اثرِ نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت
زیرِ نظر
اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
تفسیر نمونہ
ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی
مصباح القرآن ٹرسٹ

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.
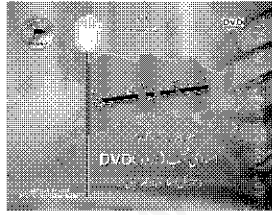
منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

اثر نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۱۱

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مِصباحُ القرآن ٹرسٹ

نام کتاب	:	تفسیر نمونہ
جلد نمبر	:	۱۱
تصنیف	:	حضرت آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی مدظلہ العالی
مترجم	:	حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی ؒ
نظر ثانی	:	ثاقب اکبر نقوی
ناشر	:	مصباح القرآن ٹرسٹ ۔ لاہور ۔ پاکستان
قیمت	:	

اس کتاب کی اشاعت کے لیے المنتظر ٹرسٹ (UK) نے بطور قرض حسنہ تعاون فرمایا ہے۔ خدا تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائیں۔

ادارہ

ملنے کا پتہ

محمد علی بک ایجنسی، اسلام آباد 051-2557471

معراج کمپنی، اُردو بازار، لاہور۔ 042-37361214

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قارئین محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ــــ کلامِ حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغازِ کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر ــــ تفسیر نمونہ ــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیرِ نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ پایا تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کُتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلیٰ اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیام قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآنِ پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ، کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مُسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہلِ علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جا سکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیبِ نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سُقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۱ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ۱۹ میں سے صفحہ ۲۹۱ تا ۴۴۲، جلد ۲۰ مکمل اور جلد ۲۱ میں سے صفحہ ۲۳ تا ۱۴۴ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورہ زمر، سورہ مومن، سورہ حٰم سجدہ، سورہ شوریٰ اور سورہ زخرف کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

ہم نے زیرِ نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیر مردِ مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسّلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھدَاء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش

تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

یہ تفسیر

حسب ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبد الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱ تفسیر مجمع البیان — تالیف —————— مشہور مفسّر طبرسی

۲ تفسیر تبیان — تالیف —————— عظیم و فقید عالم شیخ طوسی

۳ تفسیر المیزان — تالیف —————— علامہ طباطبائی

۴ تفسیر صافی — تالیف —————— ملا محسن فیض کاشانی

۵ تفسیر نور الثقلین — تالیف —————— عبد علی بن جمعہ حویزی

۶ تفسیر برہان — تالیف —————— سید ہاشم بحرانی

۷ تفسیر روح المعانی — تالیف —————— علامہ شہاب الدین محمود آلوسی

۸ تفسیر المنار — تالیف —————— محمد رشید رضا (تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ)

۹ تفسیر فی ظلال القرآن — تالیف —————— سید قطب

۱۰ تفسیر قرطبی — تالیف —————— محمد بن احمد انصاری قرطبی

۱۱ اسباب النزول — تالیف —————— ابو الحسن علی بن متویہ واحدی نیشاپوری

۱۲ تفسیر مراغی — تالیف —————— احمد مصطفیٰ مراغی

گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مدِنظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں، جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطّوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

با الفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر....؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بُوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پُرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوتے اور اس کی تیرہ جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی چودہویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا میں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی[1]۔

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرضِ خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی[2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بسترِ بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں)، کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)

[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی ۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورت حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث ، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔

(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے) ۔

خداوندا !

ہماری آنکھوں کو بینا ، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب ، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں ۔

خداوندا !

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے ، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے ، تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بارالٰہا !

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں ۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے) ۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ قم ۔ ایران

تفسیر نمونہ جلد ۱۱

فہرست

سورۂ زمر

سورہ حٰم سجدہ (فصلت)

سُورہ شوریٰ ۴۳۹

سورہ زخرف ۵۷۳

اللهم صل علی محمد وآل محمد وعجل فرجهم

تفسیر نمونہ جلد ۱۱

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

۱۔ سورہ زمر ۲۔ سورہ مومن ۳۔ سورہ حٰم سجدہ ۴۔ سورہ شوریٰ ۵۔ سورہ زخرف

سورۂ زمر: مکی سورت ہے اور اس کی ۷۵ آیات ہیں۔

پارہ ۲۳ ـــــ ۱ تا ۳۱ پارہ ۲۴ ـــــ ۳۲ تا ۷۵

سورۂ مؤمن: مکی سورت ہے اور اس کی ۸۵ آیات ہیں۔

پارہ ـــــ ۲۴

سورۂ حٰم سجدہ: مکی سورت ہے اور اس کی ۵۴ آیات ہیں۔

پارہ ۲۴ ـــــ ۱ تا ۴۶ پارہ ۲۵ ـــــ ۴۷ تا ۵۴

سورۂ شوریٰ: مکی سورت ہے اور اس کی ۵۳ آیات ہیں۔

پارہ ـــــ ۲۵

سورۂ زخرف: مکی سورت ہے اور اس کی ۸۹ آیات ہیں۔

پارہ ـــــ ۲۵

سورۂ زمر

مکہ میں نازل ہوئی

اس کی ۷۵ آیتیں ہیں

آغاز ـــــ ۲۴ شوال ۱۴۰۴ ھجری ـــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ زمر کے مطالب و مضامین

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اسی بنا پر اس میں زیادہ تر توحید و معاد، قرآن کی اہمیت اور پیغمبر اسلامؐ کے مقام نبوت سے مربوط مسائل سے متعلق گفتگو ہے۔ جیسا کہ مکی سورتوں کا معمول ہے۔

مکہ کا دور دینی اعتقادات کی بنیادوں اور ایمانی اساس کے لحاظ سے مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کا دور تھا۔ لہٰذا اس سلسلے میں مکی سورتوں میں قوی ترین اور مؤثر ترین مباحث موجود ہیں اور یہی محکم بنیاد تھی جس کے عجیب و غریب اثرات مدینہ میں جنگوں میں، دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں، منافقین کی کارستانیوں کے مقابلے میں اور نظام اسلام کو قبول کرنے میں ظاہر ہوئے اور اگر ہم مسلمانوں کی مدینہ میں تیزی کے ساتھ کامیابی کا راز معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں مکہ کی مؤثر تعلیم و تربیت کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

بہرحال یہ سورہ چند اہم حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ وہ چیز جو اس سورہ میں سب سے زیادہ دکھائی دیتی ہے وہ توحید خالص کے مسئلہ کی طرف دعوت ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں اور جہتوں کے بارے میں نصیحت، نیز توحید خالقیت، توحید ربوبیت اور توحید عبادت کا ذکر ہے۔ اس سورہ کی مختلف آیات میں خدا کی عبادت و بندگی میں اخلاص کا مسئلہ خصوصیت کے ساتھ مذکور ہے، اور اس سلسلے میں اس کی تعبیرات اس قدر مؤثر ہیں کہ وہ انسان کے دل کو اخلاص کی طرف کھینچتی اور جذب کرتی ہیں۔

۲۔ دوسرا اہم مسئلہ جو اس سورہ کے مختلف حصوں میں تقریباً ابتدا سے لے کر آخر تک قابل توجہ ہے، وہ عظیم عدالت الٰہی اور معاد کا مسئلہ ہے۔ ثواب و جزا، بہشت کے بلند مقامات اور دوزخ کی آگ کے سائبانوں کا مسئلہ بھی اس میں مذکور ہے اور قیامت کے دن کے خوف و وحشت، اعمال کے نتائج کے واضح اور آشکار ہونے اور اس عظیم منظر میں خود اعمال کے ظاہر ہو جانے کا معاملہ بھی موجود ہے۔

جھوٹوں اور خدا پر افترا باندھنے والوں کی صورتوں کے سیاہ ہونے، کافروں کے جہنم کی طرف دھکیلے جانے، ان کے لیے فرشتگانِ عذاب کی طرف سے ملامت و سرزنش کرنے، رحمت کے فرشتوں کی طرف سے بہشتیوں کو بہشت کی طرف دعوت دینے اور انھیں تبریک و تہنیت پیش کرنے کا ذکر بھی ہے۔

یہ مسائل جو معاد کے محور کے گرد گھومتے ہیں توحید کے مسائل کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں گویا ایک ہی کپڑے کا تانا بانا ہیں۔

۳۔ اس سورہ کا تیسرا حصہ جو اس کے صرف تھوڑے سے حصہ پر مشتمل ہے قرآن مجید کی اہمیت ہے لیکن یہ تھوڑا سا حصہ بھی قرآن کی ایک عمدہ تصویر اور قلب و روح پر اس کی قوی تاثیر لیے ہوئے ہے۔

۴۔ چوتھا حصہ جو اس سے بھی مختصر تر ہے گزشتہ اقوام کی سرگزشت اور آیات حق کی تکذیب کرنے والوں کے لیے خدا کا دردناک عذاب بیان کرنا ہے۔

۵۔ اس سورہ کا آخری حصّہ، خدا کی طرف بازگشت کے دروازوں کے کھلا ہونے اور توبہ کا مسئلہ ہے۔ اس حصّے میں توبہ و رحمت کی مؤثر ترین آیات بیان ہوئی ہیں کہ شاید سارے قرآن میں اس سلسلے میں کوئی آیت اس سے زیادہ خوشخبری دینے والی نہ ہو۔ یہ سورہ سورۂ زمر کے نام سے مشہور ہے اور یہ نام اس سورہ کی آیہ ۱۷ اور ۷۳ سے لیا گیا ہے، کبھی اسے اس کی آیہ ۲۰ کی مناسبت سے سورۂ غرف بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ نام مشہور نہیں ہے۔

سورۂ زمر کی فضیلت

احادیث میں اس سورہ کی تلاوت کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ان میں سے ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے۔

من قرء سورة الزمر لم يقطع الله رجاءه، واعطاه ثواب الخائفين الذين خافوا الله تعالىٰ

جو شخص سورۂ زمر کی تلاوت کرے خدا (اپنی رحمت سے) اس کی امید منقطع نہیں کرے گا اور ان لوگوں کا اجر اسے عطا کرے گا جو خدا سے ڈرتے ہیں[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے اس طرح نقل ہوا ہے۔

من قرء سورة الزمر اعطاه الله شرف الدنيا والاٰخرة، واعزه بلا مال ولا عشيرة، حتىٰ يهابه من يراه وحرم جسده على النار

جو شخص سورۂ زمر کی تلاوت کرے گا خدا اسے دنیا و آخرت کا شرف عطا کرے گا اور مال و قبیلہ کے بغیر بھی اسے قدرت و عزت بخشے گا۔ اس طرح سے کہ جو شخص بھی اسے دیکھے گا اس سے ہیبت کھائے گا اور اس کا بدن آتش دوزخ پر حرام کر دیگا۔[2]

ان فضیلتوں کا اس سورہ کے مضامین کے ساتھ موازنے کی ضرورت ہے۔ سورہ کے مضامین میں پروردگار کا خوف، اس کی رحمت کی امید، عبادت میں اخلاص اور حق تعالیٰ کی ذات پاک کے سامنے سر تسلیم خم کرنا موازنے سے یہ بات اچھی طرح سے واضح ہوتی ہے کہ یہ اجر و ثواب ان لوگوں کے لیے ہے، جو تلاوت کو غور و فکر کے لیے اور غور و فکر کو ایمان و عمل صالح کے لیے وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس سورہ کا مفہوم ان کی روح کے اندر عملی شکل پیدا کرے اور اس کی تجلی ان کی ساری زندگی میں نمایاں ہو۔ ہاں! ایسے ہی اشخاص اس قسم کے عظیم اجر اور پروردگار کی وسیع رحمت کے اہل ہیں۔

---

[1] مجمع البیان، سورۂ زمر کی ابتداء میں۔

[2] مجمع البیان، ثواب الاعمال اور تفسیر نور الثقلین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱۔ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ○

۲۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ ○

۳۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيۡنُ الۡخَالِصُ ؕ وَالَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ فِىۡ مَا هُمۡ فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِىۡ مَنۡ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ یہ کتاب خداوند عزیز و حکیم کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

۲۔ ہم نے اس کتاب کو حق کے ساتھ تجھ پر نازل کیا ہے۔ پس تم خدا کی عبادت کرو اور اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر لو۔

۳۔ آگاہ رہو کہ دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ لوگ کہ جنھوں نے خدا کے علاوہ اپنے اولیاء قرار دے لیے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ ہم ان کی پرستش نہیں کرتے مگر صرف اس لیے کہ یہ ہمیں خدا سے نزدیک کر دیں گے، جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا قیامت کے دن ان کے درمیان اس کا فیصلہ کرے گا، خدا اس شخص کو جو جھوٹا اور کفران کرنے والا ہے کبھی بھی ہدایت نہیں کرے گا۔

تفسیر

دین کو شرک سے پاک کرو

یہ سورہ قرآن مجید کے نزول سے متعلق دو آیات سے شروع ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک آیت میں تو نزولِ قرآن کے مبداء یعنی خدا کی پاک ذات کے متعلق بیان ہے اور دوسری آیت میں قرآن کے مطالب و مقاصد کے بارے میں گفتگو ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: یہ کتاب خداوند عزیز و حکیم کی طرف سے نازل ہوئی ہے (تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم)۔[1]

ہر کتاب کو اس کے نازل کرنے والے یا لکھنے والے سے پہچانتا چاہیے اور جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اس عظیم آسمانی کتاب کا سرچشمہ ایک قادر و حکیم خدا کا علم ہے جس کی بے پایاں قدرت کے مقابلے میں کوئی چیز مشکل نہیں ہے اور کوئی امر اس کے لامتناہی علم سے مخفی نہیں رہتا تو ہمیں اس کے مضامین کی عظمت کا علم ہو جاتا ہے اور مزید کسی وضاحت کے بغیر ہی ہمیں یقین آجاتا ہے کہ اس کے مطالب حق ہیں اور یہ سراسر حکمت، نور اور ہدایت ہے۔

ضمنی طور پر قرآن کی سورتوں کے آغاز میں اس قسم کی تعبیریں مومنین کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ اس عظیم کتاب میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے وہ خدا کا کلام ہے، پیغمبر کا کلام نہیں ہے اگرچہ پیغمبر اکرمؐ کا کلام بھی بلند مرتبہ اور حکیمانہ ہے۔

اس کے بعد اس آسمانی کتاب کے مطالب و مقصد کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے اس کتاب کو حق کے ساتھ تجھ پر نازل کیا ہے (انا انزلنا الیک الکتاب بالحق)۔

اس میں حق کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور تو حق کے سوا اور کوئی مطلب اس میں مشاہدہ نہیں کرے گا۔ اسی وجہ سے حق طلب لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں اور وادیٔ حقیقت کے پیاسے اس کے مطالب کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔

نیز اس کے نازل کرنے کا مقصد چونکہ انسانوں کو خالص دین پہنچانا ہے اس لیے آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اب جبکہ یہ بات ہے تو پھر "خدا کی پرستش کر، اس حال میں کہ اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کرلے" (فاعبد اللہ مخلصا له الدین)۔

ممکن ہے یہاں "دین" سے مراد خدا کی عبادت ہو کیونکہ اس سے پہلے "فاعبد اللہ" کے ذریعے عبادت کا حکم دیا گیا ہے

---

[1] "تنزیل الکتاب" ایک مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: "ھذا تنزیل الکتاب"
بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "تنزیل الکتاب" مبتداء ہے اور "من اللہ" اس کی خبر ہے۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔ ضمناً "تنزیل" ایک مصدر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں ہے اور صفت کی موصوف کی طرف اضافت ہے یعنی "ھذا کتاب منزل من اللہ ...."

اس بنا پر اس کا لاحقہ جو " مخلصًا لہ الدین " ہے۔ صحتِ عبادت کی شرط یعنی اخلاص اور ہر قسم کے شرک وریا اور غیر خدا سے خالی ہونے کو بیان کرتا ہے۔

اس حالت میں "دین" کے مفہوم کی وسعت اور اس میں کسی شرط کا نہ ہونا زیادہ وسیع معنی پر دلالت کرتا ہے، جس میں عبادت بھی شامل ہے اور دوسرے اعمال بھی اور اعتقادات بھی۔ دوسرے لفظوں میں " دین " انسان کی روحانی اور مادی حیات کے مجموعہ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ لہٰذا خدا کے خالص بندوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام حالات کو اس کے لیے خالص بنائیں اور اس کے غیر کو خانۂ دل، صحن جان اور میدانِ عمل اور دائرۂ گفتار سے دور کر دیں۔ اس کے لیے غور و فکر کریں۔ اسی کے لیے دوست بنائیں۔ اسی کی بات کریں۔ اسی کے لیے عمل کریں اور ہمیشہ اس کی رضا کی راہ میں قدم اٹھائیں۔ کیونکہ " اخلاص دین " یہی ہے۔

اسی بنا پر آیت کے مفہوم کو " لا الٰہ الا اللہ " کی شہادت میں یا خاص " عبادت و اطاعت " میں محدود کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی اس پر کوئی واضح دلیل موجود ہے۔

بعد والی آیت میں دوبارہ مسئلہ اخلاص کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: آگاہ رہو کہ دینِ خالص اللہ کے لیے مخصوص ہے (الا للہ الدین الخالص)۔

اس عبارت میں دو معانی کی گنجائش ہے۔

پہلا یہ کہ: جسے خدا قبول کرتا ہے وہ صرف دینِ خالص ہے اور صرف اس کے فرمان کے سامنے بلا کسی شرط کے سرِ تسلیم خم کرنا ہے اور ہر قسم کا شرک وریا اور قوانین خداوندی کو ان کے غیر کے ساتھ ملانا مردود و مسترد ہے۔

دوسرا یہ کہ: خالص دین و آئین صرف خدا سے ہی لینا چاہیے کیونکہ جو کچھ انسانوں کے افکار کا ساختہ و پرداختہ ہے وہ نارسا اور خطا و اشتباہ کی آمیزش رکھتا ہے۔

لیکن سابقہ آیت کے مفہوم کو پیش نظر رکھیں تو پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے، کیونکہ وہاں اخلاص کا باعث بندے ہیں۔ اس بنا پر زیرِ بحث آیت میں بھی خلوص کی انھیں کی طرف نسبت ہونی چاہیے۔

اس بات کا دوسرا شاہد وہ حدیث ہے جو پیغمبر گرامی سے نقل ہوئی ہے۔ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

> یارسول اللہ! انا نعطی اموالنا التماس الذکر فھل لنا من اجر؟ فقال رسول اللہ (ص) لا، قال یارسول اللہ! انا نعطی التماس الاجر و الذکر، فھل لنا اجر؟ فقال رسول اللہ (ص) ان اللہ تعالٰی لا یقبل الا من اخلص لہ، ثم تلا رسول اللہ (ص) ھٰذہ الاٰیۃ الا للہ الدین الخالص۔

> یارسول اللہ! ہم اپنے اموال دوسروں کو بخشتے ہیں تاکہ ہم اپنا نام و نمود لوگوں کے درمیان پیدا کریں، تو کیا ہمارے لیے کوئی اجر ہے؟
>
> فرمایا: نہیں۔

پھر اس نے عرض کیا: ہم بعض اوقات خدا سے اجر کے حصول کے لیے بھی اور نام و نمود کے لیے بھی بخشش کرتے ہیں تو کیا اس صورت میں ہمارے لیے کوئی اجر و پاداش ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: خدا کسی بھی چیز کو قبول نہیں کرتا سوائے اس کے جو اس کے لیے خالص ہو۔ پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت کی۔

الا للہ الدین الخالص [1]

بہرحال یہ آیت حقیقت میں گزشتہ آیت کی دلیل بیان کر رہی ہے۔ وہاں قرآن کہتا ہے: کہ خدا کی اخلاص کے ساتھ عبادت کرو اور یہاں اضافہ کرتا ہے: جان لے کہ خدا تو صرف خالص عمل کو ہی قبول کرتا ہے۔

آیاتِ قرآنی اور احادیثِ اسلامی میں مسئلہ اخلاص پر بہت کچھ فرمایا گیا ہے۔ زیرِ بحث جملے کی ابتداء "الا" کے ساتھ جو عام طور پر توجہ مبذول کرنے کے لیے بولا جاتا ہے، اس موضوع کی اہمیت کی ایک اور نشانی ہے۔

اس کے بعد مشرکین کہ جو اخلاص کی راہ چھوڑ کر شرک کی بے راہروی میں سرگرداں تھے کی کمزور اور فضول منطق کو باطل کرتے ہوئے اس طرح فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جنھوں نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنے اولیاء بنا لیا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ ہم ان کی پرستش نہیں کرتے مگر صرف اس لیے کہ یہ ہمیں خدا سے نزدیک کر دیں، خدا قیامت کے دن جس چیز میں وہ اختلاف کرتے ہیں، ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا اور وہاں ان کے اعمال و افکار کی خرابی اور تباہی سب پر ظاہر ہو جائے گی۔

(والذین اتخذوا من دونه اولیاء ما نعبدهم الا لیقربونا الی الله زلفی ان الله یحکم بینهم فیما هم فیه یختلفون) [2]

یہ آیت حقیقت میں مشرکین کے لیے ایک قاطع اور دو ٹوک تہدید ہے کہ قیامت کے دن جو اختلافات کے برطرف ہونے اور حقائق کے ظاہر و آشکار ہونے کا دن ہے۔ خدا ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اور ان کو ان کے اعمال کی سزا دے گا۔ علاوہ ازیں وہ میدانِ محشر میں سب کے سامنے ذلیل و رسوا بھی ہوں گے۔

یہاں بت پرستوں کی منطق وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ:

بعض اس بات کے معتقد ہیں کہ بت پرستی کا ایک سرچشمہ یہ ہے کہ ایک گروہ اپنے گمان میں خدا کی پاک ذات کو اس سے بزرگ و بالا سمجھتا تھا کہ ہماری عقل و فکر اس تک پہنچ سکے اور اس بنیاد پر وہ اسے اس سے منزہ سمجھتا تھا کہ ہم براہِ راست اس کی عبادت کریں۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ ہم ایسے افراد کی طرف رُخ کریں جن کے ذمے خدا کی طرف سے اس عالم کی ربوبیت اور تدبیر کر دی گئی ہے اور انھیں خدا اور اپنے درمیان واسطہ بنائیں۔

---

[1] روح المعانی، جلد ۲۳ ص ۲۱۲ (زیرِ بحث آیات کے ذیل میں)۔

[2] یہ بات واضح ہے کہ زیرِ بحث آیت میں " ما نعبدهم " سے پہلے ایک جملہ مقدر ہے، " یقولون ما نعبدهم........

انھیں "ارباب" اور خداؤں کے طور پر قبول کریں اور ان کی پرستش کریں تاکہ وہ ہمیں خدا کے قریب کر دیں اور وہ ملائکہ، جن اور کلی طور پر کائنات کے مقدس موجودات ہیں۔

پھر اسی بنا پر ان مقدسین تک بھی دسترس ممکن نہیں تھی لہذا ان کی مورتیاں اور تصویریں بنا لیا کرتے تھے اور ان کی پرستش کیا کرتے تھے، اور یہی وہ بُت تھے اور چونکہ وہ ان مورتیوں اور مقدسین کی ذوات کے درمیان ایک قسم کی وحدت کے قائل تھے لہذا وہ بتوں کو بھی "ارباب" اور خدا خیال کرتے تھے۔

اس طرح سے ان کی نزدیک وہ موجودات ممکن ہی خدا تھے جو خداوندِ عالم کی طرف سے پیدا کیے گئے تھے اور ان کے گمان میں وہ بارگاہِ حق کے مقرب اور پروردگار کے حکم سے امورِ عالم کو چلانے والے تھے اور وہ خدا کو رب الارباب (خداؤں کا خدا) جانتے تھے جو عالمِ ہستی کا خالق اور آفریدگار ہے۔ ورنہ بُت پرستوں میں سے بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ یہ پتھر اور لکڑی کے بُت یا ان کے خیالی خدا یعنی فرشتے اور جن وغیرہ تک بھی اس جہان کے خالق و آفریدگار ہوں[1]

البتہ بُت پرستی کے اور بھی بہت سے سرچشمے ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ انبیاء اور صالح لوگوں کا احترام بعض اوقات اس بات کا سبب بنتا تھا کہ ان کی تصویروں اور مورتیوں کا بھی احترام کریں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد ان تصویروں نے ایک مستقل صورت اختیار کر لی اور احترام بھی پرستش میں تبدیل ہو گیا۔ اسی بنا پر اسلام میں مجسمہ سازی کو سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

یہ چیز بھی تواریخ میں آئی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عرب چونکہ کعبہ اور سرزمینِ مکہ کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے، اس لیے بعض اوقات وہاں سے پتھر کے کچھ ٹکڑے اپنے ساتھ مختلف علاقوں میں لے جاتے تھے۔ پہلے تو صرف احترام کرتے اور پھر آہستہ آہستہ ان کی پرستش کرنے لگ جاتے۔

بہرحال یہ چیز اس بات سے جو "عمرو بن لحی" کی داستان میں منقول ہے کوئی تضاد نہیں رکھتی کہ اس نے شام کے سفر کے موقع پر بُت پرستی کے کچھ مناظر کا مشاہدہ کیا اور پہلی مرتبہ ایک بُت اپنے ساتھ حجاز میں لے آیا اور بتوں کی پرستش اس وقت سے معمول بنی چونکہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے ان میں سے ہر ایک بُت پرستی کی کسی ایک بنیاد کو بیان کرتا ہے اور شامیوں کا بتوں کی پرستش کرنے کا سبب بھی یہی امور یا ان جیسے ہی امور تھے۔

لیکن ہر صورت میں یہ سب بے بنیاد اوہام و خیالات تھے جو ناتوان دماغوں سے ٹپکتے تھے اور لوگوں کو خدا شناسی کے اصلی راستے سے منحرف کر دیتے تھے۔

قرآن مجید خصوصیت کے ساتھ اس نکتے پر تاکید کرتا ہے کہ انسان بغیر کسی واسطے کے خدا کے ساتھ تعلق پیدا کر سکتا ہے، اس سے گفتگو کر سکتا ہے، راز و نیاز کر سکتا ہے، اپنی حاجت طلب کر سکتا ہے، عفو و بخشش کی درخواست کر سکتا ہے اور توبہ و انابت کر سکتا ہے، یہ سب چیزیں اسی کے لیے ہیں اور اسی کے اختیار و قدرت میں ہیں۔

سورۂ "حمد" اسی حقیقت کو بیان کر رہی ہے کیونکہ بندے روزانہ نمازمیں اس سورہ کے پڑھنے سے، دائمی طور پر براہِ راست

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱۷، ص ۲۴۷ (کچھ فرق کے ساتھ)

اپنے پروردگار کے ساتھ ربط رکھتے ہیں، اس کو پکارتے ہیں اور بغیر کسی واسطے کے اس سے دعا کرتے ہیں اور اپنی حاجات طلب کرتے ہیں۔

اسلامی احکام میں توبہ و استغفار کا طریقہ اور اسی طرح خدائے بزرگ سے ہر قسم کی درخواستیں، جن سے ہماری ماثورہ دعائیں بھری پڑی ہیں، یہ سب اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلام ان مسائل میں کسی واسطے کا قائل نہیں اور یہی حقیقتِ توحید ہے۔

یہاں تک کہ مسئلہ شفاعت اور اولیاء اللہ سے توسل بھی اذنِ پروردگار اور اس کی اجازت کے ساتھ مقیّد ہے اور وہ بھی اسی مسئلہ توحید پر ایک تاکید ہے۔

اسی طرح سے رابطہ قائم و برقرار رہنا چاہیے کیونکہ وہ ہم سے، خود ہم سے بھی زیادہ قریب ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید

ہم انسان کی شہرگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ (ق ـــــ ۱۶)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے:

واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ

جان لو کہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان رہتا ہے (انفال ـــــ ۲۴)

ان حالات میں نہ وہ ہم سے دُور ہے اور نہ ہم اس سے دور ہیں کہ واسطے کی ضرورت پڑے۔ وہ دوسرے ہر شخص کی نسبت ہم سے زیادہ نزدیک ہے وہ ہر جگہ موجود و حاضر ہے اور ہمارے دل کے اندر اس کی جگہ ہے۔

اسی بنا پر واسطوں کی پرستش چاہے وہ فرشتے اور جن ہوں یا ان کے مانند دوسری مخلوق اور چاہے پتھر اور لکڑیوں کے بتوں کی پرستش ہو، ایک بے بنیاد اور جھوٹا عمل ہے۔ علاوہ ازیں پروردگار کی نعمتوں کا کفران بھی ہے، کیونکہ نعمت کا بخشنے والا پرستش کا حقدار ہے نہ کہ یہ بے جان سراپا نیاز و احتیاج موجودات۔

اس لیے آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے: خدا ایسے شخص کو جو جھوٹا اور کفران کرنے والا ہو کبھی ہدایت نہیں کرتا (ان اللہ لا یھدی من ھو کاذب کفار)۔

نہ اس جہان میں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اور نہ دوسرے جہان میں جنّت کی طرف ہدایت، کیونکہ اس نے خود ہدایت کے سب دروازوں کے بند ہونے کی بنیاد فراہم کر دی ہے، کیونکہ خدا اپنی ہدایت کا فیض ایسی زمینوں پر بھیجتا ہے جو اسے قبول کرنے کے لائق اور اس کے لیے آمادہ ہوں، نہ کہ ان دلوں میں جو جانتے ہوئے شعوری طور پر ہر قسم کی اہلیت کو تباہ کر دیں۔

"تنزیل" اور "انزال" میں فرق

اس سورہ کی پہلی آیت میں "تنزیل الکتاب" کی تعبیر ہے اور دوسری آیت میں "انزلنا الیک الکتاب" کی تعبیر ہے۔

"تنزیل" اور "انزال" میں کیا فرق ہے اور ان آیات میں تعبیر کا یہ اختلاف کس لیے ہے؟ اس بارے میں جو کچھ چند لغات کے متنوں سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "تنزیل" تو عام طور پر ایسے مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں کوئی چیز بتدریج اور آہستہ آہستہ نازل ہو، جب کہ "انزال" ایک عام معنی رکھتا ہے۔ جس میں نزولِ تدریجی بھی شامل ہے اور "دفعی" (ایک ہی

مرتبہ کا نزول) بھی ہے[1]

بعض ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل سمجھتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ "تنزیل" صرف نزولِ تدریجی ہے اور "انزال" صرف نزولِ دفعی ہے[2]

اس بنا پر مذکورہ تعبیر کا اختلاف ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ قرآن دو قسم کے نزول کا حامل ہے۔ ایک نزولِ دفعی (یعنی ایک ہی مرتبہ) جو شبِ قدر میں اور ماہِ مبارک رمضان میں واقع ہوا، اس موقع پر قرآن اکٹھا پیغمبر گرامی اسلامؐ کے قلبِ مبارک پر نازل ہوا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

انا انزلناه فی لیلة القدر

ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا۔ (قدر ــــ ۱)

انا انزلناه فی لیلة مبارکة

ہم نے اسے ایک مبارک رات میں نازل کیا۔ (دخان ــــ ۲)

شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن

رمضان وہی مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ (بقرہ ــــ ۱۸۵)

ان تمام مواقع پر "انزال" کے مادہ سے استفادہ کیا گیا ہے جو قرآن کے دفعی (ایک ہی مرتبہ کے) نزول کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرا نزول جو تدریجاً پیغمبر اکرمؐ کی نبوت کے ۲۳ سالہ دور میں صورت پذیر ہوا۔ ہر حادثے ہر واقعے میں اس سے مناسبت رکھنے والی آیات نازل ہوتی رہیں۔ اس طریقے نے مسلمانوں کو مرحلہ بہ مرحلہ روحانی، اخلاقی، اعتقادی اور اجتماعی کمال کے مدارج طے کرائے۔ جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۱۰۶ میں بیان ہوا ہے۔

وقرآنا فرقناه لتقرأه علی الناس علی مکث ونزلناه تنزیلا

ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا جو ایک دوسرے سے جدا آیتوں کی صورت میں ہے تاکہ تو اسے تدریجاً اور آہستہ آہستہ لوگوں کے سامنے پڑھے (اور ہر دلوں میں جذب ہو جائے) اور ہم نے اس قرآن کو قطعی طور پر تدریجاً نازل کیا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض اوقات ایک ہی آیت میں دونوں تعبیریں دو الگ الگ مقاصد کے لیے استعمال ہوئی ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید سورۂ محمد کی آیہ ۲۰ میں کہتا ہے:

و یقول الذین اٰمنوا لولا نزلت سورة فاذا انزلت سورة محکمة و ذکر فیها القتال

رأیت الذین فی قلوبهم مرض ینظرون الیك نظر المغشیّ علیه من الموت

---

[1] مفردات راغب، مادہ "نزل" والفرق بین الانزال والتنزیل فی وصف القرآن والملائکة ان التنزیل یختص بالموضع الذی یشیر الیه انزاله مفرقا ومرة بعد اخری والانزال عام)۔

[2] تفسیر فخر رازی میں بعض سے یہ فرق نقل ہوا ہے۔

مومنین کہتے ہیں کہ کوئی سورہ نازل کیوں نہ ہوئی؟ جس وقت محکم سورہ نازل ہو جائے گی اور اس میں جنگ کا ذکر ہوگا، تو، تو بیمار دل منافقوں کو دیکھے گا کہ وہ کس طرح سے تیری طرف دیکھ رہے ہیں جیسے ان کی روح قبض کی جا رہی ہے۔

گویا مومنین ایک سورہ کے تدریجی نزول کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ وہ اس کے خوگر ہو جائیں لیکن چونکہ بعض اوقات ایک سورہ کا تدریجی نزول کچھ مسائل کے موقعوں پر مثلاً جہاد میں منافقین کے سوء استفادہ کا سبب بنتا تھا تاکہ مرحلہ بہ مرحلہ اس سے پہلوتہی کرلیں، تو ایسے مواقع پر پوری سورۃ ایک ہی ساتھ نازل ہو جاتی تھی۔

یہ آخری چیز ہے جو ان دونوں تعبیروں کے فرق کے سلسلہ میں کہی جا سکتی ہے اور اس کے مطابق زیرِ بحث آیات میں دونوں قسم کے نزول کی طرف اشارہ ہوا ہے اس لحاظ سے یہ کامل جامعیت رکھتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود مذکورہ بالا تفسیر اور فرق کے استثنائی مواقع بھی موجود ہیں۔ منجملہ ان کے سورۂ فرقان کی آیہ ۳۲ میں بیان ہوا ہے۔

وقال الذين كفروا لولا نزل عليه القرآن جملة واحدة كذالك لنثبت به فؤادك و رتلناه ترتيلاً

کافروں نے کہا قرآن اکٹھا اور یکجا کیوں نازل نہیں ہوتا؟ یہ اس بنا پر ہے کہ ہم تیرے دل کو محکم کر دیں، اس لیے ہم نے اسے تدریجاً تیرے لیے پڑھا ہے۔

البتہ ان دونوں قسم کے "نزول" میں سے ہر ایک کے کچھ فوائد و آثار ہیں، جن کی طرف متعلقہ جگہ پر اشارہ کیا گیا ہے [1]

---

[1] قرآن کے تدریجی نزول کے بارے میں ہم نے جلد ۸ میں تفصیلی بحث کی ہے۔

۴۔ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○

۵۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ○

ترجمہ

۴۔ اگر (بفرض محال) خدا کسی کو اپنی اولاد بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا منتخب کر لیتا، وہ منزہ ہے (اس سے کہ کوئی اس کی اولاد ہو) وہ اللہ واحد و قہار ہے۔

۵۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، وہ رات کو دن پر لپیٹ دیتا ہے اور دن کو رات پر اور سورج اور چاند کو اس نے اپنے فرمان کا مسخر بنا دیا ہے، ان میں سے ہر ایک مدّتِ معین تک اپنی حرکت کو جاری رکھے ہوئے ہے، آگاہ رہو کہ وہ قادر اور بخشنے والا ہے۔

تفسیر

وہ ہر چیز پر حاکم ہے، اسے اولاد کی کیا ضرورت ہے؟

گزشتہ آیات میں اس ضمن میں گفتگو ہوئی ہے کہ مشرکین بتوں کو خدا کے نزدیک واسطہ اور شفیع سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بعض معبودوں مثلاً فرشتوں کے بارے میں ایک اور عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ وہ انھیں خدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے۔ پہلی زیرِ بحث آیت اس قبیح خیال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے: اگر خدا کسی کو اپنی اولاد بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا منتخب کر لیتا (لو اراد الله ان یتخذ ولدًا لاصطفٰی مما یخلق ما یشاء)۔

وہ اس سے پاک اور منزہ ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو وہ اللہ واحد و قہار ہے (سبحانہ ھو الله الواحد القھار)۔

پہلے جملے کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر خدا کسی کو اولاد بنانا ہی چاہتا تو بیٹیوں کا انتخاب کیوں کرتا، جو تمہارے زعم کے مطابق بے قدر وقیمت انسان ہیں، وہ بیٹوں کو منتخب کیوں نہ کرتا؟ اور یہ حقیقت میں مخاطب کے ذہن کے مطابق ایک طرح کا استدلال ہے تاکہ وہ اپنی گفتگو کے بے بنیاد ہونے کو سمجھ لیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر خدا چاہتا کہ اس کی اولاد ہو تو فرشتوں سے برتر و بہتر مخلوق پیدا کرتا۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خدا کی بارگاہ میں بیٹیوں کے وجود کی قدر وقیمت بیٹوں سے کمتر نہیں ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ فرشتے اور حضرت عیسیٰ جو منحرفین کے اعتقاد کے مطابق خدا کی اولاد ہیں۔ بہت ہی باشرف اور لائق موجودات ہیں، اس لیے ان دونوں تفاسیر میں سے کوئی بھی مناسب نظر نہیں آتی۔ بہتر یہ ہے کہ کہا جائے کہ آیت اس مطلب کو بیان کرنا چاہتی ہے کہ اولاد ضروری طور پر مدد اور روحانی تسکین کے لیے ہوتی ہے۔ بفرضِ محال اگر خدا کو اس قسم کی احتیاج ہوتی تو اس کے لیے اولاد کا ہونا ضروری نہیں تھا بلکہ اپنی باشرف مخلوق میں سے کچھ لوگوں کو منتخب کر لیتا جو اس مقصد کو پورا کرتے، اولاد کا انتخاب کیوں کرتا؟

لیکن وہ چونکہ واحد و یگانہ اور ہر چیز پر قاہر و غالب ہے اور ازلی و ابدی ہے، نہ وہ کسی کی مدد کا محتاج ہے اور نہ ہی کسی وحشت کا اس کے لیے کوئی تصور ہے، جو کسی چیز سے روحانی تسکین حاصل ہونے کی وجہ سے برطرف ہو اور نہ ہی وہ نسل کے جاری رہنے کا محتاج ہے۔ اس بنا پر وہ اولاد رکھنے سے پاک و منزہ ہے، چاہے وہ حقیقی اولاد ہو یا اپنائی اور انتخاب کی ہوئی۔

علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے یہ کم عقل بے خبر جو کبھی فرشتوں کو خدا کی اولاد خیال کرتے تھے اور کبھی اس کے اور جنوں کے درمیان کسی نسبت کے قائل ہوتے تھے اور کبھی حضرت مسیحؑ یا حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا بتاتے تھے، اس واضح حقیقت سے بے خبر تھے کہ اگر بیٹے سے مراد حقیقی بیٹا ہو تو سب سے پہلے تو اس کا لازمہ جسم ہے، دوسرے تجزیہ کو قبول کرنا ہے (کیونکہ بیٹا باپ کے وجود کا ایک جزو ہوتا ہے جو اس سے جدا ہوتا ہے)۔ تیسرے اس کا لازمہ شبیہ و نظیر کا رکھنا ہے (کیونکہ بیٹا باپ سے مشابہت رکھتا ہے) اور چوتھے۔ اس کا لازمہ بیوی کی احتیاج ہے۔

اور خدا ان تمام امور سے پاک و منزہ ہے۔

نیز اگر اس سے مراد انتخاب کردہ بیٹا ہو اور یعنی اپنایا ہوا ہو تو وہ بھی یا جسمانی کمک و مدد کے لیے ہوتا ہے یا اخلاقی اور اس کے مانند انس کے لیے ہوتا ہے اور خدا وند قادر و قاہر ان سب امور سے بے نیاز ہے۔

اس بنا پر "واحد" و "قہار" کی تعبیر ان تمام احتمالات کا مختصر سا جواب ہے۔

بہر حال لفظ "لو" جو عام طور پر محال شرطوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایک فرضِ محال ہے کہ خدا کسی فرزند کا انتخاب کرے اور اگر بفرضِ محال اسے کوئی ضرورت ہوتی تو جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے اس کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ اس کی برگزیدہ مخلوقات اس مقصد کو پورا کر دیتیں۔

پھر اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ خدا مخلوقات سے کوئی احتیاج نہیں رکھتا اور ساتھ ہی توحید اور اس کی عظمت کی نشانیوں کو بیان کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: خدا نے تمام آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے (خلق السماوات و الارض بالحق)۔

ان کا حق ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک عظیم مقصد درمیان میں تھا کہ وہ موجودات کے ارتقاء کے سوا ـــــ جن کے آگے آگے انسان ہیں اور پھر قیامت پر اختتام ہے ـــــ کچھ اور چیز نہیں ہے ۔

اس عظیم آفرینش کے بیان کے بعد ایک عجیب و غریب تدبیر اور نپے تُلے تغیرات اور ان پر حاکم عجیب نظام کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹ دیتا ہے (یکور اللیل علی النہار و یکور النہار علی اللیل)

کیسی عمدہ تعبیر ہے اگر انسان کرۂ زمین سے باہر بیٹھا ہوا ہو اور زمین کی خود اپنے گرد حرکت وضعی کا منظر اور اس کے گرد رات اور دن پیدا ہونے کو دیکھے تو اسے نظر آئے گا کہ گویا مرتب طور پر ایک طرف سے رات کی سیاہ رنگ کی نوار دن کی روشنی پر لپٹی جارہی ہے اور دوسری طرف سے دن کی سفید رنگ کی نوار رات کی سیاہی پر لپٹی جارہی ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ " یکور " " تکویر " کے مادہ سے لپیٹنے کے معنی میں ہے اور ارباب لغت خصوصیت کے ساتھ عمامہ اور دستار سر کے گرد لپیٹنے کو اس کا ایک نمونہ شمار کرتے ہیں تو اس سے ایک نکتہ جو اس قرآنی تعبیر میں پوشیدہ ہے واضح ہوجاتا ہے ، اگرچہ بہت سے مفسرین نے اس نکتہ کی طرف توجہ نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے مطالب بیان کیے ہیں جو " تکویر " کے مفہوم سے چنداں مناسبت نہیں رکھتے ۔ نکتہ یہ ہے کہ زمین کروی (گول) شکل کی ہے اور اپنے گرد حرکت کرتی ہے اور اس گردش کے زیر اثر رات کی سیاہ نوار اور دن کی سفید نوار ہمیشہ اس کے گرد چکر لگاتی ہے گویا ایک طرف سے سفید نوار سیاہ پر اور دوسری طرف سے سیاہ نوار سفید پر لپیٹی جارہی ہے ۔

بہرحال قرآن مجید نور و ظلمت اور رات دن پیدا ہونے کے بارے میں مختلف تعبیریں پیش کرتا ہے جن میں سے ہر ایک کسی ایک نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس کی طرف ایک خاص زاویے سے دیکھتی ہے ۔

کبھی کہتا ہے :

یولج اللیل فی النہار و یولج النہار فی اللیل

رات کو دن میں تدریجاً داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں ۔ (فاطر ـــــ ۱۳)

یہاں رات کے دن میں اور دن کے رات میں چھپکے چھپکے بغیر کسی شور و شین کے داخل ہونے کے متعلق گفتگو ہے ۔

اور کبھی کہتا ہے :

یغشی اللیل النہار

خدا رات کے ظلمانی پردے دن کو پہنا دیتا ہے (اعراف ـــــ ۵۴)

یہاں رات کو ظلمانی پردوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو گویا دن کی روشنی پر پڑتے ہیں اور اسے چھپا دیتے ہیں ۔

زیر بحث آیات میں " تکویر " اور ان دونوں کے ایک دوسرے میں لپیٹے جانے سے متعلق گفتگو ہے جبکہ اس میں بھی ایک نکتہ ہے جس کی طرف سطور بالا میں اشارہ ہوچکا ہے ۔

اس کے بعد اس جہان کی تدبیر و نظم کے ایک گوشے کو بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے : اس نے سورج اور چاند کو اپنے فرمان کا مسخر قرار دیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک معین مدت تک اپنی حرکت کو جاری رکھے ہوئے ہے (و سخر الشمس و القمر کل

یجری لاجل مسمّٰی)۔

وہ حرکت جو خورشید کا دور خود اپنے گرد کرتی ہے یا اسی حرکت میں کہ جس میں وہ سارے نظامِ شمسی کے ساتھ کہکشاں کے ایک خاص نقطے کی طرف بڑھ رہا ہے، معمولی سے معمولی بدنظمی بھی دکھائی نہیں دیتی اور نہ ہی چاند کی اپنی حرکت میں جو وہ زمین کے گرد کرتا ہے یا خود اپنے گرد گھومتا ہے (کوئی بدنظمی ہوتی ہے) بلکہ سب کے سب اس کے مطیعِ فرمان ہیں۔ اس کے (آفرینش کے قوانین کے) مسخر ہیں اور اپنی عمر کے اختتام تک اپنی یہی کیفیت جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ سورج اور چاند کے مسخر ہونے سے مراد ان کا پروردگار کے اذن سے انسان کے لیے مسخر ہونا ہو۔ جیسا کہ سورۂ ابراہیم کی آیہ ۳۳ میں ہے:

وسخرلکم الشمس والقمر دائبین

اس نے سورج اور چاند کو جو ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے۔

لیکن زیر بحث آیت کے جملوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور اس بات کی طرف توجہ کرنے سے بھی کہ " لکم " کی تعبیر زیر بحث آیت میں نہیں ہے، یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

آیت کے آخر میں مشرکین کو ــــــ بازگشت اور لطف و عنایت کی راہ کھلا رکھنے کے ساتھ ساتھ ــــــ تہدید کے طور پر فرمایا گیا ہے، جان لو کہ وہ عزیز و غفار ہے (الا ھو العزیز الغفار)۔

اس کی بے انتہا عزت و قدرت کی بنا پر کوئی گنہگار اور مشرک اس کے عذاب کے پنجے سے بھاگ کر نہیں نکل سکتا اور وہ اپنی غفاریت کے تقاضے سے توبہ کرنے والوں کے عیوب اور گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور انھیں اپنی رحمت کے سایے تلے لے لیتا ہے۔

"غفار" مبالغے کا صیغہ ہے "غفران" کے مادہ سے جو اصل میں ایسی چیز کو چھپانے کے معنی میں ہے جو انسان کو آلودگی سے محفوظ رکھے اور جس وقت یہ خدا کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ نادم اور پشیمان بندوں کے عیوب اور گناہوں کو چھپا دیتا ہے اور انھیں عذاب اور کیفرِ کردار سے بچا لیتا ہے۔ ہاں! وہ صاحبِ عزت و قدرت کے ساتھ ساتھ غفار بھی ہے اور رحمت و غفران کے ساتھ ساتھ "قہار" بھی ہے۔ آیت کے آخر میں ان دونوں اوصاف کا بیان بندوں میں خوف و رجاء کی حالت پیدا کرنے کے لیے ہے جو ہر قسم کے تکامل و ارتقاء کی تحریک کا اصلی عامل ہے۔

۶۔ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○

۷۔ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۟ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○

ترجمہ

۶۔ اس نے تمھیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کی بیوی کو اس (کی باقی ماندہ گیلی مٹی) سے پیدا کیا اور تمھارے لیے آٹھ جوڑے چوپایوں میں سے نازل کیے وہ تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تاریکیوں کے اندر، ایک کے بعد دوسری خلقت عطا کرتا ہے۔ یہ ہے تمھارا پروردگار خدا، (عالم ہستی کی) حکومت اسی کے لیے ہے، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ پھر تم (اس حال میں) راہِ حق سے کس طرح منحرف ہوتے ہو؟

۷۔ اگر تم کفران کرو گے تو خدا تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے کبھی بھی کفران کو پسند نہیں کرتا اور اگر تم اس کا شکر ادا کرو گے تو وہ اسے تمھارے لیے پسند کرتا ہے اور کوئی گنہ گار کسی دوسرے کا گناہ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا۔ اس کے بعد تم سب کی واپسی تمھارے پروردگار کی طرف ہے اور جو کچھ تم انجام دیا کرتے تھے وہ اس سے تمھیں آگاہ کرے گا، کیونکہ جو کچھ سینوں میں ہے وہ اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

سب کی ایک ہی نفس سے پیدائش

ان آیات میں پھر آفرینش الٰہی کی عظمت کی نشانیوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے اور انسانوں کے لیے اس کی طرح طرح کی نعمتوں کا حصہ بیان کیا جا رہا ہے۔

پہلے انسان کی خلقت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا نے تم سب کو ایک ہی شخص سے پیدا کیا ہے، پھر اس کی بیوی کو اس سے پیدا کیا (خلقکم من نفس واحدة ثم جعل منها زوجها)۔

تمام انسانوں کی ایک ہی نفس سے خلقت در اصل ہمارے پہلے جدِ امجد حضرت آدمؑ کی خلقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تمام انسان خلقت کے تنوع، مختلف اخلاق وعادات اور مختلف استعداد اور ذوق کے ساتھ ایک ہی جڑ کی طرف لوٹتے ہیں، کہ جو "آدم" ہے۔

"ثم جعل منها زوجها" در اصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے پہلے آدم کو خلق کیا پھر اس کے بعد اس کی بیوی کو اس کی باقی ماندہ مٹی سے پیدا کیا۔[1]

اس حساب سے حوا کی خلقت آدم کی خلقت کے بعد اور اولادِ آدم کی خلقت سے پہلے ہوئی۔

لفظ "ثم" ہمیشہ تاخیر زمانی کے لیے نہیں آتا بلکہ کبھی تاخیر بیان کے لیے بھی آتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں: ہم نے تمھارا آج کا کام دیکھا پھر تمھارا کل کا کام بھی دیکھا۔ حالانکہ گزشتہ کل کے اعمال مسلماً آج کے اعمال سے پہلے واقع ہوتے ہیں، لیکن ان کا ذکر بعد کے مرحلے میں ہوا۔

یہ جو بعض نے اس تعبیر کو آدم کی خلقت کے بعد اور حوا کی خلقت سے پہلے عالم ذر میں اولادِ آدم کی چیونٹیوں کی شکل میں خلقت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، درست نہیں ہے۔ اس بات کو ہم سورۂ اعراف کی آیہ ۱۷۲ کے ذیل میں "عالم ذر" کی تفسیر میں

---

[1] در حقیقت مذکورہ بالا جملے میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے:
خلقکم من نفس واحدة خلقها ثم جعل منها زوجها

بیان کرچکے ہیں [1]

یہ نکتہ بھی یاددہانی کے قابل ہے کہ آدم کی بیوی کی خلقت خود آدم کے وجود کے اجزا سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی بچی ہوئی گیلی مٹی سے ہوئی تھی۔ جیساکہ روایات میں اسس کی تصریح موجود ہے لیکن وہ روایت جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حوا آدم کی آخری بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہیں ایک بے بنیاد بات ہے جو اسرائیلیات میں سے ہے اور وہ اس مطلب کے ساتھ ہم آہنگ ہے کہ جو موجودہ تحریف شدہ توارات کے سفر تکوین کی دوسری فصل میں موجود ہے اور اس سے قطع نظر وہ مشاہدہ اور حس کے بھی برخلاف ہے کیونکہ اس روایت کے مطابق آدم کی ایک پسلی اٹھا دی گئی اور اس سے حوا پیدا ہوئیں، اس لیے مردوں کے بائیں طرف کی ایک پسلی کم ہوتی ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ مرد اور عورت کی پسلیوں کی تعداد میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ فرق ایک افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

اس کے بعد چوپایوں کی خلقت کا ذکر ہے کہ جو انسانوں کی زندگی کے اہم وسائل میں سے ہیں۔ چوپائے ایک طرف تو دودھ اور گوشت کے لیے کام آتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے چمڑے اور بالوں سے لباس اور زندگی کی دوسری ضروریات تیار کی جاتی ہیں۔ نیز سواری اور حمل و نقل کے لیے انسان ان سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، تمھارے لیے چوپایوں کے آٹھ جوڑے نازل کیے (و انزل لکم من الانعام ثمانیۃ ازواج)۔

آٹھ جوڑوں سے مراد گوسفند، بکری، اونٹ اور گائے کے نر اور مادہ ہیں۔ چونکہ لفظ "زوج" ہر جنس کے نر اور مادہ دونوں کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مجموعی طور پر یہ زوج ہوں گے (اگرچہ ہماری روزمرہ کی زبان میں "زوج" جوڑے کو کہا جاتا ہے، لیکن عربی زبان میں ایسا نہیں ہے) اسی لیے اس آیت کی ابتداء میں حضرت آدم کی بیوی کو زوج کہا گیا ہے۔

"انزل لکم" (تمھارے لیے نازل کیا) کی تعبیر، جو چوپایوں کے بارے میں ——— جیساکہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے ——— اوپر کی طرف سے نیچے کی طرف بھیجنے کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے موقع پر یہ لفظ "نزول مقامی" کے معنی میں ہوتا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی نعمت ہے جو برتر مقام اور بالاتر ہستی کی طرف سے پست تر مخلوق کو عطا کی گئی ہے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہاں "انزال" "نزل" (بروزن رسل) کے مادہ سے، مہمان کی پذیرائی کرنے یا اس پہلی چیز کے معنی میں ہے جو مہمان کی دعوت اور پذیرائی کے لیے لائی جائے۔ جیساکہ سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۱۹۸ میں جنتیوں کے بارے میں ہے۔

خالدین فیہا نزلاً من عند اللہ

وہ ہمیشہ ہمیشہ بہشت میں رہیں گے یہ خدا کی طرف سے پذیرائی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ چوپائے اگرچہ اوپر کی طرف سے نہیں اترتے لیکن ان کی حیات و پرورش کے مقدمات یعنی بارش کے حیات بخش قطرات اور سورج کی حیات بخش شعاعیں اوپر سے زمین کی طرف آتی ہیں۔

اس تعبیر کی ایک چوتھی تفسیر بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ابتداء میں تمام موجودات عالمِ غیب میں پروردگار کے علم و قدرت کے

---

[1] جلد ۴ کی طرف رجوع کریں۔

خزانے میں تھیں۔ اس کے بعد وہ مقامِ غیب سے مقامِ شہود و ظہور میں پہنچی ہیں۔ اس لیے اسے " انزال " سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ حجر کی آیہ ۲۱ میں ہے :

وان من شیء الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم

ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ایک معین و معلوم اندازے کے مطابق ہی اس میں سے نازل کرتے ہیں۔[1]

البتہ پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ اگرچہ ان تفاسیر کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ممکن ہے کہ یہ سب آیت کے مفہوم میں داخل ہوں۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علیؑ سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

انزاله ذالك خلقه اياه

چوپایوں کے آٹھ جوڑے نازل کرنے کا معنی خدا کی طرف سے ان کی خلقت ہی ہے۔

یہ حدیث بھی ظاہراً پہلی تفسیر کی طرف ہی اشارہ ہے۔ کیونکہ خدا کی طرف سے خلقت ایک ایسی خلقت ہے جو ایک برتر مقام کی طرف سے ہے۔

بہرحال اگرچہ موجودہ زمانے میں چوپایوں سے حمل و نقل کا بہت کم کام لیا جاتا ہے لیکن ان کے دوسرے اہم فائدے نہ صرف یہ کہ گزشتہ زمانے کی نسبت کم نہیں ہوئے بلکہ ان میں اور بھی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ آج بھی انسانوں کی غذا کا بہترین حصہ چوپایوں ہی کے دودھ اور گوشت سے حاصل ہوتا ہے، جبکہ لباس اور دوسری ضروریاتِ زندگی بھی انھی کے بالوں اور چمڑے سے تیار کی جاتی ہیں۔ اسی بنا پر دنیا کے بڑے بڑے ممالک کی آمدنی کا ایک اہم حصہ انھیں جانوروں کی پرورش سے صورت پذیر ہوتا ہے۔

اس کے بعد آفرینشِ الٰہی کے مختلف طریقوں میں سے ایک اور طریقہ کو بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے جنین کی خلقت کے مختلف مراحل۔ ارشاد ہوتا ہے : وہ تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تاریکیوں کے پردے میں ایک کے بعد دوسری خلقت، اور ایک کے بعد دوسری آفرینش عطا کرتا ہے (یخلقکم فی بطون امهاتکم خلقاً من بعد خلق فی ظلمات ثلاث)۔

یہ بات کہے بغیر ہی ظاہر ہے کہ " خلقاً من بعد خلق " سے مراد مکرر پے در پے اور یکے بعد دیگرے کئی خلقتیں ہیں نہ کہ صرف دو خلقتیں۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ "یخلقکم" اس بنا پر کہ فعل مضارع ہے، استمرار پر دلالت کرتا ہے اور جنین کے ایک دوسرے سے مختلف اور عجیب و غریب اور حیرت انگیز مرحلوں اور اس میں ان عجیب تبدیلیوں کے واقع ہونے کی طرف ایک مختصر اور پُر معنی اشارہ ہے، جو ماں کے پیٹ میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جنین شناس علماء کے بقول یہ سب کچھ پروردگار کی آفرینش کے نمونوں میں سے عجیب ترین اور ظریف ترین ہے۔ یہاں تک کہ جنین شناسی کا علم، توحید اور خدا شناسی کا ایک مکمل دورہ شمار ہوتا ہے اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو

---

[1] تفسیر المیزان " روح المعانی " زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

ان مسائل کی باریکیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی ان کے پیدا کرنے والے کی حمد وستائش نہ کرنے لگیں۔

"ظلمات ثلاث" (تین تاریکیوں) کی تعبیر، شکم مادر کی تاریکی، رحم کی تاریکی اور مشیمہ (وہ مخصوص تھیلی جس میں جنین ہوتا ہے) کی تاریکی ہے جو حقیقت میں تین ضخیم اور دبیز پردے ہیں جو "جنین" کے اوپر پلٹے ہوئے ہیں۔

عام تصویر بنانے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مکمل نور اور روشنی کے سامنے تصویر بنائیں لیکن انسان کا پیدا کرنے والا اس عجیب اندھیری جگہ میں پانی پر اس طرح نقش ونگار اور تصویر بناتا ہے کہ سب اسے دیکھ کر محو ہوجاتے ہیں اور ایسے مقام پر جہاں کسی بھی قسم کی دسترس کسی کی طرف سے نہیں ہے، اس کی روزی اور رزق لگاتار پہنچاتا ہے تاکہ وہ تیزی کے ساتھ نشو ونما پاتے اور اس وقت اس امر کا وہ سخت محتاج ہوتا ہے۔

سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی ایک مشہور دعائے عرفہ ہے جو درس توحید کا ایک کامل و عالی دورہ ہے اس میں آپ خدا کی نعمتوں اور اس کی قدرتوں کو شمار کرتے وقت اس کی بارگاہ میں اس طرح عرض کرتے ہیں:

وابتدعت خلقی من منی یمنی، ثم اسکنتنی فی ظلمات ثلاث بین لحم وجلد و دم، لم تشہر بخلقی، ولم تجعل الی شیئا من امری، ثم اخرجتنی الی الدنیا تاما سویا

میری خلقت وآفرینش کی ابتداء منی کے ناچیز قطرات سے قرار دی۔ پھر مجھے تین تاریکیوں کے اندر گوشت، پوست اور خون کے درمیان ساکت کر دیا۔ میری خلقت کو تونے آشکار نہیں کیا اور اس پوشیدہ جگہ پر میری خلقت کو مختلف مراحل میں جاری رکھا اور میری زندگی کے امور میں سے کسی ایک کو بھی میرے سپرد نہیں کیا۔ پھر مجھے کامل و سالم دنیا میں منتقل کر دیا[1]

(جنین کے دور اور اس کے مختلف مراحل کی خلقت کے بارے میں جلد ۲ میں سورۂ آل عمران کی آیہ ۶ کے ذیل میں اور جلد ۷ میں سورۂ حج کی آیہ ۵ کے ذیل میں ہم نے گفتگو کی ہے۔)

تین توحیدی حلقوں انسانوں کی خلقت، چوپایوں کی پیدائش اور جنین کی مختلف حالتوں اور مرحلوں کے بارے میں بیان کرنے کے بعد آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ ہے تمہارا پروردگار خدا، تمام عالم ہستی کی حکومت اسی کے لیے ہے، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر (ایسے میں) تم راہ حق سے کس طرح منحرف ہوتے ہو (ذالکم اللہ ربکم لہ الملک لا الہ الا ہو فانی تصرفون)۔

گویا انسان کو توحید کے ان عظیم آثار کے مشاہدہ کے بعد پروردگار کے مقام شہود تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد اپنی مقدس ذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ ہے تمہارا خدا، معبود اور پروردگار، اور واقعاً اگر چشم بینا ہو تو اسے ان آثار کی اوٹ میں اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔ سر والی آنکھ تو آثار کو دیکھتی ہے اور دل والی آنکھ آثار کے پیدا کرنے والے کو۔ ؎

باصد ہزار جلوہ برون آمدی کہ من
باصد ہزار دیدہ تماشا کنم ترا

---

[1] دعائے عرفہ (مصباح الزائر ابن طاؤس)

تُو تو ایک لاکھ جلووں کے ساتھ باہر آیا ہے اور میں بھی ایک لاکھ آنکھوں سے تجھے دیکھ رہا ہوں۔

"ربکم" کی تعبیر اور اسی طرح "له الملك" کی تعبیر حقیقت میں خدا کی ذاتِ پاک ہی میں معبود منحصر ہونے کی ایک دلیل ہے جو" لا الٰه الّا هو "میں بیان ہوئی ہے۔ (غور کیجیے گا)

جب خالق وہی ہے تو مالک و مربی بھی وہی ہے، تمام عالم ہستی کی مالکیت بھی اسی کے لیے ہے۔ پھر اس کے سوا کسی اور کا کون سا نقش ہے کہ اسے عبودیت کے لائق سمجھا جائے ؟

یہ وہ منزل ہے کہ گویا وہ ایک سوئی ہوئی جماعت اور ایک غافل اور ہر چیز سے بے خبر گروہ کو پکار کر کہتا ہے، فانّٰی تصرفون۔ اس حالت میں تم کس طرح غافل ہوئے اور راہِ توحید سے منحرف ہو گئے ہو۔[1]

پروردگار کی ان عظیم نعمتوں کے ذکر کے بعد اگلی آیت میں شکر و کفران کے حوالے سے اس کے مختلف پہلوؤں کو مورد مطالعہ قرار دیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: تمھارے کفران اور شکر کا نتیجہ تمھاری ہی طرف لوٹتا ہے اور اگر تم کفران کرو گے تو خدا تم سے بے نیاز ہے (اور اسی طرح اگر تم اس کی نعمت کا شکر بجالاؤ گے تو اسے اس کی بھی احتیاج نہیں ہے) (ان تکفروا فان الله غنیّ عنکم)۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: پروردگار کی یہ بے نیازی اور غنا اس سے مانع نہیں ہے کہ تمھیں شکر کا ذمہ دار قرار دے اور کفران سے روک دے۔ چونکہ فریضۂ خود ایک لطف اور ایک دوسری نعمت ہے۔ ہاں! وہ اپنے بندوں سے ہرگز کفرانِ نعمت پسند نہیں کرتا اور اگر اس کا شکر بجالاؤ تو وہ یہ تمھارے لیے پسند کرتا ہے (ولا یرضٰی لعباده الکفر وان تشکروا یرضه لکم)۔[2]

ان دو مطالب کو بیان کرنے کے بعد اس سلسلے کا تیسرا مسئلہ پیش کیا گیا ہے اور وہ ہے ہر شخص کی اس کے اپنے عمل پر باز پرس۔ کیونکہ "ذمہ داری اور تکلیف" کا مسئلہ اس مطلب کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے: کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا (ولا تزر وازرة وزر اخرٰی)۔

اور چونکہ ذمہ داری جزاء و سزا کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لہٰذا چوتھے مرحلے میں معاد کے مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پھر تم سب کی واپسی تمھارے پروردگار کی طرف ہوگی اور وہ تمھیں ان چیزوں سے آگاہ کرے گا جنھیں تم انجام دیا کرتے تھے (ثم الٰی ربکم مرجعکم فینبئکم بما کنتم تعملون)۔

اور چونکہ محاسبہ اور جزا کا مسئلہ پوشیدہ بھیدوں سے آگاہی کے بغیر ممکن نہیں ہے لہٰذا آیت کو اس جملے پر ختم کیا گیا ہے۔

"وہ ان تمام باتوں سے آگاہ ہے جو سینوں میں چھپی ہوئی ہیں اور جو کچھ سینوں پر حکم فرما ہے (انه علیم بذات الصدور)۔

---

[1] توجہ رکھیں کہ "انّٰی" کبھی "این" (کہاں) اور کبھی "کیف" (کس طرح) کے معنی میں آتا ہے۔

[2] لفظ "یرضه" مشہور قرأت میں ہاء کی پیش کے ساتھ ضمیر کے اشباع کے بغیر پڑھا جاتا ہے کیونکہ اصل میں یہ "یرضاه" تھا۔ الف جزم کی وجہ سے گر گیا اور "یرضه" ہو گیا ہے۔ ضمنی طور پر توجہ رکھنا چاہیے کہ ضمیر شکر کی طرف لوٹتی ہے۔ اگرچہ قبل کی عبارت میں شکر کا لفظ صراحت کے ساتھ نہیں آیا لیکن "ان تشکروا" اس پر دلالت کرتا ہے جیسے "اعدلوا هو اقرب للتقوٰی" کی ضمیر عدالت کی طرف لوٹتی ہے۔

اس طرح سے ذمہ داری اور اس کی خصوصیات اور اسی طرح انسانوں کی مسئولیت اور جزا و سزا کا فلسفہ مجموعی طور پر مختصر جملوں میں ایک نظم و ترتیب کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

ضمنی طور پر یہ آیت مکتب جبر و اکراہ کے طرفداروں کا ایک دندان شکن جواب ہے۔ باعث افسوس ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں میں کم نہیں ہیں۔ صراحت کے ساتھ قرآن کہتا ہے، وہ اپنے بندوں کے کفران کرنے پر ہرگز راضی نہیں ہے۔ یہ بات خود ایک واضح دلیل ہے کہ اس نے کافروں کے بارے میں کبھی بھی کفر کا ارادہ نہیں کیا ہے (جیسا کہ مکتب جبر کے پیروکار کہتے ہیں) کیونکہ جب وہ کسی چیز سے راضی نہیں ہے تو یقیناً اس کا ارادہ بھی نہیں کرے گا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کا ارادہ اس کی رضا سے جُدا ہو؟

تعجب تو ان متعصب لوگوں پر ہے جو اس واضح عبارت پر پردہ پوشی کرنے کے لیے چاہتے ہیں کہ لفظ "عباد" کو مومنین یا معصومین میں محصور کر دیں۔ حالانکہ یہ لفظ مطلق ہے اور واضح طور پر تمام بندوں کے لیے ہے۔ ہاں! خدا کفر و کفران اپنے بندوں میں سے کسی کے لیے بھی پسند نہیں کرتا۔ جیسا کہ بغیر کسی استثناء کے ان سب کے لیے شکر کو پسند کرتا ہے[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہر شخص کی، اس کے اعمال کے مقابلہ میں اصل مسئولیت، منطقی اصول کے مطابق اور تمام ادیان آسمانی کے مسلمات میں سے ہے[2]

البتہ کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کسی دوسرے کے جرم میں شریک ہو لیکن یہ اس صورت میں ہے جبکہ وہ کسی طرح سے اس عمل کے مقدمات یا خود اس عمل کے ایجاد کرنے میں دخل رکھتا ہو۔ ان لوگوں کے مانند جو کوئی بُری بدعت قائم کر جاتے ہیں یا کسی قبیح و غلط رسم کی بنیاد ڈال جاتے ہیں۔ تو جو شخص بھی اس پر عمل کرے گا، اس کا گناہ "مسبب اصلی" کے لیے بھی لکھا جائے گا۔ بغیر اس کے کہ اس پر عمل کرنے والوں کے گناہ میں کسی چیز کی کمی ہو[3]

---

[1] "شکر" اس کی اہمیت، اس کا فلسفہ، اس کا مفہوم حقیقی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ہم جلد ۶ میں سورۂ ابراہیم کی آیہ ۵ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

[2] اس سلسلے میں بھی جلد ۶ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۱۵ کے ذیل میں گفتگو ہو چکی ہے۔

[3] اس سلسلے میں بھی جلد ۳ میں سورۂ انعام کی آیہ ۶۴ کے ذیل میں ہم نے بحث کی ہے۔

۸۔ وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۝

۹۔ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ ع

ترجمہ

۸۔ جس وقت انسان کو کوئی ضرر پہنچتا ہے تو پھر وہ اپنے پروردگار کو پکارتا ہے اور اس کی طرف رجوع کرتا ہے لیکن جب وہ اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا کرے تو وہ اس بات کو جس کے لیے وہ پہلے خدا کو پکارتا تھا بھول جاتا ہے اور خدا کے لیے شریک و امثال قرار دینے لگتا ہے تاکہ لوگوں کو اس کی راہ سے منحرف کر دے۔ کہہ دے کہ چند دن کے لیے اپنے کفر سے فائدہ اٹھا لے، کیونکہ آخر تو اصحابِ جہنم میں سے ہے۔

۹۔ کیا ایسے شخص کی کوئی قدر و قیمت ہے یا اس شخص کی جو رات کی گھڑیوں میں عبادت میں مشغول رہتا ہے اور سجدہ و قیام کی حالت میں رہتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہے۔ کہہ دے کہ کیا علم والے اور بے علم برابر ہیں، صرف صاحبانِ عقل و فہم ہی اس بات کو سمجھتے ہیں۔

تفسیر

کیا عالم و جاہل برابر ہیں؟

گزشتہ آیات میں توحید استدلالی اور آفاق و انفس میں عظمتِ خدا کی نشانیوں کے حوالے سے معرفتِ پروردگار کے متعلق گفتگو تھی۔ زیرِ بحث آیات میں پہلے توحید فطری کی بات کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ انسان عقل و خرد اور نظامِ آفرینش کے مطالعے سے جو کچھ درک کرتا ہے وہ فطری طور پر اس کی روح کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ مشکلات اور حوادث کے طوفانوں میں یہ توحیدِ فطری خود کو ظاہر کر دیتی ہے لیکن فراموش کار انسان طوفانِ حوادث گزر جانے کے بعد دوبارہ غفلت و غرور میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

فرمایا گیا ہے: جس وقت انسان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے (تو نورِ توحید اس کے دل میں جگمگا اٹھتا ہے اور وہ) اپنے پروردگار کو پکارتا ہے۔ اس حال میں وہ اسی کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنے گناہ اور غفلت پر پشیمان ہوتا ہے (و اذا مس الانسان ضر دعا ربہ منیبًا الیہ)۔

لیکن جب خدا اپنی طرف سے کوئی نعمت اسے عطا کرتا ہے تو وہ گزشتہ ابتلاء اور مشکلات کو بھول جاتا ہے جن کی وجہ سے لطفِ الٰہی کے دامن سے وابستہ ہوا (ثم اذا خولہ نعمۃ منہ نسی ما کان یدعوا الیہ من قبل)[1]

وہ خدا کے لیے شریک اور شبیہ بنا لیتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں تاکہ اپنی گمراہی کے علاوہ لوگوں کو بھی راہِ خدا سے منحرف کردیں (وجعل للّٰہ اندادًا لیضل عن سبیلہ)۔

یہاں انسان سے مراد عام انسان اور انبیاء کی تعلیمات کے سائے میں تربیت نہ پانے والے انسان ہیں۔ ورنہ مردانِ حق کے ہاتھوں تربیت پانے والے انسان خود ان کی طرح "سراء" و "ضراء" میں تکالیف و راحت میں اور ناکامیوں اور کامیابیوں میں ہمیشہ اس کی یاد میں رہتے ہیں اور اس کے دامنِ لطف سے وابستہ رہتے ہیں۔

یہاں "ضر" سے مراد ہر قسم کا گزند، نقصان، ناراحتی اور تکلیف ہے چاہے وہ جسمانی پہلو سے ہو یا روحانی سے۔

---

[1] "نسی ما کان یدعوا الیہ" میں "ما" کیا معنی دیتا ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بحث ہے۔ ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ یہ "ما" "موصولہ" ہے اور "ضر" کی طرف اشارہ ہے (یہ معنی تمام معانی میں سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے، اور سطور بالا میں ہم نے اسی کو انتخاب کیا ہے)۔ بعض اسے "اللہ" کے معنی میں لیتے ہیں۔ بعض اسے "ما مصدریہ" اور دعاء کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ سورۂ یونس کی آیہ ۱۲ میں ہے۔

و اذا مس الانسان الضر دعانا لجنبہ او قاعدًا او قائمًا فلما کشفنا عنہ ضرہ مر کان لم یدعنا الی ضر مسہ

اس میں غور کیا جائے تو یہ آیت بھی ہمارے مذکورہ پہلے معنی کے لیے ایک شاہد ہے۔

"خوّله" "خول" (بروزن "عمل") کے مادہ سے، کسی چیز سے سرکشی اور ہمیشہ کی پریشانی کے معنی میں ہے اور چونکہ اس قسم کی مخصوص توجہ کا لازمہ عطا و بخشش ہے۔ اس لیے یہ مادہ "بخشنے" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ایک گروہ نے یہ بھی کہا ہے کہ "خول" (بروزن "عمل") خدمت گزاری کے معنی میں بھی آیا ہے اس بنا پر "خوّله" کا معنی یہ ہوگا کہ "اسے خدمت گزار بخشا" اور پھر ہر قسم کی نعمت بخشنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

بعض نے اس مادہ کو فخر و مباہات کے معنی میں سمجھا ہے۔ اس بنا پر مذکورہ جملے کا مطلب ہے کسی کو عطائے نعمت کے ذریعے مفتخر بنانا[1]

مجموعی طور پر یہ جملہ عطا و بخشش کے علاوہ خدا کی خاص توجہ اور عنایت کو بھی بیان کرتا ہے۔

"منیبًا الیه" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان سخت حالات میں جبکہ غرور و غفلت کے تمام پردے ہٹ جاتے ہیں، تو خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے اس سب کو چھوڑ کر خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اور "انابة" اور بازگشت کے مفہوم میں یہ حقیقت بھی چھپی ہوئی ہے کہ انسان کا اصلی مقام اور اس کا مبداء و مقصد بھی خدا ہی تھا۔

"انداد" "ند" (بروزن "ضد") کی جمع ہے اور مثل و مانند کے معنی میں ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ "مثل" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ لیکن "ند" کسی چیز کی حقیقت اور اس کے جوہر میں مماثلت کے معنی میں ہے۔

"جعل" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان اپنے وہم و گمان اور خیالِ خام سے خدا کے لیے مثل و مانند تراشتا ہے اور جعل کرتا ہے یعنی وہ چیز جو کسی طرح بھی حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتی۔

"لیضل عن سبیله" اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مغرور و گمراہ لوگ صرف اپنی ہی گمراہی پر بس نہیں کرتے بلکہ وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس وادی کی طرف کھینچ لے جائیں۔

بہر حال قرآن مجید کی آیات میں توحید فطری اور زندگی کے سخت حوادث کا ربط بار ہا بیان کیا گیا ہے، کیونکہ یہ حوادث اس کی تجلی گاہ ہیں ـــــ نیز اس مغرور انسان کی بدل جانے والی حالت اور کم ظرفی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ انسان طوفانوں میں تو توحیدِ خالص اور رنگِ الٰہی کو اپنا لیتا ہے اور طوفان کے رکتے ہی اس رنگ کو بدل دیتا ہے، یا وہ ہٹ دھرمی سے شرک کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے۔

ایسے متلون مزاج افراد کس قدر زیادہ ہیں اور ایسے لوگ کتنے کم ہیں کہ جن میں کامیابیاں نعمتیں، راحت و آرام اور طوفانِ حوادث کسی قسم کا کوئی تغیر پیدا نہیں کرتے۔

ہاں! ایک پانی کا برتن یا ایک چھوٹا سا لوٹا معمولی سی ہوا سے الٹ جاتا ہے لیکن ایک بڑا سمندر اپنی عظمت کی وجہ سے سخت طوفانوں کے مقابلے میں بھی اپنی جگہ پر رہتا ہے اور اسی وجہ سے اس نے اپنے لیے آرام کا نام اپنایا ہوا ہے۔

آیت کے آخر میں ایسے انسان کو صریح، قاطع اور زوردار تہدید کے ساتھ مخاطب کرنے کے لیے قرآن کہتا ہے: اس سے کہہ دے:

---

[1] لسان العرب، مفردات راغب اور تفسیر روح المعانی کی طرف رجوع کریں۔

تو اپنے کفر اور کفران سے تھوڑا سا فائدہ اٹھا لے، چند دن اور غفلت اور غرور میں بسر کرلے لیکن یہ جان لے کہ آخرکار تو اصحابِ دوزخ سے ہے (قل تمتع بکفرک قلیلاً انک من اصحاب النار)۔

کیا اس قسم کے کوتاہ فکر گمراہ اور گمراہ کرنے والے انسان کا انجام اس کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتا ہے؟

بعد والی آیت میں موازنہ کیا جارہا ہے اور یہ مختلف مسائل سمجھانے میں قرآن کی جانی پہچانی روش ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا ایسا شخص قدر و قیمت والا ہے یا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں پروردگار کی عبادت اور سجدہ و قیام میں مشغول رہتا ہے، اس کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے۔ عذابِ آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کی امید رکھتا ہے (امّن ھو قانت اٰناء اللیل ساجداً و قائماً یحذر الاٰخرۃ و یرجوا رحمۃ ربہ)[1]

کہاں وہ مشرک و فراموش کار، متلون مزاج، گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا انسان اور کہاں یہ بیدار، نورانی اور باصفا دل والا انسان۔ کہ جس وقت رات کی تاریکی میں غافلوں کی آنکھیں نیند میں بند ہوتی ہیں، وہ اپنی پیشانی کو اپنے محبوب کی چوکھٹ پر رکھے ہوئے ہوتا ہے اور خوف و رجاء کے ساتھ اسے پکار رہا ہوتا ہے۔

ایسے افراد نہ تو نعمت کے وقت اپنے آپ کو سزا سے امان میں سمجھتے ہیں اور نہ ہی بلاء و مصیبت کے وقت اس کی رحمت سے قطع امید کرتے ہیں اور یہ دونوں عوامل ان کے وجود کو ہمیشہ اور مسلسل متحرک رکھتے ہوئے ہوش اور احتیاط کے ساتھ، دوست کی طرف لے جاتے ہیں۔

"قانت" "قنوت" کے مادہ سے، خضوع کے ساتھ اطاعت میں لگے رہنے کے معنی میں ہے۔

"آناء" "انا" (بروزن "صدا" و "فنا") کی جمع ہے۔ ساعت اور وقت کی کچھ مقدار کے معنی میں ہے۔

رات کی ساعت اور گھڑی کا ذکر اس بنا پر ہے کہ اس وقت حضورِ قلب زیادہ اور ریا سے آلودگی دیگر اوقات کی نسبت بہت کم ہوتی ہے۔

"ساجداً" کو "قائماً" پر اس وجہ سے مقدم رکھا ہے کیونکہ سجدہ عبادت کا بالاتر مرحلہ ہے۔ نیز رحمت کا مطلق ہونا اور اس کا آخرت کے ساتھ مشروط نہ ہونا، خدا کی رحمت کی وسعت اور دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں اس کی موجودگی کی دلیل ہے۔

ایک حدیث میں جو علل الشرائع میں امام باقرؑ سے اور اسی طرح کتابِ کافی میں آپ ہی سے نقل ہوئی ہے، بیان ہوا ہے کہ یہ آیت (امّن ھو قانت اٰناء اللیل) نمازِ شب کے معنی میں ہے[2]

یہ بات واضح ہے کہ یہ تفسیر بھی بہت سی دوسری تفاسیر کی طرح ویسے ہی ایک واضح مصداق کے مانند ہے جیسے قرآن کی مختلف آیات کے

---

[1] اس جملے میں محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے:
اھٰذا الذی ذکرناہ خیر امّن ھو قانت اٰناء اللیل ....

[2] علل الشرائع اور کافی (نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۷۹ کے مطابق)

ذیل میں مصداق کے طور پر تفاسیر بیان ہوئی ہیں اور یہ آیت کے مفہوم کو نمازِ شب میں محدود نہیں کرتی۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کہہ دے کہ کیا علم والے اور بے علم برابر ہوتے ہیں (قل هل يستوى الذين يعلمون و الذين لا يعلمون)۔

نہیں! وہ یکساں نہیں ہیں۔ "صرف صاحبانِ فکر ونظر ہی ان سے متوجہ ہوتے ہیں" (انما يتذكر اولوا الالباب)۔

اگرچہ مذکورہ سوال ایک وسیع سوال ہے اور آگاہ و ناآگاہ اور صاحبانِ علم اور بے علم لوگوں کے درمیان ایک واضح موازنہ ہے۔ لیکن اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس سوال سے پہلے ایک اور سوال ہے اور وہ ہے مشرکین کے مومنین شب زندہ دار کے برابر نہ ہونے کے بارے میں۔ اس لیے دوسرا سوال بھی زیادہ تر اسی مسئلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ یہ ہٹ دھرم اور دل کے اندھے مشرک، ان پاک و روشن ضمیر اور مخلص مومنین کے برابر نہیں ہیں۔ کیا وہ ان افراد کے مساوی ہیں جو اس واضح و روشن حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں؟

بہرحال یہ جملہ جو استفہام انکاری سے شروع ہوا ہے اور اسلام کے اساسی اور بنیادی شعاروں میں سے ہے، جاہلوں کے مقابلے میں علم اور علماء کے مقام کی عظمت کو واضح کرتا ہے اور چونکہ یہ نابرابری مطلق صورت میں ذکر ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں گروہ نہ تو بارگاہِ خدا میں یکساں ہیں اور نہ ہی آگاہ مخلوق کی نظر میں، نہ دنیا میں ایک صف میں کھڑے ہوسکتے ہیں اور نہ ہی آخرت میں، نہ ظاہر میں یکساں ہیں اور نہ ہی باطن میں۔

چند اہم نکات

ان دونوں آیتوں میں چند عمدہ نکات کی طرف کچھ لطیف اشارے موجود ہیں، جو تھوڑا سا غور کرنے پر واضح ہو جاتے ہیں ——— مثلاً۔

۱۔ پہلی آیت میں تلخ و ناگوار واقعات، دل کی آنکھ کے سامنے سے غرور و غفلت کے پردوں کے ہٹنے، نورِ ایمان کے جلوہ گر ہونے اور پروردگار کی طرف بازگشت اور توبہ وانابت کا ایک فلسفہ بیان ہوا ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے ایک جواب ہے جو زندگی کے تلخ حوادث کو پروردگار کی عدالت یا نظامِ آفرینش پر ایک اعتراض کی بات سمجھتے ہیں۔

۲۔ دوسری آیت عمل اور خود سازی کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور علم و معرفت پر جا کر ختم ہوتی ہے، کیونکہ جب تک خود سازی نہ ہو اس وقت تک نورِ معرفت دل میں نہیں چمکتا اور اصولی طور پر یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔

۳۔ "قانت آناء الليل" کی تعبیر جو اسمِ فاعل کی صورت میں آئی ہے "الليل" کے لفظ کے مطلق ہونے کی طرف

توجہ کرتے ہوئے ان کی خدا کی بارگاہ میں، عبودیت وخضوع کے دوام واستمرار کی دلیل ہے، کیونکہ اگر عمل میں دوام نہ ہو تو اس کی تاثیر بہت کم ہوتی ہے۔

۴۔ اضطراری علم وآگاہی، جو نزولِ بلا کے وقت حاصل ہوتی ہے اور انسان کا مبدءِ آفرینش کے ساتھ رشتہ قائم کردیتی ہے، اسی صورت میں علم کا مصداق بنتی ہے جبکہ وہ طوفان یا مشکل ختم ہونے پر بھی برقرار رہے۔ لہٰذا زیرِ بحث آیات ان لوگوں کو جاہلوں میں سے قرار دیتی ہیں جو بلاء ومصیبت کے وقت تو بیدار ہوجاتے ہیں لیکن اس کے بعد پھر فراموشی میں غرق ہوجاتے ہیں۔ اس بنا پر حقیقی عالم وہ ہیں جو ہر حالت میں اس کی طرف توجہ رکھتے ہیں۔

۵۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے: علم اور جہالت کے فرق کو بھی صاحبانِ فکر ونظر ہی سمجھتے ہیں کیونکہ جاہل تو علم کی قدر وقیمت کو جانتا ہی نہیں ہے۔ حقیقت میں علم کا ہر مرحلہ دوسرے مرحلے کے لیے مقدمہ اور تمہید ہے۔

۶۔ اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیات میں علم کا معنی چند ایک اصطلاحات یا اشیاء کے درمیان مادی روابط اور اصطلاح کے مطابق مروّجہ علوم نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ایک خاص معرفت اور آگاہی ہے جو انسان کو " قنوت " یعنی پروردگار کی اطاعت، اس کی عدالت کا خوف اور اس کی رحمت کی امید کی طرف دعوت دیتی ہے۔ یہ ہے علم کی حقیقت اور مروّجہ علوم بھی اگر اس قسم کی معرفت کے لیے کارآمد ہوں تو علم ہیں اور اگر غرور وغفلت اور ظلم وفساد فی الارض کا سبب بنیں اور ان سے مذکورہ کیفیت اور خاص حالت حاصل نہ ہو تو پھر وہ قیل وقال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

۷۔ جو کچھ بے خبر لوگ خیال کرتے ہیں اور مذہب کو افیون سمجھتے ہیں، اس کے برخلاف انبیاء کی اہم ترین دعوت علم ودانش کی طرف ہی تھی اور انھوں نے جہالت سے اپنی بیزاری کا ہر جگہ اعلان کیا ہے۔ آیاتِ قرآنی نے اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ہر موقع سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ روایاتِ اسلامی میں بھی بہت سی ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں کہ جن سے بالاتر علم کی اہمیت کا تصور نہیں ہوسکتا۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ اسلام سے منقول ہے:

لاخیر فی العیش الا لرجلین عالم مطاع او مستمع واع

زندگی کا سوائے دو اشخاص کے کوئی فائدہ نہیں ہے ایک وہ عالم جس کے نظریات وتعلیمات کا اجراء ہو اور دوسرے وہ طالب علم جو عالم کی بات کو کان دھر کے سُنے[1]

---

[1] کافی، جلد اوّل، باب " صفۃ العلم وفضلہ " حدیث،

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

ان العلماء ورثة الانبياء وذاك ان الانبياء لم يورثوا درهما ولا ديناراً، وانما اورثوا احاديث من احاديثهم، فمن اخذ بشيء منها فقد اخذ حظا وافرا، فانظروا علمكم هذا عمن تأخذونه فان فينا اهل البيت في كل خلف عدولا ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتأويل الجاهلين

علماء انبیاء کے وارث ہیں کیونکہ انبیاء درہم و دینار اپنی یادگار کے طور پر نہیں چھوڑتے، بلکہ علوم و احادیث ان کی یادگار ہوتی ہیں جس شخص کے پاس اس میں سے کچھ حصہ ہو اس کے پاس میراثِ انبیاء کا فراواں حصہ ہے۔ اس کے بعد امامؑ مزید فرماتے ہیں: اب تم دیکھو کہ تم اپنا علم کس شخص سے اخذ کر رہے ہو (واقعی علماء سے یا علماءِ نما سے) جان لو کہ ہم اہلِ بیت میں سے ہر زمانے میں عادل اور قابلِ اعتماد افراد موجود رہتے ہیں جو غلو اور تجاوز کرنے والوں کی تحریف اور منحرف لوگوں کے بے بنیاد دعووں اور جاہلوں کی توجیہات کی اس پاک دین سے نفی کرتے ہیں[1]

۸۔ آخری آیت میں تین گروہوں کے بارے میں بات ہو رہی ہے: علماء، جہلاء اور اولوالالباب۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے ان تینوں گروہوں کی تفسیر میں بیان ہوا ہے:

نحن الذين يعلمون وعدونا الذين لا يعلمون وشيعتنا اولوا الالباب

عالم تو ہم ہیں اور ہمارے دشمن جاہل ہیں اور ہمارے شیعہ اولوالالباب ہیں[2]

یہ بات واضح ہے کہ یہ تفسیر آیت کے واضح مصداق کے بیان کے طور پر ہے اور آیت کے مفہوم کی عمومیت کی نفی نہیں کرتی۔

۹۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ امیر المومنین علیؑ ایک رات مسجد کوفہ سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے جبکہ کمیل بن زیاد کہ جو آپ کے خاص دوستوں میں سے تھے، آپؑ کے ساتھ ساتھ تھے۔ اثنائے راہ میں ایک شخص کے گھر کے قریب سے گزرے، گھر سے قرآن کی تلاوت کی آواز آرہی تھی اور وہ اس آیت کو دلنشیں اور دلگداز آواز کے ساتھ پڑھ رہا تھا: اٰمّن ھو قانت اٰناء اللیل ......

کمیل دل ہی دل میں اس شخص کی حالت پر بہت خوش ہوئے اور اس کی روحانیت پر مسرور ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ زبان سے کچھ کہتے، امامؑ نے کمیل کی طرف رُخ کیا اور فرمایا: اس شخص کی صدا تیرے لیے باعثِ حیرت نہ ہو، یہ شخص اہلِ دوزخ میں سے ہے اور میں عنقریب تجھے اس کی خبر دوں گا۔

---

[1] کافی، جلد اول باب "صفۃ العلم وفضلہ" حدیث ۲

[2] تفسیر مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

کمیل اس پر تعجب میں ڈوب گئے۔ پہلی بات تو یہ کہ امامؑ نے بہت جلدی کمیل کی فکر اور نیت کو جان لیا اور دوسری یہ کہ اس شخص کے دوزخی ہونے کی خبر دی جو ظاہری طور پر صالح نظر آتا تھا۔ کچھ مدت یونہی گزر گئی، یہاں تک کہ خوارج کا مسئلہ اس حد کو پہنچ گیا کہ وہ امیرالمومنینؑ کے مقابلے میں آکھڑے ہوئے اور حضرتؑ نے ان سے جنگ کی۔ حالانکہ وہ قرآن کو جس طرح کہ وہ نازل ہوا تھا حفظ کیے ہوئے تھے۔ امیرالمومنین علیؑ نے کمیل کی طرف رُخ کیا جبکہ تلوار آپؑ کے ہاتھ میں تھی اور ان سرکش کافروں کے سر زمین پر گر پڑے تھے، تو آپؑ نے شمشیر کی نوک سے ان میں سے ایک سر کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

اے کمیل! أمّن هو قانت أناء اللیل

یہ وہی شخص ہے جو اس رات قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔

اور اس کی حالت تجھے معلوم بھی ہوئی تھی اور اس کی حالت نے تیرے تعجب اور حیرت کو بڑھا دیا تھا۔ کمیل نے حضرت کا بوسہ لیا اور استغفار کی[1]

---

[1] "سفینۃ البحار" جلد ۲ ص ۴۹۶ حالات کمیل

۱۰۔ قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

۱۱۔ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ۙ

۱۲۔ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

۱۳۔ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

۱۴۔ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ۝ۙ

۱۵۔ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝

۱۶۔ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ۝

ترجمہ

۱۰۔ کہہ دے! اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے پروردگار (کی مخالفت) سے پرہیز کرو، جن لوگوں نے اس دنیا میں نیکی کی ہے ان کے لیے اچھا اجر ہے اور خدا کی زمین وسیع ہے (جس وقت کفر کے سرغنوں کا دباؤ تم پر بڑھ جائے تو دوسری جگہ ہجرت کر جاؤ) یقیناً صبر کرنے والے اپنا اجر بے حساب حاصل کریں گے۔

۱۱۔ کہہ دے: مجھے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں خدا ہی کی عبادت کروں، اس حال میں کہ اپنے دین کو اسی کے لیے خالص رکھوں۔

۱۲۔ اور مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ میں ہی سب سے پہلا (تسلیم کرنے والا) مسلمان بنوں۔

۱۳۔ کہہ دے: اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو میں قیامت کے عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

۱۴۔ کہہ دے: میں تو صرف خدا کی عبادت کرتا ہوں، اس حال میں کہ میں اپنے دین کو اس کیلیے خالص رکھتا ہوں۔

۱۵۔ تم اس کے بجائے جس کی چاہو پرستش کرو۔ کہہ دے: قیامت کے دن واقعی خسارے میں وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے خود اپنا اور اپنے وابستگان کا سرمایہ وجود گنوا دیا ہے۔ آگاہ رہو کہ یہی واضح خسارہ ہے۔

۱۶۔ ان کے لیے ان کے سر کے اوپر کی طرف بھی آگ کا سائبان ہوگا اور ان کے پاؤں کے نیچے سے بھی آگ کا سائبان ہوگا۔ یہ وہ چیز ہے جس سے خدا اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ اے میرے بندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔

تفسیر

مخلص بندوں کا طرزِ حیات

گزشتہ آیات میں مغرور مشرکین اور فرمانِ خدا کے مطیع مومنین کا فرق نیز علماء و جہلاء کے درمیان موازنہ کیا گیا تھا۔ اب زیرِ بحث آیات میں سچے اور مخلص بندوں کے طرزِ حیات میں سے سات دستوروں کا ذکر چند آیات میں سمو دیا گیا ہے اور ان میں سے ہر آیہ "قُل" سے شروع ہوتی ہے۔

پہلے تقویٰ کا ذکر ہے۔ پیغمبرِ اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے: کہہ دے: اے میرے مومن بندو! اپنے پروردگار سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو، (قل یاعباد الذین اٰمنوا اتقوا ربکم)[1]۔

ہاں تقویٰ یعنی خود کو گناہ سے بچانا اور حق تعالیٰ کی بارگاہ میں مسئولیت اور ذمہ داری کا احساس ہے۔ یہ خدا کے مومن بندوں کا پہلا کام ہے۔ تقویٰ جہنم کی آگ سے بچاؤ کے لیے ایک ڈھال ہے اور انحراف سے باز رکھنے کا ایک عامل ہے۔ تقویٰ بازارِ قیامت کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور پروردگار کی بارگاہ میں انسان کے مرتبہ و مقام کا معیار ہے۔

دوسرے حکم میں اس دنیا میں احسان اور نیکوکاری کا ذکر ہے، کیونکہ یہ دنیا دارِ عمل ہے۔ اس کے لیے احسان کا نتیجہ بیان کرکے لوگوں کو

---

[1] یہ بات واضح ہے کہ "یاعبادِ" کا خطاب خدا کی طرف سے ہے اور اگر اللہ پیغمبر اکرمؐ سے کہتا ہے کہ یہ بات کرو تو اس سے مراد یہ ہے کہ میری طرف سے انھیں خطاب کرو۔

اس کی تشویق دلائی گئی ہے، فرمایا گیا ہے: ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اس دنیا میں کوئی نیکی کی ہے، بہت بڑا اجر و ثواب ہے۔
(للذین احسنوا فی ھٰذہ الدنیا حسنۃ)[1]

ہاں اس دنیا میں دوستوں اور بیگانوں کے ساتھ گفتار میں، عمل میں، طرزِ فکر و نظر میں نیکوکاری کا نتیجہ دونوں جہان میں مطلق طور پر اجر کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، کیونکہ نیکی کا نتیجہ نیکی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

حقیقت میں تقویٰ تو ایک باز رکھنے والا عامل ہے اور احسان و نیکی حرکت پیدا کرنے والا عامل ہے جو مجموعی طور سے ترکِ گناہ اور فرائض و مستحبات کی انجام دہی دونوں پر مشتمل ہے۔

تیسرا حکم شرک و کفر اور گناہ سے آلودہ مراکز و مقامات سے "ہجرت" کرنے کی تشویق ہے۔ فرمایا گیا ہے: خدا کی زمین وسیع ہے (وارض اللہ واسعۃ)۔

درحقیقت یہ ان کمزور ارادے والے بہانہ جو افراد کے لیے جواب ہے جو کہتے تھے کہ ہم مشرکین کی حکومت کے تسلّط کی وجہ سے اپنے خدا کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی انجام دہی پر قادر نہیں ہیں۔ قرآن کہتا ہے: خدا کی سرزمین مکہ میں ہی محدود نہیں ہے، مکہ نہ ہوا تو مدینہ سہی، دنیا وسیع ہے، اپنے آپ کو حرکت دو اور شرک و کفر و خفقان والے مراکز سے نقل مکانی کر جاؤ کہ جو تمھیں آزادی اور انجام فرائض سے مانع ہیں۔ نقل مکانی کر جاؤ۔

مسئلہ ہجرت اہم ترین مسائل میں سے ہے، اس نے آغازِ اسلام میں حکومتِ اسلامی کی کامیابی کی تکمیل کی۔ اسی بنا پر تاریخ اسلام کی بنیاد اور سر آغاز بنا۔ دوسرے زمانوں میں بھی یہ مسئلہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ طریقہ ایک طرف تو مومنین کو دباؤ اور گھٹن کے سامنے جھکنے اور گھٹنے ٹیکنے سے باز رکھتا ہے اور دوسری طرف سے عالم کے مختلف حصّوں میں اسلام کے صدور کا عامل بھی ہے۔

قرآن مجید کہتا ہے:

> انّ الذین توفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم قالوا کنّا مستضعفین فی الارض قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃً فتھاجروا فیھا فاولٰئک مأواھم جھنم و ساءت مصیرًا۔ (نساء ۹۷)
>
> ظالموں اور مشرکوں کی روح قبض کرتے وقت قبضِ روح کرنے والے فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم کس حالت میں تھے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں: ہم مستضعف تھے اور اپنی سرزمین میں دباؤ اور سختی میں تھے لیکن فرشتے انھیں جواب دیتے ہیں: کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی، تم نے ہجرت کیوں نہ اختیار کی، ان کی جگہ جہنم ہے اور وہ کتنی بُری جگہ ہے۔

---

[1] اکثر مفسرین نے "فی ھٰذہ الدنیا" کو "احسنوا" سے متعلق قرار دیا ہے۔ اس بنا پر "حسنۃ" مطلق ہوگی اور ہر قسم کے اجر پر مشتمل ہوگی۔ خواہ وہ اس جہان میں ہو یا دوسرے جہان میں۔ نیز اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ایسے مقام پر تنوین عظمت کی دلیل ہے، اس اجر کی عظمت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

یہ چیز اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ ماحول کا دباؤ اور گھٹن، ایسے مقام پر جہاں سے ہجرت کرنا ممکن ہو۔ بارگاہ خداوندی میں عذر نہیں بن سکتا۔

(اسلام میں ہجرت کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۲ میں سورۂ نساء کی آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں اور جلد ۴ سورۂ انفال کی آیہ ۲، کے ذیل میں بحث کی جا چکی ہے۔)

چونکہ ہجرت سے عام طور پر زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں، اس لیے چوتھا حکم صبر و استقامت کا اس صورت میں بیان کیا گیا ہے: صبر کرنے والے اور استقامت دکھانے والے اپنا اجر و ثواب بے حساب حاصل کریں گے (انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب)۔[1]

"یوفی" کی تعبیر "وفی" سے اور اعطاء کامل کے معنی میں ہے اور "بغیر حساب" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ استقامت دکھانے والے صابر لوگ بارگاہ خداوندی سے برترین اور افضل ترین اجر پائیں گے اور کسی بھی عمل کی صبر و استقامت کے برابر اہمیت نہیں ہے۔

اس بات کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام صادقؑ نے رسول اللہؐ سے بیان فرمائی ہے۔

اذا نشرت الدواوین ونصبت الموازین، لم ینصب لاھل البلاء میزان، ولم ینشر لھم دیوان ثم تلا ھذہ الاٰیۃ: انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب

جس وقت اعمال نامے کھولے جائیں گے اور پروردگار کی عدالت کے ترازو نصب ہوں گے تو ایسے اشخاص کے لیے جو مصائب اور سخت حوادث میں گرفتار رہے ہیں اور انھوں نے استقامت سے کام لیا ہے، نہ تو وزن کے لیے میزان نصب ہوگی اور نہ ہی ان کا اعمال نامہ کھولا جائے گا۔

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے اپنی گفتگو کے شاہد کے عنوان سے مذکورہ بالا آیت کی تلاوت کی کہ خدا صابروں کو بے حساب اجر دے گا۔[2]

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کی پہلی ہجرت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس میں جعفر بن ابی طالب کی سرکردگی میں ایک بڑے گروہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ ہم نے یہ بارہا بیان کیا ہے کہ باوجود اس کے کہ شان نزول آیات کے مفاہیم کو واضح کرتی ہیں لیکن انھیں محدود نہیں کرتیں۔

پانچویں حکم میں اخلاص کے بارے میں شرک کے ہر شائبہ سے پاک اور خالص توحید کے متعلق گفتگو ہے لیکن یہاں گفتگو کا لب و لہجہ

---

[1] "بغیر حساب" ممکن ہے "یوفی" سے متعلق ہو یا "اجرھم" سے حال ہو لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

[2] "تفسیر مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں اور یہی معنی مختصر سے فرق کے ساتھ تفسیر قرطبی میں حسین بن علیؑ سے ان کے جد رسول اللہؐ سے نقل ہوا ہے۔

بدل جاتا ہے اور پیغمبرِ خدا اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: میں تو اس بات پر مامور ہوں کہ خدا ہی کی عبادت کروں، اس حال میں کہ میں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کیے رکھوں (قل انی امرت ان اعبد اللہ مخلصًا لہ الدین)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور میں اس بات پر مامور ہوں کہ میں پہلا مسلمان بنوں (و امرت لاَن اکون اوّل المسلمین)۔

یہاں پر چھٹا حکم یعنی اسلام اور فرمانِ خدا کے سامنے پوری طرح سرِ تسلیم خم کرنے میں سبقت کرنے کے بارے میں ہے۔

ساتواں اور آخری حکم قیامت کے دن خدا کی سزا سے متعلق ہے۔ یہ بھی اسی لب و لہجہ میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا گیا ہے، کہہ دے: اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو قیامت کے عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں (قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم)۔

یہ اس لیے ہے تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ پیغمبر بھی بندگانِ خدا میں سے ہیں، وہ بھی خالص طور سے عبادت کرنے پر مامور ہیں نہ وہ بھی خدا کے عذاب و سزا سے ڈرتے ہیں اور وہ بھی فرمانِ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مامور ہیں، بلکہ وہ دوسروں کی نسبت سنگین تر ذمہ داری رکھتے ہیں کہ وہ سب سے آگے بڑھ کر رہیں۔

وہ کبھی بھی مقام الوہیت کے مدعی اور عبادت کے راستے سے باہر قدم رکھنے کے دعویدار نہیں تھے بلکہ وہ تو اپنے مقام عبودیت پر فخر و مباہات کرتے تھے اور اسی بنا پر وہ ہر چیز میں نمونہ اور اسوہ ہیں۔

وہ ان جہات میں اپنے لیے دوسروں سے امتیاز کے قائل نہیں ہیں اور یہ بات خود ان کی عظمت اور حقانیت کی ایک واضح و روشن نشانی ہے۔ جھوٹے مدعیوں کی طرح نہیں جو دوسروں کو تو اپنی پرستش کی دعوت دیتے تھے اور اپنے آپ کو مافوق البشر اور ماورا گوہر کی حیثیت سے متعارف کرواتے تھے۔ ایسے لوگ بعض اوقات اپنے پیروکاروں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ انھیں ہر سال ان کے وزن کے برابر سونا اور جواہرات دیں۔

رسولؐ تو درحقیقت یہ فرماتے ہیں:

"میں ایسے سلاطینِ جابر کی طرح نہیں ہوں جو لوگوں کو تو کچھ ذمہ داریوں کی انجام دہی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں لیکن خود اپنے آپ کو ذمہ داری سے مافوق سمجھتے ہیں"

اور یہ حقیقت میں ایک اہم تربیتی مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ ہر مربی و رہبر کو اپنے مکتب کے احکام کی انجام دہی میں سب سے آگے قدم بڑھانا چاہیے۔ وہ اپنے آئین کا سب سے پہلا مومن، سب سے زیادہ کوشش کرنے والا اور سب سے زیادہ فداکاری کرنے والا ہونا چاہیے تاکہ لوگ اس کی صداقت پر ایمان لائیں اور اس کو ہر چیز میں اپنے لیے راہنما اور اسوہ سمجھیں۔

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا مسلمان ہونا نہ صرف زمانے کے لحاظ سے ہے، بلکہ تمام جہات میں آپ پہلے مسلمان تھے۔ ایمان کے لحاظ سے، اخلاص و عمل اور فداکاری کے اعتبار سے اور جہاد و استقامت کی جہت سے۔

پیغمبر اکرمؐ کی ساری زندگی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے۔

زیر بحث آیات میں سات احکام (تقویٰ، احسان، ہجرت، صبر، اخلاص تسلیم اور خوف) کے ذکر کے بعد مسئلہ اخلاص چونکہ خصوصیت کے ساتھ شرک کے مختلف اسباب وعوامل کے مقابلے میں ایک خصوصیت رکھتا ہے، لہٰذا تاکید کے لیے اسے دوبارہ بیان کیا گیا ہے اور اسی لب ولہجہ میں فرمایا گیا ہے: کہہ دے: میں تو خدا ہی کی عبادت کرتا ہوں اس حال میں کہ اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھتا ہوں (قل الله اعبد مخلصًا له دینی)[1]

لیکن تم اس کے علاوہ جس کی چاہو پرستش کرتے رہو (فاعبدوا ما شئتم من دونه)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کہہ دے! یہ نقصان اٹھانے والوں کا راستہ ہے، کیونکہ حقیقی زیاں کار وہی تو ہیں جو اپنی عمر اور وجود کا سرمایہ یہاں تک کہ اپنے وابستگان کو بھی قیامت کے دن ہاتھ سے گنوا بیٹھیں گے (قل ان الخاسرین الذین خسروا انفسهم واهلیهم یوم القیامة)۔

نہ تو انھوں نے اپنے وجود سے ہی کچھ فائدہ اٹھایا ہے اور نہ ہی سرمایۂ عمر سے کچھ حاصل کیا ہے، نہ ان کا خاندان اور اولاد ان کی نجات کا ذریعہ بنتے ہیں اور نہ ہی بارگاہ حق میں ان کی آبرو اور شفاعت کا سبب ہوتے ہیں۔

آگاہ رہو کہ واضح خسارہ یہی ہے (الا ذالك هو الخسران المبین)۔

آخری زیر بحث آیت میں ان کے ایک اور واضح خسارے اور نقصان کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے: ان کے لیے ان کے سروں کے اوپر آگ کے سائبان ہیں اور ان کے پاؤں کے نیچے بھی آگ کے سائبان ہیں (لهم من فوقهم ظلل من النار ومن تحتهم ظلل)۔

اس طرح سے وہ ہر طرف سے آگ کے شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس سے بالاتر اور کون سا خسران ہوگا اور اس سے بڑھ کر دردناک عذاب اور کیا ہوگا؟

"ظلل" جمع "ظله" (بروزن "قله") اس پردے کے معنی میں ہے جو اوپر کی طرف سے نصب ہو، اس بنا پر اس کا اس فرش پر اطلاق جو ان کے پاؤں کے نیچے بچھا ہوا ہے، ایک قسم کا مجازی اطلاق ہے اور اس لفظ کے مفہوم میں توسیع کے حوالے سے ہے۔

بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ چونکہ دوزخی جہنم کے کئی طبقات میں گرفتار ہوں گے اس لیے آگ کے پردے ان کے سروں کے اوپر بھی ہوں گے اور ان کے پاؤں کے نیچے بھی۔ اس لیے لفظ "ظلل" کا اطلاق نچلے پردوں پر بھی مجاز نہیں ہے۔

---

[1] "الله" کا مقدم ہونا جو کہ "اعبد" کا مفعول ہے یہاں "حصر" کے لیے ہے۔ یعنی میں صرف اسی کی عبادت کرتا ہوں اس بنا پر "مخلصًا له دینی" جو کہ حال ہے، اس معنی پر ایک نئی تاکید ہے۔

سورۂ عنکبوت کی آیہ ۵۵ اسی آیت کے مانند ہے ۔

یوم یغشٰھم العذاب من فوقھم ومن تحت ارجلھم و یقول ذوقوا ما کنتم تعملون

اس دن خدا کا عذاب انھیں سر کے اوپر سے بھی اور پاؤں کے نیچے سے بھی (ہر طرف سے) ڈھانپ لے گا اور ان سے کہے گا اس کا مزہ چکھو کہ جو تم کیا کرتے تھے ۔

یہ درحقیقت ان کے دنیا کے حالات کا تجسم ہے کہ جہالت وکفر وظلم نے ان کے تمام وجود کو گھیر رکھا تھا ، اور ہر طرف سے انھیں ڈھانپ لیا تھا ۔

اس کے بعد تاکید اور عبرت کے لیے مزید فرمایا گیا ہے : یہی تو وہ چیز ہے کہ جس سے خدا اپنے بندوں کو ڈراتا ہے ۔ جب ایسا ہے تو اے میرے بندو ! میری نافرمانی سے پرہیز کرو (ذالک یخوف اللہ بہ عبادہ یا عباد فاتقون) ۔

اس آیت میں "عباد" (بندے) کی تعبیر اور اس کی خدا کی طرف اضافت اور وہ بھی تکرار کے ساتھ ، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا عذاب کی کوئی تہدید کرتا ہے تو وہ بھی اس کے لطف ورحمت کی بنا پر ہے تاکہ بندگانِ حق اس قسم کے بُرے انجام میں گرفتار نہ ہوں ۔ یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس آیت میں "عباد" سے مراد خصوصیت کے ساتھ مومنین ہیں بلکہ یہ سب کے لیے ہے ، کیونکہ کسی شخص کو بھی اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے مامون نہیں سمجھنا چاہیے ۔

چند اہم نکات

۱۔ خُسران وزیاں کی حقیقت : خسران ــــ جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے : ــــ

اصل میں سرمایہ ہاتھ سے دے بیٹھنا اور اس کا کم ہوجانا ہے ۔ کبھی تو اس کی انسان کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے زیاں کیا اور اس نے نقصان اٹھایا اور کبھی عمل کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور کہتے ہیں : اس کی تجارت میں نقصان ہوا ہے ۔

دوسری طرف "خسران" کبھی تو ظاہری سرمایوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے ، جیسے مال اور دنیاوی مقام ، اور کبھی معنوی سرمایوں کے بارے میں جیسے صحت وسلامتی ، عقل وایمان اور ثواب اور یہی وہ چیز ہے جس کا خدا نے "خسران مبین" نام رکھا ہے اور جس خسران کو خدا نے قرآن میں بیان کیا ہے وہ دوسرے ہی معنی کی طرف اشارہ ہے نہ کہ وہ جو دنیاوی سرمایوں اور عام تجارتوں سے مربوط ہے [1]

قرآن نے حقیقت میں انسانوں کو ان تجارت پیشہ افراد سے تشبیہ دی ہے جو بہت زیادہ سرمایے کے ساتھ اس جہان کے تجارت خانہ میں قدم رکھتے ہیں ، بعض کو تو بہت زیادہ نفع ہوتا ہے اور بعض کو سخت نقصان ۔

---

[1] مفردات ، مادہ "خسر"

قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیات ہیں جن میں یہ تعبیر و تشبیہ بیان ہوئی ہے۔ درحقیقت اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ قیامت میں نجات حاصل کرنے کے لیے اس کی اور اس کی کسی کی انتظار میں نہیں رہنا چاہیے۔ اس کا واحد راستہ موجود سرمایوں اور وسائل سے فائدہ اٹھانا ہے اور اس عظیم تجارت میں سعی و کوشش کرنا ہے کیونکہ وہاں تو "همه چیز را به بهاء دهند، به بهانه نمی دهند" یعنی ہر چیز قیمت کے ساتھ دیتے ہیں بہانے سے نہیں دیتے۔

لیکن اس نے مشرکین اور گنہ گاروں کے زیان و نقصان کو "خسران مبین" کے ساتھ توصیف کیوں کی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً انھوں نے افضل ترین سرمایہ یعنی عمر، عقل و خرد و احسانات اور زندگانی کا سرمایہ ہاتھ سے گنوا دیا ہے جبکہ اس کے بدلے میں کوئی چیز حاصل نہیں کی۔

ثانیاً اگر انھوں نے صرف یہ سرمایہ ہی کھویا ہوتا اور کوئی عذاب و سزا نہ خریدی ہوتی تو پھر بھی کوئی بات تھی۔ بدبختی کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے یہ عظیم سرمایہ گنوا کر سخت ترین اور دردناک ترین عذاب اپنے لیے فراہم کرلیا ہے۔

ثالثاً یہ ایسا نقصان ہے جو قابلِ تلافی نہیں ہے اور یہ بات سب سے زیادہ بڑھ کر دردناک ہے۔ ہاں! یہ ہے "خسران مبین"

۲۔ "فاعبدوا ما شئتم" کا مفہوم: اس کا معنی ہے جس کی چاہو تم عبادت کرو۔ اصطلاح کے مطابق یہ ایک ایسا امر ہے جو تہدید کے لیے ہے اور یہ ایسے مقام پر کہا جاتا ہے جہاں مجرم اور گنہ گار شخص پر پند و نصیحت اثر نہ کرتی ہو تو آخری بات جو اس سے کہی جاتی ہے یہ ہے کہ جو چاہو کرو لیکن سزا اور عذاب کے منتظر رہو۔ یعنی تم ایسی منزل پر پہنچ گئے ہو کہ اب ذمہ داری سوچنے جاننے اور پند و نصیحت کے لائق نہیں رہے ہو اور دردناک عذاب کے سوا تمھارے لیے کوئی دوسرا انجام اور علاج نہیں ہے۔

۳۔ "اھل" سے مراد کون لوگ ہیں؟ ان آیات میں بیان ہوا ہے کہ یہ زیاں کار نہ صرف اپنی ہستی اور وجود کا سرمایہ ہاتھ سے کھو بیٹھے ہیں بلکہ یہ تو اپنے "اہل" کے وجود کا سرمایہ بھی گنوا دیتے ہیں۔

بعض مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ یہاں "اہل" سے مراد انسان کے پیروکار اور وہ لوگ ہیں جو اس کے مکتب اور پروگراموں پر چلتے ہیں۔

بعض نے اس کی بہشتی بیویوں کے مفہوم میں تفسیر کی ہے یعنی مشرکین اور مجرمین انھیں کھو بیٹھیں گے۔

بعض اس سے دنیا میں گھر والے اور نزدیکی مراد لیتے ہیں اور یہی آخری معنی اس لفظ کے اصلی مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے سب سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے کیونکہ بے ایمان افراد آخرت میں انھیں کھو بیٹھیں گے اگر وہ مومن ہوئے تو ان سے جدا ہو جائیں گے اور خود انھیں کی طرح سے کافر ہوئے تو پھر نہ صرف یہ کہ ان سے انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ وہ زیادہ دردناک عذاب کا سبب بھی بنیں گے۔

۱۷۔ وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۙ

۱۸۔ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

۱۹۔ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۚ

۲۰۔ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۝

ترجمہ

۱۷۔ جن لوگوں نے طاغوت کی عبادت سے اجتناب کیا اور خدا کی طرف لوٹے، بشارت اور خوشخبری انھی لوگوں کے لیے ہے، اس بنا پر میرے ان بندوں کو بشارت دے دو۔

۱۸۔ وہ لوگ جو باتوں کو (غور سے) سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے اور یہی عقل مند ہیں۔

۱۹۔ کیا تو اس شخص کو جس کے لیے عذاب کا حکم قطعی ہو چکا ہے رہائی بخش سکتا ہے؟ کیا تو اس شخص کو جو آگ کے اندر ہے پکڑ کر باہر لے آسکے گا؟

۲۰۔ لیکن وہ لوگ جنھوں نے خدا کا تقویٰ اختیار کیا ہے ان کے لیے تو بہشت میں بالاخانے ہیں، جن کے اوپر پھر بالاخانے سے ہیں اور ان کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ خدا کا وعدہ ہے اور خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

تفسیر

خدا کے حقیقی بندے

قرآن نے پھر ان آیات میں موازنے کی روش سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان متعصب اور ہٹ دھرم مشرکین کے مقابلے میں جن کی سرنوشت جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ پروردگار کے خاص اور حقیقت کے متلاشی بندوں کے متعلق گفتگو شروع کی ہے ارشاد ہوتا ہے: ان لوگوں کے لیے جنھوں نے "طاغوت" کی عبادت سے اجتناب کیا ہے اور خدا کی طرف بازگشت کی، بشارت اور خوشخبری ہے (والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا و انابوا الی اللہ لھم البشریٰ)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "بشریٰ" یہاں مطلق ہے لہٰذا ہر قسم کی خدائی نعمتوں پر مشتمل ہے چاہے وہ مادی ہوں یا معنوی، لیکن یہ عظیم بشارت ایسے لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو طاغوت کی پرستش سے اجتناب کریں اور خدا کی طرف لوٹ آئیں۔ سارا ایمان وعمل صالح اسی جملے میں جمع ہے۔

کیونکہ "طاغوت" اصل میں "طغیان" کے مادہ سے حد سے تجاوز کرنے والے معنی میں ہے۔ اس لیے یہ لفظ ہر تجاوز کرنے والے اور خدا کے سوا ہر معبود، جیسے شیطان اور ظالم حکمران پر بولا جاتا ہے (یہ لفظ واحد وجمع دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے)[1]

اس بنا پر "طاغوت سے اجتناب" اس وسیع وعریض معنی کا حامل ہے یعنی ہر قسم کے شرک، بت پرستی، ہوس پرستی اور شیطان پرستی سے دُوری نیز حکام جور اور ظلم کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنے والوں کے سامنے سرتسلیم خم نہ کرنے کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور "انابوا الی اللہ" تقویٰ پرہیزگاری اور ایمان کا جامع ہے۔ یقیناً اس کے افراد ہی بشارت کے اہل ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ طاغوت کی عبادت صرف رکوع وسجود کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ ہر قسم کی اطاعت کے مفہوم میں ہے جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

من اطاع جبارًا فقد عبدہ

جس شخص نے کسی ستم گر حکمران کی اطاعت کی اس نے اس کی عبادت کی[2]

پھر ان خاص بندوں کے تعارف کے لیے قرآن کہتا ہے: میرے خاص بندوں کو بشارت دے دے (فبشر عباد)[3]۔

---

[1] بعض مفسرین مثلاً زمخشری کا کشاف میں یہ نظریہ ہے کہ "طاغوت" اصل میں "طغووت" (بروزن "فعلوت") مثل "ملکوت" تھا پھر وہ مقلوب ہوگیا اور لام الفعل عین الفعل سے مقدم ہوگئی اور "طیغوت" ہوگیا اور "یا" کے الف سے بدل جانے کے بعد "طاغوت" ہوگیا اور کئی لحاظ سے تاکید کے معنی دیتا ہے صیغہ مبالغہ معنی مصدری اور قلب کی وجہ سے (تفسیر کشاف جلد ۴ ص ۱۲۰)

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں جلد، ص ۴۹۲

[3] "عباد" اصل میں "عبادی" تھا۔ "یا" حذف ہوگئی اور زیر اس کا قائم مقام ہے۔

وہ لوگ جو بات (غور سے) سنتے ہیں اور ا... بات زیادہ اچھی ہوتی ہے، اس کی پیروی کرتے ہیں (الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ)۔

وہ ایسے لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے اور وہی عقل و خرد رکھنے والے ہیں (اولئک الذین ھداھم اللہ و اولئک ھم اولوا الالباب)۔

یہ دو آیات جو اسلامی شعار کی صورت میں سامنے آئی ہیں، مسلمانوں کی حریت فکر اور مختلف مسائل میں (اچھی سے اچھی بات کو) انتخاب کرنے کی خوب نشاندہی کرتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: میرے بندوں کو بشارت دے دے اور اس کے بعد ان خاص بندوں کا اس صورت میں تعارف کروایا گیا ہے، وہ ہر کسی کی بات کو غور سے سنتے ہیں یہ دیکھے بغیر کہ کہنے والا کون ہے اور کیا نظریہ رکھتا ہے اور عقل و خرد کی قوت کے ساتھ ان میں سے بہترین کا انتخاب کرلیتے ہیں۔ وہ کسی قسم کا تعصب اور ہٹ دھرمی نہیں کرتے اور کسی قسم کی تنگ نظری ان کی فکر و نظر میں نہیں ہے۔ وہ حق کے متلاشی اور حقیقت کے پیاسے ہیں وہ جہاں کہیں بھی انھیں ملے، لپک کر اس کا استقبال کرتے ہیں اور اس کے صاف چشمے سے بغیر روک ٹوک کے پیتے ہیں اور سیراب ہوتے ہیں وہ نہ صرف حق کے طالب اور اچھی گفتگو کے پیاسے ہیں بلکہ "خوب" اور "خوب تر" میں سے اور "نیک" اور "نیک تر" میں سے دوسرے کا انتخاب کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ بہترین اور برترین کے خواہاں ہیں۔

ہاں! یہی ہے نشانی ایک سچے مسلمان اور حق طلب مومن کی۔

"یستمعون القول" (بات کو سنتے ہیں) میں "قول" سے کیا مراد ہے۔ اس ضمن میں مفسرین نے گوناگوں تفسیریں کی ہیں۔

بعض نے اس سے قرآن مراد لیا ہے اور جو کچھ اس میں احکام اور مباحات کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے وہ ان میں سے احکام کی پیروی کو احسن کی پیروی سمجھتے ہیں۔

بعض دوسروں نے اس کی مطلق اوامر الٰہیہ سے تفسیر کی ہے، چاہے وہ قرآن میں ہوں یا غیر قرآن میں۔

لیکن ان محدود تفسیروں کے لیے کسی قسم کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ آیت کا ظاہری مفہوم ہر قسم کے قول اور ہر بات پر محیط ہے۔ خدا کے باایمان بندے تمام باتوں میں سے اس بات کو انتخاب کرلیتے ہیں جو "احسن" ہے اور اس کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے عمل میں اسی پر کاربند ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے مذکورہ بالا آیت میں صاحبان ہدایت الٰہی کو اسی گروہ میں منحصر کردیا ہے جیسا کہ عقل مندوں کو بھی انھیں میں منحصر قرار دیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گروہ ظاہری و باطنی ہدایت کا حامل ہے۔ ظاہری ہدایت عقل و خرد کے طریق سے اور باطنی ہدایت نور الٰہی اور امداد غیبی کے راستے سے اور یہ دونوں افتخار اس قسم کے حقیقت کے متلاشی حریت فکر کے حامل لوگوں کے لیے ہیں۔

چونکہ پیغمبر خدا گمراہوں اور مشرکین کو ہدایت کرنے سے بہت لگاؤ رکھتے تھے اور ان لوگوں کے انحراف سے انھیں بہت تکلیف

ہوتی تھی جو حقیقت کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا بعد والی آیت میں اس حقیقت کو بیان کرکے ان کی دلجوئی کی گئی ہے کہ یہ عالم آزادی اور امتحان کا عالم ہے اور ایک گروہ آخرکار جہنم کی آگ میں جلے گا ارشاد ہوتا ہے: کیا تو ایسے لوگوں کو جن کے لیے خدا کا فرمانِ عذاب قطعی اور حتمی ہو چکا ہے نجات دلا سکتا ہے؟ کیا تو ایسے شخص کو جو آگ کے اندر ہے پکڑ کر باہر نکال سکتا ہے؟ (افمن حق علیه کلمة العذاب أفأنت تنقذ من فی النار)[1]

"حق علیه کلمة العذاب" (جس کے بارے میں عذابِ الٰہی کا فرمان متحقق اور ثابت ہو چکا ہے) یہ جملہ ان آیات سے ملتا جلتا ہے جن میں شیطان اور اس کے پیروکاروں کے بارے میں یہ بیان ہوا ہے کہ:

لأملئن جهنم منك وممن تبعك منهم اجمعين

یقیناً میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھر دوں گا۔ (ص ـــــ ۸۵)

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ اس گروہ کے بارے میں فرمانِ عذاب کا قطعی ہونا اجباری پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جن کے وہ مرتکب ہوئے ہیں اور اس اصرار کی بنا پر ہے جو وہ ظلم و فساد اور گناہ پر رکھتے تھے اس طرح سے کہ ایمان و حق کی پہچان کی روح ہمیشہ کے لیے ان میں مر چکی تھی اور ان کا وجود جہنمی وجود کا ایک ٹکڑا بن چکا تھا۔

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ "أفأنت تنقذ من فی النار" (کیا تو اس شخص کو نجات دے سکتا ہے کہ جو آگ کے اندر ہے) یہ جملہ اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ ان کا دوزخی ہونا اس قدر یقینی اور مسلّم ہے کہ گویا وہ اب اس وقت جہنم کی آگ میں ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کے افراد جنھوں نے خدا سے اپنے تعلق کے تمام راستوں کو مسدود کر دیا ہے، نجات کی کوئی راہ نہیں رکھتے۔ یہاں تک کہ پیغمبرِ اسلامؐ بھی باوجودیکہ "رحمة للعالمین" ہیں انھیں عذاب سے نہیں چھڑوا سکتے۔

لیکن اپنے رسول کے دل کو خوش کرنے اور مومنین کو پر امید رکھنے کے لیے آخری آیت میں اللہ تعالیٰ اس طرح فرماتا ہے: لیکن وہ لوگ جو خدا کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے جنت میں بالاخانے ہیں جن کے اوپر پھر بالاخانے بنے ہوئے ہیں (لکن الذین اتقوا ربهم لهم غرف من فوقها غرف)۔

اگر دوزخی آگ کے پردوں کے اندر گھرے ہوئے ہیں اور گزشتہ آیات کی تعبیر کے مطابق "لهم من فوقهم ظلل من النار ومن تحتهم ظلل" تو بہشتیوں کے لیے ایسے بالاخانے ہیں جو دوسرے بالاخانوں کے اوپر ہیں اور ایسے قصر و محلات ہیں جو دوسرے محلات کے اوپر بنے ہوئے ہیں، کیونکہ پھولوں، پانی اور نہروں اور باغوں کے منظر کو بالاخانہ کے اوپر سے دیکھنا زیادہ لذت بخش

---

[1] اس جملے میں حقیقت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔

افمن حق علیه کلمة العذاب أفأنت تخلصه أفأنت تنقذ من فی النار

اس میں سے "أفأنت تخلصه" حذف ہو گیا ہے اور دوسرا جملہ اس کے لیے دلیل و قرینہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ تقدیر میں اس طرح تھا۔

افمن حقت علیه کلمة العذاب ینجو منه

کیا جس کے لیے عذاب کا فرمان ثابت ہے وہ نجات پا سکتا ہے؟

اور زیادہ دلپذیر ہوتا ہے۔

"غرف" جمع ہے "غرفه" کی "غرف" (بروزن "حرف") کے مادہ سے۔ یہ کسی چیز کو اوپر اٹھانے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے اس پانی کو جو چلّو کے ساتھ چشمے سے اٹھا کر پیتے ہیں "غرفه" کہتے ہیں۔ یہ لفظ بعد ازاں کسی عمارت کے اوپر والے حصے اور منازل کے بالائی طبقات کے معنی میں بولا جانے لگا۔

بہشت کے یہ حسین و خوبصورت بالاخانے، ان نہروں کے ساتھ، جو ان کے نیچے بہہ رہی ہیں، سجائے گئے ہیں، اسی لیے آیت کے آخر میں ہے: ان کے نیچے والی نہریں جاری ہیں (مبنية تجرى من تحتها الانهار)۔

ہاں! "یہ خدائی وعدہ ہے اور خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا" (وعد الله لا يخلف الله الميعاد)۔[1]

چند اہم نکات

۱۔ اسلام اور حرّیتِ فکر: بہت سے مذاہب اپنے پیروکاروں کو دوسروں کی باتوں کے مطالعے اور تحقیق سے منع کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی منطق کی کمزوری کی وجہ سے اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں پڑھنے والا دوسروں کی منطق قبول نہ کرے اور اس طرح ان کے پیروکار ان کے ہاتھ سے نکل جائیں۔

لیکن جیسا کہ زیرِ بحث آیات میں بیان ہوا ہے، اسلام نے اس بارے میں "کھلے دروازوں" کی تدبیر اپنائی ہے اور انھی لوگوں کو خدا کے سچے بندے قرار دیتا ہے جو اہلِ تحقیق ہیں، ایسے کہ جو نہ تو دوسروں کی باتوں کو سننے سے گھبراتے ہیں اور نہ ہی کسی قید و شرط کے بغیر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور نہ ہی کسی وسوسے کو قبول کرتے ہیں۔

اسلام ایسے ہی لوگوں کو بشارت دیتا ہے جو باتوں کو غور سے سنتے ہیں اور ان میں سے جو بہت اچھی ہیں انھیں انتخاب کر لیتے ہیں، نہ صرف یہ کہ اچھی باتوں کو بری باتوں پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ پھولوں میں سے بھی جو پھول بہتر ہوتا ہے اسے انتخاب کرتے ہیں۔

قرآن ان بے خبر جاہلوں کی شدید مذمت کرتا ہے جو پیامِ حق سنتے وقت کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور سر پر کپڑا ڈال لیتے ہیں، جیسا کہ حضرت نوحؑ کے ارشادات میں ایسے لوگوں کی بارگاہِ پروردگار میں شکایت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وانى كلما دعوتهم لتغفر لهم جعلوا اصابعهم فى اٰذانهم و استغشوا ثيابهم واصرّوا واستكبروا استكبارًا

خداوندا! جب بھی میں نے انھیں بلایا تاکہ تو انھیں بخش دے تو انھوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے اوپر کپڑا ڈال لیا، اپنی گمراہی پر اصرار کیا اور بہت تکبر کیا۔ (نوح ——— ۷)

---

[1] زمخشری کشاف میں کہتے ہیں:
"وعد الله" مفعول مطلق کے طور پر منصوب تاکید ہے کیونکہ "لهم غرف" "وعدهم الله غرفا" کے معنی میں ہے۔

اصولی طور پر وہ مکتب جو قوی منطق رکھتا ہے، اس کے لیے دوسروں کی باتوں سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ ہی ان کی طرف سے مسائل کے پیش ہونے پر اسے خوف کھانے کی ضرورت ہے۔ ڈرنا تو انھیں چاہیے جو کمزور اور بے منطق ہیں۔

یہ آیت ایسے لوگوں کو جو ہر بات کو بغیر کسی قید و شرط کے قبول کر لیتے ہیں " اولوا الالباب " اور " ہدایت یافتہ افراد " شمار نہیں کرتی، ان کی مثال ان بھیڑوں کی سی ہے جو کسی سبزہ زار میں چرتے وقت کوئی تحقیق نہیں کرتیں۔ آیت ان دو اوصاف کو ایسے لوگوں کے ساتھ مخصوص کرتی ہے جو نہ تو بے قید و شرط تسلیم کے افراط میں گرفتار ہیں اور نہ ہی خشک اور جاہلانہ تعصبات کی تفریط میں۔

۲۔ چند سوالوں کا جواب: ۱۔ ممکن ہے یہاں یہ سوال پیش کیا جائے کہ اسلام میں کتب ضلال کی خرید و فروش کیوں منع ہے؟

۲۔ قرآن کو کفار کے ہاتھوں میں دینا کیوں حرام قرار دیا گیا ہے؟

۳۔ جو شخص کسی مطلب کو جانتا ہی نہیں وہ اس میں سے انتخاب کیسے کرے گا اور اچھے کو برے سے کس طرح جدا کرے گا؟ کیا اس بات سے دور لازم نہیں آتا؟

پہلے سوال کا جواب واضح ہے، کیونکہ زیر بحث آیات میں ایسی باتوں کے متعلق بحث ہے جن میں ہدایت کی امید ہو جب غور و فکر اور تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو گیا ہو کہ فلاں کتاب گمراہ کرنے والی ہے تو پھر وہ اس حکم کے موضوع سے خارج ہو جائے گی۔ اسلام کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ لوگ ایسے راستے میں قدم رکھیں جس کا نادرست اور غلط ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

البتہ جب تک یہ امر کسی پر ثابت نہ ہوا ہو اور وہ صحیح دین قبول کرنے کے لیے، مختلف مذاہب کے بارے میں تحقیق کر رہا ہو اس وقت تک ان تمام کتابوں کا مطالعہ اور تحقیق کر سکتا ہے لیکن مطلب ثابت ہو جانے کے بعد اس کو ایک زہریلے مادہ کی طرح ہر کسی کی دسترس سے باہر رکھنا چاہیے۔

باقی رہا دوسرے سوال کے بارے میں تو اس صورت میں قرآن غیر مسلم کے ہاتھ میں دینا جائز نہیں ہے جب کہ یہ اس کی ہتک اور بے حرمتی کا باعث ہو ورنہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ غیر مسلم واقعاً اسلام کے بارے میں تحقیق کی فکر میں ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ قرآن کا اس مقصد کے لیے مطالعہ کرے تو نہ صرف یہ کہ قرآن اسے دینے میں کوئی حرج اور رکاوٹ نہیں ہے بلکہ شاید اسے دینا واجب ہو اور جنھوں نے اسے حرام قرار دیا ہے ان کی مراد اس صورت کے علاوہ دوسری صورت ہے۔

اسی لیے عظیم اسلامی معاشرے اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ قرآن کا دنیا کی زندہ زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے اور دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت کے لیے اسے حق طلبی اور حقائق کے پیاسوں تک پہنچانا چاہیے۔

تیسرے سوال کے سلسلے میں اس نکتے پر توجہ کرنا چاہیے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ذاتی طور پر کسی کام سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، البتہ جب کوئی دوسرا اسے انجام دے لیتا ہے تو پھر وہ بھی اچھے اور برے میں تشخیص کر سکتا ہے اور عقل و خرد کی قوت اور وجدان کے سائے سے ان میں سے بہترین کا انتخاب کر سکتا ہے۔

مثلاً ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو فن معماری اور تعمیر کے کام سے آگاہ نہ ہوں، یہاں تک کہ وہ اینٹیں بھی صحیح طریقے پر ایک دوسرے پر نہ رکھ سکیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک اچھی عمارت کی اعلیٰ کیفیت میں اور ایک قبیح بے ڈھنگی اور ناموزوں عمارت میں

تمیز کر سکیں۔

بہت سے افراد کو ہم پہچانتے ہیں جو خود تو شاعر نہیں ہیں لیکن بزرگ شعراء کے اشعار کے وزن میں تمیز کر سکتے ہیں اور انھیں بے وقت تکلفاً کہنے والے شعراء کے اشعار سے جُدا کر سکتے ہیں، کچھ لوگ خود تو کشتی نہیں لڑتے لیکن کشتی لڑنے والوں کے درمیان فیصلہ اور ان میں سے اچھے کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

۲۔ حریت فکر اور اسلامی روایات: احادیثِ اسلامی میں جو زیرِ بحث آیات کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں یا مستقل طور پر منقول ہوئی ہیں اس امر پر بہت زور دیا گیا ہے۔

ان میں سے ایک حدیث امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اپنے ایک دانش مند صحابی ہشام بن حکم سے فرمایا:

یاهشام ان الله تبارك وتعالی بشر اهل العقل والفهم فی کتابه، فقال فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه

اے ہشام! خداوند تعالیٰ نے اہلِ عقل وفہم کو اپنی کتاب میں بشارت دی ہے اور فرمایا ہے: میرے ان بندوں کو بشارت دے دو جو باتوں کو (غور سے) سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین کی پیروی کرتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے اور وہ صاحبانِ عقل وفکر ہیں[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں فرمایا:

هوالرجل یسمع الحدیث فیحدث به کما سمعه لایزید فیه ولاینقص

یہ آیت ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو حدیث سنتے ہیں اور بے کم وکاست اور بغیر کمی وبیشی کے دوسروں کے لیے نقل کرتے ہیں[2]

البتہ اس حدیث سے مراد "فیتبعون احسنه" کی تفسیر ہے کیونکہ بہترین باتوں کی پیروی کرنے کی ایک نشانی یہ ہے کہ انسان اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہ کرے اور بعینہٖ دوسروں تک پہنچادے۔ نہج البلاغہ میں امیرالمومنین حضرت علیؑ کے کلمات قصار میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

الحکمة ضالة المؤمن فخذ الحکمة ولو من اهل النفاق

حکمت آمیز باتیں مومن کی گم شدہ چیز ہے، پس وہ حکمت کو لے لے چاہے وہ منافق کے پاس سے ملے[3]

---

[1] کافی، جلد ۱، کتاب العقل، حدیث ۱۲

[2] نور الثقلین، جلد ۴، ص ۴۸۲، حدیث ۲۴

[3] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۸۰

۴۔ تطبیق یا شانِ نزول: مفسّرین نے کئی ایک شانِ نزول بیان کی ہیں۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ والذین اجتنبوا الطاغوت ..... کی آیت اور اس کے بعد والی آیت تین افراد کے بارے میں وارد ہوئی ہے جو زمانۂ جاہلیت میں (اس آلودہ ماحول میں مشرکین کے شور و غوغا کے سامنے نہیں جھکے اور) وہ کہتے تھے لا الٰہ الّا اللہ ـــ وہ سلمان فارسی، ابوذر غفاری اور زید بن عمرو تھے[1]

بعض روایات میں زید بن عمرو کی جگہ سعید بن زید آیا ہے[2]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیہ افمن حق علیہ کلمۃ العذاب ..... ابوجہل وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے[3]

لیکن بعید نہیں ہے کہ یہ اصطلاحی شانِ نزول میں سے نہ ہو بلکہ آیت کے واضح مصادیق پر تطبیق کی گئی ہو۔

---

[1] تفسیر "قرطبی" و "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] "درالمنثور" طبق نقل تفسیر المیزان جلد ۱۷ صفحہ ۲۶۷

[3] اس قول کو "روح المعانی" نے بعض سے نقل کیا ہے۔

۲۱۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيۡعَ فِى الۡاَرۡضِ ثُمَّ يُخۡرِجُ بِهٖ زَرۡعًا مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيۡجُ فَتَرٰٮهُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ يَجۡعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَذِكۡرٰى لِاُولِى الۡاَلۡبَابِ ○

۲۲۔ اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰهُ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيۡلٌ لِّلۡقٰسِيَةِ قُلُوۡبُهُمۡ مِّنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ○

ترجمہ

۲۱۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اسے چشموں کی صورت میں زمین میں داخل کیا پھر اس سے زرعی پیداوار نکالتا ہے جو مختلف رنگ کی ہوتی ہے پھر یہ خشک ہو جاتی ہے اس طرح سے کہ تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد اور بے روح ہے وہ اسے درہم و برہم کر دیتا ہے اور ریزہ ریزہ بنا دیتا ہے اس ماجرے میں صاحبانِ عقل کے لیے ایک نصیحت ہے۔

۲۲۔ کیا وہ شخص جس کا سینہ خدا نے اسلام کے لیے کشادہ کر دیا ہے اور وہ نورِ الٰہی کے مرکب پر سوار ہے (ان دل کے اندھوں کی طرح ہے جن کے دل میں نورِ ہدایت داخل نہیں ہوا) وائے ہے ان کے لیے جو ذکرِ خدا کے مقابلے میں سخت دل رکھتے ہیں وہ واضح گمراہی میں ہیں۔

تفسیر

وہ لوگ جو نور کے مرکب پر سوار ہیں

قرآن ان آیات میں دوبارہ توحید و معاد کے دلائل پیش کرتا ہے اور ان مباحث کی تکمیل کرتا ہے جو گزشتہ آیات میں کفر و ایمان کے

سلسلے میں بیان ہوئے۔

نظامِ جہانِ ہستی میں پروردگار کی عظمت و ربوبیت کے آثار میں سے، آسمان سے نزولِ بارش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر اس بے رنگ پانی سے ہزاروں رنگ کے نباتات کی پرورش اور حیات کے مراحل کو طے کرنے اور آخری مرحلے تک پہنچنے کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے ہوئے تمام مؤمنین کے لیے ایک نمونے کے طور پر فرماتا ہے : کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا پھر اسے چشموں کی صورت میں زمین میں داخل کیا (الم تر ان اللّٰہ انزل من السماء ماء فسلکہ ینابیع فی الارض)۔[1]

بارش کے حیات بخش قطرے آسمان سے برستے ہیں، زمین کی نفوذ پذیر تہہ انھیں زمین کے اندر قبول کر لیتی ہے اور جب وہ نفوذ ناپذیر تہہ تک پہنچ جاتے ہیں تو وہاں رک جاتے ہیں اور زمین انھیں ذخیرہ کر لیتی ہے اور اس کے بعد چشموں، نالوں اور کنووں کی صورت میں باہر بھیجتی ہے۔

"سلکہ" (بارش کے پانی کو زمین کے اندر داخل کیا) اسی امر کی طرف اشارہ ہے جو ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے۔

"ینابیع" "ینبوع" کی جمع ہے اور "نبع" کے مادہ سے ہے کہ جو زمین سے پانی کے جوش مارنے کے معنی میں ہے۔

اگر زمین میں ایک ہی نفوذ ناپذیر تہہ ہوتی تو بارش کے پانی کے ایک بھی قطرے کو اپنے اندر ذخیرہ نہ کر سکتی اور آسمان سے بارش برسنے کے بعد سارا پانی دریاؤں میں جا پڑتا اور اس صورت میں نہ تو کوئی چشمہ ہوتا نہ نہریں اور نہ نالے ہوتے اور نہ ہی کنویں ہوتے اور اگر اس میں ایک نفوذ پذیر تہہ ہی ہوتی تو سارا پانی زمین کی گہرائیوں میں چلا جاتا اس طرح سے اس تک دسترس ہی ممکن نہ ہوتی۔ زمین کی ان دو تہوں نفوذ پذیر اور نفوذ ناپذیر۔ کا ایسے منظم اور نپے تُلے فاصلے پر ہونا اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔ نیز یہ بات قابلِ توجہ ہے بعض اوقات ــــ نفوذ پذیر اور نفوذ ناپذیر ــــ کئی طبقات اوپر تلے ہوتے ہیں جن سے اونچی سطح پر، نیم گہرے اور گہرے کنویں کھودنے میں استفادہ کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : پھر خدا اس کے ذریعے نباتات کو نکالتا ہے جو مختلف رنگ کے ہوتے ہیں (ثم یخرج بہ زرعًا مختلفًا الوانہ)۔

ان کی انواع بھی مختلف ہیں۔ جیسے گندم، جو، چاول اور مکئی اور ان کی کیفیتیں بھی مختلف ہیں اور ان کا ظاہری رنگ بھی۔ بعض گہرے سبز رنگ کے، بعض ہلکے سبز رنگ کے، بعض کے پتے چوڑے اور پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض کے باریک اور پتلے وغیرہ وغیرہ۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "زرع" ایسے پودے کو کہا جاتا ہے جس کا تنا قوی نہ ہو اس کے مقابلے میں لفظ "شجر" ہے

---

[1] "ینابیع" ترکیب نحوی کے لحاظ سے "منصوب بنزع خافض" ہے اور اصل میں "فی ینابیع" تھا (تفسیر روح المعانی و روح البیان)

جو زیادہ تر اس درخت کو کہا جاتا ہے جس کا تنا قوی ہو۔

" زرع " ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو غیر غذائی نباتات کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ طرح طرح کے پھول، سجاوٹ کی گھاس اور دوائیوں کی جڑی بوٹیاں وغیرہ جو بہت متنوع اور گوناگوں رنگوں اور صورتوں والی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات تو ایک ہی شاخ پر بلکہ ایک ہی پھول میں یہ مختلف رنگ بہت ہی عمدہ اور خوبصورت پہلو بہ پہلو دکھائی دیتے ہیں اور زبانِ بے زبانی سے خدا کی توحید اور تسبیح کا نغمہ سنا رہے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان نباتات کی حیات کے کچھ اور مراحل پیش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

اس کے بعد یہ زراعت ختم ہو جاتی ہے اس طرح سے کہ تو اسے زرد اور بے روح دیکھتا ہے۔

(ثم یھیج فتراہ مصفرًا)[1]

تیز ہوا ہر طرف سے چلتی ہے اور جو پودا کمزور ہو چکا ہوتا ہے اسے اس کی جگہ سے اکھاڑ دیتی ہے۔ پھر خدا اسے درہم برہم کر کے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے (ثم یجعلہ حطامًا)۔

"ہاں! اس واقعے میں صاحبانِ فکر و نظر کے لیے نصیحت اور یاد آوری ہے" (ان فی ذالک لذکری لاولی الالباب)۔

اس عظیم منظر میں پروردگار کی ربوبیت اور عالمِ ہستی کے باعظمت اور نپے تلے نظام کے سلسلے میں ایک امر توجہ طلب اور تذکرہ ہے اور زندگی کے ختم ہونے کے بارے میں بھی ایک تذکرہ ہے اور اس کے بعد قیامت اور مردوں کے نئے سرے سے زندہ ہونے کے سلسلہ میں بھی یاد آوری ہے۔

یہاں اگرچہ عالمِ نباتات کا منظر پیش کیا گیا ہے، لیکن یہ انسانوں کو خبردار کرتا ہے کہ اسی طرح سے تمہاری حیات میں بھی تکرار ہوگا، ممکن ہے کہ اس کی مدت مختلف ہو لیکن اس کا اصول ایک ہی ہے تولد و پیدائش، نشاط و جوانی اور پھر پژمردگی اور بڑھاپا اور آخر میں موت۔

توحید و معاد کے اس درس کے بعد مومن و کافر کے درمیان ایک موازنہ پیش کیا گیا ہے تاکہ اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ قرآن اور وحی آسمانی بھی بارش کے قطروں کی طرح ہے جو دلوں کی سرزمین پر نازل ہوتی ہے جس طرح صرف آمادہ اور اہل زمین ہی بارش کے حیات بخش قطرات سے فائدہ اٹھاتی ہے اسی طرح سے آیاتِ الٰہی سے بھی صرف وہی دل بہرہ مند ہوتے ہیں جو اس کے سایۂ لطف میں خود سازی کے لیے آمادہ و تیار ہوتے ہیں، فرمایا گیا ہے: کیا وہ شخص جس کے سینے کو خدا نے اسلام قبول کرنے کے لیے کشادہ کر دیا ہے اور وہ نورِ الٰہی کے مرکب پر سوار ہے، ان بے نور سنگدلوں کی طرح ہے جن کے دلوں میں خدا کی ہدایت نہیں پہنچی

---

[1] "یھیج" "ھیجان" کے مادہ سے ہے۔ لغت میں یہ لفظ دو معنی میں آیا ہے۔ ایک پودے کا خشک اور زرد ہونا اور دوسرا حرکت میں آنا اور جوش و خروش دکھانا۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں معانی ایک ہی بنیاد کی طرف لوٹیں، کیونکہ جس وقت پودا خشک ہو جائے تو گویا پھر بکھر جانے اور حرکت و ہیجان کے لیے آمادہ و تیار ہو جاتا ہے۔

(افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ)[1]

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے، وائے ہے ان پر جو سخت اور نفوذ ناپذیر دل رکھتے ہیں اور جن میں ذکر خدا کچھ بھی اثر نہیں کرتا (فویل للقاسیۃ قلوبھم من ذکر اللہ)۔

نہ سود مند نصیحتیں ان پر اثر کرتی ہیں، نہ انذار و بشارت، نہ قرآن کی ہلا دینے والی آیات انہیں حرکت میں لاتی ہیں اور نہ ہی وحی کی حیات بخش بارش انہیں تقویٰ و فضیلت کے پھول اگاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ:

نہ طراوتی نہ برگی نہ گلی نہ سایہ دارند

نہ ان میں کچھ طراوت ہے نہ ان پر کوئی پتہ ہے نہ ہی پھول اور نہ سایہ ہے۔

ہاں! یہ لوگ ضلال مبین اور واضح گمراہی میں ہیں (اولئک فی ضلال مبین)۔

"قاسیۃ"، "قسوۃ" کے مادہ سے خشونت، سختی اور نفوذ ناپذیری کے معنی میں ہے۔ اسی لیے سخت پتھروں کو "قاسی" کہتے ہیں، ان دلوں کو "قلوب قاسیہ" (سخت دل) کہا جاتا ہے کہ جو نور حق و ہدایت کے لیے کوئی رغبت اور جھکاؤ نہیں رکھتے، نرم اور رام نہیں ہوتے اور نور ہدایت ان میں نفوذ نہیں کرتا، فارسی میں اسے سنگدل سے تعبیر کرتے ہیں۔

بہرحال یہ تعبیر شرح صدر، سینے کی کشادگی اور وسعت روح کے مقابلے میں آئی ہے، کیونکہ کشادگی قبولیت کے لیے آمادگی کے لیے کنایہ ہے۔ ایک بیابان اور وسیع گھر بہت سے انسانوں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے اور فراخ سینہ اور کشادہ روح زیادہ سے زیادہ حقائق کو قبول کرنے کے اہل ہوتی ہے۔

ایک روایت پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے، ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر اسلامؐ سے اس آیہ کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا "افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ" انسان کا شرح صدر کیسے ہوتا ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

اذا دخل النور فی القلب انشرح والفتح

جس وقت نور انسان کے دل میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ وسیع و کشادہ ہو جاتا ہے۔

میں نے عرض کیا: اے خدا کے رسول! اس کی نشانی کیا ہے؟

فرمایا:

الانابۃ الی دار الخلود، والتجافی عن دار الغرور، والاستعداد للموت قبل نزولہ

اس کی نشانی ہمیشہ کے گھر کی طرف توجہ، غرور کے گھر سے علیحدگی اور موت کے استقبال کے لیے

---

[1] اس آیت میں ایک محذوف ہے جو بعد والے جملے کے قرینے سے واضح ہو جاتا ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے:

افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ کمن ھو قاسی القلب لا یھتدی بنور

اس کے نزول سے پہلے آمادہ ہوتا ہے۔[1]

تفسیر علی بن ابراہیم میں بیان ہوا ہے کہ "افمن شرح الله صدره للاسلام" کا جملہ امیرالمؤمنین علیؑ کے بارے میں نازل ہوا ہے اور بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ "فویل للقاسیة قلوبهم" کا جملہ ابولہب اور اس کے بیٹوں کے متعلق ہے۔[2]

یہ بات واضح ہے کہ یہ شانِ نزول حقیقت میں مفہوم کلی کے واضح مصادیق کے مانند ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "فهو علی نور من ربه" میں نور اور روشنی کا ذکر ایک سواری کے طور پر ہے کہ جس پر مومنین سوار ہوں گے، اس کی سرعت رفتار عجیب، اس کا راستہ واضح اور اس کے دوڑنے کی طاقت تمام جہان پر محیط ہوگی۔

شرح صدر اور قساوتِ قلب کے عوامل

قبولیت حق، ادراک مطالب اور خود جوشی کے اعتبار سے سب انسان یکساں نہیں ہیں۔ بعض ایک لطیف اشارے یا ایک مختصر سی گفتگو سے حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لیتے ہیں، ایک تذکر انھیں بیدار کر دیتا ہے اور ایک ہی نصیحت ان کی روح میں ایک طوفان برپا کر دیتی ہے۔ جبکہ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں کہ شدید ترین خطاب اور واضح ترین دلائل اور قوی ترین پند و نصائح بھی ان پر معمولی سا اثر نہیں ڈالتے اور یہ مسئلہ سادہ سا نہیں ہے۔

قرآن اس سلسلے میں کیسی عمدہ تعبیر بیان کرتا ہے کہ بعض کو شرح صدر اور وسعتِ روح کا حامل اور بعض کو تنگ سینے والا قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ انعام کی آیہ ۱۲۵ میں ہے:

فمن یرد الله ان یهدیه یشرح صدره للاسلام ومن یرد ان یضله یجعل صدره ضیقاً حرجاً کانما یصعد فی السماء

جس شخص کو خدا ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینے کو اس طرح سے تنگ کر دیتا ہے جیسے وہ آسمان کی طرف چڑھ جائے گا۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ افراد کے حالات کے مطالعے سے کامل طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ بعض کی روح تو اس طرح سے وسیع اور کشادہ ہوتی ہے کہ جس قدر حقائق اس میں داخل ہوں وہ آسانی کے ساتھ انھیں قبول کر لیتی ہے لیکن بعض کی روح اور فکر اس طرح سے محدود ہوتی ہے گویا کوئی جگہ کسی حقیقت کے لیے اس میں نہیں ہے، جیسے ان کا دماغ ایک محفوظ جگہ میں آہنی دیواروں کے اندر بند ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۶۹۱ (تفسیر سورۂ زمر زیر بحث آیات کے ذیل میں) یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ شیخ مفید کی روضۃ الواعظین میں بھی نقل ہوئی ہے۔

[2] تفسیر صافی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

البتہ ان دونوں میں سے ہر ایک کے کچھ عوامل و اسباب ہیں۔ ارباب دانش اور صالح علماء کے ساتھ دائمی ربط و تعلق، مسلسل و پے در پے مطالعات، خودسازی اور تہذیب نفس گناہ سے پرہیز خصوصاً حرام غذا سے اور ہر خدا کو یاد کرنا شرح صدر کے عوامل و اسباب میں سے ہے۔

اس کے برعکس جہالت، گناہ، ہٹ دھرمی، جنگ و جدال، برے لوگوں یعنی فاسقوں، فاجروں اور مجرموں کی صحبت، دنیا پرستی و ہوس پرستی، تنگیٔ روح اور قساوت قلب کا باعث بنتی ہے۔

یہ جو قرآن کہتا ہے کہ خدا جس شخص کو ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا شرح صدر کر دیتا ہے یا جسے خدا چاہتا ہے کہ گمراہ کرے تو اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے۔ یہ "چاہنا" اور "نہ چاہنا" بلاوجہ نہیں ہوتا۔ اس کا سرچشمہ خود ہماری ہی ذات ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

اوحی اللہ عز وجل الی موسٰی یا موسٰی لا تفرح بکثرۃ المال، ولا تدع ذکری علی کل حال، فان کثرۃ المال تنسی الذنوب، وان ترک ذکری یقسی القلوب

خدا نے موسٰی کی طرف وحی بھیجی کہ اے موسٰی! مال کی کثرت پر خوش نہ ہونا اور میری یاد کو کسی حالت میں ترک نہ کرنا کیونکہ مال کی زیادتی اکثر گناہوں کی فراموشی کا سبب بن جاتی ہے اور میری یاد کو ترک کر دینا دل کو سخت کر دیتا ہے[1]

ایک دوسری حدیث میں امیر المومنینؑ سے منقول ہے:

ماجفت الدموع الّا لقسوۃ القلوب، وما قست القلوب الّا لکثرۃ الذنوب

آنسو خشک نہیں ہوتے مگر دلوں کے سخت ہو جانے سے اور دل سخت نہیں ہوتے مگر گناہوں کی زیادتی سے[2]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو پروردگار کا ایک پیغام یہ تھا:

یا موسٰی لا تطول فی الدنیا املک، فیقسو قلبک، والقاسی القلب منی بعید

اے موسٰی! دنیا میں اپنی آرزوؤں کو لمبا نہ کر، کیونکہ اس سے تیرا دل سخت اور انعطاف ناپذیر ہو جائے گا اور سنگدل مجھ سے دور ہوتے ہیں[3]

---

[1]، [2] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۵۵ (حدیث ۲۳-۲۴)

[3] کافی جلد دوم، باب "القسوۃ" حدیث ۱

ایک اور حدیث میں امیرالمؤمنین علی علیہ السلام سے اس طرح منقول ہے:

لمتان: لمة من الشيطان و لمة من الملك، فلمة الملك الرقة و الفهم، ولمة الشيطان السهو والقسوة

القاء دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک القائے شیطانی اور دوسرا القائے مَلک (فرشتہ) فرشتے کا القاء دل کی نرمی اور فہم و ذکاء میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور شیطانی القاء سہو و نسیان اور قساوتِ قلب کا باعث ہوتا ہے [1]

بہرحال شرحِ صدر حاصل کرنے اور قساوتِ قلبی سے رہائی پانے کے لیے بارگاہِ خداوندی کی طرف رُخ کرنا چاہیے تاکہ وہ نورِ الٰہی جس کا خدا نے وعدہ کیا ہے انسان کے دل میں روشن ہو۔ دل کے آئینے کو گناہ کے زنگ سے صاف و صیقل کرنا چاہیے اور دل کے گھر کو ہوا و ہوس کی غلاظت سے پاک رکھنا چاہیے تاکہ وہ محبوب کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہو۔ خوفِ خدا سے آنسو بہانا اور اس بے مثال محبوب کے عشق میں گریہ و بکا کرنا، رقتِ قلبی، نرم دلی اور روح کی وسعت کے لیے عجیب و غریب اثر رکھتا ہے اور آنکھ کا جمود اور خشک ہونا سنگدلی کی نشانی ہے۔

---

[1] کافی جلد دوم "باب القسوة" حدیث ۳

۲۳۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ ۚ ثُمَّ تَلِيۡنُ جُلُوۡدُهُمۡ وَقُلُوۡبُهُمۡ اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ○

۲۴۔ اَفَمَنۡ يَّتَّقِىۡ بِوَجۡهِهٖ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَقِيۡلَ لِلظّٰلِمِيۡنَ ذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ○

۲۵۔ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَاَتٰٮهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ○

۲۶۔ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الۡخِزۡىَ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ ۘ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ ○

ترجمہ

۲۳۔ خدا نے بہترین بات نازل کی ہے، ایسی کتاب جس کی آیات (لطافت و زیبائی اور مضمون کی گہرائی کے لحاظ سے) ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، بار بار (اشتیاق انگیز انداز سے) دہرائی جانے والی، جس کی آیات سن کر وہ لوگ لرزہ براندام ہو جاتے ہیں جو اپنے پروردگار کے سامنے خشوع کرنے والے ہیں۔ پھر ان کا ظاہر و باطن نرم اور ذکر خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے وہ جسے چاہتا ہے ہدایت اس کے ساتھ کر دیتا ہے اور جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی راہنما نہیں ہے۔

۲۴۔ کیا وہ شخص جو اپنے چہرے اور ذات سے (خدا کے) دردناک عذاب کو قیامت کے دن ٹال دے (اس شخص کے مانند ہو سکتا ہے جس تک ہرگز جہنم کی آگ پہنچ ہی نہ سکے) اور ظالموں سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔

۲۵۔ جو لوگ ان سے پہلے تھے انھوں نے بھی ہماری آیات کو جھٹلایا تھا تو ان پر عذابِ الٰہی ایسی جگہ سے آیا جہاں کا وہ کوئی خیال ہی نہ رکھتے تھے۔

۲۶۔ خدا نے انھیں اسی دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و خواری کا مزہ چکھایا اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے، اگر وہ جانتے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے عبداللہ بن مسعود سے نقل کیا ہے کہ ایک دن پیغمبر اکرم کے اصحاب کی ایک جماعت نے ملالت قلبی پیدا کر لی تھی۔ عرض کیا: اے رسولِ خدا! کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ کوئی ایسی ہدایت کی بات ہمارے لیے بیان کرتے جس سے ہمارے دلوں سے ملالت و رنجیدگی کا زنگ اُتر جاتا؟ اس موقع پر ان آیات میں سے پہلی آیت نازل ہوئی اور اس میں قرآن کا "احسن الحدیث" کے عنوان سے تعارف کروایا گیا۔[1]

تفسیر

گزشتہ آیات میں ان بندگانِ خدا کے بارے میں گفتگو تھی جو تمام باتیں سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین کا انتخاب کرتے ہیں اور ایسے کشادہ سینوں اور شرح صدر کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی جو کلامِ حق قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔

اب زیرِ بحث آیات میں اسی مناسبت سے قرآن کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے تاکہ گزشتہ مباحث کی تکمیل کرتے ہوئے توحید و معاد کے حلقوں کے ساتھ نبوت کے دلائل کے حلقے کا بھی اضافہ ہو جائے، ارشاد ہوتا ہے: خدا نے بہترین حدیث اور بہت اچھی گفتگو بھیجی ہے (اللہ نزل احسن الحدیث)۔

اس کے بعد قرآن کے تین امتیازات بیان کرتے ہوئے اس آسمانی کتاب کی یوں توصیف کی گئی ہے:

یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات ہم آہنگ اور ہم صدا ہیں اور لطافت، دلربائی اور بیان کی گہرائی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہ ہیں (کتابا متشابھا)۔

"متشابھا" سے یہاں ایسا کلام مراد ہے جس کے مختلف حصے ایک دوسرے کے ساتھ ہم رنگ و ہم آہنگ ہیں، ان کے درمیان کسی قسم کا تضاد اور اختلاف نہیں ہے ایسا نہیں کہ اس کی آیتیں کچھ اچھی اور کچھ بُری ہوں، بلکہ ایک سے ایک بہتر ہے۔

یہ انسانی باتوں کی طرح نہیں ہے کہ جن میں جس قدر بھی غور کیا جائے اور جوں جوں وہ وسیع ہوتی جاتی ہیں ان میں خواہ مخواہ اختلافات

---

[1] یہ شانِ نزول کچھ مختلف الفاظ میں تفسیر کشاف (جلد ۴ ص ۱۲۲)، تفسیر قرطبی، تفسیر آلوسی اور تفسیر ابوالفتح رازی وغیرہ میں زیرِ بحث آیات کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔

تناقضات اور تضادات پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض تو خوبصورتی، زیبائی اور عمدگی کی بلندیوں پر ہوتے ہیں اور بعض بالکل عام اور معمولی سی۔ معروف بزرگ مصنفین و مؤلفین کے آثار خواہ وہ نظم کی صورت میں ہوں یا نثر کی صورت میں، ان کا مطالعہ اس امر پر گواہ ہے۔

لیکن کلامِ خدا، قرآن مجید ایسا نہیں ہے، انتہائی نظم و ترتیب، مفاہیم میں ہم آہنگی اور ایسی بے نظیر فصاحت و بلاغت جو اس کی تمام آیات میں جھلک رہی ہے، اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ یہ انسانوں کا کلام نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ (اس کے بیانات) مکرّر ہیں (مثانی)۔

ممکن ہے یہ تعبیر مختلف داستانوں، سرگزشتوں، پند و نصائح کو بار بار دہرانے کی طرف اشارہ ہو لیکن یہ ایسا تکرار ہے کہ جس سے ہرگز کوئی بدمزگی اور ملال پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے اور شوق پیدا ہوتا ہے اور خوشی محسوس ہوتی ہے اور یہ بات فصاحت کے اہم اصولوں میں سے ایک ہے کہ انسان ضرورت کے وقت گہری اور عمیق تاثیر پیدا کرنے کے لیے تکرار کرے لیکن ہر موقع پر ایک تازہ شکل اور ایک نئی صورت میں جس سے کوئی ملال اور بدمزگی پیدا نہ ہو۔

علاوہ ازیں قرآن کے بعض مطالب ایک دوسرے کے مفسر ہیں اور بہت سے سوالات اس طریقے سے حل ہو جاتے ہیں۔

بعض نے اسے قرآن کی بار بار تلاوت اور بار بار تلاوت کرنے سے اس کا اثر کہنہ نہ ہونے کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

بعض دیگر نے اسے قرآن کے مکرّر نازل ہونے کی طرف اشارہ سمجھا ہے، ایک مرتبہ تو شبِ قدر میں قلبِ پیغمبرؐ پر اکٹھا اور مجموعی صورت میں نازل ہوا اور دوسری مرتبہ پھر تدریجی صورت میں ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوا۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے مراد ہر زمانے میں قرآن کی حقیقت کی تکرار ہو یعنی سال اور مہینے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں پنہاں مطالب ایک نئی تجلّی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

ان تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اگرچہ ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ان سب کا جمع ہونا بھی ممکن ہے[1]

اس توصیف کے بعد، اس بحث میں قرآن کی ایک اور خصوصیت یعنی انتہائی گہری کا ذکر یوں کیا گیا ہے: اس قرآن کی آیات سن کر پروردگار کے آگے خشوع کرنے والوں کے جسم لرز اٹھتے ہیں (اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں) اس کے بعد ان کا بدن اور ان کا دل، ان کا اندر اور ان کا باہر خدا کا ذکر قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے اور سکون و اطمینان پا لیتا ہے (تقشعر منه جلود الذین یخشون ربهم ثم تلین جلودهم وقلوبهم الی ذکر الله)۔

اہلِ دلوں پر آیاتِ قرآنی کی عجیب و غریب تاثیر کی کتنی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ پہلے اس میں خوف اور ڈر پیدا کرتی ہیں، ایسا خوف جو بیداری اور حرکت کے آغاز کا سبب بنے اور ایسا ڈر جو انسان کو اس کی مختلف ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرے۔

اس کے بعد کے مرحلے میں اسے نرمی کی حالت اور حق بات قبول کرنے کی استعداد عطا فرما دیتا ہے اور اس کے بعد اسے سکون و آرام

---

[1] "مثانی" جیسا کہ زمخشری نے "کشاف" میں بیان کیا ہے۔ ممکن ہے "مثنی" (بروزن "مصلی") کی جمع ہو اور مکرر کے معنی میں ہو یا "مثنی" (بروزن "صحفا") کی جمع ہو اور تثنیہ سے لیا گیا ہو جو تکرار کے معنی میں ہے (کشاف جلد ۴ ص ۱۲۳)

حاصل ہوجاتا ہے ۔

یہ دونوں حالتیں جو" سلوک الی اللہ" کی منزلوں اور مختلف مرحلوں کی نشاندہی کرتی ہیں، پورے طور پر قابل ادراک ہیں، آیات غضب اور پیغمبر کا مقام انذار دلوں کو لرزا دیتا ہے اس کے بعد رحمت والی آیتیں انھیں سکون بخشتی ہیں

حق تعالیٰ کی ذات کے بارے میں غور و فکر اور اس ذات پاک کی ابدیت و ازلیت اور لامتناہی ہونے کا مسئلہ انسان کو وحشت زدہ کر دیتا ہے کہ اسے کس طرح پہچانا جاسکتا ہے لیکن انفس و آفاق میں اس ذات پاک کے آثار و شواہد کا مطالعہ اسے سکون و آرام بخشتا ہے۔[1]

تاریخ اسلام مومنین کے دلوں پر [illegible] غیر مومن افراد کے دلوں پر بھی کہ جن کے دل قابل تھے قرآن کی عجیب و غریب تاثیر کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے، اور یہ تاثیر اور انتہائی زیادہ [illegible] ش اس بات کی واضح و روشن دلیل ہے کہ یہ کتاب وحی کی صورت میں نازل ہوئی ہے ۔

ایک حدیث میں حضرت اسماء سے منقول ہے، وہ فرماتی ہیں:

کان اصحاب النبی حق اذا قرء علیھم القرآن کما نعتھم اللہ ۔ تدمع اعینھم و تقشعر جلودھم

اصحاب پیغمبر کے سا [illegible] وقت قرآن کی تلاوت ہوتی تھی ۔۔۔۔۔ جیسا کہ قرآن نے ان کی تعریف توصیف کی ہے ۔۔۔۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہوجاتی تھیں اور وہ لرزہ براندام ہوجاتے تھے۔[2،3]

امیر المومنین علیؑ نے پرہیزگاروں کے بارے میں یہ حقیقت اعلیٰ ترین طریقے سے بیان فرمائی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:۔

اما اللیل فصافون اقدامھم تالین لاجزاء القرآن یرتلونھا ترتیلا یحزنون بہ انفسھم و یستثیرون بہ دواء دائھم، فاذا مروا بآیۃ فیھا تشویق رکنوا الیھا طمعًا و تطلعت نفوسھم الیھا شوقًا، وظنوا انھا نصب اعینھم، و اذا مروا بآیۃ فیھا تخویف اصغوا الیھا مسامع قلوبھم وظنوا ان زفیر جھنم و شھیقھا فی اصول اٰذانھم

---

[1] "تقشعر" "قشعریرہ" کے مادہ سے ہے، جس کے لیے ارباب لغت اور مفسرین نے مختلف معانی بیان کیے ہیں، یہ معانی ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ بعض نے اسے بدن کی جلد کے جمع ہوجانے کے معنی میں (وہ حالت جو انسان کو خوف کے وقت عارض ہوجاتی ہے)۔ بعض نے اسے اس لرزش کے معنی میں سمجھا ہے۔ جو ایسے موقعوں پر جسم میں پیدا ہوتی ہے اور بعض اسے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجانے کے معنی میں سمجھتے ہیں اور حقیقت میں یہ سب کے سب معانی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ (مفردات راغب، لسان العرب، تفسیر کشاف، تفسیر روح المعانی اور قرطبی کی طرف رجوع کریں)۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۶۹۳

[3] آیات قرآن کی انتہائی تاثیر کے سلسلے میں متعدد روایات ہم تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں بیان کر چکے ہیں۔

وہ رات کو صف بستہ ہوتے ہیں، ٹھہر ٹھہر کر غور و فکر کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور اپنی روح کو اس کے ساتھ دل پذیر نغم میں مستغرق کر لیتے ہیں اور اپنے درد کی دوا اس سے طلب کرتے ہیں۔ جس وقت ایسی آیت سامنے آتی ہے جس میں تشویق ہو تو اس کے ساتھ دل بستگی پیدا کرتے ہیں، ان کی روح کی آنکھیں کمالِ شوق سے چمک اٹھتی ہیں اور وہ اسے اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں اور جس وقت وہ کسی ایسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں انداز و تخویف ہوتی ہے تو اسے دل کے کانوں کے ساتھ سنتے ہیں، گویا نالہ و فریاد کی صدائیں اور جہنم کے مہیب شعلوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی آوازیں ان کے کانوں میں گونج رہی ہوں۔

یہ اوصاف بیان کرنے کے بعد آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "اس کتاب میں خدا کی ہدایت ہے وہ جسے چاہتا ہے اس کے ساتھ ہدایت کرتا ہے" (ذلك هدى الله يهدى به من يشاء)۔

یہ درست ہے کہ قرآن سب کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے لیکن صرف حق طلب حقیقت کے جویا اور پرہیزگار اس کے نورِ ہدایت سے فائدہ اٹھائیں گے اور جنھوں نے اپنے دل کے دریچے جان بوجھ کر اس کے سامنے بند کر لیے ہیں اور تعصّب اور ہٹ دھرمی کی تاریکی ان کی روح پر چھائی ہوئی ہے، وہ نہ صرف یہ کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ عناد اور دشمنی کی وجہ سے ان کی ضلالت و گمراہی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس گفتگو کے بعد فرمایا گیا ہے: اور جس شخص کو خدا گمراہ کردے اس کے لیے کوئی ہادی و راہنما نہیں ہوگا (ومن يضلل الله فماله من هاد)۔

وہ گمراہی جس کی بنیادیں خود اس کے اپنے ہاتھ کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں اور اس کی بنیادیں اس کے غلط اعمال کی وجہ سے مضبوط ہوئی ہیں اور اسی بنا پر یہ بات انسانوں کے اصولِ اختیار اور آزادیٔ ارادہ کے ہرگز منافی نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں ظالموں اور مجرموں کا مومنین کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے، جن کی کیفیت پہلے بیان ہو چکی ہے تاکہ اس سے حقائق بہتر طور سے واضح ہو جائیں۔ فرمایا گیا ہے: کیا وہ شخص جو اپنے چہرے سے خدا کے دردناک عذاب کو دور کر لیتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جو اس دن انتہائی امن و امان کے ساتھ بسر کرے گا اور ہرگز جہنم کی آگ اس تک نہ پہنچے گی (افمن يتقى بوجهه سوء العذاب يوم القيامة)[1]

وہ نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا ضروری ہے، یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے:

وہ اپنے چہرے کے ساتھ عذاب کو اپنے سے دور کرے گا۔

---

[1] اس جملے میں ایک محذوف ہے اور یہ تقدیر میں اس طرح ہے:

افمن يتقى بوجهه سوء العذاب يوم القيامة كمن هو امن لا تمسه النار

کیا وہ شخص جو اپنے چہرے سے دردناک عذاب دور کر لیتا ہے اس شخص کے مانند ہے جو امن میں ہے اور آگ اس تک نہیں پہنچتی۔

یہ تعبیر اس بنا پر ہے کیونکہ " وجہ " (چہرہ) انسان کے اشرف اعضاء میں سے ہے اور انسان کے اہم حواس (آنکھ، کان ناک اور زبان) اس میں موجود ہیں اور اصولی طور پر انسان کی پہچان بھی چہرے کے ذریعے ہی ہوتی ہے اور ان ہی وجوہات کی بنا پر جس وقت اسے کوئی خطرہ ہوتا ہے تو اپنے ہاتھ، بازو اور جسم کے دوسرے اعضاء کو اس کے سامنے ڈھال بنالیتا ہے تاکہ خطرہ دُور کرے ۔

لیکن دوزخی ظالموں کی حالت اس دن کچھ اس طرح کی ہوگی کہ انھیں اپنے چہرے کے ساتھ ہی اپنا دفاع کرنا پڑے گا کیونکہ ان کے ہاتھ پاؤں تو زنجیر میں جکڑے ہوئے ہوں گے ۔ جیسا کہ سورۂ یٰس کی آیہ ۸ میں ہے :

ہم نے ان کی گردن میں طوق ڈال رکھے ہیں (اور ان کے ہاتھوں کو ان کے ساتھ جکڑا ہوا ہے) ان کے یہ طوق ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہوں گے ، لہٰذا ان کے سر اوپر کی طرف ہوں گے ۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ تعبیر اس بنا پر ہے کہ انھیں منہ کے بل آگ میں ڈالا جائے گا لہٰذا ان کا پہلا عضو جو آگ میں پہنچے گا وہ ان کا چہرہ ہے ، جیسا کہ سورۂ نمل کی آیہ ۹۰ میں ہے :

ومن جاء بالسیئۃ فکبت وجوھھم فی النار

اور جو لوگ بُرا کام انجام دیں گے وہ منہ کے بل آگ میں ڈالے جائیں گے ۔

کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تعبیر صرف جہنم کی آگ کے مقابلے میں ان کا اپنا دفاع نہ کرسکنے کے سلسلے کنایہ ہے ۔

یہ تینوں تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ یہ سب آیت کے مفہوم میں جمع ہوں ۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے : اس دن ظالموں سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو (وقیل للظالمین ذوقوا ما کنتم تکسبون) ۔

ہاں ! عذاب کے فرشتے ان سے یہ دردناک حقیقت بیان کریں گے کہ یہ تمھارے ہی اعمال ہیں جو تمھارے سامنے آئے ہیں اور تمھیں تکلیف دے رہے ہیں اور یہ بیان خود ان کے لیے ایک اور روحانی اذیت ہوگی ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ اپنے اعمال کی سزا اور عذاب بھگتو بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اپنے اعمال کو چکھو اور یہ بات "تجسّم اعمال" پر بھی ایک اور شاہد ہے ۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے وہ قیامت میں ان کے لیے دردناک عذاب کی طرف ایک اشارہ تھا ۔ بعد والی آیت ان کے لیے دنیاوی عذاب کی بات کرتی ہے تاکہ کہیں وہ یہ تصور نہ کرنے لگیں کہ وہ اس دنیاوی زندگی میں تو امان ہی میں رہیں گے ۔

ارشاد ہوتا ہے : وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے ، انھوں نے بھی ہماری آیات کو جھٹلایا تھا ، تو عذاب الٰہی ایسی جگہ سے ان پر نازل ہوا جہاں کا انھیں گمان بھی نہیں تھا (کذب الذین من قبلھم فاتاھم العذاب من حیث لا یشعرون) ۔

اگر انسان کو کسی ایسی جگہ سے ضرب لگے جہاں سے اسے توقع ہو تو وہ زیادہ دردناک نہیں ہوتی لیکن اگر اسے کسی ایسی جگہ سے ضرب لگے جہاں سے اسے ہرگز توقع نہ ہو تو وہ اس کے لیے کہیں زیادہ دردناک ہوتی ہے مگر اس کے نزدیک ترین دوستوں سے اس کی

زندگی کی محبوب ترین چیزوں سے، اس پانی سے جو اس کی زندگی کا سبب ہے، اس بادِ نسیم سے جو اس کی نشاط و خوشی کا موجب ہے، اس سکون وراحت والی زمین سے جو اس کی استراحت اور امن وامان کا مقام بھی جاتی ہے۔

ہاں! عذاب الٰہی کا ان طریقوں سے نزول بہت ہی دردناک ہے اور یہ وہی چیز ہے جو قوم نوح، عاد و ثمود، قوم لوط، قوم فرعون وقارون وغیرہ کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قوم انہی میں سے کسی ایک طریقے سے گرفتارِ عذاب ہوئی کہ جس کے بارے میں اسے ہرگز توقع نہ تھی۔

آخری زیرِ بحث آیت میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ان کے لیے دنیاوی عذاب صرف جسمانی پہلو ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ نفسیاتی وروحانی عذاب بھی تھا، فرمایا گیا ہے: خدا نے انھیں اس دنیاوی زندگی میں بھی ذلت وخواری کا مزہ چکھایا (فاذاقھم اللّٰہ الخزی فی الحیٰوۃ الدنیا)۔[1]

ہاں! اگر انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہوجائے لیکن وہ آبرومندانہ اور سربلندی کے ساتھ جان دے دے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ذلت وخواری کے ساتھ جان دے اور بے آبروئی اور رسوائی کے ساتھ عذاب کے چنگل میں گرفتار ہوجائے۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود آخرت کا عذاب زیادہ سخت زیادہ شدید اور زیادہ دردناک ہے، اگر وہ جانتے (ولعذاب الاٰخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون)۔

لفظ "اکبر" (زیادہ بڑا) عذاب کی شدت اور سختی کے لیے کنایہ ہے۔

ایک نکتہ

ان آیات کے ذیل میں کچھ روایات وارد ہوئی ہیں جو آیات کے مفاہیم کے زیادہ وسیع افق ہمارے سامنے مجسم کرتی ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ کے چچا حضرت عباس آپؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

اذا اقشعر جلد العبد من خشیۃ اللّٰہ تحاتت عنہ ذنوبہ کما یتحات عن الشجرۃ الیابسۃ ورقھا

جب کسی بندے کا بدن خوفِ خدا سے لرز اُٹھے تو اس کے گناہ اس طرح سے گرتے ہیں جس طرح سے درختوں کے خشک پتے جھڑتے ہیں۔[2]

---

[1] "خزی" خواری اور ذلت کے معنی میں ہے اور رسوائی وفضیحت کے معنی میں بھی آیا ہے (لسان العرب میں "خزی" کے مادہ کی طرف رجوع کریں)۔

[2] مجمع البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں، یہ روایت ابوالفتوح رازی اور قرطبی نے بھی کچھ فرق کے ساتھ نقل کی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ جو شخص خدا کے خوف سے اس طرح متاثر ہوتا ہے تو اس میں توبہ و انابت کی حالت پیدا ہوجاتی ہے اور اس قسم کا شخص یقیناً پروردگار کی مغفرت کا مستحق ہوگا۔

ایک اور حدیث میں جو حضرت اسماء سے نقل ہوئی ہے اور جسے ہم نے آیات کی تفسیر میں بھی بیان کیا ہے کہ جس وقت ان سے اصحاب پیغمبر کے بارے میں سوال ہوا تو وہ کہتی ہیں:

جس وقت وہ قرآن پڑھتے تھے ــــــ تو جس طرح سے خدا ان کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔

ان کی آنکھیں اشک بار ہوجاتی تھیں اور ان کا بدن لرز اٹھتا تھا۔

اس کے بعد راوی کہتا ہے: میں نے اسماء سے پوچھا: ہمارے ہاں بھی کچھ لوگ ہیں کہ جس وقت قرآن کی آیات سنتے ہیں تو ان پر غشی کی حالت طاری ہوجاتی ہے اور وہ مست مدہوش ہوجاتے ہیں۔

اسماء نے کہا:

اعوذ باللہ تعالیٰ من الشیطان

یعنی یہ تو ایک شیطانی عمل ہے[1]

یہ حدیث درحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے جو تصوف کا دم بھرتے ہیں اور جلسے اور حلقے بناتے ہیں اور آیات و اذکار پڑھتے ہیں، پھر اپنے آپ کو خوب حرکت دیتے ہیں اور اصطلاح کے مطابق "حال" اور وجد و مستی کی حالت میں آجاتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں، ہاؤ ہو کرتے ہیں اور اپنے آپ کو غشی کی حالت میں ڈال دیتے ہیں اور شاید بعض کو غشی ہو بھی جاتی ہے۔ اس قسم کے حالات اصحاب پیغمبر سے ہرگز نقل نہیں ہوئے اور یہ متصوفہ کی بدعات میں سے ایک ہے۔

البتہ یہ بات ممکن ہے کہ انسان شدتِ خوف کی بنا پر مدہوش ہوجائے لیکن یہ کام صوفیوں کے کاموں سے بہت مختلف ہے، جو ذکر و ورد کی ایسی محفلیں منعقد کرتے ہیں، جن کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے۔

---

[1] اس حدیث کو آلوسی نے روح المعانی (جلد ۲۳ ص ۲۲۵) سے نقل کیا ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے بھی زیر بحث آیات کے ذیل میں اسے نقل کیا ہے۔

۲۷۔ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

۲۸۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

۲۹۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَاۗءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

۳۰۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝

۳۱۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۷۔ ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال پیش کی ہے، شاید وہ متوجہ ہوں۔

۲۸۔ یہ قرآن فصیح (عربی) اور ہر قسم کی کجی اور نادرستی سے خالی ہے، شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں۔

۲۹۔ خدا نے ایک مثال بیان کی ہے: ایک شخص تو کئی شرکاء کی ملکیت ہے جو ہمیشہ اس کے بارے میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور ایک شخص ایسا ہے جو صرف ایک ہی شخص کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے، کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ حمد خدا کے لیے مخصوص ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

۳۰۔ تو مر جائے گا اور وہ بھی ضرور مر جائیں گے۔

۳۱۔ پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے پاس جھگڑو گے۔

تفسیر

قرآن میں کوئی کجی نہیں

ان آیات میں قرآن مجید اور اس کی خصوصیات کے بارے میں اسی طرح سے بحث جاری ہے اور یہ گزشتہ مباحث کا تسلسل ہیں۔

پہلے قرآن کی جامعیت کے سلسلہ میں اس طرح گفتگو ہے :

ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال پیش کی ہے۔ (و لقد ضربنا للناس فی هٰذا القرآن من کل مثل)۔

گزشتہ ستم گروں اور سرکشوں کا دردناک انجام ، گناہ کے ہولناک نتائج ، مختلف پند و نصائح ، اسرارِ خلقت ، نظامِ آفرینش اور محکم قوانین و احکام کے بارے میں۔ خلاصہ یہ کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے جو کچھ ضروری ہے ہم نے مثالوں کے پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔

شاید وہ متوجہ ہوجائیں اور راہِ خطا سے صراطِ مستقیم کی طرف لوٹ آئیں (لعلهم یتذکرون)۔

لغتِ عرب میں مثل ہر اس بات کو کہتے ہیں جو کسی حقیقت کو مجسم کر دے یا کسی چیز کی تعریف و توصیف کرے یا ایک چیز کی دوسری چیز سے تشبیہ دے۔ ان مفاہیم کی طرف توجہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ یہ تعبیر قرآن کے تمام حقائق و مطالب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور اس کی جامعیت کو واضح کرتی ہے۔

اس کے بعد قرآن کی ایک دوسری توصیف ذکر کی گئی ہے : یہ قرآن فصیح ہے اور ہر قسم کی کجی و انحراف اور تناقض و تضاد سے خالی ہے (قرآنًا عربیًا غیر ذی عوج)[1]۔

حقیقت میں یہاں قرآن کے تین اوصاف بیان ہوئے ہیں۔

پہلی تعبیر "قرآنًا" جو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آیات مرتبا پڑھی جاتی ہیں ، نماز میں اور نماز کے علاوہ خلوت میں اور اجتماع میں اور اسلام کی پوری تاریخ میں اور اختتامِ جہاں تک اور اس طرح سے یہ ایک ایسا نورِ ہدایت ہے جو ہمیشہ درخشاں رہنے والا ہے۔

---

[1] "قرآنًا عربیًا" اعراب کے لحاظ سے "القرآن" کے لیے "حال" ہے جو اس سے پہلے ذکر ہوا ہے لیکن چونکہ "قرآنًا" وصفی پہلو نہیں رکھتا لہٰذا بعض اسے "حال" کے لیے تمہید سمجھتے ہیں جو "عربیًا" ہے اور بعض "مقروًا" کے معنی میں لیتے ہیں جو وصفی معنی ہے اور بعض اسے ایک مقدر فعل سے منصوب سمجھتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اس خدائی کلام کی فصاحت، شیرینی اور کشش ہے کہ جسے "عربیًا" کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ "عربی" کا ایک معنی "فصیح" ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کسی قسم کی کجی اور ٹیڑھا پن اس میں نہیں ہے۔ اس کی آیات ہم آہنگ، اس کی تعبیریں منہ بولتی اور اس کی عبارتیں ایک دوسرے کی مفسر ہیں[1]

بہت سے اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر نے کہا ہے کہ "عِوج" (عین کی زیر کے ساتھ) معنوی انحرافات کے معنی میں ہے، جبکہ "عَوج" (عین کی فتح کے ساتھ) ظاہری انحراف کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ (البتہ پہلی تعبیر کبھی کبھی ظاہری انحرافات کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے، مثلاً سورۂ طٰہٰ کی آیہ ۱۰۷:

لا ترٰی فیھا عوجًا ولا امتًا

تو اس زمین میں کسی قسم کی کجی اور بلندی نہیں دیکھے گا۔

لہٰذا بعض اربابِ لغت پہلی تعبیر کو زیادہ عام جانتے ہیں[2]

بہرحال ان تمام اوصاف کے ہوتے ہوئے قرآن کے نزول کا ہدف و مقصد یہ تھا کہ شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں۔ "(لعلھم یتقون)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں "لعلھم یتذکرون" آیا تھا اور یہاں "لعلھم یتقون" کیونکہ ہمیشہ یاددہانی اور توجہ "تقویٰ" کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہوتا ہے اور پرہیزگاری اسی درخت کا ایک پھل ہے۔

اس کے بعد قرآن ایک مثال پیش کرتا ہے اور موحد و مشرک کے انجام کی ایک فصیح اور خوبصورت مثال کے ذریعے اس طرح تصویر کشی کرتا ہے: خدا نے ایک مثال بیان کی ہے کہ ایک تو ایسا آدمی ہے جو ایسے شرکاء کا غلام ہے جو ہمیشہ اس کے بارے میں جھگڑتے رہتے ہیں (ضرب اللّٰہ مثلًا رجلًا فیہ شرکاء متشاکسون)[3]

ایک ایسا غلام ہے جس کے کئی مالک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اسے کوئی کام کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ایک کہتا ہے فلاں کام انجام دو۔ دوسرا کہتا ہے یہ کام مت کرو۔ وہ ان دونوں کے درمیان پریشان ہے اور ان متضاد احکام کے درمیان حیران کھڑا ہے اور اسے سمجھ نہیں آرہی کہ اپنے آپ کو کس کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔

اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ اس کی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک اسے دوسرے کے حوالے کر دیتا ہے اور دوسرا

---

[1] "عوج" چونکہ نکرہ کی صورت میں سیاق نفی میں واقع ہوا ہے لہٰذا عموم کا فائدہ دیتا ہے، اس لیے ہر قسم کی کجی اور انحراف کی قرآن سے نفی کرتا ہے۔

[2] "مفردات راغب"، "لسان العرب" اور مختلف تفاسیر کی طرف رجوع کریں۔

[3] "متشاکسون" "شکاسۃ" کے مادہ سے بداخلاقی، جھگڑے اور خصومت کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "متشاکس" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو تعصب اور بدخلقی کے ساتھ بحث و نزاع اور جھگڑے میں مشغول ہو۔

اسے پہلے کی طرف پلٹا دیتا ہے لہٰذا اس لحاظ سے بھی وہ محروم ، بیچارہ ، بے نوا اور سرگرداں ہے۔ پھر ایک اور شخص ہے جو ایک ہی شخص کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے (و رجلاً سلمًا لرجل) ۔

اس کا راستہ اور پروگرام مشخص ہے۔ اس کے اوپر جسے اختیار ہے وہ معلوم ہے۔ نہ شک و تردد میں گرفتار ہے، نہ کوئی تضاد ہے نہ تناقض، سکونِ قلب اور آرامِ روح کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے اور پوری دلجمعی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے وہ ایسے شخص کی سرپرستی میں ہے جو ہر چیز میں، ہر حال میں اور ہر جگہ اس کی حمایت کرتا ہے "کیا یہ دونوں یکساں ہیں" (هل يستويان مثلًا) ۔

"مشرک" اور "موحد" کا یہی حال ہے ، مشرکین طرح طرح کے تضادات میں غوطہ زن ہیں ۔ ہر روز ایک معبود کے ساتھ دل باندھتے ہیں اور ہر وقت کسی ایک رب کا رُخ کرتے ہیں ۔ نہ کوئی آرام و سکون حاصل ہے نہ کچھ اطمینان ہے اور نہ ہی کوئی واضح راستہ ۔

لیکن موحدین کا دل خدا کے عشق کا گرویدہ ہے ۔ انھوں نے ساری کائنات میں سے اسی کو انتخاب کیا ہے اور ہر حالت میں اس کے لطف و کرم کے سایے میں پناہ لیتے ہیں جو ہر چیز سے بالا ہے ۔ انھوں نے ماسوا اللہ سے آنکھ اٹھالی ہے اور اسی پر نظریں جمادی ہیں ۔ ان کا راستہ اور پروگرام واضح ہے اور ان کی سرنوشت اور انجام روشن ہے ۔

ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

انا ذالـ الرجل السلم لرسول الله (ص)

میں ہوں وہ مرد جو ہمیشہ رسول اللہ (ص) کے لیے سرِ تسلیم خم کیے رہتا تھا ۔[1]

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے :

الرجل السلم للرجل حقا علی و شيعته

وہ مرد جو حقیقتاً سرِ تسلیم خم کیے تھا وہ علی اور ان کے شیعہ تھے ۔[2]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : حمد و سپاس خدا کے ساتھ مخصوص ہے (الحمد لله) ۔

وہ خدا جس نے ان واضح و روشن مثالوں کے ذریعے تمھیں راستہ دکھایا ہے اور تمھیں حق کی باطل سے تمیز کے لیے واضح دلائل دیئے ہیں ، وہ خدا جو سب کو اخلاص کی طرف دعوت دیتا ہے اور اخلاص کے سایے میں آرام و سکون بخشتا ہے ، کون سی نعمت اس سے بالاتر ہے؟ اور کون سا شکر و حمد اس سے زیادہ ضروری ہے ؟

"لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے" اور ان واضح دلائل کے باوجود ، حُبِّ دنیا اور سرکش مادی خواہشات کی خاطر حقیقت کی راہ اختیار نہیں کرتے (بل اکثرهم لا يعلمون) ۔

گزشتہ آیات میں توحید و شرک کے بارے میں بحث تھی اس کے بعد اب قیامت کے میدان میں توحید و شرک کے نتائج کے

---

[1] ، [2] پہلی حدیث کو "حاکم ابو القاسم حسکانی" نے شواہد التنزیل میں اور دوسری کو عیاشی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے (مجمع البیان زیرِ بحث آیات کے ذیل میں) ۔

بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

بات موت کے مسئلے سے شروع کی گئی ہے جو قیامت کا دروازہ ہے اور سب انسانوں کے لیے موت کے قانون کی عمومیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تو بھی مرجائے گا اور وہ بھی سب کے سب مرجائیں گے" (انك ميت و انهم ميتون)۔[1]

ہاں موت ایسے مسائل میں سے ہے جن میں سب لوگ یکساں ہیں، اس میں کسی قسم کا استثناء اور فرق موجود نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی راہ ہے جسے سب کو طے کرنا پڑے گا بہ الفاظ دیگر یہ وہ اونٹ ہے جو ہر شخص کے گھر میں بیٹھ چکا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے دشمن آپؐ کی موت کے منتظر رہتے تھے اور وہ اس بات پر خوش تھے کہ آخر کار وہ مرجائیں گے تو قرآن اس آیت میں انھیں جواب دیتا ہے کہ اگر پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مرجائے گا تو کیا تم زندہ رہو گے؟

سورۂ انبیاء کی آیہ ۳۴ میں بھی ہے:

افأين مت فهم الخالدون

کیا اگر تو مرجائے گا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہیں گے؟

اس کے بعد قرآن بحث کو قیامت کی عدالت میں لے گیا ہے اور میدانِ محشر میں، بندوں کے جھگڑے کی تصویر کشی کرتا ہے اور فرماتا ہے: پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے پاس جھگڑنے کے لیے کھڑے ہوگے (ثم انكم يوم القيامة عند ربكم تختصمون)۔

"تختصمون" "اختصام" کے مادہ سے دو ایسے افراد یا دو گروہوں کے درمیان نزاع و جدال کے معنی میں ہے، جن میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کی بات کو باطل کرے۔ کبھی تو ایک حق پر ہوتا ہے اور دوسرا باطل پر اور کبھی ممکن ہے کہ دونوں ہی باطل پر ہوں۔ جیسا کہ اہلِ باطل کا ایک دوسرے کے ساتھ مخاصمہ اور جھگڑا۔ اس بارے میں مفسرین میں بحث ہے کہ کیا یہ حکم عمومیت رکھتا ہے یا نہیں؟

بعض نے تو یہ تصور کیا ہے کہ یہ جھگڑا مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ مسلمانوں اور اہلِ قبلہ کے درمیان بھی جھگڑا ممکن ہے ۔اس موقع پر ابو سعید خدری سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ:

ہم پیغمبرِ خدا کے زمانے میں کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ ہم مسلمانوں کے درمیان مخاصمت ہوگی۔ ہم کہتے تھے کہ

---

[1] البتہ " انك ميت و انهم ميتون " کا جملہ حال حاضر میں سب کے مرجانے کی خبر دیتا ہے لیکن اصطلاح کے مطابق "مضارع محقق الوقوع" ہے جو کبھی حال کی صورت میں اور کبھی ماضی کی صورت میں بیان ہوتا ہے۔

ہمارا پروردگار ایک، ہمارا پیغمبر ایک، ہمارا دین ایک ہے تو اس کے باوجود جھگڑا کس طرح ممکن ہے، یہاں تک کہ صفین کا دن آپہنچا اور دو گروہ جن میں سے ہر ایک ظاہراً مسلمان تھے (اگرچہ ایک حقیقی مسلمان تھا اور دوسرا اسلام کا مدعی تھا)۔ ایک دوسرے کے مقابلے میں تلوار کھینچ کر کھڑے ہو گئے تو ہم نے کہا، ہاں! یہ آیت ہمارے بارے میں بھی ہے۔[1]

لیکن بعد والی آیات بتاتی ہیں کہ یہ مخاصمت ایک طرف سے پیغمبر اکرمؐ اور مومنین اور دوسری طرف سے مشرکین اور مکذبین کے درمیان ہوگی۔

تاریخ اسلام میں مشہور ہے کہ حضرت عمر نے وفات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کی وفات کا انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ رسول اللہ مر جائیں وہ تو اپنے پروردگار کی طرف گئے ہیں۔ جیسے موسیٰ بن عمران چالیس راتوں تک اپنی قوم سے غائب رہے تھے اور پھر ان کی طرف واپس لوٹ آئے۔ خدا کی قسم رسول اللہ بھی پلٹ کر آئیں گے جیسے موسیٰ پلٹ کر آئے تھے جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ رسول خدا مر چکے ہیں، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں، یہ بات ابوبکر تک پہنچی تو وہ عمر کے پاس آئے اور وہ بعض آیات جو پیغمبر اکرمؐ کی موت پر دلالت کرتی تھیں وہ عمر کے سامنے پڑھیں تو عمر خاموش ہو گئے اور کہا خدا کی قسم یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے یہ آیت سنی ہے۔[2]

---

[1] مجمع البیان جلد ۸ ص ۴۹۷

[2] سیرۃ ابن ہشام، جلد ۴ ص ۳۰۵، ۳۰۶، تلخیص کے ساتھ۔ یہ ماجرا کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۳۲۳، ص ۳۲۴ پر بھی نقل ہوا ہے۔

۳۲۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ○

۳۳۔ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○

۳۴۔ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ○

۳۵۔ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِیْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۳۲۔ اس سے زیادہ ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو خدا پر جھوٹ باندھے اور جو سچی بات اس کے پاس آئے اس کی تکذیب کرے۔ کیا جہنم میں کافروں کا ٹھکانا نہیں ہے؟

۳۳۔ لیکن وہ شخص جو سچی بات لے کر آئے اور وہ شخص جو اس کی تصدیق کرے، وہی تو پرہیزگار لوگ ہیں۔

۳۴۔ وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے موجود ہے اور نیکوکاروں کی جزا یہی ہے۔

۳۵۔ تاکہ خداوہ بدترین اعمال جو انھوں نے انجام دیئے ہیں بخش دے اور انھیں ان بہترین اعمال پر جو وہ انجام دیا کرتے تھے، اجر و ثواب عطا کرے۔

تفسیر

جو کلام خدا کی تصدیق کرتے ہیں

گزشتہ آیات میں میدان قیامت میں لوگوں کے حاضر ہونے اور اس عظیم عدالت میں ان کے جھگڑے کے بارے میں گفتگو تھی۔

ان آیات میں بھی وہی بحث جاری ہے اور لوگوں کو دو گروہوں "مکذبین" اور "مصدقین" میں تقسیم کر رہی ہیں۔

پہلا گروہ دو صفات کا حامل ہے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

اس سے زیادہ ستم گر اور کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ باندھے اور سچی اور حق بات جو اس کے پاس آئے اس کی تکذیب کرے۔ (فمن اظلم ممن کذب علی اللہ وکذب بالصدق اذ جاءہ)۔

بے ایمان اور مشرک لوگ خدا پر بہت ہی زیادہ جھوٹ باندھا کرتے تھے۔ کبھی فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے کبھی عیسیٰ کو اس کا بیٹا کہتے تھے۔ کبھی بتوں کو اس کی بارگاہ میں شفیع قرار دیتے تھے اور کبھی حلال و حرام کے سلسلے میں جھوٹے احکام گھڑ لیا کرتے تھے اور اس کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔

باقی رہی وہ سچی بات جو ان کے پاس آئی اور انھوں نے اس کی تکذیب کی وہ وہی آسمانی وحی قرآن مجید ہے۔

آیت کے آخر میں ایک مختصر سے جملہ میں اس قسم کے افراد کی سزا اس طرح بیان کی گئی ہے: کیا جہنم کافروں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے؟ (الیس فی جہنم مثوی للکافرین)[1]

جب "جہنم" کا نام لیا جاتا ہے تو باقی دردناک عذاب کا بھی اس میں خلاصہ بیان ہو جاتا ہے۔

دوسرے گروہ کے بارے میں بھی دو اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور جو شخص سچی اور حق بات لے کر آئے اور وہ شخص جو اس کی تصدیق کرے، وہی تو واقعی پرہیزگار ہیں (والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ھم المتقون)۔

اہل بیتؑ کی بعض روایات میں "والذی جاء بالصدق" کی پیغمبر اکرمؐ سے تفسیر بیان ہوئی ہے۔ ان میں "وصدق بہ" سے علی علیہ السلام مراد لیے گئے ہیں[2] لیکن اس سے مراد واضح مصداق کا بیان ہے کیونکہ "اولئک ھم المتقون" (وہی تو متقی ہیں) کا جملہ آیت کی عمومیت کی دلیل ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت سے ذاتِ پیغمبر مراد لینا جو وحی کے لانے والے بھی ہیں اور اس کے تصدیق کرنے والے بھی، بیانِ مصداق ہی ہونا چاہیے نہ کہ آیت کے تمام مفہوم کا بیان۔

اسی لیے بعض مفسرین نے "والذی جاء بالصدق" سے تمام پیغمبر مراد لیے ہیں اور "صدق بہ" سے ان کے سچے پیروکار مراد لیے ہیں جن میں دنیا کے تمام پرہیزگار شامل ہیں۔

اس آیت کی ایک اور عمدہ تفسیر موجود ہے جو سب سے زیادہ وسیع اور جامع تر ہے، اگرچہ مفسرین نے بہت کم اس کی طرف توجہ کی

---

[1] "مثوی" "ثواء" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے ایسا قیام جو دائمی ہو اس بنا پر "مثوی" یہاں ہمیشگی کی اور دائمی جگہ کے معنی میں ہے۔

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں

لیکن وہ آیات کے ظاہر کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے اور وہ یہ ہے کہ "الذی جاء بالصدق" وحی کا پیغام لانے والوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام ایسے افراد جو ان کے مکتب کے مبلغ تھے اور حق و صداقت کی باتوں کے مروج رہے ہیں اس صف میں شامل ہیں اور اس صورت میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ دونوں جملے ایک ہی گروہ پر منطبق ہوں (جیسا کہ آیت کی تعبیر کا ظاہر ہے، کیونکہ "والذی" صرف ایک مرتبہ ذکر ہوا ہے)

گویا یہ گفتگو ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو صدق اور سچائی کے لانے والے بھی ہیں اور اس پر عمل کرنے والے بھی۔ یہ ان لوگوں کی بات ہے جنھوں نے مکتب وحی اور پروردگار کی حق بات کو سارے عالم میں نشر کیا ہے اور خود اس پر ایمان رکھتے ہیں، چاہے وہ انبیاء و مرسلین ہوں یا ائمہ معصومین یا ان کے مکتب کو بیان کرنے والے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وحی کے بجائے "صدق" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف وہ بات جس میں جھوٹ اور غلطی کا احتمال نہیں ہے، وہی ہے جو وحی کے ذریعے پروردگار کی طرف سے نازل ہوتی ہے اور تقویٰ و پرہیزگاری صرف مکتب انبیاء کی تعلیمات کے سایے میں اور اس کی دل و جان سے تصدیق کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

بعد والی آیات میں ایسے لوگوں کیلئے تین عظیم اجر بیان کیے گئے ہیں، پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ جو کچھ بھی چاہیں گے ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے موجود ہے اور نیکوکاروں کی یہی تو جزا ہے۔ (لهم ما یشاءون عند ربهم ذالک جزاء المحسنین)۔

اس آیت کے مفہوم کی وسعت اس قدر ہے کہ تمام روحانی اور مادی نعمتیں اس میں شامل ہیں وہ سب کچھ ہمارے تصور اور وہم و گمان میں سما سکے یا نہ سما سکے۔

بعض نے یہاں ایک سوال پیش کیا ہے کہ کیا اگر وہ انبیاء و اولیاء کے مقامات کا تقاضا کریں جو خود ان سے برتر ہیں تو وہ بھی ان کو دیا جائے گا؟

یہ سوال کرنے والے اس حقیقت سے غافل ہیں کہ بہشتی لوگ چونکہ حقیقت بین آنکھ رکھتے ہیں اس لیے وہ ہرگز ایسی چیز کی فکر میں نہیں پڑیں گے جو حق و عدالت کے برخلاف اور اہلیت و جزا کے قانون کے برخلاف ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ وہ افراد جو ایمان و عمل کے مختلف درجات میں ہیں، ان کی ایک جیسی جزا ہو، بہشتی ایک محال چیز کی آرزو کیسے کریں گے؟ اس کے باوجود وہ روحانی طور پر اس طرح ہیں کہ جو کچھ ان کے پاس ہے اسی پر راضی ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی حسد پایا ہی نہیں جاتا۔

ہم جانتے ہیں کہ آخرت کے اجر، یہاں تک کہ تفضلاتِ الٰہی بھی ان اہلیتوں کی بنیاد پر ہیں جو انسان اس دنیا میں حاصل کرتا ہے، جو شخص یہ جانتا ہے کہ اس کا ایمان و عمل اس دنیا میں دوسرے کے ایمان و عمل کے برابر نہیں تھا وہ کبھی بھی ان کے مقام کی آرزو نہیں کرے گا کیونکہ یہ ایک غیر منطقی آرزو ہے۔

"عند ربهم" (ان کے پروردگار کے نزدیک) کی تعبیر ان کے بارے میں انتہائی لطفِ الٰہی کا بیان ہے گویا وہ ہمیشہ کے لیے اس کے مہمان ہیں اور وہ جو کچھ چاہیں گے اس کے پاس موجود پائیں گے۔

"ذالك جزاء المحسنين" (یہ ہے نیکوکاروں کی جزا) اس میں ضمیر کے بجائے اسم ظاہر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان جزاؤں کی علت اصلی ان کی نیکی ہی ہے۔

ان کی دوسری اور تیسری جزا اس صورت میں بیان کی گئی ہے: وہ چاہتے ہیں کہ خدا ان کے ان بدترین اعمال کو جو انھوں نے انجام دیئے ہیں بخش دے اور ان کی تلافی کر دے، انھیں ان کے ان بہترین اعمال کا جو انھوں نے انجام دیئے ہیں اجر عطا کرے۔ (ليكفر الله عنهم اسوء الذى عملوا و يجزيهم اجرهم باحسن الذى كانوا يعملون)۔[1]

کتنی عمدہ تعبیر ہے؟ ایک طرف تو وہ یہ تقاضا رکھتے ہیں کہ ان کے بدترین اعمال لطفِ الٰہی کے سایے میں چھپا دیئے جائیں اور توبہ کے پانی سے یہ داغ ان کے دامن سے دھل جائیں اور دوسری طرف سے ان کا یہ تقاضا ہے کہ خدا ان کے بہترین اعمال کو اجر و پاداش کا معیار قرار دے اور ان کے تمام اعمال کو اسی حساب سے قبول کرے۔

خداوند تعالیٰ نے بھی ان کی درخواست کو اسی تعبیر کے ساتھ قبول کر لیا ہے جیسا کہ ان آیات میں بیان کیا گیا ہے یعنی وہ بدترین کو بخش دے گا اور بہترین کو اجر و پاداش کا معیار قرار دے گا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جس وقت بڑی بڑی لغزشیں عفوِ الٰہی کی مشمول ہو جائیں، تو باقی تو بطریقِ اولیٰ مشمول ہو جائیں گی، عمدہ بات یہ ہے کہ انسان کی سب سے زیادہ پریشانی بڑی بڑی لغزشوں کے بارے میں ہی ہوتی ہے اور اسی وجہ سے مومنین کو زیادہ تر اسی کی فکر ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا گزشتہ آیات میں گفتگو پیغمبروں اور ان کے پیروکاروں کے بارے میں ہی نہیں تھی؟ وہ بڑی بڑی لغزشیں کس طرح کرتے ہیں؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ جب کسی فعل کی کسی گروہ کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ وہ سب کے سب اس فعل کے مرتکب ہوتے تھے بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ ان میں سے کچھ نے اسے انجام دیا ہو، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ بنی عباس نے رسول اللہؐ کی مسند خلافت پر ناحق قبضہ کیا تھا، تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ سب کے سب خلافت تک پہنچے تھے بلکہ کافی ہے کہ ان میں سے ایک گروہ ایسا ہو۔

زیرِ بحث آیت میں بھی پیغامِ وحی لانے والوں اور ان کے مکتب کے پیروکاروں میں سے بعض کی کچھ لغزشیں تھیں کہ جن سے خدا ان کے نیک اعمال کی وجہ سے درگزر کرے گا۔

بہر حال غفران و بخشش کا ذکر اجر و ثواب سے پہلے اس بنا پر ہے کہ پہلے انھیں اپنے آپ کو پاک و صاف کرنا چاہیئے اس کے بعد قربِ خدا کی بساط پر قدم رکھیں۔ پہلے عذابِ الٰہی سے آسودہ خاطر ہو لیں کہ جنت کی نعمتیں انھیں نصیب ہوں۔

---

[1] اس بارے میں کہ "ليكفر الله عنهم" کس سے متعلق ہے، مفسرین نے بہت سے احتمال ذکر کیے ہیں لیکن معنی کے لحاظ سے جو کچھ زیادہ مناسب نظر آتا ہے یہ ہے کہ "احسنوا" متعلق فعل ہے جو "المحسنين" سے سمجھ میں آتا ہے اور وہ تقدیر میں اس طرح ہے۔

(ذالك جزاء المحسنين احسنوا ليكفر الله عنهم .....)

ان لوگوں نے نیکیاں کیں تاکہ خدا ان کی لغزشوں کو بخش دے اور انھیں بہترین اجر دے۔

پہلا صدیق کون تھا؟

بہت سے مفسرینِ اسلام نے، خواہ وہ شیعہ ہوں یا اہلِ سنت "والذی جاء بالصدق وصدّق بہ" کی آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ "الذی جاء بالصدق" سے مراد پیغمبر اکرمؐ ہیں اور "صدّق بہ" سے مراد علی علیہ السلام ہیں۔

اسلام کے بزرگ مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں اور ابو الفتوح رازی نے روح الجنان میں اس چیز کو آئمہ اہلِ بیت سے نقل کیا ہے۔

اہلِ سنت کے علماء اور مفسرین کی ایک جماعت نے اسے پیغمبر اسلامؐ سے ابو ہریرہ کی وساطت سے یا دوسرے طرق سے روایت کیا ہے۔ مثلاً:

علامہ ابنِ مغازلی نے مناقب میں، علامہ گنجی نے کفایۃ الطالب میں، مشہور مفسر قرطبی نے اپنی تفسیر میں، علامہ سیوطی نے درالمنثور میں اور اسی طرح سے آلوسی نے روح المعانی میں[1]

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ اس قسم کی تفاسیر روشن ترین اور زیادہ واضح مصادیق بیان کے لیے ہوتی ہیں اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ علیؑ، پیغمبر اسلامؐ کے پیروکاروں اور آپ کی تصدیق کرنے والوں میں سب سے مقدم تھے اور پہلے "صدیق" آپؑ ہی ہیں۔

علماءِ اسلام میں سے کوئی بھی اس حقیقت کا منکر نہیں ہے کہ علیؑ مردوں میں سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے پیغمبر اکرمؐ کی تصدیق کی ہے بعض کی طرف سے جو تنقید کی گئی ہے وہ صرف اس بات پر ہے کہ آپؑ ایمان لانے کے وقت ۱۰ یا ۱۲ سال کے تھے اور آپؑ کا اسلام اس عمر میں قانونی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

لیکن یہ بات بہت عجیب نظر آتی ہے کیونکہ یہ بات کس طرح سے صحیح ہے جبکہ پیغمبرِ اسلام نے اسے قبول کر لیا ہے اور انھیں اپنا "وزیر" و "وصی" کہہ کر خطاب کیا اور پیغمبرِ اسلامؐ کے ارشادات میں انھیں بارہا "اول المؤمنین" یا "اولکم اسلاما" (مومنین میں سے پہلا یا تم میں سے جو سب سے پہلے اسلام لایا) کے نام کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے کہ جس کے مدارک ہم اہلِ سنت کے علماء کی کتب سے اسی تفسیر کی چوتھی جلد سورۂ توبہ کی آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے احقاق الحق جلد سوم ص ۱۷۷ اور المراجعات ص ۶۴ مراجعہ ۱۲ کی طرف رجوع کریں۔

۳۶۔ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ ؕ وَ یُخَوِّفُوۡنَکَ بِالَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ؕ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ○

۳۷۔ وَ مَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّضِلٍّ ؕ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِعَزِیۡزٍ ذِی انۡتِقَامٍ ○

ترجمہ

۳۶۔ کیا خدا اپنے بندے (کی نجات اور حفاظت) کے لیے کافی نہیں ہے لیکن وہ تجھے اس کے غیر سے ڈراتے ہیں اور جس کو خدا گمراہ کردے اس کو کوئی ہدایت کرنے والا نہیں ہے۔

۳۷۔ اور جس کو خدا ہدایت کرے اس کے لیے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے۔ کیا خدا قادر اور صاحبِ انتقام نہیں ہے؟

شانِ نزول

بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ مکہ کے بت پرست پیغمبر اکرمؐ کو بتوں کے غیظ و غضب سے ڈراتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کی بدگوئی نہ کرو اور ان کے برخلاف اقدام نہ کرو کیونکہ وہ تمھیں دیوانہ کردیں گے اور تکلیف و اذیت پہنچائیں گے (اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا گیا) [1]

بعض نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ جس وقت "خالد" پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے مشہور بت "عزیٰ" کو توڑنے پر مامور ہوا تو مشرکین نے کہا: اے خالد! بتوں کے غضب سے ڈرو کیونکہ ان کا غضب بہت سخت ہے (وہ تجھے لاچار کردے گا) خالد نے وہ کلہاڑا جو اس کے ہاتھ میں تھا مضبوطی کے ساتھ اس بت کی ناک پر مارا اور اسے توڑ پھوڑ دیا اور کہا:

کفرانک یا عزی لا سبحانک ــ سبحان من اھانک انی رأیت اللہ قد اھانک

اے عزیٰ! تیری نافرمانی اور برائی کرتا ہوں تو ہرگز منزہ اور پاک نہیں ہے۔ منزہ وہ ہے جس نے تیری توہین کی ہے، میں نے دیکھ لیا ہے کہ خدا نے تیری اہانت کی ہے [2]

---

[1] تفسیر کشاف، تفسیر مجمع البیان، تفسیر ابوالفتوح از تفسیر فی ظلال (مختلف تعبیروں کے ساتھ)

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں (کشاف اور میں بھی یہ روایت مختصراً بیان ہوئی ہے)۔

لیکن خالد کی داستان جو اصولی طور پر فتح مکہ کے بعد ہونی چاہیے شانِ نزول نہیں ہو سکتی کیونکہ سورۂ زمر ساری کی ساری مکی ہے، اس بنا پر ممکن ہے کہ تطبیق کے طور پر ہو۔

تفسیر

خدا کافی ہے

ان تہدیدوں کے بعد جو خدا نے گزشتہ آیات میں مشرکین کے لیے بیان کی گئی ہیں اور ان وعدوں کے بعد جو اس نے رسول اکرمؐ سے کیے ہیں، پہلی زیر بحث آیت میں کفار کی دھمکیوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا خدا اپنے بندے کی دشمنوں سے نجات اور حفاظت کے لیے کافی نہیں ہے لیکن وہ تجھے اس کے غیر سے ڈراتے ہیں (الیس اللہ بکاف عبدہ و یخوفونك بالذین من دونہ)۔

وہ خدا جس کی قدرت تمام قدرتوں سے برتر ہے اور جو اپنے بندوں کی حاجات اور مشکلات سے اچھی طرح واقف ہے اور ان کے لیے انتہائی لطف اور مہربانی رکھتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ اپنے ایمان دار بندوں کو حوادث کے طوفان اور دشمنوں کی موجِ عداوت کے مقابلے میں اکیلا چھوڑ دے، جبکہ وہ اپنے بندے کا پشتیبان ہے۔ ؎

اگر تیغِ عالم بجنبد ز جای

نبرد رگی چوں نخواہد خدای!

اگر زمانے کی تلوار اپنی جگہ سے حرکت کرے تو جب تک خدا نہ چاہے وہ رگِ گردن نہیں کاٹ سکتی اور جس وقت وہ چاہے کہ کسی کی مدد کرے تو: ؎

ہزار دشمنم ار می کنند قصد ہلاک

گرم تو دوستی از دشمنان ندارم باک

اگر میرا دشمن ہزار مرتبہ میری ہلاکت کا ارادہ کرے، اگر تو میرا دوست ہے تو پھر مجھے دشمنوں کا کوئی خوف نہیں ہے۔

چہ جائیکہ یہ بت جو بے قدر و قیمت اور بے خاصیت چیزیں ہیں۔

اگرچہ آیت کی شانِ نزول مذکورہ روایت کے مطابق بتوں کے غضب سے ڈرانے دھمکانے کے بارے میں ہے، لیکن آیت کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ اس میں غیر خدا کی ہر قسم کی تہدید شامل ہے، بہرحال یہ آیت راہِ حق پر چلنے والے تمام سچے مومنین کے لیے ایک نوید ہے، خصوصاً ایسے ماحول اور معاشرے میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور انھیں ہر طرف سے دھمکیاں ملتی رہتی ہیں۔

یہ آیت ان کے دلوں کو گرماتی اور ثباتِ قدم بخشتی ہے، نشاط و خوشی سے ان کی روح کو سرشار اور ان کے قدموں کو استوار کرتی ہے

اور دشمنوں کی نزیاں بار نفسیاتی دھمکیوں کو بے کار کر دیتی ہے۔ ہاں! جب خدا ہمارے ساتھ ہے تو پھر ہمیں اس کے غیر سے کیا ڈر ہے اور اگر ہم اس سے بیگانہ اور جدا ہو جائیں تو پھر ہر چیز ہمارے لیے دہشت ناک ہے۔

اس آیت کے آخر میں اور بعد والی آیت میں ہدایت و گمراہی کے بارے میں گفتگو ہے اور لوگوں کو دو گروہوں گمراہ اور ہدایت یافتہ میں تقسیم کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ تمام بندے اس کی بارگاہ کے نیازمند اور محتاج ہیں اور عالم ہستی میں کوئی چیز اس کے چاہے بغیر نہیں ہوتی، فرمایا گیا ہے: جسے خدا گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت کرنے والا نہیں ہے (ومن یضلل اللہ فما لہ من ھاد)۔

اور جسے خدا ہدایت کرے کوئی شخص اسے گمراہ نہیں کر سکتا (ومن یھد اللہ فما لہ من مضل)۔

یہ بات ظاہر ہے کہ نہ وہ ضلالت و گمراہی بلا وجہ ہے اور نہ ہی یہ ہدایت بغیر کسی حساب کتاب کے ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک خود انسان کی خواہش اور اس کی سعی و کوشش کا ایک تسلسل ہے اگر کوئی شخص گمراہی کی راہ میں قدم رکھتا ہے اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ نور حق کو خاموش کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے، دوسروں کو غافل کرنے میں کوئی موقع جانے نہیں دیتا اور سر سے لے کر پاؤں تک گناہ و عصیان میں غرق ہو جاتا ہے تو یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ خدا اسے گمراہ رکھتا ہے، نہ صرف یہ کہ اس سے توفیق ہدایت سلب کر لیتا ہے بلکہ اس کی ادراک اور پہچان کی قوت کو بھی بیکار کر دیتا ہے، اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور یہ نتیجہ ہے ان اعمال کا جنھیں وہ انجام دیتا ہے۔

لیکن جو لوگ خلوص نیت کے ساتھ "سیر الی اللہ" کا ارادہ رکھتے ہیں، اس کے اسباب فراہم کرتے ہیں اور ابتدائی قدم اٹھا لیتے ہیں تو ہدایت الٰہی کا نور ان کی مدد کے لیے آگے بڑھتا ہے اور حق کے فرشتے ان کی مدد کو آتے ہیں اور شیاطین کے وسوسوں کو ان کے دلوں سے دور کرتے ہیں، ان کے ارادوں کو قوی اور ان کے قدموں کو استوار کرتے ہیں اور مقامات لغزش پر لطف الٰہی ان کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

یہ ایسے حقائق ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید کی بہت سی آیات شاہد و گواہ ہیں اور کتنے بے خبر ہیں وہ لوگ جو اس قسم کی آیات کا قرآن کی دوسری آیات سے رابطہ منقطع کر کے انھیں مکتب جبر کا گواہ بناتے ہیں، گویا وہ یہ بات نہیں جانتے کہ آیات قرآنی ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔

بلکہ اسی زیر بحث آیت کے ذیل میں اس معنی پر ایک واضح شاہد موجود ہے، کیونکہ فرمایا گیا ہے: کیا خدا قادر اور صاحب انتقام نہیں ہے (الیس اللہ بعزیز ذی انتقام)۔

ہم جانتے ہیں کہ خدا کی طرف سے انتقام ان غلط اعمال کے مقابلے میں سزا و عذاب کے معنی میں ہے جو انجام دیئے گئے ہیں۔ یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کا گمراہ کرنا سزا کا پہلو رکھتا ہے اور وہ خود انسانوں کے اعمال کا ردعمل ہے نیز طبعی و فطری طور پر اس کی ہدایت بھی اجر و پاداش کا پہلو رکھتی ہے اور خالص و پاک اعمال اور اللہ کی راہ میں مجاہدے کا عکس العمل ہے [1]

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "نقمت" "عقوبت" اور سزا کے معنی میں ہے۔

چند نکات

۱۔ <u>ہدایت اور ضلالت خدا کی طرف سے ہے:</u> لغت میں ہدایت کا معنی دلالت و رہنمائی ہے جو دقیق طور پر اور لطف کے ساتھ ہو۔[1]

اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک "ارائه طریق" (راستہ دکھانا) اور "ایصال به مطلوب" دوسرے لفظوں "ہدایت تشریعی" اور "ہدایت تکوینی"۔[2]

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ بعض اوقات انسان ایسے شخص کو پوری دقت اور لطف و عنایت کے ساتھ راستہ دکھاتا ہے، جو اس کا طالب ہے، لیکن راستہ طے کرنا اور مقصود تک پہنچنا خود اس کے ذمہ ہوتا ہے۔

لیکن کبھی طالبانِ مقصد کا ہاتھ پکڑ کر راستہ دکھانے کے علاوہ اسے مقصد تک بھی پہنچا دیا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں پہلے مرحلے میں صرف قوانین و احکام بیان کر کے راستہ طے کرنے کی شرائط و حالات اور مقصد تک پہنچنے کو بیان کر دیا جاتا ہے، لیکن دوسرے مرحلے میں اس کے علاوہ سفر کے وسائل فراہم کیے جاتے ہیں، رکاوٹوں کو دور کیا جاتا ہے مشکلات حل کی جاتی ہیں اور اس راستے کے مسافروں کی مقصد تک ہمراہی، حفاظت اور حمایت کی جاتی ہے۔

البتہ اس کا متضاد "اضلال" ہے۔

آیات قرآنی پر ایک اجمالی نگاہ ہی اچھی طرح سے واضح کر دیتی ہے کہ قرآن ہدایت و ضلالت کو خدا کا فعل شمار کرتا ہے اور دونوں کی اپنی طرف نسبت دیتا ہے۔ اگر ہم اس سلسلے کی تمام آیات شمار کریں تو بات لمبی ہو جائے گی بس اتنا ہی کافی ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۱۲ میں یہ بیان ہوا ہے:

والله یهدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم

خدا جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔

نیز سورۂ نحل کی آیہ ۹۳ میں یہ بیان ہوا ہے:

ولکن یضل من یشاء و یهدی من یشاء

لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

ہدایت و ضلالت دونوں کے بارے میں یا ان دونوں میں سے ایک کے متعلق ایسی ہی تعبیر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں نظر آتی ہے۔[3]

---

[1] مفردات مادہ "هدی"

[2] غور کیجیے کہ یہاں ہدایت تکوینی ایک وسیع معنی میں لی گئی ہے اس میں قوانین کو بیان کرنے اور راستہ دکھانے کے علاوہ ہر طرح کی ہدایت شامل ہے۔

[3] مثال کے طور پر دیکھیے: فاطر ۸، زمر ۲۳، مدثر ۳۱، بقرہ ۲۷۲، انعام ۸۸، یونس ۲۵، رعد ۲۷، اور ابراہیم ۴

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض آیات میں صراحت کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ سے نفی کی ہے اور خدا کی طرف نسبت دی ہے، چنانچہ سورۂ قصص کی آیہ ۵۶ میں ہے:

انك لا تهدى من احببت ولكن الله يهدى من يشاء

تُو جسے چاہے ہدایت نہیں کر سکتا لیکن خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۷۲ میں ہے:

ليس عليك هداهم ولكن الله يهدى من يشاء

انھیں ہدایت کرنا تیرے ذمہ نہیں ہے لیکن خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

ان آیات کے سطحی مطالعے اور ان کے عمیق اور گہرے معنی کا ادراک نہ کرنے کے باعث ایک گروہ ان کی تفسیر کرنے میں گمراہ ہوگیا اور راہِ ہدایت سے انحراف کر بیٹھا اور اس نے مکتبِ جبر کو اختیار کر لیا۔ یہاں تک کہ بعض مشہور مفسر بھی اس آفت سے محفوظ نہ رہ سکے اور اس ہولناک گڑھے میں جا گرے، یہاں تک کہ انھوں نے ہدایت وضلالت کو تمام مراحل میں جبری سمجھ لیا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ چونکہ اس عقیدہ کا مسئلہ عدالتِ الٰہی اور حکمتِ خداوندی سے تضاد واضح تھا لہٰذا اُسے ترجیح دیتے ہوئے اصل عدالت کے ہی منکر ہو گئے تاکہ اپنی غلطی کی اصلاح کر لیں، اصولاً اگر ہم اصولِ جبر کے قائل ہوں تو پھر شرعی ذمہ داری رسولوں کے بھیجنے اور آسمانی کتابوں کے نازل کرنے کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

لیکن وہ لوگ جو مکتبِ اختیار کے طرفدار ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی عقلِ سلیم اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ خدا کسی گروہ کو ضلالت وگمراہی کا راستہ طے کرنے پر مجبور کرے اور پھر اس جبری کام کی وجہ سے اسے سزا بھی دے یا کسی گروہ کو ہدایت پر مجبور کرے اور اس کے بعد بغیر کسی وجہ سے انھیں جزا بھی دے اور ایسے کام کی وجہ سے جسے انھوں نے خود سے انجام نہیں دیا ہے انھیں دوسروں پر امتیاز بھی دے، ان لوگوں نے ان آیات کی تفسیر کے لیے دوسرے راستے اختیار کیے ہیں، جن میں سے زیادہ اہم حسبِ ذیل ہیں

۱۔ ہدایتِ الٰہی سے مراد ہدایتِ تشریعی ہے، جو وحی، آسمانی کتابوں اور پیغمبروں اور ان کے اوصیاء کے ذریعے اور اسی طرح عقل و وجدان کے ادراک سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ لیکن تمام مراحل میں راستہ طے کرنا خود انسان کے اپنے ذمہ ہے۔

البتہ یہ تفسیر ہدایت والی بعض آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہے لیکن دوسری بعض آیات کی یہ تفسیر نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ صراحت کے ساتھ "ہدایت تکوینی" اور "ایصال به مطلوب" کے بارے میں ہیں۔ مثلاً سورۂ قصص کی آیہ ۵۶ میں ہے کہ:

تو جس شخص کو پسند کرے ہدایت نہیں کر سکتا لیکن خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہدایت تشریعی اور راستہ دکھانا پیغمبروں کی اصلی ذمہ داری ہے۔

۲۔ مفسرین کی ایک اور جماعت نے ہدایت وگمراہی کی اس مقام پر جہاں وہ تکوینی پہلو رکھتی ہے، جزا و سزا اور بہشت و دوزخ کے راستے تک پہنچانے کے معنی میں تفسیر کی ہے، انھوں نے یہ کہا ہے کہ خدا نیکوکاروں کو بہشت کے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے اور بدکاروں کو اس سے گمراہ کرتا ہے۔

البتہ یہ معنی بھی صرف بعض آیات کے بارے میں صحیح ہے لیکن دوسری آیات کے بارے میں لفظ ہدایت وضلالت کے مطلق ہونے اور ان میں کسی قسم کی قید و شرط نہ ہونے کی وجہ سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

۳۔ ایک اور جماعت نے یہ کہا ہے کہ ہدایت سے مراد مقصود تک پہنچنے کے اسباب و مقدمات فراہم کرنا ہے اور ضلالت سے مراد ان کو مہیا نہ کرنا یا انھیں حذف کرنا ہے۔ بعض نے اسے "توفیق" اور "سلبِ توفیق" سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ توفیق سے مراد مقصود تک پہنچنے کے لیے مقدمات کا فراہم ہونا اور سلبِ توفیق انھیں اٹھا لینا ہے۔

اس بنا پر خدا کی ہدایت اس طرح نہیں ہے کہ خدا جبری طور پر انسانوں کو مقصد تک پہنچا دے بلکہ اس طرح ہے کہ اس کے وسائل انھیں مہیا کر دے۔ مثلاً اچھے مربی کا ہونا، تربیت کے ماحول کا صحیح ہونا، دوستوں اور ساتھ دینے والوں کا صالح و نیک ہونا اور اسی قسم کی دوسری چیزیں سب کی سب مقدمات ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انسان کو ہدایت کا راستہ طے کرنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ وہ ان سب کو پسِ پشت ڈال کر راہِ ضلالت کو اختیار کر سکتے ہیں۔

لیکن اس تفسیر میں اس سوال کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ یہ توفیقات ایک گروہ کے شاملِ حال کیوں ہوتی ہیں، جبکہ دوسرا گروہ ان سے محروم رہتا ہے۔

اس تفسیر کے طرفداروں کو خدا کے افعال کے حکیمانہ ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس فرق کے دلائل ذکر کرنا پڑیں گے۔ مثلاً یہ کہیں کہ عملِ خیر انجام دینا توفیقِ الٰہی کا سبب بنتا ہے اور اعمالِ شر انجام دینا انسان سے توفیق سلب کر لیتا ہے۔

بہر حال یہ ایک اچھی تفسیر ہے لیکن مطلب پھر بھی اس سے زیادہ گہرا ہے۔

۴۔ دقیق ترین تفسیر جو ہدایت وضلالت کی تمام آیات سے ہم آہنگ ہے اور ان سب کا مفہوم اچھی طرح سے واضح کرتی ہے بغیر اس کے کہ اس میں کوئی معمولی سا بھی خلاف ظاہر پایا جائے یہ ہے کہ ہم کہیں کہ:

ہدایت تشریعی راستہ دکھانے کے معنی میں جنبۂ عمومی رکھتی ہے اور کسی قسم کی قید و شرط اس میں نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۂ دہر کی آیہ ۳ میں بیان ہوا ہے کہ:

انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرًا و اما کفورًا

ہم نے انسان کو راستہ دکھا دیا ہے اب چاہے وہ شکر گزاری کرے یا کفران و ناشکری کرے۔

نیز سورۂ الشوریٰ کی آیہ ۵۲ میں یہ بیان ہوا ہے کہ:

و انک لتھدی الٰی صراط مستقیم

تو تمام انسانوں کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ نبی کی دعوت خدا کی دعوت کی مظہر ہے کیونکہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے۔

اور منحرفین اور مشرکین کی ایک جماعت کے بارے میں سورۂ نجم کی آیہ ۲۳ میں ہے:

و لقد جاءھم من ربھم الھدٰی

خدائی ہدایت پروردگار کی طرف سے ان کے پاس آئی۔

لیکن ہدایت تکوینی جس کا معنی ہے ایصال بہ مطلوب اور بندوں کا ہاتھ پکڑ کر راستے کے تمام پیچ وخم سے گزار کر لے جانا اور ان کی حفاظت کرنا، ساحلِ نجات تک پہنچانے تک، یہ بہت سی دوسری آیات کا موضوعِ بحث ہے۔ یہ ہدایت ہرگز غیر مشروط نہیں ہے یہ ہدایت ایسے گروہ کے ساتھ مخصوص ہے جس کے اوصاف قرآن میں بیان ہوئے ہیں اور گمراہ کرنا جو اس کا الٹ ہے وہ بھی ایک ایسے گروہ کے ساتھ مخصوص ہے کہ جن کے اوصاف بیان ہو چکے ہیں۔

اگرچہ بعض آیات مطلق ہیں، لیکن بہت سی دوسری آیات نے ان کی قیدو شرط کو وقت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور جس وقت ان مطلق اور مقید آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر رکھیں تو پھر مطلب پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے اور آیات کے معنی میں کسی قسم کا ابہام اور تردّد باقی نہیں رہتا اور وہ نہ صرف یہ کہ انسان کے اختیار اور ارادے کی آزادی کے خلاف نہیں ہے بلکہ پوری طرح اس کی تاکید کرتا ہے۔

ایک وضاحت

قرآن مجید ایک جگہ کہتا ہے:

یضل بہ کثیرًا و یھدی بہ کثیرًا و ما یضل بہ الّا الفاسقین

وہ ان ضرب الامثال کے ذریعے بہت سوں کو گمراہ اور بہت سوں کو ہدایت کرتا ہے لیکن فاسقوں کے علاوہ اور کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ (بقرہ ——— ۲۶)

یہاں ضلالت کا سرچشمہ فسق اور اطاعت و فرمانِ الٰہی سے خروج کو شمار کیا گیا ہے

ایک اور جگہ قرآن کہتا ہے:

و اللہ لا یھدی القوم الظالمین

خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ (بقرہ ——— ۲۵۸)

یہاں ظلم کا ذکر ہے اور اسے ضلالت کے لیے میدان ہموار کرنے والے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری جگہ ہے:

و اللہ لا یھدی القوم الکافرین

اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ (بقرہ ——— ۲۶۴)

یہاں کفر کا گمراہی کے لیے زمین ہموار کرنے والے کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔

ایک اور آیت میں بیان ہوا ہے۔

ان اللہ لا یھدی من ھو کاذب کفار

خدا جھوٹے اور کفران کرنے والے کو ہدایت نہیں کرتا۔ (زمر ——— ۳)

ایک دوسری جگہ آیا ہے :

ان اللہ لا یھدی من ھو مسرف کذاب

خدا بہت زیادہ جھوٹ بولنے والے اور اسراف کرنے والے کو ہدایت نہیں کرتا۔

(مؤمن ——— ۲۸)

یعنی اسراف اور دروغ گوئی گمراہی کے عامل ہیں۔

البتہ ہم نے جو کچھ یہاں پر بیان کیا ہے یہ اس سلسلے میں قرآن کی آیات کا ایک حصّہ ہے، ان آیات میں سے بعض انھیں مفاہیم کے ساتھ مختلف سورتوں میں بار بار آئی ہیں۔

نتیجۂ کلام یہ ہے کہ قرآن خدائی ضلالت کو ایسے افراد کے ساتھ مخصوص شمار کرتا ہے جو ان اوصاف کے حامل ہیں : کفر، ظلم، فسق دروغ، اسراف اور کفران۔

کیا وہ لوگ جو ان اوصاف کے حامل ہیں وہ ضلالت و گمراہی کے لائق نہیں ہیں ؟

دوسرے لفظوں میں جو شخص ان امور کا مرتکب ہوتا ہے کیا اس کے دل پر تاریکی کے پردے نہیں پڑجاتے ؟

زیادہ واضح عبارت میں ان اعمال و صفات کے کچھ آثار ہیں جو خواہ مخواہ انسان کو دامن گیر ہوجاتے ہیں، اس کی آنکھ، کان اور عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور اسے ضلالت و گمراہی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔

چونکہ سب چیزوں کی خاصیت اور تمام اسباب کی تاثیر حکم خدا سے ہے، اس بنا پر ان تمام مراحل میں گمراہ کرنے کی نسبت خدا کی طرف دی جاسکتی ہے لیکن یہ نسبت بندوں کا عین اختیار اور ارادے کی آزادی ہے۔

یہ بات تو ہوئی مسئلۂ ضلالت و گمراہی کے سلسلے میں، باقی رہا ہدایت کے سلسلے میں تو اس کے لیے بھی قرآن میں کئی شرائط و اوصاف بیان ہوئے ہیں، جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ بھی علت و سبب کے بغیر نہیں ہے اور حکمتِ الٰہی کے برخلاف نہیں ہے۔

اوصاف کا ایک حصّہ جو استحقاقِ ہدایت پیدا کرتا ہے اور لطفِ الٰہی کو کھینچتا ہے۔ ذیل کی آیات میں آیا ہے : ایک جگہ بیان ہوا ہے۔

یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام ویخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ ویھدیھم الی صراط مستقیم

خدا قرآن کے ذریعے ان لوگوں کو جو اس کی رضا و خوشنودی کی پیروی کرتے ہیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے اور اپنے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور انھیں راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

(مائدہ ——— ۱۶)

یہاں فرمانِ خدا کی پیروی اور اس کی خوشنودی کے حصول کو ہدایتِ الٰہی کے لیے راہ ہموار کرنے والا شمار کیا گیا ہے۔

دوسری جگہ بیان ہوا ہے :

ان اللہ یضل من یشاء و یھدی الیہ من اناب

خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو شخص اس کی طرف رجوع اور بازگشت کرے اس کی ہدایت کرتا ہے۔ (رعد ـــــ ۲۷)۔

یہاں توبہ وانابت کو استحقاق ہدایت کا عامل شمار کیا گیا ہے ؛

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے :

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں ہم انھیں اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں ۔ (عنکبوت ـــــ ۶۹)

یہاں پر "جہاد" وہ بھی مخلصانہ جہاد، جو خدا کی راہ میں ہو، ہدایت کی اصلی شرط کے طور پر ذکر ہوا ہے ۔

ایک دوسری آیت میں یہ بھی بیان ہوا ہے :

والذین اھتدوا زادھم ھدی

جنھوں نے ہدایت کے لیے پہلے قدم اٹھا لیے ہیں، خدا ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے ۔ (محمد ـــــ ۱۷)

یہاں راہِ ہدایت کی کچھ مقدار کو طے کر لینا، لطفِ خدا سے اس راستے کے جاری رہنے کی ایک شرط کے عنوان سے ذکر ہوا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ جب تک بندوں کی طرف سے توبہ وانابت نہ ہو، جب تک وہ اس کے فرمان کے پیرو نہ بنیں، جب تک جہاد اور سعی وکوشش نہ کریں اور جب تک راہِ حق میں پہلا قدم نہ اٹھائیں لطفِ الٰہی ان کے شاملِ حال نہیں ہوتا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں مطلوب تک نہیں پہنچاتا ۔

جو ان اوصاف کے حامل ہیں کیا ایسے افراد کے لیے ہدایت کا حصول بے سبب ہے یا کیا یہ ہدایت کے جبری ہونے کی دلیل شمار ہوگی ؟

آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کی آیات اس سلسلے میں بہت واضح اور منہ بولتی ہیں ۔ البتہ وہ لوگ جو آیاتِ ہدایت وضلالت کی صحیح طور سے جمع بندی نہ کر سکے یا انھوں نے جمع کرنا نہ چاہا وہ اس قسم کی خطرناک غلطی میں گرفتار ہو گئے ہیں اور بقول ے :

ع چوں ندیدند حقیقت، رہ افسانہ زدند

(چونکہ حقیقت کو نہ دیکھ پائے لہذا افسانے کی راہ اختیار کر لی)

یہ کہنا چاہیے کہ اس "ضلالت" کے لیے زمین انھوں نے خود ہموار کی ہے ۔

بہرحال مشیتِ الٰہی کہ ہدایت وضلالت کی مذکورہ آیات ہرگز بے دلیل اور حکمت ومصلحت سے خالی مشیت کے معنی میں نہیں ہیں، بلکہ ہر موقع ومحل پر اس کی خاص شرائط ہیں جو اسے خدا کے حکیم ہونے کے ساتھ ہم آہنگ کرتی ہیں ۔

۲۔ لطف خدا کا ذکر: انسان حوادث کی تند و تیز ہوا کے سامنے گھاس کے ایک تنکے کے مانند ہے اور ہر وقت کسی بھی طرف پھینکا جا سکتا ہے، ممکن ہے کہ گھاس کا یہ تنکا کسی پتے یا ٹوٹی ہوئی شاخ کے ساتھ جا ملے لیکن تیز ہوا ان دونوں کو ہی اڑا لے جائے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی درخت کے ساتھ جا چپکے تو ممکن ہے کبھی طوفان درخت کو بھی اکھاڑ لے جائے لیکن اگر وہ کسی بہت بڑے پہاڑ کے ساتھ جڑ جائے تو کوئی بھی طوفان اسے اس کی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔

یہ پہاڑ تو خدا پر ایمان کا ہی دوسرا نام ہے اور باقی جو کچھ بیان ہوا وہ اس کے غیر پر بھروسہ کرنے کے طرح ہے اور اسی بنا پر مذکورہ بالا آیات میں قرآن کہتا ہے:

الیس اللہ بکاف عبدہ

کیا خدا اپنے بندے کی حمایت کے لیے کافی نہیں ہے؟

اس آیت کے مضمون و مطالب پر توجہ اور ایمان انسان کو بہت زیادہ شجاعت اور اعتماد ذات بخشتا ہے، اس کے دل کو آرام و سکون دیتا ہے تاکہ سخت حوادث کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح ڈٹ جائے، دشمنوں کی کثرت سے نہ ڈرے اور ساتھیوں کی کمی سے نہ گھبرائے اور شدید بحران اس کا روحانی سکون درہم برہم نہ کرے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

المؤمن کالجبل الراسخ لا تحرکہ العواصف

مومن مضبوط پہاڑ کی طرح ہے اسے تند و تیز آندھیاں اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں۔

۳۸۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ○

۳۹۔ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ۙ

۴۰۔ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ○

ترجمہ

۳۸۔ اور اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً وہ یہی کہیں گے کہ خدا نے، کہہ دے: کیا تم نے کبھی ان معبودوں کے بارے میں سوچا ہے جنھیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو۔ کہ اگر خدا کوئی ضرر میرے لیے چاہے تو کیا وہ اس کے ضرر کو برطرف کر سکتے ہیں یا وہ میرے لیے کسی رحمت کا ارادہ کرے تو کیا ان میں اس کی رحمت کو روک لینے کی طاقت ہے؟ کہہ دے خدا میرے لیے کافی ہے اور تمام توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے۔

۳۹۔ کہہ دے: اے میری قوم! جو کچھ تمھارے بس میں ہے اسے کرگزرو، میں تو اپنی ذمہ داری پوری کروں گا لیکن بہت جلد تمھیں معلوم ہو جائے گا ...... کہ

۴۰۔ دنیا کا ذلیل و خوار کرنے والا عذاب کس کے لیے آتا ہے، اور اس کے بعد (آخرت کا) جاودانی عذاب اس پر وارد ہوتا ہے۔

تفسیر

تمھارے معبود کوئی مشکل حل کر سکتے ہیں؟

گزشتہ آیات میں مشرکین کے انحرافی عقائد اور ان کے برے نتائج کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب زیر بحث آیات میں توحید کے دلائل سے متعلق گفتگو کی گئی ہے تاکہ گزشتہ بحث کو دلیل سے مکمل کیا جائے، نیز گزشتہ آیات میں اس سلسلے میں گفتگو تھی کہ خدا کی حمایت ہی کافی ہے، اس مسئلے کو بھی زیر بحث آیات میں دلیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اگر تو ان سے سوال کرے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً وہ یہی کہیں گے کہ خدا نے (ولئن سألتهم من خلق السماوات والارض ليقولن الله)۔

کیونکہ کوئی وجدان اور عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ یہ وسیع و عریض جہان، اتنی عظمت و بزرگی کے ساتھ کسی زمینی موجود کی مخلوق ہو، چہ جائیکہ بے روح اور بے عقل و شعور بتوں کی مخلوق ہو۔ اس طرح سے قرآن انھیں عقل کے فیصلے اور وجدان و فطرت کے حکم کی طرف لے جاتا ہے تاکہ توحید کی پہلی بنیاد کو کہ جو آسمان و زمین کی خالقیت ہے، ان کے دلوں میں محکم کرے۔

بعد والے مرحلے میں انسان کے سود و زیاں اور اس کے نفع و نقصان میں تاثیر کو بیان کرتا ہے تاکہ یہ ثابت کرے کہ بت اس سلسلے میں کچھ اثر نہیں رکھتے، مزید کہتا ہے: ان سے کہہ دے: خدا کے علاوہ جن معبودوں کو تم پکارتے ہو کیا تم نے کبھی ان کے متعلق سوچا ہے کہ اگر خدا میرے لیے کسی نقصان کا ارادہ کرے، تو کیا وہ اسے برطرف کر سکتے ہیں یا اگر میرے لیے کسی رحمت کا ارادہ کرے تو کیا ان میں اس کی رحمت کو روک لینے کی طاقت ہے (قل افرأيتم ما تدعون من دون الله ان ارادني الله بضر هل هن كاشفات ضره او ارادني برحمة هل هن ممسكات رحمته)[1]

اب جبکہ نہ ان کے لیے خالقیت ثابت ہے اور نہ ہی وہ سود و زیاں کی کوئی قدرت رکھتے ہیں، تو ان کی پرستش کیا معنی رکھتی ہے؟ مبدءِ جہانِ آفرینش اور ہر سود و زیاں کے مالک کو چھوڑ کر ان بے خاصیت اور بے شعور موجودات کا دامن کیوں تھاما جائے؟ اور اگر ان کے معبود باشعور ہوتے جیسے جنات اور فرشتے کہ جن کی بعض بت پرست پرستش کیا کرتے تھے۔ تو پھر بھی نہ وہ خالق ہیں اور نہ سود و زیاں ان کے بس میں ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں ایک کلی اور آخری نتیجے کے طور پر قرآن کہتا ہے: کہہ دے خدا میرے لیے کافی ہے اور سب توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے (قل حسبی الله عليه يتوكل المتوكلون)۔

یہ بات کہ مشرکین آسمان و زمین کی خالقیت کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے تھے بارہا قرآن کی آیات میں بیان ہوئی ہے[2]

---

[1] عام طور پر مفسرین اور ارباب لغت "افرأیتم" کے جملے کی "اخبرونی" (مجھے بتاؤ) کے معنی میں تفسیر کرتے ہیں، حالانکہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہاں "رؤیت" کی اس کے اصل معنی یعنی آنکھ یا دل سے دیکھنے کے معنی میں تفسیر کی جائے اس بنا پر "کیا تم نے مشاہدہ کیا" یا "کیا تمھیں معلوم ہوا" کا معنی کیا جا سکتا ہے۔

[2] عنکبوت ۶۱، ۶۳ ، لقمان ۲۱ ، زخرف ۹، ۸۷

یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ بات ان کے نزدیک بالکل مسلّمہ تھی اور یہ بات خود شرک کے بطلان پر ایک بہترین سند ہے کیونکہ عالم ہستی کی توحید خالقیت و مالکیت و ربوبیت بذاتِ خود توحیدِ عبودیت پر بہترین دلیل ہے اور اس کا نتیجہ خدا کی پاک ذات پر توکل اور اس کے غیر سے آنکھیں پھیر لینا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابراہیم بت شکن کی سرکش نمرود کے ساتھ مقابلے کے موقع پر اس نے عالم ہستی کی ربوبیت کا دعویٰ کیا اور لوگوں کی موت وحیات کو اپنے ہاتھ میں قرار دیا۔ پھر جب ابراہیمؑ نے کہا کہ اگر تو سچ کہتا ہے تو سورج کو مغرب سے نکال کے دکھا تو وہ مبہوتؑ خاموش ہوگیا یہ طرزِ فکر بت پرستوں کے درمیان کم ہی دکھائی دیتا ہے اور یہ صرف نمرود جیسے مغرور و بے شعور کے ناتواں دماغ میں ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں وہ ضمیر جو جھوٹے معبودوں کی طرف لوٹتی ہے اور جمع کے سارے صیغے مؤنث کی صورت میں ہیں (هن۔ کاشفات ۔ ممسکات)

یہ اسی بنا پر ہے کہ اول تو دنیائے عرب کے مشہور بتوں کے نام مؤنث تھے (لات ۔ منات ۔ عزیٰ) دوسرے چونکہ وہ صنفِ مؤنث کے ضعف وناتوانی کے معتقد تھے لہٰذا خدا اس بیان کے ساتھ بتوں کی ناتوانی کو خود انھیں کے اعتقاد کے مطابق مجسم کرنا چاہتا ہے۔ تیسری طرف چونکہ بتوں میں بے روح موجودات بہت تھے اور جمع مؤنث کا صیغہ بے جان موجودات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اس لیے زیرِ بحث آیت میں اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "علیه یتوکل المتوکلون" کا جملہ "علیه" مقدم ہونے کی بنا پر حصر کا معنی دیتا ہے۔ یعنی توکل کرنے والے صرف اسی پر توکل اور بھروسہ کرتے ہیں۔

بعد والی آیت میں ان لوگوں کو جو عقل و وجدان کی منطق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے، ایک پُر اثر تہدید الٰہی کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دے: اے میری قوم! تم اپنی جگہ پر رہو اور تم میں جتنی طاقت، قوت اور توانائی ہے وہ انجام دے لو، میں بھی اپنی ذمہ داری پوری کروں گا، لیکن تم بہت جلد حقیقت جان لو گے (قل یا قوم اعملوا علیٰ مکانتکم انی عامل فسوف تعلمون)[1]۔

تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں ذلیل و خوار کرنے والا عذاب کس شخص کے پاس آئے گا اور وہ اس سے رسوا ہو جائے گا

---

[1] "مکانة" کس مادہ سے ہے اور اس کا کیا معنی ہے اس بارے میں اکثر مفسرین اور اربابِ لغت کہتے ہیں کہ یہ "کون" کے مادہ سے ہے اور مقام، جگہ اور منزلت کے معنی میں ہے لیکن وہ یہ تصریح کرتے ہیں کہ چونکہ لفظ "مکان" زیادہ تر اسی صورت میں استعمال ہوا ہے لہٰذا یہ تصور کیا گیا ہے کہ اس میں "میم" اصلی ہے، اسی لیے اس کی جمع مکسر "امکنه" لائی جاتی ہے لیکن لسان العرب میں یہ احتمال ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لفظ "مکنة" اور "تمکن" کے مادہ سے ہے جو توانائی اور قدرت کے معنی میں ہے بہرحال پہلی صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم اپنی جگہ پر رہو اور دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جو کچھ تمھاری طاقت، قدرت اور بس میں ہے اسے انجام دو۔

اور اس کے بعد آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب اس پر وارد ہوگا (من یأتیہ عذاب یخزیہ و یحل علیہ عذاب مقیم)۔

اس طرح سے ان کے ساتھ آخری بات کی گئی ہے کہ یا تو عقل وخرد کی منطق کے سامنے سر تسلیم خم کر لو اور وحی الٰہی کی آواز پر کان دھرو اور یا دو دردناک عذابوں کے انتظار میں رہو، ایک دنیا کا عذاب جو خواری و رسوائی کا باعث ہے اور دوسرا آخرت کا عذاب جو جاودانی اور دائمی ہے اور یہ وہی عذاب ہیں جنھیں تم نے خود اپنے ہاتھ سے فراہم کیا ہے اور یہ ایسی آگ ہے جس کا ایندھن تم نے خود جمع کیا ہے اور اسے خود تم نے بھڑکایا ہے۔

۴۱۔ إِنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ○

۴۲۔ اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ○

۴۳۔ أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ○

۴۴۔ قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۖ لَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

ترجمہ

۴۱۔ ہم نے اس آسمانی کتاب کو لوگوں کے لیے، حق کے ساتھ تم پر نازل کیا ہے۔ جو شخص ہدایت قبول کرے تو یہ خود اسی کے فائدے میں ہے، اور جو شخص گمراہی اختیار کرے تو وہ صرف اسی کے لیے نقصان دہ ہوگی اور تو انھیں ہدایت پر مجبور کرنے کے لیے مامور نہیں ہے۔

۴۲۔ خدا ارواح کو موت کے وقت قبض کر لیتا ہے اور جن کی موت نہیں آتی انھیں نیند کے وقت پکڑ لیتا ہے پھر ان لوگوں کی ارواح کو جن کی موت کا حکم صادر ہو چکا ہے، انھیں تو رہنے دیتا ہے اور دوسری ارواح کو (جنھیں ابھی زندہ رہنا ہوتا ہے) واپس لوٹا دیتا ہے جو ایک مدت معین تک رہیں گی، اس چیز میں جو غور و فکر کرنے والوں کے لیے

واضح نشانیاں ہیں۔

۴۳۔ کیا انھوں نے اللہ کے سوا اوروں کو شفیع بنالیا ہے کہہ دے کہ چاہے وہ کسی چیز پر اختیار ہی نہ رکھتے ہوں اور نہ ہی کوئی بات سمجھتے ہوں۔

۴۴۔ کہہ دے کہ تمام شفاعت اللہ ہی کے لیے ہے، کیونکہ آسمانوں اور زمین کی حاکمیت اسی کے لیے ہے اور پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

تفسیر

موت اور نیند کے وقت ارواح قبض ہو جاتی ہیں

دلائلِ توحید کے ذکر اور مشرکین و موحدین کا انجام بیان کرنے کے بعد زیرِ بحث پہلی آیت میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ حق کو قبول کرنے اور نہ کرنے کا سود و زیان خود تمھارے ہی لیے ہے۔ اگر اللہ کا نبی اس سلسلے میں اصرار کرتا ہے تو یہ اس بنا پر نہیں ہے کہ اسے اس سے کوئی فائدہ ہو گا بلکہ یہ تو صرف فریضۂ الٰہی کی انجام دہی ہے۔ فرمایا گیا ہے: ہم نے اس آسمانی کتاب کو حق کے ساتھ تم لوگوں کے لیے نازل کیا ہے (انا انزلنا علیك الکتاب للناس بالحق)[1]

جو شخص ہدایت قبول کرے گا خود اسی کے فائدے میں ہے اور جو شخص گمراہی اختیار کرے گا تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہو گا (فمن اھتدٰی فلنفسه و من ضل فانما یضل علیھا)۔

ہر حال "تو حق کو ان کے دلوں میں جبراً داخل کرنے پر مامور نہیں ہے" تیری ذمہ داری تو صرف ابلاغ و انذار ہے (و ما انت علیھم بوکیل)۔

جو شخص راہِ حق اختیار کرے گا اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو شخص بے راہ روی اختیار کرے گا اس کا نقصان بھی خود اسی کو ہو گا۔ یہ امر آیاتِ قرآنی میں بارہا بیان ہوا ہے اور یہ اس حقیقت پر ایک تاکید ہے کہ خدا کو نہ تو بندوں کے ایمان کی احتیاج ہے اور نہ ہی ان کے کفر سے اسے کوئی وحشت ہے اور نہ ہی اس کے پیغمبر کو اس سے کوئی وحشت ہے اس نے یہ پروگرام اس لیے مرتب نہیں کیا ہے کہ اس سے اسے کوئی فائدہ ہو، بلکہ اس لیے ہے تاکہ اپنے بندوں پر مہربانی اور کرم کرے۔

"وما انت علیھم بوکیل" کی تعبیر (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وکیل یہاں اس شخص کے معنی میں ہے

---

[1] "بالحق" ممکن ہے کہ "کتاب" کے لیے حال ہو یا "انزلنا" میں فاعل کے لیے حال ہو۔ اگرچہ پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ:

ہم نے قرآن کو اس حالت میں تجھ پر نازل کیا ہے کہ وہ حق کے ہمراہ اور ہمگام ہے۔

جو گمراہوں کے ایمان لانے کی ذمہ داری رکھتا ہو) قرآنی آیات میں اسی عبارت کے ساتھ یا اس کے مشابہ عبارت سے بارہا تکرار ہوئی ہے اور یہ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ لوگوں کے ایمان لانے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اصولاً ایمان جبر کے ساتھ ہوتا ہی نہیں۔ نبی تو صرف اس بات کا ذمہ دار ہے کہ خدا کا فرمان لوگوں تک پہنچانے میں لمحہ بھر بھی کوتاہی اور سستی نہ کرے، چاہے وہ اسے قبول کریں یا اس سے روگرداں ہو جائیں۔

اس کے بعد یہ واضح کرنے کے لیے کہ انسانوں کی ہر چیز، جن میں ان کی موت و حیات بھی ہے، خدا ہی کے ہاتھ میں ہے فرمایا گیا ہے: خدا ارواح کو موت کے وقت قبض کر لیتا ہے۔ (اللہ یتوفی الانفس حین موتھا[1])۔

اور ان ارواح کو جن کی موت نہیں آئی ہوتی نیند میں پکڑ لیتا ہے (والتی لم تمت فی منامھا[2])۔

اس طرح سے "نیند" "موت" کی بہن ہے اور اس کی ایک کمزور شکل ہے، کیونکہ نیند کے وقت روح کا جسم سے رابطہ بہت ہی کم رہ جاتا ہے اور ان دونوں کے بہت سے رشتے منقطع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کہ ان کی ارواح کو جن کی موت کا حکم صادر کر چکا ہے روک لیتا ہے (اس طرح سے کہ وہ ہرگز نیند سے بیدار نہیں ہوتے) اور جن کی حیات کے برقرار رہنے کا فرمان دے چکا ہے ان کی ارواح انھیں بدنوں کی طرف لوٹا دیتا ہے جو ایک معین مدت تک رہیں گی (فیمسک التی قضٰی علیھا الموت و یرسل الاخرٰی الٰی اجل مسمّٰی)۔

ہاں اس مسئلے میں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں واضح آیات اور نشانیاں ہیں (ان فی ذالک لاٰیات لقوم یتفکرون)۔

اس آیت سے درج ذیل امور کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔

۱۔ انسان روح اور جسم سے مرکب ہے، روح ایک غیر مادی جوہر ہے جس کا جسم کے ساتھ ارتباط اس کے لیے نور اور حیات کا سبب ہے۔

۲۔ موت کے وقت خدا اس رابطے کو منقطع کر دیتا ہے اور روح کو عالمِ ارواح کی طرف لے جاتا ہے اور نیند کے وقت بھی اس روح کو قبض کر لیتا ہے، لیکن اس طرح سے نہیں کہ بالکل ہی رابطہ منقطع ہو جائے۔ اس بنا پر روح بدن کے لیے تین حالتیں رکھتی ہے۔ ارتباط تام (حیات و بیداری کی حالت)، ارتباط ناقص (نیند کی حالت) اور کامل طور پر ارتباط کا منقطع ہونا (موت کی حالت)

۳۔ نیند، موت کی کمزور حالت ہے اور موت نیند کا مکمل نمونہ ہے۔

۴۔ نیند روح کے استقلال اور اصالت کی دلیل ہے، خصوصاً جب کہ خواب اور وہ بھی سچے خواب کے ساتھ ہو تو پھر یہ معنی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

---

[1] "توفی" کا معنی قبض کرنا اور پورے طور پر پکڑ لینا ہے اور "انفس" یہاں ارواح کے معنی میں ہے "یتوفی" کے قرینہ سے۔

[2] "منام" مصدری معنی رکھتا ہے اور "نوم" نیند کے معنی میں ہے۔

۵۔ بعض ارواح کا جب نیند کی حالت میں ان کا جسم کے ساتھ رابطہ کمزور ہو جاتا ہے تو کبھی تو یہ ارتباط مکمل انقطاع کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اس طرح سے کہ وہ سونے والے پھر کبھی بیدار نہیں ہوتے، لیکن دوسری روحیں نیند اور بیداری کی حالت میں متحرک رہتی ہیں یہاں تک کہ حکم الٰہی نہ آ پہنچے۔

۶۔ اس بات کی طرف توجہ کہ انسان ساری رات نیند کے وقت موت کے آستانہ پر ہوتا ہے ایک درسِ عبرت ہے کہ اگر وہ اس میں غور و فکر کرے تو اس کی بیداری کے لیے کافی ہے۔

۷۔ یہ تمام امور خدا کی قدرت کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں اور اگر دوسری آیات میں "ملک الموت" اور موت کے فرشتوں کے ہاتھوں قبض روح کی بات آئی ہے تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل کرنے والے اور اس کے امر کو جاری کرنے والے ہیں اور ان دونوں مفاہیم کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

بہرحال یہ جو آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ "اس میں ایسے لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں، واضح نشانیاں ہیں" اس سے مراد خدا کی قدرت کی نشانیاں، مبدء و معاد کا مسئلہ اور خدا کے ارادے کے سامنے انسان کی کمزوری و ناتوانی ہے۔

گزشتہ آیت میں انسان کے وجود پر اللہ کی حاکمیت اور موت و حیات اور خواب و بیداری کے نظام کے ذریعے اس کی تدبیر مسلّم ہو چکی ہے۔ لہٰذا بعد والی آیت میں مسئلہ شفاعت میں مشرکین کے انحراف کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ ان پر ثابت کیا جائے کہ شفاعت کا مالک وہی ہے جو موت و حیات کا مالک ہے نہ کہ بے شعور بُت۔ فرمایا گیا ہے: انھوں نے خدا کے علاوہ شفیع بنا لیے ہیں (ام اتخذوا من دون الله شفعاء)[1]

ہم جانتے ہیں کہ بتوں کی عبادت کے بارے میں بُت پرستوں کے مشہور بہانوں میں سے ایک یہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے:۔

ہم تو ان کی اس لیے پرستش کرتے ہیں تا کہ وہ اللہ کے ہاں ہمارے شفیع ہوں۔

جیسا کہ اسی سورہ کے شروع میں بیان ہوا ہے:۔

مانعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى (زمر ـــ ۳)

چاہے اس بنا پر کہ وہ بتوں کو فرشتوں اور ارواحِ مقدسہ کی تمثال اور مظاہر سمجھتے تھے اور چاہے اس لیے کہ وہ ان بے جان پتھروں اور لکڑیوں کے لیے کسی پُراسرار قدرت کے قائل تھے۔

بہرحال شفاعت اولاً فہم و شعور کے ادراک کی فرع ہے اور ثانیاً قدرت، مالکیت اور حاکمیت کی فرع ہے لہٰذا آیت کے آخر میں ان کے جواب میں فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دے کہ کیا ان سے شفاعت طلب کرتے ہو چاہے وہ کسی بھی چیز کے مالک نہ ہوں، یہاں تک کہ کچھ ادراک و شعور بھی نہ رکھتے ہوں (قل اولو كانوا لا يملكون شيئا ولا يعقلون)[2]

---

[1] "ام" یہاں منقطعہ ہے اور "بل" کے معنی میں ہے اور اگر متصلہ ہو تو اس کے مقابلے میں دوسرا "ام" مقدر ماننا پڑے گا جو خلافِ ظاہر ہے۔

[2] "اولو كانوا لا يملكون شيئا" کا جملہ کچھ مقدر رکھتا ہے اور معنی کے لحاظ سے اس طرح ہے:۔

ايشفعون لكم ولو كانوا لا يملكون شيئا

اگر تم فرشتوں اور ارواح مقدسہ کو اپنے شفیع سمجھتے ہو تو وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتے، ان کے پاس جو کچھ ہے خدا کی طرف سے ہے اور اگر پتھر اور لکڑی کے بتوں سے شفاعت طلب کرتے ہو تو وہ عدم مالکیت کے علاوہ بے عقل و بے شعور بھی ہیں۔ ان بہانوں کو چھوڑ دو اور ایسی ذات کی طرف رُخ کرو جس کی مالکیت وحاکمیت تمام عالم ہستی پر محیط ہے اور ہر چیز کی انتہا اسی کی ذات پاک پر ہوتی ہے۔

اس لیے بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: کہہ دے! کہ تمام شفاعت خدا ہی کے لیے ہے (قل للّٰہ الشفاعۃ جمیعًا)۔

کیونکہ آسمانوں اور زمین کی مالکیت وحاکمیت اسی کے لیے ہے اور پھر تم سب کے سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

(لہ ملك السماوات و الارض ثم الیہ ترجعون)۔

اور اس طرح سے قرآن انھیں کُلّی طور پر غیر مسلح کر دیتا ہے، چونکہ وہ توحید جو سارے عالم پر حاکم ہے وہ کہتی ہے کہ شفاعت بھی پروردگار کے اذن وحکم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

من ذا الذی یشفع عندہ الّا باذنہ

کون ہے جو اس کے پاس اس کے اذن وفرمان کے بغیر شفاعت کرے۔ (بقرہ ـــــ ۲۵۵)

یا بعض مفسّرین کے قول کے مطابق بنیادی طور پر شفاعت کی حقیقت خدا کے اسماءِ حسنیٰ سے توسّل ہے یعنی اس کی رحمانیت، غفاریت اور ستاریت سے توسّل ہے، اس بنا پر ہر قسم کی شفاعت آخر کار اسی کی ذات پاک کی طرف لوٹتی ہے۔ لہٰذا جب صورتحال یہ ہو تو اس کے اذن کے بغیر اس کے غیر سے کس طرح سے شفاعت طلب کی جا سکتی ہے [۱]

"ثم الیہ ترجعون" (پھر تم اسی کی طرف لوٹو گے) کے جملے کا اس کے ماقبل سے ارتباط کے بارے میں مفسّرین کے مختلف بیانات نظر آتے ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نہ صرف اس دنیا میں شفاعت خدا کے اختیار میں ہے بلکہ آخرت میں بھی شفاعت و نجات اسی کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی کی جانب سے ہے۔ لہٰذا مشرکین کی طرح مشکلات کا حل اور مصائب کی دوری کے لیے غیر خدا کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ یہ جملہ شفاعت کے خدا کے ساتھ مخصوص ہونے کی ایک اور دلیل ہے کیونکہ پہلی دلیل میں خدا کی مالکیت کا ذکر ہوا ہے اور یہاں تمام چیزوں کی اسی کی طرف بازگشت کا ذکر ہے۔

۳۔ یہ جملہ مشرکین کے لیے ایک تہدید اور دھمکی ہے اور ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم خدا کی طرف لوٹ جاؤ گے اور اس کے ہاں تم اپنے بُرے اور قبیح افکار و اعمال کا نتیجہ دیکھو گے۔

یہ تمام تفسیریں مناسب ہیں اگرچہ پہلی اور دوسری تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

---

[۱] المیزان جلد ۱۷ ص ۲۸۶

چند نکات

۱۔ نیند کا اسرار آمیز عالم :۔ نیند کی حقیقت کیا ہے؟ اور کیا ہوجاتا ہے کہ انسان سوجاتا ہے؟ اس سلسلہ میں ماہرین نے بہت بحث کی ہے :

بعض اس کو خون کے اہم حصے کے دماغ سے نکل کر بدن کے دوسرے حصوں میں انتقال کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اس طرح سے وہ اس کے لیے طبیعیاتی عامل کے قائل ہیں۔

بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ جسم کی زیادہ کارکردگی کی وجہ سے ایک خاص زہریلا مواد بدن میں جمع ہوجاتا ہے اور یہی چیز نظام اعصاب پر اثرانداز ہوتی ہے اور انسان پر نیند کی حالت طاری ہوجاتی ہے اور جب تک وہ زہر تحلیل ہو کر بدن میں جذب نہیں ہوجاتا یہ حالت برقرار رہتی ہے۔ اس طرح سے وہ اس کے لیے کیمیائی عامل کے قائل ہیں۔

ایک اور گروہ نیند کے لیے ایک قسم کے اعصابی عامل کا قائل ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اعصاب کی خاص فعال مشین جو انسان کے دماغ کے اندر ہے اور جو اعضاء کی مسلسل حرکات کا مبدء ہے، وہ زیادہ تھکان کے زیر اثر بے کار اور معطل ہوجاتا ہے اور خاموش ہوجاتا ہے۔

لیکن ان میں سے کوئی نظریہ بھی نیند کے مسئلے کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا، اگرچہ ان عوامل کی اجمالی طور پر تاثیر کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ جو چیز اس بات کا سبب بنی ہے کہ موجودہ ماہرین نیند کی واضح تفسیر بیان کرنے سے عاجز رہ گئے ہیں وہ ان کا دی مادی تفکر ہے، وہ چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کی روح کے استقلال اور اصالت کو قبول کیے بغیر تفسیر کریں۔ حالانکہ نیند اس سے پہلے کہ وہ ایک جسمانی پیدا ہونے والی چیز ہو ایک روحانی چیز ہے جس کی روح کی صحیح شناخت کے بغیر تفسیر کرنا ناممکن ہے۔

قرآن مجید نے مذکورہ بالا آیات میں نیند کے مسئلے کی ایک دقیق ترین تفسیر بیان کی ہے، کیونکہ وہ کہتا ہے کہ نیند ایک قسم کا قبض روح اور روح کی جسم سے جدائی ہے لیکن مکمل جدائی نہیں۔

اس طرح سے جس وقت حکم خدا سے انسان کے بدن سے روح کا پرتو ختم ہوجاتا ہے اور اس جسم کے اوپر اس میں سے ایک ہلکی سی شعاع کے سوا کچھ نہیں رہتا تو ادراک و شعور کی مشینری معطل ہوجاتی ہے اور انسان کی حس و حرکت رک جاتی ہے۔ اگرچہ کچھ عمل جو اس کی حیات کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں مثلاً دل کا دھڑکنا اور خون کی گردش اور عمل تنفس و تغذیہ برقرار رہتا ہے۔

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے :

ما من احد ینام الا عرجت نفسه الی السماء، و بقیت روحه فی بدنه، و صار بینهما سبب کشعاع الشمس، فان اذن الله فی قبض الاروح اجابت الروح النفس، و ان اذن الله فی رد الروح اجابت النفس الروح، فهو قوله سبحانه "الله یتوفی الانفس حین موتها ....

جو شخص سوجاتا ہے، اس کا نفس آسمان کی طرف صعود کر جاتا ہے اور روح اس کے بدن میں رہ جاتی ہے اور ان دونوں کے درمیان سورج کی شعاعوں کی طرح ربط قائم رہتا ہے۔ جس وقت خدا انسان کی روح کے قبض کرنے کا حکم صادر فرماتا ہے تو روح نفس کی دعوت قبول کر لیتی ہے اور اس کی طرف پرواز کر جاتی ہے لیکن جب خدا روح کو واپسی کی اجازت دیتا ہے تو پھر نفس روح کی دعوت قبول کر لیتا ہے اور بدن کی طرف لوٹ آتا ہے اور یہی معنی ہے خداوند سبحان کے ارشاد کا جو فرماتا ہے: اللہ یتوفی الانفس حین موتھا)[1، 2]

یہاں ضمنی طور سے خواب کے بارے میں ایک اور اہم مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کیونکہ بہت سے ایسے خواب ہیں جو بعینہٖ یا تھوڑے سے تغیر کے ساتھ خارج میں واقع ہو جاتے ہیں۔

مادی تفسیریں اس قسم کے خوابوں کی توجیہ کرنے سے عاجز ہیں، جبکہ روحانی تفسیریں اس مسئلے کو اچھی طرح سے واضح کر سکتی ہیں، کیونکہ انسان کی روح بدن سے جدا ہونے اور عالمِ ارواح سے ارتباط کے وقت بہت سے گزشتہ اور آئندہ سے مربوط حقائق جان لیتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو سچے خوابوں کی بنیاد ہے۔ (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۵ سورۂ یوسف کی آیہ ۴ کے ذیل میں رجوع فرمائیں جہاں اس سلسلے میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے)

۲۔ "نیند" روایاتِ اسلامی کی رُو سے: جو روایات مفسرین نے زیرِ بحث آیات کے ذیل میں ذکر کی ہیں ان سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں "نیند" روح کی عالمِ ارواح کی طرف حرکت کو کہا گیا ہے اور "بیداری" روح کی بدن کی طرف واپسی اور ایک قسم کی حیاتِ مجدد ہے۔

ایک حدیث میں امیرالمؤمنین علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ اپنے اصحاب کو اس طرح تعلیم دیتے تھے:

لا ینام المسلم وھو جنب، لا ینام الا علی طھور، فان لم یجد الماء فلیتیمم بالصعید، فان روح المؤمن ترفع الی اللہ تعالٰی فیقبلھا، ویبارک علیھا، فان کان اجلھا قد حضر جعلھا فی کنوز رحمتہ، وان لم یکن اجلھا قد حضر بعث بھا مع امنائہ من ملائکتہ، فیردونھا فی جسدہ

مسلمان کو چاہیے کہ وہ حالتِ جنابت میں نہ سوئے، وضو کی طہارت کے بغیر بستر پر نہ جائے، اور اگر پانی نہ ہو

---

[1] مجمع البیان زیرِ بحث آیہ کے ذیل میں اور تفسیر صافی

[2] اس بات کی طرف توجہ رہے کہ اس روایت میں "روح" سے مراد روح حیوانی اور بدن کی اصلی مشینری کا کام کرنا ہے اور "نفس" روحِ انسانی کے معنی میں ہے۔

تو تیمم کرے کیونکہ مومن کی روح خداوند تعالیٰ کی طرف اوپر کو جاتی ہے وہ اسے قبول کرتا اور برکت دیتا ہے، اگراس کی اجل آخر کو پہنچ گئی ہو تو اسے اپنی رحمت کے خزانوں میں قرار دیتا ہے اور اگر اجل آخر کو نہ پہنچی ہو تو اپنے امین فرشتوں کے ساتھ اس کے بدن کی طرف پلٹا دیتا ہے [1]

ایک اور حدیث میں امام باقرؑ سے اس طرح منقول ہے:

اذا قمت باللیل من منامك فقل: الحمد لله الذی رد علی روحی لاحمده واعبده

جس وقت رات کو نیند سے بیدار ہو تو اس طرح کہو: الحمد لله الذی رد علی روحی لاحمده واعبده۔ (یعنی حمد خاص خدا کے لیے ہے جس نے میری روح کو میری طرف لوٹایا تاکہ میں اس کی حمد و ثنا اور اس کی عبادت کروں) [2]

اس سلسلے میں اور بھی بہت سی احادیث بیان ہوئی ہیں۔

---

[1] خصال صدوق (نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۸۸ کے مطابق)

[2] اصول کافی (نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۸۸ کے مطابق)

۴۵۔ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○

۴۶۔ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○

۴۷۔ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ○

۴۸۔ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○

ترجمہ

۴۵۔ جس وقت خدا کو وحدت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے متنفر ہوجاتے ہیں لیکن جب دوسرے معبودوں کا ذکر ہوتا ہے تو وہ خوش ہوجاتے ہیں۔

۴۶۔ کہہ دے : خداوندا ! تو ہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور پنہاں و آشکار بھیدوں کا جاننے والا ہے، تو ہی اپنے بندوں کے درمیان ان باتوں کے لیے جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے، فیصلہ کرے گا

۴۷۔ اگر ستمگران تمام چیزوں کے مالک ہوجائیں جو روئے زمین پر ہیں اور اتنا ہی ان کے پاس اور بھی ہو تو وہ روز قیامت کے عذاب سے رہائی حاصل کرنے کے لیے ان سب کو قربان کرنے پر تیار ہوجائیں گے

اور خدا کی طرف سے ان کے لیے ایسے امور ظاہر ہوں گے جن کا وہ گمان بھی نہیں کرتے تھے۔

۴۸۔ اس دن وہ بڑے اعمال جنھیں وہ انجام دیا کرتے تھے ان کے لیے ظاہر ہو جائیں گے اور جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی انھیں آکر گھیر لے گی۔

تفسیر

وہ لوگ جو خدا کے نام سے گھبراتے ہیں

ان آیات میں پھر توحید اور شرک کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔ پہلی زیر بحث آیت میں مشرکین اور معاد کے منکرین کا توحید کے مقابلے میں ایک انتہائی قبیح اور برا چہرہ دکھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس وقت خدائے یگانہ و یکتا کا نام لیا جائے تو ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے متنفر ہو جاتے ہیں لیکن جب دوسرے معبودوں کے بارے میں کوئی گفتگو ہوتی ہے تو سرور میں ڈوب جاتے ہیں (واذا ذکر اللہ وحدہ اشمأزت قلوب الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون)۔[1]

کبھی انسان برائیوں کا اس طرح سے عادی ہو جاتا ہے اور پاکیزگیوں اور نیکیوں سے ایسا بیگانہ ہو جاتا ہے کہ حق کا نام سننے سے ناراحت اور متنفر ہوتا ہے اور باطل کے ذکر سے مسرور اور خوش ہوتا ہے جو خدا عالم ہستی کا پیدا کرنے والا ہے اس کے سامنے سر تعظیم نہیں جھکاتا لیکن پتھر اور لکڑی کے ٹکڑے کے سامنے جو اس کا اپنا بنایا ہوا ہے یا انسانوں اور اپنے ہی جیسے دوسرے موجودات کے آگے زانوئے ادب جھکا دیتا ہے اور ان کی تعظیم و تکریم کرتا ہے۔

اسی معنی کے مشابہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۴۶ میں بھی ہے:

واذا ذکرت ربک فی القراٰن وحدہ ولوا علٰی ادبارھم نفورًا

جس وقت تو اپنے پروردگار کا قرآن میں وحدانیت کے ساتھ ذکر کرتا ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

خدا کے عظیم پیغمبر نوحؑ اس قسم کے کج فکروں کی بارگاہ خداوندی میں شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اٰذانھم واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارًا

خداوندا! جب بھی میں نے انھیں دعوت دی کہ وہ تیری بارگاہ میں آئیں تاکہ تو انھیں بخش دے تو انھوں نے

---

[1] "اشمأزت"، "اشمئزاز" کے مادہ سے گرفتگی اور کسی چیز سے تنفر کے معنی میں ہے وحدہ منصوب ہے حال یا مفعول مطلق کے عنوان سے۔

اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے سراور چہرے کو کپڑے سے ڈھانپ لیا تاکہ وہ میری آواز نہ سن سکیں اور انھوں نے گمراہی کی راہ میں اصرار کیا اور بہت شدت کے ساتھ تکبّر و استکبار کیا۔

(نوح ــــــ ۷)

ہاں! ہٹ دھرم تعصّب کرنے والوں اور مغرور جاہلوں کا یہی حال ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ اس گروہ کی بدبختی کا سرچشمہ دو چیزیں تھیں، اصولِ توحید کا انکار اور آخرت پر ایمان نہ رکھنا۔

ان کے مدّمقابل وہ مومن ہیں جو خداوند یگانہ کا نام سن کر اس کے مقدّس نام کی طرف اس طرح کھنچتے اور جذب ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ہر چیز اس کی راہ میں نثار کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ محبوب کا نام ان کے کام ودہن کو شیریں، ان کے مشامِ جاں کو معطّر اور ان کے سارے دل کو روشن کر دیتا ہے، نہ صرف اس کا نام بلکہ ہر وہ چیز جو اس سے ارتباط اور تعلق رکھتی ہے ان کے لیے سرور آفریں ہے۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ صفت زمانہ پیغمبرؐ کے مشرکین کے ساتھ مخصوص تھی بلکہ ہر زمانے میں ایسے تاریک دل منحرفین ہوتے ہیں جو خدا کے دشمنوں کے نام اور الحادی مکاتبِ فکر اور ظالموں کی کامیابی کا ذکر سننے سے خوش ہوتے ہیں لیکن نیک اور پاک لوگوں، ان کے پروگراموں اور کامیابیوں کا نام ان کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس لیے بعض روایات میں اس آیت سے ایسے لوگ مراد لیے گئے ہیں جو اہلِ بیتِ پیغمبرؐ کے فضائل سننے سے یا ان کے مکتب کی پیروی سے ناراحت اور پریشان ہوجاتے ہیں [۱]

جب گفتگو یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ یہ ہٹ دھرم گروہ اور مغرور جاہل خداوند یگانہ کا نام تک بھی سننے سے متنفر و بیزار ہیں تو اللہ اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ ان سے منہ پھیر لے اور اپنے پروردگار کی بارگاہ کی طرف رُخ کرے، اس سے ایسے لب ولہجہ کے ساتھ گفتگو کر جو اس کے عشق سے سرشار اور گہرے ایمان کا ترجمان ہے اور اس کی بارگاہ میں اس گروہ کی شکایت کر تاکہ اپنے دل کو بھی جو غم زدہ ہے آرام وسکون دے سکے اور اس طریقہ سے سوئے ہوئے غافل انسانوں کی ارواح کو بھی جلا بخشے۔ فرمایا گیا ہے، کہہ دے خداوندا! اے وہ کہ جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور پنہاں و آشکار بھیدوں سے آگاہ ہے، تو ہی اپنے بندوں کے درمیان ان باتوں کے لیے جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے فیصلہ کرے گا (قل اللّٰھم فاطر السماوات و الارض عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادك فیما کانوا فیہ یختلفون)۔[۲]

ہاں قیامت کا دن، جو تمام اختلافات اٹھ جانے کا دن ہے اور پوشیدہ حقائق ظاہر ہوجانے کا دن ہے، اس دن حاکمِ مطلق اور فرمانروا تو ہی ہے، تو ہی سب چیزوں کا خالق ہے اور ان کے اسرار سے بھی آگاہ ہے، وہاں تیرے فیصلے سے اختلافات ختم ہوجائیں گے اور یہ ہٹ دھرم گمراہ اپنی غلطی کو سمجھ لیں گے اور وہاں فکر ونظر کی تلافی ہوجائے گی، لیکن انھیں کیا فائدہ؟

۱۔ اصولِ کافی اور روضہ کافی (نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۰ کے مطابق)

۲۔ (فاطر السماوات) منصوب ہے منادائے مضاف کے عنوان سے۔

جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: "اگر ظالم ان تمام چیزوں کے مالک ہو جائیں جو روئے زمین پر ہیں اور اتنا ہی ان کے پاس اور بھی ہو تو وہ یوم قیامت کے عذاب سے رہائی حاصل کرنے کے لیے ان سب کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے (لیکن ایسی بات ممکن نہیں ہے)۔ (و لو ان للذین ظلموا ما فی الارض جمیعًا و مثله معه لا فتدوا به من سوء العذاب یوم القیامة)۔

"ظلم" یہاں ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ اس میں شرک بھی شامل ہے اور دوسرے مظالم بھی۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: خدا کی طرف سے ان کے لیے ایسے امور ظاہر ہوں گے جن کا وہ کبھی گمان بھی نہیں کرتے تھے (و بدا لهم من الله ما لم یکونوا یحتسبون)۔

اور وہ ایسے عذابوں کو اپنی آنکھ سے دیکھیں گے جو ہرگز ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گے۔

علاوہ ازیں وہ صرف لطفِ خداوندی کی وجہ سے مغرور تھے، جب کہ وہ اس کے غصے، غضب اور مقہوریت سے غافل تھے۔

وہ دیدہ و دانستہ ایسے اعمال انجام دیا کرتے تھے جنھیں وہ نیکیاں سمجھا کرتے تھے، حالانکہ بعض اوقات وہ گناہانِ کبیرہ میں سے ہوتے بہر حال ان جہات میں ایسے مسائل ان کے لیے ظاہر ہوں گے جنھیں وہ کبھی بھی باور نہیں کرتے تھے۔

یہ ٹھیک نیکی کے اس وعدے کا الٹ ہے جو مومنین سے کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے:

فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین

کوئی نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسے کیسے اجر پنہاں کر کے رکھے گئے ہیں جو ان کی آنکھوں کی روشنی اور ٹھنڈک کا سبب ہیں۔ (الم سجدہ ——— ۱۷)

منقول ہے کہ ایک مسلمان موت کے وقت بہت ہی بے تابی اور جزع و فزع کر رہا تھا۔ جب لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا میں اس آیت کے بارے سوچ رہا ہوں کہ خدا فرماتا ہے:

و بدا لهم من الله ما لم یکونوا یحتسبون

وحشت اور پریشانی نے مجھے گھیر رکھا ہے اور میں اس بات سے ڈر رہا ہوں کہ کہیں خدا کی طرف سے میرے لیے ایسے امور آشکار و ظاہر نہ ہو جائیں جن کا میں کبھی گمان بھی نہیں رکھتا تھا۔[1]

بعد والی بیت اس مطلب کی توضیح یا تکمیل ہے جو پہلی آیت میں گزر چکا ہے۔ فرمایا گیا ہے: اس دن وہ بُرے اعمال جنھیں انھوں نے انجام دیا ہے ان کے لیے ظاہر ہو جائیں گے (و بدا لهم سیئات ما کسبوا)۔

اور جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی انھیں آکر گھیرے گی (و حاق بهم ما کانوا به یستهزءون)۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان اور تفسیر قرطبی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

درحقیقت ان آیات میں مشرکین اور ظالموں سے مربوط چار باتیں بیان ہوئی ہیں :

پہلی یہ کہ اس دن عذابِ الٰہی کا ہول و وحشت اس قدر زیادہ ہوگا کہ اگر ان کے پاس روئے زمین کی ثروت و اموال کا دگنا بھی ہو تو وہ عذاب سے رہائی پانے کے لیے تمام کا تمام دینے پر تیار ہو جائیں گے لیکن وہاں کچھ نہ بن پائے گا۔

دوسری یہ کہ خدا کی سزاؤں کی وہ اقسام جو کبھی بھی ان کے ذہن میں نہیں آئی تھیں ان کے سامنے ظاہر ہو جائیں گی۔

تیسری یہ کہ ان کے برے اعمال ان کے سامنے آحاضر ہوں گے اور مجسم ہو جائیں گے۔

چوتھی یہ کہ جس بات کو معاد کے سلسلے میں مذاق سمجھتے تھے اسے حقیقتِ عینی کی صورت میں دیکھ لیں گے اور نجات کے تمام دروازے ان کے لیے بند ہو جائیں گے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن کہتا ہے کہ " ان کے برے اعمال آشکار ہو جائیں گے " یہ آیت تجسم اعمال کے مسئلہ پر ایک دلیل ہوگی کیونکہ یہ لازم و ضروری نہیں ہے کہ لفظ مجازات اور کیفر کو مقدر مانا جائے۔

۴۹۔ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

۵۰۔ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

۵۱۔ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ○

۵۲۔ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۴۹۔ جب انسان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو ہمیں (اپنی مشکل کے حل کے لیے) پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اسے کوئی نعمت دے دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ: یہ نعمت تو مجھے میرے علم کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے بلکہ یہ تو ان کی آزمائش کا ذریعہ ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

۵۰۔ یہی بات ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے تھے، لیکن جو کچھ انھوں نے کمایا تھا وہ ان کے کچھ کام نہ آیا۔

۵۱۔ پس ان کے بُرے اعمال ان کے آگے آئے اور (اہلِ مکہ) کے ان ظالموں کا گروہ بھی اپنے کیے ہوئے بُرے اعمال میں بہت جلد گرفتار ہو جائے گا اور وہ ہرگز عذابِ الٰہی کے چنگل سے نہیں نکل سکیں گے۔

۵۲۔ کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ خدا جس شخص کے لیے چاہے روزی وسیع یا تنگ کر دیتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں آیات اور نشانیاں ہیں۔

تفسیر

سختیوں میں یادِ خدا لیکن.......

یہاں پھر موضوع سخن بے ایمان اور ظالم لوگ ہیں اور ان کے قبیح چہروں میں سے ایک اور چہرہ دکھایا جا رہا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جب انسان کو کوئی ضرر یا نقصان پہنچتا ہے (اور کوئی درد و رنج و فقر پہنچتا ہے) تو اپنی مشکل کے حل کے لیے مجھے پکارتا ہے (فاذا مس الانسان ضر دعانا)۔

وہی انسان جو گزشتہ آیات کے مطابق خدائے یگانہ کا نام سننے پر اظہار تنفر کرتا تھا، ہاں! وہی انسان حوادث میں گرفتاری کے وقت لطفِ الٰہی کے سایے میں پناہ لیتا ہے۔

لیکن وہ بھی وقتی طور پر۔ جس وقت ہم اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا کر دیتے ہیں اور اس کا درد و رنج دور کر دیتے ہیں تو وہ ہمارے لطف و عطا کو بھلا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ نعمت تو میں نے خود حاصل کی ہے اور یہ میری لیاقت (اور کام جاننے) کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے (ثم اذا خولناه نعمة منا قال انما اوتيته على علم)[1]

اس گفتگو کا نمونہ سورۂ قصص کی آیہ ۷۸ میں قارون کی زبانی موجود ہے، جس نے بنی اسرائیل کے ان علماء کے سامنے جنھوں نے اسے یہ پند و نصیحت کی تھی کہ ان خداداد نعمتوں سے اس کی رضامندی حاصل کر، یہ کہا تھا:

انما اوتيته على علم عندی

یہ وہ نعمات ہیں جنھیں میں نے اپنے علم و دانش کی وجہ سے حاصل کیا ہے۔

یہ بے خبر غافل کچھ بھی تو نہیں سوچتے کہ وہ علم و دانش بھی تو خدا ہی کی طرف سے ایک نعمت ہے۔ کیا انھوں نے یہ علم و دانش جو ان کی تدبیر معاش اور فراواں آمدنی کا سبب ہے خود اپنے آپ کو دیا ہے یا کیا یہ ازل سے ان کی ذات کا جزء تھا؟

بعض مفسرین نے اس جملے کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: یہ نعمات خدا نے ہمیں اس بنا پر دی ہیں چونکہ وہ ہماری لیاقت و استعداد کو جانتا تھا۔

اگرچہ یہ احتمال زیر بحث آیت میں تو ممکن ہے لیکن سورۂ قصص کی آیت میں قارون کے بارے میں "عندی" (میرے پاس) کے لفظ کی طرف توجہ کرتے ہوئے ممکن نہیں ہے اور یہ امر زیر بحث آیت کے لیے پہلی تفسیر کی ترجیح کے لیے ایک قرینہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] "خول" "تخویل" کے مادہ سے اعطاء و بخشش اور تفضل کے معنی میں ہے اور اسی سورۂ زمر کی آیہ ۸ کے ذیل میں ہم نے اس لفظ کی مزید تشریح کی ہے۔ "اوتیتہ" کی ضمیر باوجود اس کے کہ وہ نعمت کی طرف لوٹتی ہے، مذکر کی صورت میں آئی ہے، کیونکہ اس سے مراد "شیء من النعمة" یا "قسم من النعمة" ہے۔

اس کے بعد قرآن ان خودغرض اور کم ظرف لوگوں کے جواب میں، جو نعمت حاصل ہوتے ہی بہت جلد خود کو بھول جاتے ہیں اس طرح کہتا ہے: بلکہ یہ نعمت تو ان کی آزمائش کا ایک ذریعہ ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے (بل هی فتنة ولکن اکثرهم لا یعلمون)۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ سخت حوادث ظاہر ہونے اور اس کے بعد بڑی بڑی نعمتیں پا لینے سے جو کچھ ان کے اندر ہے اسے ظاہر کردیں۔

کیا وہ مصیبت کے وقت مایوس اور نعمت کے وقت مغرور ہو جاتے ہیں؟

کیا ان انقلابات میں بھی خدا کو یاد کرتے ہیں یا دنیا میں غرق ہو جاتے ہیں؟

کیا وہ اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں یا اپنی کمزوریوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے خدا کو پہلے سے بھی زیادہ یاد کرتے ہیں؟

لیکن افسوس! زیادہ تر لوگ فراموش کار ہی ہیں اور وہ ان حقائق سے آگاہ نہیں ہیں۔

اس حقیقت کو قرآنی آیات میں بارہا دہرایا گیا ہے کہ خداوند حکیم کبھی تو انسان کو مشکلات کی سختیوں میں مبتلا کرتا ہے اور کبھی عیش و آرام اور آسائش و نعمت میں تاکہ ان طریقوں سے اسے آزمائے، اس کے وجود کی قدر و قیمت کو بلند کردے اور اسے اس حقیقت سے آشنا کردے کہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔

اصولی طور پر فضا ساز شدائد فطرت کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں، جیسے نعمتیں معرفت کا مقدمہ ہیں (اس سلسلہ میں جلد ۹ سورۂ عنکبوت کی آیہ ۶۵ کے ذیل میں بھی ہم نے گفتگو کی ہے)

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ انسان آیا ہے اور فراموش کار اور مغرور کے طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایسے انسانوں کی طرف اشارہ ہے جو خدائی مکاتب کے زیر تربیت نہیں آتے اور جن کا کوئی مربی اور راہنما نہیں تھا۔ ان کی خواہشات آزاد تھیں اور وہ ہوا و ہوس میں غوطہ زن تھے اور خودرو گھاس کے مانند تھے۔ ہاں! یہی وہ لوگ ہیں کہ جس وقت وہ درد و رنج میں گرفتار ہوتے ہیں تو خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں اور جب حوادث کا طوفان رک جاتا ہے اور انھیں نعمتیں حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر خدا کو بھول جاتے ہیں (اس سلسلے میں مزید تشریح "انسان قرآنِ کریم میں" کے عنوان کے تحت جلد ۵ سورۂ یونس کی آیہ ۱۲ کے ذیل میں مطالعہ کریں)

بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: یہ بات ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (وہ بھی یہی دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ہماری نعمتیں ہمارے علم و لیاقت کی پیداوار ہیں) لیکن جو کچھ انھوں نے حاصل کیا تھا وہ ان کے کچھ کام نہ آیا (قد قالها الذین من قبلهم فما اغنی عنهم ما کانوا یکسبون)[1]۔

ہاں قارون جیسے مغرور افراد اپنے اموال کو اپنی لیاقت و قابلیت کی پیداوار سمجھتے تھے اور ان پر جو خدا کی نعمتیں تھیں انھیں وہ

---

[1] "قد قالها" کی ضمیر "کلمہ" یا "مقالہ" کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ امر سابقہ جملے سے سمجھا جا سکتا ہے اور اس سے مراد "انما اوتیته علی علم" کا جملہ ہے۔

بھلا چکے تھے۔ انھوں نے مبدء اصلی سے غافل ہوکر صرف ظاہری اسباب پر نظریں جما لی تھیں، لیکن تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جس وقت خدا نے انھیں اور ان کے خزانوں کو زمین میں دھنسا دیا تو کوئی بھی ان کی مدد کرنے والا نہیں تھا اور ان کا مال و دولت ان کی حالت کے لیے کوئی فائدہ نہ دے سکا۔ جیساکہ قرآن کہتا ہے:

فخسفنا به وبداره الارض فما كان له من فئة ينصرونه من دون الله (قصص: ۸)

نہ صرف قارون بلکہ عاد و ثمود اور قوم سبا جیسی اقوام بھی اسی انجام میں گرفتار ہوئیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ان کے برے اعمال انھیں دامن گیر ہوگئے (فاصابهم سيئات ما كسبوا)۔

ان میں سے سب عذاب الٰہی کی کسی ایک قسم طوفان، سیلاب، زلزلہ یا صیحہ آسمانی میں گرفتار ہوگئے اور تباہ و برباد ہوگئے۔

مزید فرمایا گیا ہے: یہ انجام انھیں میں منحصر نہیں تھا بلکہ مکہ کے یہ ظالمین و مشرکین بھی بہت جلد اپنے برے اعمال میں گرفتار ہوں گے اور ہرگز عذاب الٰہی کے چنگل سے بھاگ کر نہیں نکل سکتے (والذين ظلموا من هؤلاء سيصيبهم سيئات ما كسبوا وما هم بمعجزين)۔

بلکہ یہ بات تو ان سے بھی اوپر جاتی ہے اور ہر دور خدا سے بے خبر اور مغرور ستم گر اس میں شامل ہیں۔

"سيصيبهم سيئات ما كسبوا" سے مراد دنیاوی عذاب ہے یا اخروی، اس بارے میں دونوں احتمال ذکر کیے گئے ہیں لیکن "فاصابهم سيئات ما كسبوا" (ان سے پہلے لوگ بھی اپنے برے اعمال میں گرفتار ہوئے تھے)، کے قرینہ سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے)۔

جو کہتے تھے کہ ہماری نعمتیں خود ہماری آگاہی اور توانائی کی وجہ سے ہیں، قرآن ان سے کہتا ہے کہ گزرے ہوئے لوگوں کی تاریخ پڑھو اور دیکھو کہ یہی بات دوسرے لوگوں نے بھی کہی تھی اور وہ کیسے کیسے مصائب اور عذاب میں گرفتار ہوئے، یہ ایک تاریخی جواب ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں ایک عقلی جواب دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کیا وہ نہیں جانتے کہ خدا جس کے لیے چاہتا ہے روزی کشادہ یا تنگ کر دیتا ہے (اولم يعلموا ان الله يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر)۔

کتنے بہت سے ایسے اہل اور لائق افراد ہیں جو زندگی میں محروم اور گوشہ نشین ہیں اور کتنے بہت سے ایسے کمزور و ناتواں افراد ہیں جو ہر لحاظ سے نعمتوں سے بہرہ مند ہیں، اگر ساری کی ساری مادی کامیابیاں خود افراد کی اپنی سعی و کوشش اور لیاقت و قابلیت کی بنا پر انھیں حاصل ہوتیں تو پھر ہمیں یہ منظر نظر نہ آتے۔

یہی چیز خود اس بات کا ثبوت ہے کہ عالم اسباب کی پشت پر ایک اور طاقتور ہاتھ بھی ہے جو اسے نپے تلے نظام کے مطابق چلا رہا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کو زندگی میں سعی و کوشش کرنا چاہیے یہ بھی درست ہے کہ جہاد و کوشش بہت سی مشکلات کے حل کی کلید ہے،

لیکن یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے کہ ہم مسبب الاسباب کو ہی بھول جائیں اور صرف اسباب پر نظر رکھیں اور خود اپنے ہی آپ کو مؤثر حقیقی سمجھ بیٹھیں۔

بہت سے لائق اور لوگوں کے ناکام رہنے کا راز اور بہت سے جاہل افراد کے کامیاب ہونے کا بھید یہی ہے، یہ بات تمام لوگوں کے لیے ایک تنبیہ ہے تاکہ وہ عالمِ اسباب میں گم نہ ہو جائیں اور صرف اپنی ہی شخصی قوت پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں۔

لہذا آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اس میں ان لوگوں کے لیے، جو ایمان لائے ہیں آیات اور نشانیاں ہیں (ان فی ذالک لاٰیات لقوم یؤمنون)۔

خدا کی پاک ذات کے لیے نشانیاں، جیسا کہ امیر المؤمنین علیؑ نے فرمایا ہے:

عرفت اللہ بفسخ العزائم وحل العقود و نقض الھمم

میں نے خدا کو پختہ اور مصمم ارادوں کے ٹوٹ جانے اور مشکلات کی گرہیں کھلنے اور ارادوں کے درہم برہم ہونے سے پہچانا ہے[1]

یہ انسان کے ضعف و ناتوانی کی نشانیاں ہیں تاکہ وہ اپنے آپ کو گم نہ کر بیٹھے اور غرور و خود بینی میں گرفتار نہ ہو جائے۔

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۲۵۰

۵۳۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○

۵۴۔ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ○

۵۵۔ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○

ترجمہ

۵۳۔ کہہ دے: اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے اوپر ظلم و اسراف کیا ہے! خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہوجانا، کیونکہ خدا سارے گناہوں کو بخش دے گا۔ بیشک وہ غفور و رحیم ہے۔

۵۴۔ اور اپنے پروردگار کی بارگاہ میں رجوع کرو اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرلو، اس سے پہلے کہ عذاب تمھاری طرف آئے اور پھر کسی کی طرف سے تمھاری مدد نہ ہو۔

۵۵۔ اور ان بہترین احکام کی جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں پیروی کرو، اس سے پہلے کہ (خدائی) عذاب اچانک تمھاری طرف آجائے جبکہ تمھیں اس کی کوئی خبر بھی نہ ہو۔

تفسیر

خدا تمام گناہوں کو بخش دے گا

گزشتہ آیات میں مشرکین اور ظالمین کے بارے میں بار بار تہدیدیں آئی ہیں، ان کے بعد اب ان آیات میں تمام گنہ گاروں کو امید دلائی جارہی ہے اور ان کے لیے بازگشت کا راستہ کھولا جارہا ہے، کیونکہ ان تمام امور کا ہدف اصلی تربیت و ہدایت ہے نہ کہ انتقام جوئی اور خشونت و سختی۔ انتہائی لطف اور محبت بھرے انداز میں، سب کے لیے اپنی آغوشِ رحمت کھولے ہوئے اور ان کے لیے عفو و مہربانی کا

فرمان صادر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ان سے کہہ دے: اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنے اوپر اسراف اور ظلم کیا ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہوجانا، کیونکہ خدا تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے (قل یاعبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعًا انہ ھو الغفور الرحیم)۔

اس آیت کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت قرآن کی آیات میں گنہ گاروں کے لیے سب سے زیادہ امید بخش ہے اور اس کی وسعت اس حد تک ہے کہ ایک روایت کے مطابق امیرالمومنین علی علیہ السلام نے فرمایا کہ سارے قرآن میں کوئی آیت اس سے زیادہ وسیع نہیں ہے۔ آپ کے الفاظ یوں ہیں:۔

ما فی القرآن اٰیۃ اوسع من یا عبادی الذین اسرفوا......[1]

اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ:

۱۔ "یاعبادی" (اے میرے بندو!) کی تعبیر پروردگار کی جانب سے ایک لطف و عنایت کا آغاز ہے۔

۲۔ "اسراف" کی تعبیر "ظلم و گناہ و جرم" کے بجائے ایک اور لطف ہے۔

۳۔ "علیٰ انفسہم" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان کے سارے گناہ خود اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہ پروردگار کی محبت کی ایک اور نشانی ہے۔ جیسا کہ ایک شفیق باپ اپنے بیٹے سے کہتا ہے: "یہ سارا ظلم اپنے اوپر نہ کر"۔

۴۔ "لاتقنطوا" (ناامید نہ ہوں) کی تعبیر کہ "قنوط" اصل میں اچھائی اور خیر سے مایوس ہونے کے معنی میں ہے۔ تنہا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ گنہ گاروں کو "لطفِ الٰہی" سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

۵۔ "من رحمۃ اللہ" کی تعبیر "لا تقنطوا" کے بعد اس خیر و محبت پر اور بھی زیادہ تاکید ہے۔

۶۔ جب ہم "ان اللہ یغفر الذنوب جمیعًا" کے جملے پر پہنچتے ہیں، جس کی ابتداء حرفِ تاکید کے ساتھ ہو رہی ہے اور لفظ "الذنوب" (الف و لام کے ساتھ جمع) جو بغیر کسی استثناء کے تمام گناہوں کو اپنے دامن میں لے لیتا ہے تو گفتگو اوج و بلندی پر پہنچ جاتی ہے اور دریائے رحمت موجزن ہو جاتا ہے۔

۷۔ جس وقت "جمیعًا" کا یعنی ایک اور تاکید کا اضافہ ہو جاتا ہے تو امید آخری مرحلے تک پہنچ جاتی ہے۔

۸، ۹۔ خدا کی "غفور" و "رحیم" کے ساتھ توصیف جو پروردگار کی صفات میں سے دو امید بخش اوصاف ہیں، آیت کے آخر میں یاس و ناامیدی کی کم سے کم گنجائش بھی باقی نہیں رہنے دیتی۔

ہاں! اسی دلیل کی بنیاد پر یہ آیت قرآن کی آیات میں سب سے زیادہ وسعت رکھنے والی آیت ہے جو ہر قسم کے گناہ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور اسی وجہ سے یہ قرآن مجید کی آیات میں سب سے زیادہ امید بخش آیت شمار ہوتی ہے۔

واقعًا ایسی ذات سے جس کا دریائے لطف بیکراں سب ہے اور جس کے فیض کی شعاعیں غیر محدود ہیں، اس سے اس کے علاوہ اور کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔

---

[1] مجمع البیان، تفسیر قرطبی اور تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

وہ ذات جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے اور جس نے اپنے بندوں کو رحمت کیلئے پیدا کیا ہے نہ کہ خشم و عذاب کے لیے، اس سے اس کے علاوہ اور کوئی امید نہیں۔

کیا رحیم و مہربان خدا ہے اور کیسا مہرو محبت والا پروردگار!

یہاں دو مسائل نے مفسرین کی فکر کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان کا حل خود اسی آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں پوشیدہ ہے۔

پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ کیا آیت کی عمومیت تمام گناہوں کو حتیٰ کہ شرک اور دوسرے تمام گناہان کبیرہ پر بھی محیط ہے اگر ایسا ہے تو پھر سورۂ نساء کی آیہ ۴۸ میں شرک کو قابل بخشش گناہوں سے الگ کیوں کیا گیا ہے؟ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء

خدا شرک کو نہیں بخشتا لیکن اس کے سوا دوسرے گناہوں میں سے جسے چاہے بخش دیتا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مغفرت کا یہ وعدہ جو زیر بحث آیت میں آیا ہے کیا یہ مطلق ہے یا توبہ اور اسی قسم کی کسی چیز کے ساتھ مشروط ہے؟

البتہ یہ دونوں سوالات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور ان کا جواب بعد والی آیات میں اچھی طرح سے مل سکتا ہے کیونکہ بعد والی آیات میں تین حکم دیئے گئے ہیں جو تمام باتوں کو واضح کر دیتے ہیں۔

"وانیبوا الیٰ ربکم" (اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو)

"واسلموا لہ" (اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرو)

"واتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم" (ان بہترین احکام و فرامین کی پیروی کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں)

یہ تینوں احکام تو یہ کہتے ہیں کہ غفران و رحمت کے دروازے تو تمام بندوں پر بغیر کسی استثناء کے کھلے ہوئے ہیں لیکن وہ اس بات کے ساتھ مشروط ہیں کہ وہ گناہ کے ارتکاب کے بعد ہوش میں آئیں، اپنا راستہ بدل لیں، درگاہ خداوندی کی طرف رجوع کریں، اس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور عمل کے ساتھ اس توبہ و انابت میں اپنی صداقت کی نشاندہی کریں۔ اس طرح سے نہ شرک اس سے مستثنیٰ ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا گناہ بلکہ اس عفو عمومی اور رحمت واسعہ کا کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہونا بھی ناقابل انکار ہے۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سورہ نساء کی آیہ ۴۸ میں مشرکین کے لیے بخشش اور عفو کے بارے میں استثناء کیا گیا ہے تو وہ ان مشرکین کے بارے میں ہے جو حالت شرک میں دنیا سے جائیں نہ کہ وہ جو بیدار ہو جائیں اور راہ حق پر چل پڑیں، کیونکہ صدر اسلام کے مسلمانوں کی اکثریت اسی قسم کی تھی۔

اگر ہم بہت سے مجرمین کی حالت پر نظر کریں تو گناہ کرنے کے بعد اس طرح پریشان اور پشیمان ہوتے ہیں کہ انھیں یقین ہی نہیں آتا کہ ان کے لیے بازگشت کی کوئی راہ بھی کھلی ہوگی اور وہ اپنے آپ کو ایسا آلودہ سمجھتے ہیں کہ وہ گویا کسی بھی پانی کے ساتھ پاک ہونے کے قابل نہیں ہیں اور وہ پوچھتے ہیں کہ کیا واقعاً ہمارے گناہ بھی قابل بخشش ہیں؟

وہ سوچتے ہیں کیا خدا کی طرف ہمارے لیے بھی کوئی راستہ کھلا ہوا ہے؟ کیا ہماری واپسی کی بھی کوئی گنجائش ہے؟

اگر ہم اس کیفیت پر نظر رکھیں تو آیت کے مفہوم کو اچھی طرح سے سمجھ لیں گے، کیونکہ وہ ہر قسم کی توبہ کے لیے تو آمادہ ہیں لیکن اپنے گناہ کو قابلِ بخشش نہیں سمجھتے، خصوصاً اگر انھوں نے بارہا توبہ کی ہو اور توڑ ڈالی ہو۔

یہ آیت ان سب کو خوشخبری دے رہی ہے کہ تم سب کے لیے راستہ کھلا ہے۔

اسی لیے تاریخ اسلام کے مشہور مجرم اور سید الشہداء حمزہ کے قاتل "وحشی" نے جب مسلمان ہونا چاہا تو وہ اس بات سے ڈر رہا تھا کہ اس کی توبہ قبول نہ ہوگی کیونکہ واقعاً اس کا گناہ بہت بڑا تھا۔ بعض مفسّرین کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس نے رحمتِ الٰہی کے دروازے اس وحشی اور دوسرے توبہ کرنے والے وحشیوں پر کھول دے۔

اگرچہ یہ سُورہ مکی سورتوں میں سے ہے اور جس دن یہ آیت نازل ہوئی اس وقت تک نہ جنگِ اُحد ہوئی تھی، نہ حضرت حمزہ کی شہادت رونما ہوئی تھی اور نہ ہی وحشی کی توبہ کا مسئلہ تھا۔ لہٰذا یہ ماجرا اس آیت کے لیے شانِ نزول نہیں بن سکتا، بلکہ ایک قانون کلی کی ایک مصداق پر تطبیق ہو سکتا ہے، لیکن بہرحال یہ واقعہ آیت کے مفہوم کی وُسعت کو مشخص کر سکتا ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو گیا ہے کہ روح المعانی میں آلوسی جیسے مفسّرین کا اس چیز پر اصرار کہ اس آیت میں غفران و بخشش کا وعدہ کسی چیز سے مشروط نہیں ہے، ایک غلط بات ہے اگرچہ اس نے اس کے لیے سترہ دلیلیں ذکر کی ہیں، کیونکہ یہ بعد والی آیات کے ساتھ واضح تضاد رکھتی ہے، اور اس کی سترہ دلیلیں جن میں سے بہت سی قابلِ ادغام ہیں کہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتیں کہ خدا کی رحمت وسیع اور کشادہ ہے جس میں تمام گنہ گار شامل ہیں اور یہ چیز بعد والی آیات کے قرینے سے، اس وعدۂ الٰہی کے مشروط ہونے کے منافی نہیں۔

اس آیت کے سلسلے میں کچھ اور مطالب بھی ہیں جو انشاء اللہ "چند نکات" کے تحت آئیں گے۔

بعد والی آیت میں تمام مجرموں اور گنہ گاروں کو رحمتِ الٰہی کے اس بے کراں دریا میں ورود کی راہ دکھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آؤ (وانیبوا الی ربکم)۔

اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لو، اس کا فرمان دل و جان کے ساتھ سنو اور اسے قبول کرو، اس سے پہلے کہ عذابِ الٰہی تمھیں دامن گیر ہو جائے اور پھر کوئی تمھاری مدد نہ کر سکے (واسلموا له من قبل ان یأتیکم العذاب ثم لا تنصرون)۔

ان دو مراحل (مرحلہ انابت اور اسلام) کو طے کر لینے کے بعد تیسرے مرحلے کے بارے میں جو مرحلہ عمل ہے، گفتگو کرتے ہوئے مزید فرمایا گیا ہے: ان بہترین احکام کی جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں پیروی کرو، اس سے پہلے کہ عذابِ الٰہی اچانک تمھارے پاس آجائے اور تمھیں اس کی خبر بھی نہ ہو (واتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم من قبل ان یأتیکم العذاب بغتة وانتم لا تشعرون)۔

اس طرح سے رحمتِ خدا تک پہنچنے کی راہ تین قدموں سے زیادہ نہیں ہے۔

پہلا قدم توبہ اور گناہ پر پشیمانی اور خدا کی طرف رُخ۔

دوسرا قدم ایمان اور خدا کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم۔

تیسرا قدم عملِ صالح۔

یہ تینوں قدم بڑھانے کے بعد۔ اس وعدے کے مطابق جو اس نے فرمایا ہے۔ اس کی رحمت کے بیکراں سمندر میں داخل ہونا قطعی و یقینی ہے، چاہے انسان کے گناہوں کا بوجھ کتنا ہی سنگین اور بھاری کیوں نہ ہو۔

"اتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم" (بہترین چیز جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو) سے کیا مراد ہے۔ اس بارے میں مفسّرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں۔

ان میں سے جو احتمال سب سے بہتر نظر آتا ہے یہ ہے کہ جو احکام خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں وہ مختلف ہیں۔ بعض واجبات کی طرف دعوت دیتے ہیں، بعض مستحبات کی طرف اور بعض مباحات کی اجازت پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا احسن سے مراد واجبات و مستحبات کا انتخابات کرنا ہے البتہ ان کی ترتیب و مرتبہ کو ملحوظ و خاطر رکھتے ہوئے۔

بعض نے اسے کتبِ آسمانی میں سے قرآن کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اسی سورۂ زمر کی آیت ۲۳ میں بیان کردہ قرینے کی رُو سے جس میں قرآن کو "احسن الحدیث" (بہترین گفتگو) کہا گیا ہے:

اللہ نزّل احسن الحدیث کتابًا متشابھًا مثانی

البتہ ان دونوں تفسیروں میں سے کوئی ایک دوسرے کے منافی نہیں ہے۔

چند نکات

۱۔ توبہ کی راہ سب کے لیے کھلی ہے: اہم مسائل میں سے جو تربیتی مسائل کی راہ میں موجود ہیں گزشتہ بُرے اعمال کی وجہ سے گناہگاری کا احساس ہے۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ گناہ بہت بڑے اور سنگین ہوں، کیونکہ اس صورت میں ہمیشہ یہ فکر انسان کی نظر میں رہتی ہے کہ اگر وہ پاکیزگی، تقویٰ اور خدا کی راہ کی طرف لوٹنا بھی چاہے تو وہ اپنی گزشتہ بھاری ذمہ داریوں سے کس طرح رہائی پاسکتا ہے یہ فکر ایک دہشت ناک خواب کی طرح اس کی روح پر سایہ ڈالے رہتی ہے اور اکثر اوقات اسے زندگی کا طرزِ عمل بدلنے اور پاکیزگی کی طرف جھکنے سے باز رکھتی ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ توبہ کرنے کا کیا فائدہ؟

تیرے گزشتہ اعمال کی زنجیرِ لعنت کے ایک طوق کی طرح تیرے ہاتھ پاؤں میں پڑی ہوئی ہے، تو تو گناہ کے رنگ میں ڈھل گیا ہے جو ایک ثابت اور تغیر ناپذیر رنگ ہے۔

جو لوگ تربیتی مسائل اور توبہ کرنے والے گنہ گاروں سے ربط رکھتے ہیں، ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اسے انھوں نے اچھی طرح سے آزمایا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی مشکل ہے؟

اسلامی تعلیمات کہ جو قرآن مجید سے اخذ کی گئی ہیں میں یہ مسئلہ حل ہو چکا ہے اور وہ توبہ و انابت کو جبکہ وہ شرائط کے ساتھ گزشتہ کردار سے جدا ہونے اور نئی زندگی کے آغاز کرنے کا ایک قاطع ذریعہ سمجھتی ہیں، بلکہ اسے "تولدِ ثانی" قرار دیتی ہیں۔ اسلامی روایات میں بعض گنہ گاروں کے بارے میں بارہا بیان ہوا ہے۔

كمن ولدته امه

وہ اس شخص کی طرح ہے جو ابھی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔

اس طرح سے قرآن لطفِ الٰہی کے دروازوں کو ہر انسان کے لیے ہر حالت میں اور ذمہ داریوں کے ہر قسم کے بوجھ کی صورت میں کھلا رکھتا ہے، اور اس کی واضح دلیل زیرِ بحث آیات ہیں۔ ان میں طرح طرح سے مجرموں اور گنہ گاروں کو خدا کی طرف دعوت دی گئی ہے اور انھیں یہ اعتماد دیتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو گزشتہ زندگی سے بالکل جدا کر سکتے ہیں۔

ایک روایت میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے:

التائب من الذنب كمن لا ذنب له

جو شخص گناہ سے توبہ کرلے وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے اصلاً کوئی گناہ نہ کیا ہو۔[1]

یہی مفہوم کچھ اضافے کے ساتھ امام باقرؑ سے نقل ہوا ہے، آپؑ نے فرمایا:

التائب من الذنب كمن لا ذنب له، والمقيم على الذنب وهو مستغفر منه كالمستهزء

جو شخص گناہ سے توبہ کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو اور جو شخص استغفار کے ساتھ ساتھ گناہ بھی جاری رکھے ہوئے ہو تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو مذاق کرتا ہو۔[2]

لیکن ظاہر ہے کہ رحمتِ الٰہی کی طرف یہ واپسی بلا شرط نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ حکیم ہے اور وہ کوئی کام بے حساب نہیں کرتا۔ اگر اس نے اپنی رحمت کی آغوش کو سب کے لیے کھول رکھا ہے اور انھیں ہمیشہ اپنی طرف بلاتا رہتا ہے تو اس کے لیے بندوں میں اہلیت کا ہونا بھی ضروری ہے ایک طرف تو انھیں اپنے تمام وجود کے ساتھ بازگشت کا خواہاں ہونا چاہیے اور اندرونی انقلاب اور بنیادی تبدیلی پیدا کرنی چاہیے۔ دوسری طرف بازگشت کے بعد اپنے ایمان اور اعتقاد کی ان بنیادوں کو نئے سرے سے اٹھانا چاہیے جو طوفانِ گناہ کے باعث منہدم ہو چکی ہیں۔

تیسری طرف اعمالِ صالح کے ذریعے اپنی روحانی ناتوانی اور اخلاقی کمزوری کی تلافی کرنا چاہیے البتہ سابق گناہ جتنے زیادہ سنگین تھے اسی حساب سے زیادہ صالح اعمال بجا لانے چاہییں اور یہ بالکل وہی چیز ہے جسے قرآن نے مذکورہ بالا تین آیات میں "انابت" "اسلام" اور "اتباعِ احسن" کے عنوان سے بیان کیا ہے۔

۲۔ سنگین بوجھ والے افراد: بعض مفسرین نے ان آیات کی کچھ شانِ نزول بیان کی ہیں، جو سب کی سب احتمالاً تطبیق کی حیثیت رکھتی ہیں نہ کہ شانِ نزول کی۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۱۲۷ (مادہ توبہ)

[2] اصول کافی جلد ۲ باب توبہ حدیث ۱۰ ص ۳۱۶

ان میں سے ایک "وحشی" کی داستان ہے جو میدانِ اُحد میں بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا تھا اور پیغمبر اکرمؐ کے چچا حضرت حمزہؓ جیسے شجاع اور بہادر کمانڈر کو بزدلانہ طریقے سے شہید کر دیا جنھوں نے ہر جگہ اپنی جان کو پیغمبر اکرمؐ کے لیے سپر بنا رکھا تھا۔ جب اسلام کو عروج حاصل ہوا اور مسلمان ہر جگہ کامیاب ہوئے تو اس وحشی نے بھی اسلام قبول کرنا چاہا لیکن وہ ڈر رہا تھا کہ اس کا اسلام قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس ضمن میں مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور وہ اسلام لے آیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اس سے پوچھا:

تو نے میرے چچا کو کس طرح قتل کیا تھا؟

اس نے تفصیل کے ساتھ واقعہ بیان کیا۔ پیغمبر اکرمؐ بہت زیادہ روئے، اس کی توبہ تو قبول کر لی، لیکن اس سے فرمایا:

غيب وجهك عنى فانى لا استطيع النظر اليك فلحق بالشام فمات في الخمر

میری آنکھوں کے سامنے کبھی نہ آنا کیونکہ میں تجھے نہیں دیکھ سکتا۔ وحشی سرزمینِ شام کی طرف چلا گیا اور آخرکار خمر نامی علاقے میں جاکر مرگیا۔

بعض لوگوں نے سوال کیا کہ کیا یہ آیت صرف اس وحشی کے بارے میں ہے یا سب مسلمانوں کے لیے ہے؟ فرمایا سب کے لیے ہے۔[1]

دوسری ایک شخص نباش (جو قبروں کو کھود کر کفن چوری کر کے لے جاتا ہے) کی داستان ہے، جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:-

ایک جوان روتا ہوا پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آیا۔ وہ بہت ہی پریشان تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں خدا کے غضب سے ڈر رہا ہوں۔

فرمایا: کیا تو نے شرک کیا ہے؟

کہا: نہیں!

فرمایا: کیا تو نے خونِ ناحق بہایا ہے؟

عرض کیا: نہیں!

فرمایا: خدا تیرے گناہوں کو بخش دے گا چاہے وہ جتنے بھی زیادہ ہوں۔

عرض کیا: میرا گناہ آسمان و زمین اور عرش و کرسی سے بھی بڑا ہے!

فرمایا: کیا تیرا گناہ خدا سے بھی بڑا ہے؟

عرض کیا: نہیں! خدا تو ہر چیز سے بڑا ہے۔

فرمایا: جا! (توبہ کر) کہ خدائے عظیم گناہِ عظیم کو بخش دیتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: اچھا بتا تو سہی تو نے کون سا گناہ کیا ہے؟

عرض کیا: اے رسولِ خدا! مجھے شرم آتی ہے کہ اسے آپ کے سامنے بیان کروں۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۶۴۳ (مادہ "وحش")، تفسیر فخر رازی جلد ۲۷ ص ۴ اور تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۲

فرمایا: آخر بتا تو سہی کہ تو نے کیا کیا ہے ؟

عرض کیا: میں سات سال سے قبریں کھود کر مُردوں کے کفن اتارتا رہا ہوں، یہاں تک کہ ایک دن قبر کھودتے ہوئے مجھے (قبر میں) انصار کی ایک لڑکی نظر آئی۔ جب میں نے اسے برہنہ کرلیا تو میرا نفس ہیجان میں آگیا ......

(اس کے بعد اس نے اپنی دست درازی کا قصہ بیان کیا)

جس وقت اس کی گفتگو یہاں تک پہنچی تو پیغمبر اکرمؐ کو سخت غصہ آیا اور رنجیدہ ہوئے اور فرمایا اس فاسق کو باہر نکال دو اور اس کی طرف رُخ کرکے فرمایا: تو دوزخ سے کتنا نزدیک ہے۔

وہ جوان باہر نکلا تو شدت کے ساتھ رو رہا تھا۔ بیابان کی طرف نکل گیا اور کہتا جاتا تھا: اے محمدؐ کے خدا! اگر تو میری توبہ قبول کرلے تو اس کی اپنے پیغمبر کو اطلاع کر دے، ورنہ آسمان سے آگ بھیج کر مجھے جلا دے اور مجھے آخرت کے عذاب سے نجات دے۔ یہ موقع تھا جبکہ قاصدِ وحیِ خدا پیغمبر گرامیؐ پر نازل ہوا اور آیہ قل یاعبادی الذین اسرفوا ......، آنحضرتؐ کے حضور میں پڑھی [1]

جبرئیل کی طرف سے اس آیت کی تلاوت، یہاں ممکن ہے پہلی بار کی صورت میں نہ ہو کہ شانِ نزول کا پہلو پیدا کرے بلکہ ایک ایسی آیت کا تکرار ہو جو پہلے نازل ہو چکی ہے اور یہ اس گنہ گار شخص کی توبہ قبول کرنے کے اعلان اور زیادہ تاکید و توجہ کے لیے ہو۔

ہم پھر عرض کیے دیتے ہیں کہ اس قسم کے اشخاص جو گناہ کا سنگین بوجھ اپنے کندھوں پر لیے ہوئے ہوتے ہیں وہ اپنے اعمالِ صالح کے ذریعے تلافی کرنے کے لیے بہت بھاری ذمہ داری رکھتے ہیں۔

جناب فخر رازی نے زیر بحث آیات کے لیے ایک اور شانِ نزول بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیات اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، وہ کہتے تھے کہ محمدؐ کا خیال یہ ہے کہ جو شخص بت کی پوجا کرے یا جس کا ہاتھ کسی کے خون میں رنگا ہوا ہو وہ کبھی بھی نہیں بخشا جائے گا، اس کے باوجود وہ ہم سے یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام لے آؤ، ہم کس طرح اسلام لے آئیں جبکہ ہم نے بُت پرستی بھی کی ہے اور بے گناہوں کا خون بھی بہایا ہے (تو یہ آیات نازل ہوئیں اور توبہ کا دروازہ ان کے سامنے کھول دیا گیا) [2]

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد نہم صفحہ ۴۱۲ (زیر بحث آیات کے ذیل میں)

[2] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۷ ص ۴ (زیر بحث آیات کے ذیل میں)

۵۶۔ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ ۝

۵۷۔ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۝

۵۸۔ اَوْ تَقُوْلَ حِیْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِیْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

۵۹۔ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰیٰتِیْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝

ترجمہ

۵۶۔ (یہ احکام اس بنا پر ہیں کہ) مبادا کوئی شخص قیامت کے دن کہے: افسوس ہے مجھ پر ان کوتاہیوں کی بنا پر جو میں نے فرمانِ خدا کی اطاعت میں کی ہیں اور (اس کی آیات کا) میں نے مذاق اور تمسخر اڑایا ہے۔

۵۷۔ اور مبادا وہ کہے کہ اگر خدا میری ہدایت کرتا تو میں پرہیزگاروں میں سے ہوتا۔

۵۸۔ یا جس وقت وہ عذاب کو دیکھے تو کہے کہ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ میں دوبارہ (دنیا کی طرف) پلٹ جاؤں، تاکہ نیکوکاروں میں سے ہوجاؤں؟

۵۹۔ ہاں! میری آیات تیرے پاس آئی تھیں، لیکن تو نے ان کی تکذیب کی اور تکبر کیا اور تو کافروں میں سے تھا۔

تفسیر

اس دن پشیمانی فضول ہے

گزشتہ آیات میں توبہ اور گزشتہ اعمال کی تلافی اور اصلاح کے لیے ایک تاکیدی حکم آیا تھا۔ زیرِ بحث آیات اس کے بعد

آئی ہیں، پہلے فرمایا گیا ہے: یہ حکم اس لیے دیئے گئے تھے کہ مبادا کوئی قیامت کے دن کہے کہ افسوس ہے میرے پیمان کوتاہیوں کی وجہ سے جو میں نے فرمان خدا کی اطاعت میں کی ہیں اور اس کی آیات اور رسولوں کا میں نے مذاق اڑایا تھا (ان تقول نفس یاحسرتا علیٰ ما فرطت فی جنب الله و ان کنت لمن الساخرین)۔[1]

"یا حسرتا" اصل میں "یا حسرتی" تھا (حسرت کی یاء متکلم کی طرف اضافت ہوئی ہے) اور "حسرت" ان چیزوں پر غم کے معنی میں ہے جو ہاتھ سے نکل گئی ہوں اور پشیمانی باقی رہ گئی ہو۔

"راغب" مفردات میں کہتا ہے کہ یہ لفظ "حسر" (بروزن "حبس") کے مادہ سے برہنہ کرنے اور لباس اتارنے کے معنی میں ہے اور چونکہ گزشتہ پر ندامت اور غم کے موقع پر گویا جہالت کے پردے برطرف ہو گئے ہیں، اس لیے یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔

ہاں! جس وقت انسان عرصۂ محشر میں وارد ہوگا اور کوتاہیوں، چشم پوشیوں، غلط کاریوں اور اہم باتوں کو مذاق سمجھنے کے نتائج کو اپنی آنکھ کے سامنے دیکھے گا تو وہ "واحسرتا" کہہ کر فریاد بلند کرے گا۔ ایک بھاری غم گہری ندامت کے ساتھ اس کے دل پر سایہ فگن ہوگا اور وہ اپنی اس اندرونی حالت کو زبان پر جاری کرتے ہوئے مذکورہ جملوں کی صورت میں بیان کرے گا۔

اس بارے میں کہ یہاں "جنب الله" کے کیا معنی ہیں؟ مفسرین نے بہت سے احتمال ذکر کیے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ "جنب" لغت میں پہلو کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں ہر اس چیز پر اس کا اطلاق ہونے لگا جو کسی دوسری چیز کے ساتھ قرار پائی ہے۔ جیسا کہ "یمین" و "یسار" بدن کے دائیں اور بائیں طرف کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد ہر اس چیز کو جو اس طرف قرار پائی ہے "یمین" و "یسار" کہا جانے لگا۔ یہاں بھی "جنب الله" ان تمام امور کے معنی میں ہے جو پروردگار کی جانب اور اس کے لیے قرار پاتے ہیں۔ اس کا فرمان، اس کی اطاعت، اس کا قرب اور کتب آسمانی جو اس کی طرف سے نازل ہوئیں، یہ سب اس کے معنی میں جمع ہیں۔

اس طرح سے گنہگاران تمام کوتاہیوں پر جو انھوں نے خدا کے بارے میں کی تھیں، ندامت، افسوس اور حسرت کا اظہار کریں گے اور اس کی آیات اور رسولوں کے بارے میں تمسخر و استہزا انھیں خاص طور پر یاد آئے گا کیونکہ ان کی کوتاہیوں کا اصلی عامل ان عظیم حقائق سے جہالت، غرور اور تعصب کے باعث بے اعتنائی کرنا اور مذاق خیال کرنا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور مبادا وہ یہ کہے کہ اگر خدا مجھے ہدایت کرتا تو میں پرہیزگاروں میں سے ہوتا (او تقول لو ان الله هدانی لکنت من المتقین)۔

یہ بات گویا وہ اس وقت کہے گا جب اسے میزان حساب کے پاس لائیں گے، وہ ایک گروہ کو دیکھے گا جو نیکیوں سے بھرے دامن کے

---

[1] اس آیت کی ابتدا میں کچھ محذوف ہے جو اسے گزشتہ آیات کے ساتھ جوڑتا ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے "لئلا تقول نفس" یا "حذرًا ان تقول نفس..." دوسری صورت میں یہ جملہ "انیبوا واسلموا واتبعوا" کا "مفعول لہ" ہوگا اور "وان کنت لمن الساخرین" میں "ان" مخففہ ہے مثقلہ سے اور اصل میں "انی کنت لمن الساخرین" تھا۔

ساتھ جنت کی طرف جا رہے ہیں لہٰذا یہ بھی یہ آرزو کرے گا کہ ان کی صف میں ہو اور ان کے ساتھ خدائی نعمتوں کی طرف جائے۔

مزید ارشاد ہوتا ہے: اور مبادا جس وقت وہ عذاب الٰہی کو دیکھے تو کہے: کیا یہ ہو سکتا ہے کہ مجھے دوبارہ دنیا کی طرف پلٹا دیں تاکہ میں نیکو کاروں میں سے ہو جاؤں؟ (او تقول حین تری العذاب لو ان لی کرۃ فاکون من المحسنین)۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب اسے جہنم کی طرف لے جائیں گے اور اس کی آنکھ جلا دینے والی آگ اور اس کے دردناک عذاب کے منظر پر پڑے گی، اس کے دل سے ایک آہ نکلے گی اور وہ آرزو کرے گا "اے کاش! اسے اجازت دے دی جاتی کہ وہ دنیا کی طرف پلٹ جائے، اپنی گزشتہ تباہ کاریوں کا اپنے نیک اعمال کے ساتھ ازالہ کرے اور نیکو کاروں کی صف میں جگہ پائے۔

اس طرح مجرمین قیامت میں یہ تینوں طرح کی گفتگو ایک خاص موقعہ پر کریں گے۔

صحن محشر میں وارد ہوتے ہی اظہار حسرت کریں گے۔

پرہیزگاروں کے اجر کو دیکھ کر ان کی سی سرنوشت کی آرزو کریں گے۔

اور عذابِ الٰہی کا مشاہدہ کر کے دنیا کی طرف لوٹنے اور گزشتہ اعمال کی تلافی کی آرزو کریں گے۔

قرآن اس تینوں طرح کی گفتگو کے مقابلے میں صرف دوسری گفتگو کا اس طرح جواب دیتا ہے: ہاں! میری آیات تیرے پاس آئیں اور تو نے ان کی تکذیب کی اور تکبر کیا اور تو کافروں میں سے تھا۔ (بلیٰ قد جاء تک اٰیاتی فکذبت بها واستکبرت وکنت من الکافرین)[1]

یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ اگر خدائی ہدایت میرے پاس آئی ہوتی تو میں بھی پرہیزگاروں میں سے ہوتا، تو وہ ہدایتِ الٰہی کیا ہے؟ وہ ان سب آسمانی کتابوں، خدا کے رسولوں اور آفاق و انفس میں حق کی نشانیوں کے سوا اور تو کچھ نہیں ہے۔

تو نے ان سب آیات کو دیکھا بھی ہے اور سنا بھی ہے، ان کے بارے میں تیرا ردِ عمل کیا تھا؟ تکذیب، تکبر اور کفر۔

کیا یہ ممکن ہے کہ خدا اتمام حجت کے بغیر کسی کو سزا دے؟ کیا خدا کے تربیتی نظام کے لحاظ سے تیرے اور ہدایت یافتہ لوگوں کے درمیان کوئی فرق تھا؟

ان تینوں اعمال میں سے "تکبر" تو اصلی جڑ ہے، اس کے بعد "آیاتِ الٰہی کی تکذیب" ہے اور اس کا نتیجہ "کفر و بے ایمانی" ہے۔

لیکن وہ ان کی پہلی بات کا جواب کیوں نہیں دیتا؟ کیونکہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس سے کوئی گریز نہیں ہے، انھیں

---

[1] اگرچہ گزشتہ آیات میں قائل "نفس" تھا اور وہ مونث ہے اور آیات قرآن میں اس سے مربوط اوصاف و افعال بار ہا مونث کی صورت میں آئے ہیں، لیکن زیر بحث آیت میں "کذبت" اور اس کے بعد کی ضمیریں مذکر آئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اس سے مراد انسان ہے اور اس کی مثل ہے بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لفظ نفس مذکر و مونث دونوں طرح سے استعمال ہوتا ہے۔

حسرت و ندامت اٹھانا اور غم و اندوہ میں ہی غرق رہنا چاہیے۔

باقی رہا تیسری بات کے بارے میں جو دنیا کی طرف بازگشت کا تقاضا ہے تو قرآن کی آیات میں متعدد مواقع پر اس کا جواب دیا جا چکا ہے لہٰذا اب تکرار کی ضرورت نہیں۔ مثلاً سورہ انعام کی آیہ ۲۸:

ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه وانهم لكاذبون

اگر وہ لوٹ بھی جائیں تو بھی انہیں گزشتہ اعمال کو دہرائیں گے اور وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

اسی طرح سورہ مومنون کی آیہ .. بھی اس ضمن میں موجود ہے۔

اس سے قطع نظر جو جواب ان کی دوسری بات کا دیا گیا ہے وہی ان کے پہلے سوال کے جواب کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے، کیونکہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کا مقصد کیا ہے؟ کیا اتمام حجت کے سوا کچھ اور ہے؟ جبکہ خدا ان پر اتمام حجت کر چکا ہے اور اس سلسلے میں کوئی کمی نہیں کی ہے کہ دوبارہ اسے بیان کرے۔ جو بیداری مجرمین میں عذاب دیکھ کر پیدا ہوگی، وہ ایک قسم کی اضطراری بیداری ہوگی، اور واپسی کی صورت میں عام حالت میں اس کے آثار باقی نہیں رہیں گے۔ یہ ٹھیک اسی بات کے مانند ہے جو قرآن مشرکین کے دریا کی موجوں میں گرفتار ہو جانے کے موقع کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ وہ اس وقت تو خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارتے ہیں لیکن جب وہ ساحلِ نجات پر پہنچ جاتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

فاذا ركبوا فى الفلك دعوا الله مخلصين له الدين فلما نجاهم الى البر اذا هم يشركون

(عنکبوت ـــــــ ۶۵)

چند نکات

۱۔ **"جنب الله" میں کوتاہی:** ہم بیان کر چکے ہیں کہ زیر بحث آیات میں "جنب الله" ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر اس مطلب پر محیط ہے جو خدا کے ساتھ مربوط ہے اور اس طرح سے اس حصے میں کوتاہی اس کے فرمان کی اطاعت، کتب آسمانی کی پیروی اور انبیاء و اولیاء کی اقتداء کے ضمن میں تمام قسم کی کوتاہیوں پر محیط ہے۔

اسی بنا پر متعدد روایات میں آئمہ اہلِ بیتؑ سے منقول ہے کہ "جنب الله" سے مراد آئمہ اہل بیتؑ ہیں۔ اس سلسلے میں ایک روایت جو اصول کافی میں امام موسیٰ بن جعفرؑ سے "يا حسرتا على ما فرطت فى جنب الله" کی تفسیر کے بارے میں بیان ہوئی ہے، اس میں ہے:

جنب الله امير المؤمنين (ع) وكذالك من كان بعده من الاوصياء بالمكان الرفيع الى ان ينتهى الامر الى اخرهم

"جنب اللہ" امیرالمؤمنین اور اسی طرح آپ کے بعد کے اوصیاء ہیں جو بلند مقام رکھتے ہیں یہاں تک کہ یہ سلسلہ ان کے آخری تک جا پہنچے (کہ وہ حضرت مہدی ارواحنا فداہ ہیں) [1]

علاوہ ازیں تفسیر علی بن ابراہیم میں امام صادقؑ سے بیان ہوا ہے:

نحن جنب الله

جنب اللہ ہم ہیں [2]

یہی معنی دوسری روایات میں دوسرے ائمہ سے بھی نقل ہوئے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے بارہا بیان کیا ہے، یہ تفاسیر واضح مصادیق کا بیان ہیں، کیونکہ یہ بات تو مسلّم ہے کہ ائمہ کے مکتب کی پیروی پیغمبر اکرمؐ کی پیروی اور خدا کے حکم کی اطاعت ہے، کیونکہ وہ خود اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں کہتے۔

ایک اور حدیث میں قیامت کے دن حسرت و ندامت رکھنے والوں کا واضح مصداق "بے عمل عالموں" کو بتایا گیا ہے۔

کتاب "محاسن" میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

ان اشد الناس حسرة يوم القيامة الذين وصفوا العدل ثم خالفوه، و هو قول الله عز وجل ان تقول نفس يا حسرتا على ما فرطت فی جنب الله

قیامت کے دن سب لوگوں سے زیادہ افسوس کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو حق و عدالت کے راستے کی لوگوں کے سامنے تعریف و توصیف کرتے تھے، اور پھر خود ہی اس کی مخالفت پر تیار ہو جاتے تھے اور یہ وہی چیز ہے جسے خداوند تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے۔ ان تقول نفس يا حسرتا على ما فرطت فی جنب الله [3]

۲۔ **موت کے آستانے پر یا قیامت:** کیا یہ تینوں باتیں جو مجرمین عذاب الٰہی کو دیکھ کر کریں گے ان کی عمر کے آخر میں عذاب استیصال کے ساتھ مربوط ہیں؟ یا عرصۂ قیامت میں ورود کے وقت سے مربوط ہیں؟

اس سلسلے میں دوسرا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے، اگرچہ اس سے پہلے کی آیات عذاب استیصال کے ساتھ مربوط ہیں اور اس کے بعد والی قیامت کے ساتھ مربوط ہے۔ اس بات کی شاہد سورۂ انعام کی آیہ ۳۱ ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے:

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۵

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۵

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۶

قد خسر الذین کذبوا بلقاء اللہ حتیٰ اذا جاءتھم الساعۃ بغتۃ قالوا یاحسرتنا علیٰ ما فرطنا فیھا

وہ لوگ جنھوں نے لقائے پروردگار کا انکار کر دیا تھا وہ نقصان اور خسارے میں گرفتار ہو گئے، ان کی حالت اسی طرح سے جاری رہے گی، یہاں تک کہ اچانک قیامت آجائے گی۔ اس وقت وہ کہیں گے "ہائے افسوس ہم نے اس بارے میں کوتاہی کی تھی۔

مذکورہ بالا روایات بھی اس معنی پر ایک گواہ ہیں۔

۶۰۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ○

۶۱۔ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۡ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

۶۲۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۡ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ○

۶۳۔ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○

۶۴۔ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ○

ترجمہ

۶۰۔ اور جنھوں نے خدا پر جھوٹ باندھا تھا، قیامت کے دن تو دیکھے گا کہ ان کے منہ کالے ہیں، کیا جہنم میں متکبرین کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟

۶۱۔ اور خدا ان لوگوں کو جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا تھا کامیابی کے ساتھ نجات دے گا۔ انھیں کوئی بھی برائی لاحق نہ ہوگی اور نہ وہ ہرگز غمگین ہوں گے۔

۶۲۔ خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز کا محافظ اور نگران ہے۔

۶۳۔ آسمان اور زمین کی چابیاں اسی کی ملکیت ہیں اور جن لوگوں نے خدا کی آیات کا انکار کیا وہی تو خسارے میں ہیں۔

۶۴۔ کہہ دے: اے جاہلو! کیا تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کا حکم دیتے ہو؟

تفسیر

ہر چیز کا خالق و محافظ خدا ہے

گزشتہ آیات میں ان متکبر اور جھوٹے مشرکین کے بارے میں گفتگو تھی جو قیامت کے دن اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے اور اس جہان کی طرف واپسی کا تقاضا کریں گے۔ ایسا تقاضا جو لاحاصل اور ناقابلِ قبول ہے۔ اب زیرِ بحث آیات میں اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے، جنھوں نے خدا پر جھوٹ باندھا تھا، قیامت کے دن تو دیکھے گا کہ ان کے منہ کالے ہیں (و یوم القیامۃ تری الذین کذبوا علی اللہ وجوھھم مسودۃ)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کیا جہنم میں متکبرین کے لیے کوئی جگہ نہیں؟ (الیس فی جھنم مثوی للمتکبرین)۔

اگرچہ "کذبوا علی اللہ" (خدا پر انھوں نے جھوٹ باندھا) کا مفہوم وسیع اور کشادہ ہے، لیکن زیرِ بحث آیت میں خدا کی طرف شرک کی نسبت دینے اور خدا کے لیے فرشتوں میں سے یا حضرت عیسیٰؑ یا کسی اور کے فرزند ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح لفظ "متکبر" اگرچہ ان تمام لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں لیکن یہاں زیادہ تر وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے انبیاء کی دعوت کے مقابلے میں دینِ حق سے استکبار کیا اور ان کی دعوت قبول کرنے سے روگردانی کی۔

قیامت میں جھوٹ بولنے والوں کی روسیاہی، ان کی ذلت و خواری اور رسوائی کی نشانی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عرصۂ قیامت انسان کے پوشیدہ اسرار ظاہر ہونے اور ان کے اعمال و افکار مجسّم ہونے کا میدان ہے۔ جو لوگ اس دنیا میں سیاہ اور تاریک دل رکھتے تھے، اور ان کے اعمال ان کے افکار کی طرح تیرہ و تار تھے، وہاں ان کی یہ اندرونی حالت باہر آجائے گی اور ان کے چہرے تاریک و سیاہ ہوجائیں گے۔

دوسرے لفظوں میں قیامت میں ظاہر و باطن ایک ہوجائے گا اور چہرے دلوں کا رنگ اختیار کرلیں گے، جن کے دل تاریک و سیاہ ہوں گے ان کے چہرے سیاہ ہوجائیں گے اور جن کے دل نورانی ہیں ان کے چہرے بھی ایسے ہی ہوں گے۔

جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۱۰۶، ۱۰۷ میں آیا ہے:

> یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ فاما الذین اسودت وجوھھم اکفرتم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون ٥ واما الذین ابیضت وجوھھم ففی رحمۃ اللہ ھم فیھا خالدون ٥

اس دن کچھ چہرے سفید اور کچھ چہرے سیاہ ہوجائیں گے، جن کے چہرے سیاہ ہوجائیں گے ان سے کہا جائے گا: کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہوگئے تھے، اب تم اپنے کفر کی وجہ سے عذاب چکھو! اور جن کے چہرے سفید اور نورانی ہوں گے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا کی رحمت میں رہیں گے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کچھ روایات جو منابع اہل بیتؑ سے نقل ہوئی ہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا پر جھوٹ باندھنا جو قیامت میں روسیاہی کا سبب ہے، ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس میں امامت اور رہبری ناحق دعویٰ بھی شامل ہے۔ جیسا کہ صدوق کتاب اعتقادات میں امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں:

من زعم انه امام و لیس بامام" قیل و ان کان علویًا فاطمیًا؟ قال و ان کان علویًا فاطمیًا

اس سے مراد وہ شخص ہے جو خود کو امام سمجھے جبکہ وہ امام نہ ہو۔ عرض کیا گیا: چاہے وہ نسل علی اور اولادِ فاطمہ سے ہو؟ فرمایا: ہاں چاہے وہ نسلِ علی اور اولادِ فاطمہ سے ہی ہو[1]

یہ حقیقت میں ایک واضح مصداق کا بیان ہے کیونکہ خدا کی طرف سے امامت و رہبری کا دعویٰ کرنا اگر حقیقت کے مطابق نہ ہو تو خدا پر جھوٹ باندھنے کا واضح ترین مصداق ہے۔

اسی طرح جو لوگ پیغمبر یا امام برحق کی طرف جھوٹی نسبت دیں تو ان کا عمل بھی درحقیقت خدا پر جھوٹ بولنا ہے، کیونکہ وہ اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں کہتے۔ اسی لیے امام صادقؑ سے ایک اور حدیث میں منقول ہے۔

من حدث عنا بحدیث فنحن سائلوه عنه یومًا فان صدق علینا فانما یصدق علی الله و علی رسوله و ان کذب علینا فانه یکذب علی الله و رسوله لانا اذا حدثنا لا نقول قال فلان و قال فلان، انما نقول قال الله و قال رسوله (ص) ثم تلا هذه الآیة " و یوم القیامة ترى الذین کذبوا علی الله وجوههم مسودة ...

جو شخص کوئی حدیث ہم سے نقل کرے تو ہم ایک دن اس سے سوال کریں گے: اگر اس نے سچ کہا ہے اور ہم سے ہی بیان کیا ہے تو حق بات کی خدا اور اس کے پیغمبر کی طرف نسبت دی ہے اور اگر ہم پر جھوٹ بولا ہے تو اس نے خدا اور اس کے رسول پر جھوٹ بولا ہے کیونکہ ہم جس وقت کوئی حدیث بیان کرتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہتے کہ فلاں شخص اور فلاں شخص نے یہ کہا ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ خدا نے یہ کہا ہے اور اس کے پیغمبر نے کہا ہے پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی: و یوم القیامة تری الذین کذبوا علی الله وجوههم مسودة ....[2]

یہ حدیث اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتے اور تمام صحیح اور

---

[1] اعتقادات الامامیہ تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۶ کے مطابق۔ یہی معنی تفسیر علی بن ابراہیم اور کتاب کافی سے بھی نقل ہوا ہے۔ (کتاب کافی جلد اول باب "من ادعی الامامة و لیس لها باهل" حدیث اول و دوم کی طرف رجوع کریں۔

[2] مجمع البیان مذکورہ بحث آیات کے ذیل میں

معتبر احادیث جو ان سے نقل ہوئی ہیں وہ سب کی سب پیغمبر اکرمؐ کی طرف بازگشت کرتی ہیں، اور یہ ایسا نکتہ ہے جو تمام علماء اسلام کے لیے قابلِ غور ہے۔ اس بنا پر ان لوگوں کو بھی جو ان کی امامت قبول نہیں کرتے کم از کم ان کی احادیث کو احادیث رسولؐ کے عنوان سے تو قبول کرنا چاہیے۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث امام صادقؑ سے کافی میں نقل ہوئی ہے اس میں بیان ہوا ہے :

ہم میں سے ہر ایک امام کی حدیث دوسرے امام کی حدیث ہے اور ہماری حدیث رسول اللہ کی حدیث ہے

(کافی جلد اول باب روایت الکتب والحدیث حدیث ۱۴)

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ آیاتِ قرآنی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ کفر کا اصلی سرچشمہ کبر و غرور ہی ہے۔ جیسا کہ شیطان کے بارے میں آیا ہے :

ابی واستکبر وکان من الکافرین

اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ (بقرہ ——— ۳۴)

اسی بنا پر متکبرین کی جگہ جہنم کی جلا ڈالنے والی آگ کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتی۔

یہاں تک کہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

ان فی جهنم لوادیا للمتکبرین یقال له سقر، شکی الی الله عزوجل شدة حره، وسئله ان یتنفس فاذن له فتنفس فاحرق جهنم

جہنم میں ایک علاقہ ایسا ہے جو متکبرین کے لیے مخصوص ہے اسے سقر کہا جاتا ہے، ایک دفعہ اس نے اپنی حرارت کی شدت کی خدا سے شکایت کی اور یہ تقاضا کیا کہ وہ ایک سانس لے لے، اسے اجازت دے دی گئی تو اس نے ایک ایسا سانس لیا جس نے جہنم کو جلا کر رکھ دیا۔[1]

بعد والی آیت میں اس گروہ کے مدِمقابل یعنی پرہیزگاروں کے اور قیامت میں ان کی سعادت کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے، فرمایا گیا ہے : خدا ان لوگوں کو جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا نجات دے گا اور انھیں کامیاب کرے گا (وینجی الله الذین اتقوا بمفازتهم)[2]

---

۱ تفسیر علی بن ابراہیم ، نورالثقلین جلد ۴ ص ۴۹۶ کے مطابق یہی حدیث تفسیر صافی میں بھی زیر بحث آیات کے ذیل میں آیا ہے۔

۲ "مفازة" مصدر میمی ہے اور فلاح اور کامیابی کے معنی میں ہے اور "بمفازتهم" میں "با" یا ملابست کے لیے ہے یا سببیت کے لیے پہلی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا۔

خدا انھیں کامیابی کے ساتھ نجات دے گا۔

دوسری صورت میں آیت کا معنی یہ ہے :

خدا انھیں ان کی کامیابی کی وجہ سے (ایمان اور عمل صالح کی طرف کنایہ ہے) نجات اور رہائی بخشے گا۔

اس کے بعد اس فلاح وکامیابی کی ان دو مختصر اور پرمعنی جملوں کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے، کوئی برائی ان تک نہ پہنچے گی اور کوئی غم انھیں نہیں ہوگا (لا یمسهم السوء و لا هم یحزنون)۔

وہ ایسے عالم میں زندگی بسر کریں گے جہاں سوائے نیکی و پاکیزگی اور وجد و سرور کے کوئی چیز نہ ہوگی۔ حقیقت میں اس مختصر سی تعبیر نے خدا کی تمام نعمتوں کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے۔

بعد والی آیت ایک بار پھر مسئلہ توحید کی جانب اور شرک کے خلاف مقابلے کی طرف لوٹتی ہے اور مشرکین کے ساتھ جو گفتگو ہو رہی تھی، اسی کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ فرمایا گیا ہے: خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی تمام چیزوں کا محافظ اور ان پر ناظر و نگران ہے (الله خالق کل شیء و هو علیٰ کل شیء وکیل)۔

پہلا جملہ "توحید خالقیت" کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا جملہ "توحید ربوبیت" کی طرف اشارہ ہے۔

توحید خالقیت کا مسئلہ تو ایسی چیز ہے کہ مشرکین تک بھی عام طور پر اس کے معترف تھے۔ جیسا کہ اسی سورہ کی آیہ ۳۸ میں بیان ہوا ہے۔

اگر تو مشرکین سے پوچھے کہ آسمان و زمین کس نے پیدا کیے تو وہ کہیں گے: اللہ نے۔

لیکن انھوں نے توحید ربوبیت میں انحراف کیا تھا، وہ اپنے کاموں کا محافظ، نگہبان اور مدبر بتوں کو ہی سمجھتے تھے اور مشکلات میں انھی سے پناہ لیتے تھے۔ قرآن درحقیقت مذکورہ بیان کے ذریعے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ امور عالم کی تدبیر اور اس کی حفاظت و نگہداری اسی ہستی کے ہاتھ میں ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ اس بنا پر ہر حالت میں اسی کی پناہ لینی چاہیے۔

ابن منظور نے لسان العرب میں "وکیل" کے متعدد معانی بیان کیے ہیں، مثلاً "کفیل" "حافظ" اور "وہ ہستی جو کسی چیز کے امور کی تدبیر کرے"۔

اس طرح سے ثابت ہو جاتا ہے کہ بت نہ تو کوئی فائدہ ہی پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نقصان، نہ تو وہ کوئی گرہ کھول سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی گرہ لگا سکتے ہیں، ایک ایسا ضعیف و کمزور وجود ہیں کہ جن سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

مکتب جبر کے بعض پیروکار "الله خالق کل شیء" سے اپنے انحرافی عقیدہ پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال بھی آیت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اس بنا پر ان کا خالق بھی خدا ہی ہے اگرچہ ان کے ظہور کا مقام ہمارے بدن کے اعضاء ہیں۔

ان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ اس مطلب کو نہ سمجھ سکے کہ خدا کی خالقیت، ہمارے افعال کے بارے میں ہمارے اختیار اور ارادے کی آزادی سے کوئی تضاد نہیں رکھتی، کیونکہ یہ دونوں نسبتیں طول میں ہیں عرض میں نہیں۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ ہمارے اعمال خدا کی طرف بھی نسبت رکھتے ہیں اور ہماری طرف بھی۔ ایک طرف تو عالم ہستی کی کوئی چیز بھی خدا کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے اور اس لحاظ سے ہمارے اعمال بھی اسی کی مخلوق ہیں، لیکن اسی نے چونکہ ہمیں قدرت و طاقت، عقل و فہم، ارادہ و اختیار، آلات کار اور آزادیٔ عمل عطا کی ہے تو اس لحاظ سے ہمارے عمل کو اس کی طرف نسبت دی جا سکتی ہے۔

اس کی مشیت یہ ہے کہ ہم آزاد رہیں اور اعمالِ اختیاری بجالائیں اور اس نے تمام وسائل ہمارے اختیار میں دے دیئے ہیں۔
لیکن اس کے باوجود ہم اپنے عمل میں آزاد و مختار ہیں اور اس لحاظ سے ہمارے افعال ہماری طرف منسوب ہیں اور ہم ان کے بارے میں مسئول اور ذمہ دار ہیں۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم ہی اپنے اعمال کے خالق ہیں اور خدا کا ان میں کوئی دخل نہیں ہے تو وہ مشرک ہے کیونکہ وہ دو خالقوں کا معتقد ہو گیا، بڑا خالق اور چھوٹا خالق، اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہمارے افعال کا خالق خدا ہے اور ہمارا اس میں کوئی دخل نہیں ہے تو وہ منحرف ہے، کیونکہ اس نے خدا کی حکمت و عدالت کا انکار کیا ہے کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اعمال تو اس کے ہوں اور ان کے بارے میں جواب دہ ہم ہوں، اس صورت میں سزا و جزا، حساب و معاد اور ذمہ داری و مسئولیت کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔

اس بنا پر صحیح اسلامی عقیدہ جو قرآن کی آیات کو یکجا جمع کرنے سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے یہ ہے کہ ہمارے تمام اعمال اس کی طرف بھی نسبت رکھتے ہیں اور ہماری طرف بھی نسبت رکھتے ہیں اور یہ دونوں نسبتیں آپس میں کسی قسم کی کوئی تضاد نہیں رکھتیں کیونکہ یہ دو طولی نسبتیں ہیں نہ کہ عرضی و متوازی (غور کیجیے گا)۔

بعد والی آیت خدا کی توحید مالکیت کے ذکر کے ساتھ گزشتہ آیت کی توحیدی بحث کی تکمیل کرتی ہے اور کہتی ہے: آسمانوں اور زمین کی چابیاں اسی کے لیے ہیں (له مقالید السماوات والارض)۔

"مقالید" اکثر اربابِ لغت کے قول کے مطابق "مقلید" کی جمع ہے (اگرچہ زمخشری نے یہ کہا ہے کہ یہ کلمہ اپنی جنس سے کوئی مفرد نہیں رکھتا) اور "مقلید" و "اقلید" دونوں چابی کے معنی میں ہیں اور لسان العرب اور بعض دوسروں کے مطابق اس کی اصل فارسی کے لفظ "کلید" سے لی گئی ہے اور عربی میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بنا پر (مقالید السماوات والارض) کا معنی آسمانوں اور زمین کی چابیاں ہی ہے[1]

یہ تعبیر عام طور پر کسی چیز کی مالکیت اور اس پر تسلط کے لیے کنایہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں: اس کام کی چابی فلاں کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا زیرِ بحث آیت خدا کی توحیدِ مالکیت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتی ہے اور عالمِ ہستی پر اس کی توحید تدبیر و ربوبیت و حاکمیت کی طرف بھی۔

اسی بنا پر قرآن اس جملے کے بعد بلا فاصلہ اس طرح نتیجہ نکالتا ہے، جنھوں نے آیاتِ خدا سے کفر کیا ہے وہ زیاں کار ہیں (والذین کفروا بآیات الله اولئك هم الخاسرون)۔

کیونکہ انھوں نے تمام خیرات و برکات کے منبع اصلی اور سرچشمہ حقیقی کو چھوڑ دیا ہے اور بے راہ رو ہو کر سرگرداں ہو گئے ہیں۔ جس ذات کے ہاتھ میں آسمان و زمین کی تمام چابیاں ہیں اس سے روگردانی کر کے ناتواں موجودات کے پیچھے لگ گئے ہیں، جن سے مطلق طور پر

---

[1] بعض فارسی لغت نویسوں کے قول کے مطابق "کلید"، کا معرب "اقلید" و "اکلیل" سے اور "مقلاد" وہ آلہ ہے جس کے ساتھ قفل کھولا اور بند کیا جاتا ہے (حاشیہ برہان قاطع)۔

کوئی بھی کام نہیں ہوسکتا ۔

ایک حدیث میں امیرالمؤمنین علیؑ سے منقول ہوا ہے کہ میں نے رسولِ خدا سے "مقالید" کی تفسیر پوچھی، تو آپؐ نے فرمایا:

یا علی لقد سئلت عن عظیم المقالید، ھو ان تقول عشرًا اذا اصبحت، وعشرًا اذا امسیت، لا الٰہ الّا اللّٰہ واللّٰہ اکبر وسبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ واستغفر اللّٰہ ولا قوۃ الا باللّٰہ (ھو) الاول والاٰخر والظاھر والباطن لہ الملک ولہ الحمد (یحیی و یمیت) بیدہ الخیر وھو علٰی کل شیءٍ قدیر

تو نے عظیم چابیوں کے بارے میں سوال کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تو ہر صبح اور ہر شام ان جملوں کی تکرار کرے

لا الٰہ الّا اللّٰہ واللّٰہ اکبر وسبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ....

آخر حدیث تک۔

پھر آپؐ نے مزید فرمایا:

جو شخص ہر صبح و شام دس مرتبہ ان کلمات کی تکرار کرے گا، خدا اسے چھ اجر عطا کرے گا، جن میں سے ایک یہ ہے کہ خدا اسے شیطان اور اس کے لشکر سے محفوظ رکھے گا تاکہ اس کا اس پر تسلّط نہ ہو[1]

یہ بات کہے بغیر ہی واضح ہے کہ ان کلمات کا کہنا زبان کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں ان سب اجور کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ ان کے مطالب و معانی پر ایمان اور ان پر عمل بھی ضروری ہے۔

یہ حدیث ممکن ہے خدا کے اسمائے حسنیٰ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہو، جو عالمِ ہستی پر اس کی مالکیت و حاکمیت کا مبدء ہیں۔ (غور کیجیے گا)

توحید کی شاخوں کے بارے میں گزشتہ آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اس سے مجموعی طور پر بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ "توحید در عبادت" ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ یہاں تک کہ ایک فہمیدہ اور عقل مند انسان اپنے آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ بتوں کے سامنے سجدہ کرے۔ اس لیے اس کے بعد ایک قاطع اور سخت لب و لہجے میں فرمایا گیا ہے۔ کہہ دے: اے جاہلو! کیا تم مجھے یہ حکم دیتے ہو کہ میں غیر خدا کی عبادت کروں (قل افغیر اللّٰہ تأمرونّی اعبد ایھا الجاھلون)۔

یہ گفتگو خاص طور پر اس بات کی طرف توجہ کرنے سے ایک بہت عمیق مفہوم پیدا کرتی ہے کہ کفار و مشرکین بعض اوقات پیغمبرِ اسلامؐ کو یہ دعوت دیتے تھے کہ آپؐ ان کے خداؤں کا احترام اور پرستش کریں یا کم از کم بتوں کی عیب جوئی اور ان پر تنقید کرنے سے پرہیز کریں۔ گویا یہ آیت صراحت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ مسئلہ توحید اور نفیِ شرک کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس پر کوئی معاملہ، سودے بازی یا سمجھوتہ کیا جاسکے۔ شرک تو جا ہے جس صورت میں بھی ہو اسے نابود کر دینا چاہیے اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہیے۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۱۹، ۵ اور تفسیر ابوالفتوح الرازی جلد ۹ ص ۷، ۱۴ زیر بحث آیات کے ذیل میں (تلخیص کے ساتھ)۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بت پرست عام طور پر جاہل ہوتے ہیں؛ نہ صرف یہ کہ وہ پروردگار کے بارے میں جاہل ہیں بلکہ انھوں نے تو خود اپنی انسانیت کے بلند و بالا مقام کو بھی نہیں پہچانا اور اسے پامال کر دیا ہے۔

اس آیت میں امر اور حکم کی تعبیر بھی معنی خیز ہے۔ یہ اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ وہ کسی دلیل و منطق کے بغیر ایک آمرانہ لہجے میں پیغمبر اسلامؐ کو بت پرستی کی دعوت دیتے تھے۔ اس قسم کی باتیں جاہل و نادان افراد سے کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

کیا یہ جہالت و نادانی کی بات نہیں ہے کہ انسان عالم ہستی میں خدا کی ان تمام آیات اور نشانیوں کو چھوڑ دے جو اس کے علم و حکمت اور قدرت و تدبیر پر گواہ ہیں اور بے قدر و قیمت چیزوں سے چمٹ جائے جو نہ تو کوئی اثر رکھتی ہیں اور نہ ہی کسی خاصیت کی حامل ہیں۔

۶۵۔ وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○

۶۶۔ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ○

۶۷۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○

ترجمہ

۶۵۔ تمام گزشتہ انبیاء کی طرف بھی اور تیری طرف بھی یہی وحی کی گئی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو تیرے سارے اعمال نابود ہو جائیں گے اور تو زیاں کاروں میں سے ہو جائے گا۔

۶۶۔ بلکہ صرف خدا ہی کی عبادت کر اور شکر گزاروں میں سے ہو جا۔

۶۷۔ انھوں نے خدا کو اس کے شایانِ شان طریقے سے نہیں پہچانا حالانکہ قیامت کے دن ساری زمین اسی کے قبضۂ قدرت میں ہو گی اور آسمان اُسکے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہونگے، اس کی ذات ان کے شرک سے منزہ اور پاک اور بلند و بالا ہے۔

تفسیر

تو مشرک ہو جائے تو سب اعمال برباد!

ان آیات میں اسی طرح شرک و توحید سے مربوط مسائل ہی بیان ہو رہے ہیں جن کے متعلق گزشتہ آیات میں بھی گفتگو تھی۔

پہلی آیت میں شرک کے نقصان کو دو ٹوک انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تجھ سے پہلے کے تمام انبیاء کی طرف بھی اور تیری طرف بھی یہی وحی کی گئی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو یقیناً تیرے تمام اعمال حبط و نابود ہو جائیں گے اور تو زیاں کاروں میں سے ہو جائے گا۔ (ولقد اوحی الیك و الی الذین من قبلك لئن اشركت لیحبطن عملك و لتكونن

من الخاسرین)۔

اس طرح سے شرک کے دو خطرناک نتائج ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ خدا کے پیغمبروں کے لیے بھی اگر بفرضِ محال وہ مشرک ہوجائیں تو یہی نتائج ہوں گے۔

پہلا مسئلہ تو حبط اعمال کا ہے اور دوسرا مسئلہ زندگی کے خسران و زیان میں گرفتار ہونے کا۔

"حبط اعمال" کا معنی شرک کی وجہ سے عمل کے آثار اور اجر کا محو ہو جانا ہے کیونکہ اعمال قبول ہونے کی شرط، اصولِ توحید کا اعتقاد ہے اور اس کے بغیر کوئی عمل بھی قابلِ قبول نہیں ہوتا۔

شرک جلا ڈالنے والی وہ آگ ہے جو آدمی کے اعمال کے درخت کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔

شرک ایک ایسی کوندنے والی بجلی ہے جو زندگی کے تمام حاصل کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

شرک اس طوفان کے مانند ہے جو انسان کے اعمال کو ریزہ ریزہ کر کے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ ابراہیم کی آیہ ۱۸ میں بیان ہوا ہے۔

مثل الذین کفروا بربهم اعمالهم کرماد اشتدت به الریح فی یوم عاصف لا یقدرون مما کسبوا علیٰ شیء ذالك هو الضلال البعید

ان لوگوں کے اعمال جنھوں نے اپنے پروردگار سے کفر اختیار کیا اس خاکستر کے مانند ہیں جو ایک طوفانی دن میں تیز آندھی کے مقابل میں ہوں ان میں اپنے ان اعمال کو بچا لینے کی معمولی سی بھی سکت نہیں ہوتی جو انھوں نے انجام دیئے ہیں، یہی تو بہت بڑی گمراہی ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے :۔

ان الله تعالیٰ یحاسب کل خلق الا من اشرك بالله فانه لا یحاسب و یؤمر به الی النار

خداوند تعالیٰ تمام بندوں کا محاسبہ کرے گا مگر جس نے خدا کے ساتھ شرک کیا ہوگا اسے بغیر حساب کے جہنم کی آگ میں بھیج دیا جائے گا[1]

باقی رہا ان کا زیاں کار ہونا تو وہ اس بنا پر ہے کہ انھوں نے اپنا عظیم ترین سرمایہ یعنی عقل و خرد اور قیمتی عمر، دنیا کی تجارت کے اس عظیم بازار میں گنوا دی ہے اور حسرت و اندوہ کے سوا انھوں نے کوئی چیز نہ خریدی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بات ممکن ہے کہ خدا کے عظیم پیغمبر شرک کا راستہ اختیار کر لیں گے کہ آیت اس لہجے کے ساتھ ان سے بات کر رہی ہے ؟

اس سوال کا جواب واضح ہے اور وہ کہ انبیاء ہرگز شرک نہیں کریں گے اگرچہ وہ اس کام پر قدرت و اختیار رکھتے ہیں اور معصوم ہونے کا

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۷

یعنی سلب قدرت و اختیار نہیں ہے بلکہ ان کی سطح معرفت کا بلند ہونا اور مبدء وحی کے ساتھ دوامی اور مستقیم ارتباط، اس بات سے مانع ہے کہ وہ ایک لمحہ بھر کے لیے بھی شرک کا تصور کریں۔ کیا کوئی عقل مند اور حاذق طبیب، جو انتہائی خطرناک و مہلک اور زہریلے مادے کی تاثیر سے بخوبی آگاہ ہو، اس سے یہ بات ممکن ہے کہ وہ اپنی فکر و عقل کے اعتدال کی صورت میں خود کو اس سے آلودہ کرلے؟

مقصد یہ ہے کہ شرک کے خطرے کی اہمیت سب کے گوش گزار ہو جائے تاکہ لوگ جان لیں کہ جب خدا اپنے بزرگ پیغمبروں کے ساتھ اس طرح سے گفتگو کر رہا ہے تو دوسروں کا معاملہ تو واضح ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ عربوں کی اس مشہور ضرب المثل کی طرح ہے:

ایاك اعنی واسمعی یا جارة

مراد تو میری تو ہے اور اے پڑوسن تو بھی سنتی رہنا۔

یہی معنی ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے بھی منقول ہیں، جب کہ مامون نے آپ سے چند آیات کے بارے میں سوال کیا تو امامؑ نے فرمایا:

اس قسم کی آیات سے مراد امت ہے اگرچہ مخاطب رسولؐ خدا ہیں[1]

بعد والی آیت میں مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: بلکہ صرف خدا ہی کی عبادت کر اور شکر گزاروں میں سے ہو جا (بل الله فاعبد وکن من الشاکرین)[2]

لفظ "الله" کو "حصر" کے لیے مقدم رکھا گیا ہے، یعنی صرف اللہ کی ذات پاک ہی کو منحصر طور پر تیرا معبود ہونا چاہیے اور اس کے بعد شکر گزاری کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ ان نعمتوں کا شکر ادا کرنا جن میں انسان غرق ہے، اللہ کی معرفت اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے لیے ہمیشہ ایک سیڑھی کا کام دیتا ہے۔ نعمت کے جواب میں شکر کرنا ہر انسان کے لیے فطری امر ہے اور شکر گزاری کے لیے ہر چیز سے پہلے منعم کی ہستی کی معرفت لازم ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں شکر کا راستہ توحید کے راستے سے جا ملتا ہے اور وہ بت جو کسی نعمت کا مبدء نہیں ہیں الگ ہو جاتے ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں نفی شرک کے لیے ایک اور بات کی گئی ہے اور ان کے انحراف کی اصلی جڑ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "انھوں نے خدا کو اس کے شایان شان طریقے سے نہیں پہچانا" اور اسی بنا پر اس کے مقدس نام کو اتنا نیچے لے آئے ہیں کہ اسے بتوں کے ہم پلہ بنا دیا (وما قدروا الله حق قدره)۔

ہاں! شرک کا سرچشمہ خدا کے بارے میں صحیح معرفت نہ ہونا ہے، جو شخص یہ جانتا ہو کہ:

اولاً وہ ہر لحاظ سے بے پایاں اور غیر محدود وجود ہے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۹۷

[2] "فاعبد" میں "فا" ممکن ہے زائدہ ہو جو اس قسم کے موقعوں پر تاکید کے لیے آتی ہے بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ شرط محذوف کی جزا ہے اور تقدیر یوں اس طرح تھا "ان کنت عابداً فاعبد الله" پھر شرط حذف ہو گئی اور مفعول اس کی جگہ پر مقدم ہو گیا۔

ثانیاً تمام موجودات کی خلقت و پیدائش اسی کی طرف سے ہے، یہاں تک کہ اپنی بقا کے لیے بھی اسی کے فیض وجود کے محتاج ہیں۔

ثالثاً عالم ہستی کی تدبیر اور تمام مشکلات کا حل اور تمام ارزاق اسی کے دستِ قدرت میں ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کی شفاعت بھی ہوگی تو اسی کے اذن و فرمان سے ہوگی تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان اس کے علاوہ کسی اور کی طرف رُخ کرے۔

اصولاً ان صفات کے ساتھ کسی وجود کے لیے دوگانگی محال ہے، کیونکہ تمام جہات سے دو غیر محدود وجودوں کا ہونا محال ہے اور عقلاً ممکن نہیں ہے۔ (غور کیجیے گا)

اس کے بعد اس کی عظمت و قدرت کے بیان کے لیے دو عمدہ کنایوں سے استفادہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: قیامت کے دن تمام زمین اسی کے قبضے میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے (والارض جمیعًا قبضته یوم القیامة والسماوات مطویات بیمینه)

"قبضہ" اس چیز کے معنی میں ہے جو مٹھی میں لی جاتی ہے اور عام طور پر یہ کسی چیز پر قدرتِ مطلقہ اور تسلطِ کامل کے لیے کنایہ ہے جیسا کہ روزمرہ کے جملوں میں ہم کہتے ہیں کہ فلاں شہر میرے قبضہ میں ہے یا فلاں ملک میرے قبضہ اور مٹھی میں ہے۔

"مطویات" "طی" کے مادہ سے "لپیٹنے" کے معنی میں ہے جو کبھی عمر کے گزرنے یا کسی چیز سے عبور کرنے کے لیے کنایہ ہوتا ہے۔

سورۂ انبیاء کی آیہ ۱۰۴ میں آسمانوں کے بارے میں یہی تعبیر زیادہ واضح صورت میں بیان ہوئی ہے۔

یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب

اس دن ہم آسمانوں کو طوماروں کی طرح لپیٹ دیں گے۔

جو شخص طومار کو لپیٹ کر دائیں ہاتھ میں لیے ہوئے ہو وہ اس پر کامل ترین تسلط رکھتا ہے، خصوصاً "یمین" (دایاں ہاتھ) اس بنا پر کہا گیا ہے کیونکہ اکثر لوگ اہم کام دائیں ہاتھ سے ہی انجام دیتے ہیں اور اس میں زیادہ قوت کا احساس کرتے ہیں۔

مختصر بات یہ ہے کہ یہ سب تشبیہات اور تعبیرات دوسرے جہان میں عالم ہستی پر پروردگار کے مطلق تسلط کے لیے کنایہ ہیں، تاکہ سب لوگ جان لیں کہ عالم قیامت میں کلید نجات اور حل مشکلات خدا کے دستِ قدرت میں ہے تاکہ شفاعت وغیرہ کے بہانے سے بتوں اور دوسرے معبودوں کی طرف نہ جائیں۔

کیا اس دنیا میں زمین و آسمان اسی صورت میں اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر قرآن آخرت کی بات کیوں کر رہا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس دن خدا کی قدرت ہر زمانے کی نسبت زیادہ آشکار ہوگی اور اصلی ظہور کے مرحلے میں پہنچی ہوئی ہوگی اور سب کے سب واضح و آشکار طور پر جان لیں گے کہ ہر چیز اسی کی ہے اور اسی کے اختیار اور قبضے میں ہے۔

علاوہ ازیں ممکن ہے بعض لوگ نجات کے بہانے سے قیامت میں غیر خدا کے پاس چلے جائیں، جیسا کہ عیسائی مسیحؑ کی پرستش کے لیے نجات کا مسئلہ اٹھاتے ہیں۔ اس بنا پر مناسب یہی ہے کہ قیامت میں خدا کی قدرت کے بارے میں گفتگو کی جائے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ یہ ساری تعبیریں کنایہ کا پہلو رکھتی ہیں اور ہمارے الفاظ کی کوتاہ دامنی کی وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ روزمرہ کی زندگی میں ان بلند معانی کو انھیں معمولی الفاظ کے قالب میں ڈھالیں اور اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی شخص ان سے پروردگار کے تجسم کا احتمال سمجھے سوائے اس کے کہ جو بہت ہی سادہ لوح کوتاہ بین اور کوتاہ فکر ہو تو اس صورت میں کیا کیا جاسکتا ہے؟ وہ الفاظ جو پروردگار کی عظمت کا مقام بیان کرنے کی گنجائش رکھتے ہوں ہمارے پاس نہیں ہیں لہٰذا ہمیں انھیں الفاظ کے کنائی معانی سے استفادہ کرتے ہوئے۔ جو وسیع اور کشادہ دامن رکھتے ہیں۔ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

بہرحال ان بیانات کے بعد آیت کے آخر میں ایک مختصر اور واضح نتیجہ اخذ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: اس کی ذات ان کے شرک سے منزہ اور پاک ہے اور بلند و بالا ہے (سبحانہ و تعالیٰ عما یشرکون)۔

اگر انسان اپنے افکار کے چھوٹے سے پیمانوں کے ساتھ اس کی پاک ذات کے بارے میں فیصلہ نہ کرتا تو ہرگز شرک و بُت پرستی نہ کرتا۔

چند نکات

۱۔ <u>مسئلہ حبط اعمال</u>: کیا واقعاً یہ بات ممکن ہے کہ انسان کے نیک اور اچھے اعمال اس کے بُرے اعمال کی بنا پر حبط و نابود ہوجائیں؟ کیا یہ مسئلہ ایک طرف تو خدا کی عدالت کے اور ان آیات کے ظاہری مفہوم کے منافی نہیں ہے جو یہ کہتی ہیں کہ انسان اگر ذرہ برابر اچھا یا بُرا کام انجام دے تو اسے دیکھے گا

یہاں بحث کا دامن بہت وسیع ہے۔ دلائل عقلی کے لحاظ سے بھی اور دلائل نقلی کے لحاظ سے بھی۔ جس کا ایک حصّہ جلد دوم میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں پیش کرچکے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی دیگر متعلقہ آیات کے ذیل میں پیش کریں گے۔

وہ بات جس کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے اور جو زیر بحث آیات میں درپیش ہے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے گناہوں کے مقابلے میں "حبط اعمال" میں شک کرے تو کم از کم وہ شرک کی حبط اعمال میں تاثیر کے متعلق شک نہیں کرے گا، کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات جن میں سے بعض کی طرف ہم اوپر اشارہ کرچکے ہیں، میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ایمان کے ساتھ دنیا سے جانا اعمال کی قبولیت کی شرط ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی عمل قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

مشرک کا دل ایک شورہ زار کے مانند ہے کہ اگر تمام پھولوں کے بیج اس میں چھڑک دیے جائیں اور حیات بخش بارش اس کے اوپر برستی رہے تو اس میں ایک پھول بھی اگانے کی استعداد نہ ہوگی اور خس و خاشاک کے سوا اس سے کوئی بھی چیز نہ اُگے گی۔

۲۔ <u>کیا مومنوں نے خدا کو پہچان لیا ہے؟</u>: ان آیات میں بیان ہوا ہے کہ مشرکین نے خدا کو اس کے شایان شان طریقے سے نہیں پہچانا کیونکہ اگر وہ پہچان لیتے تو پھر شرک کی راہ پر نہ چلتے، اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ مومنین موحد نے اسے حقیقی طور پر پہچان لیا ہے۔

تو اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ بات پیغمبر اکرمؐ کی اس مشہور حدیث کے ساتھ کیسے ہم آہنگ ہے، جس میں آپؐ فرماتے ہیں:

ما عرفناك حق معرفتك، وما عبدناك حق عبادتك

ہم نے تجھے ایسا نہیں پہچانا جیسا کہ تیری معرفت کا حق ہے، اور ہم نے تیری ایسے عبادت نہیں کی جیسے کہ تیری عبادت کا حق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت کے کئی مرحلے اور درجے ہوتے ہیں ان میں سے ایک مرحلہ ایسا ہے جو معرفت سے بالاتر ہے اور وہ خدا کی ذات کی کنہ اور حقیقت کو معلوم کرنا ہے اور یہ بات کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے اور اس کی ذات پاک کے سوا کوئی بھی اس کی ذات پاک کی کنہ اور حقیقت سے باخبر نہیں ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کی مذکورہ مشہور حدیث اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن کچھ مراحل ایسے ہیں جو اس سے بہت نیچے ہیں جو انسانوں کی استعداد میں ہیں اور وہ اس کی صفات کی اجمالی شناخت اور اس کے افعال کی تفصیلی شناخت کا مرحلہ ہے اور یہ مرحلہ انسان کے لیے ممکن ہے اور اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا حکم اسی مرحلے سے متعلق ہے۔ زیر بحث آیت بھی اسی مرحلے کے بارے میں گفتگو کررہی ہے جس میں مشرکین عاجز رہ جاتے ہیں۔

۶۸۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ○

ترجمہ

۶۸۔ اور صور پھونکا جائے گا تو وہ سب کے سب مرجائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ سوائے ان کے جنھیں خدا چاہے گا، پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو وہ سب کے سب اچانک (زندہ ہوکر) اٹھ کھڑے ہوں گے اور (حساب وجزا کے) انتظار میں ہوں گے۔

تفسیر

صور پھونکا جانا اور سب کی موت وحیات

گزشتہ آیتوں میں قیامت کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیت میں اسی مسئلے کو بہت سی خصوصیات کے ساتھ بیان کیا جارہا ہے۔ پہلے دنیا کے اختتام کی بات کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اور صور پھونکا جائے گا تو وہ سب کے سب مرجائیں گے۔ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے ان کے جنھیں خدا چاہے گا (ونفخ فی الصور فصعق من فی السماوات ومن فی الارض الا من شاء اللہ)۔

پھر صور پھونکا جائے گا تو اچانک سب کے سب اٹھ کھڑے ہوں گے اور وہ اپنے حساب وجزا اور انجام کے انتظار میں ہوں گے (ثم نفخ فیہ اخریٰ فاذا ھم قیام ینظرون)۔

اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی انتہا اور قیامت کے آغاز میں دو حادثے ناگہانی اور اچانک رونما ہوں گے۔ پہلے حادثے میں سب زندہ موجودات فوراً مرجائیں گے اور دوسرے حادثے میں جو کچھ وقفے کے بعد صورت پذیر ہوگا، تمام انسان اچانک زندہ ہوکر کھڑے ہوجائیں گے اور حساب وکتاب کا انتظار کریں گے۔

قرآن مجید ان دونوں حادثوں کو "نفخ صور" سے تعبیر کرتا ہے جو ناگہانی اور اچانک حوادث کے بارے میں ایک خوبصورت اور زیبا کنایہ ہے۔ کیونکہ "نفخ" کا معنی ہے "پھونکنا" اور "صور" کا معنی ہے "بگل" یا اندر سے خالی سینگ جو عام طور پر قافلے یا لشکر کو چلانے یا ٹھہرانے کے لیے بجاتے ہیں۔ البتہ ان دونوں کی آوازوں میں آپس میں فرق ہوتا ہے۔ ٹھہرنے کا بگل قافلے کو ایک جگہ ٹھہرا دیتا ہے

اور چلنے کا بگل قافلے کے چلنے کی ابتداء کا اعلان کرتا ہے ۔

یہ تعبیر ضمنی طور پر حکم کی سہولت کو بھی بیان کر رہی ہے اور اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خداوند بزرگ و برتر ایک ہی فرمان سے جو ایک بگل میں پھونکنے کی طرح آسان ہے، اہلِ آسمان و زمین کو مار دے گا اور ایک ہی فرمان سے کہ وہ بھی کوچ کرنے اور چلنے کے بگل سے مشابہت رکھتا ہے، سب کو زندہ کر دے گا ۔

ہم بار ہا بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے الفاظ جو ہماری روزمرہ کی محدود زندگی کے لیے وضع ہوئے ہیں اس سے بہت زیادہ عاجز ہیں ۔ کہ ماوراء طبیعت جہاں یا اس جہان کے اختتام اور دوسرے جہان کے آغاز سے مربوط حقائق کو صحیح طور پر بیان کر سکیں ۔ اسی بنا پر ضروری ہے کہ معمولی اور عام الفاظ سے ہی ان وسیع و کشادہ معانی کے لیے استفادہ کیا جائے اور ان الفاظ کے معانی کے لیے ان میں موجود قرائن پر توجہ رکھنی چاہیے ۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ قرآن مجید میں اس جہان کے خاتمے اور دوسرے جہان کے حادثاتی آغاز کے متعلق مختلف تعبیریں آئی ہیں ۔

متعدد آیات میں (دس سے زیادہ مواقع پر) "نفخ صور" کا ذکر ہے[1]

ایک مقام پر " نقر فی الناقور" کہا گیا ہے اور وہ بھی بگل یا اسی قسم کی چیز میں پھونکنے کے معنی میں ہے ارشادِ الٰہی ہے :

فاذا نقر فی الناقور فذالك يومئذ يوم عسير

(مدثر ـــــــ ۸، ۹)

بعض مواقع پر " قارعة " کی تعبیر نظر آتی ہے جو سختی کے ساتھ کھٹکھٹانے کے معنی میں ہے ۔

(قارعہ ـــــــ ۱، ۲، ۳)

بعض دوسرے مقامات پر " صيحة " کی تعبیر آئی ہے جو ایک عظیم صدا کے معنی میں ہے ۔ جیسے سورۂ یٰس کی آیہ ۴۹ میں ہے :

ماينظرون الّا صيحة واحدة تأخذهم وهم يخصمون

یہ آیت دنیا کے اختتام کے صیحہ کی بات کرتی ہے جو لوگوں کو بے ہوش کر دے گی اور سورۂ یٰس کی آیہ ۵۳ میں ہے :

ان كانت الّا صيحة واحدة فاذا هم جميع لدينا محضرون

یہاں قیامت کے اس صیحہ کے بارے میں بات ہے جس کے بعد تمام لوگ زندہ ہو جائیں گے اور پروردگار کی عدالت میں حاضر ہوں گے ۔

---

[1] وہ مواقع جہاں قرآن میں " نفخ صور " کا لفظ آیا ہے ، حسب ذیل ہیں :

کہف ـــــ ۹۹ ، مؤمنون ـــــ ۱۰۱ ، یٰس ـــــ ۵۱ ، زمر ـــــ ۶۸ ، ق ـــــ ۲۰ ، الحاقہ ـــــ ۱۳ ، انعام ـــــ ۷۳ ، طٰہٰ ـــــ ۱۰۲ ، نمل ـــــ ۸۷ ، نبأ ـــــ ۱۸ ۔

ان آیات سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے آخر میں ایک عظیم صیحہ آسمانوں اور زمین پر تمام رہنے والوں کو مار دے گی اور اس کو "موت کی چیخ" کہتے ہیں۔

قیامت کے آغاز میں ایک عظیم صیحہ اور چیخ کے ساتھ سب کے سب زندہ ہو جائیں گے اور قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور یہ حیات کی صیحہ اور چیخ ہوگی۔

لیکن یہ دونوں آوازیں دقیقاً کس طرح کی ہوں گی؟ پہلی چیخ کا کیا اثر ہوگا اور دوسری چیخ میں کیا تاثیر ہے؟ یہ بات خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا لہٰذا بعض روایات میں صور کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے کہ جو اسرافیل پھونکے گا، مثلاً

و للصور رأس واحد و طرفان، و بين طرف رأس كل منهما الى الأخر مثل ما بين السماء الى الارض

اسرافیل کے بگل کا ایک سر اور دو شاخیں ہوں گی اور ان دونوں شاخوں کے درمیان آسمان اور زمین کے درمیان جتنا فاصلہ ہوگا۔

پھر اسی روایت کے ذیل میں ہے:

جس وقت وہ اس میں زمین کی طرف پھونکے گا تو زمین میں کوئی زندہ موجود باقی نہ رہے گا اور جس وقت وہ اس میں آسمان کی طرف والے حصے میں پھونکے گا تو سارے کے سارے آسمان والے مر جائیں گے پھر خدا اسرافیل کے لیے موت کا حکم دے گا اور کہے گا کر مر جا تو وہ بھی مر جائے گا۔[1]

بہرحال اکثر مفسرین نے "نفخ صور" کے معنی "بگل میں پھونکنے" کے ہی کیے ہیں۔ جس کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے بارے میں لطیف کنایہ ہے لیکن کچھ مفسرین نے "صور" کو "صورت" کی جمع سمجھا ہے اور اس بنا پر اس نفخ صور کو صورت میں پھونکنے کے معنی میں جانا ہے، جیسے روح کو بدن میں پھونکتے ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق ایک مرتبہ انسانی صورتوں میں پھونکا جائے گا تو سب کے سب مر جائیں گے اور ایک مرتبہ اور پھونکا جائے گا تو سب کے سب زندہ ہو جائیں گے۔[2]

یہ تفسیر علاوہ اس کے کہ متون روایات سے ہم آہنگ نہیں ہے خود آیت کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ "ثم نفخ فیه اخریٰ" میں ضمیر مفرد مذکر اس کی طرف لوٹتی ہے، حالانکہ اگر جمع کے معنی میں ہوتا تو پھر اس کی طرف مفرد مؤنث کی ضمیر لوٹتی اور "نفخ فيها" کہا جاتا۔

اس سے قطع نظر صورت میں پھونک مُردوں کو زندہ کرنے کے موقع پر تو مناسب ہے (جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے معجزات میں آیا ہے) لیکن یہ تعبیر قبض روح کے لیے استعمال نہیں ہوتی۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم، تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۰۲ کے مطابق

[2] توجہ کیجیے کہ "صور" بروزن "نور" و "صور" بروزن "زحل" دونوں "صورت" کی جمع ہیں۔

چند نکات

۱۔ صور کتنی مرتبہ پھونکا جائے گا؟ کیا نفخ صور دو مرتبہ ہوگا یا اس سے زیادہ؟ علماء اسلام کے درمیان مشہور دو ہی مرتبہ ہے۔ زیربحث آیت کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے۔ دوسری آیات قرآن بھی مجموعی طور پر دو "نفخوں" کی ہی خبر دیتی ہیں لیکن بعض نے اس کی تعداد تین نفخہ یا چار نفخہ تک بھی سمجھی ہے۔

اس طرح سے نفخۂ اولٰی کو نفخۂ "فزع" بھی کہتے ہیں۔

یہ تعبیر سورۂ نمل کی آیہ ۸۷ سے لی گئی ہے۔

و یوم ینفخ فی الصور ففزع من فی السماوات و من فی الارض

جس وقت صور پھونکا جائے گا اس وقت آسمانوں میں رہنے والے اور زمین میں بسنے والے سب دہشت زدہ ہو جائیں گے۔

وہ دوسرے اور تیسرے نفخہ کو "موت وحیات" کا نفخہ سمجھتے ہیں۔ جس کی طرف زیربحث آیات اور قرآن کی دوسری آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ ایک کو نفخۂ "صعق" کہتے ہیں۔ ("صعق" بے ہوش ہونے کے معنی میں آیا ہے اور مرنے کے معنی میں بھی) اور دوسرے کو نفخۂ "قیام" کہتے ہیں۔

جنہوں نے چوتھے نفخہ کا احتمال ذکر کیا ہے، ظاہراً انہوں نے سورۂ یٰس کی آیہ ۵۳ سے یہ مفہوم اخذ کیا ہے، جہاں نفخۂ حیات کے بعد کے بارے میں ہے۔

ان کانت الا صیحۃ واحدۃ فاذا ھم جمیع لدینا محضرون

صرف ایک چیخ ہوگی اور اس کے بعد وہ سب کے سب ہمارے پاس حاضر ہو جائیں گے۔

ان کے نزدیک یہ نفخہ "جمع وحضور" ہے۔

لیکن حق بات یہی ہے کہ دو نفخوں سے زیادہ نہیں ہوں گے اور فزع اور عمومی وحشت کا مسئلہ حقیقت میں سارے جہان والوں کے مرنے کے لیے ایک مقدمہ ہے جو پہلے نفخہ یا پہلے صیحہ سے حاصل ہوگا۔ جیسا کہ نفخۂ جمع اسی نفخۂ حیات کا انجام ہے۔ اس طرح سے دو سے زیادہ نفخہ نہیں ہوں گے۔ "نفخۂ موت" اور "نفخۂ حیات"۔

اس گفتگو کا دوسرا شاہد سورۂ نازعات کی آیہ ۶، ۷ ہیں جہاں قرآن کہتا ہے۔

یوم ترجف الراجفۃ تتبعھا الرادفۃ

جس دن ہولناک زلزلہ ہر جگہ کو لرزا کے رکھ دے گا تو اس کے بعد بھی وہ زلزلہ آجائے گا جو بندوں کو زندہ اور اکٹھا کر کے رکھ دے گا۔

۲۔ صورِ اسرافیل کیا ہے؟ اس کی صوتی امواج ساری دنیا کو کس طرح گھیر لیں گی؟ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ صوتی امواج

شدت رفتار ہوتی ہیں اور ایک سیکنڈ میں دو سو چالیس میٹر سے آگے نہیں جاتیں جبکہ روشنی کی رفتار اس سے ۱ لاکھ گنا سے بھی زیادہ ہے اور ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلو میٹر تک پہنچ جاتی ہے۔

ہمیں کہنا پڑے گا کہ ہم اس موضوع کے بارے میں قیامت کے بہت سے دوسرے مسائل کی طرح صرف اجمالی علم رکھتے ہیں، اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کی جزئیات ہمارے لیے واضح نہیں ہیں۔

اسلامی کتب میں صور کے بارے میں آنے والی روایات میں غور کرنے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ بعض کے خیالات کے برخلاف "صور" ایک معمولی قسم کا بگل نہیں ہوگا۔

ایک روایت میں امام علی بن حسینؑ سے منقول ہے:

ان الصور قرن عظیم له رأس واحد و طرفان، و بین الطرف الاسفل الذی یلی الارض الی الطرف الاعلی الذی یلی السماء مثل تخوم الارضین الی فوق السماء السابعة، فیه اثقاب بعدد ارواح الخلائق

"صور" ایک بہت بڑا سینگ ہے جس کا ایک سر اور دو اطراف ہیں، اور اس کی نچلی سمت جو زمین کی طرف ہے اور اوپر والی سمت جو آسمان کی طرف ہے کا درمیانی فاصلہ زمین کے نچلے حصے سے لے کر ساتویں آسمان کے اوپر تک ہے اور اس میں مخلوقات کی ارواح کی تعداد کے برابر سوراخ ہیں[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے:

الصور قرن من نور، فیه اثقاب علی عدد ارواح العباد

صور ایک نورانی سینگ ہے جس میں بندوں کی ارواح کی تعداد کے برابر سوراخ ہیں[2]

یہاں نور کا ذکر مذکورہ دوسرے سوال کا بھی جواب دیتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ یہ عظیم صیحہ ہماری عام صوتی امواج کی طرح کی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی چیخ ہے جو بہت برتر و بالاتر ہے اور نور کی امواج سے بھی بہت زیادہ سریع تر امواج رکھتی ہے جو زمین و آسمان کی وسعت کو تھوڑی سی دیر میں طے کرے گی پہلی مرتبہ کی چیخ موت آفرین ہوگی اور دوسری زندہ کرنے والی اور حیات بخش۔

یہ مسئلہ کہ ایک آواز اس طرح سے موت آفرین کیسے ہو سکتی ہے اگر گزشتہ زمانے میں کسی کے لیے باعث تعجب تھی تو اب ہمارے لیے اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کیونکہ ہم نے اکثر سنا ہے کہ بموں کے پھٹنے کی آوازیں کانوں کو بہرہ، جسم کو ریزہ ریزہ اور گھروں تک کو تباہ کر دیتی ہیں اور انسانوں کو ایک جگہ سے اٹھا کر دور دراز مقام پر پھینک دیتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ہوائی جہاز کی تیز رفتاری۔ دیوار صوتی کو توڑنے کے لیے ایسی ایسی وحشت ناک آواز اور تباہ کن لہریں پیدا کرتی ہے کہ عمارتوں کے شیشوں کو ایک وسیع شعاع تک ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

---

[1] لئالی الاخبار، ص ۴۵۲

[2] علم الیقین ص ۸۹۲

جب امواجِ صوتی کے ایسے چھوٹے چھوٹے نمونے جو انسانوں نے ایجاد کیے ہیں اپنا ایسا اثر دکھاتے ہیں تو وہ عظیم صیحہ جو خدا کی طرف سے ہوگی یعنی وہ عظیم عالمی دھماکہ کیا اثرات مرتب کرے گا؟

لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس کے مدمقابل کچھ موجیں ایسی بھی ہوں جو ہلا دینے والی، بیدار کرنے والی اور زندہ کرنے والی ہوں اگرچہ اس کا تصور آج ہمارے لیے ممکن نہیں ہے لیکن سوئے ہوئے افراد کو بلند آواز کے ساتھ بیدار کرنا یا شدید جھٹکوں کے ساتھ بیہوش افراد کو ہوش میں لانا، کم از کم ہم نے ضرور دیکھا ہے ہم دوبارہ عرض کرتے ہیں کہ ہم اپنے محدود علم کی بنا پر صرف دور سے ان امور کا بہت ہلکا سا نقش ہی دیکھ سکتے ہیں۔

۲۔ کون سے افراد مستثنیٰ ہیں؟ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ زیر بحث آیت میں قرآن کہتا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں رہنے والے سب کے سب مر جائیں گے، پھر ایک گروہ کا استثناء کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

الا من شاء اللہ

سوائے ان لوگوں کے جنھیں خدا چاہے گا۔

اس بارے میں کہ یہ لوگ کون ہیں؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے

ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا کے کچھ عظیم فرشتے مثلاً جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل ہیں۔

ایک اور روایت میں بھی اس مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے[1]

بعض نے حاملین عرشِ خدا کا بھی اس پر اضافہ کیا ہے (جیسا کہ ایک دوسری روایت میں آیا ہے)[2]

بعض دوسروں نے ارواحِ شہداء کو مستثنیٰ جانا ہے جو آیات قرآنی کے حکم کے مطابق "احیاء عند ربھم یرزقون" زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس سے رزق پاتے ہیں۔

ایک روایت میں اس مطلب کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے[3]

البتہ یہ روایات آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتیں، لیکن بہرحال ان ہی روایات میں سے بعض سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ باقی رہ جانیوالا گروہ بھی آخرکار مر جائے گا۔ اس طرح سے خدائے حی لا یموت "کے سوا سر تا سر عالمِ ہستی میں کوئی زندہ موجود باقی نہ رہے گا۔

اس بارے میں کہ فرشتوں یا ارواح شہداء، انبیاء اور اولیاء کے لیے موت کیسے ہوگی؟ تو اس کے لیے احتمال یہی ہے کہ ان کے بارے میں موت سے مراد، روح کے رشتے کا قالب مثالی سے ٹوٹ جانا یا ارواح کا مسلسل فعالیت سے معطل ہو جانا ہے۔

۴۔ کیا دونوں نفخہ ناگہانی ہوں گے؟ قرآن مجید کی آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نفخہ ناگہانی صورت میں

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں

[2] بحار الانوار، جلد ۶ ص ۳۲۹

[3] نور الثقلین جلد ۴، ص ۵۰۲ (حدیث ۱۱۴)

وقوع پذیر ہوں گے لیکن پہلا نفخہ ایسی غفلت کی حالت میں ہوگا کہ بہت سے لوگ کسب وکار اور اموال پر جھگڑے اور خرید وفروخت میں مشغول ہوں گے اور سب کے سب وہیں کے وہیں مر جائیں گے جیسا کہ سورۂ یٰس کی آیہ ۲۹ میں ہے :

ان کانت الا صیحة واحدة فاذا هم خامدون

وہ بس ایک ہی چیخ ہوگی جس سے وہ وہیں کے وہیں بجھ کر رہ جائیں گے۔

دوسرے صیحہ کے بارے میں زیر بحث آیت میں بھی ہے ۔

فاذا هم قیام ینظرون

اچانک وہ کھڑے ہو جائیں گے اور حساب وجزا کا انتظار کریں گے ۔

یہ اور دیگر تعبیرات نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ بھی ناگہانی طور پر ہی واقع ہوگی ۔

۵۔ دونوں نفخوں کے درمیان فاصلہ : قرآن مجید کی آیات سے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا صرف " ثم " کی تعبیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فاصلہ ہوگا ، البتہ بعض اسلامی روایات میں یہ فاصلہ چالیس سال ذکر ہوا ہے [1] جن کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہے کہ ان سالوں کا پیمانہ کیا ہوگا ، کیا یہ عام سالوں کی طرح ہوں گے یا قیامت کے سالوں اور ایام جیسے؟ یہ امر واضح نہیں ۔

بہرحال نفخۂ صور اور اس جہان کے اختتام ، اسی طرح نفخۂ ثانی اور دوسرے جہان کے آغاز میں غور وفکر ، ان اشارات کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو قرآن مجید میں آئے ہیں اور مزید تفصیل جو روایات اسلامی میں دکھائی دیتی ہے ، انسانوں کو گہرا تربیتی درس دیتی ہے ۔ خاص طور پر اس سے یہ حقیقت واضح اور روشن ہوتی ہے کہ ہر لمحہ اور ہر حالت میں اس قسم کے عظیم اور ہولناک حادثے کے استقبال کے لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ اس کے لیے کوئی معین تاریخ بیان نہیں ہوئی اور اس کے وقوع کا ہر زمانے میں احتمال ہے ۔ علاوہ ازیں وہ بغیر کسی مقدمے اور تمہید کے شروع ہوگا اسی لیے نفخ صور سے مربوط مذکورہ احادیث میں سے ایک کے ذیل میں ، راوی کہتا ہے کہ جب گفتگو یہاں تک پہنچی کہ ـــــــ

رأیت علی بن الحسین یبکی عند ذالك بکاء شدیداً

امام سجاد علیہ السلام کو میں نے دیکھا کہ آپ شدت کے ساتھ گریہ فرما رہے ہیں اور اس جہان کے خاتمے ، قیامت اور بارگاہِ خداوندی میں لوگوں کے حساب وکتاب کے لیے حاضر ہونے کے بارے میں آپ سخت پریشان ہیں [2]

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۰۲ حدیث ۱۱۹

[2] تفسیر صافی ، زیر بحث آیت کے ذیل میں

۶۹۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○

۷۰۔ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ○

ترجمہ

۶۹۔ اور (اس دن) زمین اپنے پروردگار کے نور سے روشن ہوجائے گی اور اعمال نامے سامنے رکھ دیئے جائیں گے اور پیغمبروں اور گواہوں کو حاضر کیا جائے گا اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ ہوگا اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

۷۰۔ اور ہر شخص کو جو کچھ اس نے انجام دیا ہے، بے کم و کاست (پورا پورا) دیا جائے گا اور جو عمل وہ انجام دیا کرتے تھے اس کے بارے میں وہ سب سے زیادہ آگاہ ہے۔

تفسیر

جب زمین پروردگار کے نور سے روشن ہوجائے گی

ان آیات میں قیامت سے مربوط وہ گفتگو جو گزشتہ آیات میں شروع ہوئی تھی، اسی طرح جاری ہے۔

ان دونوں آیات میں سات جملے ہیں، جن میں سے ہر ایک معاد کے سلسلہ میں ایک مطلب کو بیان کرتا ہے اس طرح سے کہ ہر ایک دوسرے مطلب کی تکمیل کرتا ہے یا اس کی دلیل بیان کرتا ہے اور ان میں ایک خاص نظم پایا جاتا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اس دن زمین اپنے پروردگار کے نور سے روشن ہوجائے گی (واشرقت الارض بنور ربها)۔

اس "اشراق" اور نور الٰہی کی روشنی سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل تین تفسیریں زیادہ اہم ہیں۔

۱۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ "نور رب" سے مراد حق و عدالت ہے کہ خدا اس دن صفحۂ زمین کو اس کے ساتھ منور کردے گا۔

مرحوم مجلسی بحار الانوار میں کہتے ہیں :

ای اضائت الارض بعدل ربہا یوم القیامۃ لان نور الارض بالعدل

یعنی قیامت کے دن زمین عدلِ پروردگار سے روشن ہو جائے گی کیونکہ زمین کا نور عدالت کی ہی وجہ سے ہے[1]

بعض دوسروں نے اس مشہور حدیث نبوی کو اس معنی کا شاہد قرار دیا ہے :

الظلم ظلمات یوم القیامۃ

ظلم قیامت کے دن تاریکی اور ظلمت کی صورت میں مجسم ہو جائے گا[2]

زمخشری نے بھی کشاف میں اسی معنی کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے :

اس دن زمین عدل قائم ہونے اور حساب وکتاب میں انصاف کی وسعت اور حسنات وسیئات کا صلہ ملنے سے روشن ہو جائے گی ۔

۲ ۔ بعض دوسروں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسے نور کی طرف اشارہ ہے جو سورج اور چاند کے نور کے علاوہ ہوگا ، جسے خدا خصوصیت کے ساتھ اس دن پیدا کرے گا ۔

۳ ۔ مفسرِ عالی قدر مؤلف المیزان کہتے ہیں :

زمین کے نور پروردگار سے روشن ہونے سے مراد جو روزِ قیامت کی خصوصیات میں سے ہے ، وہی کشف غطاء ، پردوں اور حجابوں کا ہٹ جانا ، حقائق اشیاء خیر و شر ، اطاعت و عصیاں اور حق و باطل میں سے انسانوں کے اعمال کا ظاہر ہو جانا ہے ۔

اس کے بعد اس معنی پر سورۂ ق کی آیہ ۲۲ سے استدلال کرتے ہیں ۔

لقد کنت فی غفلۃ من ھٰذا فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید

تو اس بارے میں غفلت میں تھا ۔ ہم نے تیری آنکھ کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا اور آج تیری آنکھ اچھی طرح سے دیکھ لے گی ۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ اشراق اس دن ہر چیز کے بارے میں ہوگا لیکن ان سب میں سے خصوصیت کے ساتھ زمین ہی کا ذکر اس بنا پر ہے کہ اصلی ہدف و مقصد اس دن روئے زمین کے لوگوں کی حالت بیان کرنا ہے ۔

البتہ یہ تفسیریں آپس میں تضاد نہیں رکھتیں اور قابلِ جمع ہیں اگرچہ پہلی اور تیسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ یہ آیت قیامت کے ساتھ مربوط ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض روایات اہلِ بیتؑ میں حضرت مہدیؑ کے

---

[1] بحار الانوار ، جلد ۷ ص ۳۲۱

[2] روح المعانی و روح البیان ، زیر بحث آیات کے ذیل میں

قیام سے اس کی تفسیر ہوئی ہے تو یہ حقیقت میں ایک قسم کی تطبیق و تشبیہ ہے اور اس معنی پر تاکید ہے کہ حضرت مہدیؑ کے وقت دنیا صحن قیامت کا ایک نمونہ ہو جائے گی اور اس امام برحق اور جانشین پیغمبرؐ اور نمایندۂ پروردگار کے ذریعے روئے زمین میں عدل و داد اس حد تک حکم فرما ہو جائے گا کہ جسے زمین کی طبیعت و مزاج قبول کرلے ۔

مفضل بن عمر امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں :

اذا قام قائمنا اشرقت الارض بنور ربها واستغنی العباد عن ضوء الشمس و ذهبت الظلمة

جس وقت ہمارے قائم قیام کریں گے تو زمین اپنے پروردگار کے نور سے روشن ہو جائے گی اور بندوں کو سورج کی روشنی کی ضرورت نہ رہے گی اور ظلمت برطرف ہو جائے گی۔[1]

اس آیت کے دوسرے جملے میں نامۂ اعمال کے بارے میں گفتگو ہے ، قرآن کہتا ہے : اس دن اعمال نامے آگے رکھ دیئے جائیں گے اور وہ انھیں دیکھیں گے (ووضع الکتاب) ۔

وہ اعمال نامے جن میں انسان کے تمام چھوٹے بڑے عمل جمع ہوں گے اور قرآن میں سورہ کہف کی آیہ ۴۹ کے بیان کے مطابق ۔

لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاها

کوئی چھوٹی یا بڑی معصیت ایسی نہ ہوگی جو اس میں شمار نہ کی گئی ہو ۔

اور بعد والے جملے میں گواہوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے اور قرآن مزید کہتا ہے : اس دن پیغمبروں اور گواہوں کو حاضر کریں گے (وجایٔ بالنبیین والشهداء) ۔

پیغمبروں کو اس لیے حاضر کیا جائے گا تاکہ وہ مجرمین کو اپنے فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے بارے میں بتائیں ۔ جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیہ ۶ میں بیان ہوا ہے :

ولنسئلن المرسلین

ہم رسولوں سے قطعی طور پر سوال کریں گے ۔

اور " گواہوں " کو اس بنا پر حاضر کیا جائے گا کہ وہ عدالت میں گواہی دیں ۔ یہ ٹھیک ہے کہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے ، لیکن مراتب عدالت کی تاکید کے لیے گواہوں کی حاضری ضروری ہے ۔

یہ گواہ کون لوگ ہیں ؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بحث ہے ۔

بعض نے انھیں اُمت کے نیک ، پاک اور عادل افراد سمجھا ہے جو انبیاء کے فریضۂ رسالت کی ادائیگی کی بھی گواہی دیں گے اور ان لوگوں کے اعمال کی بھی جو ان کے زمانے میں زندگی بسر کرتے تھے جن میں سے افضل و اشرف ائمہ معصومینؑ ہیں ۔

---

[1] ارشاد مفید (تفسیر صافی اور نور الثقلین کے مطابق زیر بحث آیات کے ذیل میں) ۔ یہی معنی مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار جلد ۵۲ ص ۳۳۰ پر تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے ۔

بعض دوسروں نے انھیں فرشتوں سے تفسیر کیا ہے کہ وہ انسانوں کے اعمال پر گواہ ہیں۔ انھوں نے سورۂ ق کی آیہ ۲۱ کو اس معنی کا گواہ بنایا ہے، جس میں یہ بیان کیا گیا ہے۔

وجاءت کل نفس معها سائق و شهيد

ہر شخص صحن محشر میں اس حالت میں وارد ہوگا کہ اس کے ساتھ ایک تو عدالت الٰہی کی طرف ہانک کر بجانے والا ہوگا اور دوسرا گواہ ہوگا۔

بعض نے ان سے مراد اعضاء بدن اور اطاعت و معصیت کے مکان و زمان لیے ہیں کہ جو قیامت کے دن کے گواہوں میں سے ہوں گے۔

لیکن ظاہر تر یہ ہے کہ "شہداء" (گواہ) ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور مفسرین میں سے ہر ایک نے اس کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے خصوصیت کے ساتھ "شہیدان راہ خدا" مراد ہیں لیکن یہ بعید نظر آتا ہے کیونکہ گفتگو عدالت الٰہی کے گواہوں کے بارے میں ہو رہی ہے نہ کہ راہ حق کے شہیدوں کے بارے ہیں۔ اگرچہ ممکن ہے کہ وہ بھی شہود (گواہوں) کی صف میں ہوں۔

چوتھا جملہ کہتا ہے: ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ ہوگا (وقضی بينهم بالحق)۔

پانچویں جملہ میں مزید فرمایا گیا ہے: اور ان پر ظلم نہیں ہوگا (وهم لا يظلمون)۔

یہ بات ظاہر و واضح ہے کہ جس وقت حاکم خدا ہو اور زمین اس کی عدالت کے نور سے روشن ہو جائے اور نامۂ اعمال جو صحیح طور پہ بالتفصیل انسان کے اعمال بیان کر رہا ہو پیش کر دیا گیا ہو اور پیغمبر اور سارے گواہان عدالت حاضر ہوں تو حق کے علاوہ اور کوئی فیصلہ نہیں ہوگا اور اس قسم کی عدالت میں ظلم و بیدادگری کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔

چھٹا جملہ بعد والی آیت میں اس بات کی تکمیل کرتا ہے اور کہتا ہے: ہر شخص کو جو عمل اس نے انجام دیا ہے، بے کم و کاست پورا پورا دیا جائے گا (ووفيت كل نفس ما عملت)۔

ان کے اعمال کا بدلہ، صلہ، جزا اور پاداش نہیں بلکہ خود ان کے اعمال ہی ان کے حوالے کر دیئے جائیں گے اور کون سی جزا یا سزا اس سے بڑھ کر ہو سکتی ہے کہ انسان کا عمل کامل طور سے اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس بات کی طرف توجہ رکھیے کہ "وفیت" (کامل طور سے ادا کرنے کے معنی میں ہے) اور اس کا وہ عمل ہمیشہ کے لیے اس کا ہم نشین اور ساتھی بن جائے گا۔

کون ہے جو عدالت کے اس نظام کو دقیقاً اجرا کر سکتا ہو؟ وہی ذات کہ جس کا علم ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے لہٰذا ساتویں اور آخری جملہ میں فرمایا گیا ہے: اور جو عمل وہ انجام دیا کرتے تھے وہ اس کے بارے میں سب سے زیادہ آگاہ ہے (وهو اعلم بما يفعلون)۔

یہاں تک کہ شہود اور گواہوں کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ تمام شہود اور گواہوں سے زیادہ علم رکھتا ہے لیکن اس کے لطف و عدالت کا تقاضا یہی ہے کہ گواہوں کو حاضر کرے، ہاں! ایسا ہے قیامت کا میدان، جس کے لیے سب کو آمادہ و تیار رہنا چاہیے۔

۷۱۔ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ ھٰذَا ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ○

۷۲۔ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ○

ترجمہ

۷۱۔ اور وہ لوگ جو کافر ہو گئے گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔ جس وقت وہ جہنم کے پاس آئیں گے تو اس کے دروازے کھل جائیں گے اور دوزخ کے نگہبان ان سے کہیں گے: کیا تھی میں سے تمھارے پاس رسول نہیں آئے تھے کہ وہ تمھارے رب کی آیتیں تم پر پڑھتے اور اس دن کی ملاقات سے تمھیں ڈراتے۔ وہ کہیں گے: ہاں (پیغمبر بھی آئے تھے اور انھوں نے آیاتِ الٰہی بھی ہمارے سامنے پڑھی تھیں) لیکن عذابِ الٰہی کا فرمان کافروں کے لیے مسلّم ہو چکا ہے۔

۷۲۔ ان سے کہا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ کے لیے اس میں رہو، متکبروں کا ٹھکانا کتنی بُری جگہ ہے؟ (تمام کوتاہیاں خود تمھاری ہی طرف سے تھیں)۔

تفسیر

گروہ در گروہ جہنم میں داخل ہوں گے

ان آیات میں بھی اسی طرح سے معاد کی بحث جاری ہے، گزشتہ آیات میں مومنین اور کفار کی جزا اور سزا کے سلسلہ میں جو کچھ اجمالی صورت میں بیان ہوا تھا وہ اب تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔ دوزخیوں کے بارے میں بات شروع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو کافر ہو گئے تھے گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے (وسیق الذین کفروا الی جھنم زمرًا)۔

انھیں کون ہانک کرلے جائے گا؟ عذاب کے فرشتے! جو انھیں جہنم کے دروازوں تک لے جانے پر مامور ہوں گے۔ اسی تعبیر کی مشابہ سورۂ ق کی آیہ ۲۱ میں بھی بیان ہوا ہے۔

وجاءت کل نفس معها سائق و شهيد

ہر انسان میدانِ قیامت میں اس حال میں آئے گا کہ اس کے ساتھ ایک تو ہانکنے والا ہوگا اور ایک گواہی دینے والا ہوگا۔

" زمر " کی تعبیر چھوٹے گروہ کے معنی میں ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے اور علیحدہ علیحدہ گروہوں کی صورت میں جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔

" سیق " " سوق " کے مادہ سے چلانے کے معنی میں ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ کام لگاتار جاری رہے گا یہاں تک کہ وہ دوزخ تک پہنچ جائیں گے۔ اس موقع پر دوزخ کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور دوزخ کے نگہبان ملامت کے طور پر انھیں کہیں گے کہ کیا تمھی میں سے تمھارے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمھارے پروردگار کی آیات تمھارے لیے پڑھیں اور اس دن کی ملاقات سے تمھیں ڈرائیں (حتّٰی اذا جاءو ھا فتحت ابوابها وقال لهم خزنتها الم یأتکم رسل منکم یتلون علیکم اٰیات ربکم و ینذرونکم لقاء یومکم هٰذا)[1]

اس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے دروازے ان کے ورود سے پہلے بند ہوں گے بالکل زندانوں کے دروازوں کی طرح، جب وہ ان کے قریب جائیں گے تو وہ اچانک ان کے سامنے کھل جائیں گے اور یہ ناگہانی مشاہدہ انھیں اور بھی زیادہ وحشت زدہ کر دے گا، لیکن سب سے پہلے انھیں جہنم کے خازنوں کی ملامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہدایت کے تمام اسباب تمھارے لیے فراہم تھے۔

ایسے پیغمبر جو خود تمھاری اپنی ہی نوع میں سے تھے، تمھارے پروردگار کی آیات لے کر مسلسل اور پے در پے خطرات کا اعلان کرتے اور ڈراتے ہوئے اور یکے بعد دیگرے لگاتار آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہوئے تمھارے پاس آتے رہے تھے[2]

اس کے باوجود یہ بدبختی تمھیں کس طرح دامن گیر ہوگئی اور واقعاً جہنم کے خازنوں کی یہ گفتگو ان کے لیے دردناک ترین عذابوں میں سے ہوگی جس کا جہنم میں ورود کے وقت انھیں سامنا کرنا پڑے گا (جب کہ اہلِ بہشت کو خوش آمدید کہا جائے گا)۔

بہرحال وہ انھیں ایک مختصر اور دردآمیز جملے کے ساتھ جواب دیتے ہوئے "کہیں گے، ہاں! خدا کے پیغمبر بھی آئے تھے اور آیاتِ الٰہی بھی ہمارے سامنے پڑھی گئی تھیں اور انھوں نے کافی انذار کیا لیکن کافروں کے لیے عذابِ الٰہی کا فرمان مسلّم ہوگیا" اور اس کا عذاب ہمیں

---

[1] " خزنة " جمع ہے " خازن " کی " خزن " (بروزن " جزم ") کے مادہ سے کسی چیز کی حفاظت کرنے کے معنی میں ہے اور " خازن " محافظ و نگہبان کو کہا جاتا ہے۔

[2] " یتلون " ، " ینذرون " فعل مضارع ہے اور استمرار کی دلیل ہے۔

دامن گیر ہوگیا (قالوا بلیٰ ولکن حقت کلمت العذاب علی الکافرین)۔

بعض بزرگ مفسرین "کلمة العذاب" کو اس گفتگو کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو آدم کے زمین پر ہبوط یا شیطان کی طرف سے بنی آدم کو گمراہ کرنے کا ارادہ ظاہر کرنے کے وقت پروردگار نے کی تھی۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۳۹ میں ہے کہ جس وقت آدم نے زمین پر ہبوط کیا تو خدا نے فرمایا:

والذین کفروا وکذبوا بآیاتنا اولئك اصحاب النار هم فیها خالدون

جو لوگ کافر ہوگئے اور انھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی وہ جہنمی ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی میں رہیں گے۔

اور جس وقت شیطان نے یہ عرض کیا کہ میں مخلصین کے سوا ان سب کو گمراہ کردوں گا، تو خدا نے فرمایا:

لأملئن جهنم من الجنة والناس اجمعین

میں مسلماً دوزخ کو گنہ گار جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا۔ (الم سجدہ ـــــ ۱۳)

اس طرح سے وہ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ انھوں نے تکذیبِ انبیاء اور آیاتِ الٰہی کے انکار کی راہ اختیار کر لی تھی اور طبعی طور پر ان کی اس سے بہتر سرنوشت نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "حقت کلمة العذاب" سے مراد وہی کچھ ہو جو سورۂ یٰس کی آیہ ۷ میں بیان ہوا ہے۔

لقد حق القول علی اکثرهم فهم لا یؤمنون

ان میں سے اکثر کے بارے میں فرمانِ عذاب پورا ہوگیا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات انسان کا کام بہت زیادہ گناہوں، دشمنی، ہٹ دھرمی اور حق کے مقابلے میں تعصب کرنے کی وجہ سے یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کے دل پر مُہر لگا دی جاتی ہے اور اس کے لیے بازگشت کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی تو اس حالت میں عذاب الٰہی کا فرمان اس کے بارے میں قطعی ہو جاتا ہے۔

لیکن بہر حال ان سب چیزوں کا سرچشمہ انسان کے خود اپنے اعمال ہیں اور اس بات کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی شخص اس جملے سے جبر اور انسان کے ارادے کی آزادی نہ ہونے کا وہم کرے۔

یہ مختصر سی گفتگو جہنم کے دروازے پر ختم ہو جائے گی اور "ان سے کہا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں سے داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ کے لیے اس میں رہو، متکبروں کے رہنے کا ٹھکانا کتنی بری جگہ ہے" (قیل ادخلوا ابواب جهنم خالدین فیها فبئس مثوی المتکبرین)۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ ممکن ہے جہنم کے دروازے ایسے دروازوں کے معنی میں ہوں جو انسانوں کے اعمال کے مطابق بنتے ہیں اور ہر گروہ کو اس کے عمل کی مناسبت سے جہنم میں لے جائیں گے۔ جیسا کہ بہشت کے دروازے بھی اسی طرح کے ہیں، لہٰذا اس کے

دروازوں میں سے ایک دروازے کا نام "باب المجاهدین" ہے اور امیرالمومنین علی علیہ السلام کے کلام میں بھی آیا ہے۔

ان الجهاد باب من ابواب الجنة

جہاد بہشت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ فرشتے انسان کے تمام اوصافِ رذیلہ میں سے جو اسے دوزخ کی طرف لے جاتے ہیں۔ "تکبر" کا ذکر کریں گے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کفرو انحراف اور گناہ کا اصلی اور بڑا سرچشمہ زیادہ کبر و غرور اور حق کے سامنے عدم تسلیم ہی ہے۔

ہاں! یہ کبر ہی ہے جو انسان کی آنکھ پر ضخیم پردے ڈال دیتا ہے اور اس کو تابناک چہرے دیکھنے سے محروم کر دیتا ہے، اسی بنا پر ایک روایت میں امام صادقؑ اور امام باقرؑ سے منقول ہوا ہے۔

لا يدخل الجنة من فى قلبه مثقال ذرة من كبر

جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔[2]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۷

[2] کافی، جلد ۲ باب الکبر حدیث ۶

۷۳۔ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ○

۷۴۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۖ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ○

۷۵۔ وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○

ترجمہ

۷۳۔ اور وہ لوگ جنھوں نے تقوائے الٰہی اختیار کیا وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے، جب وہ اس کے قریب پہنچیں گے تو جنت کے دروازے کھل جائیں گے اور اس کے نگہبان کہیں گے تم پر سلام ہو، یہ نعمتیں تمھیں بھلی ہوں، تم جنت میں داخل ہوجاؤ اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہو۔

۷۴۔ وہ کہیں گے: حمد وستائش اس خدا کے لیے مخصوص ہے جس نے ہمارے ساتھ اپنے وعدہ کی وفا کی اور بہشت کی زمین ہماری میراث قرار دے دی کہ ہم جس جگہ چاہیں اپنی منزل بنالیں۔ عمل کرنے والوں کی جزا کتنی اچھی ہے۔

۷۵۔ (اس دن) تو فرشتوں کو دیکھے گا کہ وہ عرشِ خدا کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں (اور اس کی حمد وثنا کر رہے ہیں) اور بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ ہوگا اور (آخرکار) کہا جائے گا: حمد عالمین کے پروردگار کے لیے مخصوص ہے۔

تفسیر

گروہ در گروہ جنت میں وُرود

یہ آیات جو سورۂ زمر کی آخری آیات ہیں، اسی طرح سے معاد سے مربُوط مباحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور چونکہ گزشتہ آیات میں تمام کافروں کے جہنم کے ورود کی کیفیت کے بارے میں گفتگو تھی، لہٰذا یہاں پرہیزگار مومنین کے جنت میں ورود کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے تاکہ تقابل سے مسائل زیادہ واضح اور آشکار ہو جائیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جنھوں نے تقوائے الٰہی اختیار کیا، انھیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا (و سیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا)۔

"سیق" ("سوق" کے مادہ سے "شوق" کے وزن پر ہے اور ہانکنے کے معنی میں ہے) کی تعبیر یہاں سوال انگیز ہے اور بہت سے مفسرین کی توجہ کو اپنی طرف جذب کیا ہے۔ کیونکہ یہ تعبیر ان مواقع پر استعمال ہوتی ہے جب کوئی کام بغیر شوق اور داخلی جذبے سے انجام پائے۔ یہ تعبیر دوزخیوں کے بارے میں تو صحیح ہے لیکن جنتیوں کے بارے میں کیوں ہے؟ جو پورے شوق کے ساتھ جنت کی طرف جائیں گے۔

بعض نے اس تعبیر سے یہ سمجھا ہے کہ بہت سے جنتی اپنے دوستوں کے انتظار میں ہوں گے۔

بعض اسے اس بنا پر جانتے ہیں کہ شوقِ لقائے پروردگار نے پرہیزگاروں کو اس طرح اپنی طرف جذب کر رکھا ہوگا کہ وہ اس کے غیر کی طرف یہاں تک کہ جنت کی طرف بھی توجہ نہ کریں گے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ان کی سواریاں انھیں تیزی کے ساتھ جنت کی طرف ہانک لے جائیں گی۔

باوجودیکہ یہ سب تفسیریں اچھی ہیں اور آپس میں کوئی تضاد بھی نہیں رکھتیں تاہم ایک نکتہ اور بھی یہاں پر موجود ہے جو ممکن ہے اس تعبیر کا اصلی راز ہو اور وہ یہ ہے کہ جس قدر پرہیزگار بہشت کے عاشق ہیں، بہشت اور رحمت کے فرشتے ان کے بہشت میں آنے کے ان سے بھی زیادہ عاشق ہیں۔ جیسا کہ بعض اوقات میزبان اپنے مہمان کے دیدار کا اتنا شائق ہوتا ہے کہ وہ جس رفتار سے خود آ رہا ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اپنی طرف لے جاتا ہے۔ رحمت کے فرشتے بھی انھیں اسی طرح جنت کی طرف لے جائیں گے۔

بہرحال یہاں بھی لفظ "زمر" جو چھوٹے سے گروہ کے معنی میں ہے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بہشتی بھی مختلف گروہوں کی شکل میں جنت کی طرف جائیں گے اور اس سے ان کے روحانی مقامات و مراتب کی نشاندہی ہوتی ہے۔

یہاں تک کہ وہ جنت میں پہنچ جائیں گے، اس حال میں کہ اس کے دروازے ان کے لیے پہلے سے کھلے ہوئے ہوں گے اور اس وقت جنت کے خازن اور نگہبان، رحمت کے فرشتے ان سے کہیں گے: تم پر سلام ہو، یہ نعمتیں تمھیں بھلی ہوں، جنت میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہو (حتّٰی اذا جاء وھا و فتحت ابوابھا و قال لھم خزنتھا سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین)۔[1]

حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں!

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ دوزخیوں کے بارے میں تو قرآن یہ کہتا ہے کہ جس وقت وہ دوزخ کے قریب پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھل جائیں گے لیکن بہشتیوں کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کے دروازے پہلے سے کھلے ہوئے ہوں گے اور یہ ایک خاص احترام و اکرام کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بات بالکل اس عشق و محبت رکھنے والے میزبان کی کیفیت کے مانند ہے جو اپنے گھر کے دروازے مہمان کے آنے سے پہلے ہی کھول دیتا ہے اور دروازے کے پاس اس کے انتظار میں کھڑا رہتا ہے، رحمتِ الٰہی کے فرشتے کی بھی یہی حالت ہوگی۔

گزشتہ آیات میں دوزخیوں کے بارے میں تو یہ بیان ہوا تھا کہ عذاب کے فرشتوں کی ان سے پہلی گفتگو سخت ملامت و سرزنش ہوگی۔ کہ وہ اسبابِ ہدایت رکھنے کے باوجود انھیں یہ روزِ بد کیوں دیکھنا پڑا ہے؟

لیکن بہشتیوں کے لیے پہلی گفتگو "سلام و درود اور احترام و اکرام ہے" اور پھر بہشت جاوداں کی طرف ورود کی دعوت ہے۔

"طبتم"، "طیب" (بروزن "صید") کے مادہ سے پاکیزگی کے معنی میں ہے اور چونکہ یہ سلام و درود کے بعد کہا گیا ہے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ "انشائی" مفہوم رکھتا ہو۔ یعنی پاک و پاکیزہ رہو، خوش و خرم رہو یا دوسرے لفظوں میں یہ پاکیزہ نعمتیں تمھیں بھلی ہوں، اے پاک سرشت پاک دل لوگو!

لیکن بہت سے مفسرین نے اس کی "خبر" کے معنی میں تفسیر کی ہے اور یہ کہا ہے کہ فرشتے ان سے یہ کہیں گے کہ تم آلودگی اور ناپاکی سے پاک ہو چکے ہو اور ایمان اور عملِ صالح کے ذریعے تمھارا قلب و روح پاک ہو گیا ہے اور گناہوں اور معاصی سے بھی تم پاک ہو گئے ہو۔

یہاں تک کہ بعض نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جنت کے دروازے پر ایک درخت ہے جس کے نیچے صاف پانی کے دو چشمے اُبل رہے ہیں، مومنین ایک چشمے کا پانی پئیں گے تو ان کا باطن پاک و پاکیزہ ہو جائے گا اور دوسرے چشمے کے پانی سے نہائیں گے تو ان کا ظاہر پاک و صاف ہو جائے گا اور یہ وہ موقع ہے جب نگہبانِ جنت ان سے کہیں گے (سلام علیکم طبتم فادخلوها خالدین)[1]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ دوزخیوں کے بارے میں بھی "خلود" اور ہمیشگی کی تعبیر آئی ہے اور بہشتیوں کے بارے میں بھی تاکہ پہلا گروہ یہ جان لے کہ نجات کا کوئی راستہ موجود نہیں ہے اور دوسرا گروہ بھی نعمتِ خداوندی کے زوال کے بارے میں ہرگز پریشان نہ ہو۔

بعد والی آیت میں چار مختصر اور معنی خیز جملے جو بہشتیوں کی انتہائی خوشنودی اور دلی مسرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھی کی زبانی نقل ہوئے ہیں: "وہ کہیں گے: حمد و ستائش خدا ہی کے لیے مخصوص ہے جس نے ہمارے بارے میں اپنے وعدے کی وفا کی" (و قالوا الحمد لله الذی صدقنا وعده)۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ ———)

۱ جملہ شرطیہ "اذا جاءوها" کی جزا کیا ہے اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان بحث ہے۔ سب سے زیادہ مناسب یہی ہے کہ "قال لهم خزنتها" کا جملہ جزا ہے اور اس کی واو زائدہ ہے۔ یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ جزا ایک محذوف جملہ ہے اور تقدیر میں "سلام من الله علیکم" ہے یا یہ کہ جزا کا محذوف ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مطلب اس قدر وسیع و عالی ہے کہ قابلِ توصیف نہیں ہے بعض نے "فتحت" کو ہی جزا سمجھا ہے اور واؤ کو زائدہ سمجھا ہے۔ (حاشیہ صفحہ ہذا)

۱ تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۸۲۰

بعد والے جملہ میں مزید فرمایا گیا ہے ، (کہ وہ کہیں گے) اور جنت کی زمین کو ہماری میراث قرار دے دیا ہے اور اسے ہمیں بخش دیا (واورثنا الارض)۔

یہاں زمین سے مراد جنت کی زمین ہے اور "موارث" کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ یہ ساری نعمتیں انھیں تھوڑی سی زحمت کی وجہ سے دے دی گئی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ میراث ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے انسان عام طور پر کوئی زحمت نہیں اٹھاتا اور یا یہ اس لحاظ سے ہے کہ ہر انسان کے لیے ایک مکان تو جنت میں ہے اور ایک جگہ جہنم میں ہے۔ جب وہ اپنے اعمال کی وجہ سے دوزخی ہو جاتا ہے تو اس کا جنت والا مکان دوسروں کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ بہشتی ہو جائے تو اس کا دوزخی مکان دوسروں کے لیے رہ جاتا ہے اور یا اس بنا پر ہے کہ وہ انتہائی آزادی کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ میراث سے استفادہ کیا جاتا ہے کیونکہ انسان اس سے استفادہ کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے۔

یہ جملہ حقیقت میں اس وعدۂ الٰہی کا ٹھیک ٹھیک طور سے پورا ہونا ہے جو سورۂ مریم کی آیہ ۶۳ میں آیا ہے۔

تلك الجنة التی نورث من عبادنا من کان تقیًّا

یہ وہ بہشت ہے جو ہم اپنے پرہیزگار بندوں کو میراث میں دیں گے۔

تیسرے جملہ میں پروردگار کی وسیع جنت سے استفادہ کرنے میں اپنی مکمل آزادی کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں ؛

ہم جنت میں جس جگہ چاہیں قیام کریں اور ٹھہریں (نتبوّأ من الجنة حیث نشاء)۔

قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت بہت سے باغات سے مل کر بنی ہے۔ اسی لیے قرآن میں "جنات عدن" (بہشت کے جاودانی باغات) (توبہ - ۷۲) کی تعبیر آئی ہے اور بہشتی لوگ اپنے سلسلہ مراتب اور اپنے مقامات روحانی کے لحاظ سے ان میں ساکن ہوں گے۔ اس بنا پر ان کی آزادی بہشت کے انھیں وسیع باغات کے اندر ہے جو ان کے اختیار میں ہیں، ان بالاتر مقامات میں نہیں جن کے لیے وہ خود کو اہل اور لائق نہیں پاتے اور بنیادی طور پر وہ اس قسم کا کوئی تقاضا بھی نہیں کرتے۔

آخر میں آخری جملے میں ہے، عمل کرنے والوں کے لیے پروردگار کے حکم سے کیسا اچھا اجر و ثواب ہے (فنعم اجر العاملین)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ وسیع نعمتیں "بہا" (قیمت) کے ساتھ دی جاتی ہیں "بہانہ" کے ساتھ نہیں دی جائیں۔ ایمان اور عمل صالح لازمی اور ضروری ہے تاکہ اس کی وجہ سے اس قسم کا حق اور لیاقت و اہلیت پیدا ہو جائے۔

کیا یہ جملہ بھی بہشتیوں کا ہی ہے یا یہ پروردگار کا کلام اور گفتگو ہے، جو ان کی باتوں کے بعد کی گئی ہے۔

مفسرین نے دونوں احتمال ذکر کیے ہیں لیکن پہلا معنی یعنی اس کا اہل بہشت کی گفتگو ہونا دوسرے جملوں کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

آخر کار آخری زیر بحث آیت میں جو سورۂ زمر کی آخری آیہ ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

تو اس دن فرشتوں کو دیکھے گا کہ وہ عرش خدا کے گرد حلقہ کیے ہوئے طواف کر رہے ہیں اور اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجا لا رہے ہیں۔

(وتری الملائکة حافین من حول العرش یسبحون بحمد ربھم)۔

عرش خدا کے گرد فرشتوں کی وضع و کیفیت کے طرف اشارہ یا تو اس بنا پر ہے کہ اوامر الٰہی کے اجراء کے لیے ان کی آمادگی کو

بیان کیا جائے یا اس پرارزش اور قابل قدر باطنی حالت مشہود کی طرف اشارہ ہے جو خاصان و مقربان بارگاہِ خداوندی کو اس دن حاصل ہوگی اگرچہ یہ تینوں معنی آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتے لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

لہٰذا اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس دن بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ ہوگا (وقضی بینھم بالحق)۔

اور چونکہ یہ امور، پروردگار کی ربوبیت کی نشانیاں اور ہر قسم کی حمد وستائش کے لیے اس کی ذات پاک کی لیاقت کے دلائل ہیں، لہٰذا آخری جملے میں فرمایا گیا ہے: اس دن کہا جائے گا، حمد وسپاس عالمین کے پروردگار کے لیے مخصوص ہے (و قیل الحمد للہ رب العالمین)۔

کیا اس بات کے کہنے والے فرشتے ہیں؟ یا بہشتی اور پرہیزگار؟ یا وہ سب کے سب؟ آخری معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے کیونکہ خدا کی حمد وسپاس تمام صاحبانِ عقل وفکر اور تمام خاصانِ خدا اور مقربانِ بارگاہِ الٰہی کا طرزِ عمل ہے اور فعل مجہول قیل کا لانا بھی اسی معنی کا مؤید ہے۔

خداوندا! ہم بھی تمام فرشتوں اور تیرے فرمانبردار بندوں کے ساتھ ہم صدا اور ہم آواز ہوتے ہیں اور تیری ان تمام نعمتوں پر جو تُو نے ہمیں عنایت فرمائی ہیں شکر بجالاتے ہیں خصوصاً اس عظیم نعمت پر ہم تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے اپنے قرآن مجید کی آیات میں فکر ونظر کی ہمیں توفیق دی ہے اور عرض کرتے ہیں: الحمد للہ رب العالمین

بارِالٰہا! ہم تجھے تیرے عظیم پیغمبرؐ کی، تیرے حاملین عرش کی اور تیری بارگاہ کے تمام مقربین کی قسم دیتے ہیں کہ ہمیں اس جہان میں بھی اور اس جہان میں بھی ان سے جدا نہ فرما۔

بارِالٰہا! ہمیں ان لوگوں کے زمرے میں قرار دے جو تقویٰ اور عمل صالح کے سایے میں گروہ در گروہ تیری بہشت بریں میں وارد ہوں گے اور تیرے فرشتے جن پر سلام ودرود کریں گے۔ آمینؐ یا رب العالمین۔

سورۂ زمر کی تفسیر کا اختتام
اور تفسیر نمونہ کی جلد ۱۹ کا اختتام ۲؍ ذی الحجہ
۱۴۰۴ھ / مطابق ۸؍ جون ۱۹۸۳ء

اس انیسویںؐ جلد کا ترجمہ ـــ بدھ ـــ سوا ایک بجے بعد دوپہر ۱۳؍ ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ (۲۰؍ اگست ۱۹۸۶ء) بر مکان سیٹھ نوازش علی ساعتی ۱۸؍ ای ماڈل ٹاؤن لاہور بدست حقیر پُرتقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم اختتام پذیر ہوا۔

والحمد للہ اولاً وآخراً والصلوٰۃ علی النبی وآلہ ابداً سرمداً

احقر صفدر حسین نجفی

سورہ مومن

◎ مکہ میں نازل ہوئی — !

◎ اس کی کل ۸۵ آیات ہیں

تاریخ آغاز
۴ ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۴ھ

سورۂ مؤمن کے مندرجات

سورۂ مؤمن، "حوامیم" میں سے سب سے پہلی سورت ہے۔ (حوامیم قرآن کی ان سات سورتوں کے مجموعہ کا نام ہے جو "حٰمٓ" سے شروع ہوتی ہیں اور قرآن میں یکے بعد دیگرے موجود ہیں۔ اور سب کی سب مکہ میں نازل ہوئی ہیں)۔

اس سورت میں بھی دوسری مکی سورتوں کے مانند مختلف اعتقادی اور اصول دین کے بنیادی مسائل کو بیان کیا گیا ہے کیونکہ اُس دور کے مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت بنیادی عقائد کی پختگی تھی۔

اس سورت کے مندرجات میں مندرجہ ذیل امور آتے ہیں۔

خدا کا قہر، اس کی مہربانی، انذار، بشارت نیز ظالموں، جابروں اور متکبرین کے ساتھ منطقی، مدلل اور قاطع نبرد آزمائی اور حق طلب و حق جو مؤمنین پر لطف و کرم۔

اس سورت کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اس میں جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستان کا وہ حصہ بیان ہوا ہے جو مؤمن آل فرعون سے متعلق ہے۔ یہ ماجرا صرف اسی سورت ہی میں ذکر ہوا ہے جو کہ قرآن کی کسی اور سورہ میں نہیں ہے، یہ اسی مؤمن اور زیرک و باتدبیر شخص کی داستان ہے جس کا شمار فرعون کے بااثر افراد میں سے ہوتا تھا لیکن وہ اندرونی طور پر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکا تھا اور موسیٰؑ اور ان کے دین کے لیے فرعون کے دربار میں ایک قابل اعتماد مورچے کی حیثیت رکھتا تھا۔ جیسا کہ ہم سورت کی تفصیل میں دیکھیں گے کہ ایسے حساس لمحات میں جب کہ موسیٰ علیہ السلام موت کے نزدیک پہنچ چکے تھے یہ باایمان شخص نہایت زیرکی اور ظرافت کے ساتھ آپؑ کی مدد کے لئے آگے بڑھا اور انہیں موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا۔

اس سورت کا نام "سورۂ مؤمن" بھی اسی مناسبت سے ہے، کیونکہ اس کی تگ و دو اور سعی و کوشش کے تذکرے اس سورت کی بیس سے زائد آیات میں موجود ہیں جو مجموعی طور پر اس کے ایک چوتھائی حصے پر مشتمل ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت میں مؤمن آل فرعون کے حالات کا بیان مکہ کے ان مسلمانوں کیلئے ایک باقاعدہ تربیتی درس تھا جو آنحضرتؐ پر ایمان رکھنے کے باوجود آپؐ کے زبردست جانی دشمنوں سے بھی دوستانہ مراسم استوار کئے ہوئے تھے تاکہ مشکل کے وقت آپؐ کے لیے محفوظ مورچہ ثابت ہو سکیں۔ اور کہتے ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ کے چچا بزرگوار حضرت ابو طالبؑ کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہوتا تھا جیسا کہ اسلامی روایات میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔[1]

---

[1] الغدیر جلد ۸ ص ۳۸۸

بہرحال اس سورت کے مندرجات کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلے حصے میں سورت کے آغاز کے ساتھ ہی خدا کی ذات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور کچھ اسماء حسنیٰ کا ذکر ہے خاص کر ان اسماء کا جو دلوں میں امید اور خوف کو وجود میں لاتے ہیں جیسے "غافر الذنب وقابل التوب شدید العقاب"

دوسرے حصے میں ظالم و جابر کافروں کو اسی دنیا میں عذاب کی دھمکی دی گئی ہے کہ وہ ایسے ہی عذاب میں گرفتار ہوں گے جیسے ان سے پہلی سرکش قومیں گرفتار ہوئی تھیں۔ اسی طرح قیامت کے عذاب اور اس کی خصوصیات اور تفصیلات کا بیان ہے۔

تیسرے حصے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ بیان کرتے ہوئے بات مؤمن آل فرعون کی داستان تک جا پہنچتی ہے اور اس سورت کا ایک اچھا خاصا حصہ اس باہوش، زیرک اور شجاع انسان کی اہل فرعون کے ساتھ مفصل گفتگو پر مشتمل ہے۔

چوتھے حصے میں ایک بار پھر قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے تاکہ سوئے ہوئے دل بیدار ہو جائیں۔

پانچویں حصے میں انسانی زندگی کے حوالے سے توحید اور شرک جیسے اہم مسئلے کو بیان کیا گیا ہے اور توحید کی علامات و اثبات اور شرک کے بطلان پر کچھ دلائل قائم کئے گئے ہیں۔

چھٹے حصے میں جو کہ اس سورت کا آخری حصہ ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صبر و شکیبائی پر کاربند رہنے کی دعوت کے ساتھ ساتھ اس سورت کے دوسرے حصوں کا ایک خلاصہ پیش کیا گیا ہے یوں مبدأ و معاد کے مسائل، گذشتہ لوگوں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے، ضدی مزاج مشرکین کو متنبہ کرنے اور خدا کی کچھ نعمتوں کو بیان کرنے کے بعد سورت ختم ہو جاتی ہے۔

ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورت کو "مؤمن" کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ اس کے ایک حصے کو مؤمن آل فرعون کے حالات پر مشتمل ہونے کی بنا پر ہے جیسا کہ اسے "غافر" سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ اس کی تیسری آیت میں یہی نام آیا ہے۔

سورۂ مؤمن کی فضیلت

جو روایات پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ اہلبیتؑ سے منقول ہوئی ہیں ان میں "حٰمٓ" سورتوں کے بے شمار فضائل عمومی طور پر اور سورہ "مؤمن" کے فضائل خصوصی طور پر بیان ہوئے ہیں۔

عمومی لحاظ سے جو روایات وارد ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الحوامیم تاج القرآن"۔

(ساتوں) حٰم سورتیں قرآن کا تاج ہیں[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان سورہ مؤمن کا آغاز۔ (بعض نسخوں میں لفظ "تاج" آیا ہے اور بعض میں لفظ "دیباج" آیا ہے)۔

ابن عباسؓ نے ایک روایت بیان کی ہے جو یا تو پیغمبرؐ خدا سے یا پھر حضرت امیر المؤمنینؑ سے سنی گئی ہے فرماتے ہیں :۔

" لکل شیء لباب ولباب القرآن الحوامیم "

ہر چیز کا ایک مغز ہوتا ہے اور قرآن کا مغز "حٰم" سورتیں ہیں[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

" الحوامیم ریحان القرآن فاحمدوا اللہ واشکروہ بحفظھا و تلاوتھا ، وان العبد لیقوم یقرأ الحوامیم فیخرج من فیہ اطیب من المسك الاذفر والعنبر وان اللہ لیرحم تالیھا وقارئھا ویرحم جیرانہ واصدقائہ ومعارفہ وکل حمیم او قریب لہ ، وانہ فی القیامۃ یستغفر لہ العرش والکرسی وملائکۃ اللہ المقربون "

"حٰم سورتیں قرآن مجید کے خوشبو دار پھول ہیں۔ پس حمد خدا بجا لاؤ اور انہیں حفظ کر کے اور ان کی تلاوت کر کے خدا کا شکر بجا لاؤ اور جو شخص نیند سے بیدار ہونے کے بعد حٰم سورتوں کی تلاوت کرے تو (قیامت کے دن) اس کے منہ سے نہایت ہی دل انگیز خوشبو نکلے گی جو مشک وعنبر سے کئی گنا بہتر ہوگی۔ اور خداوند عالم ان سورتوں کی تلاوت کرنے والوں پر بھی رحمت کرتا ہے اور ان کے ہمسایوں، دوستوں، واقف کاروں اور ان کے نزدیک و دور کے دوستوں کو بھی اپنی رحمت میں شامل کر دیتا ہے۔ قیامت کے دن عرش و کرسی اور خدا کے مقرب فرشتے بھی ان کے لیے استغفار کریں گے"[2]

پیغمبر اسلام کی ایک اور حدیث میں ہے :

" الحوامیم سبع وابواب جھنم سبع، تجیٔ کل حامیم منھا فتقف علی باب من ھذہ الابواب تقول اللھم لا تدخل من ھٰذا الباب من کان یؤمن بی ویقرأنی "

"حامیم والی سات سورتیں ہیں اور جہنم کے دروازے بھی سات ہیں اور ہر ایک ان میں سے ایک ایک دروازے پر کھڑی ہو جائے گی اور کہے گی : خداوندا! جو شخص مجھ پر ایمان لایا اور میری تلاوت کی اسے اس دروازے سے داخل نہ فرما"[3]

سورۂ مؤمن کی فضیلت کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے :

---

[1] تفسیر مجمع البیان سورۂ مؤمن کا آغاز۔ (بعض نسخوں میں لفظ "تاج" آیا ہے اور بعض میں لفظ "دیباج" آیا ہے)۔

[2] تفسیر مجمع البیان سورۂ مؤمن کا آغاز۔

[3] "بیہقی" منقول "روح المعانی" جلد ۲۴ ص ۳۶۔

"جو شخص حٰم مومن کی تلاوت کرتا ہے تمام انبیاء، صدیقین اور مومنین کی ارواح اس پر درود بھیجتی ہیں اور اس کے لیے استغفار کرتی ہیں۔"[1]

واضح سی بات ہے کہ اس قدر عظیم فضائل کا تعلق اس کے اہم مضامین اور مندرجات سے ہے کہ جو جب بھی انسان کی اعتقادی اور عملی زندگی میں نظر آنے لگ جائیں تو وہ کسی شک و شبہ کے بغیر ان عظیم فضائل کا مستحق ہوگا اور اگر ان روایات میں تلاوت کی بات ہوئی ہے تو اس سے ایسی تلاوت مراد ہے جو ایمان اور عمل کا مقدمہ ثابت ہو۔

حضرت رسالت مآبؐ کی ایک حدیث میں یہ بامعنی تعبیر وارد ہوئی ہے کہ "جو شخص "حٰم" کی تلاوت کرے اور اس پر ایمان بھی رکھتا ہو" یہ ہماری اس بات کے لیے روشن دلیل ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان آغاز سورۂ مومن۔

سورۂ مؤمن

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱۔ حٰمٓ

۲۔ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ

۳۔ غَافِرِ الذَّنۡبِ وَقَابِلِ التَّوۡبِ شَدِيۡدِ الۡعِقَابِ ذِى الطَّوۡلِ‌ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ؕ اِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حٰمٓ

۲۔ یہ ایسی کتاب ہے جو قادر اور دانا خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

۳۔ جو گناہوں کو بخشنے والا، توبہ قبول کرنے والا، سخت عذاب دینے والا اور بہت زیادہ نعمتوں کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، (تم سب کی) بازگشت اسی کی طرف ہے۔

تفسیر

امید افزا صفات

اس سورت کا آغاز بھی حروف مقطعات سے ہوتا ہے اور یہاں پر کچھ نئے حروف دکھائی دیتے ہیں اور وہ ہیں "حا" اور " میم "۔

حروفِ مقطعات کے بارے میں سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ اعراف اور بعض دوسری سورتوں کے آغاز میں ہم تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں پر جو چیز بیان کرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ بعض روایات اور اسی طرح بہت سے مفسرین کے مطابق یہ دو حروف کہ جن سے سورت کا آغاز ہو رہا ہے خدا کے دو نام ہیں کہ جن ناموں کے آغاز میں یہ دو حروف ہیں جس طرح کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ان حروف کی "حمید" اور "مجید" سے تفسیر کی گئی ہے [1]

بعض مفسرین نے " ح " سے خدا کے یہ نام مراد لیے ہیں۔ "حمید"، "حلیم" اور "حنان" وغیرہ اور " م " سے " ملک"، "مالک" اور "مجید" وغیرہ جیسے نام مراد لیے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ " ح " خدا کی "حاکمیت" اور " م " خدا کی "مالکیت" کی طرف اشارہ ہو۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ "حٰمٓ" خدا کا اسم اعظم ہے [2]

ظاہر ہے کہ ان تفاسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں بلکہ ممکن ہے کہ سب تفسیریں اس آیت کے معنی میں جمع ہوں۔

جس طرح کہ قرآن مجید کا طریقہ کار ہے کہ حروف مقطعہ کے بعد قرآن کی عظمت بیان کرتا ہے اسی طرح بعد والی آیت میں بھی عظمتِ قرآن کا تذکرہ ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کتاب اپنی اس قدر عظمت و رفعت کے باوجود انہی عام حروف الف باء سے مرکب ہے۔ اس قدر عظیم عبارت اس قدر معمولی سے مصالح سے معرض وجود میں لائی گئی ہے، جو بذات خود اس کے معجزہ ہونے کی دلیل ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: یہ ایسی کتاب ہے جو قادر اور دانا خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے (تنزیل الکتاب من اللہ العزیز العلیم)۔

اس کی عزت اور قدرت اس بات کا موجب ہے کہ کوئی ایک بھی اس کی برابری نہیں کر سکتا اور اس کا علم اس بات کا باعث ہے کہ اس کے تمام مضامین و مندرجات کمال کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں اور وہ ارتقاء و تکامل کی راہ میں تمام انسانی ضروریات کو اچھی طرح جانتا ہے۔

---

[1] معانی الاخبار از شیخ صدوق ص ۲۲ (باب معنی الحروف المقطعۃ فی اوائل السور)۔

[2] تفسیر "قرطبی" اسی آیت کے ذیل میں۔

اس کے بعد کی آیت میں خداوند عالم کی پانچ ایسی عظیم صفات کا تذکرہ ہے جن میں سے کچھ تو امید افزا اور کچھ خوف آفرین ہیں۔
فرمایا گیا ہے: وہ ایسا خدا ہے جو گناہوں کو معاف کرتا ہے (غافر الذنب)۔
اور توبہ قبول کرتا ہے (وقابل التوب)۔[1]
اس کی سزا سخت ہے (شدید العقاب)۔
اس کی نعمتیں فراوان ہیں (ذی الطول)۔[2]
ایسا خدا ہے جس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں (لا الٰہ الّا ھو)۔
تم سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے (الیہ المصیر)۔
جی ہاں! جو ذات بھی ان اوصاف کی مالک ہے وہی عبادت کے لائق اور سزا اور جزا دینے کی حق دار ہے۔

چند ایک نکات

۱۔ ان آیات میں صفات الٰہی: مندرجہ بالا دو آیات (۲، ۳) میں "اللہ" کے نام کے بعد اور "معاد" کے ذکر "الیہ المصیر" سے پہلے خداوند کریم کے اوصاف میں سے سات صفتیں بیان ہوئی ہیں، جن میں سے کچھ تو "صفات ذات" ہیں اور کچھ "صفات فعل" ہیں جو مجموعی طور پر توحید، علم، قدرت، رحمت اور غضب کو بیان کر رہی ہیں اور عزیز وعلیم ایسی صفات اس آسمانی کتاب کے نزول کی بنیاد قرار پائی ہیں اور غفرانِ ذنوب، قبولِ توبہ، شدتِ عقاب اور عطائے نعمت تربیت نفوس اور خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کا مقدمہ ہیں۔

۲۔ غضب دو رحمتوں کے درمیان: ان تمام اوصاف میں "غافر الذنب" سب سے اوّل ہیں اور "ذی الطول" آخر میں ہے اور ان دونوں کے درمیان میں "شدید العقاب" ہے۔ درحقیقت اس کا غضب دو رحمتوں کے درمیان واقع ہوا ہے اور اس کے علاوہ اس ایک صفت غضب کے ساتھ ساتھ تین صفات رحمت کا واقع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ "اس کی رحمت اس کے غضب سے آگے بڑھی ہوئی ہے" (یا من سبقت رحمتہ غضبہ)

۳۔ الیہ المصیر کا مفہوم: یہ نہ صرف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن سب کی بازگشت اس کی طرف ہے بلکہ اس کا مطلق ہونا یہ بتا رہا ہے کہ تمام امور کی بازگشت خواہ وہ اس دنیا میں ہوں خواہ دوسرے جہاں میں اسی کی طرف ہے اور تمام موجودات کا سلسلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

۴۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھو کا مفہوم اس آیت میں: یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ "لا الٰہ الّا ھو" کا جملہ جو آخری صفت

---

[1] "توب" یا تو، توبہ کی جمع ہے یا پھر مصدر ہے (مجمع البیان)

[2] "طول" (بروزن قول) نعمت اور فضیلت کے معنی میں بھی ہے اور طاقت، امکان اور کسی چیز تک جا پہنچنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ بعض مفسرین کے مطابق "ذی الطول" اسے کہا جاتا ہے جو عظیم اور طولانی نعمتیں کسی دوسرے کو بخش دے۔ بنابریں اس کا معنی "منعم" کے معنی سے خاص ہے۔

کے طور پر آیا ہے اور "توحید عبودیت" کو بیان کر رہا ہے اور غیر اللہ کی نفی کر رہا ہے درحقیقت آخری صفت اور آخری نتیجہ کے طور پر بیان ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ابن عباس کی بیان کردہ ایک روایت میں پڑھتے ہیں کہ :

"وہ "غافر الذنب" ہے اس شخص کے لیے جو "لا الٰہ الّا اللہ" کہے"

"وہ قابل التوب" ہے اس شخص کے لیے جو "لا الٰہ الّا اللہ" کہے"

"وہ "شدید العقاب" ہے اس شخص کے لیے جو "لا الٰہ الّا اللہ" نہ کہے اور

"وہ "ذی الطول" غنی اور بے نیاز ہے اس سے جو "لا الٰہ الّا اللہ" نہ کہے"

پس بنا بریں ان تمام صفات کا محور وہ لوگ ہیں جو توحید پر ایمان رکھتے ہوں اور ان کا قول و عمل توحید کے جادہ سے منحرف نہ ہو

۵۔ **قرآن میں بخشش کے ذرائع :** کلام مجید میں بہت سے امور ایسے ہیں جو مغفرت اور گناہوں کے معاف ہو جانے کے اسباب کی حیثیت سے بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) **توبہ۔** چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

یاایھا الذین اٰمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحًا عسٰی ربکم ان یکفر عنکم سیئاتکم

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو! خدا کی طرف پلٹ جاؤ اور خالص توبہ کرو امید ہے کہ خدا تمھارے گناہ معاف کر دے (تحریم۔ ۸)۔

(۲) **ایمان اور عمل صالح۔** چنانچہ فرماتا ہے :

والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات واٰمنوا بما نزل علٰی محمّد وھو الحق من ربھم کفر عنھم سیئاتھم

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک اعمال بجالائے اور جو کچھ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوا ہے اس پر بھی ایمان لے آئے اور وہ حق آیات ہیں اور ان کے پروردگار کی طرف سے ہیں، تو خداوند عالم ان کے گناہوں کو بخش دے گا (سورۂ محمدؐ۔ ۲)۔

(۳) **تقوٰی۔** چنانچہ ارشاد فرماتا ہے :

ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانًا و یکفر عنکم سیئاتکم

اگر خدا کا تقوٰی اختیار کرو گے تو خدا بھی تمھیں حق اور باطل کی پہچان عطا کرے گا اور تمھارے گناہوں کو معاف کر دے گا (انفال۔ ۲۹)۔

(۴) **ہجرت، جہاد اور شہادت۔** جیسا کہ فرماتا ہے :

فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقاتلوا وقتلوا

لاکفرن عنھم سیئا تھم

جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں انہیں دکھ پہنچایا گیا اور جنگ کی اور مارے گئے تو میں ایسے لوگوں کے گناہوں کو یقیناً معاف کر دوں گا (آل عمران۔ ۱۹۵)۔

(۵) چھپاکر راہ خدا میں خرچ کرنا۔ جیساکہ اس کا ارشاد ہے:

ان تبدوا الصدقات فنعمّا ھی و ان تخفوھا و تؤتوھا الفقراء فھو خیر لکم و یکفر عنکم من سیئاتکم۔

"اگر تم راہِ خدا میں اپنے صدقات کو آشکار طور پر خرچ کرو تو اچھا ہے اور اگر انہیں چھپاکر خرچ کرو اور فقیروں کو دو تو تمہارے لیے بہتر ہے اور وہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا" (بقرہ۔ ۲۷۱)۔

(۶) قرض الحسنہ۔ چنانچہ فرماتا ہے:

ان تقرضوا اللہ قرضًا حسنًا یضاعفہ لکم و یغفر لکم

اگر تم خدا کو قرض الحسنہ دو تو وہ اسے تمہارے لیے دوگنا کر دے گا اور تمہیں معاف کر دے گا (تغابن ۔۱۷)۔

(۷) گناہان کبیرہ سے پرہیز: یہ گناہان صغیرہ کی بخشش کا سبب ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے۔

ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیئاتکم

اگر تم گناہان کبیرہ سے بچو کہ جن کے پاس جانے سے تمہیں روکا گیا ہے، تو ہم تمہارے گناہان صغیرہ کو معاف کر دیں گے (نساء۔ ۳۱)۔

تو اس طرح سے ہم پر مغفرتِ الٰہی کے دروازے ہر طرف سے کھلے ہوئے ہیں۔ سات قرآنی آیات کی رو سے مغفرت کے سات دروازے اوپر بیان ہوئے ہیں تاکہ ہم جس طرف سے چاہیں داخل ہو جائیں اور کیا ہی بہتر ہو کہ ساتوں دروازوں سے داخل ہو جائیں۔

۴۔ مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝

۵۔ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝

۶۔ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝

ترجمہ

۴۔ صرف وہی لوگ ہماری آیات کے بارے میں مجادلہ کرتے ہیں جو (عناد اور دشمنی کی وجہ سے) کافر ہو چکے ہیں۔ تمہیں ان کی شہروں میں آمد و رفت اور ظاہری شان و شوکت دھوکے میں نہ ڈال دے۔

۵۔ اُن سے پہلے نوح کی قوم نے اور ان کے بعد میں آنے والی اقوام نے (اپنے پیغمبروں کو) جھٹلایا اور ہر اُمت نے سازش کی کہ اپنے پیغمبر کو پکڑے (اور اسے تکلیف دے) اور انہوں نے حق کو مٹانے کے لئے مجادلہ باطل کیا، لیکن میں نے انھیں پکڑ لیا (اور سخت سزا دی)، پس دیکھئے کہ خدا کا عذاب کیسا تھا؟

۶۔ اسی طرح تمہارے پروردگار کا فرمان اُن لوگوں کے لئے کہ جو کافر ہو چکے ہیں یقینی ہو چکا ہے کہ وہ سب کے سب جہنمی ہیں۔

تفسیر

خدا کا اٹل فرمان

خداوند عالم کی طرف سے نزول قرآن کے ذکر اور خدا کی ان صفات کے بیان کے بعد جو خوف اور امید کا سبب بنتی ہیں ایسے لوگوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے جنھوں نے ان آیات الٰہی کے مقابلے کی ٹھان لی تھی اور مختصر سے جملوں میں ان کا انجام بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: خدا کی آیات کے بارے میں صرف وہی لوگ مجادلہ کرتے ہیں جو عناد اور دشمنی کی وجہ سے کافر ہو چکے ہیں (ما یجادل فی اٰیات اللہ الا الذین کفروا)۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان لوگوں کے پاس بسا اوقات طاقت، اقتدار اور افرادی قوت بھی ہوتی ہے لیکن "کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی شہروں میں آمد و رفت اور قدرت نمائی تمھیں دھوکے میں ڈال دے" فلا یغررك تقلبهم فی البلاد)۔

یہ ان کی چند روزہ کر و فر اور مختصر سی مدت کے لیے ان کی شان و شوکت ہے اور بہت جلد ان کے بلبلے سے ہوا نکل جائے گی اور وہ نیست و نابود ہو جائیں گے یا تیز ہوا کے جھونکوں میں راکھ کے مانند پراگندہ ہو جائیں گے۔

"یجادل" "جدل" کے مادہ سے ہے جو رسی کو بل دینے اور اسے مضبوط بنانے کے معنی میں آتا ہے۔ اس کا استعمال عمارتوں اور زرہوں وغیرہ پر بھی ہوتا ہے اسی بنا پر ان لوگوں کے طریقہ کار کو "مجادلہ" کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے مقابلے میں آکر مناظرہ کرتے اور اپنے مضبوط و محکم دلائل کے ذریعے ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن توجہ رہے کہ عربی لغت کے لحاظ سے ہر مقام پر "مجادلہ" مذموم بات نہیں ہے (ہر چند کہ ہماری روزمرہ کی زبان نے اسے مذموم بنا دیا ہے) کیونکہ اگر اسے حق کی راہ میں استعمال کیا جائے اور وہ منطق و استدلال پر مبنی ہو اور بے خبر لوگوں کی ہدایت اور حقیقت کے بیان کی خاطر ہو تو قابل مذمت ہی نہیں بلکہ لائق تعریف بھی بن جاتا ہے۔ ہاں البتہ اگر بودے دلائل اور تعصب، جہالت اور غرور پر مبنی استدلال کے ذریعے لوگوں کو بے وقوف بنایا جائے تو پھر مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔ اتفاق سے قرآن مجید میں یہ لفظ دونوں مفاہیم میں استعمال ہوا ہے چنانچہ ہم ایک جگہ پر پڑھتے ہیں:

وجادلهم بالتی هی احسن

ان لوگوں کے ساتھ اچھے انداز میں مجادلہ کریں (نحل ـ ۱۲۵)۔

لیکن دوسرے مقامات پر مذموم مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے زیر تفسیر آیت یا اس کے بعد والی آیت میں ہے۔

"جدال" اور "مجادلہ" کے بارے میں ہم "چند اہم نکات" کے زیر عنوان تفصیلی گفتگو کریں گے۔

"تقلب" "قلب" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے دگرگوں کرنا، الٹ پلٹ کرنا۔ اور یہاں پر مختلف علاقوں اور شہروں پر حکومت، تصرف، تسلط اور غلبہ پانے اور آمد و رفت نکلنے کے معنی میں آیا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کا اصل مقصد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابتدائے اسلام کے غریب مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ کہیں

وہ کافروں کے مادی و مالی وسائل اور سیاسی و اجتماعی طاقت کو ان کی حقانیت اور حقیقی قوت کی دلیل نہ سمجھ لیں ان جیسے بہت سے افراد دنیا میں گزرے ہیں اور تاریخ بتاتی ہے کہ جب ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا تو وہ کس قدر عاجز اور بے بس نظر آئے اور موسم خزاں کے پژمردہ پتوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گر پڑے۔

موجودہ دور میں بھی ظالم و متکبر کفار اپنا وجود منوانے یا دنیا کے مستضعف اور غریب لوگوں پر اپنا رعب جمانے کے لیے بھاگ دوڑ، پروپیگنڈے، کانفرنسیں، سیاسی دورے، جنگی مشقیں، اپنے حلیفوں کے ساتھ جنگی اور اقتصادی معاہدے وغیرہ کرتے رہتے ہیں تاکہ اپنے ناپاک عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے فضا کو سازگار بنائے رکھیں۔ لیکن یہ مومنوں کا کام ہے کہ وہ بیدار رہیں اور کفار کی اس پرانی روش کے فریب میں نہ آئیں اور ان سے کبھی مرعوب و پریشان نہ ہوں۔

لہٰذا بعد والی آیت میں بعض سابق سرکش اور گمراہ قوموں کے انجام کو مختصر لیکن جامع انداز میں بیان فرمایا گیا ہے: ان سے پہلے نوح کی قوم نے اور ان کے بعد آنے والی قوموں نے اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا (کذبت قبلھم قوم نوح والاحزاب من بعدھم)۔

"احزاب" سے مراد قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون، قوم لوط اور اس طرح کے دوسرے لوگ ہیں جنہیں سورۂ ص کی آیت ۱۲ اور ۱۳ میں "احزاب" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

کذبت قبلھم قوم نوح وعاد وفرعون ذوالاوتاد وثمود وقوم لوط واصحاب الأیکۃ اولئك الاحزاب

جی ہاں یہ وہ "احزاب" تھے جنہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنے اپنے دور کے انبیاء کو جھٹلایا کیونکہ ان انبیاء کی دعوت ان لوگوں کے ناجائز مفادات اور خواہشات نفسانی کے خلاف تھی۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے صرف جھٹلانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ "ان میں سے ہر امت نے سازش تیار کی کہ اپنے نبی کو پکڑیں، انہیں تکلیف پہنچائیں، قید خانے میں ڈال دیں یا قتل کر ڈالیں" (وھمت کل امۃ برسولھم لیأخذوہ)۔

انھوں نے پھر اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ "حق کو مٹانے کے لیے باطل باتوں کا سہارا لیا اور لوگوں کو گمراہ کرنے پر ڈٹے رہے" (وجادلوا بالباطل لیدحضوا به الحق)[1]

لیکن یہ چیزیں ہمیشہ کے لیے برقرار نہ رہیں اور مناسب موقع پر "میں نے انہیں پکڑ لیا اور سخت سزا دی، دیکھئے! عذاب الٰہی کیسا تھا؟" (فاخذتھم فکیف کان عقاب)۔

تمہارے سفر کے دوران میں ان کے شہروں کے کھنڈرات تمہیں نظر آتے ہیں۔ ان کا برا اور تاریک انجام تاریخ کے صفحات اور صاحبان دل کے سینوں میں محفوظ ہے دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔

مکہ کے ان سرکش کفار اور عرب کے ظالم مشرکین کا بھی ان سے بہتر انجام نہیں ہوگا۔ مگر یہ کہ توبہ کریں اور اپنی کارستانیوں پر نظر ثانی کریں۔

---

[1] "لیدحضوا" "ادحاض" کے تین مادوں سے مٹانے اور باطل کرنے کے معنی میں ہے۔

مندرجہ بالا آیت سرکش احزاب کے طرز عمل کو تین حصوں میں خلاصہ کے طور پر بیان کر رہی ہے :

الف : تکذیب اور انکار۔

ب : مردانِ حق کے خاتمے کی سازش۔

ج : عوام الناس کو گمراہ کرنے کے لیے جھوٹا پروپیگنڈا۔

عرب کے مشرکین نے بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اسی طریق کار کو دہرایا، لہٰذا اگر قرآن نے انہیں گذشتہ اقوام جیسے انجام سے دوچار ہونے کی دھمکی دی ہے تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں اس دنیا میں عذاب سے دوچار ہونے کے علاوہ دوسرے جہان میں بھی ان کے عذاب میں مبتلا ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : تمہارے پروردگار کا اس قسم کا فرمان ان لوگوں کے لیے مسلم ہو چکا ہے جو کافر ہو چکے ہیں کہ وہ اہلِ جہنم ہیں (وکذالك حقت کلمة ربك علی الذین کفروا انهم اصحاب النار)۔

آیت کا معنی بڑا ہی وسیع ہے جو ہر قوم کے ضدی مزاج اور ہٹ دھرم کافروں کے شاملِ حال ہے اور جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے یہ صرف کفار ہی سے مخصوص نہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں پروردگارِ عالم کے عذاب کا مسلم ہونا ان کے مسلسل گناہ اور بار بار کی خلاف ورزیوں کی وجہ سے ہے جو وہ اپنی مرضی کے مطابق انجام دیا کرتے تھے۔ لیکن جناب فخر رازی جیسے بعض مفسرین پر تعجب ہوتا ہے کہ جنہوں نے اس کو مختلف اقوام کے جبری انجام سے دوچار ہونے اور ان کے ارادہ واختیار کے سلب ہو جانے کی ایک دلیل سمجھا ہے۔ حالانکہ اگر وہ فرقہ وارانہ تعصب کی عینک اتار کر اس کا مطالعہ کرتے اور اس میں تھوڑا سا بھی غور وفکر کرتے تو آیات کا صحیح مطلب ان کے لیے واضح ہو جاتا کہ خداوند عالم نے ان کے لیے برا انجام اس وقت مقرر کیا جب انہوں نے ظلم اور جرائم کے تمام راستے خود اپنے ہی پاؤں سے طے کئے۔

چند اہم نکات

۱۔ کافروں کی ظاہری شان وشوکت : قرآنی آیات میں ہمیں بار بار یہ بات نظر آتی ہے کہ غریب اور مظلوم مؤمن یہ ہرگز تصور نہ کریں کہ بعض اوقات وسیع پیمانے پر کچھ مسائل ظالم وجابر اور بے ایمان افراد یا معاشرے کو مل جاتے ہیں تو یہ ان کی سعادت اور نیک بختی کی دلیل ہوتے ہیں یا ان کے کامیاب انجام کی علامت ہوتے ہیں۔

خاص کر قرآن مجید ان کوتاہ فکر اور کوتاہ نظر افراد کی اس سوچ پر خطِ تنسیخ کھینچتا ہے جو بعض اوقات کچھ لوگوں کے مادی وسائل کو ان کی روحانی حقانیت کی دلیل سمجھ لیتے ہیں۔ گزشتہ اقوام کی تاریخ کو مؤمنین کے لیے پیش کرتے ہوئے ان کے واضح نمونوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ جیسے مصر میں فرعونی حکمرانوں کے، بابل میں نمرودیوں کے، عراق، حجاز اور شامات میں قوم نوح، عاد اور ثمود کے نمونے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ غریب اور تنگ دست مؤمن کسی قسم کی کمی اور کمزوری کا احساس کریں اور ظالموں کے ظاہری کروفر سے مرعوب ہو جائیں یا سست پڑ جائیں۔

البتہ قانونِ قدرت یہ نہیں ہے کہ جس نے بھی کسی قسم کی خلاف ورزی کی اسے فوراً ہی اس کے کئے کی سزا دے دی گئی جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت ۵۹ میں ہے:

وجعلنا لمهلكهم موعدًا

ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔

سورۂ طارق کی آیت ۱۷ میں فرمایا گیا ہے:

فمهّل الكافرين امهلهم رويدًا

کافروں کو تھوڑی سی مہلت دے دیجئے تاکہ ان کا انجام کار واضح ہو جائے۔

سورۂ آل عمران کی آیت ۱۷۸ میں فرمایا گیا ہے:

انما نملی لهم ليزدادوا اثمًا

ہم ان کو اس لیے مہلت دیتے ہیں تاکہ ان کے گناہ زیادہ ہو جائیں۔

المختصر اس قسم کی مہلت کا مقصد یا تو کفار پر اتمام حجت ہے یا مؤمنین کی آزمائش اور یا پھر جن لوگوں نے اپنے اوپر توبہ کے دروازے بند کر لیے ہیں ان کے گناہوں میں اضافہ۔

اس قسم کی صورت حال بعض اوقات ان بعض مادی لحاظ سے پسماندہ مومن قوموں کو درپیش آتی ہے کہ جو طاقتور ظالم مادی حکومتوں کی ترقی کو دیکھتی ہیں تو ان کے دل میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ ایسی اقوام کو چاہیے کہ وہ مندرجہ بالا قرآنی منطق کو پیش نظر رکھ کر ان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔

اس کے علاوہ انہیں یہ بھی یاد رکرنا چاہیئے کہ ان کی اس محرومی اور پسماندگی کا سب سے اہم سبب ان ظالموں کا ظلم ہی ہے کہ اگر وہ ان کے ظلم کی یہ زنجیریں توڑ ڈالیں اور ان کی غلامی سے نجات پا کر اپنی شبانہ روز کوششوں اور سعیِ مسلسل میں لگ جائیں تو اس پسماندگی کا ازالہ کر سکتی ہیں۔

۲۔ مجادلہ، قرآن کی رو سے: اسی سورت میں پانچ مرتبہ "مجادلہ" کی بات ہوئی ہے جو سب کی سب "مجادلۂ باطل" کے ذکر پر مبنی ہے، (ملاحظہ ہوں آیات ۴، ۵، ۳۵، ۵۶ اور ۶۹) لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی نکتہ نظر سے "جدال" کے بارے میں کچھ تفصیل سے گفتگو کی جائے۔

"جدال" اور "مراء" دو ایسے عنوان ہیں جن کے بارے میں قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں کافی گفتگو ہوئی ہے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے ان کلمات کے مفہوم کو واضح کیا جائے پھر جدال کی قسمیں (جدالِ حق اور جدالِ باطل) اور ان کی علامات کو بیان کیا جائے اور آخر میں جدالِ باطل کے نقصانات اور جدالِ حق کے فوائد اور کامیابی کے اسباب کی توضیح اور تشریح کی جائے۔

الف: "جدال" اور "مراء" کیا ہیں؟

واضح رہے کہ "جدال"، "مراء" اور "مخاصمہ" تین ایسے الفاظ ہیں جن کا مفہوم ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے لیکن ان کا آپس

میں بہت فرق ہے[1]

"جدال" دراصل رسّی کو بل دینے اور لپیٹنے کے معنی میں ہے بعدازاں اس کا استعمال فریق مخالف کو بحث و گفتگو کے ذریعے اس پر غلبہ پانے کے مفہوم میں ہونے لگا۔

"مراء" (بروزن حجاب) ایسی چیز کے بارے میں گفتگو کے معنی میں آتا ہے جس میں "مریہ" یعنی شک پایا جاتا ہو۔

"خصومت" اور "مخاصمہ" دراصل دو آدمیوں کا ایک دوسرے کے گلے پڑ جانے اور ایک کا دوسرے کے پہلو کو پکڑنے کے معنی میں ہے۔ بعدازاں اس کا اطلاق زبانی کلامی لڑائی جھگڑے پر ہونے لگا۔

علامہ مجلسی مرحوم "بحار الانوار" فرماتے ہیں کہ "جدال" اور "مراء" کے الفاظ اکثر و بیشتر علمی مسائل کے بارے میں بولے جاتے ہیں جبکہ "مخاصمہ" کا اطلاق دنیاوی امور کے بارے میں ہوتا ہے۔

بعض لوگ "جدال" اور "مراء" میں یہ فرق بتاتے ہیں کہ "مراء" میں فضیلت اور کمال کا اظہار مقصود ہوتا ہے جبکہ "جدال" میں فریق مخالف کو حقیر اور عاجز کرنا مدِ نظر ہوتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ "جدال" علمی مسائل میں ہوتا ہے جب کہ "مراء" علمی اور غیر علمی دونوں کے لیے عام ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ "مراء" فریق مخالف کے حملوں کا دفاع کرنے کا نام ہے جبکہ "جدال" کا اطلاق مدافعانہ اور جارحانہ دونوں طرح کے حملوں پر ہوتا ہے[2]

ب۔ جدالِ حق اور جدالِ باطل

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس لفظ کے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر استعمال سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ "جدال" کا ایک وسیع مفہوم ہے اور فریقین کے درمیان ہونے والی ہر قسم کی گفتگو اس کے مفہوم میں شامل ہے خواہ وہ حق پر مبنی ہو یا باطل پر۔

چنانچہ سورۂ نحل کی آیت ۱۲۵ میں خداوند عالم اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وجادلهم بالتی هی احسن

آپ ان لوگوں کے ساتھ اچھے انداز سے گفتگو اور مجادلہ کریں۔

سورۂ ہود کی آیت ۷۴ میں حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ہے:

فلما ذهب عن ابراهیم الروع وجاءته البشری یجادلنا فی قوم لوط

جب ابراہیم سے خوف دور ہوا اور انہیں بیٹے کی ولادت کی خوشخبری مل چکی تو قومِ لوط کی سزا کے سلسلے میں ہم سے مجادلہ کرنے لگے۔

---

[1] یہ تینوں الفاظ "باب مفاعلہ" کا مصدر ہیں۔

[2] بحار الانوار جلد ۲، ص ۱۲۹۔

گویا ان کے مجادلات، مجادلۂ حق ہی کی ایک قسم تھے۔

لیکن قرآن مجید کے اکثر مقامات پر یہ لفظ جدالِ باطل کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ اسی سورہ (مومن) میں یہ لفظ پانچ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

بہرحال دوسروں کے ساتھ گفتگو میں بحث، استدلال اور مناقشہ سے اس لیے استفادہ کیا جائے کہ اس سے حق بات کی وضاحت اور جاہل و بے علم لوگوں کی ہدایت اور راہِ حق کی نشاندہی مقصود ہو تو یہ نہایت ہی پسندیدہ اور لائقِ قدر ہے بلکہ بعض مواقع پر واجب بھی ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید نے حق بات بیان کرنے اور حق کو ثابت کرنے کے لیے بحث و گفتگو کی ہرگز مخالفت نہیں کی بلکہ بہت سی آیات میں اس امر کی عملاً تائید بھی کی گئی ہے۔

بہت سے مقامات پر مخالفین سے برہان اور دلیل کا مطالبہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

هاتوا برهانكم

اپنا استدلال پیش کرو[1]

بہت سی جگہوں پر دلیل کے تقاضوں کے پیشِ نظر قرآن نے خود مختلف دلائل پیش کیے ہیں جیسا کہ سورۂ یٰس کے آخر میں ہم نے پڑھا ہے کہ جب وہ عرب پرانی اور بوسیدہ ہڈی ہاتھ میں لیے پیغمبر اسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا:

من يحي العظام وهي رميم

ان گلی سڑی ہڈیوں کو ازسرِنو کون زندہ کرے گا؟ (یٰس-۷۸)

تو اس کے جواب میں معاد کے مسئلے اور مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے بارے میں خدا کی قدرت پر کئی دلائل پیش کر دیئے گئے ہیں۔

اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۸ میں نمرود کے سامنے جناب ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو اور ان کے دندان شکن دلائل، سورۂ طٰہٰ کی آیات ۴۹ تا ۵۴ میں فرعون کے سامنے جناب موسیٰ علیہ السلام کا احتجاج بیان فرمایا گیا ہے جن سے مجادلۂ حق کے واضح نمونوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اسی طرح بت پرستوں، مشرکوں اور حیلے بہانے بنانے والوں کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختلف پُرمغز دلائل سے قرآن مجید چھلک رہا ہے۔

لیکن اس کے مقابلے میں بہت سے ایسے نمونوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ باطل کے پرستار اپنی بے بنیاد باتوں کو سچا ثابت کرنے کے لیے باطل مجادلات کا سہارا لیتے تھے اور حق کو باطل ثابت کرنے اور سادہ لوح عوام کو فریب دینے کے لیے فریب کاریوں، حیلوں اور بہانوں سے کام لیتے تھے۔ انبیائے الٰہی کے مقابلے میں گمراہ اور سرکش اقوام کے لیے مذاق، دھمکی، افترا پردازی اور بغیر دلیل کے انکار کر دینا تو معمولی کام تھا، جبکہ انبیائے خدا کا کام ہر دم محبت سے بھرپور منطقی دلائل پیش کرنا ہوتا تھا۔

اسلامی روایات میں بھی مخالفین کے سامنے پیغمبر اکرم اور ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام کے مباحث اور مناظرات بڑی تعداد میں

---

[1] بقرہ-۱۱۱، انبیاء-۲۴، نمل-۶۴ اور قصص-۷۵۔

ملتے ہیں کہ اگر ان سب کو جمع کر لیا جائے تو ایک بہت ضخیم کتاب بن جائے زیادہ یہ ہے کہ ان حضرات کے سب کے سب اور تمام مناظرے اور مباحثے حیطۂ تحریر میں نہیں لائے گئے)۔

نہ صرف یہ ذوات مقدسہ بلکہ ان کے اصحاب و انصار بھی انہی بزرگواروں کی حمایت و تائید کے ساتھ مخالفین سے مناظرے اور مباحثے کرتے رہے۔ البتہ اس کام کی اجازت صرف ایسے لوگوں کو دی جاتی جو ان باتوں کی کافی صلاحیت رکھتے تھے۔ کیونکہ اگر یہ چیز مدنظر نہ رکھی جائے تو بجائے اس کے کہ حق کو تقویت پہنچے الٹا اس کے کمزور ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اور مخالفین کی جرأت اور جسارت بڑھ جانے کا سبب ہوتا ہے۔

اسی لیے تو ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک دوست حمزہ بن محمد طیار کہتے ہیں کہ میں نے امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی :

بلغنی انک کرهت مناظرة الناس

مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ مخالفین کے ساتھ مناظرے کو ناپسند فرماتے ہیں ؟

تو امامؑ نے جواب میں فرمایا :

اما مثلك فلا یکره، من اذا طار یحسن ان یقع، و ان وقع یحسن ان یطیر، فمن کان هذا لا نکرهه

اگر تمھارے جیسے افراد ہوں تو ان کے لیے کوئی حرج نہیں ہے یعنی ایسے لوگوں کے لیے اجازت ہے جو پرواز کر کے بلندی تک پہنچ جائیں تو اچھے طریقے سے اترنا جانتے ہوں اور اگر بیٹھے ہوئے ہوں تو بخوبی پرواز کر کے بلندی تک پہنچ جائیں۔ تو ہم ایسے لوگوں کے مناظرہ کرنے کو ناپسند نہیں کرتے ہیں[1]

یہ خوبصورت تعبیر استدلال میں اوج کمال کو پہنچنے اور پھر بحث کو سمیٹنے اور اسے خاتمہ دینے کی صلاحیت کی طرف اشارہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میدان مناظرہ میں ایسے لوگوں کو قدم رکھنا چاہیے جن کا استدلالی مباحث پر مکمل تسلط اور ان پر پوری طرح عبور حاصل ہو۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان کی کمزوری کو ان کے مذہب کی کمزوری پر محمول کیا جائے۔

ج۔ مجادلۂ باطل کے غلط نتائج

یہ ٹھیک ہے کہ بحث و مباحثہ حل مشکلات کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہوگا جب بحث کے دونوں فریق طالب حق ہوں اور راہِ حقیقت کے متلاشی ہوں یا کم از کم اگر ایک فریق ہٹ دھرمی اور ضد بازی سے کام لے تو دوسرا فریق حق کے ثابت کرنے اور حقیقت تک پہنچنے کی فکر میں ہو۔ لیکن اگر ہر دو فریق خود غرضی، بالادستی اور صرف اپنی ہی بات منوانے کے لیے مجادلہ کریں تو حق سے دور ہو جانے، دل کے تاریک ہونے، لڑائی جھگڑوں اور کینوں کے بڑھ جانے کے سوا اور کوئی نتیجہ

---

[1] رجال کشی ص ۲۹۸۔

نہیں نکلے گا۔

اسی لیے اسلامی روایات میں "مراء" اور "باطل مجادلہ" سے روکا گیا ہے اور اس قسم کے مجادلات کے نقصانات کی طرف بھی انہی روایات میں معنی خیز اور لطیف اشارے ملتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

من ضن بعرضه فليدع المرآء

جسے اپنی عزت پیاری ہے اسے مجادلہ اور زبانی لڑائی جھگڑے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔[1]

کیونکہ اس قسم کی بحث مباحثوں سے بات بڑھ کر بے عزتی، توہین حتیٰ کہ گالی گلوچ رکیک اور ناروا تہمتوں تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں آپؑ ہی کا فرمان ہے کہ

اياكم والمرآء والخصومة فانهما يمرضان القلوب على الاخوان، وينبت عليهما النفاق

مجادلہ اور زبانی لڑائی جھگڑوں سے پرہیز کرو کیونکہ یہ دونوں چیزیں برادران دینی کے بارے میں دلوں کو بیمار کر دیتی ہیں اور نفاق کے بیج کو پودے کی صورت میں پروان چڑھاتی ہیں۔[2]

کیونکہ اس قسم کے لڑائی جھگڑے جو عموماً بحث و استدلال کے صحیح اصولوں سے عاری ہوتے ہیں لوگوں کے اندر ہٹ دھرمی، ضد بازی اور تعصب کی روح کو اس قدر تقویت پہنچاتے ہیں کہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے فریق پر غلبہ پانے کے لیے ہر قسم کے جھوٹ، فریب، تہمت اور ہتک عزت سے کام لیا جائے۔ جس کا نتیجہ کینہ پروری اور دلوں میں نفاق کا بیج بونے کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا۔

"جدال باطل" کا ایک اور بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ دونوں فریق اپنے انحراف، گمراہی اور غلط فہمی میں پہلے سے زیادہ سخت اور پختہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنے مقصود کے ثابت کرنے کے لیے ہر باطل دلیل کا سہارا لینا پڑتا ہے حتیٰ کہ اس کا مقابل اگر حق بات بھی کہے تو اسے ٹھکرا دیتا ہے یا اسے قبول ہی نہیں کرتا جو بذات خود غلطی اور گمراہی کی تقویت کا موجب ہے۔

د۔ مجادلۂ احسن کا طریقۂ کار:

جدال حق میں ہدف اور مقصد یہ نہیں ہوتا کہ فریق مخالف کی توہین کی جائے یا اس پر فوقیت اور برتری حاصل کی جائے بلکہ اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے افکار اور روح کی گہرائیوں پر تاثیر پیدا کی جائے اسی وجہ سے مجادلہ احسن کا طریقہ کار جدال باطل سے ہر لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔

اس موقع پر جدال کرنے والے شخص کو فریق مخالف کے اندر معنوی طور پر نفوذ اور رسوخ پیدا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار۔ کلمہ ۳۶۲۔

[2] "اصول کافی" جلد دوم (باب المراء والخصومۃ) حدیث ۱۔

وسائل سے کام لینا چاہیے جن کی طرف قرآن مجید میں بڑے پیارے انداز سے اشارے کئے گئے ہیں :

۱۔ اس کی یہ کوشش نہیں ہونی چاہیئے کہ فریق مخالف اس کی باتوں کو حق سمجھ کر قبول کرے بلکہ اگر ممکن ہو تو اسے یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ فریق ثانی اس کی باتوں کو اپنا نتیجہ فکر سمجھے تو نہایت ہی مؤثر بات ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں فریق مخالف یہ خیال کرے کہ یہ مطلب اور سوچ خود اس کے اندرونِ قلب سے اٹھی ہے اور اس کے اپنے غور و فکر کی پیداوار ہے تاکہ اسے مزید سوچنے اور سمجھنے کا موقع مل جائے۔

یہ جو قرآن مجید نے توحید اور شرک کی نفی جیسے اہم حقائق سے لے کر دوسرے تمام مسائل استفہام کے انداز میں پیش فرمائے ہیں مثلاً توحید کے دلائل بیان کرنے کے بعد قرآن فرماتا ہے :

ء الٰہ مع اللہ

آیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے (نمل ۔ ۶۰)

اس کی اصل وجہ شاید یہی ہے۔

۲۔ ہر اس چیز سے پرہیز کرنا چاہیئے جس سے فریقِ مخالف کے جذبات مجروح ہوتے ہوں اور اس سے اس کی ہٹ دھرمی بڑھ جاتی ہو، قرآن کہتا ہے :

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ

وہ لوگ خدا کے بجائے جن معبودوں کو پکارتے ہیں انہیں برا بھلا نہ کہو۔ (انعام ۔ ۱۰۸)

مبادا وہ بھی ضد میں آکر خداوند بزرگ و برتر کو برا بھلا کہنا شروع کر دیں۔

۳۔ ہر فرد یا گروہ کے مقابلے میں بحث و مباحثہ کرتے وقت انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے تاکہ فریق مخالف کو اس بات کا احساس ہو کہ بحث کرنے والا صحیح معنوں میں حقائق سے پردہ اٹھانا چاہتا ہے۔ بطور مثال جب قرآن مجید شراب اور جوا کے نقصانات بیان کرتا ہے تو اس کے جزوی مادی اور اقتصادی منافع کو بھی بیان کرتا ہے جو کچھ لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ فرماتا ہے :

قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما

کہہ دیجئے شراب اور جوئے میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فوائد بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔ (بقرہ ۔ ۲۱۹)

اس طرح کی طرزِ گفتگو سننے والے کے دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔

۴۔ بُری اور ناخوشگوار باتوں کا اسی انداز میں جواب نہ دے۔ بلکہ محبت، نرمی اور درگزر سے کام لے اس طرح کے طرزِ عمل سے ہٹ دھرم اور ضدی مزاج دشمنوں کے دل نرم کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے :

ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم

بہترین طریقے سے برائیوں کو دور کر دو کیونکہ اس طرح تمہاری جس شخص سے دشمنی ہے اس قدر نرم ہو جائے گا

گویا وہ تمہارا ایک پکا دوست ہے۔ (حٰم السجدہ۔۳۴)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب ہم قرآن مجید میں بیان شدہ انبیاء کی اپنے جابر اور سرکش دشمنوں کے ساتھ اندازِ گفتگو کو ملاحظہ کرتے ہیں یا پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی اپنے دشمنوں سے عقیدتی مباحث کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سلسلے میں ہمیں نہایت ہی قیمتی سبق ملتے ہیں جو بہت اہم نفسیاتی مسائل کو احسن انداز میں حل کر رہے ہوتے ہیں اور ان سے دوسروں کے دلوں تک پہنچنے کی راہ صاف اور ہموار ہوتی ہے۔

خاص کر اس سلسلے میں علامہ مجلسیؒ نے ایک مفصل روایت نقل کی ہے جس میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس طویل مناظر کا تذکرہ ہے جو آپ نے عرب کے یہودیوں، نصرانیوں دہریوں، ثنویوں (دوگانہ پرستوں) اور مشرکوں کے ساتھ کیا تھا۔ آنحضرتؐ کا یہ مناظرہ ایسے احسن اور پیارے انداز میں تھا کہ دشمنوں کے لیے تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ یہ ایک ایسا سبق آموز مناظرہ ہے جو ہمارے مناظروں کے لیے نمونہ عمل بن سکتا ہے[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۹ ص ۲۵۷ کے بعد کے صفحات ملاحظہ ہوں۔

۷۔ اَلَّذِیۡنَ یَحۡمِلُوۡنَ الۡعَرۡشَ وَ مَنۡ حَوۡلَہٗ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ رَبَّنَا وَسِعۡتَ کُلَّ شَیۡءٍ رَّحۡمَۃً وَّ عِلۡمًا فَاغۡفِرۡ لِلَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اتَّبَعُوۡا سَبِیۡلَکَ وَ قِہِمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ ○

۸۔ رَبَّنَا وَ اَدۡخِلۡہُمۡ جَنّٰتِ عَدۡنِ ِۣ الَّتِیۡ وَعَدۡتَّہُمۡ وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَ اَزۡوَاجِہِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِہِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ○ۙ

۹۔ وَ قِہِمُ السَّیِّاٰتِ ؕ وَ مَنۡ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمۡتَہٗ ؕ وَ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ○ ع

ترجمہ

۷۔ جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے اردگرد (طواف کر رہے) ہیں وہ خدا کی تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنین کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں پروردگارا! تیری رحمت اور علم سب چیزوں پر حاوی ہیں۔ توان لوگوں کی مغفرت فرما جنھوں نے توبہ کی اور تیرے راستے پر چلے اور تو انہیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

۸۔ (وہ عرض کرتے ہیں) پروردگارا! تو انہیں بہشت برین کے باغوں میں داخل فرما جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا تھا اور اسی طرح ان کے نیک آباء واجداد، ازواج اور اولاد سے کیونکہ تو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔

۹۔ اور انہیں برائیوں سے بچا، جسے تُو نے برائیوں سے بچا لیا اسے اپنی رحمت میں شامل فرما لیا اور یہی تو عظیم کامیابی ہے۔

تفسیر

حاملانِ عرش ہمیشہ مؤمنین کے لیے دعا گو ہیں:

گزشتہ آیات کے تیور بتاتے ہیں کہ یہ اس وقت نازل ہوئی تھیں جب مسلمان اقلیت میں تھے اور محرومی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کے دشمن طاقت، تسلط اور وافر وسائل کے لحاظ سے عروج پر تھے۔

ان آیات کے بعد زیر نظر آیات درحقیقت اس لیے نازل ہوئیں تاکہ سچے مؤمنین کو اس بات کی خوشخبری سنائیں کہ وہ ہرگز تنہا نہیں ہیں اور نہ ہی وہ خود کو تنہا محسوس کریں کیونکہ عرش الٰہی کے حامل خدا کے مقرب ترین اور عظیم ترین فرشتے ان کے ہم صدا، دوست اور طرفدار ہیں اور ہمیشہ ان کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔ اس دنیا میں بھی اور اس جہان میں ہمیشہ ان کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں یہی چیز زمانۂ ماضی کے مؤمنین کی طرح زمانۂ حال اور آئندہ زمانے کے مؤمنین کے لیے تسلی خاطر اور دلجمعی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

فرمایا گیا ہے: جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ فرشتے جو عرش کے اردگرد رہتے ہیں خدا کی تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں، اسی پر ایمان رکھتے ہیں اور مؤمنین کے لیے استغفار کرتے ہیں (الذین یحملون العرش ومن حولہ یسبحون بحمد ربھم ویؤمنون بہ ویستغفرون للذین اٰمنوا)۔

وہ اپنی باتوں میں کہتے ہیں، پروردگارا! تیری رحمت اور تیرا علم سب چیزوں پر حاوی ہے (تو اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر ہے اور ان کی بابت رحیم بھی ہے) خداوندا! ان لوگوں کو بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ کو اختیار کیا انہیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھ (ربنا وسعت کل شیء رحمۃ وعلمًا فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلک وقھم عذاب الجحیم)۔

یہ گفتگو مؤمنین کو اس بات کی طرف متوجہ کر رہی ہے کہ صرف تم ہی عبادتِ خدا اور اس کی حمد و تسبیح بجا نہیں لاتے، تم سے پہلے خدا کے مقرب ترین فرشتے یعنی حاملانِ عرش اور اس کا طواف کرنے والے فرشتے اس کی حمد و تسبیح بجا لا رہے ہیں۔

ساتھ ہی کفار کو بھی تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ اس کے نزدیک ایک جیسی بات ہے کیونکہ اسے کسی کے ایمان کی ضرورت نہیں اس قدر فرشتے اسکی حمد و تسبیح بجالاتے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اس کے باوجود کہ اسے کسی کی حمد و ثنا بجا لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ان سب چیزوں سے بے نیاز برتر اور بالاتر ہے۔

ساتھ ہی مؤمنین کو یہ خبر بھی دی جا رہی ہے کہ تم اس دنیا میں اکیلے نہیں ہو ــــ اگرچہ بظاہر اس ماحول میں تم اقلیت میں ہو ــــ کائنات کی طاقتور ترین غیبی طاقتیں اور حاملینِ عرش تمہارے حامی اور دعا گو ہیں جو ہمیشہ خدا سے یہی دعا کرتے رہتے ہیں کہ تمھیں اپنے عفو اور رحمتوں میں شامل فرمائے، تمھارے گناہوں کو معاف کر دے اور تمھیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے۔

اس آیت میں ایک بار پھر "عرش" کا ذکر ملتا ہے اور حاملینِ عرش اور ان فرشتوں کی دعاؤں کی بات ہو رہی ہے جو عرش کے اردگرد رہتے ہیں اگرچہ مختلف سورتوں کی تفسیر کے سلسلے میں ہم اس موضوع پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں [1] پھر بھی چند اہم نکات کی بحث میں ہم اس کی کچھ اور تشریح کریں گے۔

مؤمنین کے بارے میں حاملینِ عرش کی دعاؤں کا سلسلہ بعد والی آیت میں بھی ملتا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے: خداوندا! جس بہشت برین کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اس میں انہیں داخل فرما (ربنا وادخلھم جنات عدن التی وعدتھم)۔

اور اسی طرح ان کے نیک آباؤ اجداد، ازواج اور اولاد کو بھی (ومن صلح من اٰبائھم وازواجھم و ذریاتھم) [2] کیونکہ تو ہر چیز پر غالب ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے (انک انت العزیز الحکیم)۔

یہ آیت جو "ربنا" سے شروع ہوئی ہے حاملانِ عرش اور مقربانِ الٰہی کی عاجزانہ اور ملتمسانہ درخواست ہے جو وہ اپنے پروردگار کے لطف و کرم کے حصول کے لیے ایک مرتبہ پھر اس کے مقامِ ربوبیت کا سہارا لے کر مؤمنین کے لیے نہ صرف دوزخ سے نجات کی درخواست کرتے ہیں بلکہ ان کے بہشت کے باغ بریں میں داخل ہونے کی التجا بھی کرتے ہیں۔ نہ صرف ان کی اپنی ذات کے لیے بلکہ ان کے آباؤ اجداد، ازواج اور اولاد کے لیے بھی جو ان کے ہم مسلک اور ہم گام ہیں اور اس کی عزت و قدرت جیسی صفات کے واسطے سے یہ دعا مانگ رہے ہیں۔

ان آیات میں جس وعدہ کی طرف اشارہ ہوا ہے اس سے مراد وہی وعدہ ہے جو خدا نے اپنے نبیوں کے ذریعے لوگوں سے کیا ہے۔

مؤمنین کی دو حصوں میں تقسیم سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ کچھ مؤمنین کا شمار تو صفِ اول میں ہوتا ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو فرامین الٰہی کے بجالانے میں پوری کوشش کرتے ہیں اور کچھ کا شمار اس صف میں نہیں ہوتا اور یہ وہ لوگ ہیں جو پہلے گروہ کی طرف نسبت رکھتے ہیں اور اس کی کسی حد تک پیروی کی وجہ سے فرشتوں کی دعاؤں میں شامل ہیں۔

پھر یہ فرشتے مؤمنین کے بارے میں اپنی چوتھی دعا میں کہتے ہیں، تو انہیں برائیوں سے محفوظ رکھ کیونکہ جنہیں تو اس دن کی برائیوں سے محفوظ رکھے گا وہی تیری رحمت میں شامل ہوں گے (وقھم السیئات ومن تق السیئات یومئذ فقد رحمتہ)۔

آخر کار وہ اپنی دعا اس جملہ پر ختم کرتے ہیں: اور یہ ہے عظیم کامیابی (وذالک ھو الفوز العظیم)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہو سکتی ہے کہ انسان کے گناہ بخش دیئے جائیں، عذاب اور برائیاں اس سے دور کر دی جائیں، وہ رحمتِ الٰہی میں شامل ہو جائے، بہشت بریں میں داخل ہو جائے اور اس کے تعلق دار اور قریبی رشتہ دار بھی اس سے جا ملیں۔

---

[1] تفصیل تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد، سورہ اعراف کی آیت ۵۴ کے ذیل میں، پانچویں جلد، سورہ ہود کی آیت ۷ کے ذیل میں اور پہلی جلد سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۵ کے ذیل میں تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

[2] "ومن صلح" کا جملہ "وادخلھم" کے جملے کی ضمیر پر معطوف ہے۔

چند اہم نکات

١۔ حاملینِ عرش کی چار دعائیں: یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ ان چار دعاؤں کا آپس میں کیا فرق ہے؟ آیا ان میں سے بعض دعاؤں کا تکرار نہیں ہے؟

لیکن اگر تھوڑا سا غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر دعا ایک علیحدہ مطلب پر دلالت کر رہی ہے۔ سب سے پہلے وہ مومنین کے لیے بخشش اور گناہوں کے آثار مٹا دیئے جانے کی درخواست کرتے ہیں۔

یہ بات جہاں پر ہر عظیم نعمت تک پہنچنے کا مقدمہ ہے وہاں پر خود بھی ایک مطلوب اور پسندیدہ بات ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا مہربانی ہو سکتی ہے کہ انسان خود کو پاک و پاکیزہ محسوس کرے۔ اس کا خدا اس سے راضی ہو اور وہ اپنے خدا سے راضی ہو؟ جی ہاں بہشت اور دوزخ کے موضوع سے ہٹ کر بھی خدا کے بندوں کے لیے یہ احساس نہایت قابلِ فخر اور بہت ہی باعظمت احساس ہے

دوسرے مرحلے پر فرشتے انہیں جہنم سے دور رکھنے کی درخواست کرتے ہیں اور یہ بھی بذاتِ خود ان کی روحانی تسکین کا ایک بہترین اور اہم ترین ذریعہ ہے۔

تیسرے مرحلے پر بہشت کے حصول کی درخواست کرتے ہیں نہ صرف خود ان مومنین کے لیے بلکہ ان کے عزیز و اقارب کے لیے بھی کہ جن کا وجود مومنین کی روحانی تسکین اور قلبی مسرت کا سبب ہوتا ہے۔

نیز چونکہ جہنم کے علاوہ عرصۂ محشر میں اور بھی کئی قسم کی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا ہوگا جیسے محشر کا ہولناک منظر، تمام مخلوق کے سامنے رسوائی، لمبی مدت کا حساب و کتاب وغیرہ تو وہ اپنی ایک اور دعا میں خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ مومنین کو اس دن کی ہر قسم کی ناخوشگواری اور رسوائیوں سے دور رکھے تاکہ وہ مکمل سکون، اطمینان، عزت اور احترام کے ساتھ بہشت بریں میں داخل ہو جائیں۔

٢۔ دعا کیسے کی جائے؟: ان آیات میں حاملینِ عرش، مومنین کو دعا کرنے کے آداب بتاتے ہیں چنانچہ سب سے پہلے خداوند ذوالجلال کے نام سے متمسک ہونے کا درس دیتے ہیں (ربنا)۔

پھر اسے جلال اور جمال کی صفات سے متصف کرتے ہیں اور اس کی بے پایاں رحمت اور ناپیدا کنار علم سے مدد حاصل کرنے کا سبق دیتے ہیں (وسعت کل شیء رحمة وعلمًا)۔

اور آخر میں دعا کرنے اور مسائل کو اہمیت کے پیش نظر ترتیب کے ساتھ بیان کرنے اور ان شرائط کو دعا کے ساتھ ملانے کا درس دیتے ہیں جو قبولیتِ دعا کا سبب بنتے ہیں (فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلك)۔

پھر دعا کو خدا کی جلالی اور جمالی صفات کا ذکر کر کے ختم کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس دعا میں حاملینِ عرش نے اوصافِ الٰہی میں سے پانچ بہترین اور اہم ترین صفات کا انتخاب کیا ہے خدا کی ربوبیت، رحمت، قدرت، علم اور حکمت۔

٣۔ دعاؤں کا آغاز "ربنا" سے کیوں؟: آیاتِ قرآنی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ "اولیاء اللہ" خواہ وہ انبیاء ہوں

یا فرشتے اور خدا کے نیک اور صالح بندے دعا کرتے وقت اپنی گفتگو کا آغاز "ربنا" یا "ربی" سے کیا کرتے تھے۔ چنانچہ

حضرت آدم علیہ السلام عرض کرتے ہیں:

ربنا ظلمنا انفسنا

پروردگارا! میں نے اور میری بیوی نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے (اعراف۔۲۳)۔

حضرت نوح علیہ السلام عرض کرتے ہیں:

رب اغفرلی ولوالدی

اے میرے رب! میری اور میرے ماں باپ کی مغفرت فرما (نوح۔۲۸)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں:

ربنا اغفرلی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب

اے ہمارے پروردگار! میری اور میرے ماں باپ اور مومنین کی اس دن مغفرت فرما جس دن حساب برپا ہوگا۔ (ابراہیم۔۴۱)

حضرت یوسف علیہ السلام عرض کرتے ہیں:

رب قد اٰتیتنی من الملک

"اے میرے پروردگار تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی ہے۔ (یوسف۔۱۰۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام عرض کرتے ہیں:

رب بما انعمت علی فلن اکون ظهیرًا للمجرمین

اے میرے پروردگار! چونکہ تو نے مجھے نعمتیں عطا کی ہیں لہٰذا مجرمین کی پشت پناہی نہیں کروں گا۔ (قصص۔۱۷)

حضرت سلیمان علیہ السلام کہتے ہیں:

رب اغفرلی وھب لی ملکًا لا ینبغی لاحد من بعدی

خداوندا! مجھے بخش دے اور ایسی حکومت عطا فرما کہ جو میرے بعد کسی اور شخص کے لائق نہ ہو۔ (ص۔۳۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کرتے ہیں:

ربنا انزل علینا مائدة من السمآء

پروردگارا! ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما۔ (مائدہ۔۱۱۴)

حضرت خاتم الانبیاء پیغمبر عظیم الشان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرض کرتے ہیں:

رب اعوذ بك من همزات الشياطين

پروردگارا! اس شیطانی وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ (مؤمنون۔۹۷)

سورۂ آلِ عمران کی آخری آیات کے مطابق مومنین اس جملے کو بار بار دہراتے ہیں جن میں سے ایک حصہ یہ بھی ہے:

ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا

پروردگارا! ان بڑے بڑے آسمانوں اور چوڑی چکلی زمین کو تو نے بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔

ان تعبیرات سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ بہترین دعا وہ ہے جو ربوبیت پروردگار کے ذکر سے شروع ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ "اللہ" کا مبارک نام خدا کے تمام ناموں کا جامع ہے لیکن چونکہ اس کی مہربان ذات سے دعا کا رابطہ ربوبیت کے مسئلے سے مناسب رکھتا ہے لہٰذا یہ دوسرے تمام ناموں سے زیادہ مناسب اور شایان شان ہے اور ربوبیت بھی ایسی جو خداوند کریم کی طرف سے انسان کے ابتدائی لمحات سے شروع ہو کر اس کی زندگی کے آخری لمحے بلکہ اس کے بعد بھی اسے اپنے زیر سایہ لیے رہتی ہے اور اسے الطاف الٰہی میں غرق رکھتی ہے۔[1]

۲۔ عرش کیا ہے؟ : ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ ہمارے یہ الفاظ جو ہماری محدود و ناچیز زندگی کی کیفیت بیان کرنے کے لیے وضع کیسے گئے وہ خداوند جل وعلا کی عظمت تو بجائے خود اس کی عظیم مخلوق کی عظمت کو بھی بیان نہیں کرسکتے یہی وجہ ہے کہ ہم ان الفاظ کے کنایہ پر مبنی معانی سے استفادہ کرتے ہوئے اس دھندلکے سے اس عظمت کو کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں

ان الفاظ میں سے ایک "عرش" بھی ہے، جس کا لغوی معنی "چھت" یا "لمبی ٹانگوں والا تخت" ہے جو کرسی کے مقابلے میں آتا ہے کیونکہ اس کی ٹانگیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ پھر یہ لفظ قدرت خدا کے تخت کے بارے میں "عرش پروردگار" کے نام سے بولا جانے لگا۔

عرش خداوندی سے کیا مراد ہے اور یہ کہ کس معنی کے لیے کنایہ ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین، محدثین اور فلاسفہ کے مختلف نظریات ہیں۔

بعض نے اس کا معنی "خداوند عالم کا بے انتہا علم" سمجھا ہے۔

بعض نے "خدا کی مالکیت اور حاکمیت" کا معنی بتایا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد خدا کی کمالی اور جلالی صفات ہیں کیونکہ ہر ایک صفت اس کے مقام کی عظمت کو بیان کرتی ہے، جیسا کہ بادشاہوں کے تخت ان کی عظمت کی نشانی سمجھے جاتے ہیں۔

جی ہاں! خداوند عالم عرش علم، عرش قدرت، عرش رحمانیت اور عرش رحیمیت کا مالک ہے۔

مندرجہ بالا تینوں تفاسیر کی رو سے "عرش" کا مفہوم پروردگار عالم کی صفات کی طرف لوٹ جاتا ہے نہ کہ کسی اور خارجی وجود کی طرف۔

بعض روایات جو اہل بیت اطہار کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی اسی بات کی تائید کرتی ہیں جیسا کہ "حفص بن غیاث" بیان کرتے ہیں:

"کسی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے "وسع کرسیہ السماوات والارض" کی تفسیر کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

---

[1] "تفسیر کبیر" از فخر رازی۔ اسی آیت میں۔

اس سے مراد خدا کا علم ہے"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام ہی سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"عرش" سے مراد خدا کا وہ علم ہے جس سے اس نے انبیاء کو واقف کیا اور "کرسی" سے مراد وہ علم ہے جس سے کسی کو بھی آگاہ نہیں کیا"۔[2]

جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے کچھ اور روایات سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "عرش" اور "کرسی" خلاق عالم کی دو عظیم مخلوقات ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ عرش سے مراد مجموعۂ کائنات ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ زمین و آسمان مجموعی طور پر کرسی کے اندر موجود ہیں بلکہ زمین و آسمان کرسی کے سامنے ایسے ہیں جیسے صحرائے اعظم میں ایک عدد انگشتری اور کرسی عرش کے سامنے ایسے ہے جیسے اس انگشتری کے سامنے زمین و آسمان۔

کبھی "عرش" کا اطلاق انبیاء، اوصیاء اور کامل مؤمنین کے دلوں پر کیا گیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ

ان قلب المؤمن عرش الرحمٰن

مؤمن کا دل خدا کا عرشِ عظیم ہے۔[3]

نیز حدیث قدسی میں آیا ہے:

لم یسعنی سمائی ولا ارضی و وسعنی قلب عبدی المؤمن

میرے آسمان و زمین مجھے اپنے اندر نہیں سما سکتے لیکن میرے مومن بندے کا دل میرا ٹھکانا ہے۔[4]

لیکن معنی عرش کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے ـــ جہاں تک انسانی بس کی بات ہے ـــ بہترین طریقہ کار یہ ہے کہ قرآن میں اس کے استعمال کے مقامات کا اچھی طرح سے جائزہ لیں۔

قرآن پاک کی بہت سی آیات میں یہ تعبیر دیکھنے میں آتی ہے:

ثم استوٰی علی العرش

خداوند عالم (تخلیق کائنات کے بعد) عرش پر مسلط ہو گیا۔[5]

اس سلسلے کی بعض آیات کے فوراً بعد "یدبر الامر" کا جملہ ملتا ہے یا ایسی تعبیریں جو خداوند عالم کے علم و تدبیر پر دلالت کرتی ہیں۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۵۸ ص ۲۸ (حدیث ۴۶، ۴۷)۔

[2] بحار الانوار جلد ۵۸ ص ۲۸ (حدیث ۴۶، ۴۷)۔

[3] بحار الانوار جلد ۵۸ ص ۳۹۔

[4] بحار الانوار جلد ۵۸ ص ۳۹۔

[5] سورہ اعراف / ۵۴۔ سورہ یونس / ۳۔ سورہ رعد / ۲۔ سورہ فرقان / ۵۹۔ سورہ سجدہ / ۴۔ اور سورہ حدید / ۴

کچھ اور آیات میں "عرش" کی صفت بھی بیان کی گئی ہے جیسے سورۂ توبہ کی آیت ۱۲۹ میں: و ھو رب العرش العظیم

کچھ آیات میں حاملینِ عرش کا ذکر ہے۔ جیسے یہی آیت جس کی ہم تفسیر کر رہے ہیں۔

کچھ آیات میں ان ملائکہ کا تذکرہ ہے جو عرش کے اردگرد رہتے ہیں جیسے

و تری الملائکۃ حافین من حول العرش (زمر۔ ۷۵)

کہیں پر فرمایا گیا ہے:

وکان عرشہ علی المآء

ان تعبیروں سے اور ان کے علاوہ دوسری تعبیروں سے جو اسلامی روایات میں وارد ہوئی ہیں یہ نتیجہ بخوبی نکالا جاسکتا ہے کہ عرش کے لفظ کا مختلف معانی پر اطلاق ہوتا ہے ہر چند کہ ان سب کی بنیاد ایک ہے۔

"عرش" کا ایک معنی تو وہی "حکومت، مالکیت اور کائنات کا نظام چلانا" ہے۔ کیونکہ عام طور پر معمولی گفتگو میں بھی عرش کا لفظ کسی صاحب اقتدار کے اپنے ملک پر مکمل کنٹرول کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً عام طور پر کہتے ہیں "فلان ثل عرشہ" جو اس بات کا کنایہ ہے کہ "اس کا راج سنگھاسن ڈول گیا۔

فارسی میں بھی کہا جاتا ہے:

"پایہ ہای تخت اور ہم شکست"۔

اس کے تخت کے پائے ٹوٹ گئے ہیں۔

عرش کا ایک اور معنی "پوری کائنات" ہے۔ کیونکہ تمام کائنات ہی اس کی عظمت کی نشانی ہے۔

کبھی "عرش" کا اطلاق "عالم بالا" پر اور "کرسی" کا "عالم زیریں" پر ہوتا ہے۔

بعض اوقات "عالم ماوراءِ طبیعت" کو "عرش" کہتے ہیں اور عالم مادی خواہ زمین اور آسمان ہوں سب کو "کرسی" کہتے ہیں، جیسا کہ "آیت الکرسی" میں آیا ہے:

وسع کرسیہ السماوات والارض

نیز چونکہ خدا کی معلومات اور مخلوقات اس کی پاک ذات سے جدا نہیں ہیں لہٰذا کبھی "علم الٰہی" پر بھی "عرش" کا اطلاق ہوا ہے۔

اگر مومن بندوں کے پاک و پاکیزہ دل کو "عرش الرحمان" کہا گیا ہے تو اس لئے کہ وہ اس کی پاک ذات کی معرفت کا مقام اور اس کی عظمت اور قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

بنابریں یہ قرائن سے ہی سمجھا جائے گا کہ کون سا معنی کس موقع پر مراد لیا جاسکتا ہے؟ لیکن یہ بات بھی بہر حال اپنے مقام پر مسلم ہے کہ معنی خواہ کوئی مراد لیا جائے عرش کا لفظ خداوند ذوالجلال کی بزرگی اور عظمت کو ہی بیان کرے گا۔

جس آیت کی ہم تفسیر کر رہے ہیں اس میں حاملینِ عرش کا تذکرہ ہے ممکن ہے یہاں پر عرش سے مراد خداوند عالم کی

حکومت اور نظمِ کائنات کو چلانا ہو اور حاملینِ عرش سے مراد اس کی حاکمیت اور تدبیرِ عالم کے نافذ کرنے والے ہوں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد تمام کائنات ہو یا پھر "عالم ماورا طبیعت" ہو اور اس کے حامل وہ فرشتے ہوں جو اس کائنات کی تدبیر کے ستونوں کو بحکم خدا اپنی دوش پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

۱۰۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُنَادَوۡنَ لَمَقۡتُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ مِنۡ مَّقۡتِکُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ اِذۡ تُدۡعَوۡنَ اِلَی الۡاِیۡمَانِ فَتَکۡفُرُوۡنَ ○

۱۱۔ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ وَ اَحۡیَیۡتَنَا اثۡنَتَیۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَہَلۡ اِلٰی خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ○

۱۲۔ ذٰلِکُمۡ بِاَنَّہٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰہُ وَحۡدَہٗ کَفَرۡتُمۡ ۚ وَ اِنۡ یُّشۡرَکۡ بِہٖ تُؤۡمِنُوۡا ؕ فَالۡحُکۡمُ لِلّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡکَبِیۡرِ ○

ترجمہ

۱۰۔ جو لوگ کافر ہو چکے ہیں انہیں بروز قیامت آواز دی جائے گی کہ تمھارے بارے میں تمھاری اپنی عداوت اور غصّے کی نسبت خداوند عالم کی عداوت اور غصہ زیادہ ہے۔ کیونکہ تم ایمان کی طرف بلائے جاتے تھے، لیکن تم انکار کرتے تھے۔

۱۱۔ وہ کہیں گے: پروردگارا! تو نے ہمیں دوبار مارا اور دو مرتبہ زندہ کیا ہے، اب ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا ہے۔ آیا (دوزخ سے) نکلنے کا کوئی راستہ موجود ہے؟

۱۲۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ جب اکیلے خدا کو پکارا جاتا تو تم انکار کرتے تھے اور اگر کسی کو اس کا شریک ٹھہرایا جاتا تو تم اس پر ایمان لے آتے تھے۔ اب فیصلہ خدا کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے جو بلند مرتبہ اور بزرگ ہے (اور وہ تمھیں اپنی حکمت کے مطابق سزا دے گا)۔

تفسیر

گناہوں کا اعتراف لیکن کب؟

گزشتہ آیات میں مومنین کے "رحمت الٰہی" میں شامل ہونے کی بات ہو رہی تھی۔ زیر نظر آیات میں بے ایمان لوگوں پر "غضب الٰہی" کی گفتگو ہو رہی ہے تاکہ دونوں فریقوں کا تقابل کر کے گفتگو کو مزید واضح کر دیا جائے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: جو لوگ کافر ہو چکے ہیں انہیں بروز قیامت آواز دی جائے گی کہ تمہارے بارے میں تمہاری اپنی عداوت اور غصے کی نسبت خداوند عالم کی عداوت اور غصہ زیادہ ہے کیونکہ تم ایمان کی طرف بلائے جاتے تھے لیکن تم کفر کا رستہ اختیار کرتے تھے (ان الذین کفروا ینادون لمقت اللہ اکبر من مقتکم انفسکم اذ تدعون الی الایمان فتکفرون)۔

ان کفار کو یہ آواز کون دے گا؟ ظاہر ہے کہ ان کو لعنت ملامت، سرزنش اور رسوا کرنے کے لیے عذاب کے فرشتے ہی ایسی آواز دیں گے جبکہ رحمت کے فرشتے ہمیشہ مومن اور صالح لوگوں کی عزت واحترام کے لیے کمربستہ نظر آئیں گے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آواز خود ان کفار کی ہو جو دوسرے کفار کو دیں گے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بہرصورت کفار یہ آواز ضرور سنیں گے خواہ وہ کسی کی طرف سے ہو اور بعد کی آیات اس معنی پر واضح طور پر گواہی دے رہی ہیں۔

لغوی طور پر "مقت" کا معنی بغض اور زبردست عداوت ہے، یہ آیت بتا رہی ہے کہ بے ایمان لوگ جس قدر اپنے بارے میں سخت اور زبردست عداوت پیدا کرتے جائیں گے خداوند قہار کا غضب بھی ان کے بارے میں اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنے بارے میں کافر لوگوں کی عداوت اور غصہ سے کیا مراد ہے؟ تو یہاں پر دو تفسیریں ملتی ہیں۔

ایک یہ کہ ان لوگوں نے اپنے بارے میں بہت بڑی دشمنی کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ وہ منادیان توحید اور پیامبران الٰہی کی باتوں کو ٹھکراتے اور جھٹلاتے رہے ہدایت الٰہی کے چراغوں سے منہ ہی نہیں پھیرا انہیں گل بھی کرتے رہے تو کیا انسان کی اپنی ذات کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی اور دشمنی ہو سکتی ہے کہ خواہشات نفسانی کی پیروی کرتے ہوئے اور چند روزہ مادی مفاد کے لیے سعادت ابدی کی راہیں ہمیشہ کے لیے اپنے لیے بند کر دے اور دائمی عذاب کے دروازے اپنے لیے کھول دے؟

اس تفسیر کے مطابق درحقیقت "اذ تدعون الی الایمان فتکفرون" (اس وقت تمہیں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم انکار کیا کرتے تھے) کا جملہ ان کی اپنی ذات کے ساتھ عداوت اور غصے کی کیفیت بیان کر رہا ہے۔

دوسری یہ کہ ان کی اپنی ذات کے ساتھ دشمنی اور غصے سے مراد قیامت کے دن کی دشمنی ہے۔ کیونکہ جب وہ وہاں پر اپنا انجام دیکھیں گے تو سخت پشیمان اور پریشان ہوں گے، ان کی چیخ وپکار بلند ہوگی زبردست غصے کی وجہ سے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹیں گے۔

ویوم یعض الظالم علی یدیہ (فرقان۔ ۲۷)۔

آرزو کریں گے کہ :

یالیتنی کنت ترابًا

"اے کاش کہ خاک ہوتے" (نباء۔ ۴۰)

زبردست تکلیف کی وجہ سے پیچ و تاب کھائیں گے اور چونکہ فبصرك الیوم حدید (ق۔ ۲۲) کے پیش نظر چشم بینا حاصل کر چکے ہوں گے، یوم تبلی السرائر (طارق۔ ۹) کے پیش نظر تمام اندرونی بھید منظر عام پر آچکے ہوں گے "واذا الصحف نشرت" (تکویر۔ ۱۰) کے پیش نظر ہر ایک کا نامہ اعمال ظاہر ہو چکا ہوگا "کفیٰ بنفسك الیوم علیك حسیبًا" (بنی اسرائیل۔ ۱۴) کے پیش نظر ہر انسان اپنا حساب آپ کرنے کے لیے بلایا جا چکا ہوگا اور خود ہی اپنے خلاف فیصلہ دے گا اور اپنے آپ سے بالکل متنفر ہو کر راہِ فرار اختیار کرے گا۔

اسی موقع پر انہیں آواز دی جائے گی :

"تم پر خدا کی دشمنی اور غضب اس سے بھی زیادہ ہے کیونکہ راہ حق کی طرف بلانے والے اللہ کے پیغمبر تمہیں ایمان کی دعوت دیتے تھے لیکن تم کفر کی راہ اختیار کرتے تھے اور اسی پر گامزن رہتے تھے"

اس تفسیر کے مطابق اذ تدعون الی الایمان فتکفرون کا جملہ ان کے بارے میں غضبِ خدا کی عظمت کی دلیل بن رہا ہے[1]

دونوں تفاسیر مناسب ہیں لیکن پہلی تفسیر کئی لحاظ سے زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

بہر صورت، حالات خواہ کیسے ہی ہوں گناہ گار لوگ قیامت کی صورتِ حال اور اپنے بارے میں غضبِ الٰہی کو مشاہدہ کرنے کے بعد ایک لمبے خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائیں گے اور اس کے لیے چارۂ کار کی فکر میں لگ جائیں گے اور کہیں گے "پروردگارا! تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا اور دو مرتبہ زندہ کیا ہے اور ہم نے موت و حیات کے ان مراحل میں بہت کچھ سیکھ لیا ہے اب ہم گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں آیا (دوزخ سے) باہر جانے (اور دنیا میں واپس جا کر ان گناہوں کی تلافی کرنے) کا کوئی راستہ ہے؟" (قالوا ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین فاعترفنا بذنوبنا فهل الی خروج من سبیل)۔

جی ہاں! اب غفلت کے پردے آنکھوں سے ہٹیں گے اور انسان کی حقیقت بین نگاہیں کھلیں گی لہٰذا اعتراف گناہ کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہوگا۔

کفار اس دنیا میں معاد (اور قیامت) کا سخت انکار کیا کرتے تھے اور اس بارے میں انبیاء عظام علیہم السلام کا مذاق اڑایا کرتے

---

[1] پہلی تفسیر کے مطابق "اذ" "ظرفیہ" ہے اور "مقتکم انفسکم" سے متعلق ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق "اذ" "تعلیلیہ" ہے اور "مقت اللہ" سے متعلق ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آیت مندرجہ بالا میں لفظ "مقت" کے بارے میں چار احتمال موجود ہیں اور ہر مفسر نے ان میں سے ایک احتمال اپنایا ہے۔ پہلا یہ کہ دونوں کا ظرف قیامت ہو۔ دوسرا یہ کہ دونوں کا ظرف دنیا ہو۔ تیسرا یہ کہ پہلے کا ظرف دنیا ہو اور دوسرے کا قیامت ہو چوتھا یہ کہ اس کے برعکس ہو۔ لیکن مندرجہ بالا تفسیر کے مطابق پہلا آخرت سے اور دوسرا دنیا سے یا دونوں آخرت سے مربوط ہوں (غور کیجئے گا)۔

تھے۔ لیکن جب اپنی مسلسل موت وحیات کا سلسلہ دیکھیں گے تو ان کے لیے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی ان لوگوں کا دو موتوں اور دو زندگیوں پر بار بار زور دینا شاید اس لیے ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "اے وہ خدا جو مارنے اور جلانے کی قدرت رکھتا ہے! تجھ میں اس بات کی بھی قدرت ہے کہ تو ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج دے تاکہ ہم وہاں جاکر اپنے اعمال کی تلافی کریں"۔

دو موتیں اور دو زندگیاں

یہاں پر "دو مرتبہ مارنے" اور "دو مرتبہ زندہ کرنے" سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین نے بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں جن میں سے صرف تین احتمال قابل ذکر ہیں۔

۱۔ دوبارہ مارنے سے مراد ایک موت تو زندگی کے خاتمہ پر ہے اور دوسری موت برزخ کے اختتام پر۔ اور دوبارہ جلانے سے مراد ایک تو برزخ میں جلانا ہے اور دوسرے روز قیامت۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب انسان اس دنیائے فانی سے کوچ کرتا ہے تو اسے زندگی کا ایک اور روپ دے دیا جاتا ہے وہی زندگی جو "بل احیاء عند ربھم یرزقون (آل عمران ۱۶۹)" کے مصداق شہداء کی زندگی ہے، وہی زندگی جو پیغمبر خدا اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی زندگی ہے اس زندگی میں وہ ہمارا سلام سنتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں۔ نیز وہی زندگی جو آل فرعون جیسے سرکش اور باغی افراد کی ہے اور "النار یعرضون علیھا غدوًّا و عشیًّا (مومن ۴۶)" کے پیش نظر صبح شام انہیں عذاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ادھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس دنیا کے خاتمے پر جب پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو نہ صرف تمام انسان بلکہ تمام فرشتے اور مرنے والوں کے تمام وہ ارواح جو "مثالی قالبوں" میں ہیں "فصعق من فی السماوات ومن فی الارض" زمر / ۶۸)۔ کے پیش نظر سب کے سب مرجائیں گی اور سوائے ذات ذوالجلال کے کوئی چیز بھی باقی نہیں رہے گی۔ (البتہ فرشتوں اور "مثالی قالبوں" میں موجود ارواح کی موت اور زندگی ہم انسانوں کی موت اور زندگی سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی تفصیل ہم سورۂ زمر کی آیت ۶۸ کے ذیل میں بیان کرچکے ہیں)

وہ اس طرح کہ ہماری ایک جسمانی حیات ہے اور ایک برزخی حیات۔ ہم اپنی حیات جسمانی کے خاتمے پر مرجائیں گے اور دوسرے اس دنیا کے خاتمے پر برزخی زندگی کو الوداع کہیں گے۔ ان دونوں موتوں کے بعد ہمیں دو زندگیاں ملیں گی۔ ایک برزخی زندگی اور ایک روز قیامت کی زندگی۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہماری ان دو زندگیوں کے علاوہ اس دنیا میں تیسری زندگی بھی ہے اور اس دنیا میں آنے سے پہلے ہم ایک موت سے بھی دوچار رہے ہیں کیونکہ اس دنیا میں آنے سے پہلے بھی تو ہم مردہ ہی تھے۔

لیکن اگر آیت میں اچھی طرح غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب خود بخود واضح ہوجائے گا کیونکہ اس دنیا میں آنے سے پہلے (جبکہ ہم مٹی تھے) کو "موت" کہتے ہیں "اماتہ" (یعنی مارنا) نہیں کہتے۔ لیکن اس دنیا کی زندگی اگرچہ احیاء کا مصداق ہے لیکن قرآن مجید نے اس طرف اشارہ نہیں کیا کیونکہ یہ احیاء کفار کے لیے چنداں عبرت کا سبب نہیں تھا۔ جو چیز ان کی بیداری اور گناہوں کے

اعتراف کا سبب بنی تھی ایک تو برزخ کی زندگی ہے اور دوسرے روزِ قیامت کی زندگی۔ (غور کیجئے گا)

۲۔ دو زندگیوں سے مراد ایک تو کچھ سوالوں کا جواب دینے کے لئے قبر میں زندہ ہونا ہے اور دوسرے قیامت کے دن جی اٹھنا ہے اور دو موتوں سے مراد ایک تو اسی زندگی کا خاتمہ ہے دوسرے قبر میں موت ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین نے اس آیت کو قبر کی عارضی زندگی کی دلیل سمجھا ہے۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قبر کی زندگی کیسی زندگی ہے؟ آیا یہ زندگی جسمانی ہوگی یا برزخی یا نصف جسمانی اور نصف برزخی؟ اس سلسلے میں خاصی لمبی چوڑی بحث ہے جسے یہاں پر درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۔ پہلی موت سے مراد، انسان کے اس دنیا میں آنے سے پہلے کی موت ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ مٹی تھا۔ بنابریں اسکی پہلی زندگی بھی یہی دنیاوی زندگی ہوگی۔ اور دوسری موت اس دنیا کے خاتمے پر ہوگی اور دوسری زندگی بروز قیامت ہوگی۔

جن لوگوں نے اس تفسیر کو اپنایا ہے وہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸ سے استدلال کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے:

كيف تكفرون بالله و كنتم امواتاً فاحياكم ثم يميتكم ثم يحييكم ثم اليه ترجعون

"تم خدا کا کیونکر انکار کرتے ہو جب کہ تم پہلے مردہ تھے پھر اس نے تمہیں پیدا کیا، پھر وہ تمہیں مار دے گا اور دوبارہ زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے"۔

لیکن اگر ذرا سا بھی غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زیرِ تفسیر آیت میں دو "اماتہ" (مارنے) کی بات ہو رہی ہے جب کہ سورۂ بقرہ کی یہ آیت ایک "موت" اور ایک "اماتہ" کی بات کر رہی ہے[1]

ان تمام تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ تناسخ (آواگون) کے قائل کچھ لوگوں نے اس آیت سے اپنے نظریے کے حق میں استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ آیت انسان کی کئی بار کی زندگی اور موت اور اسی دنیا میں نئے ابدان میں ایک ہی روح کے بار بار عود کر آنے پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہی آیت عقیدۂ تناسخ کی نفی کی ایک زندہ دلیل ہے۔ کیونکہ وہ موت اور حیات کو صرف دو ہی مرتبہ میں منحصر کر رہی ہے جب کہ تناسخ کا عقیدہ رکھنے والے متعدد اور مسلسل کئی زندگیوں اور کئی موتوں کے قائل ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ ایک انسان کی روح کئی بار نئے نئے ڈھانچوں اور کئی تازہ ترین نطفوں میں حلول کر کے اس دنیا میں لوٹ سکتی ہے۔

بہرحال یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ کافروں کی یہ درخواست ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگی کہ انہیں دوزخ سے نکال کر دنیا میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ اپنے گمان کے مطابق اپنے تاریک ماضی کا ازالہ کر سکیں اور اس کا ناقابلِ قبول ہونا اس حد تک واضح ہے کہ ان آیات میں اس کی بات تک نہیں کی گئی۔ صرف بعد کی آیت میں ایک بات ہوئی ہے جو ایک دلیل کا عنوان رکھتی ہے۔

---

[1] بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ممکن ہے یہ آیت "رجعت" کی طرف اشارہ ہو۔ لیکن اگر آیت کی عمومیت پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ تمام کفار کے بارے میں ہے جب کہ رجعت میں عموم کا پہلو مفقود ہے، لہٰذا یہ تفسیر بھی بحث طلب ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: یہ اس لیے ہے کہ جب خدا کی وحدانیت کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو تم انکار کا راستہ اختیار کرتے ہوئے کفر کیا کرتے تھے لیکن جب کسی کو اس کا شریک بنایا جاتا تو تم اسے تسلیم کر لیتے تھے اور اس پر ایمان لے آتے تھے (ذالکم بانه اذا دعی الله وحده کفرتم وان یشرك به تؤمنوا)۔

جہاں پر بھی توحید، طہارت، تقویٰ اور فرمان حق کی بات ہوتی تو تم اپنا منہ پھیر لیتے اور جہاں پر کفر، نفاق، شرک اور پلیدی کی بات ہوتی تو تم نہال نہال ہو جاتے لہٰذا تمھارا انجام بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جواب کا دنیا میں واپس لوٹ جانے کی درخواست سے کیا تعلق ہے؟

اگر آیت کی تعبیرات پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے اس قسم کے اعمال عارضی اور وقتی نہیں تھے بلکہ وہ ہمیشہ اسی صورتِ حال پر قائم تھے۔ لہٰذا اگر اب بھی وہ دنیا میں لوٹا دیئے جائیں تو پھر بھی وہ وہی کام کریں گے۔ ان کا قیامت کے دن اس قسم کا ایمان مجبوری کی بنا پر ہوگا نہ کہ حقیقی۔ اس کے علاوہ ان کے گزشتہ عقائد، اعمال اور نیتیں بھی اس بات کی متقاضی ہیں کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں۔ لہٰذا دنیا کی طرف بازگشت اب ممکن نہیں۔

بہرحال یہ ان لوگوں کی مخصوص صورت حال کا جائزہ ہے، کفر و شرک اور گناہ جن کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکے تھے، جو خدا کا نام سنتے ہی منہ بنا لیتے تھے اور بتوں کا نام آجانے پر مسرت کا اظہار کرتے تھے۔ جن کے بارے میں سورۂ زمر کی آیت ۴۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

و اذا ذکر الله وحده اشمأزت قلوب الذین لایؤمنون بالأخرة واذا ذکر الذین من دونه اذا هم یستبشرون

اور یہ کیفیت عصرِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی مخصوص نہیں بلکہ ہمارے اس دور میں بھی دل کے کئی اندھے ایسے ہیں جو ایمان، توحید اور تقویٰ سے گریزپا ہیں لیکن جہاں پر کفر، نفاق اور اخلاقی بے راہروی کی بو پا لیتے ہیں وہیں پر ٹوٹ پڑتے ہیں (اہل بیت علیہم السلام کی بعض روایات میں اس آیت کی "ولایت" سے تفسیر کی گئی ہے جن کو بعض لوگ سننے تک گوارا نہیں کرتے لیکن اس کے مخالفین کے نام سے نہال نہال ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تفسیر آیت کا ایک مصداق بیان کر رہی ہے نہ کہ آیت کا تمام مفہوم اسی مصداق میں منحصر ہے)

آیت کے آخر میں ان تاریک دل مشرکین کو ہمیشہ کے لیے مایوس کرنے کے لیے ارشاد ہوتا ہے: فیصلے کا کلی اختیار خداوند برتر و بزرگ کے ہاتھ میں ہے (فالحکم لله العلی الکبیر)۔

فیصلے کی اس سند کا مالک، قاضی، دادخواہ اور دادرس صرف خداوند علی و اعلیٰ ہے اور چونکہ وہ "علی" (بلند مرتبہ) اور "کبیر" (صاحبِ عظمت و بزرگی) ہے لہٰذا نہ تو کسی سے مغلوب ہوتا ہے، نہ کسی کی سفارش اس پر اثر کرتی ہے اور نہ ہی کوئی فدیہ، تاوان وغیرہ جیسی چیزیں اس کے فیصلے کو روک سکتی ہیں۔ وہی حاکم مطلق ہے اور اس کے علاوہ کائنات کی ہر چیز اس کے زیر فرمان ہے لہٰذا اس کی حکم عدولی اور اس کے فیصلے سے روگردانی کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

دعا جو قبول نہیں ہو گی

یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ ہم قرآنی آیات میں کفار یا اہل جہنم کے دنیا میں دوبارہ بھیجے جانے کی درخواست اور اس کے مسترد کر دیئے جانے کے بارے میں پڑھ رہے ہوں، بلکہ قرآن مجید کے متعدد مقامات پر یہی بات بیان ہوئی ہے۔

سورۂ شوریٰ کی آیت ۴۴ میں ہے:

ظالم لوگ عذاب الٰہی کو دیکھنے کے بعد کہیں گے کہ

هل الی مردّ من سبیل

کیا واپس لوٹ جانے کا کوئی راستہ ہے؟

سورۂ زمر کی ۵۸ ویں آیت میں گناہ گار اور بے ایمان افراد کے بارے میں ہے:

جب وہ عذاب الٰہی کو دیکھیں گے تو کہیں گے اگر ہم ایک مرتبہ پھر دنیا میں چلے جائیں تو نیک لوگوں میں سے ہو جائیں۔ او تقول حین تری العذاب لوان لی کرۃ فاکون من المحسنین

سورۂ مؤمنون کی ایک سو ساتویں آیت میں انہی افراد کے بارے بیان ہے۔

ربنا اخرجنا منها فان عدنا فانا ظالمون

"پروردگارا! ہمیں جہنم سے باہر نکال کر بھیج دے اگر دوبارہ ایسے کام کریں تو یقیناً ہم ظالم ہیں"۔

سورۂ مؤمنون کی آیت ۹۹ اور ۱۰۰ میں ہے کہ جب کچھ لوگ موت کے فرشتوں کو دیکھتے ہیں تو خدا سے یہ درخواست کرتے ہیں:

رب ارجعون لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت

پروردگارا! مجھے واپس بھیج دے تاکہ میں نے جو بھی کوتاہی کی ہے اور جو کام چھوڑ آیا ہوں اس کی تلافی کے لیے عمل صالح انجام دوں۔

لیکن انہیں "کلّا" (ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا) یا اس جیسے الفاظ کے ساتھ جواب دیا جائے گا۔

تو گویا قرآن مجید یہ کہنا چاہتا ہے کہ، یہ دنیاوی زندگی ایک تجربہ ہے جو کسی کے لیے دہرایا نہیں جائے گا۔ لہٰذا تمہیں یہ خیالِ خام دل سے نکال دینا چاہیئے کہ "اگر مرنے کے بعد ہمیں شدید ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا ہے تو کیا ہوا واپسی اور تلافی کی راہیں تو کھلی ہوئی ہیں" نہیں ایسا ہرگز نہیں۔

اس کی دلیل واضح ہے، قانون تکامل وارتقاء اور اس کی پیش رفت کے سلسلے میں رجعت پسندی اور پیچھے کو ہٹنا ناممکن ہوتا ہے۔ اس قانون کے تحت جس طرح نومولود کا شکم مادر میں واپس لوٹ جانا محال ہے، خواہ اس نے شکم مادر میں ارتقائی مراحل طے کر لیے ہوں یا قبل ازاں ساقط ہو جائے، واپسی تو کسی بھی صورت میں ناممکن ہے۔ موت بھی اسی طرح کا ایک دوسرا تولد ہے

جس سے انسان ایک جہان سے دوسرے جہان میں منتقل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہاں پر بھی واپسی کا امکان مفقود ہے۔ اس کے علاوہ مجبوری کی بیداری کو صحیح معنوں میں بیداری نہیں کہا جاتا، جب بھی اس کے اسباب ختم ہو جائیں گے فراموشی دوبارہ عود کر آئے گی اور پھر وہی کام شروع کر دیں گے۔ جیسا کہ اسی دنیا میں بہت سے لوگوں کے بارے میں بہت سے ایسے موارد دیکھنے میں آتے ہیں کہ جب وہ کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو پروردگارِ عالم کے لطف و کرم کا سہارا لیتے ہیں اور توبہ کے دروازے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن جونہی طوفانِ مصائب تھما وہ فوراً ان مصائب کو بھول بھلا کر پرانی ڈگر پر چل نکلتے ہیں۔

۱۳۔ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ۭ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ۝

۱۴۔ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝

۱۵۔ رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝

ترجمہ

۱۳۔ وہ (خداتو) وہی ہے جو تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے قیمتی رزق نازل کرتا ہے۔ صرف وہی لوگ ان حقائق کو یاد رکھتے ہیں جو خدا کی طرف لوٹ جائیں گے۔

۱۴۔ (صرف) خدا کو پکارو اور اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کرو خواہ یہ بات کافروں کو ناگوار گزرے۔

۱۵۔ وہ (نیک بندوں کے) درجات بلند کرتا ہے، عرش کا مالک ہے، اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنے فرمان کے ذریعے روح القا، کرتا ہے تاکہ ملاقات کے دن سے لوگوں کو ڈرائے۔

تفسیر

صرف خدا کو پکارو

یہ آیات درحقیقت ان مسائل کا استدلال ہیں جو گزشتہ آیات میں وعظ و نصیحت اور تنبیہ و تہدید کی صورت میں بیان ہوئے ہیں۔

ان میں خداوند متعال کی توحید وربوبیت اور اس سے شرک نیز بت پرستی کی نفی پر دلائل ہیں۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے : وہ (خدا تو) وہی ہے جو تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے (هوالذی یریکم اٰیاتہ)۔

آفاق اور انفس میں موجود وہی نشانیاں جن سے ساری کائنات بھری پڑی ہے، ایسے عجیب و غریب نقوش جو عالم وجود کے در و دیوار پر نمایاں ہیں، ایسے واضح نقوش جنہیں دیکھ کر اگر کوئی تیری ذات کے متعلق نہ سوچے تو وہ خود نقش بر دیوار ہے۔

پھر ان آیات میں سے ایک نشانی کے متعلق فرمایا گیا ہے : وہ تمہارے لیے آسمان سے قیمتی رزق نازل کرتا ہے۔
(وینزل لکم من السمآء رزقًا)۔

بارش کے حیات بخش قطرے، آفتاب کا نور جو تمام موجودات کو زندہ کرتا ہے، اور ہوا جو تمام حیوانات اور نباتات کا سرمایۂ حیات ہے۔ یہ سب آسمان سے نازل ہوتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ یہ تین امور زندگی اور حیات کا اہم ترین وسیلہ ہیں اور باقی سب چیزیں ان کی فروعات ہیں۔

بعض مفسرین نے آسمان کو "عالم غیب" اور زمین کو "عالم شہود" جانا ہے۔ اور آسمان سے رزقِ الٰہی کے نزول کا معنی، اس کا عالم غیب سے عالم شہود پر نازل ہونا کیا ہے۔ لیکن یہ تفسیر قطع نظر اس کے کہ ظاہر آیت کے خلاف ہے اس کی قطعاً ضرورت بھی نہیں ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وحی اور بہت سی آیات جو روحانی غذا ہیں آسمان غیب سے نازل ہوتی ہیں اور بارش اور آفتاب کا نور جو جسمانی غذا ہیں آسمان ظاہر سے نازل ہوتے ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ بھی ہیں، لیکن یہ تصور ہرگز نہیں کرنا چاہیئے کہ زیر تفسیر آیات بھی اس عام مفہوم یا آیات تشریعی کی طرف خصوصی اشارہ ہیں۔ کیونکہ "یریکم اٰیاتہ" (وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے) کا جملہ قرآن میں بار بار کائنات میں موجود توحیدی آیات کے معنی میں آتا ہے۔ جن میں سے ایک مقام خود اسی سورت مؤمن کے آخر میں ہے جہاں پر خداوند عالم چوپایوں اور کشتیوں کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے :

ویریکم اٰیاتہ فای اٰیات اللہ تنکرون

"وہ تمہیں اپنی آیات دکھاتا ہے پس تم اس کی کون کون سی آیات کا انکار کروگے"؟ (مؤمن - ۸۱)

اسی طرح کی کئی دوسری آیات بھی ہیں۔

اصولی طور پر "یریکم" (تمہیں دکھاتا ہے) کی تعبیر مناسب ہی آیاتِ تکوینی کے لیے ہے۔ جہاں تک تشریعی آیات کا تعلق ہے تو ان کے لیے "وحی بھیجی" اور "تمہاری طرف آیا" جیسی تعبیریں دکھائی دیتی ہیں۔

بہر حال یہ جو بعض متقدم اور معاصر مفسرین نے آیات کو "تشریعی آیات" یا "تشریعی اور تکوینی آیات" کے معنی میں لیا ہے اس کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے یہاں پر آسمان وزمین میں اور خود انسان کے اندر موجود اللہ تعالیٰ کی اور بہت سی آیاتِ عظیمہ کو چھوڑ کر انسان کی روزی کے مسئلے ہی کو کیوں بیان کیا ہے ؟

کیونکہ یہ روزی کا مسئلہ ہی ہے جو انسانی فکر کو اپنی طرف مشغول کئے رہتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات وہ رزق میں اضافے اور فقر و فاقہ سے نجات پانے کے لئے بتوں کے آگے جھک جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر قسم کی روزی خدا کے ہاتھ میں ہے بت

تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اس قدر عظیم کائنات میں اتنی بڑی اور لاتعداد نشانیوں کے باوجود ان کی نابینا آنکھیں اور پردوں میں ڈھکے ہوئے دل کچھ بھی نہیں دیکھ پاتے صرف وہی لوگ ان حقائق کو یاد رکھتے ہیں جو خدا کی طرف لوٹیں اور اپنے قلب و روح کو گناہوں سے پاک کریں (وما یتذکر الا من ینیب)۔

بعد کی آیت میں یوں نتیجہ نکالا گیا ہے: اب جبکہ صورت حال یہ ہے تو تم خدا کو پکارو اور اپنے دین کو خدا کے لیے خالص کرو (فادعوا اللہ مخلصین لہ الدین)۔

اب اٹھ کھڑے ہو اور ایمان کا لسولا لے کر مشرکین کے بتوں پر ٹوٹ پڑو اور سب کو اپنی فکر، ثقافت اور معاشرے سے باہر نکال پھینکو۔

البتہ تمہارا یہ کام ہٹ دھرم اور متعصب کفار کی تکلیف کا باعث ضرور بنے گا لیکن تمھیں اس بات کی پرواہ نہیں کرنا چاہیئے تم اپنے دین کو خالص کئے رکھو "خواہ یہ کافروں کو ناگوار بھی گزرے" (ولو کرہ الکافرون)۔

جس ماحول میں گمراہ بت پرستوں کی اکثریت ہو وہاں پر توحید کی آواز ان کے لیے ایک وحشت ناک آواز ہوتی ہے جیسا کہ چمگادڑوں کے ٹولے کے لیے طلوعِ آفتاب وحشت ناک ہوتا ہے، لیکن تم ان کے جاہلانہ اور وقتی ردِعمل سے مت گھبراؤ، خم ٹھونک کر میدانِ عمل میں آجاؤ اور پوری جرأت کے ساتھ آگے بڑھتے رہو اور توحید و اخلاص کا پرچم ہر جگہ لہراؤ۔

بعد کی آیت خداوند عالم کو چند اوصاف سے متصف کرتی ہے اور کہتی ہے: وہ درجات بلند کرنے والا ہے (رفیع الدرجات)۔

وہ اپنے صالح بندوں کے درجات بلند کرتا ہے جیسا کہ سورۂ مجادلہ کی آیت ۱۱ میں فرمایا گیا ہے:

یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات

خداوند عالم مؤمنین اور علماء کے درجات بلند کرتا ہے۔

حتیٰ کہ ان انبیاء کے درجات بھی بلند کرتا ہے اور انہیں فضیلت و برتری عطا فرماتا ہے جو امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں اور اخلاص کے عالی مرتبہ تک پہنچے ہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعض

اس نے انسانوں کو اس زمین میں اپنا خلیفہ اور نمائندہ قرار دیا ہے اور ہر ایک کو اس کی لیاقت، اہلیت اور استعداد کے مطابق برتری عطا فرمائی ہے۔ سورۂ انعام کی آیت ۱۶۵ میں فرمایا گیا ہے:

وھو الذی جعلکم خلائف الارض و رفع بعضکم فوق بعض درجات

اگر گذشتہ آیت میں دین میں اخلاص برتنے کی دعوت دی گئی ہے تو اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ خداوند عالم تمھارے درجات تمھارے اخلاص کے مطابق بلند کرے گا کیونکہ وہ "رفیع الدرجات" ہے۔

یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جب ہم "رفیع" کو "رافع" یعنی بلند کرنے والا کے معنی میں لیں لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "رفیع" یہاں پر "مرتفع" کے معنی میں ہے، تو ایسی صورت میں رفیع الدرجات، خداوند عالم کی بلند اور عالی صفات کی طرف

اشارہ ہے، بے شک وہ علم کے لحاظ سے بھی بلند مرتبہ ہے اور قدرت کے لحاظ سے بھی، اس کے کمال و جمال کے تمام اوصاف اس قدر بلند ہیں کہ انسانی عقل و دانش کا بلند پرواز ہما بھی اس کے بلند مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا۔

لغت میں "رفیع" دونوں معانی کے لیے آتا ہے لہٰذا آیت کی بھی دونوں معنوں کے لحاظ سے تفسیر کی جاسکتی ہے لیکن چونکہ آیات میں نیک بندوں کو جزائے خیر اور بلند درجات عطا کرنے کی بات ہو رہی ہے لہٰذا پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہر چند ہمارے نظریہ کے مطابق لفظ کا ایک سے زیادہ معانی میں استعمال جائز ہے لہٰذا دونوں تفاسیر بھی صحیح ہیں خاص کر قرآنی آیات کے بارے میں کہ جن کے الفاظ کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: وہ عرش کا مالک ہے (ذو العرش)۔

ساری کائنات اس کی قدرت اور حکومت کے تابع ہے اور اس کے ملک و حکومت میں کوئی شریک نہیں ہے اور یہ بات بذاتِ خود اس امر کی دلیل ہے کہ لیاقت اور استعداد کے مطابق بندوں کے درجات کی طبقہ بندی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

اس سے پہلے کی آیت میں "عرش" کے بارے میں کافی گفتگو ہو چکی ہے لہٰذا یہاں پر اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

تیسری تعریف بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: خداوند عالم ہی اپنے فرمان کے مطابق اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے روح القاء کرتا ہے (یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ)۔

یہ روح قرآن، مقام نبوت اور وحی ہی ہے جو جسم انسانی میں روح کے مانند دلوں کی حیات کا سبب ہے۔

ایک تو اس کی "قدرت" اور دوسرے اس کا "رفیع الدرجات" ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ ہر قسم کے فرائض کی ادائیگی کا تفصیلی پروگرام وحی کے ذریعے بتائے اور اسی چیز کو کیسے بہترین لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی اسے "روح" سے تعبیر کیا گیا ہے اور "روح" ہوتی ہی وہ چیز ہے جو زندگی، تحرک، تگ و دو، جدوجہد، ترقی اور پیش رفت کا سبب بنے۔

اگرچہ یہاں پر مفسرین نے "روح" کے معنی کی وضاحت کے لیے کئی احتمالات ذکر کیے ہیں۔ لیکن اس آیت میں اور سورۂ نحل کی دوسری آیت میں اور اسی طرح سورۂ شوریٰ کی آیت ۵۲ میں موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مقامات پر روح سے مراد وحی، قرآن اور شرعی فرائض ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۂ نحل کی دوسری آیت:

ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ ان انذروا انہ لا الٰہ الا انا فاتقون

اسی طرح سورۂ شوریٰ کی ۵۲ ویں آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے آپ پر قرآن، ایمان اور روح کے نزول کو بیان فرمایا گیا ہے:

وکذالک اوحینا الیک روحًا من امرنا ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان

"من امرہ" (اس کے حکم کے مطابق) یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر فرشتۂ وحی بھی اس روح کے پہنچانے پر مامور ہے تو وہ بھی خدا ہی کی طرف سے بات کرتا ہے نہ کہ اپنی جانب سے۔

"علی من یشاء من عبادہ" "اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے" اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ وحی کی نعمت بغیر کسی حساب و کتاب کے عطا فرما دیتا ہے کیونکہ اس کی مشیت اس کی عین حکمت ہوتی ہے۔ جسے اس مقام کے لائق سمجھتا ہے اسے عطا فرماتا ہے جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت ۱۲۴ میں فرمایا گیا ہے:

الله اعلم حیث یجعل رسالته

خداوند عالم سب سے بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں قرار دے۔

اہلِ بیت اطہار کی بعض روایات میں مندرجہ بالا آیت میں "روح" کی تفسیر "روح القدس" کی گئی ہے اور اپنے پیغمبر اور معصوم اماموں سے مخصوص بتایا گیا ہے۔ یہ بھی ہماری ان تصریحات کے منافی نہیں ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کیونکہ "روح القدس" وہ مقدس اور بلند مرتبہ معنوی روح ہے جو بطور کامل اور بدرجہ اتم ان معصومین میں موجود ہے۔ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ اس کا پر تو دوسرے افراد میں بھی منتقل ہوتا ہے۔ اور جب بھی "روح القدس" کا فیض ان کی کمک کرتا ہے تو ان سے نہایت ہی اہم باتیں اور اہم امور سرزد ہوتے ہیں۔[1]

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ گذشتہ آیات میں بارش کے نزول اور جسمانی رزق کی بات ہو رہی تھی اور یہاں پر نزولِ وحی اور روحانی رزق کی بات ہو رہی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام پر روح القدس نازل کرنے کا کیا مقصد ہے؟ اور اس پُرنشیب و فراز، طویل اور پُرمشقت سفر میں ان کا مقصد اور ہدف کیا ہے؟

اسی سلسلے کی آیت کے آخری جملے میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے خود قرآن فرماتا ہے: مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ملاقات کے دن سے ڈرائیں (لینذر یوم التلاق)۔

جس دن بندے اپنے پروردگار سے شہود باطنی کے ذریعے ملاقات کریں گے،

جس دن گزشتہ اور آئندہ زمانے کے لوگ آپس میں ملاقات کریں گے،

جس دن حق اور باطل کے پیشوا اپنے پیروکاروں سے ملاقات کریں گے،

جس دن مستضعفین اور مستکبرین باہم ملاقات کریں گے،

جس دن ظالم اور مظلوم آپس میں ملاقات کریں گے،

جس دن انسان اور فرشتے ملاقات کریں گے،

خلاصہ یہ کہ جس دن انسان اپنے اعمال، گفتار اور کردار سمیت، اللہ کی بارگاہ عدل کی ملاقات کرے گا۔

تمام آسمانی کتابوں اور خداوند عالم کے تمام منصوبوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ لوگوں کو "ملاقات" کے اس عظیم دن سے ڈرائیں، اور اس آیت میں قیامت کا کیا ہی عجیب نام منتخب کیا گیا ہے "یوم التلاق"۔

---

[1] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد اول سورۂ بقرہ کی آیت ۸۷ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

۱۶- يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○

۱۷- اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

ترجمہ

۱۶- (ملاقات کا دن) وہ دن ہے جب سب لوگ ظاہر ہو جائیں گے اور ان میں سے کسی کی کوئی چیز خدا پر مخفی نہیں رہے گی، آج کے دن کس کی حکومت ہے؟ خداوند یکتا و قہار کی۔

۱۷- جس شخص نے جو بھی عمل انجام دیئے ہیں آج کے دن ان کی جزا پائے گا، آج کے دن کچھ بھی ظلم نہیں ہوگا، خداوند عالم جلد حساب کرنے والا ہے۔

تفسیر

ملاقات کا دن

یہ اور بعد میں آنے والی چند دوسری آیات "یوم التلاق" کی تشریح اور تفسیر میں، جو قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور گزشتہ چند آیات میں اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

ان دو آیات میں قیامت کی چند خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے جو ایک دوسرے سے بڑھ کر دل دہلا دینے والی ہیں۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: ملاقات کا دن ایسا دن ہے جس میں سب لوگ ظاہر ہو جائیں گے (یوم ھم بارزون)۔

ایسا دن ہے جس میں سب حجاب اور پردے ہٹ جائیں گے۔

ایک تو ل جیسی مادی رکاوٹیں ہٹا دی جائیں گی اور قرآن کے الفاظ میں زمین "قاعاً صفصفاً" (کسی اونچ نیچ کے بغیر بالکل ہموار) ہو جائے گی۔ (طٰہٰ - ۱۰۶)

دوسرے تمام انسان قبروں سے نکالے جائیں گے۔
تیسرے سب لوگوں کے باطنی اسرار ظاہر ہوجائیں گے" یوم تبلی السرائر" (طارق۔ ۹)
اور زمین اپنے تمام اندرونی دفینے باہر نکال دے گی" واخرجت الارض اثقالھا" (زلزال۔ ۲)
چوتھے تمام نامۂ اعمال کھولے جائیں گے اور ان کا سب کچھ آشکار ہوجائے گا" واذا الصحف نشرت" (تکویر۔ ۱۰)
پانچویں جن اعمال کو انسان پہلے سے بھیج چکا ہے وہ وہاں پر مجسم ہوکر اس کے سامنے آجائیں گے" یوم ینظر المرء ماقدمت یداہ" (نبأ۔ ۴۰)
چھٹے جن مسائل کا انسان چھپ کر بار بار مرتکب ہوتا تھا وہ ظاہر ہوجائیں گے" بل بدا لھم ما کانوا یخفون من قبل" (انعام۔ ۲۸)
ساتویں انسان کے اپنے اعضاء حتیٰ کہ وہ زمین بھی جس پر وہ گناہوں کا ارتکاب کیا کرتا تھا اس کے خلاف گواہی دے گی اور حقائق بیان کرے گی" یومئذ تحدث اخبارھا" (زلزال ۴)
المختصر اس دن تمام انسان اپنے تمام وجود، تمام ہستی اور کیفیت و حالت کے ساتھ اس عظیم میدان میں آموجود ہوں گے اور کوئی بھی چیز چھپی نہیں رہ جائے گی" وبرزوا للہ جمیعًا" (ابراہیم ۔ ۲۱)
کیا ہی عجیب اور وحشت ناک منظر ہوگا ؟
وہاں پر کیسا شور و غوغا اور چیخ و پکار بلند ہوگی ؟ اس قدر کہنا کافی ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے یہ فکر کریں کہ اس دنیا میں یہی منظر معرض وجود میں آجائے اور تمام انسانوں کے ظاہر و باطن اور خلوت و جلوت ایک ہوکر منصۂ شہود پر آجائیں تو لوگوں کی اس وقت کیا کیفیت ہوگی ؛ اور لوگوں کے باہمی تعلقات کیونکر منقطع ہوجائیں گے ؟
جی ہاں اس جہان کی کیفیت بھی یہی ہے اور انسان کو اس دنیا میں اس طرح رہنا چاہیے کہ اگر اس کے باطن کے حالات ظاہر ہوجائیں تو ان سے خوف نہ کھائے اس کے اعمال و کردار کو ایسا ہونا چاہیئے کہ اگر آج بھی وہ منظر عام پر آجائیں تو اسے پریشان نہ ہونا پڑے۔
اس دن کی دوسری صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : لوگوں کی کوئی چیز بھی خدا پر مخفی نہیں ہوگی (لا یخفٰی علی اللہ منھم شیء)۔
اس دنیا میں بھی اور آج بھی کوئی چیز اس قادر مطلق پر مخفی نہیں ہے اور اصولی طور پر جس کا وجود لاتناہی ہو اور کسی قسم کی محدودیت جس کی پاک ذات کے لیے نہ ہو اس کے نزدیک ظاہر و باطن اور غیب و شہود یکساں ہیں۔
تو پھر قرآن مندرجہ بالا جملے کو" یوم ھم بارزون" کی تشریح اور تفسیر کے طور پر کیوں بیان کر رہا ہے ؟
اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ یہ بات اس دن تمام چیزیں کے مکمل طور پر اور اچھی طرح ظاہر ہونے پر دلالت کرتی ہے جس دن عام لوگوں سے کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی خدا کے بارے میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
اس دن کی تیسری خصوصیت ، پروردگار عالم کی حاکمیت مطلقہ ہے، جس طرح اسی آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : اس دن

کہا جائے گا کہ اس دن کی حکومت اور ملکیت کس کے پاس ہے؟ (لمن الملك اليوم)۔

تو اس کے جواب میں کہیں گے: صرف خداوند قہار کی ملکیت ہے (لله الواحد القهار)۔

یہ سوال کون کرے گا اور اس کا جواب کون دے گا؟ آیت نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ البتہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ سوال خداوند عالم کی طرف سے کیا جائے گا اور اس کا جواب تمام مؤمنین اور کفار مل کر دیں گے۔[1]

لیکن بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ سوال اور جواب دونوں خدا کی جانب سے ہوں گے۔[2] جب کہ بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ سوال خدا کا منادی زور زور سے کرے گا اور خود ہی اس کا جواب دے گا۔

لیکن بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال اور جواب کسی خاص فرد کی طرف سے نہیں ہوں گے۔ بلکہ یہ ایک ایسا سوال ہے جو بغیر کسی استثناء کے خالق و مخلوق، فرشتہ و انسان، مؤمن و کافر، وجود کے تمام ذرات اور کائنات کے در و دیوار کی طرف سے کیا جائے گا۔ اور ہر ایک زبانِ حال سے اس کا جواب دے گا۔ یعنی جہاں جہاں دیکھو گے وہاں وہاں پر اس کی حاکمیت و حکومت کے آثار نمایاں اور اس کی قہاریت کی نشانیاں ظاہر ہوں گی جس ذرہ کی آواز سنو گے وہی "لمن الملك" کہہ رہا ہو گا اور اس کا جواب بھی خود دے رہا ہو گا "لله الواحد القهار"۔

اس کا ایک نہایت چھوٹا سا نمونہ ہم اسی دنیا میں دیکھتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم ایک گھر یا ایک شہر یا ایک ملک میں داخل ہوتے وقت کسی ایک فرد معین کی قدرت کی علامات کو ہر جگہ محسوس کرتے ہیں گویا ہر ایک یہی کہہ رہا ہوتا ہے کہ اس جگہ کا مالک اور حاکم فلاں آدمی ہے اور وہاں کے در و دیوار بھی پکار پکار کر یہی کہہ رہے ہوتے ہیں۔

البتہ آج بھی خداوند عالم کی مالکیت سراسر کائنات پر حکم فرما ہے لیکن بروز قیامت نیا ظہور اختیار کرے گی اس دن نہ تو ظالم اور جابر لوگوں کی حکومت کا کوئی پتہ ہو گا اور نہ ہی طاغوتوں کے مسحور کن نعرے سنائی دیں گے۔ نہ ہی زمینی طاقتوں کا کوئی نام و نشان ہو گا اور نہ ہی شیطان اور اس کے لشکریوں کا کوئی اتہ پتہ ہو گا۔

اس دن کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سزا اور جزا کا دن ہو گا۔ جیسا کہ بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے "آج کے دن ہر شخص اپنے کئے کی سزا یا جزا پائے گا" (اليوم تجزٰى كل نفس بما كسبت)۔

جی ہاں! خداوند عالم کا علمی احاطہ، حاکمیت، مالکیت اور قہاریت اس عظیم اور خوف و رجا پر مبنی حقیقت پر واضح دلیل ہیں۔

پانچویں خصوصیت وہی ہے جو بعد کے جملے میں ذکر کی گئی ہے: آج کے دن کسی پر بھی ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا (لا ظلم اليوم)۔

ظلم کیونکر ممکن ہو جب کہ ظلم یا تو جہالت کی وجہ سے سرزد ہوتا ہے اور خداوند عالم کا علم ہر چیز پر محیط ہے یا پھر عاجزی کی بنا پر ہوتا ہے اور خداوند عالم ہر چیز پر قاہر، حاکم اور مالک ہے تو پھر خدا کی بارگاہ میں اس دن ظلم کیونکر ممکن ہے؟ بالخصوص وہ دن خدا

---

[1] تفسیر مجمع البیان، انہی آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر "المیزان" انہی آیات کے ذیل میں۔

کے فیصلے کا دن ہو گا نہ کہ لوگوں کی آزمائش کے لیے آزادی کا دن۔

چھٹی اور آخری خصوصیت بندوں کے اعمال کا جلد محاسبہ ہے جیسا کہ آیت کے اختتام پر فرمایا گیا ہے: خداوند سریع الحساب ہے (ان اللہ سریع الحساب)۔

وہاں پر حساب و کتاب کی رفتار اس حد تک تیز ہو گی جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے:

ان اللہ تعالٰی یحاسب الخلائق کلھم فی مقدار لمح البصر

خداوند عالم اپنی تمام مخلوق کا حساب ایک پلک جھپکنے کی دیر میں کرے گا۔[1]

اصولی طور پر "اعمال کے مجسم ہو جانے" اور "خیر و شر کے آثار باقی رہ جانے" کے نظریہ کو قبول کر لینے کے بعد قیامت کے دن حساب و کتاب کا مسئلہ تو حل شدہ ہی ہے۔ آیا جو مشینیں اس دنیا میں کام کے ساتھ ہی نمبر بتاتی جاتی ہیں انہیں حساب کرنے کے لیے کسی زمانے کی ضرورت ہوتی ہے؟

"سریع الحساب" کا لفظ قرآن مجید کی مختلف آیات میں بار بار ملتا ہے اس کا مقصد شاید یہ ہے کہ شیطان صفت لوگ سادہ لوح افراد کے دلوں میں یہ وسوسے نہ ڈال دیں کہ ہزاروں سالوں کے دوران میں بجالائے ہوئے اعمال کا حساب و کتاب اس قدر جلد آسانی کے ساتھ کیونکر ممکن ہے؟

ان تمام باتوں سے ہٹ کر یہ تعبیر تمام انسانوں کے لیے ایک تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس دن مجرمین کو کوئی بھی مہلت نہیں دی جائے گی، جس طرح کہ اس دنیا میں کسی مجرم یا قاتل پر مقدمہ چلانے اور کیس پر غور کرنے کے لیے کئی سالوں یا کم از کم کئی مہینوں کی مدت درکار ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان سورۂ بقرہ کی آیت ۲۰۲ کے ذیل میں۔

۱۸۔ وَاَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡاٰزِفَةِ اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَى الۡحَـنَاجِرِ كٰظِمِيۡنَ ؕ مَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ حَمِيۡمٍ وَّلَا شَفِيۡعٍ يُّطَاعُ ؕ

۱۹۔ يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِى الصُّدُوۡرُ

۲۰۔ وَاللّٰهُ يَقۡضِىۡ بِالۡحَـقِّ ؕ وَالَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ لَا يَقۡضُوۡنَ بِشَىۡءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ

ترجمہ

۱۸۔ انہیں اس دن سے ڈرایئے جو قریب ہے کہ جب سخت خوف کی وجہ سے دل حلق تک پہنچ جائیں گے اور ان کا تمام وجود غم واندوہ سے بھر جائے گا۔ ظالموں کا نہ تو کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی ایسا شفاعت کرنے والا کہ جس کی شفاعت مانی جائے۔

۱۹۔ وہ ان آنکھوں کو بھی جانتا ہے جو خیانت کرتی ہیں اور جو کچھ دل چھپاتے ہیں ان سے بھی باخبر ہے۔

۲۰۔ اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور خدا کے علاوہ وہ جن معبودوں کو پکارتے ہیں کچھ بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تفسیر

جب جان لبوں تک پہنچے گی

یہ آیات بھی حسب سابق اوصاف قیامت کے سلسلے کی کڑی ہیں اور درحقیقت ان آیات میں قیامت کے اوصاف میں سے

سات اور اوصاف اور ہولناک اور وحشت ناک حوادث کا بیان ہے جو ہر صاحبِ ایمان شخص کو گہرے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: انہیں اس دن سے ڈرائیے جو قریب ہے (وانذرھم یوم الآزفۃ)۔

"آزفۃ" لغت میں "نزدیک" کو کہتے ہیں اور یہ کیسا عجیب و غریب نام ہے کہ جو "یوم القیامۃ" کے بجائے آیا تاکہ ناآگاہ اور بے خبر لوگ یہ نہ کہیں کہ ابھی قیامت برپا ہونے میں بہت بڑا عرصہ باقی ہے، اپنے دھیان کو ابھی سے قیامت کی طرف لگانے کی ضرورت نہیں ہے یہ ایک ادھار کا وعدہ ہے۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ کل دنیاوی عمر قیامت کی عمر کے مقابلے میں ایک زود گزر لمحے سے زیادہ نہیں ہے اور چونکہ اس کی حتمی تاریخ خدا نے انبیاء و مرسلین تک کو نہیں بتائی لہٰذا ہمیشہ اس کے استقبال کے لیے آمادہ رہنا چاہیئے۔

دوسری صفت یہ ہے کہ: اُس روز زبردست خوف و ہراس کی وجہ سے دل حلق تک پہنچ جائیں گے (اذ القلوب لدی الحناجر)۔

جب انسان زبردست مشکلات میں پھنس جاتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس کا دل اپنی جگہ چھوڑ کر حلق سے باہر آیا چاہتا ہے۔ عرب ایسی صورت حال کو "بلغت القلوب الحناجر" سے تعبیر کرتے ہیں اور شاید اس کا فارسی صحیح نعم البدل "جان لبوں تک پہنچ چکی ہے" ہی ہو سکتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ دل جو خون کی تقسیم کا مرکز ہے وہ نہ تو کبھی اپنی جگہ سے ہلتا ہے اور نہ ہی حلق تک پہنچتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ "قلب" دراصل "جان" کے لیے کنایہ ہو، مثلاً کہا جاتا ہے کہ اس کی جان حلق تک پہنچ چکی تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا اس کی روح اس کے بدن سے بالتدریج خارج ہوتے ہوتے باقی تھوڑی سی رہ چکی ہے۔

بہرحال اس دن انسان خدا کے سخت حساب و کتاب، تمام مخلوق کے سامنے رسوائی کے خوف اور ناقابلِ نجات دردناک عذاب میں مبتلا ہونے کے ڈر سے اس قدر ہول و اضطراب کا شکار ہو جائے گا جو بیان نہیں ہو سکتا۔

اس کی تیسری صفت کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ان کا تمام وجود غم و اندوہ سے بھرا ہو گا لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکیں گے (کاظمین)۔

"کاظم" "کظم" کے مادہ سے ہے جس کا لغوی معنی ہے "پانی بھری مشک کا منہ باندھنا" بعد ازاں اس کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہونے لگا جو غصے سے بھرے ہوتے ہیں لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔

اگر انسان کسی وقت غمِ جانکاہ اور اندوہ کا شکار ہو جائے لیکن وہ فریاد کر سکتا ہو تو ممکن ہے کہ اس کا کچھ غم ہلکا ہو جائے اور اس کے دل کو کچھ آرام آ جائے لیکن افسوس کہ وہاں پر تو چلانے اور فریاد کرنے کی بھی اجازت نہیں ہو گی۔ وہاں پر تو تمام مخفی راز دل کے ظاہر ہو جانے، حق کی عدالت میں پیش ہونے، عدالتِ پروردگار میں حاضری دینے اور مخلوقِ خدا کے موجود ہونے کے مسائل ہوں گے پھر چیخ و پکار کیا فائدہ پہنچائے گی؟

چوتھی صفت یہ ہے کہ: ظالموں کا کوئی دوست نہیں (ما للظالمین من حمیم)۔

وہ یار اور مکار دوست جو اقتدار کے زمانے میں اس کے دسترخوان کی مکھی بنے اس کے گرد منڈلاتے رہتے تھے اور خوشامد

و چاپلوسی کے ذریعے اپنے آپ کو وفادار دوست اور جان نثار ساتھی یا خاندانی غلام بتایا کرتے تھے ان سب کو اپنی اپنی پڑی ہے دوسرے کا کسی کو کچھ خیال نہیں۔ الغرض اس دن نہ تو کسی انسان کا کوئی دوست ہوگا اور نہ ہی درد دل بانٹنے کے لیے کوئی غمخوار۔

پانچویں صفت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: اور نہ ہی کوئی ایسا شفاعت کرنے والا ہے کہ جس کی شفاعت قبول کی جائے (ولا شفیع یطاع)۔

کیونکہ انبیاء اور اولیاء جیسے سچے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی خداوند عالم کے حکم پر منحصر ہوگی۔ اس طرح سے بت پرستوں کے اس گمان پر بھی خط تنسیخ پھر جاتا ہے کہ بت ان کی شفاعت کریں گے۔

چھٹے مرحلے پر قیامت کی کیفیت کے ضمن میں خدا کا ایک وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا خیانت سے دیکھنے والی آنکھوں کو جانتا ہے اور جو کچھ سینوں میں پوشیدہ ہے اس سے بھی باخبر ہے (یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور)۔[1]

جی ہاں! جو خدا آنکھ کی مخفی حرکتوں اور سینے کے اندرونی رازوں سے آگاہ ہے وہی اس دن اپنی مخلوق کے بارے میں عدل وانصاف کرے گا اور اس کے اس صحیح معنوں میں علم وآگاہی کی وجہ سے گناہ گاروں کے لیے دن نہایت تاریک ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ جب امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آنجناب نے فرمایا:

الم تر الی الرجل ینظر الی الشیء وکانہ لا ینظر الیہ فذالک خائنۃ الاعین

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کبھی انسان کسی چیز کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسے نہیں دیکھ رہا؟ یہی خیانت آلودہ نگاہیں ہیں۔[2]

جی ہاں! اس قسم کی نگاہ خواہ لوگوں کی ناموس کی طرف ہو یا کسی اور ایسی چیز کی طرف کہ جسے دیکھنا ممنوع ہے اس خدا سے چنداں مخفی نہیں رہ سکتی جس کے لیے زمین وآسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۂ سبا کی آیت ۳ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السماوات ولا فی الارض

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ساتھی جو آپ کے حضور میں اسلام کے ایک جانی دشمن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، جب وہ مخالف آنحضرتؐ سے امان نامہ حاصل کر کے باہر چلا گیا تو اس ساتھی نے آپ کی خدمت میں عرض کی اس کے امان حاصل کرنے سے پہلے آپ نے ہمیں اشارہ کیوں نہیں فرمایا تاکہ ہم کھڑے ہو کر اس کی گردن اڑا دیتے تو آنجناب

---

[1] "یعلم خائنۃ الاعین" کے جملے میں نحوی ترکیب کے لحاظ سے دو احتمال ہیں، پہلا یہ کہ "خائنۃ" مصدری معنی میں ہے جس کا معنی "خیانت" ہے، (جیسا کہ "کاذبۃ" اور "لاغیۃ" کہ جن کا معنی "کذب" اور "لغو" ہے)۔ دوسرا یہ کہ موصوف سے صفت مقدم ہو اور اصل میں "الاعین الخائنۃ" ہو تو پھر اس صورت میں لفظ "خائنۃ" اسم فاعل ہوگا۔

[2] تفسیر صافی، اسی آیت کے ذیل میں۔

نے ارشاد فرمایا :

ان النبی لا تکون لہ خائنۃ الاعین

انبیاء کے پاس مخفی اور خائن آنکھیں نہیں ہوتیں۔[1]

البتہ خیانتِ چشم کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ غیر عورتوں کی طرف چوری چوری دیکھا جائے یا اس سے آنکھ لڑانے کی کوشش کی جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کی عیب جوئی اور تحقیر کی غرض سے آنکھ کا اشارہ کیا جائے، تیسری صورت یہ ہے کہ سازشوں اور شیطانی منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے آنکھوں سے اشارے کیے جائیں وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کا اس بات پر ایمان ہو کہ بروز قیامت اس کی نگاہوں، سوچوں، خواہشوں اور ان کے اسباب تک کا پورا پورا محاسبہ ہوگا اور ہر ایک سے متعلق پوری تحقیق کی جائے گی اور سوال کیا جائے گا تو وہ یقیناً تقویٰ کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہو جائے اور نفوسِ انسانی کی تربیت میں معاد، خدا کی طرف سے نگرانی اور قیامت کے دن حساب و کتاب پر ایمان کتنا مؤثر ہے؟

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ عالم جب اپنی اعلیٰ تعلیم نجف اشرف کے حوزۂ علمیہ میں مکمل کر چکے اور اپنے وطن واپس جانے کے لئے اپنے استاد سے الوداع کی غرض سے ان کے حضور پہنچے اور ان سے آخری وعظ و نصیحت کی درخواست کی تو انہوں نے فرمایا اس قدر تکالیف اٹھانے کے بعد پھر بھی آخری نصیحت کلام اللہ مجید ہے اور آپ اس آیت کو ہرگز فراموش نہ کریں۔

الم یعلم بان اللہ یریٰ

کیا انسان نہیں جانتا تھا کہ خدا ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ (علق-۱۴)

یقیناً ایک صحیح معنوں میں مؤمن شخص کی نگاہ میں یہ تمام کائنات خدا کے حضور میں ہے اور تمام کام اسی کے سامنے انجام پاتے ہیں اور یہی تصور گناہوں سے اجتناب کے لیے کافی ہے۔

قیامت کی ساتویں صفت جو چھٹی صفت کی طرح خدا کی صفت کے طور پر بیان ہوئی ہے قرآن کے الفاظ میں : خدا حق پر مبنی فیصلہ کرے گا (واللہ یقضی بالحق)۔

اور وہ اس کے علاوہ جن معبودوں کو پکارتے ہیں ان میں سے کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکتا (والذین یدعون من دونہ لا یقضون بشیءٍ)۔

جی ہاں! اس دن فیصلے کا اختیار صرف اور صرف خدا کے پاس ہوگا اور وہ بھی حق سچ کے علاوہ کوئی فیصلہ نہیں کرے گا کیونکہ ظلم پر مبنی فیصلہ یا تو جہالت اور ناآگاہی کی بنا پر ہوتا ہے جب کہ وہ تمام اسرار اور بھیدوں تک سے اچھی طرح واقف ہے اور یا پھر عاجز آجانے یا ضرورت کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ سب اُس کی ساحتِ مقدس سے دور ہیں۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ یہ جملہ "توحید معبود" پر ایک دلیل ہے کیونکہ معبود بننے کی صلاحیت وہی رکھتا ہے کہ آخرکار

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص۵۷۵۷ (کچھ خلاصے کے ساتھ)۔

فیصلہ جس کے ہاتھ میں ہو لہٰذا وہ بت کہ جو نہ اس دنیا میں کسی خاصیت کے مالک ہیں اور نہ ہی قیامت کے دن کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں تو ان میں معبود بننے کی صلاحیت کیونکر ہو سکتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ حق کی جانب سے حق پر مبنی فیصلہ جات کے بہت سے اور وسیع معانی ہیں جو عالم تکوین اور عالم تشریع دونوں پر محیط ہیں جس طرح کہ قرآنی آیات میں "قضاء" کی تعبیر دونوں معانی پر مشتمل ہے چنانچہ ایک مقام پر فرمایا گیا ہے:

وقضٰی ربك الّا تعبدوا الّا ایّاہ

"تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو"۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ ۲۳)۔

یہ قضاوت تشریعی ہے۔ اور دوسری جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

اذا قضٰی امرًا فانما یقول لہ کن فیکون

جب وہ کسی چیز کے بارے میں حکم جاری کرتا ہے تو اسے کہتا ہے "ہوجا" تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

(آل عمران۔ ۴۷)

یہ قضاوت تکوینی ہے۔

آخر میں گزشتہ آیات پر تاکید کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: خدا سننے اور دیکھنے والا ہے (ان اللہ ھو السمیع العلیم)۔

بلکہ یہ دیکھنا اور سننا اپنے صحیح معنی کے لحاظ سے، یعنی تمام سنی جانے والی اور تمام دیکھی جانے والی چیزیں ہمہ وقت اس کے حضور ہر وقت موجود رہتی ہیں اور یہ اسی کی ذات پاک سے مخصوص ہے اور یہ چیز اس بات کی تاکید ہے کہ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے اور حق کا فیصلہ بھی اسی کے ساتھ خاص ہے کیونکہ جب تک کوئی سمیع و بصیر مطلق نہ ہو وہ حق پر مبنی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

۲۱- اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ○

۲۲- ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○

ترجمہ

۲۱- کیا انہوں نے روئے زمین کی سیر نہیں کی تاکہ وہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا کیا انجام ہوا؟ وہ قدرت و طاقت اور زمین میں آثار کے لحاظ سے ان سے بہت زیادہ تھے۔ لیکن خدا نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا اور انہیں (عذابِ) خدا سے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔

۲۲- یہ اس وجہ سے تھا کہ ان کے رسول انکے پاس ہمیشہ واضح دلائل لے کر آتے رہے لیکن وہ سب کا انکار کرتے رہے لہٰذا خداوند عالم نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا (اور انہیں سزا دی) کیونکہ وہ قوی اور شدید العقاب ہے۔

تفسیر

ظالموں کا دردناک انجام دیکھو

چونکہ قرآن مجید کا بہت سی آیات میں طریقہ کار یہی رہا ہے کہ حساس اور اصولی و کلّی قاعدوں کو ذکر کرنے کے بعد انہیں جزئی اور

محسوس مسائل کے ساتھ ملا دیتا ہے اور انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے ان مسائل کی تحقیقات کے لیے گزشتہ اور حال کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے لے جاتا ہے۔ زیر نظر آیات کی بھی یہی کیفیت ہے جن میں مبدأ و معاد، اعمال کی سخت جانچ پڑتال اور سرکشی اور گناہ کے خطرناک نتائج کے ذکر کے بعد لوگوں کو گزشتہ امتوں کے حالات منجملہ فرعون اور فرعونیوں کے حالات کا مطالعہ کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: آیا انہوں نے روئے زمین کی سیر نہیں کی تاکہ وہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں کہ کیا ہوا (اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین کانوا من قبلهم)۔

یہ کوئی مرتب کردہ تاریخ نہیں ہے جس کے اصل اور صحیح ہونے میں کسی قسم کا شک کیا جا سکے، یہ تو ایک زندہ تاریخ ہے جو اپنی زبانِ بے زبانی سے پکار رہی ہے۔ تباہ کاروں کے محلوں کے کھنڈرات سرکشوں کے عذاب شدہ شہر مٹی تلے سوئے ہوئے لوگوں کی گلی سڑی بوسیدہ ہڈیاں اور زمین میں ملی ہوئی سر بفلک عمارتیں واقعی تاریخ کے لیے سبق آموز جملے ہیں جو حقائق کو بے کم و کاست بیان کر رہے ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ تھے جو زمین میں اہم آثار کے اعتبار سے ان سے زیادہ طاقتور تھے (کانوا هم اشد منهم قوة و اٰثارًا فی الارض)۔

وہ اس قدر طاقتور حکومتوں، عظیم لشکروں اور روشن مادی تمدن کے مالک تھے کہ مشرکینِ مکہ کی زندگی تو ان کے نزدیک ایک بازیچۂ اطفال سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہے۔

" اشد منهم قوة " کہ کر ان کی سیاسی اور فوجی طاقت کے بارے میں بھی بتایا جا رہا ہے اور اقتصادی و علمی طاقت کے بارے میں بھی۔

" اٰثارًا فی الارض " کی تعبیر سے ممکن ہے کہ ان کی عظیم زرعی ترقی کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ سورۂ روم کی آیت ۹ میں بھی آیا ہے کہ:

اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلهم کانوا اشد منهم قوة و اثاروا الارض وعمروها اکثر مما عمروها

"کیا ان لوگوں نے زمین کی سیر نہیں کی کہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے تھے کہ وہ کیا ہوئے؟ وہ بہت ہی طاقتور تھے اور زمین کو (کھیتی باڑی کے لیے) دگرگون کرتے تھے اور ان سے زیادہ اُن لوگوں نے اسے آباد کیا تھا۔"

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے بڑی بڑی اور محکم عمارتوں کی طرف اشارہ ہو جو گزشتہ اقوام نے پہاڑوں کے دل میں اور دشت و صحرا کے وسط میں بنا رکھی تھیں جیسا کہ قرآن مجید قوم عاد کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

اتبنون بکل ریع اٰیة تعبثون و تتخذون مصانع لعلکم تخلدون

آیا تم ہر بلند مکان پر اپنی خواہشاتِ نفسانی کی نشانی تعمیر کرتے ہو اور محکم قصر اور قلعے تعمیر کرتے ہو؟ گویا

تم اس دنیا میں ہمیشہ رہو گے (شعراء - ۱۲۸، ۱۲۹)

اور آیت کے آخر میں ان سرکش قوموں کا انجام ایک مختصر سے جملے میں یوں بیان کیا گیا ہے: خدا نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا اور کوئی نہ تھا کہ ان کا دفاع کرتا اور انہیں عذابِ الٰہی سے بچاتا (فاخذھم اللہ بذنوبھم وما کان لھم من اللہ من واق)۔

نہ تو افرادی قوت کی کثرت انہیں عذاب الٰہی سے بچا سکی اور نہ ہی طاقت، شان و شوکت اور بے حساب مال و دولت۔

قرآن مجید میں کئی بار "اخذ" (پکڑنا) سزا دینے کے معنی میں آیا ہے کیونکہ کسی کو سخت ترین سزا دینے کیلئے پہلے اسے پکڑتے ہیں اور پھر سزا دیتے ہیں۔

جو چیز پہلے اجمالی طور بیان کی گئی ہے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا کی یہ دردناک سزا اس لیے تھی کیونکہ ان کے رسول دلائل لے کر ان کے پاس آتے رہتے تھے اور وہ سب کا انکار کر دیا کرتے تھے۔ (ذالک بانھم کانت تاتیھم رسلھم بالبینات فکفروا)۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ غافل یا بے خبر تھے یا ان سے سرزد ہونے والے گناہ اتمام حجت نہ کرنے کی وجہ سے تھے، ان کے پاس پیغمبر بھی مسلسل آیا کرتے تھے (جیسا کہ "کانت تاتیھم" کی تعبیر سے استفادہ ہوتا ہے) لیکن ان سب کے باوجود انہوں نے احکام الٰہی کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ وہ ہدایت کے چراغوں کو گل کر دیتے، ہمدرد رسولوں سے منہ پھیر لیتے بلکہ کبھی تو انہیں شہید کر دیتے۔

ایسے ہی موقع پر خدا نے ان کی گرفت کی (فاخذھم اللہ)۔

کیونکہ وہ طاقتور اور سخت عذاب دینے والا ہے (انہ قوی شدید العقاب)۔

رحمت کے موقع پر "ارحم الراحمین" اور غضب کے مقام پر "اشد المعاقبین" ہے۔

۲۳- وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝

۲۴- اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝

۲۵- فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا كَیْدُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ۝

۲۶- وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝

۲۷- وَقَالَ مُوْسٰٓی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ۝

ترجمہ

۲۳- ہم نے موسٰی کو اپنی آیات اور روشن دلیل کے ساتھ بھیجا۔

۲۴- فرعون، ہامان اور قارون کی طرف، لیکن انہوں نے کہا وہ تو بہت جھوٹا جادوگر ہے۔

۲۵- جب ہماری طرف سے ان کے پاس حق آپہنچا تو انہوں نے کہا: جو موسٰی پر ایمان لا چکے ہیں ان کے لڑکوں کو قتل کر دو اور (قید و خدمت گاری کے لیے) ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دو۔ لیکن کافروں کی چالیں گمراہی میں ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں (اور نقش بر آب ہوتی ہیں)۔

۲۶۔ اور فرعون نے کہا: مجھے چھوڑ دو (تاکہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ اپنے پروردگار کو بلائے (تاکہ وہ اسے نجات دلائے) میں تو اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ تمہارے دین کو تبدیل نہ کر ڈالے یا زمین میں فساد برپا نہ کرے۔

۲۷۔ موسیٰ نے کہا میں اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں ہر اس متکبر سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں لاتا۔

تفسیر

قتل موسیٰ کا ارادہ

گزشتہ آیات میں سابقہ قوموں کے دردناک انجام کی طرف اشارہ تھا اس کے فوراً بعد ان آیات میں ان داستانوں میں سے ایک داستان کا تذکرہ کرتے ہوئے موسیٰ اور فرعون، ہامان اور قارون کی داستان بیان کی گئی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ موسیٰ اور فرعون کی داستان قرآن مجید کی بہت سی سورتوں میں بیان ہوئی ہے لیکن مطالب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مطالب ہرگز تکرار نہیں ہیں۔ بلکہ ہر موقع پر اس داستان کے ایک خاص زاویے پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ زیر تفسیر آیات میں اہم مقصد مومنِ آلِ فرعون کا ماجرا بیان کرنا ہے۔ اور باقی بیان اس اہم ماجرا کا مقدمہ ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے موسیٰ کو اپنی "آیات" اور "سلطان مبین" دے کر بھیجا (ولقد ارسلنا موسٰی بأیاتنا و سلطان مبین)۔

"فرعون، ہامان اور قارون کی طرف، لیکن انہوں نے کہا وہ تو بڑا جھوٹا جادوگر ہے" (الی فرعون و ھامان وقارون فقالوا ساحر کذاب)۔

"آیات" اور "سلطان مبین" میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں مفسرین کی طرف سے مختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں۔

بعض مفسرین "آیات" کو روشن دلائل اور "سلطان مبین" کو معجزات کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

جب کہ بعض دوسرے مفسرین نے "آیات" کو تورات کی آیات کی طرف اور "سلطان مبین" کو معجزات کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

بعض اور مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ "آیات" تو حضرت موسیٰ کے تمام معجزات کے لیے ہے لیکن "سلطان مبین" ان کے چیدہ چیدہ اور برجستہ معجزات کے بارے میں ہے جیسے عصا اور ید بیضا جو فرعون پر واضح طور پر غلبہ کا سبب بنے۔

پھر اور مفسرین نے کہا ہے کہ "آیات" سے مراد حضرت موسیٰ کے معجزات ہیں اور "سلطان مبین" سے مراد فرعون پر موسیٰ کا وہ غلبہ، قاہرہ اور خدائی تسلط ہے جس سے وہ آپؑ کو قتل کرنے سے اور آپؑ کی دعوت کو خاموش کرنے سے باز رہا۔

لیکن ان تفاسیر میں سے کسی کا بھی واضح ثبوت موجود نہیں ہے اور قرآن مجید کی دوسری آیات سے جو بات سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ "سلطان مبین" عموماً ایسی روشن اور محکم دلیل کو کہتے ہیں جو کسی کے واضح غلبہ کا باعث بنے۔ جیسا کہ سورۂ نمل کی آیت ۲۱ میں حضرت سلیمانؑ اور ہدہد کی داستان میں ہے کہ جب سلیمان کہتے ہیں:

"مَیں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا، وہ کیوں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر ڈالوں گا یا پھر اپنی غیر حاضری کے لیے "سلطان مبین" (واضح دلیل) پیش کرے۔"

سورۂ کہف کی پندرھویں آیت میں ہے:

لولا یأتون علیھم بسلطان مبین

"وہ اپنے معبودوں کے لیے روشن دلیل کیوں نہیں لاتے"؟

نیز قرآن مجید میں لفظ "آیات" کئی مرتبہ معجزات کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اسی بنا پر "آیات" حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کی طرف اشارہ ہے اور "سلطان مبین" کا معنی قوی منطق اور دندان شکن دلائل ہیں، جو موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے مقابلے کے لیے عطا ہوئے تھے۔

بہرحال حضرت موسیٰؑ ایک تو عقلی منطق کے اسلحے سے مسلح تھے اور دوسرے ایسے معجزات بھی پیش کیا کرتے تھے جو ان کے جہانِ ماوراء الطبیعت سے رابطے کی علامت تھے لیکن اس کے برخلاف ان کے سرکش فرعونی دشمنوں کے پاس سوائے اس کے کوئی اور حربہ نہیں تھا کہ انہیں یا تو ساحر کہیں یا کذاب!

سحر کی تہمت آیات اور معجزات کے جواب میں تھی اور کذب کی تہمت منطقی دلائل کے مقابلے میں یہ ہماری اس تفسیر کا ایک اور شاہد ہے جو ہم نے ان دو تعبیروں کے بارے میں بیان کی ہے۔

جی ہاں کفر کے سرغنوں کا ہمیشہ سے یہی طریقۂ کار چلا آرہا ہے کہ وہ مردانِ حق کے سچے دلائل پر اس قسم کے جھوٹے لیبل لگایا کرتے ہیں کہ آج بھی ہم اس کے کئی نمونے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں تین افراد ذکر کیے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی چیز کا مجسم نمونہ تھا۔

"فرعون" طغیان و سرکشی اور ظلم و جور کی حاکمیت کا نمونہ تھا،

"ہامان" شیطنت اور شیطانی منصوبے بنانے کا مظہر تھا اور

"قارون" باغی اور سامراجی سرمایہ دار جو اپنی دولت بچانے کے لیے کسی بھی طریقۂ کار کو اپنانے سے نہیں چوکتا تھا۔

اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مامور تھے کہ ظالم اور جابر حکام کے ظلم وستم، غدار سیاستدانوں کی شیطنت اور مستکبر دولت مندوں کی سرکشی کا خاتمہ کر کے معاشرے کی بنیاد سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی عدل و انصاف پر رکھیں، لیکن جن لوگوں کے ناجائز مفادات خطرے میں پڑ گئے تھے انہوں نے آپؑ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

بعد کی آیت ان کے چند ایک شیطانی منصوبوں کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہے : جب ہماری طرف سے حق ان کی جانب آیا تو بجائے اس کے کہ وہ اس کو غنیمت سمجھتے اس کے ساتھ مقابلہ کی ٹھان لی اور کہا کہ جو لوگ موسیٰ پر ایمان لے آئے ہیں ان کے لڑکوں کو قتل کر دو اور کنیزی اور خدمت کے لیے) ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دو (فلما جاءهم بالحق من عندنا قالوا اقتلوا ابناء الذين آمنوا معه واستحيوا نساءهم) ۔

اس تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ لڑکوں کے مار ڈالنے اور لڑکیوں کو زندہ رکھنے کا سلسلہ موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کے دور میں ہی نہیں تھا بلکہ آپ کے قیام اور دورانِ نبوت میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ملاحظہ ہو سورۂ اعراف آیت ۱۲۹ جو اس مدعا پر شاہد ہے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا :

اوذينا من قبل ان تأتينا و من بعد ما جئتنا

" آپ کے آنے سے پہلے اور آپ کے آنے کے بعد ہر دو زمانوں میں ہمیں ستایا گیا "

بنی اسرائیل نے یہ بات فرعون کی طرف سے مومنین کے بچوں کے منصوبۂ قتل کے بعد کہی۔

بہر حال یہ شیطانی حکومتوں کا ایک ناپاک اور دائمی منصوبہ ہوتا ہے کہ فعال اور متحرک افرادی قوت کو تباہ و برباد کر دیں اور غیر فعال افراد کو اپنے مقاصد کے لیے زندہ رکھیں۔ تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ فرعون اور فرعونیوں کا یہ منصوبہ خواہ جناب موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کا تیار کردہ ہو کہ بنی اسرائیل کو فرعون کا قیدی بنا دیا جائے اور خواہ موسیٰ علیہ السلام کے قیام کے بعد۔ بہر حال یہ ایک انقلاب دشمن حرکت تھی تاکہ بنی اسرائیل کو اس حد تک ناکارہ بنا دیا جائے کہ وہ اٹھنے کے قابل نہ رہیں۔

لیکن قرآن مجید آیت کے آخر میں فرماتا ہے : " کافروں کے منصوبے ضلالت اور گمراہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں۔ یہ ان کے ایسے تیر ہیں جو وہ جہالت اور گمراہی میں چلاتے ہیں اور پتھر پر جا لگتے ہیں (وما كيد الكافرين الا في ضلال) ۔

انہیں اس بات کا قطعاً وہم و گمان نہیں ہوتا کہ ان پر کوئی مصیبت بھی آن پڑے گی ، یہ تو مشیت الٰہی ہوتی ہے کہ آخر کار حق کی طاقت باطل کی قوتوں پر غالب آکر رہتی ہے۔

ایک طرف موسیٰ اور ان کے پیروکاروں کے درمیان باہمی نزاع ، اور دوسری طرف ، فرعون اور اس کے ہم نواؤں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کافی حد تک بڑھ گیا اور اس دوران میں بہت سے واقعات رونما ہو چکے جنہیں قرآن نے اس مقام پر ذکر نہیں کیا بلکہ ایک خاص مقصد کو جسے ہم بعد میں بیان کریں گے پیش نظر رکھ کر ایک نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ حالات بہت خراب ہو گئے تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انقلابی تحریک کو دبانے بلکہ ختم کرنے کے لیے ان کے قتل کی ٹھان لی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کے مشیروں اور درباریوں نے اس کے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

" فرعون نے کہا مجھے چھوڑ دو تاکہ میں موسیٰ کو قتل کر ڈالوں اور وہ اپنے پروردگار کو بلائے تاکہ وہ اسے اس سے نجات دے " (وقال فرعون ذروني اقتل موسٰى وليدع ربه) ۔

اس سے یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اس کے اکثر یا کم از کم کچھ مشیر موسیٰ کے قتل کے مخالف تھے وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ چونکہ موسیٰ کے کام معجزانہ اور غیر معمولی ہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے لیے بد دعا کر دے تو اس کا خدا ہم پر عذاب نازل کر دے

لیکن کبر و غرور کے نشے میں بدمست فرعون کہنے لگا: میں تو اسے ضرور قتل کروں گا جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔

یہ بات تو معلوم نہیں ہے کہ فرعون کے حاشیہ نشینوں اور مشیروں نے کس بنا پر اسے موسیٰ کے قتل سے باز رکھا البتہ یہاں پر چند ایک احتمال ضرور ہیں اور ہو سکتا ہے وہ سب کے سب صحیح ہوں۔

ایک احتمال تو یہ ہے کہ ممکن ہے خدا کی طرف سے عذاب نازل ہو جائے۔

دوسرا احتمال ان کی نظر میں یہ ہو سکتا ہے کہ موسیٰ کے مارے جانے کے بعد حالات یکسر دگرگوں ہو جائیں گے کیونکہ وہ ایک شہید کا مقام پالیں گے اور انہیں ہیرو کا درجہ مل جائے گا اس طرح سے ان کا دین بہت سے مومن، ہمنوا، ہی خواہ اور ہمدرد پیدا کر لے گا۔ خاص کر اگر یہ ماجرا جادوگروں سے مقابلے اور ان پر موسیٰ علیہ السلام کے عجیب اور غیر معمولی انداز میں غالب آنے کے بعد کا ہو تو اس احتمال کو اور بھی تقویت مل جاتی ہے اور بظاہر ہے بھی ایسے ہی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے ساتھ سب سے پہلی ملاقات میں اسے دو عظیم معجزے (عصا اور ید بیضا کے معجزے) دکھائے اسی لیے فرعون انہیں جادوگر کہنے لگا اور جادوگروں کو بلا کر ان سے مقابلے کی تاریخ مقرر کی تاکہ اس طرح سے وہ موسیٰ پر غالب آجائیں اور وہ اسی روز کے انتظار میں تھا۔

بنا بریں کوئی وجہ نہیں بنتی کہ فرعون نے اس درمیانی مدت کے دوران میں موسیٰ کو ٹھکانے لگانے کا ارادہ کیا ہو یا مصر کے لوگوں کے دین کی تبدیلی کا اسے خوف ہو۔[1]

خلاصہ کلام انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ بذاتِ خود موسیٰ علیہ السلام ان کے لیے ایک عظیم خطرہ ہیں لیکن اگر ان حالات میں انہیں قتل کر دیا جائے تو یہ حادثہ ایک "تحریک" میں بدل جائے گا جس پر کنٹرول کرنا بھی مشکل ہو جائے گا اور اس سے جان چھڑانی مشکل تر ہو جائے گی۔

فرعون کے کچھ درباری ایسے بھی تھے جو قلبی طور پر فرعون سے راضی نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ موسیٰ زندہ رہیں اور فرعون کی تمام تر توجہ انہی کی طرف مبذول رہے اس طرح سے وہ چار دن آرام کے ساتھ بسر کریں اور فرعون کی آنکھوں سے اوجھل رہ کر ناجائز مفاد اٹھاتے رہیں کیونکہ یہ ایک پرانا طریقہ کار ہے کہ بادشاہوں کے درباری اس بات کی فکر میں رہتے ہیں کہ ہمیشہ ان کی توجہ دوسرے امور کی طرف مبذول رہے تاکہ وہ آسودہ خاطر ہو کر اپنے ناجائز مفادات کی تکمیل میں لگے رہیں۔ اسی لیے تو بعض اوقات وہ بیرونی دشمن کو بھی بھڑکاتے ہیں تاکہ بادشاہ کی فارغ البالی کے شر سے محفوظ رہیں۔

بہر حال فرعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کے منصوبے کی توجیہ کرتے ہوئے اپنے درباریوں کے سامنے اس کی دو دلیلیں

---

[1] تفسیر المیزان میں ہے کہ سورۂ شعراء کی آیت ۳۶ "ارجہ واخاہ" (اسے اور اس کے بھائی کو کچھ نہ کہو) اس بات کی دلیل ہے کہ کچھ لوگ ایسے تھے جو فرعون کو موسیٰ کے قتل سے روکتے تھے۔ لیکن موسیٰ کی داستان سے متعلقہ آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جناب موسیٰ کے قتل کا منصوبہ زیر غور نہیں تھا۔ اس وقت صرف اور صرف یہ بات پیش نظر تھی کہ دیکھیں آیا موسیٰ اپنے دعوے میں سچے ہیں یا جھوٹے؟ قتل کا منصوبہ تو اس وقت زیر غور آنے لگا جب موسیٰ جادوگروں پر غالب آگئے اور مصر کے بہت سے لوگوں کے دل میں ان کا اثر و رسوخ بڑھ گیا اور اس طرح سے فرعون کو اپنا تخت و تاج خطرے میں نظر آنے لگا۔

بیان کیں۔ ایک کا تعلق دینی اور روحانی پہلو سے تھا اور دوسری کا دنیادی اور مادی سے۔ وہ کہنے لگا: مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ تمھارے دین کو تبدیل کر دے گا اور تمھارے باپ دادا کے دین کو دگرگوں کر دے گا (انی اخاف ان یبدل دینکم)۔

یا یہ کہ زمین میں فساد اور خرابی برباد کر دے گا (او ان یظھر فی الارض الفساد)۔

اگر میں خاموشی اختیار کروں تو موسٰی کا دین بہت جلد مصر والوں کے دلوں میں اتر جائے گا اور بت پرستی کا "مقدس دین" جو تمھاری قومیت اور مفادات کا محافظ ہے ختم ہو جائے گا اور اس کی جگہ توحید پرستی کا دین لے لے گا جو یقیناً تمھارے سو فیصد خلاف ہوگا۔

اگر میں آج خاموش ہو جاؤں اور کچھ عرصہ بعد موسٰی سے مقابلہ کرنے کے لیے اقدام کروں تو اس دوران میں وہ اپنے بہت سے دوست اور ہمدرد پیدا کر لے گا جس کی وجہ سے زبردست لڑائی چھڑ جائے گی جو ملکی سطح پر خونریزی، گڑبڑ اور بے چینی کا سبب بن جائے گی۔ اسی لیے مصلحت اسی میں ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

البتہ "فرعون" کے نکتۂ نظر سے "دین" کی تعبیر اس کی اپنی یا بتوں کی پوجا پاٹ کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ ایسا "دین" جس سے لوگوں کے دل و دماغ کو مخمور اور خود ان کو احمق بنایا جا سکے۔ ایسا "دین" جس سے اس جابر اور خونخوار بھیڑیئے کے جابرانہ تسلط کو مقدس سمجھا جائے۔

اسی طرح استکباری نظام کے خلاف ایک ایسا انقلاب جس سے قید و بند کی زنجیریں توڑ کر عوام الناس کو آزادی دلائی جا سکے اور بت پرستی کے آثار مٹا کر توحید الٰہی کو زندہ کیا جائے اس کی نظر میں "فساد" تھا۔

جابر اور مفسد لوگوں کا ابتدا ہی سے یہی طریقہ کار چلا آرہا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے اور مردان خدا کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے ان دو جھوٹے بہانوں کا سہارا لیتے ہیں، جس کے کئی نمونے آج بھی ہمیں دنیا کے گوشہ و کنار میں نظر آتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس گفتگو سے موسٰی علیہ السلام نے کس ردعمل کا اظہار کیا جو اس مجلس میں تشریف فرما بھی تھے، قرآن کہتا ہے: موسٰی نے کہا: میں اپنے پروردگار اور تمھارے پروردگار کی ہر اس متکبر سے پناہ مانگتا ہوں جو روز حساب پر ایمان نہیں لاتا (وقال موسٰی انی عذت بربی و ربکم من کل متکبر لا یؤمن بیوم الحساب)۔

موسٰی علیہ السلام نے یہ باتیں بڑے سکون قلب اور اطمینان خاطر سے کیں۔ جو ان کے قوی ایمان اور ذاتِ کردگار پر کامل بھروسے کی دلیل ہیں۔ اور اس طرح سے ثابت کر دیا کہ اس کی اس دھمکی سے وہ ذرہ بھر بھی نہیں گھبرائے۔

حضرت موسٰی علیہ السلام کی اس گفتگو سے ثابت ہوتا ہے کہ جن لوگوں میں مندرجہ ذیل دو صفات پائی جائیں وہ نہایت ہی خطرناک افراد ہیں۔ ایک "تکبر" اور دوسرے "قیامت پر ایمان نہ رکھنا" اور اس قسم کے افراد سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

"تکبر" اس بات کا باعث بن جاتا ہے کہ انسان اپنے علاوہ کسی اور کو درخور اعتناء نہیں سمجھتا، خدا کی آیات اور معجزات کو جادو گردانتا ہے، مصلحین کو مفسدین کا نام دیتا ہے اور دوستوں اور ساتھیوں کی نصیحتوں کو سازش اور کمزوری پر محمول کرتا ہے۔

نیز روز حساب پر ایمان نہ رکھنا اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ اس کے معمول اور کاروبار میں کسی قسم کی منصوبہ بندی اور حساب وکتاب نہیں ہوتے، اپنی محدود سی طاقت کے ذریعے پروردگار کی لامحدود قدرت سے مقابلہ کے لیے کمربستہ ہو جاتا ہے اور خدا کے پیغمبروں کے خلاف مقابلے کی ٹھان لیتا ہے، اس لئے کہ وہ خود کسی حساب وکتاب کا پابند نہیں ہوتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فرعون کی یہ دھمکی کہاں تک کارگر ثابت ہوئی؟ بعد کی آیات اس مسئلے سے پردہ اٹھاتی ہیں اور اس مغرور و متکبر شخص کے ہاتھوں سے موسیٰ علیہ السلام کی نجات کی کیفیت واضح کرتی ہیں۔

۲۸۔ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝

۲۹۔ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝

ترجمہ

۲۸۔ آلِ فرعون میں سے ایک مؤمن شخص نے کہ جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا کہا: آیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، جبکہ وہ تمھارے رب کی طرف سے واضح دلائل بھی لا چکا ہے۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو جھوٹ خود اس کا دامن پکڑے گا اور اگر سچا ہے تو کم از کم تمھیں جن بعض عذابوں کی وعید دیتا ہے وہ تم تک پہنچ جائیں گے۔ خداوند اس شخص کو ہدایت نہیں کرتا جو اسراف کرنے والا ہوتا ہے اور جو بہت ہی جھوٹا ہوتا ہے۔

۲۹۔ اے میری قوم! آج حکومت تمھارے پاس ہے اور تم اس سرزمین میں کامیاب بھی ہو۔ اگر عذابِ الٰہی ہمارے پاس آ بھی گیا تو پھر کون ہماری مدد کرے گا؟ فرعون نے کہا: میں اس کے سوا تمھیں اور

کچھ نہیں دکھا سکتا جس کا میں اعتقاد رکھتا ہوں اور حق و کامیابی کی راہ کے علاوہ تمہیں کسی اور چیز کی دعوت نہیں دیتا (موسیٰ کے قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا)۔

تفسیر

آیا کسی کو خدا کی طرف بلانے پر بھی قتل کرتے ہیں؟

یہاں سے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی تاریخ کا ایک اور اہم کردار شروع ہوتا ہے جو قرآن مجید کی صرف اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے "مؤمن آل فرعون" جو فرعون کے قریبیوں میں سے تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ توحید قبول کر چکا تھا لیکن اپنے اس ایمان کو ظاہر نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو خاص طریقے سے موسیٰ علیہ السلام کی حمایت کا پابند سمجھتا تھا جب اس نے دیکھا کہ فرعون کے غیظ و غضب سے موسیٰ علیہ السلام کی جان کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے تو مردانہ وار آگے بڑھا اور اپنی دل نشین اور مؤثر گفتگو سے قتل کی اس سازش کو ناکام بنا دیا۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: آلِ فرعون میں سے ایک شخص نے جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا کہا: آیا کسی شخص کو صرف اس بنا پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟ (وقال رجل مؤمن من اٰل فرعون یکتم ایمانه اتقتلون رجلاً ان یقول ربی اللہ)۔

حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے معجزات اور واضح دلائل اپنے ساتھ لایا ہے (وقد جاءکم بالبینات من ربکم)۔

آیا تم اس کے عصا اور ید بیضا جیسے معجزات کا انکار کر سکتے ہو؟ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے اس کے جادوگروں پر غالب آجانے کا مشاہدہ نہیں کیا؟ یہاں تک کہ جادوگروں نے اس کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور ہماری پرواہ تک نہ کی اور نہ ہی ہماری دھمکیوں کو خاطر میں لائے اور موسیٰ کے خدا پر ایمان لا کر اپنا سر اس کے آگے جھکا دیا ذرا صحیح بتاؤ کیا ایسے شخص کو جادوگر کہا جا سکتا ہے؟ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو، جلد بازی سے کام نہ لو اور اپنے اس کام کے انجام کو بھی اچھی طرح سوچ لو تاکہ بعد میں پشیمان نہ ہونا پڑے۔

ان سب سے قطع نظر یہ دو حال سے خالی نہیں "اگر وہ جھوٹا ہے تو جھوٹ اس کا خود ہی دامن گیر ہو گا اور اگر سچا ہے تو کم از کم جس عذاب سے تمہیں ڈرایا گیا ہے وہ کچھ نہ کچھ تو تمہارے پاس پہنچ ہی جائے گا (وان یک کاذباً فعلیه کذبه وان یک صادقاً یصبکم بعض الذی یعدکم)۔

یعنی اگر وہ جھوٹا ہے تو جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، آخر کار ایک نہ ایک دن اس کا پول کھل جائے گا اور وہ اپنے جھوٹ کی سزا پالے گا لیکن یہ امکان بھی تو ہے کہ شاید وہ سچا ہو اور خدا کی جانب سے بھیجا گیا ہو۔ تو پھر ایسی صورت میں اس کے کئے ہوئے وعدے

کسی نہ کسی صورت میں وقوع پذیر ہو کر رہیں گے۔ لہٰذا اس کا قتل کرنا عقل و خرد سے کوسوں دور ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا: "اللہ تعالیٰ مسرف اور جھوٹے کی ہدایت نہیں فرماتا" (ان اللہ لایھدی من ھو مسرف کذاب)۔

اگر حضرت موسیٰ تجاوز و اسراف و دروغ کو اختیار کرتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی ہدایت حاصل نہ کر سکتے اور اگر تم بھی ایسے ہی ہو گئے تو اس کی ہدایت سے محروم ہو جاؤ گے۔

یہ آخری عبارت اگرچہ ذومعنی ہے اور اس کے دو پہلو ہیں لیکن ظاہری بات ہے کہ مؤمن آلِ فرعون کے پیش نظر فرعون اور فرعون والوں کی کیفیت اور صورتِ حال تھی اور اس کا اس عبارت اور بعد کی عبارتوں میں خدا کی ربوبیت پر بار بار زور دینا اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ فرعون یا کم از کم فرعونیوں کا ایک گروہ اللہ کی ربوبیت پر اجمالی عقیدہ رکھتے تھے۔ وگرنہ اس کی یہ تعبیرات اس کا موسیٰ کے خدا پر ایمان اور بنی اسرائیل کے ساتھ تعاون اور ہمکاری تصور کیا جاتا اور اس نے "تقیہ" کا جو طریقہ کار اپنایا ہوا تھا اس اصول سے ہم آہنگ نہ ہوتا۔

اس مقام پر بعض مفسرین کی طرف سے دو سوال کئے جاتے ہیں؛

ایک یہ کہ اگر موسیٰ جھوٹے تھے تو ان کا جھوٹ صرف ان کے اپنے لیے ہی نقصان دہ نہ تھا بلکہ تمام معاشرہ بھی اس کی لپیٹ میں آجاتا۔ کیونکہ معاشرے کے انحراف کا سبب بن جاتا۔ صرف ان کی ذلت تک محدودیت کیسی؟

دوسرے یہ کہ اگر وہ سچے تھے تو ان کے تمام وعدے عملی جامہ پہنتے، یہ بعض کا تذکرہ کیوں ہوا ہے؟

پہلے سوال کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد صرف جھوٹ کی سزا ہے جو صرف جھوٹے ہی کو ملتی ہے اور خدا کا عذاب اس کے شر کو دور کرنے کے لیے کافی ہے یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص خدا پر جھوٹ باندھے اور خدا لوگوں کی گمراہی کے لیے اسے اپنے حال پر چھوڑ دے؟

دوسرے سوال کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے تمہیں دنیا اور آخرت کے عذاب کی دھمکی دی ہے لہٰذا اگر وہ سچا ہے تو اس کا ایک حصہ جو دنیاوی عذاب سے متعلق ہے وہ تمہیں دامنگیر ہوگا یا پھر اس سے مراد کم از کم حد ہے کہ اگر اس کی تمام باتوں کو نہیں مانتے ہو تو کم از کم اس کی کچھ باتوں کا سچا ہونا تو ممکن ہے۔

بہرحال مؤمن آلِ فرعون اس گفتگو کے ذریعے فرعون اور اس کے درباریوں کو چند طریقوں سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا رہا۔

پہلا یہ کہ موسیٰ کے اس عمل پر اس قدر شدید ردعمل کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

دوسرے یہ کہ اس کے پاس ایسے دلائل ہیں جو بظاہر قابل قبول نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ایسے شخص کے ساتھ مقابلہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ تمہارے کسی قسم کے اقدام کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر وہ جھوٹا ہے تو خدا خود اس سے نمٹ لے گا اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ سچا ہو تو پھر ایسی صورت میں خدا ہم سے نمٹے گا۔

مؤمن آلِ فرعون نے اس پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اپنی گفتگو کو جاری رکھا، دوستی اور خیر خواہی کے انداز میں ان سے یوں گویا ہوا: اے میری قوم! آج مصر کی طویل و عریض سرزمین پر تمہاری حکومت ہے اور تم ہر لحاظ سے غالب اور کامیاب ہو، اس قدر بے اندازہ نعمتوں کا کفران نہ کرو، اگر خدائی عذاب ہم تک پہنچ گیا تو پھر ہماری کون مدد کرے گا (یا قوم لکم الملک الیوم ظاھرین فی الارض فمن ینصرنا من بأس اللہ ان جاءنا)۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا مقصد یہ ہو کہ آج تمہارے ہاتھ میں ہر قسم کی طاقت موجود ہے اور موسیٰ کے بارے میں جو چاہو رائے قائم کر سکتے ہو اور جو چاہو اس کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہو لیکن اپنی طاقت کے گھمنڈ میں ہی نہ رہو اس سے پیدا ہونے والے انجام کو بھی مدِنظر رکھو۔

ظاہراً اس کی یہ باتیں "فرعون کے ساتھیوں" کے لیے غیر مؤثر ثابت نہیں ہوئیں انہیں نرم بھی بنا دیا اور ان کے غصے کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔

لیکن یہاں پر فرعون نے خاموشی مناسب نہ سمجھی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "بات وہی ہے جو میں نے کہہ دی ہے" جس چیز کا میں معتقد ہوں اسی کا تمہیں بھی حکم دیتا ہوں میں اس بات کا معتقد ہوں کہ ہر حالت میں موسیٰ کو قتل کر دینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے (قال فرعون ما اریکم الا ما اریٰ)۔

اور جان لو کہ میں تمہیں حق اور کامیابی کے رستے کے علاوہ اور کسی بات کی دعوت نہیں دیتا (وما اھدیکم الا سبیل الرشاد)۔

پوری تاریخ میں تمام جابروں اور طاغوتوں کی یہی صورت حال رہی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی رائے ہی کو صائب اور برحق سمجھتے ہیں۔ اپنی رائے کے سامنے کسی کو رائے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتے۔ بزعم خود وہ ہی عقلِ کل ہوتے ہیں اور دوسرے عقل و خرد سے بالکل عاری اور یہی ان کی حماقت اور جہالت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

چند ایک نکات

۱۔ مؤمن آلِ فرعون کون تھا؟ قرآنی آیات سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ آلِ فرعون میں سے تھا جو موسیٰ پر ایمان لے آیا تھا لیکن اپنے ایمان کو چھپاتا تھا دل ہی دل میں موسیٰ سے محبت کرتا تھا اور اپنے آپ کو حضرت موسیٰ کا دفاع کرنے کا پابند سمجھتا تھا۔

وہ نہایت زیرک، سمجھدار اور موقع شناس انسان تھا منطق اور استدلال میں نہایت قوی تھا اور اس قدر باسمجھ انسان تھا کہ نہایت ہی حساس لمحات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدد کو پہنچا اور جیسا کہ بعد کی آیات سے پتہ چلے گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل جیسی خطرناک سازش سے نجات دلائی۔

اسلامی روایات اور مفسرین کے اقوال میں اس خدا شناس شخص کی بہت تعریف کی گئی ہے۔

جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ؛ وہ فرعون کا چچا زاد یا خالہ زاد بھائی تھا اور انہوں نے "آل فرعون" کی تعبیر کو بھی اس معنی پر گواہ سمجھا ہے کیونکہ عموماً آل کا اطلاق نزدیکی رشتہ داروں پر ہوتا ہے ہر چند کہ دوست واحباب پر بھی لفظ بولا گیا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین اسے اللہ کا ایک نبی سمجھتے ہیں جس کا نام "حزبیل" یا حزقیل تھا۔[1]

---

[1] یہ معنی پیغمبر اسلامؐ کی ایک روایت سے نقل کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو امالی شیخ صدوق منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۱۹) لیکن اگر دیکھا جائے تو "حزقیل" بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے تھے۔ لہٰذا یہ احتمال بعید معلوم ہوتا ہے اور مندرجہ بالا روایت بھی سند کے لحاظ سے ضعیف ہے یہ اور بات ہے کہ یہ حزقیل بنی اسرائیل کے وہ مشہور نبی نہ ہوں بلکہ اس نام کا کوئی اور شخص ہو۔

بعض روایت کرتے ہیں کہ وہ فرعون کے گنجینوں اور خزانوں کا سرپرست اور خازن تھا۔[1]

ابن عباس سے روایت ہے کہ فرعون والوں میں سے صرف تین افراد حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے، ایک تو مؤمن آل فرعون، دوسرے فرعون کی زوجہ اور تیسرے وہ شخص جس نے حضرت موسیٰ کو نبوت ملنے سے پہلے خبردار کیا کہ :

فرعون کے درباری اپنے ایک پیروکار کے قتل کے بدلے آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں لہٰذا جتنا جلدی ہو سکے آپ مصر سے نکل جائیں۔ (قصص۔ ۲۰)

لیکن کچھ ایسے قرائن بھی ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جادوگروں کے ساتھ مقابلے کے بعد لوگوں کی بہت بڑی تعداد موسیٰ پر ایمان لے آئی تھی اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن آل فرعون کا ماجرا جادوگروں کے واقعے کے بعد کا ہے۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ مؤمن آل فرعون کا تعلق دراصل بنی اسرائیل سے تھا جو فرعونیوں میں مکمل مل کر زندگی بسر کر رہا تھا اور اس پر ان کا بہت حد تک اعتماد بھی تھا لیکن یہ احتمال کافی حد تک ضعیف نظر آتا ہے کیونکہ یہ ایک تو "آل فرعون" کی اور دوسرے "یا قوم" (اے میری قوم) کی تعبیر سے ہم آہنگ نہیں ہے البتہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کی تاریخ میں اس کا مسلّم اور مؤثر کردار مکمل طور پر واضح ہے۔ اگرچہ اس کی زندگی کے تمام پہلو ہمیں آج تک واضح طور پر معلوم نہیں ہیں۔

۲۔ تقیہ ـــ مقابلے کا ایک مؤثر ذریعہ "تقیہ" یا "عقیدۂ باطنی کا چھپانا" بعض لوگوں کے گمان کے برخلاف کمزوری، خوف اور مطلب براری کا نام نہیں ہے بلکہ طاقتوروں، ظالموں اور جابروں کے ساتھ مقابلے کے ایک مؤثر ذریعے کے عنوان سے اس سے کام لیا جاتا ہے، دشمن کے رازوں کا پتہ لگانا ایسے افراد کے بغیر ناممکن ہے جو تقیہ کے "طریقۂ کار" سے کام لیتے ہیں۔

دشمن کو غافل کر کے اس کے پیکر پر کاری ضربیں لگانا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اپنے منصوبوں کو چھپایا نہ جائے اور تقیہ سے کام لیا نہ جائے۔

مؤمن آلِ فرعون کا تقیہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے دین کی خدمت اور حساس ترین بلکہ بحرانی ترین لمحات میں ان کی جان کی حفاظت کے لیے تھا۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان کا اپنا کوئی نہ کوئی آدمی دشمن کے گروہ میں موجود ہو تاکہ اس کی چالوں اور منصوبوں کی اچھی طرح معلومات حاصل کر کے ان سے پوری طرح باخبر ہو اور بوقت ضرورت دوستوں کو اس سے مطلع کرے۔ بلکہ اگر ضرورت پڑ جائے تو دشمن کی سوچ اور فکر تک رسائی حاصل کر کے اس کے منصوبوں اور چالوں کو ناکام بنا دے۔

اگر مؤمن آلِ فرعون "تقیہ" کی ٹیکنیک سے استفادہ نہ کرتا تو کیا اس قدر عظیم خدمات انجام دے سکتا تھا؟

اسی لیے تو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں آیا ہے :

التقیۃ دینی و دین اٰبائی، ولا دین لمن لا تقیۃ لہ، و التقیۃ ترس اللّٰہ فی الارض،

لان مؤمن اٰل فرعون لو اظھر الاسلام لقتل

تقیہ میرا دین ہے اور میرے آباؤ اجداد کا دین ہے۔ جس کا تقیہ نہیں اس کا دین نہیں، تقیہ روئے زمین

---

[1] یہ معنی علی بن ابراہیم کی تفسیر میں بھی آیا ہے (تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۱۸)۔

پر خدا کی طرف سے ایک ڈھال ہے کیونکہ اگر مومن آل فرعون اپنے ایمان کا اظہار کر دیتا تو قتل کر دیا جاتا۔[1]

خاص ایسے مقامات پر جہاں مومنین اقلیت میں ہوں اور ایسی اکثریت کے درمیان پھنسے ہوئے ہوں جو نہ تو کسی دلیل اور منطق کو سمجھتی ہو اور نہ ہی اس میں رحم کا ذرہ ہو تو ایسی صورت میں کوئی بھی عقل اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ سوائے ضرورت کے خاص موقع کے اپنے ایمان کا اظہار کر کے اپنی فعال توانائیاں ضائع کر دی جائیں۔ بلکہ ایسے خاص حالات کے پیش نظر اپنے عقیدے کو چھپا کر اپنی توانائیوں کو یکجا اور اکٹھا کر کے آخری حملے کے لیے آمادہ کیا جانا چاہیے۔

خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی نے بھی اپنے قیام کے آغاز میں کئی سالوں تک اپنی دعوت کو مخفی رکھا اور اسی طریقہ کار سے کام لیتے رہے جب ایک عرصے کے بعد آپ کے دوستوں کی تعداد زیادہ ہو گئی اور مرکزی بنیاد مضبوط ہو گئی تو پھر اسلام کی کھلم کھلا دعوت کا اظہار فرمایا۔

اس ضمن میں دوسرے انبیاء عظام میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لیا جا سکتا ہے۔ باوجودیکہ آپ ایک شجاع اور نڈر انسان تھے لیکن بتوں کے توڑنے کے موقع پر آپ نے تقیہ کے طریقہ کار سے کام لیا اور اپنے منصوبے کو بت پرستوں سے مخفی رکھا۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہوتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا بزرگوار جناب حضرت ابو طالب نے آخر عمر تک تقیہ کی روش ترک نہیں کی صرف چند ایک لیکن خاص موقعوں پر اپنے ایمان کا اظہار کیا اور دوسرے مواقع پر صراحت کے ساتھ کوئی بات نہیں کی تاکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان بچانے کے سلسلے میں مؤثر کردار ادا کر سکیں اور ہٹ دھرم بے رحم اور کینہ پرور بت پرست آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں۔

بہرحال بعض جاہل اور حقائق سے بے خبر لوگوں نے جو یہ سمجھ رکھا ہے کہ تقیہ صرف مذہب شیعہ ہی کے لیے مخصوص ہے یا یہ کمزوری اور جھوٹ کی علامت ہے تو ان کی یہ سوچ مکمل طور پر بے بنیاد اور ہر قسم کی منطق سے دور ہے کیونکہ کسی استثناء کے بغیر تمام مذاہب اور مکاتیب فکر میں کسی نہ کسی صورت میں یہ ضرور موجود ہے۔

مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی دوسری جلد (سورۂ آل عمران آیت ۲۸ کے ذیل میں) اور چھٹی جلد (سورۂ نحل کی آیت ۱۰۶ کے ذیل میں) مطالعہ فرمائیں۔

۳۔ صدیقین کون ہیں؟: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض احادیث میں ہے کہ

الصدیقون ثلاثۃ "حبیب النجار" مؤمن آل یٰس الذی یقول "فاتبعوا المرسلین اتبعوا من لا یسئلکم اجرًا" و "حزقیل" مؤمن آل فرعون، و "علی بن ابی طالب"، و ھو افضلھم

"سب سے پہلے (بزرگ انبیاء کی) تصدیق کرنے والے تین لوگ ہیں حبیب نجار مؤمن آل یٰس جس نے (انطاکیہ) کے لوگوں سے کہا خدا کے رسولوں کی پیروی کرو، ان لوگوں کی اتباع کرو جو تم سے کسی قسم کی اجرت بھی نہیں مانگتے اور خود ہدایت یافتہ ہیں اور حزقیل مؤمن آل فرعون اور علی بن ابی طالب جو ان سب سے افضل اور برتر ہیں۔"

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۸ صفحہ ۵۲۱ (زیر بحث آیات کے ذیل میں)۔

یہ حدیث شیعہ اور سنی دونوں مذاہب کی کتابوں میں موجود ہے[1]

سچ بات بھی یہی ہے کہ ان افراد نے خدا کے انبیاء کی اس وقت تصدیق کی اور ان پر ایمان کا اظہار کیا جب انبیاء کے لیے زبردست بحرانی لمحات تھے انہوں نے اس وقت اور بحرانی لمحوں میں پیش قدمی کی اور صحیح معنوں میں "صدیق" کہلانے کے حقدار ہیں۔ یہ ان لوگوں کے سرخیل ہیں جنہوں نے خدا کے انبیاء کی تصدیق کی خصوصاً علی بن ابی طالب علیہ السلام کہ جنہوں نے اپنی ساری زندگی وقف ہی پیغمبر اسلامؐ کے لیے کردی تھی آپؑ نے خود پیغمبر اکرمؐ کی زندگی بلکہ ان کی رحلت کے بعد بھی ایثار و فداکاری کی ایسی روشن مثالیں قائم کیں جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گی۔

---

[1] ملاحظہ ہو "امالی شیخ صدوق" اور ابن حجر کی کتاب "صواعق محرقہ" فصل ثانی باب ۹۔

۳۰۔ وَقَالَ الَّذِیٓ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡٓ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ مِّثۡلَ یَوۡمِ الۡاَحۡزَابِ ۙ○

۳۱۔ مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ وَالَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ؕ وَمَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ ○

۳۲۔ وَیٰقَوۡمِ اِنِّیۡٓ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ یَوۡمَ التَّنَادِ ۙ○

۳۳۔ یَوۡمَ تُوَلُّوۡنَ مُدۡبِرِیۡنَ ۚ مَا لَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ○

ترجمہ

۳۰۔ اس باایمان شخص نے کہا: اے میری قوم! مجھے تمہارے بارے میں گزشتہ اقوام کے (عذاب کے) دن کی طرح کا خوف ہے۔

۳۱۔ میں قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد والے لوگوں کی (شرک، کفر اور سرکشی جیسی) عادت سے ڈرتا ہوں۔ اور خدا بندوں پر ظلم نہیں چاہتا۔

۳۲۔ اے میری قوم! مجھے تمہارے لیے اس دن سے خوف ہے جس دن لوگ ایک دوسرے کو بلائیں گے (اور ایک دوسرے سے مدد طلب کریں گے لیکن ان کی ایک بھی نہیں سنی جائے گی)۔

۳۳۔ جس دن تم منہ پھیر کر بھاگ رہے ہو گے لیکن خدا کے عذاب سے تمہیں کوئی چیز نہیں بچا سکے گی اور جسے خدا (اس کے اعمال کی وجہ سے) گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت کرنے والا نہیں ہے۔

تفسیر

میں تمھیں خبردار کرتا ہوں!

اس دور میں مصر کے لوگ ایک حد تک متمدن اور پڑھے لکھے تھے۔ انہوں نے قوم نوح، عاد اور ثمود جیسی گزشتہ اقوام کے بارے میں مؤرخین کی باتیں بھی سن رکھی تھیں۔ اتفاق سے ان اقوام کے علاقوں کا اس علاقے سے زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا یہ لوگ ان کے دردناک انجام سے بھی کم وبیش واقفیت رکھتے تھے۔

لہٰذا مؤمن آل فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے منصوبے کی مخالفت کی۔ اس نے دیکھا کہ فرعون کو زبردست اصرار ہے کہ وہ موسیٰؑ کے قتل سے باز نہیں آئے گا۔ اس مردِ مؤمن نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور نہ ہی ہارنی چاہیے تھی۔ لہٰذا اب کہ اس نے یہ تدبیر سوچی کہ اس سرکش قوم کو گزشتہ اقوام کی تاریخ اور انجام کی طرف متوجہ کرے کہ شاید اس طرح سے یہ لوگ بیدار ہوں اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ قرآن کے مطابق اس نے اپنی بات یوں شروع کی۔ اس باایمان شخص نے کہا: اے میری قوم! مجھے تمھارے بارے میں گزشتہ اقوام کے (عذاب کے) دن کی طرح کا خوف ہے (و قال الذی اٰمن یا قوم انی اخاف علیکم مثل یوم الاحزاب)۔

پھر اس بات کی تشریح کرتے ہوئے کہا: میں قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والوں کی سی بُری عادت سے ڈرتا ہوں (مثل دأب قوم نوح وعاد وثمود والذین من بعدھم)[1]

ان قوموں کی عادت شرک، کفر اور طغیان وسرکشی تھی۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کا کیا انجام ہوا؟ کچھ تو تباہ کن طوفانوں کی نذر ہوگئیں، کچھ وحشت ناک جھگڑوں کی وجہ سے برباد ہوئیں، کچھ کو آسمانی بجلی نے جلا کر راکھ کر دیا اور کچھ زلزلوں کی بھینٹ چڑھ کر صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔

کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ کفر اور طغیان پر اصرار کی وجہ سے تم بھی مذکورہ عظیم بلاؤں میں سے کسی ایک کا شکار ہو سکتے ہو؟ لہٰذا مجھے کہنے دو کہ مجھے تمھارے بارے میں بھی اس قسم کے خطرناک مستقبل کا اندیشہ ہے۔

آیا تمھارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ تمھارے کردار اور افعال ان سے مختلف ہیں؟ آخر ان لوگوں کا کیا قصور تھا کہ وہ اس طرح کے بھیانک مستقبل سے دوچار ہوئے کیا اس کے سوا کچھ اور تھا کہ انھوں نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی دعوت کے خلاف قیام کیا، ان کی تکذیب کی بلکہ انہیں قتل کر ڈالا۔

---

[1] "دأب" (بروزن "ضرب") کا اصل معنی ہمیشہ چلنا ہے اور "دائب" اس چیز کو کہتے ہیں جو ہمیشہ چلتی رہے پھر اس کا اطلاق ہر پختہ مستقل اور ہمیشگی کی عادت پر ہونے لگا۔ یہاں پر قوم نوح وغیرہ کے لیے "دأب" کا لفظ ان کی مستقل اور دائمی عادت کی طرف اشارہ ہے جو ان میں تھی اور وہ دائمی عادت شرک، سرکشی، ظلم اور کفر ہے۔

لیکن یاد رکھو جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوگی خود تمھارے کئے کی سزا ہوگی کیونکہ "خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا (و ما اللہ یرید ظلمًا للعباد)۔

خدا نے اپنے بندوں کو اپنے فضل و کرم کے ساتھ پیدا کیا، انہیں بے شمار نعمتیں عطا کیں اور ان کی ہدایت کے لیے اپنے پیغمبر بھیجے، یہ تو ان بندوں کی مخالفت اور سرکشی ہے جو ان کے دردناک عذاب کا سبب بنتی ہے۔

پھر کہتا ہے: اے میری قوم! میں تمھارے لیے اس دن سے ڈرتا ہوں جس دن لوگ ایک دوسرے کو پکاریں گے (و یا قوم انی اخاف علیکم یوم التناد)۔

"التناد" "نداء" کے مادہ سے ہے جس کا معنی "پکارنا" ہے۔ (یہ لفظ دراصل "التنادی" تھا یاء کو حذف کر دیا گیا اور دال کا کسرہ اسی پر دلالت کرتا ہے)۔

مفسرین کے درمیان مشہور اور معروف یہی ہے کہ "یوم التناد" قیامت کا ایک نام ہے اور ہر ایک نے اس کی علیحدہ وجہ تسمیہ بیان کی ہے اور یہ وجوہات تقریبًا ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ نام دوزخی لوگوں کے بہشتیوں کو پکارنے کی وجہ سے ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ونادٰی اصحاب النار اصحاب الجنة ان افیضوا علینا من الماء او مما رزقکم اللہ

"جہنمی لوگ اہل بہشت کو پکاریں گے کہ تھوڑا سا پانی یا تھوڑی سی روزی جو تمھیں خدا نے دی ہے ہمیں دے دو۔"

تو بہشتی لوگ انہیں جواب دیں گے:

ان اللہ حرمھما علی الکافرین

"خدا نے یہ سب کچھ کافروں پر حرام کر دیا ہوا ہے۔" (اعراف - ۵۰)[1]

یا اس لیے کہ لوگ ایک دوسرے کو پکاریں گے اور ایک دوسرے سے پناہ طلب کریں گے اور مدد مانگیں گے۔

یا اس لیے کہ منادیان محشر بلند آواز سے کہیں گے:

الا لعنة اللہ علی الظالمین

"ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔" (ہود - ۱۸)

یا اس لیے کہ جب مؤمنین کو نامۂ اعمال دیا جائے گا تو وہ خوشی سے پکار اٹھیں گے:

ھاؤم اقرءوا کتابیہ

"آؤ لوگو! میرا نامۂ اعمال پڑھو۔" (حاقہ - ۱۹)

اور جب کافروں کو ان کا نامۂ اعمال دیا جائے گا تو وہ گھبرا کر فریاد بلند کریں گے:

---

[1] یہی مطلب شیخ صدوق کی کتاب "معانی الاخبار" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔

یا لیتنی لم اوت کتابیہ

"اے کاش کہ مجھے نامۂ اعمال نہ دیا جاتا۔" (حاقہ۔ ۲۵)

لیکن اس معنی کو وسیع تر تناظر میں دیکھنا چاہیے کہ "یوم التناد" کے مفہوم میں یہ دنیا بھی شامل ہے کیونکہ "یوم التناد" کا معنی صرف اور صرف "ایک دوسرے کو پکارنے کا دن" ہے اور یہ تعبیر انتہائی عاجزی اور سخت حیرت اور بے کسی کی نشانی ہے جب بھی کوئی شخص کسی مصیبت میں پھنس جاتا ہے اور ہر طرف سے اس کی امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں تو اس وقت چیخ و پکار کرتا ہے لیکن اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔

اس دنیا میں بھی "یوم التناد" بہت ہیں جس دن خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے، جس دن معاشرہ اپنے گناہوں اور غلطیوں کی وجہ سے چاروں طرف سے مشکلات میں پھنس جاتا ہے، جس دن بحران اور حوادث سب کو اپنے شکنجوں میں جکڑ لیتے ہیں تو لوگ ادھر ادھر بھاگ کر پناہ تلاش کرتے ہیں لیکن انہیں کہیں بھی پناہ نہیں ملتی اور ہر شخص چیخ و پکار کر رہا ہوتا ہے وہی دن "یوم التناد" ہوتا ہے۔

لیکن آیت "یوم التناد" کی تفسیر بیان کر رہی ہے: جس دن تم منہ پھیر کر بھاگ رہے ہو گے لیکن خدا کے عذاب سے تمہیں کوئی چیز نہیں بچا سکے گی (یوم تولون مدبرین مالکم من اللہ من عاصم)۔

اور جسے خدا (اس کے اعمال کی وجہ سے) گمراہ کر دے اسے کوئی بھی ہدایت کرنے والا نہیں ہے (ومن یضلل اللہ فمالہ من ھاد)۔

وہ لوگ اس دنیا میں راہ ہدایت سے گمراہ ہو جاتے ہیں اور جہل و ضلالت کے پردوں میں چلے جاتے ہیں لہٰذا آخرت میں بہشت اور خدا کی نعمتوں کے رستے بھول جاتے ہیں۔

ممکن ہے مندرجہ بالا عبارت فرعون کی باتوں کی طرف لطیف سا اشارہ ہو جب کہ اس نے کہا کہ:

ما اھدیکم الا سبیل الرشاد

"میں تمہیں ہدایت اور سچائی کے راستے کے علاوہ اور کوئی دعوت نہیں دیتا۔" (مؤمن۔ ۲۹)۔

۳۴۔ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۝

۳۵۔ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝

ترجمہ

۳۴۔ اس سے پہلے یوسف تمھارے پاس روشن دلائل لے کر آئے لیکن تم نے اس کی لائی ہوئی چیزوں میں اسی طرح شک کیا، یہاں تک کہ وہ اس دنیا سے سدھارے، تم نے کہا کہ اس کے بعد خدا قطعاً کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجے گا، خدا اسی طرح ہر اسراف کرنے والے اور شک کرنے والے کو گمراہ کرتا ہے۔

۳۵۔ جو لوگ خدا کی آیات کے بارے میں مجادلہ کرتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل آئی ہو، ان کا یہ کام خدا کے اور ان کے شدید غضب کا موجب ہے جو ایمان لائے ہیں۔ اسی طرح خدا ہر متکبر جبار کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

تفسیر

جابر حکمران صحیح فہم سے محروم ہیں

ان آیات میں مؤمن آل فرعون کی گفتگو کا سلسلہ جاری ہے۔

گزشتہ، موجودہ اور آئندہ آیات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "مؤمن آل فرعون نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے سیاہ اور تاریک دل میں اثر کرنے اور ان سے تکبر اور کفر کا زنگ دور کرنے کے لیے اپنی گفتگو کو پانچ مرحلوں میں بیان کیا ،

پہلے مرحلے میں اس نے ذو معنی اور احتیاط پر مبنی گفتگو کی اور اس کا فراد سرکش قوم کو احتمالی نقصان سے بچنے کی دعوت دی اور کہا : اگر موسیٰ جھوٹ بولتے ہیں تو یہ جھوٹ خود ان کے اپنے دامن کو پکڑے گا اور اگر سچ کہتے ہیں تو عذاب تمہیں دامن گیر ہو گا لہذا خدا سے ڈرو اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دو۔

دوسرے مرحلے میں انہیں گزشتہ اقوام کے حالات اور انجام کے بارے میں غور اور مطالعے کی دعوت دی اور انہیں اس قسم کے انجام سے بچنے کی دعوت دی۔

تیسرے مرحلے میں موجودہ آیات میں ان کی کچھ اپنی تاریخ انہیں یاد دلائی جس کا ان سے زیادہ فاصلہ بھی نہیں گزرا تھا اور انکے باہمی رابطے بھی اس سے ابھی تک نہیں ٹوٹے تھے اور یہ تھا حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت کا مسئلہ جو کہ حضرت موسیٰ کے جد امجد تھے اور ان کی دعوت کے انداز کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے :

اس سے پہلے یوسف تمہاری ہدایت کے لیے واضح اور روشن دلائل لے کر آئے (ولقد جاءکم یوسف من قبل بالبینات)[1]

لیکن تم نے اسی طرح ان کی دعوت میں بھی شک کیا (فمازلتم فی شك مما جاءكم به)۔

اس وجہ سے نہیں کہ ان کی دعوت میں کسی قسم کی پیچیدگی تھی یا ان کی آیات و دلائل ناکافی تھے بلکہ صرف اپنی انا پر قائم رہتے ہوئے تم نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور ہمیشہ شک و شبہ کا اظہار کرتے رہے۔

پھر ہر قسم کی ذمہ داری اور فرائض کی انجام دہی سے جان چھڑانے، اپنی انا کو قائم رکھنے اور خواہشات نفسانی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جب یوسف اس دنیا سے چلے گئے تو تم نے کہنا شروع کر دیا کہ ان کے بعد خدا ہرگز کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجے گا (حتّٰی اذا هلك قلتم لن يبعث الله من بعده رسولاً)۔

---

[1] واحد آیت جو جناب یوسفؑ کی نبوت پر دلالت کرتی ہے یہی آیت ہے ہر چند کہ سورۂ یوسف میں اس بات کے اشارے تو ملتے ہیں لیکن اس میں صراحت کے ساتھ یہ بات بیان نہیں ہوئی۔

تمہاری اس غلط روش کی وجہ سے ہدایت الٰہی تمہارے شامل حال نہ ہو سکی، جی ہاں "اسی طرح خدا ہر اسراف کرنے والے اور شک کرنے اور وسوسہ ڈالنے والے کو گمراہ کرتا ہے (کذالک یضل اللہ من ھو مسرف مرتاب)۔

تم نے ایک طرف تو اسراف اور خدائی حدود سے تجاوز کرنے کا راستہ اختیار کیا اور دوسری طرف ہر چیز میں شک و شبہ اور وسواس سے کام لیا۔ تمہارے دونوں کام اس بات کا سبب بن گئے کہ خداوند عالم اپنے لطف و کرم کی نگاہ تم سے پھیر لے اور تمہیں ضلالت و گمراہی کی وادی میں چھوڑ دے اور تمہارا انجام اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

اب اگر موسیٰ کے بارے میں بھی تم نے اسی روش کو اپنایا اور تحقیق و جستجو سے کام نہ لیا تو ممکن ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نبی ہو لیکن اس کی ہدایت کا نور تمہارے چھپے ہوئے اور حجابوں میں پڑے ہوئے دل پر نہ چمکے۔

بعد کی آیت "مسرف مرتاب" کی تشریح کرتے ہوئے کہتی ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو بغیر کسی ایسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو خدا کی آیات میں مجادلہ کرتے ہیں (الذین یجادلون فی اٰیات اللہ بغیر سلطان اتاھم)[1]

اپنی گفتگو میں کوئی عقلی اور نقلی واضح دلیل رکھے بغیر خدا کی آیات بینات کا مقابلہ کرتے ہیں اور اٹکل پچوؤں، بے بنیاد وسوسوں اور مختلف حیلے بہانوں سے اپنی مخالفت جاری رکھتے ہیں۔

یہ کتنی بری بات ہے کہ حق کے مقابلے میں اس قسم کے بے بنیاد جدال خدا کے اور ان لوگوں کے عظیم غضب کا سبب بنتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں (کبر مقتاً عند اللہ وعند الذین اٰمنوا)[2]

کیونکہ جدالِ باطل اور خدا کی آیات کے مقابلے میں بغیر کسی دلیل و منطق کے محاذ آرائی ایک تو مجادلہ کرنے والوں کی گمراہی کا سبب بنتی ہے اور دوسرے عوام الناس کی بے راہروی اور ضلالت کا۔ یہ روش معاشرے میں نور حق کو خاموش اور حکومت باطل کی بنیادوں کو مستحکم کرتی ہے۔

اور آخر میں ان کے حق کے آگے نہ جھکنے کی وجہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: خدا اسی طرح ہر متکبر جبار کے دل پر مہر لگا دیتا ہے (کذالک یطبع اللہ علیٰ کل قلب متکبر جبار)[3]

جی ہاں! جو لوگ تکبر اور جباریت جیسی دوسری صفات کی وجہ سے حق کے مقابلے میں ڈٹ جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور کسی حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو خدا بھی حق جوئی اور حق خواہی کی روح ان سے سلب کر لیتا ہے اور نوبت

---

[1] یہاں پر "الذین" "مسرف مرتاب" کا بدل ہے۔ جب کہ بدل نہ مفرد اور مبدل جمع ہے کیونکہ کسی معین فرد پر نظر نہیں ہے بلکہ جنس مدنظر ہے۔

[2] "کبر" کا فاعل "الجدال" ہے جو پہلے جملے سے سمجھ میں آتا ہے اور "مقتا" اس کی تمیز ہے، بعض مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ شاید اس کا فاعل "مسرف مرتاب" ہو۔ لیکن پہلا معنی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

[3] یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں "متکبر اور جبار"، قلب کی صفت کے طور پر ذکر ہوئے ہیں (ہر چند کہ اضافت کی صورت میں ہیں) نہ کہ کسی شخص کی صفت، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبر اور جباریت کی بنیاد قلب ہے اور دہیں سے یہ انسان کے باقی تمام وجود میں سرایت کر جاتے ہیں۔ اور تمام اعضاء تکبر اور جباریت کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔

یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ حق ان کے ذائقے میں کڑوا اور باطل میٹھا ہو جاتا ہے۔

ان بیانات کے ذریعے مومن آل فرعون نے جو کچھ کرنا تھا کر دکھایا چنانچہ بعد کی آیات سے معلوم ہوگا کہ اس نے فرعون کو جناب موسیٰؑ کے قتل کی تجویز بلکہ فیصلے کے بارے میں ڈانواڈول کر دیا یا کم از کم اسے ملتوی کروا دیا اور اسی التواء سے قتل کا خطرہ ٹل گیا اور یہ تھا اس ہوشیار، زیرک اور شجاع مرد خدا کا فریضہ جو اس نے کماحقہ ادا کر دیا۔ جیسا کہ بعد کی آیات سے معلوم ہوگا کہ اس سے اس کی جان کے بھی خطرے میں پڑنے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔

۳۶۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۙ○

۳۷۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ○

ترجمہ

۳۶۔ اور فرعون نے کہا اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت تیار کر کہ شاید میں ذرائع تک پہنچ سکوں۔

۳۷۔ آسمانوں (پر چڑھنے) کے ذرائع، تاکہ میں موسیٰ کے خدا سے باخبر ہو سکوں، ہر چند کہ میں گمان کرتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔ اس طرح سے فرعون کے برے اعمال اس کی نظر میں مزین کر دیئے گئے اور وہ راہ حق سے روک دیا گیا اور فرعون (اور فرعون جیسوں) کی سازش کا انجام تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

تفسیر

موسیٰ کے خدا کی خبر لاتا ہوں

اگرچہ مؤمن آل فرعون کی باتوں نے فرعون کے دل پر اس قدر اثر کیا کہ وہ موسیٰ کے قتل سے تو باز آگیا لیکن پھر بھی غرور کی چوٹی سے نیچے نہ اترا اور اپنی شیطنت سے بھی باز نہ آیا اور نہ ہی حق بات قبول کرنے پر آمادہ ہوا۔ کیونکہ فرعون میں اس بات کی نہ تو صلاحیت

تھی اور نہ ہی لیاقت۔ لہذا اپنے شیطنت آمیز اعمال کو جاری رکھتے ہوئے اس نے ایک نئے کام کی تجویز پیش کی اور وہ ہے آسمانوں پر چڑھنے کے لیے ایک بلند و بالا برج کی تعمیر تاکہ اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کی "خبر" لے آئے! جیسا کہ زیر نظر آیات میں ہے۔

فرعون نے کہا: اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت تیار کر دو تاکہ میں اسباب و ذرائع تک پہنچ سکوں: (وقال فرعون یا ھامان ابن لی صرحًا لعلی ابلغ الاسباب)۔

ایسے اسباب و ذرائع جو مجھے آسمانوں تک لے جائیں تاکہ میں موسیٰ کے خدا سے باخبر ہو سکوں ہر چند کہ میں گمان کرتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے (اسباب السماوات فاطلع الیٰ الٰہ موسیٰ و انی لاظنہ کاذبًا)۔

جی ہاں اس قسم کے برے اعمال فرعون کی نظر میں مزین کر دیئے گئے تھے اور انھوں نے اسے راہ حق سے روک دیا تھا۔ (وکذالک زین لفرعون سوء عملہ وصد عن السبیل)۔

لیکن فرعون کی سازش اور چالوں کا انجام نقصان اور تباہی کے سوا کچھ نہیں (وما کید فرعون الا فی تباب)۔

"صرح" دراصل وضاحت اور روشنی کے معنی میں ہے۔ اسی سے "تصریح" ہے جس کا معنی ہے واضح اور آشکار کرنا۔ بعد ازاں اس کا اطلاق بلند و بالا عمارتوں اور خوبصورت اور سر بفلک محلوں پر بھی ہونے لگا کیونکہ اس نوعیت کی عمارتیں کامل طور پر واضح اور ظاہر ہوتی ہیں۔ بہت سے مفسرین اور ارباب لغت نے اسی معنی کی تصریح کی ہے۔

اور "تباب" کا معنی خسارہ اور ہلاکت ہے۔

سب سے پہلی چیز جو یہاں پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آخر اس کام سے فرعون کا مقصد کیا تھا؟ آیا وہ واقعًا اس حد تک احمق تھا کہ گمان کرنے لگا کہ موسیٰ کا خدا آسمان میں ہے؟ بالفرض اگر آسمان میں ہو بھی تو آسمان سے باتیں کرنے والے پہاڑوں کے ہوتے ہوئے اس عمارت کے بنانے کی کیا ضرورت تھی جو پہاڑوں کی اونچائی کے سامنے بالکل ناچیز تھی؟ اور کیا اس طرح سے وہ آسمان تک پہنچ بھی سکتا تھا؟

یہ بات تو بہت ہی بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ فرعون مغرور اور متکبر ہونے کے باوجود سمجھ دار اور سیاستدان شخص تو ضرور تھا جس کی وجہ سے اس نے ایک عظیم ملت کو اپنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور بڑے زور دار طریقے سے اس پر حکومت کرتا رہا۔ لہذا اس قسم کے افراد کی ہر ہر بات اور ہر ہر حرکت شیطانی حرکات و سکنات کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ لہذا سب سے پہلے اس کے اس شیطانی منصوبے کا تجزیہ و تحلیل کرنا چاہیے کہ آخر ایسی عمارت کی تعمیر کا مقصد کیا تھا؟

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے ان چند مقاصد کے پیش نظر ایسا اقدام کیا:

۱۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگوں کی فکر کو مصروف رکھے۔ موسیٰ کی نبوت اور بنی اسرائیل کے قیام کے مسئلے سے ان کی توجہ ہٹانے کے لیے اس نے یہ منصوبہ تیار کیا۔ بعض مفسرین کے بقول یہ عمارت ایک نہایت ہی وسیع و عریض زمین میں کھڑی کی گئی جس پر پچاس ہزار راج اور مزدور کام کرنے لگے۔ اس تعمیری منصوبے نے دوسرے تمام مسائل کو بھلا دیا۔ جوں جوں عمارت بلند ہوتی جاتی تھی توں توں لوگوں کی توجہ اس کی طرف زیادہ مبذول ہوتی جاتی تھی۔ ہر جگہ اور ہر محفل میں نئی خبر کے عنوان سے اس کے چرچے تھے اس نے وقتی طور پر جادوگروں پر موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی کو جو کہ فرعون اور فرعونیوں کے پیکر پر ایک کاری ضرب تھی لوگوں کے

ذہنوں سے فراموش کر دیا۔

۲۔ وہ چاہتا تھا کہ اس طرح سے زحمت کش اور مزدور طبقے کی جزوی مادی اور اقتصادی امداد کرے اور عارضی طور پر ہی سہی بیکار لوگوں کے لیے کام مہیا کرے تاکہ تھوڑا سا اس کے مظالم کو فراموش کر دیں اور اس کے خزانے کی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ احتیاج محسوس ہو۔

۳۔ پروگرام یہ تھا کہ جب عمارت پایہ تکمیل کو پہنچ جائے، تو وہ اس پر چڑھ کر آسمان کی طرف نگاہ کرے اور شاید چلہ کمان میں رکھ کر تیر چلائے اور وہ واپس لوٹ آئے تو لوگوں کو احمق بنانے کے لیے کہے کہ موسیٰ کا خدا جو کچھ بھی تھا آج اس کا خاتمہ ہو گیا ہے اب ہر شخص بالکل مطمئن ہو کر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جائے۔

ورنہ فرعون کے لیے تو صاف ظاہر تھا کہ اس کی عمارت جتنی بھی بلند ہو چند سو میٹر سے زیادہ تو اونچی نہیں جا سکتی تھی، جبکہ آسمان اس سے کئی گنا بلند اور اونچے تھے۔ پھر یہ کہ اگر بلند ترین مقام پر بھی کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھا جائے تو اس کا منظر بغیر کسی کمی بیشی کے ویسے ہی نظر آتا ہے جیسے سطح زمین سے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ فرعون نے یہ بات کر کے درحقیقت موسیٰ کے مقابلے سے ایک قسم کی پسپائی اختیار کی جبکہ اس نے کہا کہ میں موسیٰ کے خدا کے بارے میں تحقیق کرنا چاہتا ہوں "فاطلع الی الله موسیٰ" اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ ہر چند کہ میں اسے جھوٹا گمان کرتا ہوں"۔ اس طرح سے وہ یقین کی منزل سے ہٹ کر شک اور گمان کے مرحلے تک نیچے آ جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے "وکذالك زین لفرعون سوء عمله وصد عن السبیل وماکید فرعون الا فی تباب" میں سب سے پہلے فرعون کے انحراف کی بنیادی وجہ بتائی ہے اور وہ ہے تکبر، غرور اور خود خواہی جیسے قبیح اور برے اعمال کا اس کی نگاہوں میں مزین ہونا۔

پھر اس کا نتیجہ بیان کیا ہے جو راہ حق سے گمراہی کی صورت میں نکلا ہے۔ تیسرے مرحلے میں اس کے منصوبوں کی ناکامی کا اعلان کرتا ہے۔ گویا تین مختصر سے جملوں میں تین جامع مطالب۔

یقیناً اس قسم کی سیاست بازی مختصر سے عرصے کے لیے تو مؤثر واقع ہو سکتی ہے لیکن کاٹھ کی ہنڈیا بار بار چولہے پر نہیں چڑھ سکتی۔

بعض روایات میں ہے کہ "ہامان" اس فرعونی برج کو اس قدر اونچا لے گیا کہ اس کے اوپر تیز ہواؤں کی وجہ سے کام کرنا دشوار ہو گیا۔ راج اور مستری فرعون کے پاس آکر کہنے لگے اس سے اوپر مزید بلندی پر کام کرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ اس کی تعمیر کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ایسی زبردست تیز و تند ہوا چلی کہ جس نے اسے تہ و بالا کر کے رکھ دیا[1]

معلوم ہو گیا کہ فرعون کی تمام طاقت اور قدرت نمائی ہوا کے ایک جھونکے کو بھی برداشت نہ کر سکی۔

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۱۳ صفحہ ۱۲۵ (نقل از تفسیر علی بن ابراہیم)۔

۳۸۔ وَقَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ ۚ○

۳۹۔ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ ۫ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ○

۴۰۔ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ ○

ترجمہ

۳۸۔ (قوم فرعون سے) جو شخص ایمان لاچکا تھا، اس نے کہا: اے میری قوم! تم میری پیروی کرو تاکہ میں تمھیں صحیح راستے کی ہدایت کروں۔

۳۹۔ اے میری قوم! یہ دنیاوی زندگی تو بس جلد ختم ہونے والی متاع ہے اور آخرت ہی دائمی آرام کا گھر ہے۔

۴۰۔ جو شخص بُرے کام انجام دے گا اس جیسی سزا کے علاوہ اسے کچھ نہیں ملے گا اور جو شخص نیک عمل بجا لائے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت جب کہ وہ مومن ہو تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور انہیں بے حساب رزق ملے گا۔

تفسیر

تم میری پیروی کرو

ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ مومن آلِ فرعون نے اپنی گفتگو کو چند مرحلوں میں بیان کیا ہے اور یہ آیات اس کی گفتگو کا چوتھا مرحلہ ہے جس میں اس نے اپنے موضوع کو ایک اور طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ ہے انہیں دنیاوی زندگی کی ناپائیداری اور حشر ونشر کے مسئلے کی طرف متوجہ کرنا اور ان کی طرف توجہ کسی قسم کے شک وشبہ کے بغیر انسانوں کی تربیت میں گہرا اثر رکھتی ہے قرآن کہتا ہے : جو شخص ایمان لاچکا تھا اس نے پکار کر کہا اے میری قوم ! میری پیروی کرو تاکہ میں تمہیں راہ حق کی راہنمائی کروں۔ (وقال الذی اٰمن یاقوم اتبعونِ اھدکم سبیل الرشاد)۔

اس سے چند آیات قبل ہم نے پڑھا تھا کہ فرعون نے کہا تھا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی ہدایت اور بھلائی کا راستہ ہے لیکن مومن آل فرعون نے یہ بات کہہ کر درحقیقت فرعون کا جواب دیا اور اس کے دعویٰ کی تردید کر دی اور حاضرین کو بتا دیا کہ فرعون کی وسوسہ انگیز باتوں میں نہ آجائیں کیونکہ اس کی سب چالیں اور تدبیریں ناکامی کا شکار ہو جائیں گی صحیح راہ وہی ہے جو میں بتا رہا ہوں یعنی تقویٰ اور خدا پرستی کی راہ۔

پھر اس نے کہا : اے میری قوم ! اس دنیا سے دل نہ لگاؤ کیونکہ یہ چند روزہ زندگی جلد ختم ہونے والی متاع ہے اور آخرت ہی تمہارے آرام کا ابدی ٹھکانا ہے (یاقوم انما ھٰذہ الحیٰوۃ الدنیا متاع وان الاٰخرۃ ھی دار القرار)۔

ممکن ہے کہ ہم لاکھوں فریب کے ذریعے کامیاب ہو بھی جائیں حق کو پس پشت بھی ڈال دیں، ہزاروں ظلم کا ارتکاب کر بھی ڈالیں، بے گناہوں کے خون سے اپنے دامن کو آلودہ بھی کرلیں لیکن آخر کتنے دنوں تک ؟ اس دنیا میں ہماری زندگی ہے کتنی ؟ یہ چند روزہ زندگی بہت جلد گزر جائے گی اور موت کا بے رحم پنجہ ہماری گردنوں کو ضرور پکڑے گا باشکوہ اور بلند وبالا محلات وقصور سے اٹھا کر منوں مٹی تلے دبا دے گا۔ ہمارے لیے آرام وآسائش کا اصل ٹھکانا تو کوئی اور ہے۔

پھر اس دنیا کے فانی اور آخرت کے باقی ہونے کی ہی بات نہیں اس سے بھی اہم مسئلہ حساب وکتاب اور سزا وجزا کا ہے "جو شخص برے کام انجام دے گا اس کے مطابق اسے سزا دی جائے گی اور جو نیک اعمال بجا لائے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو وہ بہشت میں داخل ہوگا اور اسے بے حد حساب رزق وروزی دی جائے گی (من عمل سیّئۃ فلا یجزیٰ الا مثلھا ومن عمل صالحًا من ذکر او انثٰی وھو مؤمن فاولٰئک یدخلون الجنۃ یرزقون فیھا بغیر حساب)۔

وہ اپنی اس جچی تلی گفتگو میں ایک طرف تو خداوند عالم کے عدل وانصاف کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ وہ مجرموں کو صرف ان کے جرم کے مطابق سزا دے گا۔

دوسری طرف اس کے بے انتہا فضل وکرم کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ مومنین کو ان کے ایک نیک عمل کے بدلے میں بے حد وحساب جزا عطا فرمائے گا، اور اس سلسلے میں اس امر کو مدنظر نہیں رکھا جائے گا کہ ایک نیکی کے بدلے صرف ایک جزا ملے، نہیں بلکہ بے حد وحساب جزا ملے گی اور جزا بھی ایسی کہ جسے نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا ہوگا بلکہ کسی شخص کے تصور تک میں نہیں آئی ہوگی۔

ساتھ ہی وہ اپنی گفتگو میں ایمان اور عمل صالح کے لازم ملزوم ہونے کی یاد دہانی بھی کروا رہا ہے۔

اور یہ بھی بتا رہا ہے کہ انسانی اقدار کے لحاظ سے اللہ کی بارگاہ میں مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بہرحال وہ اپنی اس مختصر سی گفتگو کے ذریعے یہ حقیقت بیان کر رہا ہے کہ اگرچہ اس دنیا کی متاع ناچیز اور ناپائیدار ہے لیکن اس میں اس قدر صلاحیت ضرور پائی جاتی ہے کہ وہ بے حد وحساب جزا تک پہنچنے کا وسیلہ بن سکتی ہے اور اس معاملے سے زیادہ منافع بخش اور کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟

ضمنی طور پر یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ "مثلها" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے جہان کی سزائیں بالکل اسی طرح ہیں جس طرح انسان اس دنیا میں کام انجام دیتا ہے۔ اور "غیر حساب" کی تعبیر بتاتی ہے بخشش کا حساب وکتاب وہی رکھتا ہے جس کے پاس نعمتیں اور مال محدود ہوتا ہے اور اسے اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ اگر حساب وکتاب نہ رکھا گیا تو مال ختم ہو جائے گا یا کم از کم، گھٹ جائے گا۔ لیکن جس کی نعمتوں کے خزانے بے انتہا اور غیر محدود ہوں، جتنا بھی کسی کو بخش دے پھر بھی کوئی خزانہ کم نہ ہونے پائے اسے حساب وکتاب کے ساتھ عطا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ (کیونکہ جس قدر بھی ان سے اٹھالیں پھر بھی غیر محدود اور بے انتہا ہیں)۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آیا یہ آیت سورۂ انعام کی آیت ۱۶۰ کے ساتھ متصادم نہیں ہو رہی جس میں کہا گیا ہے کہ:

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها

جو ایک نیکی لائے گا اس جیسی دس پائے گا۔

تو جواب کے لیے اس نکتے کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ یہ دس گنا اجر تو اس کی کم از کم حد ہے یہی وجہ ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرنے کا ثواب سات سو گنا بلکہ اس سے بھی بیشتر ہے جو بے حد وحساب مرحلے تک جا پہنچتا ہے اور یہ حد اور حساب صرف خدا کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔

۴۱۔ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ؕ○

۴۲۔ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ○

۴۳۔ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ○

۴۴۔ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ○

۴۵۔ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۚ○

۴۶۔ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ○

ترجمہ

۴۱۔ اے میری قوم! کیا وجہ ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف دعوت دیتا ہوں لیکن تم مجھے آگ کی طرف بلاتے ہو؟

۴۲۔ تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں خدائے واحد کا منکر ہو جاؤں اور جس کا مجھے علم نہیں اسے میں اس

کا شریک ٹھہراؤں۔ حالانکہ میں تو تمھیں خداوند عزیز وغفار کی طرف بلاتا ہوں۔

۴۳۔ جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو اس کی دنیا اور آخرت میں قطعاً کوئی دعوت (اور حکومت) نہیں اور قیامت کے دن ہم سب کی بازگشت صرف اور صرف خدا کی طرف ہوگی اور مسرف لوگ تو ہیں ہی جہنمی۔

۴۴۔ جو میں کہہ رہا ہوں بہت جلد تم اسے سمجھ لوگے میں اپنا سارا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں وہ اپنے بندوں کے بارے میں اچھی طرح سمجھتا ہے۔

۴۵۔ خدا نے اسے ان لوگوں کی بُری چالوں سے بچا لیا اور آل فرعون پر سخت عذاب نازل ہوا۔

۴۶۔ ان کا عذاب، آگ ہے کہ ہر صبح شام جس کے پاس وہ پیش کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو حکم ملے گا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں بھیج دو۔

تفسیر

آخری بات

پانچویں اور آخری مرحلے پر مومن آل فرعون نے تمام حجاب الٹ دیئے اور اس سے زیادہ اپنے ایمان کو نہ چھپا سکا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ چکا اور فرعون والوں نے بھی ـــــ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا ـــــ اس کے بارے میں بڑا خطرناک فیصلہ کیا۔

قرآئن بتاتے ہیں کہ اس خود غرض، معزور اور ضدی مزاج قوم نے اس بہادر اور با ایمان شخص کی باتوں کو سُن کر خاموشی اختیار نہیں کر لی بلکہ اس کے برعکس شرک کے فوائد بیان کئے اور اسے بُت پرستی کی دعوت دی۔

اسی لیے تو اس نے پکار کر کہا، اے قوم! آخر کیا وجہ ہے کہ میں تو تمھیں نجات کی طرف دعوت دوں اور تم مجھے آگ کی طرف بلاؤ (ویاقوم مالی ادعوکم الی النجاۃ وتدعوننی الی النار)۔

میں تمہاری سعادت کا طالب ہوں اور تم میرے بدبختی کے خواہاں، میں تمھیں شاہراہ ہدایت پر لانا چاہتا ہوں اور تم مجھے صحیح راہ سے بھی ہٹانا چاہتے ہو۔

تو کیا تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ خدائے واحد کا کافر ہو جاؤں اور اس کے لیے وہ شریک قرار دوں جس کا مجھے علم تک نہیں۔ حالانکہ میں تمہیں خداوند عزیز و غفار کی طرف دعوت دیتا ہوں (تدعوننی لاکفر باللہ واشرک بہ مالیس لی بہ علم وانا ادعوکم الی العزیز الغفار)۔

قرآن پاک کی مختلف آیات اور مصر کی تاریخ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ مصری عوام فراعنہ مصر کی پرستش کے علاوہ بتوں کی پوجا پاٹ بھی کیا کرتے تھے۔ جیساکہ سورۂ اعراف کی آیت ۱۲۷ میں ہے کہ فرعون کے حواریوں نے اسے کہا:

اتذر موسٰی وقومہ لیفسدوا فی الارض ویذرک والھتک

آیا تو اس بات کی کھلی چھٹی دے سکتا ہے کہ موسٰی اور اس کی قوم زمین میں فساد برپا کریں اور تجھے اور تیرے خداؤں کو ترک کر دیں؟

حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی فرعون مصر کے زندان میں اپنے قیدی ساتھیوں سے کہا تھا:

ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار

آیا مختلف معبود بہتر ہیں یا ایک غالب قہار خدا؟ (یوسف۔ ۳۹)

بہرحال مومن آل فرعون نے ایک مختصر اور سرسری سے تقابل سے انہیں اس بات کی یاد دہانی کروا دی کہ تمہاری دعوت شرک کی طرف ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ جس کی کم از کم کوئی دلیل نہیں ملتی۔ یہ ایک تاریک اور خطرناک راستہ ہے لیکن میں ایک واضح اور روشن راستے کی طرف بلاتا ہوں ایسا راستہ جو تمہیں خداوند عزیز و توانا اور غفار تک پہنچاتا ہے۔

"عزیز" اور "غفار" کی تعبیر جہاں ایک طرف خوف اور امید کے عظیم مبدأ کی طرف اشارہ ہے وہاں دوسری طرف بتوں اور فرعونوں کی الوہیت کی نفی کی طرف بھی اشارہ ہے جن میں نہ تو عزت کی بو پائی جاتی ہے اور نہ ہی عفو و درگزشت کی۔

مزید کہتا ہے: اور جن چیزوں کی طرف تم مجھے بلاتے ہو ان کی یقیناً نہ تو دنیا میں کوئی دعوت ہے اور نہ ہی آخرت میں (ان بتوں نے نہ تو کبھی دنیا میں لوگوں کی طرف پیغمبر بھیجے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو ان کی طرف بلائیں اور نہ ہی آخرت میں کسی چیز پر ان کی حکومت ہوگی) (لاجرم انما تدعوننی الیہ لیس لہ دعوۃ فی الدنیا ولا فی الاخرۃ)۔[1]

حس و شعور سے خالی یہ چیزیں نہ تو پہلے کبھی کسی حرکت کا مبدأ رہی ہیں اور نہ ہی کبھی بعد میں ہوں گی یہ بت نہ تو بول سکتے ہیں، نہ ان کے رسول ہیں اور نہ ان کے پاس عدالت کا کوئی محکمہ ہے المختصر نہ تو کسی کی مشکل دور کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کو مشکل میں ڈال سکتے ہیں۔

اسی لیے تمہیں اچھی طرح سے جان لینا چاہیے کہ "بروز قیامت ہماری بازگشت صرف اور صرف خدا ہی کی طرف ہوگی"

---

[1] "لاجرم" کے بارے میں ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ یہ جملہ دو کلموں "لا" اور "جرم" سے مرکب ہے جرم کا اصل معنی پھل توڑنا ہے۔ اس ترکیب کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز اس کام کو منقطع نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس سے روک سکتی ہے۔ بنا بریں لاجرم کا معنی "قطعاً" اور "لازماً" بنتا ہے اور بعض اوقات یہ "قسم" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(وان مردنا الی اللہ)۔

اسی نے تو انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے رسول بھیجے ہیں اور وہی ہے جو انسانوں کو ان کے اعمال کی وجہ سے جزا اور سزا دے گا۔

اور یہ بات بھی تمہیں جان لینی چاہیے کہ "اسراف کرنے والے اور حد سے بڑھ جانے والے جہنمی ہیں" (وان المسرفین هم اصحاب النار)۔

آخر کار اس مرحلے پر مؤمن آل فرعون نے اپنے ایمان کو آشکار کر ہی دیا اور اپنے توحید پرستی کے رستے کو اس قوم کے شرک آلود رستے سے جدا کر لیا اس استدلال کے ساتھ اس قوم کو اپنے سے جھٹک دیا اور اپنی مدلل گفتگو کے بل بوتے پر ان سب کا تنہا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اپنی آخری گفتگو میں بڑی معنی خیز دھمکی کے ساتھ کہا، جلد تمہیں اس چیز کا پتہ چل جائے گا جس کے متعلق میں آج کہہ رہا ہوں، جب غیظ وغضب الٰہی کی آگ تمہیں اس جہان اور اس جہان میں آلے گی پھر تم میری باتوں کی تصدیق کرو گے (فستذکرون ما اقول لکم)۔

لیکن افسوس کہ اس وقت بہت دیر ہو چکی ہو گی، اگر یہ عذاب آخرت میں ہو تو اس وقت واپسی کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے اور اگر دنیا میں ہو تو توبہ کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔

پھر اس نے کہا: اور میں اپنے تمام کام خداوند یکتا کے سپرد کرتا ہوں جو اپنے بندوں کے حالات سے اچھی طرح آگاہ ہے (وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد)۔

اسی لیے نہ تو میں تمہاری دھمکیوں سے ڈرتا ہوں نہ مجھے تمہاری کثرت اور طاقت کا خوف ہے اور نہ ہی میری تنہائی مجھے وحشت میں ڈال سکتی ہے کیونکہ میں نے اپنے سارے وجود کو اس قادر مطلق کے سپرد کر دیا ہے جو بے انتہا قدرت کا مالک اور اپنے بندوں کے حالات سے بخوبی آگاہ ہے

یہ جملہ درحقیقت اس مرد مؤمن کی ایک مؤدبانہ دعا ہے کیونکہ وہ اس وقت ایسے طاقتور دشمن کے ہاتھوں میں پھنسا ہوا تھا جو بے رحم خونخوار تھا۔ اس کی بارگاہ رب العزت میں ایک مؤدبانہ درخواست تھی کہ وہ ان مشکل حالات میں اس کی مدد فرمائے۔

خداوند عالم نے بھی اپنے اس مؤمن اور مجاہد بندے کو تنہا نہیں چھوڑا جیسا کہ بعد کی آیت میں ہے: خدا نے بھی اسے ان کی ناپاک چالوں اور سازشوں سے بچا لیا (فوقاہ اللہ سیئات ما مکروا)۔

"سیئات ما مکروا" کی تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ فرعونیوں نے اس کے بارے میں مختلف سازشیں اور منصوبے تیار کر رکھے تھے اور وہ منصوبے کیا تھے؟ قرآن نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی ظاہر ہے کہ مختلف قسم کی سزائیں، اذیتیں اور آخر کار قتل اور سزائے موت ہی ہو سکتی ہے لیکن خداوند عالم کے لطف وکرم نے ان سب کو ناکام بنا دیا۔

چنانچہ بعض تفسیروں میں ہے کہ وہ ایک مناسب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام تک پہنچ گیا اور اس

نے بنی اسرائیل کے ہمراہ دریائے نیل کو عبور کیا نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اس کے قتل کا منصوبہ بن چکا تو اس نے اپنے آپ کو ایک پہاڑ میں چھپا لیا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔[1]

یہ دونوں روایات آپس میں مختلف نہیں ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ پہلے وہ شہر سے مخفی ہو گیا ہو اور پھر بنی اسرائیل سے جا ملا ہو۔

ہو سکتا ہے ان سازشوں میں بت پرستی کے مسلط کرنے اور راہ توحید سے منحرف کرنے کا منصوبہ بھی شامل ہو چنانچہ خداوند عالم نے اسے اس منصوبے سے بھی بچا لیا اور اسے ایمان، توحید اور تقویٰ کی راہ پر ثابت قدم رکھا۔

اس نے "آل فرعون پر سخت عذاب نازل کیا" (وحاق بآل فرعون سوء العذاب)۔[2]

ویسے خدا کی تمام سزائیں اور عذاب دردناک ہی ہیں لیکن "سوء العذاب" کی تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے ان لوگوں کے لیے سب سے زیادہ دردناک عذاب کا انتخاب کیا اور یہ وہی عذاب ہے جس کی طرف بعد کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اور فرمایا گیا ہے: ان کے لیے دردناک عذاب وہی آگ ہے جس پر وہ ہر صبح و شام پیش کئے جاتے ہیں (النار یعرضون علیها غدوًّا وعشیًّا)۔[3]

اور جس دن قیامت برپا ہو گی تو حکم دیا جائے گا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو (و یوم تقوم الساعة ادخلوا اٰل فرعون اشد العذاب)۔

اس آیت میں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

اوّل یہ کہ یہاں پر فرعون کے بجائے آل فرعون کا تذکرہ ہے جو فرعون کے گمراہ خاندان، حواریوں اور ساتھیوں کی طرف اشارہ ہے اور یہ اس بات کا غماز ہے کہ جب ان لوگوں کا یہ انجام ہو گا تو خود فرعون کا انجام واضح ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انہیں صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے لیکن بروز قیامت وہ سخت عذاب میں داخل ہوں گے۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ ان کا پہلا عذاب "برزخی عذاب" ہے جو اس دنیا کے بعد اور قیامت سے پہلے تک کے درمیانی عرصے کا عذاب ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں صبح و شام دوزخ کی آگ کے سامنے لا کر اس کے نزدیک کر دیا جاتا ہے جس سے جان بھی لرز جاتی ہے اور جسم پر بھی اس کا زبردست اثر ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ "غدو" اور "عشی" (صبح و شام) کی تعبیر یا تو اس عذاب کے دائمی ہونے پر دلالت کر رہی

---

[1] تفسیر مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

[2] "حاق" کا معنی ہے "پہنچ گیا" "نازل ہو گیا" لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس کی اصل "حق" ہو ایک قاف کو الف میں تبدیل کر کے "حاق" بنا دیا گیا ہو۔ (دیکھئے مفردات راغب، مادہ "حق") اور "سوء العذاب" صفت کی موصوف کی طرف اضافت ہے جو اصل میں "العذاب السوء" تھا۔

[3] "النار" "سوء العذاب" کا بدل ہے۔

ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص صبح وشام ہمارا وقت ضائع کرتا ہے یعنی ہمیشہ اور ہر وقت۔ یا پھر اس کے صبح وشام دو وقت ہونے کی طرف اشارہ ہے جو فرعونوں کے اظہار قدرت اور عیش ونوش کے وقت ہوا کرتے تھے۔

"غدو" اور "عشی" (صبح وشام) کی تعبیر پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ آیا عالم برزخ میں بھی یہ چیز ہوگی کیونکہ آیات قرآنی سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ آخرت میں بھی صبح وشام ہوں گے جیسا کہ سورۂ مریم کی آیت ۶۲ میں ہے:

ولهم رزقهم فيها بكرة وعشيًّا

"ان بہشتی لوگوں کے لیے صبح وشام مخصوص رزق ہے۔"

اور یہ تعبیر بہشتی نعمتوں کے دائمی ہونے کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۂ رعد کی آیت ۳۵ میں ہے:

اكلها دائم و ظلّها

"وہاں کی غذا اور سایہ دائمی ہوں گے۔"

کیونکہ ممکن ہے کہ جہاں روزی کی یہ نعمتیں دائمی ہوں گی وہاں ان دو وقتوں میں خدا کے مخصوص لطف وکرم اہل بہشت کو نصیب ہوں گے۔

چند اہم نکات

۱۔ مؤمن آل فرعون کی داستان ایک درس ہے: خدا کے دین اور آسمانی مذاہب جو طاغوتوں اور جباروں کے ساتھ مقابلے کا حکم دیتے ہیں شروع شروع میں یہ مذاہب مٹھی بھر افراد کے ذریعے پیش کئے گئے۔ اگر وہ لوگ اپنے افراد کی قلت اور مخالفین کی کثرت کو ان کی حقانیت کی دلیل سمجھتے تو یہ مذاہب ہرگز کامیاب نہ ہوتے۔

اور ایسے لائحہ عمل میں حکم فرما بنیادی اصول وہی ہے جسے امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے فرمان حقیقت ترجمان میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

ايها الناس لا تستوحشوا فی طريق الهدٰی لقلة اهله

"اے لوگو! راہ حق میں افراد کی قلت سے ہرگز نہ گھبراؤ۔"[1]

مؤمن آل فرعون اس مکتب کا ایک نمونہ اور اس راہ کے ایک راہی تھے۔ انہوں نے اپنے طرز عمل سے بتا دیا کہ ایک باعزم انسان اپنے ایمان بھرے راسخ عقیدے اور ارادے کے ساتھ جابر فرعونوں کے ارادوں تک کو متزلزل کر کے اللہ کے عظیم پیغمبر کو بہت بڑے خطرے سے نجات دلا سکتا ہے۔

اس شیر دل اور زیرک انسان کی تاریخ زندگی بتاتی ہے کہ حق کے طرفداروں کا ہر ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھنا چاہیے۔ اگر ضرورت ہو تو ایمان کا اظہار کر کے اپنی آواز کو دُور دُور تک پہنچانا چاہیئے اور اگر حالات اس امر کے متقاضی نہ ہوں تو تبدیل المیعاد

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۱۔

اور طویل المیعاد مقاصد کے پیش نظر اپنے ایمان کو چھپالینا چاہیئے۔

اور تقیہ بھی اسی چیز کا نام ہے کہ انسان اپنے نیک اور مقدس مقاصد کے لیے ایک خاص مدت تک اپنے عقائد کا اظہار نہ کرے۔

جس طرح دشمن کی سرکوبی کے لیے ظاہری اسلحے سے لیس ہونا ضروری ہے اسی طرح منطقی اسلحے سے مسلح ہونا بھی ایک ناگزیر امر ہے کیونکہ اس کا اثر ظاہری اسلحے سے کئی گنا بہتر ہے۔ لہٰذا جو کام مومن آل فرعون نے اپنے منطقی دلائل کے اسلحے سے انجام دیا، ان خاص حالات میں کوئی اور اسلحہ انجام نہیں دے سکتا تھا۔

بہر حال مومن آل فرعون کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند عالم اس جیسے مومن افراد کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا اور اگر وہ خطرات میں گھر جائیں تو انہیں اپنے لطف وکرم کی پناہ میں لے لیتا ہے۔

یہاں پر اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بعض روایات کے مطابق مومن آل فرعون کو شہید کر دیا گیا جب کہ قرآن مجید کہتا ہے کہ خدا نے اسے فرعونیوں کی غلط چالوں سے بچا لیا تو اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند ذوالجلال نے اسے اپنے عقیدے سے منحرف ہو کر کفر و شرک اختیار کرنے سے بچا لیا۔[1]

۲۔ **مسئلہ تفویض :** اپنے کاموں کو خدا کے سپرد کر کے اس کی ذات پر توکل کر لینے کا نام "تفویض" ہے اور اس کی اہمیت کے بارے میں امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کا یہ فرمان کافی ہے :

الایمان له اربعة ارکان، التوکل علی الله، و تفویض الامر الی الله عز وجل والرضا بقضاء الله، والتسلیم لامر الله

"ایمان کے چار ارکان ہیں خدا کی ذات پر توکل، اپنے تمام کام اس کے سپرد کر دینا، اس کی قضا پر راضی ہو جانا اور اس کے فرمان پر سر تسلیم خم کر دینا"۔[2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

المفوض امره الی الله فی راحة الابد، و العیش الدائم الرغد، والمفوض حقاً هو العالی عن کل همة دون الله

---

[1] کتاب "محاسن برقی" میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ " فوقاه الله سیئات ما مکروا" کی کیا تفسیر ہے؟ تو آپ نے فرمایا :

اما لقد سطوا علیه وقتلوه ولکن اتدرون ما وقاه؟ وقاه ان یفتنوه فی دینه

انہوں نے اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ نے کس لحاظ سے اس کی حفاظت کی وہ یہ کہ دین کے بارے میں اسے گمراہی اور فتنے سے بچا لیا۔ (تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۵۲۱)۔

[2] بحار الانوار جلد ۶۸ صفحہ ۳۴۱۔

جو شخص اپنے امور کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے وہ راحت ابدی اور ہمیشہ کی بابرکت زندگی پالیتا ہے اور جو شخص اپنے کاموں کو صحیح معنوں میں خدا کے سپرد کر دیتا ہے وہ اس (خدا) کے سوا کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔[1]

راغب اصفہانی اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں کہ "تفویض" کا معنی "لوٹانا" ہے۔ لہذا اپنے امور خدا کو تفویض کر دینے کا مقصد اپنے کام اس کے سپرد کر دینا ہے نہ کہ ہر قسم کی ہمت اور کوشش سے بھی ہاتھ اٹھا لیا جائے۔ جو یقیناً معنی میں تحریف کے مترادف ہوگا۔ لہذا التفویض کا معنی یہ ہوگا کہ انسان اپنے کام کے انجام دینے میں ہر قسم کی سعی و کوشش اور جد و جہد سے کام لے اور جب سخت مشکلات اور موانع آڑے آجائیں تو گھبرائے نہیں، حواس باختہ نہ ہو اور نہ ہمت ہار بیٹھے، بلکہ اپنے امور کو خدا کے سپرد کر کے اپنی ہمت اور کوشش جاری رکھے۔

"تفویض" کی اگرچہ مفہوم کے لحاظ سے "توکل" سے زیادہ مشابہت ہے لیکن یہ ایک مرحلہ اس سے بالاتر ہے، کیونکہ "توکل" کی حقیقت خدا کو اپنا وکیل بنانا ہے جبکہ تفویض کا مفہوم یہ ہے کہ سب کچھ مطلقاً اس کے سپرد کر دیا جائے۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کو اپنا وکیل بناتا ہے لیکن اپنی نگرانی بھی اس پر رکھتا ہے لیکن تفویض کے سلسلے میں اس قسم کی نگرانی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ عالم برزخ: "برزخ" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس دنیا اور اُس جہان کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ قرآن مجید میں جس قدر قیامت کے بارے میں کثرت سے گفتگو ہوئی ہے اس کی نسبت سے برزخ کے بارے میں بہت کم بات ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے اس پر ابہام کے کچھ پردے پڑے ہوئے ہیں اور اس کی خصوصیات اور تفصیلات کے بارے میں صحیح طور پر علم نہیں ہے اور حقیقت الامر یہ ہے کہ برزخ کی خصوصیات کا علم، اعتقادی مسائل میں زیادہ مؤثر نہیں ہے۔ لہذا کتاب خدا میں بھی اس کے بارے میں بہت کم گفتگو ہوئی ہے۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ قرآن نے عالم برزخ کے وجود کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے البتہ اس کی تفصیلات کے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کی۔

جو آیات عالم برزخ کی نشاندہی کرتی ہیں ان میں سے زیر تفسیر آیات بھی ہیں جن میں کہا گیا ہے "قیام قیامت سے پہلے آل فرعون کو ہر صبح و شام آگ کے سامنے پیش کر کے انہیں سزا دی جاتی ہے" اور یہ سزا "عذاب برزخ" کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

دوسری طرف جو آیات مرنے کے بعد شہداء کی حیات جاوید اور ان کے خصوصی اور بے حد حساب اجر کے بارے میں دلالت کرتی ہیں وہ بھی "برزخ کی نعمتوں" پر شاہد ناطق ہیں۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک حدیث ہے:

ان احدکم اذا مات عرض علیہ مقعدہ بالغداۃ والعشی، ان کان من اھل الجنۃ فمن

---

[1] کتاب سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۳۷۴ (مادہ فوض)۔

الجنة، وان كان من اهل النار فمن النار، يقال هٰذا مقعدك حيث يبعثك الله يوم القيامة

جب تم میں سے کوئی شخص اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے تو اسے ہر صبح و شام اپنا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے۔ اگر تو وہ بہشتی ہے اس کا ٹھکانا بہشت میں ہے اگر جہنمی ہے تو اس کا مقام جہنم میں ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن تمھاری رہائش یہیں ہوگی (اور یہی چیز روح کی خوشی یا عذاب کا سبب بنے گی)۔[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ذالك فى الدنيا قبل يوم القيامة لان فى نار القيامة لا يكون غدو وعشى، ثم قال ان كانوا يعذبون فى النار غدوًّا وعشيًّا ففيما بين ذالك هم من السعداء، لا ولكن هٰذا فى البرزخ قبل يوم القيامة الم تسمع قوله عزوجل، ويوم تقوم الساعة ادخلوا اٰل فرعون اشد العذاب

یہ سب کچھ روز قیامت سے پہلے کی دنیا میں ہوتا ہے کیونکہ قیامت کی آگ میں تو صبح و شام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر فرمایا: اگر وہ قیامت میں صرف صبح و شام عذاب جہنم سے دوچار ہوں تو اس درمیانی عرصہ میں تو وہ سعادت مند ٹھہرے۔ لہٰذا یہ بات نہیں ہے اور اس عذاب کا تعلق برزخ سے ہے جو قیامت سے پہلے کا عرصہ ہے۔ آیا (اس جملے کے بعد) خدا کا فرمان نہیں سنا کہ فرماتا ہے: "جب قیامت برپا ہوگی تو کہا جائے گا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں بھیج دو۔"[2]

امام علیہ السلام یہ نہیں فرماتے کہ قیامت میں صبح و شام نہیں، بلکہ جہنم کی آگ ہمیشہ کے لیے ہے اس کے لیے صبح و شام کا سوال پیدا نہیں ہوتا، جہاں پر صبح و شام سزا ملے گی وہ عالم برزخ ہے۔ پھر آپ نے آیت کے بعد والے جملے کو استدلال کے طور پر پیش فرمایا ہے جو قیامت کی بات کر رہا ہے اور اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سے پہلے کا جملہ عالم برزخ پر دلالت کر رہا ہے۔

عالم برزخ اور اس کے دلائل کے سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۸ (سورۂ مومنون کی آیت ۱۰۰ کے ذیل میں) میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

---

[1] اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے (منقول از طبرسی، درمنثور اور قرطبی انہی آیات کے ذیل میں)، کتاب صحیح مسلم میں تو اس موضوع پر پورا باب لکھا گیا ہے جس میں متعدد روایات نقل کی گئی ہیں۔ دیکھئے صحیح مسلم جلد چہارم ص ۲۱۹۹۔

[2] تفسیر مجمع البیان جلد ۸ ص ۵۲۶۔

۴۷۔ وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِى النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ○

۴۸۔ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ○

۴۹۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِى النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ○

۵۰۔ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِىْ ضَلٰلٍ ○

ترجمہ

۴۷۔ اس وقت کا سوچیں جب لوگ دوزخ کی آگ میں ایک دوسرے کے خلاف احتجاج کریں گے۔ ضعفاء مستکبرین سے کہیں گے: ہم تمہارے پیروکار تھے تو کیا (آج) تم ہماری آگ کا کچھ حصہ اپنے لئے قبول کرو گے؟

۴۸۔ مستکبرین کہیں گے: ہم تو خود سب اسی میں ہیں خدا نے اپنے بندوں کے درمیان (عدل و انصاف کے ساتھ) فیصلہ کیا ہے۔

۴۹۔ اور جو لوگ آگ میں ہیں وہ خازنین جہنم سے کہیں گے کہ تم اپنے خدا سے دعا کرو کہ ایک دن کے

لیے ہم سے عذاب اٹھا لے۔

۵۰۔ تو وہ کہیں گے: آیا تمہارے پیغمبر تمہارے پاس واضح دلائل لے کر نہیں آئے تھے؟ تو وہ جواب میں کہیں گے: آئے تھے۔ تو پھر وہ کہیں گے: پس جو چاہو دعا کرتے رہو، لیکن کافروں کی دعا کی گمراہی میں بھٹکنے کے سوا کوئی منزل نہیں۔

تفسیر

دوزخ میں ضعفاء اور مستکبرین کا باہمی احتجاج

چونکہ مومن آل فرعون نے، فرعون والوں کی توجہ قیامت اور دوزخ کے عذاب کی طرف مبذول کروائی تھی لہٰذا زیر نظر آیات اسی سلسلے میں رشتہ سخن کو آگے بڑھاتی ہیں اور دوزخ کی آگ کے درمیان میں جہنمیوں کی غصے بھری باتوں کا ذکر کرتی ہیں۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اس وقت کا سوچیں جب لوگ آتش جہنم میں ایک دوسرے کے خلاف احتجاج اور گفتگو کریں گے، ضعفاء مستکبرین سے کہیں گے ہم تمہارے پیروکار تھے تو کیا آج، تم ہماری آگ کا کچھ حصہ اپنے لیے قبول کرو گے (واذ یتحاجون فی النار فیقول الضعفاء للذین استکبروا انا کنا لکم تبعًا فھل انتم مغنون عنا نصیبًا من النار)[1]

"ضعفاء" سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس نہ تو کافی حد تک علم تھا اور نہ وہ حریت فکر کے مالک تھے بلکہ اندھا دھند کفر کے سرغنوں کی پیروی کیا کرتے تھے جنہیں قرآن نے "مستکبرین" کے عنوان سے یاد کیا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ پیروی کرنے والے یہ لوگ وہاں پر جانتے ہوں گے کہ یہ رہبر تو خود ہی عذاب میں گرفتار ہیں اور ان کا ذرہ بھر بھی دفاع نہیں کر سکتے تو پھر وہ ان کی پناہ کیوں طلب کریں گے اور ان سے عذاب کا حصہ بٹانے کی کیوں درخواست کریں گے؟

بعض مفسرین نے کہا ہے یہ اس لیے ہے کہ اس جہان میں ان کی عادت ہو چکی تھی کہ جب بھی کسی سخت مصیبت میں پھنس جاتے تھے تو ان کے دامن میں پناہ لیا کرتے تھے تو اس جہان میں بھی لاشعوری طور پر یہی کام کریں گے۔

لیکن بہتر یہ ہے کہ یہ جواب دیا جائے کہ یہ بات ان کے لیے ایک طرح کا مذاق، لعنت و ملامت اور سرزنش کی حیثیت رکھتی ہے تاکہ انہیں پتہ چل جائے کہ ان کے تمام دعوے کھوکھلے اور حقیقت سے بہت دور تھے[2]

---

[1] بعض لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ "یتحاجون" میں ضمیر کا مرجع "آل فرعون" ہے لیکن آیات میں موجود قرائن بتاتے ہیں کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے جس میں سب کفار شامل ہیں۔

[2] "تبعًا" تابع کی جمع ہے اور بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ مصدر ہو اور مصدر کا اطلاق ایسے افراد پر جو کسی صفت سے متصف ہوں ایک معمول ہے یعنی دراصل وہ جہنمی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم تمہارے تابع ہی نہیں تھے بلکہ عین تبعیت تھے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ آپؑ نے " غدیر" کے ایام میں سے ایک دن خطبہ ارشاد فرمایا اور خطبہ میں لوگوں کو توحید الٰہی کی طرف دعوت دینے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی اطاعت کی طرف بھی متوجہ کیا جن کی اطاعت کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ آپؑ نے مندرجہ بالا آیت تلاوت فرمانے کے بعد کہا:

افتدرون الاستکبار ماھو؟ ھو ترک الطاعۃ لمن امروا بطاعتہ، والترفع علی من ندبوا الٰی متابعتہ، والقراٰن ینطق من ھٰذا کثیرًا، ان تدبرہ متدبر زاجرہ، ووعظہ

"تم جانتے ہو کہ استکبار کیا ہے؟ ان لوگوں کی اطاعت کو ترک کر دینا جن کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور خود کو ان سے بالاتر سمجھنا، اس قسم کا کلام قرآن مجید میں اکثر مقام پر ملتا ہے۔ اس طرح کہ اگر انسان اس کے بارے میں غور و فکر سے کام لے تو اسے نصیحت دیتا اور خلاف ورزی سے روکتا ہے۔"

امام علیہ السلام ان زندہ اور واضح تعبیرات سے ان لوگوں کو خبردار کرنا چاہتے تھے جنہوں نے غدیر کے دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیتوں کو پس پشت ڈال کر دوسرے لوگوں کی پیروی کرلی تھی۔[1]

بہرحال اس سوال کے جواب میں مستکبرین چپ نہیں سادھ لیں گے مگر مدلل جواب بھی نہیں دیں گے بلکہ ایسا جواب دیں گے جو ان کی عاجزی اور زبوں حالی کا آئینہ دار ہوگا۔ جیسا کہ بعد کی آیت میں قرآن مجید اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: مستکبرین کہیں گے ہم اور تم غرض سب اسی آگ میں رجل رہے ہیں اور ایک جیسے نتائج بھگت رہے) ہیں۔ خدا نے اپنے بندوں کے درمیان (عدل و انصاف کے ساتھ) فیصلہ کیا ہے (قال الذین استکبروا انا کل فیھا ان اللہ قد حکم بین العباد)۔

اگر ہم تمہاری کسی مشکل کو حل کر سکتے تو سب سے پہلے اپنی مشکل کو حل کرتے۔ یہاں پر تو ہم سے کچھ نہیں بن پڑتا۔ نہ تم سے عذاب ہٹا سکتے ہیں نہ خود سے حتیٰ کہ تمہارے عذاب کا کچھ حصہ بھی اپنے ذمہ لینے سے قاصر ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سورۂ ابراہیم کی آیت ۲۱ میں یہی چیز ہے کہ مستکبرین ان ضعفاء کے جواب میں کہیں گے:

لو ھدانا اللہ لھدینا کم سواء علینا اجزعنا ام صبرنا مالنا من محیص

"اگر خدا نے ہمیں (عذاب سے نجات کے راستہ کی) ہدایت کی ہوئی تو ہم بھی تمہیں اس کی ہدایت کرتے۔ (لیکن یہ بات نہیں ہے، اب) چاہے بیتابی کا اظہار کریں چاہے صبر اختیار کریں برابر ہے۔"

ظاہر ہے کہ ان دونوں جوابوں کا آپس میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کر رہے ہیں۔

---

[1] مصباح شیخ - (منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۲۶)

جب ان کی تمام امیدیں ہر جگہ سے منقطع ہو جائیں گی تو وہ خازنین جہنم کی طرف اپنا دامن پھیلائیں گے اور قرآن کے الفاظ میں وہ خازنین جہنم سے کہیں گے کہ تم اپنے خدا سے دعا کرو کہ ایک دن کے لیے ہم سے عذاب اٹھا لے (وقال الذین فی النار لخزنة جھنم ادعوا ربکم یخفف عنا یوماً من العذاب)[1]

وہ جانتے ہوں گے کہ عذاب الٰہی برطرف ہونے والی چیز نہیں ان کی یہی درخواست ہوگی کہ صرف ایک دن کے لیے ان سے عذاب اٹھا لیا جائے۔ ان کے لیے ایک ہی دن کی رعایت ہو جائے تو کافی ہے کہ اس دن اطمینان کا سانس لے لیں اور تھوڑی دیر کے لیے تازہ دم ہو جائیں۔

لیکن جہنم کے داروغے "کہیں گے آیا تمہارے پیغمبر تمہارے پاس روشن دلیلیں لے کر نہیں آئے تھے" آیا تمہارے لیے کافی اتمام حجت نہیں ہوا (قالوا اولم تك تأتیکم رسلکم بالبیّنات)۔

تو وہ جواب میں کہیں گے: جی ہاں آئے تھے" (قالوا بلیٰ)۔

تو پھر جہنم کے داروغے کہیں گے: "اب جو چاہو دعا مانگتے رہو لیکن یاد رکھو کہ کافروں کی دعا کسی مقصد تک نہیں پہنچ پائے گی بلکہ رستے میں ضائع اور نابود ہو جائے گی" (قالوا فادعوا وما دعاء الکافرین الا فی ضلال)۔

تم خود اس بات کا اعتراف کر رہے ہو کہ اللہ کے رسول تمہارے پاس روشن دلائل لے کر آئے تھے لیکن تم نے ان کی کوئی پرواہ نہیں کی اور کافر ہو گئے، لہٰذا اب جو بھی دعا کرو گے بے سود ہوگی، کیونکہ خدا کافروں کی دعا قبول نہیں فرماتا۔

بعض مفسرین نے اس آخری جملے کی تفسیر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم خود دعا کرو کیونکہ ہم خدا کی اجازت کے بغیر کوئی دعا نہیں کر سکتے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب ہمیں اس قسم کی اجازت نہیں ہے تو تمہیں یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ نجات کے دروازے تم پر بند ہو چکے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ قیامت میں کافر، مؤمن بن جائیں گے لیکن یہ ایمان ان کے آثار کفر میں کسی قسم کی کمی نہیں کرے گا۔ لہٰذا حسب سابق کافر کے کافر ہی رہیں گے۔

---

[1] "خزنہ" خازن کی جمع ہے جس کا معنی محافظ اور نگہبان ہے۔

۵۱۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝

۵۲۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ۝

۵۳۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ ۝

۵۴۔ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝

۵۵۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝

ترجمہ

۵۱۔ یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی مدد کرتے ہیں جو ایمان لائے، دنیا کی زندگی میں بھی اور جس دن گواہان اٹھ کھڑے ہوں گے۔

۵۲۔ جس دن ظالموں کی عذر خواہی انہیں کوئی فائدہ نہیں بخشے گی اور ان کے لئے خدا کی لعنت اور انہی کے لئے برا گھر (اور ٹھکانا) ہے۔

۵۳۔ ہم نے موسیٰ کو ہدایت عطا فرمائی اور بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) کا وارث قرار دیا۔

۵۴۔ ایسی کتاب جو صاحبان عقل کے لیے ہدایت اور یاد آوری کا سبب تھی۔

۵۵۔ صبر اور شکیبائی اختیار کر کیونکہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہوں پر استغفار کر و اور اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح صبح شام بجا لاؤ۔

تفسیر

ہم مؤمنین کی مدد کرتے ہیں

چونکہ گزشتہ آیات میں جہنمیوں کے باہمی احتجاج اور گفتگو کا تذکرہ تھا کہ وہ وہاں پر نہ تو ایک دوسرے کی مدد کرسکیں گے اور نہ ہی کوئی دوسرا ان کی مدد کو آئے گا۔ پھر ان سے قبل کی آیات میں مؤمن آل فرعون جیسے مرد مجاہد اور بطل حریت کی داستان اور اسے خدا کی حمایت حاصل ہونے کا ذکر تھا، لہٰذا زیر تفسیر آیات میں ایک قاعدہ کلیہ کے تحت دنیا و آخرت میں انبیاء اور مؤمنین کی نصرت کا بیان ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی دنیاوی زندگی میں بھی اور جس دن تمام گواہ اٹھ کھڑے ہوں گے اس دن بھی مدد کریں گے (انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد)۔

ایسی بے دریغ حمایت جس کی مختلف طرح سے تاکید کی گئی ہے۔ ایسی حمایت جو غیر مشروط ہوگی۔ اسی لیے تو اس کے پیچھے پیچھے مختلف کامیابیاں بھی ہیں۔ یعنی دلائل و گفتگو میں کامیابی، جنگوں میں کامیابی، مخالفین پر عذاب بھیج کر انہیں نیست و نابود کر دینے کی صورت میں کامیابی اور غیبی امداد بھیج کر دل کو تقویت پہنچانے اور روح کو طاقتور بنانے کی صورت میں کامیابی۔

اس مقام پر ہم "روز قیامت" کے بارے میں ایک نئی تعبیر دیکھ رہے ہیں اور وہ ہے "یوم یقوم الاشھاد" (جس دن گواہ اٹھ کھڑے ہوں گے)۔

"اشھاد" "شاھد" یا "شھید" کی جمع ہے (جس طرح "اصحاب" صاحب کی اور "اشراف" شریف کی جمع ہے) اور ہر صورت میں گواہ کے معنی میں ہے اور یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ گواہ کون ہیں؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں جن کو ایک جا اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اس سے مراد انسان کے اعمال پر نگران فرشتے ہیں۔

۲۔ اس سے مراد انبیاء ہیں جو اپنی امتوں کے گواہ ہیں۔

۳۔ اس سے مراد فرشتے، انبیاء اور مؤمنین ہیں جو مؤمنین کے اعمال کے گواہ ہیں۔

لیکن یہ احتمال کہ انسان کے اعضاء بھی اس فہرست میں شامل ہیں بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ لفظ "اشھاد" اگرچہ وسیع معانی کا حامل ہے لیکن "یوم یقوم الاشھاد" (جس دن گواہ اٹھ کھڑے ہوں گے) کی تعبیر اس سے مناسبت نہیں رکھتی۔

یہ تعبیر ایک دلچسپ نکتے کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور یہ کہنا چاہتی ہے کہ قیامت کا دن وہ دن ہوگا جس میں تمام مخلوق

اکٹھی ہوگی اور اس عظیم اجتماع میں گواہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس مقام کی رسوائی بدترین رسوائی ہوگی جبکہ عزت افزائی اور کامیابی بھی بلند ترین مرتبہ کی ہوگی۔ ہم اس دن انبیاء و مرسلین اور مؤمنین کی مدد کریں گے اور اس عظیم اجتماع میں ان کی عزت و آبرو میں چار چاند لگا دیں گے۔

لیکن اس دن رسوائی اور بدبختی کافروں اور ظالموں کا حصّہ ہوگی جیسا کہ بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: جس دن کہ ظالموں کو عذر خواہی کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی بلکہ خدا کی لعنت ان کے لیے مخصوص ہوگی اور برا گھر (اور ٹھکانا) بھی انہی کے لیے ہوگا (یوم لاینفع الظالمین معذرتھم ولھم اللعنۃ ولھم سوء الدار)۔

ایک تو گواہوں کے سامنے عذر خواہی کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی بلکہ اس عظیم اور عدیم النظیر اجتماع میں ذلت و رسوائی ان کا مقدر ہوگی۔

دوسرے وہ خدا کی رحمت سے دور ہوں گے کیونکہ لعنت کا معنی رحمت سے دوری ہے اور لعنت ان کا دامن پکڑے گی۔

اور تیسرے جسمانی لحاظ سے بھی وہ زبردست شکنجے اور عذاب میں گرفتار ہوں گے اور آتش جہنم میں ان کے لیے بدترین ٹھکانا ہوگا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر خداوند عالم نے اپنے انبیاء اور مؤمنین کے ساتھ کامیابی کا وعدہ کیا ہے اور وہ بھی بڑی تاکید کے ساتھ، تو پھر تاریخ میں ہمیں بے ایمان کفار کے ہاتھوں بہت سے انبیاء اور مومنین کے قتل کیوں دکھائی دیتے ہیں، وہ بعض اوقات مشکلات میں کیوں پھنس جاتے تھے یا فوجی شکست کا سامنا کیوں کرتے تھے، تو کیا خداوند عالم وعدہ خلافی کرتا ہے؟

اس کا جواب ایک نکتے پر غور کرنے سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ بہت سے لوگوں کی سوچ کا معیار اور پیمانہ بہت محدود ہوتا ہے اور وہ کامیابی کے مفہوم کو اپنے اسی محدود معیار کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ کسی کی کامیابی کا راز اسی میں سمجھتے ہیں کہ دشمن کو شکست دے کر چند روزہ دنیاوی حکومت کو اپنے قبضۂ قدرت میں لے لیا جائے۔

وہ مقصد میں کامیابی اور مکتب کی بالادستی کو کامیابی ہی نہیں سمجھتے اور نہ ہی اسے کسی کھاتے میں شمار کرتے ہیں وہ کسی مجاہد شہید کے موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ اور اسوہ بن جانے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ وہ کائنات کے حریت پسندوں کے نزدیک کسی عزت و سربلندی اور خالق اکبر کی رضا کے حصول کو تو کوئی چیز ہی نہیں سمجھتے۔

ظاہر سی بات ہے کہ اس محدود سوچ کے حامل افراد کے لیے تو اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے، لیکن اگر سوچ کو بلند اور افق فکری وسیع کیا جائے اور حقیقی اقدار کو مدنظر رکھا جائے تو پھر اس آیت کے حقیقی مفہوم کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔

اس مقام پر سید قطب نے اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" میں ایک بہترین بات کہی ہے جو ہمارے مدعا کی بہترین شاہد ہے۔ وہ کربلا کے ہیرو حضرت امام حسین علیہ السلام کی مثال کو پیش نظر رکھ کر کہتے ہیں:

"حسین رضوان اللہ علیہ نے اس عظیم میدان اور دردناک منظر میں شربت شہادت نوش فرمایا، آیا یہ فتح تھی یا شکست؟ چھوٹی سوچ اور ظاہری صورت میں تو شکست تھی، لیکن خالص حقیقت اور وسیع سوچ کے لحاظ سے بہت بڑی کامیابی تھی۔

روئے زمین کے انسانوں کے پاک دل ہر شہید کے لیے لرز جاتے ہیں، ان میں عشق و محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، دلوں میں غیرت اور فداکاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جیسا کہ حسین رضوان اللہ علیہ) نے ہی کچھ کیا۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس پر مسلمانوں کے تمام فرقے خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی متفق ہیں بلکہ غیر مسلمین کی بھی بہت بڑی تعداد کا اس پر اتفاق ہے۔

بہت سے ایسے شہداء ہیں کہ اگر ہزار سال تک بھی زندہ رہتے تو وہ نہ اپنے عقیدے اور مکتب فکر کی اس قدر نصرت کر سکتے، نہ ہی ان تمام عظیم انسانی اقدار کو دلوں میں یادگار کے طور پر چھوڑ سکتے اور نہ ہی ہزاروں لوگوں کو اپنی آخری باتوں سے اس قدر آگاہ اور بیدار کر سکتے جتنا انھوں نے اپنے مقدس خون کے ذریعہ کیا ہے! جی ہاں وہ آخری باتیں اور خطبات جو انہوں نے اپنے خون کے ذریعے قلم بند کیے ہیں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور آنے والی نسلوں کو جذبہ اور تحرک عطا کرتے رہیں گے بلکہ وہ ہر زمانے میں اس طرح سے تاثیر آفریں رہیں گے کہ پوری تاریخ پر چھائے رہیں گے"[1]

سید قطب کی باتوں پر ہم کچھ اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم شیعیان ہر سال ماہ محرم میں اپنی آنکھوں کے ساتھ حضرت امام حسینؑ اور کربلا میں شہید ہونے والے ان کے دوسرے رفقاء کار کی زندگی کے آثار دیکھتے ہیں۔ کس طرح وہ عظیم تحریکوں کا سبب بن جاتے ہیں؟

ہم نے عاشوراء محرم کے ایام میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح لاکھوں کروڑوں مسلمانوں نے ظلم واستبداد اور استعمار کے ایوانوں کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔

ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اس ایثار پیشہ اور فداکار نسل کہ جس نے اپنی فداکاری اور ایثار گری کا درس مکتب حسینؑ اور آپؑ ہی کی یادگار مجالس سے لیا تھا، نے کس طرح خالی ہاتھوں کے ساتھ دنیا کے طاقتور ترین جابر بادشاہ کو تخت سے نیچے اتار پھینکا۔

جی ہاں ہم نے یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ خون حسینؑ کس طرح ان کی رگوں میں دوڑا اور انہوں نے دنیا والوں کی قیاس آرائیوں کو کس طرح غلط ثابت کر دیا۔

یہ حسینؑ اور ان کے اعوان وانصار کی کامیابی نہیں تو اور کیا ہے کہ تیرہ سو سال گزرنے کے باوجود اپنی طاقت کا لوہا منوا لیا۔

---

[1] تفسیر فی ظلال القرآن جلد ، ص ۱۸۹۔

ایک اور سوال کا جواب

یہاں پر ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مندرجہ بالا آیت کہتی ہے "قیامت کے دن ظالموں کو معذرت طلبی کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی" جب کہ سورۂ مرسلات کی آیت ۳۶ میں ہے۔

آس دن انہیں عذر خواہی کی بالکل اجازت ہی نہیں دی جائے گی۔"

ولا یؤذن لھم فیعتذرون

یہ دونوں آیات آپس میں کیسے ہم آہنگ ہو سکتی ہیں ؟

جواب کے لیے دو نکتوں کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔

پہلا یہ کہ بروز قیامت کچھ مرحلے ہوں گے جن کے حالات اور کوائف ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے کہیں پر زبان کام کرنا چھوڑ دے گی اور ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء وجوارح بولنے لگیں گے اور گواہی دیں گے۔ لیکن دوسرے مرحلوں میں زبان کھول دی جائے گی اور انسان بولنے لگے گا۔ (جیسا کہ سورۂ یٰس کی ۶۵ ویں آیت پہلی صورت حال کی اور زیر بحث سورت کی گزشتہ آیات جو جہنیوں کی گفتگو اور احتجاج کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں دوسری صورت حال کے بارے میں اسی مدعا پر شاہد ہیں۔)

بنابریں اگر کہیں پر بعض مرحلوں میں انہیں عذر خواہی کی اجازت نہیں ملے گی اور بعض مراحل میں اجازت مل جائے گی لیکن بے سود۔ لہٰذا ان کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ بعض اوقات انسان بات تو کرتا ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور وہ بالکل فضول ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر گویا اس نے کوئی بات ہی نہیں کی۔ بنابریں "انہیں عذر خواہی کی اجازت نہیں دی جائے" والا جملہ بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ ان کی معذرت طلبی بے سود ہو گی۔

پھر قرآن مجید انبیاء کی امداد اور حمایت الٰہی کے زیر سایہ ان کی دشمنوں پر کامیابی کا ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے موسیٰ کو ہدایت عطا کی اور بنی اسرائیل کو آسمانی کتاب (تورات) کا وارث بنایا (ولقد اٰتینا موسی الھدٰی و اورثنا بنی اسراءیل الکتاب)۔

جو ہدایت خداوند عالم نے جناب موسیٰ کو عطا فرمائی اس کے وسیع معانی ہیں جس میں مقام نبوت اور وحی بھی شامل ہے اور تورات جیسی آسمانی کتاب بھی۔ نیز وہ ہدایت بھی اس میں شامل ہے جو انجام فرائض کے لیے انہیں عطا ہوئی اور وہ معجزات بھی جو ان کے اختیار میں تھے۔

"تورات" کے بارے میں میراث کی تعبیر اس لیے ہے کہ یہ کتاب بنی اسرائیل کی نسلاً بعد نسل میں چلی آتی رہی اگر وہ چاہتے تو بغیر کوئی تکلیف اٹھائے اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ جیسا کہ عام دوسری میراث سے کسی قسم کی زحمت کے بغیر فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے اللہ کی اس عظیم نعمت کو ضائع کر دیا۔

بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے:

یہ آسمانی کتاب صاحبان عقل کے لیے ہدایت اور یاد آوری کا سبب تھی (ھدًی وذکرٰی لاولی الالباب)۔ ۱؎

"ہدایت" اور "ذکرٰی" کا فرق یہ ہے کہ "ہدایت" کام کے اوائل میں ہوتی ہے اور "تذکر" ان مسائل کے سلسلے میں یاد آوری کے طور پر استعمال ہوتا ہے جنہیں پہلے انسان نے سن رکھا ہو اور اس پر ایمان بھی لے آیا ہو لیکن اس وقت انہیں فراموش کر چکا ہو۔ دوسرے لفظوں میں آسمانی کتابیں ہدایت کی آغاز کنندہ بھی ہیں اور اسے جاری رکھنے والی بھی۔

لیکن ہدایت کے دونوں مراحل میں خواہ وہ اوائل کار میں ہو خواہ پہلے سے جاری ہو فائدہ صرف "اولوا الالباب" یعنی صاحبان فکر وعقل ہی اٹھا سکتے ہیں نہ کہ عقل وخرد سے عاری، ہٹ دھرم، متعصب اور آنکھوں اور کانوں سے کام نہ لینے والے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں تین اہم احکام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام جاری فرمائے گئے ہیں جو درحقیقت عمومی اور ہر ایک کے لیے ہیں اگرچہ ان کے لیے خطاب صرف آنحضرتؐ کی ذات کو کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: صبر اختیار کر کیونکہ خدا کا وعدہ بالکل سچا (فاصبر ان وعد اللّٰہ حقّ)۔

دشمنوں کے عناد وہٹ دھرمی کے مقابلے میں صبر کر۔

کچھ نادان دوستوں کی نادانی، سستی، سہل انگاری اور دل آزاری کے مقابلے میں صبر کر۔

خواہشات نفسانی اور سرکش ہوس اور غیظ وغضب کے موقع پر صبر۔

خلاصہ تمام مراحل میں آپ کی کامیابی کا راز صرف اور صرف صبر واستقامت میں ہے۔

جان لے کہ خدا نے تیری اور تیری امت کی فتح وکامرانی کے بارے میں جو وعدے کیے ہیں وہ یقیناً پورا ہو کر رہیں گے اور وعدۂ الٰہی کی حقانیت پر ایمان ہی تجھے اپنا مشن جاری رکھنے اور اپنے مشن میں سرگرم عمل رکھنے کے لیے استقامت عطا کر رہا ہے، اور ہر قسم کی سخت مشکلات کے تحمل کو تجھ پر اور تیری امت کے لیے آسان بنا رہا ہے۔

قرآن مجید میں بارہا آنحضرتؐ کو صبر کا حکم دیا گیا ہے۔ کبھی تو مطلق صورت میں جیسا کہ زیر نظر آیت میں ہم پڑھ رہے ہیں اور بعض دوسری آیات میں اور کبھی مخصوص صورت میں مذکور ہوا ہے جیسے سورۂ ق کی ۳۹ ویں آیت میں ہے۔

فاصبر علٰی ما یقولون

جو کچھ وہ کہتے ہیں اور تجھ پر ناروا تہمتیں لگاتے ہیں اُس پر صبر کر۔

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

"اپنے ان دوستوں کے ساتھ صبر کر جو (بظاہر غریب ہیں لیکن) ہر صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔ اور ان سے جدائی اختیار نہ کر۔" (کہف/۲۸)

پیغمبر اسلامؐ اور صدر اسلام کے مومنین کو جو کامیابیاں بھی نصیب ہوئی ہیں وہ اسی صبر واستقامت کا نتیجہ تھیں، آج بھی کثیر تعداد

۱؎ "ھدًی وذکرٰی" ممکن ہے کہ "مفعول لہٗ" ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ "مصدر" بمعنی "حال" کے ہو یعنی "ھادیًا ومذکرًا لاولی الالباب" کچھ اور لوگوں نے اور بھی احتمالات کا ذکر کیا ہے جیسے "بدل" یا مبتدا محذوف کی خبر وغیرہ لیکن وہ احتمالات مناسب معلوم نہیں ہوتے۔

میں دشمنوں اور لاتعداد مشکلات میں کامیابی اس کے بغیر ناممکن ہے۔

دوسرے حکم میں فرمایا گیا ہے: اور اپنے گناہوں پر استغفار کر (واستغفر لذنبک)۔

یہ یقینی بات ہے کہ پیغمبر اکرمؐ معصوم ہونے کی بنا پر کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید میں اس قسم کی تعبیریں آنحضرتؐ اور دیگر انبیاء کے بارے میں ان کے لیے بیان ہوئی ہیں جو کسی نسبت کی وجہ سے ہیں۔ کیونکہ کچھ ایسے کام ہوتے ہیں جو عام انسانوں کے لیے تو عبادت اور نیکی شمار ہوتے ہیں لیکن انبیاء کے نزدیک گناہ کہلاتے ہیں، کیونکہ

حسنات الابرار سیئات المقربین)

ایک لمحے کی غفلت بلکہ ایک ادلیٰ چیز کا ترک بھی ان کے لیے مناسب نہیں ہوتا اور ان کے عالی مرتبے اور بلند معرفت کی وجہ سے انہیں ایسی باتوں سے منزہ ومبرا ہونا چاہیے اور اگر کبھی ان سے سرزد ہو جائیں تو وہ ان پر استغفار کرتے ہیں۔

لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد امت کے گناہوں پر استغفار ہے یا ایسے گناہوں پر جو لوگوں نے پیغمبرؐ کے بارے میں انجام دیئے ہیں۔ یا یہاں پر استغفار، استغفار تعبدی ہے، یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔ اس سلسلے کے آخری حکم میں فرمایا گیا ہے: اپنے رب کی تسبیح اور حمد پر عصر اور صبح بجالایئے (وسبح بحمد ربك بالعشی والابکار)۔

"عشی" کا معنی زوال آفتاب سے غروب آفتاب تک کا درمیانی وقت ہے اور "ابکار" طلوع فجر سے طلوع آفتاب کے درمیانی وقت کو کہتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ "عشی" اور "ابکار" عصر اور صبح کے ان دو مخصوص اوقات کی طرف اشارہ ہو کہ جن میں انسان اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح کی آمادگی رکھتا ہے۔ کیونکہ یا تو اپنے دنیاوی دھندوں اور کاموں میں مصروف نہیں ہوا ہوتا اور یا پھر انہیں ختم کر چکا ہوتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ رات اور دن کے تمام اوقات میں حمد و تسبیح کے دوام کے معنی میں ہو اور اس تعبیر کو ہم اس مثال سے یوں واضح کرتے ہیں کہ "اس کا صبح و شام دھیان رکھو" یعنی ہمیشہ دھیان رکھو۔

بعض مفسرین نے اس حمد و تسبیح سے صبح اور عصر کی نمازوں کی طرف یا پھر پنجگانہ نمازوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جبکہ آیت کا مفہوم اس سے بھی وسیع تر ہے اور نمازیں فقط اس کا ایک مصداق بن سکتی ہیں۔

بہرحال یہ تینوں اوامر خودسازی کے جامع ترین اصول اور خدا کے لطف و کرم کے سائے میں بہت بڑی کامیابی کیلئے آمادہ ہونے کا سبب ہیں اور بڑے بڑے مقاصد تک رسائی کے لیے زاد راہ ہیں۔

سب سے پہلے مشکلات اور رکاوٹوں کے مقابلے میں صبر و تحمل کا مظاہرہ، پھر گناہ اور ہر قسم کی آلودگی سے دل کو پاک اور صاف کرنا اور پھر اسے یاد الٰہی کے ساتھ آراستہ کرنا اور وہ آرائش بھی حمد و تسبیح پروردگار کے ساتھ، جس کا معنی خدا کو ہر قسم کے عیب و نقص سے منزہ اور مبرا سمجھنا اور اس کے حسن و کمال پر اس کی ستائش اور تعریف کرنا ہے۔

حمد و تسبیح اگرچہ ہوتی تو خالق کے لیے ہے لیکن اس کا پرتو مخلوق پر بھی پڑتا ہے اور اسے بھی عیوب سے پاک اور صفات کمال سے آراستہ کرتی ہے۔

۵۶۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ سُلۡطٰنٍ اَتٰىہُمۡ ۙ اِنۡ فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ اِلَّا کِبۡرٌ مَّا ہُمۡ بِبَالِغِیۡہِ ۚ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ○

۵۷۔ لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○

۵۸۔ وَ مَا یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ ۬ۙ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الۡمُسِیۡٓءُ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَتَذَکَّرُوۡنَ ○

۵۹۔ اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ لَّا رَیۡبَ فِیۡہَا وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ○

ترجمہ

۵۶۔ جو لوگ آیات خدا کے بارے میں ایسی دلیل کے بغیر جو ان کے پاس آئی ہو جھگڑا کرتے ہیں ان کے دلوں میں تو صرف تکبر (اور غرور) ہے اور وہ ہرگز اپنے مقصد تک نہیں پہنچیں گے، لہٰذا اپنے خدا کی پناہ مانگ کیونکہ وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

۵۷۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے زیادہ اہم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۵۸۔ نابینا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہیں اسی طرح وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح بجا لائے بدعملوں کے برابر نہیں ہیں لیکن تم بہت کم متوجہ ہوتے ہو۔

۵۹۔ روزِ قیامت یقیناً آکر رہے گا، اس میں تو کچھ بھی شک نہیں ہے مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہیں

گذشتہ آیات میں خداوند عالم اپنے پیغمبر کو مخالفین کی ناہنجار باتوں اور ان کے ناپاک منصوبوں کے مقابلے میں صبر و شکیبائی کی دعوت دے رہا تھا۔ زیر نظر آیات میں کفار و مشرکین کے حق کے مقابلے میں جھگڑے اور ستیزہ جوئی کے اسباب پر روشنی ڈال رہا ہے سب سے پہلی آیت میں کہتا ہے: جو لوگ خدا کی آیات کے بارے میں ایسی دلیل و منطق کے بغیر جھگڑا کرتے ہیں جو ان کے پاس خدا کی طرف سے آئی ہو، ان کے سینوں میں تکبر کے سوا کچھ نہیں ہے (انّ الذین یجادلون فی اٰیات اللہ بغیر سلطان اتاھم ان فی صدورھم الا کبر)۔

"مجادلہ" — جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں — کا معنی گفتگو اور بات چیت میں لڑائی جھگڑا اور بغیر دلیل و منطق کے بحث و مباحثہ ہے۔ ہر چند یہ کبھی وسیع معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور حق اور باطل دونوں قسم کی گفتگو پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور "بغیر سلطان اتاھم" کی تعبیر مجادلہ کے اس معنی کی تاکید ہے جو عموماً استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ "سلطان" ایسی دلیل اور برہان کو کہتے ہیں جو کسی کے فریق مخالف پر تسلط حاصل کرنے کا سبب بنتی ہے۔

اور "اتاھم" کی تعبیر ان دلائل کی طرف اشارہ ہے جو خداوند عالم کی طرف سے وحی کے ذریعے نازل ہوتی ہیں اور چونکہ حقائق ثابت کرنے کے لیے وحی ہی سب سے زیادہ قابل اطمینان ذریعہ ہوتی ہے اسی لیے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

جن "اٰیات اللہ" کے بارے میں وہ مجادلہ کرتے ہیں ان سے مراد قرآن مجید کی آیات اور معجزے نیز مبدأ و معاد سے متعلق گفتگو ہے جسے کبھی تو وہ سحر کہتے تھے اور کبھی جنون اور دیوانگی سے تعبیر کیا کرتے تھے اور کبھی "اساطیر الاوّلین" یا قصہ پارینہ کا نام دیا کرتے تھے۔

اس طرح سے یہ آیت اس حقیقت پر زندہ گواہ ہے کہ مجادلہ کا اصل منبع اور مرکز تکبر، غرور اور خود پسندی ہے۔ کیونکہ متکبر اور خود پسند لوگ اپنے آپ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور دوسروں کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے لہٰذا اپنے افکار کو خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں حق اور دوسروں کے نظریات کو خواہ وہ برحق ہی کیوں نہ ہوں باطل سمجھتے ہیں لہٰذا اپنے باطل نظریات پر ڈٹے رہتے ہیں۔

"اِنْ" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے مواقع پر اس انحصار کا اصل سبب وہی تکبر، تفوّق اور خود پسندی ہے، ورنہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی دلیل اور ثبوت کے بغیر اپنی غلط باتوں پر اس قدر اڑا رہے۔

"صدور" سے اس مقام پر دلوں کی طرف اشارہ ہے اور دل سے مراد روح، جان اور عقل و فکر ہے جس کا ذکر کئی بار

قرآنی آیات میں آیا ہے۔

بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں مذکور "کبر" کا معنی "حسد" کیا ہے اور وہ جناب پیغمبرؐ کے ساتھ ان کے مجادلے کا اصل سبب آنحضرتؐ کے ظاہری اور روحانی مدارج و کمال اور مقام و مرتبہ سے حسد کو سمجھتے ہیں جبکہ "کبر" کا لغوی معنی "حسد" نہیں ہے البتہ ممکن ہے اس کا لازمی حصہ ہو کیونکہ متکبر اور مغرور لوگ عموماً حاسد بھی ہوتے ہیں اور دنیا بھر کی نعمتیں صرف اپنی ذات کے لیے چاہتے ہیں اور دوسروں کے پاس ہرگز گوارہ نہیں کرتے۔

پھر فرمایا گیا ہے: وہ کبھی اپنے مقصود کو نہیں پاسکیں گے (ماھم ببالغیہ)۔

ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خود کو ہی سب کچھ سمجھیں، دوسروں پر اپنی بڑائی جتائیں اور شیخی بگھاریں اور لوگوں پر حکومت کریں لیکن ذلت و رسوائی اور محکوم ہونے کے علاوہ انہیں اور کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔ نہ تو وہ تکبر اور غرور کے مقصد کو پہنچ پائیں گے اور نہ ہی ان کے باطل اور بے بنیاد مجادلے کا مقصد پورا ہو سکے گا کہ حق کو مٹا کر باطل کو اس کے جا گزیں کر لیں۔[1]

آیت کے آخر میں خدا اپنے رسولؐ کو حکم دے رہا ہے کہ ایسے مغرور، خود خواہ اور بے منطق لوگوں کے شر سے خدا کی پناہ طلب کریں۔ فرمایا گیا ہے: اب جبکہ صورت حال یہ ہے تو خدا کی پناہ مانگ کیونکہ وہ سننے اور دیکھنے والا ہے (فاستعذ باللہ انہ ھو السمیع البصیر)۔

وہ ان کی بے بنیاد باتوں کو بھی سنتا ہے اور ان کی سازشوں، چالوں اور برے اعمال کو بھی دیکھتا ہے۔

نہ صرف پیغمبر اسلام بلکہ راہ حق کے تمام راہی افراد کو لڑاکا اور جھگڑالو لوگوں کے کھڑے کئے ہوئے طوفان حوادث میں خدا کی پناہ مانگنا چاہیئے اور خود کو اس کے سپرد کر دینا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ جب خدا کے باعظمت نبی جناب یوسف علیہ السلام زلیخا کے کھڑے کئے ہوئے طوفان مصیبت میں گھر جاتے ہیں تو کہتے ہیں:

معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای

"میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ عزیز مصر نے مجھے نعمتیں دی ہیں اور میرا مرتبہ بلند کیا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس سے خیانت کروں۔" (یوسف/۲۳)

اسی سورت کی گزشتہ آیات میں جناب موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ہم پڑھ چکے ہیں:

---

[1] "بالغیہ" میں ضمیر کا مرجع کیا چیز ہے؟ مفسرین نے اس بارے میں دو احتمال ذکر کئے ہیں پہلا یہ کہ شاید یہ ضمیر "کبر" کی طرف لوٹ رہی ہو کیونکہ "ماھم ببالغیہ" کا جملہ "کبر" کی صفت ہے۔ اور پورے جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ اپنے تکبر کے مقصد تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ اس احتمال کے لحاظ سے درحقیقت یہاں پر "مضاف" محذوف ہے اور اصل جملہ یوں ہوگا "ماھم ببالغی مقتضی کبرھم" دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر شاید "جدال" کی طرف لوٹ رہی ہے جو "یجادلون" کے جملہ میں موجود ہے۔ یعنی وہ اپنے جدال کے مقصد کو نہیں پاسکیں گے کہ جو حق کا مٹانا ہے لیکن اس صورت میں یہ جملہ "کبر" کی صفت نہیں ہو سکتا۔ لہذا حرف عطف کو حذف کر کے اسے پہلے جملوں پر عطف کرنا چاہیئے۔

انی عذت بربی و ربکم من کل متکبر لا یؤمن بیوم الحساب

"میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی پناہ چاہتا ہوں ہر اس متکبر سے جو روز حساب پر ایمان نہیں لاتا" (مؤمن / ۲۷)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفار کا مجادلہ معاد اور انسان کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں بھی تھا لہٰذا بعد کی آیت میں نہایت ہی واضح طور پر معاد کے اس مسئلے کو بیان کیا جا رہا ہے کہ "آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کی خلقت سے زیادہ اہم اور بالاتر ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے" (لخلق السماوات والارض اکبر من خلق الناس ولکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

جو ذات ان عظیم کروں اور وسیع کہکشانوں کو اس عظمت کے ساتھ پیدا کرنے اور پھر انہیں صحیح نظام کے تحت چلانے کی قدرت رکھتی ہے وہ مردوں کے دوبارہ زندہ کرنے سے کیونکر عاجز اور ناتواں ہو سکتی ہے؟ یہ تو ان لوگوں کی جہالت کی باتیں ہیں جنہیں ان حقائق کے ادراک کی توفیق ہی حاصل نہیں ہوتی۔

اکثر مفسرین نے تو اس آیت کو معاد کے بارے میں کفار کے مجادلہ کا جواب سمجھا ہے[1] لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ ان مغرور متکبرین کے تکبر کا جواب ہے جو خود کو اور اپنے ناقص افکار کو بڑا سمجھتے تھے حالانکہ کائنات کی عظمت کے مقابلے میں وہ ایک ناچیز اور بے مقدار ذرے سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔ آیات کے مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ معنی بھی چنداں بعید نہیں ہے۔ لیکن بعد کی آیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال اس آیت میں "باطل مجادلہ" کا ایک اور عامل پیش کیا گیا ہے۔ جو "جہالت" ہے جبکہ اس سے پہلی آیات میں تکبر کی بات ہو رہی تھی، چونکہ ان دونوں کا آپس میں قریبی رابطہ ہے لہٰذا انہیں یکے بعد دیگرے بیان کیا گیا ہے کیونکہ کبر و غرور کا سرچشمہ جہالت اور خود سے اور اپنی علم سے عدم آگاہی ہے۔

بعد کی آیت میں ایک واضح تقابل کے ذریعے ان جاہل متکبرین کی کیفیت اور صاحبان علم مؤمنین کی کیفیت کو جدا کر کے بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: اندھا اور آنکھوں والا ہرگز برابر نہیں ہوتے (وما یستوی الاعمیٰ والبصیر)۔

"اسی طرح جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے وہ بدکاروں کے برابر نہیں ہیں (والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات ولا المسیء)[2]

لیکن تم اپنی خود خواہی، تکبر اور جہالت کی بنا پر بہت کم توجہ کرتے ہو (قلیلاً ما تتذکرون)[3]

---

[1] ملاحظہ ہوں تفسیر مجمع البیان، تفسیر کبیر فخر رازی، تفسیر کشاف زمخشری، تفسیر روح المعانی، تفسیر صافی اور روح البیان۔

[2] آیات کی جملہ بندی کے لحاظ سے بادی النظر میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے "ولا المسیء" میں "لا" کا ذکر نہیں ہونا چاہیئے تھا لیکن ایک طرف سے نفی کی تاکید اور دوسری طرف سے اس جملے کا مقصود اصلی ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ حرف نفی کو مکرر لایا جائے، خاص کر جب کوئی جملہ طولانی ہو جائے اور اس کی ابتداء میں نفی آئی ہو تو بعد میں بھی نفی لائی جاتی ہے تاکہ پہلی نفی نظر انداز نہ ہو جائے۔

[3] "قلیلاً ما تتذکرون" کے جملہ میں "ما" زائدہ ہے اور تاکید کے لیے ہے۔

اندھوں سے مراد وہ بے خبر اور نا آگاہ لوگ ہیں جن کی آنکھوں پر کبر و غرور کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور وہ انہیں فہم حقائق کی اجازت نہیں دیتے اور آنکھ والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو نور علم اور منطقی استدلال کے پرتو ہیں، حق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تو کیا یہ دونوں فریق آپس میں برابر ہیں؟

یہ تو تھا ایمان اور عقیدے کے لحاظ سے، رہا عمل کی رو سے، تو صالح العمل مومن افراد، بدکار، مجرم اور گناہ سے آلودہ لوگوں کے کس طرح برابر ہو سکتے ہیں؟ درحقیقت پہلا تقابل علم و آگاہی کے لحاظ سے ہے اور دوسرا اعمال کی رو سے۔

جی ہاں! "آنکھوں والے" ایک تو اپنے چھوٹے ہونے کو دیکھتے ہیں اور ادھر دوسری طرف اپنے اطراف میں موجود عظیم کائنات کو، اسی لیے وہ اپنی حیثیت اور قدر و قیمت کو پہچانتے ہیں۔ لیکن "اندھے" نہ تو زمان و مکان میں اپنی حیثیت اور قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی اپنے اطراف کی عظیم کائنات کو دیکھتے ہیں۔ اسی لیے ہمیشہ اپنی ذات کی قیمت لگانے میں غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں اور کبر و غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کبر و غرور انہیں برائیوں پر آمادہ کرتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت کے دو جملوں کو آپس میں ملا کر یہ نکتہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ایمان اور عمل صالح چشم دل کو بینائی عطا کرتے ہیں جبکہ کفر اور بدعملی انسان کے دل کو اندھا کر کے حق اور باطل کی پہچان کی قوت اس سے سلب کر لیتے ہیں۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں دو ٹوک انداز میں بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ قیام قیامت کی خبر دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ساعت (قیامت) یقیناً آکر رہے گی اس میں تو شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے (ان الساعة لاٰتية لاريب فيها ولكن اكثر الناس لا يؤمنون)۔

"لاٰتية" میں "ان" اور "لام" نیز "لاريب فيها" سب تاکیدی معنی کے تکرار پر دلالت کر رہے ہیں اور یقین کے ساتھ باور کروا رہے ہیں کہ قیامت ضرور برپا ہوگی۔ قرآنی آیات میں اس کے بہت سے دلائل بیان کئے گئے ہیں اور بعض مقامات پر بغیر کسی قسم کی دلیل ذکر کئے ایک قطعی اور یقینی امر کے طور پر اس کا تذکرہ ہے لہذا یہ بھی انہی مقامات میں سے ایک ہے۔

"راغب" اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں کہ "ساعة" کا اصل معنی "زمانے کے اجزاء میں سے ایک جزء" ہے اور چونکہ قیامت کا جلد وقوع اور اس دن بنی آدم کے اعمال کا حساب و کتاب جلد نمٹا دیا جائے گا لہذا اسے "ساعة" کا نام دیا گیا ہے۔

یہی تعبیر قرآن مجید میں بیسیوں مرتبہ ذکر ہوئی ہے البتہ کہیں پر تو خود قیامت کے بارے میں ہے اور کہیں پر اس دنیا کے اختتام اور قیامت کے مقدمات کے بارے ہیں، تو چونکہ دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا رابطہ ہے اور دونوں ہی ناگہانی طور پر وقوع پذیر ہوں گے لہذا دونوں کو "ساعة" کہا گیا ہے[1]

اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے" اس وجہ سے نہیں کہ قیامت کا مسئلہ کوئی مخفی اور مبہم چیز ہے بلکہ انکار قیامت کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ دنیا میں مادر پدر آزادی کے ساتھ غیر مشروط طور پر ہر قسم کی ہوا و ہوس اور خواہشات نفسانی کے مزے لوٹے اس لیے بھی اور اس وجہ سے بھی کہ لمبی چوڑی آرزوئیں اس

---

[1] قیامت کو "ساعة" سے موسوم کرنے کے بارے میں ہم مفصل بحث تفسیر نمونہ کی جلد ۹ (سورۂ روم کی آیت ۱۲ کی تفسیر) میں کر چکے ہیں۔

بات سے مانع ہو جاتی ہیں کہ انسان قیامت کے بارے میں کچھ سوچ سکے اور اس پر ایمان لے آئے۔

مغرور یہودی

بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت کی شان نزول یہ بتائی ہے کہ

"یہودی لوگ کہا کرتے تھے کہ عنقریب "مسیح دجال" ظہور کرے گا اور ہم اس کی امداد کریں گے تاکہ وہ محمد اور اس کے ساتھیوں کی سرکوبی کرے اور ہمیں ان کے ہاتھوں سے نجات مل جائے گی اور ہم چین کی زندگی بسر کریں گے۔"[1]

اس عبارت کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ اس طرح سے حضرت "عیسیٰؑ" کے ظہور اور ان کے "دجال" پر غالب آجانے کو بیان کرنا چاہتے تھے کہ جس کا انہیں انتظار تھا اور وہ مسیح کو اپنے سے جتانا چاہتے تھے اور دجال کا انطباق نعوذ باللہ وہ پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کرنا چاہتے تھے۔

دوسرا معنی یہ کہ وہ صحیح معنوں میں "دجال" کے انتظار میں تھے اور اسے اپنے میں سے سمجھتے تھے۔

کیونکہ جیسا کہ راغب نے "مفردات" میں اور ابن منظور نے "لسان العرب" میں "مسیح" کے کلمہ کے متعلق تصریح کی ہے کہ یہ کلمہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی بولا جاتا ہے اور "دجال" پر بھی۔ جناب عیسٰی علیہ السلام پر یا تو اس لیے کیونکہ وہ زمین میں سیر و سیاحت کیا کرتے تھے، یا پھر اس لئے کیونکہ وہ بیماروں پر ہاتھ پھیر کر انہیں بحکم خدا شفا عطا فرمایا کرتے تھے اور "دجال" پر اس لیے کہ اس کی صرف ایک آنکھ ہے اور دوسری آنکھ کی جگہ "ممسوح" یعنی "صاف" ہے۔

احتمال یہی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے بعد یہودیوں کو جو پے در پے شکستیں ہوئیں وہ اس سے سخت پریشان تھے اور جلا گئے تھے لہذا وہ جھوٹے اور فریبی شخص یعنی "دجال" کا انتظار کرنے لگے تاکہ وہ آئے اور لوگ اس کے ہمنوا ہو کر پیغمبر اور ان کے ساتھیوں سے اپنی جان چھڑائیں اور سکھ کا سانس لیں۔

یا پھر وہ حضرت عیسیٰ مسیح کا انتظار کرنے لگے جیسا کہ "قاموس مقدس" سے پتہ چلتا ہے کہ صرف عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے انتظار میں نہیں ہیں یہودی بھی ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ، دجال کے ساتھ جنگ کریں گے اور اسے مار مار کر فنا کر دیں گے اور وہ اپنا یہ عقیدہ ظہور اسلام پر منطبق کرنا چاہتے تھے۔

بہر حال بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت کی اس شانِ نزول کو اس امر پر دلیل سمجھا ہے کہ یہ آیت اور اس کے بعد کی آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ برخلاف سورت کی دوسری آیات کے جو سب کی سب مکی ہیں۔

لیکن چونکہ اصل شانِ نزول ثابت نہیں نیز اس کا مفہوم بھی کچھ مبہم سا ہے لہذا یہ نتیجہ نکالنا قابل قبول نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۵ ص[illegible] انہی آیات کے ذیل میں۔

۶۰۔ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝

۶۱۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

۶۲۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۡ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝

۶۳۔ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۰۔ تمھارے پروردگار نے کہا ہے کہ مجھے پکارو تاکہ میں (تمھاری دعا کو) قبول کروں جو لوگ میری عبادت سے متکبرانہ سرتابی کرتے ہیں عنقریب ذلیل ہوکر جہنم میں جائیں گے۔

۶۱۔ خدا تو وہ ہے جس نے تمھارے لئے رات بنائی ہے تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشنی عطا کرنے والا قرار دیا۔ خدا لوگوں کے بارے میں صاحب فضل وکرم ہے ہرچند کہ اکثر لوگ شکر گزار نہیں

۶۲۔ یہ ہے تمھارا پروردگار اللہ جو سب چیزوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی معبود نہیں تو اس صورت میں تم راہ حق سے کیونکر منحرف ہوتے ہو۔

۶۳۔ جو لوگ آیات خدا کا انکار کیا کرتے ہیں اسی طرح راہ حق سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

تفسیر

مجھے پکارو

گذشتہ آیات میں بے ایمان، متکبر اور مغرور لوگوں کے بارے میں کچھ تہدید کا ذکر تھا۔ ان آیات میں پروردگار اپنے لطف وکرم کے ساتھ توبہ کرنے والوں کے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول رہا ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: تمھارے پروردگار نے کہا ہے کہ مجھے پکارو تاکہ میں (تمھاری دعا کو) قبول کروں (وقال ربکم ادعونی استجب لکم)۔

بہت سے مفسرین نے یہاں پر دعا اور پکارنے کی اسی اپنے مشہور معنی میں تفسیر کی ہے اسی طرح "استجب لکم" کی۔ اسی طرح اسی آیت کے ذیل میں دعا اور اس کے ثواب کے بارے میں بھی متعدد روایات وارد ہوئیں جن کی طرف ہم آگے چل کر اشارہ کریں گے۔ وہ بھی اسی معنی کی گواہ ہیں۔

جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے مشہور مفسر قرآن عبداللہ بن عباس کی پیروی کرتے ہوئے اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ یہاں پر "دعا" کا معنی توحید اور پروردگار کی عبادت ہے یعنی "میری عبادت کرو اور میری وحدانیت کا اقرار کرو" لیکن بظاہر وہی پہلی تفسیر بہتر ہے۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت سے چند نکات کا استفادہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔ دعا کرنا خدا کی پسندیدہ بات ہے اور خود اس کی اپنی منشاء ہے۔

۲۔ دعا کے بعد قبولیت کا وعدہ کیا گیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک مشروط وعدہ ہے نہ کہ مطلق۔ وہی دعا قابل قبول ہوگی جس میں "دعا" کی، دعا کرنے والوں کی اور "دعا میں طلب کئے جانے والی چیزوں" کی شرائط جمع ہوں اور ہم نے اس موضوع کو فلسفۂ دعا اور اس کے حقیقی مفہوم کے عنوان سے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۶ کے ذیل میں مفصل طور پر بیان فرمایا ہے اسے یہاں پر دہرانے کی ضرورت نہیں [1]

۳۔ دعا بذات خود ایک قسم کی عبادت ہے کیونکہ آیت میں اس کے لیے یہ لفظ آیا ہے۔

اسی آیت میں ان لوگوں کو سخت متنبہ کیا گیا ہے جو دعا نہیں کرتے فرمایا گیا ہے: جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ بہت جلد ذلت وخواری کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے (ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین)۔[2]

دعا کی اہمیّت اور قبولیّت کی شرائط

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے متعدد روایات منقول ہوئی ہیں جو دعا کی اہمیت کو اچھی طرح

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اول۔

[2] "داخر" "دخور" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ذلت اور خواری ہے اور یہ ذلت وخواری اسی تکبر اور غرور کی سزا ہوگی۔

واضح کرتی ہیں، مثلاً:

۱۔ ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں۔

الدعاء هو العبادة

دُعا عبادت ہی تو ہے۔[1]

۲۔ ایک اور حدیث میں ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آپؑ کے ایک صحابی نے سوال کیا:

ماتقول فی رجلین دخلا المسجد جمیعًا کان احدهما اکثر صلاة والاٰخر دعاء، فایهما افضل؟ قال کل حسن

آپ ان دو لوگوں کے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں جو مسجد میں داخل ہوں ایک بہت زیادہ نمازیں بجالائے اور دوسرا بہت زیادہ دعا کرے تو ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟

امامؑ نے فرمایا: دونوں اچھے ہیں۔

سائل نے پھر عرض کیا:

قد علمت، ولکن ایهما افضل؟

جانتا تو میں بھی ہوں کہ دونوں اچھے ہیں، لیکن یہ فرمائیے کہ ان میں سے افضل کون ہے؟

تو امامؑ نے فرمایا:

اکثرهما دعاء، اما تسمع قول الله تعالیٰ ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جهنم داخرین

جو شخص زیادہ دعا مانگتا ہے وہی افضل ہے، کیا تم نے خداوند متعال کا یہ فرمان نہیں سُنا ادعونی استجب لکم......

پھر آپؑ نے فرمایا:

هی العبادة الکبرٰی

دعا بہت بڑی عبادت ہے۔[2]

۳۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ کونسی عبادت افضل ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا:

مامن شیءٍ افضل عند الله من ان یسئل ویطلب مما عنده وما احد ابغض الی الله عزوجل ممن یستکبر عن عبادته ولا یسئل ما عنده

---

[1] مجمع البیان جلد ۸ ص۵۲۸۔

[2] مجمع البیان جلد ۸ ص۵۲۹۔

کوئی چیز خدا کے نزدیک اس بات سے افضل نہیں ہے کہ اس سے سوال کیا جائے اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس میں سے طلب کیا جائے اور خدا کے نزدیک اُس سے بڑھ کر مبغوض اور قابل نفرت کوئی نہیں ہے جو اس کی عبادت سے متکبرانہ سرتابی کرتا ہے اور اس سے بخشش کی درخواست نہیں کرتا [1]

۴۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک روایت میں ہے:

ان عند الله عز وجل منزلة لا تنال الا بمسألة، ولو ان عبداً سدّ فاه ولم يسئل لم يعط شيئاً، فاسئل تعط، انه ليس من باب يقرع الا يوشك ان يفتح لصاحبه

خدا کے نزدیک کچھ مقامات ایسے ہیں جن تک دعا اور درخواست کے بغیر رسائی ناممکن ہے اگر کوئی بندہ دعا کرنے سے اپنا منہ بند کرے اور اس سے کسی چیز کی درخواست نہ کرے تو اسے کچھ نہیں ملے گا۔ لہٰذا خدا سے مانگو تاکہ تمھیں ملے کیونکہ جو دروازہ بھی اصرار کے ساتھ کھٹکھٹایا جائے آخر کار کھول دیا جاتا ہے [2]

۵۔ بعض روایات میں دعا مانگنے کو تو قرآن پاک کی تلاوت سے بھی افضل شمار کیا گیا ہے جیسا کہ اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ، امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہم السلام سے منقول ہے:

الدعاء افضل من قرائة القرآن

دعا مانگنا قرأت قرآن سے بھی افضل ہے [3]

ایک مختصر سے تجزیہ و تحلیل کے ذریعے ان تمام احادیث کے اصل فوائد اور مقاصد تک پہنچا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ دعا انسان کو معرفت خدا کی طرف دعوت دیتی ہے جو ہر انسان کا بہترین سرمایہ ہے۔

۲۔ دعا اس بات کا سبب بنتی ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کا محتاج سمجھے اور اس کے سامنے جھک جائے اور تکبر و غرور کو ترک کر دے کہ جو ہر قسم کی شقاوتوں، بدبختیوں اور آیات خدا میں مجادلہ کرنے کا منبع و مرکز اور سرچشمہ ہے اور اس کی ذات پاک کے سامنے اپنے آپ کو بالکل ہیچ سمجھے۔

۳۔ انسان تمام نعمتوں کی عطا و بخشش خدا کی ذات سے سمجھے اور اسی کے ساتھ محبت کرے جس سے اس کی محبت کے رشتے اور محکم ہوں گے۔

---

[1] کافی جلد ۲ "باب فضل الدعاء والحث علیه" ص ۴۶۸۔

[2] کافی جلد ۲ "باب فضل الدعاء والحث علیه" ص ۴۶۸۔

[3] "مکارم الاخلاق" (منقول از تفسیر المیزان" جلد ۲ ص ۳۲۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۶ کے ذیل میں)۔

۴۔ دعا کرنے والا چونکہ خود کو ضرورت مند اور خدا کی نعمتوں کا مرہون منت جانتا ہے لہٰذا وہ اپنے تئیں اس کے احکام کا پابند بھی سمجھتا ہے۔

۵۔ دعا کرنے والا چونکہ جانتا ہے کہ دعا کی قبولیت غیر مشروط نہیں ہے بلکہ خلوص دل اور صفائے قلب نیز گناہوں سے توبہ اور ضرورت مندوں اور دوستوں کی حاجات کو پورا کرنا اس کے شرائط میں سے ہے، لہٰذا خود سازی کرتا ہے اور اپنی تربیت کے لیے قدم اٹھاتا ہے۔

۶۔ دعا، انسان کو خود اعتمادی کا درس دیتی ہے، یاوس اور ناامید ہونے سے بچاتی ہے اور مزید سعی و کوشش کی دعوت دیتی ہے[1]

اس تفصیلی گفتگو کے آخر میں ایک نہایت ہی اہم نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ کہ احادیث کے مطابق دعا ایسے مقامات کے ساتھ مخصوص ہے جب انسان کی تمام کوششیں بے کار ہو جائیں یا دوسرے لفظوں میں جو انسان کے بس میں ہے اس حد تک کوشش کرے اور باقی خدا سے طلب کرے۔ لہٰذا اگر انسان دعا کو سعی و کوشش کی جگہ لے آئے اور ہر قسم کی تگ و دو سے ہاتھ اٹھا لے صرف دعا پر ہی اکتفا کرے تو دعا قطعاً مستجاب نہ ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

اربعة لا تستجاب لهم دعوة، رجل جالس في بيته يقول اللّٰهم ارزقني فيقال له الم آمرك بالطلب؟ ورجل كانت له امرأة فدعا عليها فيقال له: الم اجعل امرها اليك؟ ورجل كان له مال فافسده، فيقول: اللّٰهم ارزقني، فيقال له: الم آمرك بالاقتصاد؟ الم آمرك بالاصلاح؟ ورجل كان له مال فاداه بغير بينة، فيقال له: الم آمرك بالشهادة

چار قسم کے افراد ایسے ہیں جن کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ ایک وہ جو گھر میں بیٹھ کر دعا مانگے خداوندا! مجھے رزق عطا فرما، تو اسے کہا جاتا ہے: آیا میں نے تجھے تلاش کرنے کا حکم نہیں دیا؟

دوسرا وہ جس کی بیوی (اسے ہر وقت ستاتی رہتی) ہو اور وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بددعا کرے تو اسے کہا جاتا ہے آیا میں نے اس کی طلاق کا حق تجھے نہیں دیا؟

تیسرا وہ جو اپنے مال کو فضول خرچی میں ضائع کر ڈالے پھر کہے خداوندا! مجھے رزق عطا فرما: تو اسے کہا جاتا ہے کہ آیا میں نے تجھے اعتدال اور میانہ روی کے ساتھ خرچ کرنے کا حکم

---

[1] دعا اور اس کے فلسفہ و شرائط کے بارے میں تفسیر نمونہ کی دیگر جلدوں میں بھی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے ملاحظہ ہو جلد ۸ سورۂ فرقان کی آیت ۷۷، نیز جلد ۲ میں بھی اس سلسلے میں مطالب ہیں اور سب سے زیادہ تفصیل جلد اوّل میں موجود ہے۔

نہیں دیا تھا؟ کیا میں نے تجھے مال کی اصلاح کا حکم نہیں دیا؟

اور چوتھا وہ جس کے پاس مال ہو اور وہ بغیر کسی کو گواہ ٹھہرائے کسی کو قرض دے (اور قرض لینے والا مکر جائے اور قرض دینے والا دعا مانگے خدایا! اس کے دل کو نرم بنا تا کہ میرا قرض واپس کرے)

تو اسے کہا جاتا ہے کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ قرض دیتے وقت گواہ ٹھہرا لیا کرو۔[1]

ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر انسان نے بھرپور کوشش سے کام نہیں لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے مصائب میں گرفتار ہو گیا اور اس کوتاہی، تقصیر اور سستی کے نتیجے میں اس کی دعا بھی مستجاب نہیں ہوگی۔

یہیں پر سے بہت سی دعاؤں کے قبول نہ ہونے کی وجوہات میں سے ایک وجہ کا پتہ چل جاتا ہے کیونکہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو سعی و کوشش کے بغیر صرف دعا سے کام چلانا چاہتے ہیں، لیکن خدائی طریقہ کار یہ ہے کہ ایسی دعا کبھی قبول نہیں ہوتی۔

البتہ دعا کی عدم قبولیت کے کچھ اور اسباب بھی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت سے مواقع پر انسان اپنے نفع اور نقصان کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے بہت دعا مانگتا ہے جبکہ اس کی قبولیت کسی بھی صورت میں اس کے مفاد میں نہیں ہوتی حتیٰ کہ ممکن ہے کہ وہ خود بھی بعد میں اس چیز سے واقف ہو جائے۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیں کہ بعض اوقات کوئی بیمار یا بچہ اپنی دیکھ بھال کرنے والوں سے رنگ برنگی غذائیں طلب کرتا ہے۔ اگر اس کی بات مان لی جائے تو اس کی جان خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے مواقع پر خداوند رحمان و رحیم اس کی دعا کو دنیا میں شرف اجابت نہیں بخشتا بلکہ اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ کر لیتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی دعا کی قبولیت کی کچھ شرطیں ہیں جو قرآنی آیات اور احادیث میں بیان ہوئی ہیں جن کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد اول سورۂ بقرہ آیت ۱۸۶ کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

دعا کیوں قبول نہیں ہوتی؟

بعض روایات میں بہت سے ایسے گناہوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو دعا کی قبولیت سے مانع ہوتے ہیں جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں بری نیت، نماز کو دیر سے ادا کرنا، بدزبانی، حرام غذا اور راہ خدا میں صدقہ و خیرات وغیرہ نہ دینا۔[2]

ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے مندرجہ ذیل معنی خیز فرمان پر ختم کرتے ہیں، جسے مرحوم طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "احتجاج" میں نقل کیا ہے:

انہ سئل الیس یقول اللہ ادعونی استجب لکم؟ وقد نری المضطر یدعوہ ولا یجاب لہ، والمظلوم یستنصرہ علی عدوہ فلا ینصرہ، قال ویحک ما یدعوہ احد

---

[1] اصول کافی جلد دوم "باب من لا یستجاب لہ دعوۃ" حدیث ۲۔

[2] معانی الاخبار (منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۵۲۳ اور اصول کافی)۔

الاستجاب له، اما الظالم فدعائه مردود الی ان یتوب واما المحق فاذا دعا استجاب له وصرف عنه البلاء من حیث لا یعلمه، او ادخر له ثواباً جزیلاً لیوم حاجته الیه، وان لم یکن الامر الذی سئل العبد خیراً له ان اعطاه امسك عنه

کسی نے آپ سے سوال کیا کہ آیا خدا نہیں فرماتا کہ تم مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا جبکہ ہم مضطر اور بے چارے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ دعا مانگتے ہیں لیکن ان کی یہ دعا قبول نہیں ہوتی مظلوموں کو دیکھتے ہیں کہ دشمن کے خلاف خدا سے کامیابی کی دعا مانگتے ہیں مگر خدا ان کی مدد نہیں کرتا۔

امامؑ نے فرمایا، تجھ پر افسوس ہے۔ کوئی ایسا شخص نہیں جو اُسے پکارے اور خدا اس کی دعا قبول نہ کرے لیکن ظالم کی دعا اس وقت تک قبول نہیں ہوگی جب تک وہ توبہ نہ کرے اور مستحق جب بھی دعا مانگے قبول ہوتی ہے اور اللہ اس سے بلائیں اس طرح دور کر دیتا ہے کہ خود اسے بھی علم نہیں ہوتا یا پھر اس کی ضرورت کے دن (بروز قیامت) کے لیے، ذخیرہ کر دیتا ہے۔

اور جب بندے کسی چیز کا تقاضا کرتے ہیں اور اس میں مصلحت نہیں ہوتی تو خدا وہ اس سے روک لیتا ہے [1]

چونکہ دعا اور خدا سے درخواست اس کی معرفت کی ایک شاخ ہے لہٰذا بعد کی آیت میں ان حقائق کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو انسان کی سطح معرفت کو بالا کر دیتے ہیں اور اجابت دعا کی شرائط میں سے ایک شرط کو بیان کیا جا رہا ہے جس سے قبولیت دعا کی امید کو تقویت ملتی ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے:

خدا تو وہ ہے جس نے رات تمہارے لیے پیدا کی تاکہ تم اس میں آرام کرو (الله الذی جعل لکم اللیل لتسکنوا فیه)۔

کیونکہ ایک تو رات کی تاریکی اس بات کا موجب بنتی ہے کہ انسان کو مجبوراً اپنے دن کے کاموں کو بند کرنا پڑتا ہے دوسرے خود ہی تاریکی بدن، روح اور اعصاب کے آرام کا سبب بنتی ہے جبکہ روشنی تحرک اور فعالیت کا ذریعہ ہے۔

اسی لیے فوراً اسی آیت میں فرمایا گیا ہے: اور دن کو روشنی عطا کرنے والا بنایا ہے۔ (والنهار مبصراً)۔

تاکہ انسان کے حیاتیاتی ماحول کو روشن کر کے اسے سرگرمی کے لیے آمادہ کرے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ "مبصر" کا معنی ہے "دیکھنے والا" اور دن کی اس صفت کا بیان درحقیقت لوگوں کے بینا کرنے کے لیے ایک قسم کی تاکید اور مبالغہ ہے [2]

---

[1] تفسیر صافی انہی آیات کے ذیل میں۔

[2] نور و ظلمت اور روز و شب کے اسرار و فلسفہ کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۹، جلد ۸ اور جلد ۵ میں بالترتیب سورۂ قصص کی آیت ۷۱، سورۂ نمل کی آیت ۸۶ اور سورۂ یونس کی آیت ۶۷ کے ذیل میں گفتگو کی گئی ہے۔

پھر اضافہ کیا گیا ہے : خدا لوگوں کے بارے میں صاحب فضل و کرم ہے ، ہر چند کہ اکثر لوگ شکر گزاری نہیں کرتے (انّ اللہ لذو فضل علی الناس و لکن اکثر الناس لا یشکرون)۔

روز و شب کا یہ جچا تلا نظام اور نور و ظلمت کا باری کے مطابق آنا جانا خداوند عالم کے اپنے بندوں پر فضل و کرم کا ایک نمونہ اور انسان اور دیگر اشیاء کی زندگی کا ایک مؤثر عامل ہے۔

اگر روشنی نہ ہوتی تو حیات اور تحرک کا وجود نہ ہوتا، اگر باری کے مطابق تاریکی نہ ہوتی تو نور کی شدت تمام موجودات کو تھکا کر ناتواں اور فرسودہ کر دیتی ، نباتات کو جلا کر بھسم کر دیتی لیکن اکثر لوگ قدرت کی ان عظیم نعمات سے بے پرواہ ہو کر گزر جاتے ہیں اور اس کا شکر بجا نہیں لاتے۔

قاعدے کی رو سے دوسرے " الناس " کے بجائے ضمیر ہونی چاہیے تھی اور " و لکن اکثرھم لا یشکرون " کہنا چاہیئے تھا لیکن ضمیر کے بجائے " الناس " کا ذکر گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ (غیر تربیت یافتہ) انسان کی طبع ہی کفران نعمت ہے ، جیسا کہ سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۴ میں بھی ہے :

انّ الانسان لظلوم کفار

انسان بہت ہی ظالم اور بڑا ناشکرا ہے [1]

لیکن اگر انسان کی بینا آنکھیں اور دانا قلب ہوں جو خداوند عالم کے ہر جگہ بچھے خوان نعمت کو اور اس کی بے حساب باران رحمت کو ملاحظہ کریں جو ہر جگہ پہنچ چکی ہے تو زبان سے بیساختہ خدا کی حمد و شکر بجا لائے اور اپنے آپ کو خدا کی عظمت و رحمت کے سامنے حقیر و پست اور اس کی رحمت کا مرہون سمجھے [2]

بعد کی آیت پروردگار کی توحید ربوبیت سے شروع ہو کر اس کی توحید خالقیت و ربوبیت پر ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ، جس نے تمھیں یہ تمام نعمتیں عنایت فرمائی ہیں وہی وہ خدا ہے جو تمھارا مالک اور مربی ہے (ذالکم اللہ ربکم)۔

وہی خدا ہے جو ہر چیز کا خالق ہے (خالق کل شیئ)۔

اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں (لا الٰہ الا ھو)۔

درحقیقت خدا کی بے انتہا نعمتیں اس کے رب اور مدبر ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ہر چیز کا خالق ہونا اس کی ربوبیت میں وحدانیت کی ایک اور دلیل ہے کیونکہ اشیاء کا خالق ہی ان کا مالک اور مربی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ خداوند عالم کی خالقیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس نے عالم کی تمام موجودات کو پیدا کر کے خود کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہر ہر لمحے اس کی ذات

---

[1] تفسیر المیزان اور تفسیر روح المعانی انہی آیات کے ذیل میں۔

[2] " شکر " کے معنی اور اس کی قسموں کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۰ (سورۂ ابراہیم کی آیت ۷ کے ذیل) میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

کا فیض کائنات کی ہر ایک چیز تک پہنچ رہا ہے اور اس قسم کی خالقیت اس کی ربوبیت سے قطعاً جدا نہیں ہے۔

ظاہر ہے ایسی ذات ہی عبادت کے لائق ہے۔ اسی لیے "خالق کل شیء" کا جملہ " ذالکم اللہ ربکم " کی دلیل کے مانند ہے اور " لا الٰہ الا ھو " اس کے نتیجے کی طرح (غور کیجئے گا)

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : تو ایسی صورت میں تم کس طرح راہ حق سے منحرف ہو سکتے ہو (فانّٰی تؤفکون)[1] اور کیوں خداوند وحدہ لاشریک کو چھوڑ کر بتوں کی عبادت بجالاتے ہو ؟

خیال رہے کہ " تؤفکون " صیغہ مجہول کی صورت میں آیا ہے۔ یعنی تمہیں حق کے رستے سے منحرف کرتے ہیں، گویا بت پرست اس قدر بے اختیار و بے ارادہ ہیں کہ اس راہ میں ان کا اپنا کوئی ارادہ اور اختیار نہیں ہوتا۔

زیر تفسیر آیات کے سلسلہ کی آخری آیت گزشتہ مطالب کی وضاحت اور تاکید کی صورت میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : جو لوگ خدا کی آیات کا انکار کرتے ہیں اسی طرح حق کے رستے سے منحرف ہو جاتے ہیں (کذالک یؤفک الذین کانوا بآیات اللہ یجحدون)۔

"یجحدون" " جحد " کے مادہ سے ہے جس کا اصل معنی ایسی چیز کا انکار ہے جو دل میں ہوتی ہے یعنی انسان کسی چیز کا اعتقاد تو رکھے لیکن ساتھ ہی اس کی نفی بھی کرے، یا کسی چیز کی نفی کا عقیدہ رکھتا ہو لیکن زبان سے اس کا اثبات کرے۔ بخیل اور کنجوس لوگوں کو " جحد " کہتے ہیں جو عموماً اپنی غربت کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور " ارض جحدۃ " اس زمین کو کہتے ہیں جس میں نباتات بہت کم اگیں [2]

بعض دیگر صاحبان لغت نے " جحد " اور " جحود " کی یوں تفسیر کی ہے :

الجحود الانکار مع العلم

جحود ایسے انکار کو کہتے ہیں جس کا علم ہوتا ہے [3]

پس بنا بریں، جحد کے مفہوم میں حق کے مقابلے میں ایک قسم کی ہٹ دھرمی اور عناد پوشیدہ ہوتا ہے۔ ظاہری بات ہے جو شخص حقائق کا ان صفات کے ساتھ سامنا کرے گا اس کا انجام راہ حق سے انحراف کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے ؟ کیونکہ جب تک انسان حق جو، حق خواہ اور حقائق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا نہ ہو حق اور حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔

---

[1] ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ " تؤفکون " " افک " کے مادہ سے ہے جس کا معنی حق کے راستے سے بھٹک جانا اور منحرف ہو جانا ہے اور اگر مخالف ہواؤں کو " مؤتفکات " کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے اور جھوٹ کو " افک " کہتے ہیں تو اس لیے کہ وہ بیان حق سے منحرف ہوتا ہے۔

[2] مفردات راغب مادہ " جحد "

[3] صاحب لسان العرب نے اس تعریف کو جوہری سے نقل کیا ہے۔

اسی لیے حق تک رسائی کے لیے پہلے سے خود سازی کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی کو ایمان سے پہلے تقویٰ کا نام دیا جاتا ہے جس کی طرف قرآن مجید کی سورۂ بقرہ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ

ذالك الكتاب لاريب فيه هدًى للمتقين

اس آسمانی کتاب میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ متقین کے لیے سرمایۂ ہدایت ہے۔

۶۴- اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○

۶۵- هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

۶۶- قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ ۫ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

ترجمہ

۶۴- خدا وہ ہے کہ جس نے تمہارے لئے زمین کو امن و اطمینان کی جگہ بنایا ہے اور آسمانوں کو تمہارے سروں پر چھت کے مانند اور تمہاری صورتیں بنائیں تو خوب اچھی صورتیں بنائیں اور کھانے کو تمہیں پاکیزہ چیزیں عطا کیں یہ ہے خدا تمہارا پروردگار، بابرکت ہے وہ خدا جو تمام عالمین کا پروردگار ہے۔

۶۵- وہی صحیح معنوں میں زندہ ہے، اس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں، پس تم اسے ہی پکارو اور اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کرو، تعریف مخصوص ہے خدا کے لیے جو تمام عالمین کا پروردگار ہے۔

۶۶- کہہ دے کہ مجھے اس بات سے روک دیا گیا ہے کہ میں ان معبودوں کی پرستش کروں جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو جبکہ میرے پاس پروردگار کی طرف سے کھلی نشانیاں آچکی ہیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف عالمین کے رب کے حضور سر جھکاؤں۔

تفسیر

یہ ہے تمہارا ربّ

ان آیات میں بھی گذشتہ آیات کی طرح اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ بندوں کے شامل حال ہیں تاکہ ایک تو ان بندوں کو بیشتر آگاہی سے بہرہ مند کریں اور دوسرے ان کے دل میں اُمید کا اضافہ کریں تاکہ اس طرح سے وہ دعا کرنے کے اہل ہو کر قبولیت کی نعمت سے مالا مال ہو جائیں۔

یہ نکتہ بھی دلچسپ ہے کہ گزشتہ آیات میں زمان سے متعلق نعمتوں یعنی رات اور دن کا تذکرہ تھا، اور یہاں پر مکان سے متعلق نعمتوں یعنی زمین کے آرام کی جگہ ہونے اور آسمان کے بلند چھت ہونے کی بات ہو رہی ہے۔ فرمایا گیا ہے: خدا تو وہ ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو آرام اور اطمینان کی جگہ بنایا ہے (اللہ الذی جعل لکم الارض قرارًا)۔

جی ہاں اس نے کرۂ زمین پر وہ تمام شرائط پوری کر دی ہیں جو کسی قابل اطمینان وسکون جگہ کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک پائیدار اور ہر قسم کے ہچکولے سے خالی، انسان کی روح وجسم سے بالکل ہم آہنگ، مختلف چیزوں کے نکالنے کا مرکز، ضرورت کی تمام چیزوں پر مشتمل وسیع وعریض، مفت اور مباح۔

پھر فرمایا گیا ہے: اور آسمان کو چھت اور گنبد کے مانند تمہارے سر پر قرار دیا ہے (والسماء بناءً)۔

"بناء" جیسا کہ ابن منظور "لسان العرب" میں لکھتے ہیں ان گھروں کو کہتے ہیں جن سے بادیہ نشین عرب استفادہ کرتے ہیں جیسے خیمے اور سائبان وغیرہ۔

کیسی دلچسپ تعبیر ہے کہ آسمان کو ایسے خیمے سے تشبیہ دی گئی ہے جس نے زمین کو گھیر رکھا ہے۔ البتہ یہاں پر "آسمان" سے زیادہ تر مراد وہی وسیع معنوں میں فضا ہے جس نے چاروں طرف سے زمین کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور ایک خیمے کے مانند تمام کرۂ ارضی کو گھیرا ہوا ہے۔

خدا کا یہ عظیم خیمہ ایک تو تمازت آفتاب سے بچاتا ہے اور سورج کی روشنی کی شدت کم کر دیتا ہے۔ اگر یہ سائبان نہ ہوتا تو سورج کی اور دوسری فضائی شعاعیں روئے زمین پر کسی بھی چیز کو زندہ باقی نہ رہنے دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ فضا نورد مجبور ہیں کہ ان شعاعوں سے بچنے کے لیے ہمیشہ مخصوص لباس میں رہیں جو ایک تو سنگین ہوتا ہے اور دوسرے گراں قیمت ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ سائبان ان آسمانی پتھروں کو بھی زمین پر گرنے سے روکتا ہے جو ہمیشہ کرۂ ارضی کی طرف کھینچ آتے ہیں کیونکہ یہی پتھر جب پہلی بار آسمان سے ٹکراتے ہیں تو بڑی تیزی میں ہوتے ہیں اور نہایت زور سے آ کر ٹکراتے ہیں تو جل کر بھسم ہو جاتے ہیں اور ان کی خاکستر آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھتی رہتی ہے۔

اور یہ وہی چیز ہے جسے سورۂ انبیاء کی آیت ۳۲ میں "سقف محفوظ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وجعلنا السماء سقفاً محفوظاً[1]

اس کے بعد "آفاقی آیات" سے "انفسی آیات" کو بیان فرماتے ہوئے کہتا ہے، وہ خدا تو وہی ہے جس نے تمھاری صورتیں بنائی ہیں اور تمھاری کیا خوبصورت تصویریں بنائی ہیں (وصوّرکم فاحسن صورکم)۔

قامت میانہ اور سیدھی، صورت زیبا اور دلکش جسے نہایت ہی نظم کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ جسے پہلی نظر دیکھتے ہی دوسرے موجودات اور حیوانات سے نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے۔ اس کی یہی فزیکل ساخت اس کے لیے اس بات کا سبب بنتی ہے کہ وہ مختلف کاموں کو سرانجام دے اور نفیس یا بھاری مصنوعات ایجاد کرے اور مختلف اعضاء کی بنا پر آرام سے زندگی بسر کرے اور زندگی کی دوسری سہولیات سے فائدہ اٹھائے۔

دوسرے جانور اپنے منہ کے ذریعے کھاتے پیتے ہیں جبکہ اس کے برعکس انسان اپنے ہاتھوں کے ذریعے دیکھ بھال کے کھاتا اور پیتا ہے۔ یہی وہ سبب ہے جس کے ذریعے انسان ناپاک، غیر متعلقہ اور غیر ضروری غذاؤں کو جدا کرکے پاک و پاکیزہ غذا کا انتخاب کرتا ہے۔ پھلوں کے چھلکے اتار دیتا ہے اور ناقابل استعمال اشیاء کو پھینک دیتا ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں پر صورت کا عمومی معنی مراد لیا ہے جس میں ظاہری اور باطنی دونوں صورتیں شامل ہیں۔ انہوں نے اسے استعداد اور ذوق کی مختلف قسموں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر خلق فرمایا ہے اور جن کے ذریعے اسے دوسرے حیوانات پر فضیلت عطا کی ہے۔

آخر میں اس سلسلے کی چوتھی اور آخری نعمت کو بیان کرتے ہوئے پاک و پاکیزہ روزی کا ذکر کیا گیا ہے، اس نے تمھیں طیبات پر مبنی روزی عطا کی ہے (ورزقکم من الطیبات)۔

"طیبات" کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں ہر پاک و پاکیزہ چیز شامل ہے خواہ خوراک ہو یا لباس، زن و شوہر ہو یا مکان اور سواری، حتیٰ کہ پاکیزہ اور شستہ گفتگو بھی اس میں آجاتی ہے۔

خداوند عالم نے یہ تمام چیزیں عالم آفرینش میں تو پاک و پاکیزہ خلق فرمائی ہیں یہ اور بات ہے کہ بسا اوقات انسان خود انہیں ناپاک بنا دیتا ہے۔

ان چار عظیم نعمتوں کے بیان کے بعد کہ جن میں سے نصف کا تعلق زمین و آسمان سے ہے اور آدھی کا تعلق خود انسان سے ہے، فرمایا گیا ہے، یہ ہے خدا تمھارا پروردگار (ذالکم اللہ ربکم)[2]

اور چونکہ حقیقت امر اسی طرح ہے لہٰذا تمام جہانوں کا پروردگار جاوید و بابرکت ہے (فتبارک اللہ رب العالمین)۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۷، مذکورہ آیت کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

[2] "ذالکم" دراصل دور کی طرف اشارہ ہے اور ایسے مقامات پر اس کا استعمال بلند مرتبہ اور عظمت کے لیے ہوتا ہے اور چونکہ فارسی زبان میں اس قسم کی تعبیر کا معمول نہیں ہے لہٰذا ہم نے نزدیک کے اشارے کی صورت میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔

جی ہاں! جس نے اس قدر نعمتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں وہی کائنات کا چلانے والا اور لائق عبادت ہے۔

بعد کی آیت توحید عبودیت کے مسئلے کو ایک اور انداز میں پیش کر رہی ہے اور وہ ہے حقیقی معنوں میں حیات کا ذات خداوند عالم میں انحصار، چنانچہ فرمایا گیا ہے: وہی حقیقی معنوں میں زندہ ہے (ھو الحی)۔

کیونکہ اسکی حیات اسکی عین ذات ہے کسی اور چیز کی اسے ضرورت نہیں ہے۔ ایسی زندگی ہے جس تک موت کی رسائی نہیں بلکہ وہ زندگی، جاوید ہے، یہ صرف خداوند متعال کی ذات سے خاص ہے کائنات کے دوسرے تمام موجودات ایسی زندگی کی حامل نہیں ہیں بلکہ ان کی زندگی کے ساتھ موت ملی ہوئی ہے اور یہ عارضی اور محدود زندگی بھی اسی کی پاک ذات سے حاصل کرتے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے اس کی عبادت کی جانی چاہیے جو زندہ ہے اور حیات مطلق کا مالک ہے۔ اسی لیے تو فوراً ہی فرمایا گیا ہے: اس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے (لا الٰہ الا ھو)

جب حقیقت حال یہی ہے تو پھر تم بھی اسی کو پکارو اور اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کرو (فادعوہ مخلصین لہ الدین)۔

جو اس کے علاوہ ہیں انہیں ایک طرف ہٹا دو کہ سب فنا ہو جائیں گے اور پھر اپنی زندگی کے دوران میں بھی ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ جس میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی وہ صرف وہی ہے اور جس کے بارے میں موت کا تصور نہیں کیا جاسکتا وہی ہے اور بس۔

"آنچہ تغیر نپذیرد اوست" و "آنچہ نمردہ است وغیر داوست"

آیت کو اس جملے پر ختم کیا گیا ہے: تمام تعریفیں اسی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں جو رب عالمین ہے (الحمد للہ رب العالمین)۔

درحقیقت یہ جملہ خدا کے ان بندوں کے لیے ایک درس ہے جو گذشتہ آیات میں مذکور اور خود اپنی ذات میں موجود نعمتوں خاص کر زندگی کی نعمت کی وجہ سے اس کی حمد وستائش اور شکر وسپاس بجالاتے ہیں۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں توحید سے متعلق گفتگو کو سمیٹتے ہوئے مشرکین اور بت پرستوں کو مایوس کرنے کے لیے روئے سخن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "کہہ دے کہ مجھے اس بات سے روک دیا گیا ہے کہ خدا علاوہ جن جن کو تم بلاتے ہو میں ان کی عبادت کروں، کیونکہ میرے پاس میرے پروردگار کی طرف سے بینات اور روشن دلائل آچکے ہیں" (قل انی نھیت ان اعبد الذین تدعون من دون اللہ لما جاء نی البینات من ربی)۔

نہ صرف غیر اللہ کی عبادت سے روکا گیا ہوں بلکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف اور صرف عالمین کے پروردگار کے آگے سرتسلیم خم کروں (وامرت ان اسلم لرب العالمین)۔

ایک طرف تو بتوں کی عبادت سے ممانعت کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خدا کی طرف سے عقلی اور نقلی منطق اور روشن دلائل بھی آئے اور دوسری طرف "رب العالمین" کے آگے سر جھکانے کا حکم ہے، جو بذات خود مقصد اور مدعا پر ایک اور دلیل ہے کیونکہ عالمین کا پروردگار ہونا ہی اس کی پاک ذات کے سامنے سرتسلیم خم کر دینے کے لیے کافی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں "امر" اور "نہی" کے دو علٰحدہ علٰحدہ موارد ہیں۔ یعنی خدا وند عالم کے آگے جھک جانے کا امر اور بتوں کی عبادت سے نہی۔ ممکن ہے یہ تعبیر اس لیے ہو کہ بتوں کے بارے میں صرف جس چیز کا تصور ہو سکتا ہے وہ ہے ان کی پرستش اور عبادت لیکن خدا کے بارے میں عبادت کے علاوہ اس کے فرامین اور احکام پر عملدرآمد بھی ضروری ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ زمر کی گیارہویں اور بارہویں آیت میں ہے:

قل انی امرت ان اعبد اللّٰہ مخلصًا لہ الدین وامرت لان اکون اول المسلمین

کہہ دے مجھے حکم دیا گیا ہے کہ خلوص کے ساتھ خدا کی عبادت کروں اور یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ اس کے سامنے سب سے پہلا سر جھکانے والا بنوں۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت میں موجود تعبیرات قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں بھی ملتی ہیں جو سرکش اور ہٹ دھرم دشمنوں کے ساتھ ایسے انداز کی گفتگو پر مشتمل ہیں کہ اگر ان میں حق کو قبول کرنے کی ذرہ بھر بھی صلاحیت موجود ہو تو ان سے یقیناً متاثر ہو جائیں۔

غور کیجئے، فرمایا گیا ہے، مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے، مجھے اس بات سے روکا گیا ہے یعنی جب مجھے ایسا حکم دیا گیا ہے یا روکا گیا ہے تو اپنا حساب تم خود ہی کر لو۔ یہ ایسی تعبیر ہے جو ان کی سرکشی کو چیلنج کئے بغیر ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہی ہے۔

مندرجہ بالا آیات کے بارے میں آخری بات جو کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مسلسل تین آیات میں خدا کی "رب العالمین" کے ساتھ توصیف کی گئی ہے ملاحظہ فرمائیے:

پہلے فرمایا گیا ہے:

فتبارک اللّٰہ رب العالمین

اس کے بعد فرمایا گیا ہے:

الحمد للّٰہ رب العالمین

پھر فرمایا گیا ہے:

وامرت ان اسلم لرب العالمین

پھر ان کے درمیان ایک طرح کی منطقی ترتیب پائی جاتی ہے کیونکہ پہلی میں اس کے بابرکت ہونے کی بات ہے، اس کے بعد ہر قسم کی حمد و ستائش کے ساتھ اختصاص ہے آخر کار عبودیت اور پرستش کو اسی کی ذات مقدس میں منحصر کر دیا گیا ہے۔

۶۷- هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

۶۸- هُوَ الَّذِیْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○

ترجمہ

۶۷- وہ وہی ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر تم کو بچے کی صورت میں باہر بھیجتا ہے۔ پھر تم کمال قوت کے مرحلے تک پہنچ جاتے ہو۔ اس کے بعد تم بوڑھے ہو جاتے ہو۔ جب کہ تم میں سے کچھ لوگ اس مرحلے تک پہنچنے سے پہلے مر جاتے ہیں مقصد یہ ہے کہ تم اپنی زندگی کی مقررہ مدت تک پہنچ جاؤ اور شاید عقل سے کام لو۔

۶۸- وہ وہی خدا ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور جب کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس سے یہی کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ فوراً ہو جاتا ہے۔

تفسیر
تخلیقِ انسانی کے سات مرحلے

توحید سے متعلق آیات کو جاری رکھتے ہوئے ایک بار پھر کچھ "انفسی آیات" کو بیان کرتے ہوئے تخلیق انسانی کے مختلف مراحل کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ پہلے پہل انسان کی مٹی سے تخلیق کا تذکرہ ہے، پھر شکم مادر میں رہنے کی مدت کا ذکر، اس کے بعد مرتے دم تک دنیاوی زندگی کا دورانیہ، غرض اس طرح کے سات مراحل کو بیان کیا جارہا ہے۔ تاکہ ایک طرف تو اس کی قدرت اور ربوبیت کی عظمت واضح ہو جائے اور دوسری طرف اس کی اپنے بندوں پر عطا و بخشش اور نعمتوں کی عظمت کا اظہار ہو جائے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: وہ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے، پھر جمے ہوئے خون کے مانند چیز سے پھر تم کو بچے کی صورت میں شکم مادر سے باہر بھیجتا ہے۔ پھر تم اپنی طاقت و توانائی اور کمال کے مرحلے کو پہنچتے ہو، اس کے بعد تم بڑھاپے کے مرحلہ کو پہنچ جاتے ہو، ہر چند کہ تم میں سے کچھ لوگ اس مرحلے تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ تم اپنی زندگی کی مقررہ مدت تک پہنچ جاؤ اور شاید عقل سے کام لو (ھوالذی خلقکم من تراب ثم من نطفة ثم من علقة ثم یخرجکم طفلاً ثم لتبلغوا اشدکم ثم لتکونوا شیوخًا و منکم من یتوفّٰی من قبل و لتبلغوا اجلاً مسمًّی ولعلکم تعقلون)۔

اس لحاظ سے تخلیق کا پہلا مرحلہ مٹی ہے، جو ہمارے جدامجد اور پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی جانب اشارہ ہے یا پھر تمام انسانوں کی خاک سے تخلیق کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ تمام غذائی مواد جو انسانی وجود بلکہ اس کے نطفے تک کو تشکیل دیتا ہے خواہ وہ مواد حیوانی ہو یا نباتی سب کی بنیاد مٹی ہی ہے۔

دوسرا مرحلہ، نطفے کا ہے جس کا تعلق جناب آدم اور ان کی بیوی جناب حوا کے علاوہ باقی تمام انسانوں سے ہے۔

تیسرا مرحلہ وہ ہے جس میں نطفہ ارتقاء کی منزل کو پہنچ جاتا ہے اور ایک بڑی حد تک نشو و نما پاکر جمے ہوئے خون کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اس کے بعد "مضغہ" (خون کے لوتھڑے) کا پھر اعضاء کے ظاہر ہونے کا مرحلہ ہے، پھر حس و حرکت کا مرحلہ ہے۔ البتہ قرآن مجید میں اس مقام پر ان تین مراحل کا تذکرہ نہیں ہے اگرچہ دوسری کئی آیات میں ان کی طرف اشارات ملتے ہیں۔

اس جگہ پر چوتھا مرحلہ "تولد جنین" کا بتایا گیا ہے اور پانچواں مرحلہ جسمانی طاقت کے کمال کا مرحلہ ہے جسے بعض لوگ تیس سال کی عمر بتاتے ہیں۔ جس میں زیادہ سے زیادہ جسمانی نشو و نما ہو چکی ہوتی ہے۔ بعض لوگ اسے اس سے زیادہ اور کچھ لوگ اس سے کم عرصہ بتاتے ہیں۔ البتہ ممکن ہے کہ مختلف افراد میں یہ مراحل مختلف ہوں۔ قرآن نے اسے "بلوغ اشد" سے تعبیر کیا ہے۔

اس کے بعد پیچھے کی طرف لوٹنے اور توانائیوں کے آہستہ آہستہ ختم ہو جانے کا مرحلہ شروع ہو کر بڑھاپے کے دوران

تک جا پہنچتا ہے جو کہ چوتھا مرحلہ ہے۔
آخرکار عمر کے خاتمے کا مرحلہ ہے جو آخری مرحلہ ہے اور جو اس سرائے فانی سے اس عالم جاودانی کی طرف منتقل ہونے کا وقت ہے۔
آیا ان تمام منظم اور باقاعدہ تبدیلیوں کے باوجود کائنات کے مبدأ کی قدرت و عظمت اور اس کے الطاف و احسانات میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟
یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ پہلے چار مراحل میں جو کہ مٹی، نطفہ، علقہ اور بچے کی پیدائش سے متعلق ہیں "خلقکم" (تمہیں پیدا کیا) کہا گیا ہے اور ان مراحل میں انسان کے کسی قسم کے ارادہ و اختیار کو عمل دخل کا حق حاصل نہیں ہے، لیکن بعد کے تین مراحل میں جو قوت جسمانی کی انتہا کو پہنچنا، اس کے بعد بڑھاپا اور پھر عمر کے خاتمے سے متعلق ہیں "لتبلغوا" (تاکہ تم پہنچو) اور "لتکونوا" (تاکہ تم ہو جاؤ) کہا گیا ہے جو ایک تو ولادت کے بعد انسان کی آزادیٔ اختیار کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے شاید اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ممکن ہے کہ یہ تین دورانیے انسان کی اپنی اچھی یا بری تدبیر کی وجہ سے آگے یا پیچھے ہو جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ انسان ایسے کام کرے جس سے وہ جلد بوڑھا ہو جائے یا قبل از وقت اس کی موت واقع ہو جائے۔ اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنی تعبیرات کس قدر جچی تلی اور حساب و کتاب کے تحت ہوتی ہیں۔
موت کے بارے میں "یتوفّی" کے لفظ کا استعمال (جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کی منطق میں موت فنا اور نیستی کا نام نہیں ہے، بلکہ موت کے فرشتے انسان کی روح قبض کرکے موت کے بعد کے عالم میں منتقل کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں بار ہا استعمال ہونے والی اس تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ موت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ یعنی موت کے مادی مفہوم فنا اور نیستی کی نفی کرکے اسے بقاء ابدی کا نام دیتا ہے۔
"ومنکم من یتوفّی من قبل" (تم میں سے کچھ لوگ اس سے پہلے مر جاتے ہیں) کا جملہ ممکن ہے کہ بڑھاپے کے مرحلے کی طرف یا اس سے پہلے کے مراحل کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی ان مراحل تک پہنچنے سے پہلے ہر موڑ پر موت کا امکان موجود ہے۔
یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ان تمام مراحل کو "ثم" کے کلمہ کے ساتھ ایک دوسرے پر عطف کیا گیا ہے جو فاصلے کے ساتھ ترتیب کی علامت ہے سوائے آخری یعنی زندگی کے خاتمے کے مرحلے کے جسے واؤ کے ساتھ عطف کیا گیا ہے، ممکن ہے تعبیر کا یہ فرق اس لئے ہو کہ عمر کی انتہا کو جا پہنچنا ہمیشہ بڑھاپے کے بعد ہی نہیں ہوتا کیونکہ بہت سے لوگ بوڑھا ہونے سے پہلے جوانی کے عالم ہی میں عالم بقاء کو سدھار جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جوانی کے عالم تک پہنچنے سے بھی پہلے رخصت ہو جاتے ہیں۔
"اجل مسمّٰی" کے بارے میں تفسیر نمونہ کی پانچویں، چھٹی اور گیارہویں جلد میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔
اسی سلسلے کی آخری آیت میں خداوند عالم کے اہم مظاہر یعنی موت اور حیات کی بات ہو رہی ہے۔ دو ایسی مخلوقات کہ انسان کی تمام علمی ترقی کے باوجود ابھی تک سلسلۂ معمہ بنی ہوئی ہیں چنانچہ فرمایا گیا ہے: خدا تو وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے (ھو الذی یحیی و یمیت)۔
جی ہاں! موت اور حیات اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے وہ نباتات میں ہو یا حیوانات اور انسانوں میں سب خدا کے ہاتھ

میں ہے اور زندگی مختلف اور گوناگون صورتوں میں ظاہر ہوئی ہے۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی مخلوق سے لے کر غول پیکر حیوانات تک اور بحر اوقیانوس کی تاریک اور ظلمانی گہرائیوں سے لے کر آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے والے پرندوں تک، سمندروں کی موجوں کے درمیان میکروسکوپ کے بغیر دکھائی نہ دینے والے باریک ترین نباتات سے لے کر بیسیوں گز لمبے درختوں تک کی اپنی مخصوص زندگی اور اپنے مخصوص حالات ہوتے ہیں۔ اسی لحاظ سے ان کی موت بھی مختلف ہوتی ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ زندگی کے مختلف روپ کائنات اور عالم خلقت کے نہایت ہی تعجب انگیز روپ ہوتے ہیں۔

خاص کر ان مخلوقات کا ایک بے جان عالم سے زندگی کی منزل میں قدم رکھنا یا عالم حیات سے موت کی وادی میں منتقل ہونا اس حد تک قابلِ تعجب ہے کہ ان میں سے ہر ایک اسرار آفرنیش کو بیان کر رہا ہے اور اپنے رب کی آیات میں سے ایک آیت ہے۔

لیکن یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ان اہم اور پیچیدہ مسائل میں سے کوئی بھی مسئلہ اس کی قدرت کاملہ کے سامنے مشکل اور پیچیدہ نہیں ہے، بلکہ اس کے ایک ارادے اور فرمان کا منتظر ہے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: وہ جب بھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اس سے یہی کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ فوراً ہی ہو جاتی ہے۔ (فاذا قضٰی امرًا فانما یقول لہ کن فیکون)۔

حتیٰ کہ "کن" (ہو جا) کے بعد "فیکون" (ہو جاتی ہے) کی تعبیر بھی الفاظ میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ ورنہ لفظ "کن" کہنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ادھر خدا کا ارادہ ہوا ادھر مخلوقات نے وجود پیدا کر لیا[1]

---

[1] "کن فیکون" کی تفسیر کے سلسلے میں ہم جلد اوّل میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۷ کی تفسیر میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

۶۹۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ۝

۷۰۔ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۛ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝

۷۱۔ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ۝

۷۲۔ فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۝

۷۳۔ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝

۷۴۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ۝

۷۵۔ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ۝

۷۶۔ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝

ترجمہ

۶۹۔ آیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہماری آیات میں مجادلہ کرتے ہیں، کس طرح راہِ حق سے بھٹک جاتے ہیں۔

۷۰۔ جنہوں نے (آسمانی) کتاب اور جو کچھ ہم نے اپنے رسولوں پر نازل کیا ان سب کو جھٹلایا، لیکن بہت جلد (اپنے کیے کا نتیجہ) جان لیں گے۔

۷۱۔ جب طوق اور زنجیر ان کی گردنوں میں ہوں گے اور انہیں کشاں کشاں لے جایا جائے گا۔

۷۲۔ اور وہ کھولتے ہوئے پانی میں ڈالے جائیں گے اور پھر جہنم کی آگ میں جلائے جائیں گے۔

۷۳۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہاں ہیں وہ جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے تھے؟

۷۴۔ وہی معبود کہ جن کی تم خدا کے علاوہ عبادت کیا کرتے تھے؟ تو وہ کہیں گے وہ تو سب ہماری آنکھوں سے اوجھل اور گم ہو گئے ہیں۔ بلکہ ہم تو اس سے پہلے کبھی بھی کسی چیز کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی خدا کافروں کو سرگرداں کر دیتا ہے۔

۷۵۔ یہ اس لئے ہے کہ تم زمین میں ناحق خوشی منایا کرتے تھے اور غرور و مستی کی وجہ سے نہال ہوا کرتے تھے۔

۷۶۔ اب جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ اور اس میں ہمیشہ رہو اور متکبرین کے لیے کیسا ہی برا ٹھکانا ہے۔

تفسیر

مغرور دشمنوں کا انجام

ان آیات میں پھر ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو آیات الٰہی کے بارے میں مجادلہ کرتے ہیں اور نبوت کے دلائل اور انبیاء کی دعوت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ ان آیات میں ان افراد کے انجام کی واضح طور پر منظر کشی کی گئی ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: آیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو آیات الٰہی میں مجادلہ کرتے ہیں، وہ کس طرح راہ حق سے پھر جاتے ہیں (الم تر الی الذین یجادلون فی اٰیات الله انیٰ یصرفون)۔

یہ مجادلہ، ضد اور عناد پر مبنی گفتگو، یہ اندھی تقلید اور بے بنیاد تعصبات اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ وہ صراط مستقیم سے بھٹک کر بے راہروی کا شکار ہو جائیں، کیونکہ حقائق صرف اسی وقت واضح ہوتے ہیں جب انسان کے اندر تلاش حق کی روح زندہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے استفہامیہ انداز میں اس بات کا بیان اس چیز کو واضح کر رہا ہے کہ جو بھی غیر جانبدار شخص ان کے حالات پر نگاہ ڈالے گا وہ ان کی بے راہروی اور راہ حق سے بھٹک جانے پر سخت تعجب کرے گا کہ اس

قدر بین آیات اور واضح نشانیوں کے باوجود وہ حق کو کیوں نہیں دیکھتے؟

پھر ان کے بارے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آسمانی کتاب اور اس چیز کو جھٹلایا جو ہم نے اپنے رسولوں پر نازل کی (الذین کذبوا بالکتاب وبما ارسلنا بہ رسلنا)۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس سورت میں بارہا "آیات الٰہی کے بارے میں مجادلہ کرنے والوں" کا ذکر آیا ہے اور تین مقامات (۳۵ ویں ۵۶ ویں اور زیر نظر آیات) میں "الذین یجادلون فی اٰیات اللّٰہ" مذکور ہے اور قرائن بتلاتے ہیں کہ "اٰیات اللّٰہ" سے زیادہ تر مراد وہی آیات نبوت اور آسمانی کتابوں کے مندرجات ہیں نیز چونکہ توحید کی آیات اور معاد سے متعلقہ مسائل بھی آسمانی کتابوں میں مندرج ہیں لہٰذا وہ بھی ان کے مجادلہ کی زد میں آتے ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس جملے کو بار بار دہرانا کسی اہم مطلب کی تاکید ہے یا ہر مقام پر کوئی نئی بات بتانی مقصود ہوتی ہے؟ بظاہر دوسرا احتمال زیادہ قرین عقل معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان تینوں آیات میں سے ہر ایک میں ایک نئی بات ذکر کی گئی ہے، جس سے خاص مطلب بتانا مقصود ہے۔

آیت ۵۶ میں اس قسم کے مجادلہ کا سبب تکبر، غرور اور نخوت بیان کیا گیا ہے جبکہ آیت ۳۵ میں اس کا سبب ان کی دنیاوی سزا کے طور پر ان کے دلوں پر لگی مہروں کا ذکر ہے اور زیر نظر آیت میں اس کا سبب ان کی اُخروی سزا اور دوزخ کے مختلف عذاب بیان ہوئے ہیں۔

اس بات کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ "یجادلون" کا صیغہ فعل مضارع کی صورت میں بیان ہوا ہے جو استمرار پر دلالت کرتا ہے اور اس بات کا اشارہ ہے کہ اس قسم کے افراد جو آیات الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں اپنے غلط عقائد اور برے اعمال کی توجیہ کے لیے ہمیشہ مجادلہ اور بے بنیاد بحث کا سہارا لیتے ہیں۔

بہرحال آیت کے آخر میں انہیں ان الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے: وہ بہت جلد اپنے غلط اعمال کے انجام سے باخبر ہوجائیں گے۔ (فسوف یعلمون)۔

جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیر ڈال کر انہیں کشاں کشاں جہنم میں لے جایا جائے گا (اذ الاغلال فی اعناقھم والسلاسل یسحبون)۔ [1]

پہلے وہ کھولتے پانی میں اور پھر جہنم میں جلائے جائیں گے (فی الحمیم ثم فی النار یسجرون)۔

"یسجرون" "سجر" (بروزن "فجر") کے مادہ سے ہے جو مفردات میں راغب کے بقول آگ جلانے اور اسے بھڑکانے

---

[1] "اغلال" "غل" کی جمع ہے جس کا معنی ہے "وہ طوق جو گردن یا ہاتھ اور پاؤں میں ڈالے جاتے ہیں" یہ دراصل "غلل" (بروزن "اجل") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے وہ پانی جو درختوں کے درمیان چلتا ہے اگر خیانت کو "غلول" اور پیاس سے پیدا ہونے والی حرارت کو "غلیل" کہتے ہیں تو اس کی وجہ انسان کے اندر تدریجی نفوذ ہے۔

"سلاسل" "سلسلۃ" کی جمع ہے جس کا معنی زنجیر ہے۔ اور "یسحبون" "سحب" (بروزن "سہو") کے مادہ سے ہے جس کا معنی "کھینچنا" ہے۔

کے معنی میں ہے، بعض دوسرے ارباب لغت اور مفسرین کا کہنا ہے کہ اس کا معنی ہے "تنور کو آگ سے بھر دینا"۔[1]

اسی لیے بعض مفسرین نے آیت کا معنی یہ سمجھا ہے کہ اس قسم کے کفار خود ہی جہنم کا ایندھن ہوں گے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی چوبیسویں[24] آیت میں ہے :

فاتقوا النار التی وقودها الناس والحجارة

اس آگ سے بچو، جس کا ایندھن پتھر اور انسان ہوں گے۔

بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ ان کا تمام وجود آگ سے بھر جائے گا (البتہ دونوں معانی میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا)۔

مجادلہ کرنے والوں اور ضدی متکبرین کے لیے اس قسم کی سزا در حقیقت ان کے اس دنیا میں اعمال کی مناسبت سے ردعمل ہوگا۔

کیونکہ وہ دنیا میں تکبر اور غرور کی وجہ سے خدائی آیات کو جھٹلایا کرتے تھے اور انھوں نے خود کو اندھی تقلید اور تعصبات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا لہٰذا اس دن نہایت ہی ذلت و خواری کے ساتھ طوق اور زنجیر ان کی گردنوں میں ڈالے جائیں گے، پہلے تو انہیں کھولتے پانی میں ڈالا جائے گا پھر جہنم کا ایندھن بنا کر اسی میں دھکیل دیا جائے گا۔

اس جسمانی عذاب کے علاوہ انہیں روحانی عذاب کے طور پر بھی دردناک سزا دی جائے گی، ان کی سزاؤں میں سے ایک وہی ہے جس کے بارے میں آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : پھر انہیں کہا جائے گا کہاں ہیں وہ جن کو تم خدا کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے (ثم قیل لھم این ما کنتم تشرکون)۔

وہی معبود کہ جن کی تم خدا کے علاوہ عبادت کیا کرتے تھے (من دون اللہ)۔

تاکہ وہ تمہاری شفاعت کریں اور آتش جہنم کی دردناک سزا اور متلاطم موجوں سے تمہیں نجات دلائیں۔ کیا تم بارہا یہی نہیں کہا کرتے تھے کہ ہم ان کی اس لیے عبادت کرتے ہیں تاکہ وہ ہمارے شفیع بنیں تو کہاں گئی ان کی شفاعت ؟

لیکن وہ نہایت شرمندگی اور رسوائی کی وجہ سے سر جھکا کر جواب میں "کہیں گے وہ تو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور نیست و نابود اور یوں ہلاک ہو چکے ہیں کہ اب ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا" (قالوا ضلوا عنا)۔[2]

اس میں شک نہیں ـــــ جیسا کہ قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی آیا ہے کہ ـــــ یہ جھوٹے معبود جہنم میں ہوں گے اور بعید نہیں کہ ان کے ساتھ ہی ہوں، لیکن چونکہ وہاں پر نہ تو ان کا کوئی کردار ہوگا اور نہ ہی کسی قسم کا اثر، لہٰذا ان کا وجود اور عدم وجود یکساں ہوگا۔

---

[1] تفسیر صافی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر کشاف، انہی آیات کے ضمن میں۔ "لسان العرب" نے "سجر" کا اصلی معنی پُر کرنا بتایا ہے اور کہا ہے کہ "سجرت النھر" یعنی نہر پانی سے بھری ہوئی ہے۔

[2] مفسرین نے یہاں پر "ضلوا" کے دو معانی بتائے ہیں ایک تو "ضاعوا" (ضائع ہو گئے) اور دوسرے "ھلکوا" (ہلاک ہو گئے) اور بعض مفسرین نے اس کلمہ کو "غابوا" کے معنی میں لیا ہے یعنی "غائب ہو گئے" جیسے ہم کہتے ہیں "ضلت الدابة" یعنی "غابت فلم یعرف مکانھا"۔

پھر جب وہ دیکھیں گے کہ بتوں کی عبودیت کا اعتراف تو ان کی پیشانی کا داغ ثابت ہو رہا ہے لہٰذا انکار پر تُل جائیں گے اور کہیں گے ، اس سے پہلے تو ہم بالکل کسی چیز کی عبادت ہی نہیں کیا کرتے تھے (بل لم نکن ندعوا من قبل شیئًا) ۔

جنہیں ہم حقیقت سمجھتے تھے اوہام اور خیالات کے سوا کچھ نہیں تھے ، ہماری زندگی کے صحرا میں ان کی حیثیت سراب کی سی تھی۔ جنہیں ہم پانی سمجھتے تھے ۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ وہ تو اسم بے مسمّیٰ اور الفاظ بے معنی و مفہوم تھے ۔ جن کی عبادت ضلالت و گمراہی اور فضولیات کے علاوہ کچھ نہیں تھی ۔ بنابریں وہ ایک ناقابل تردید حقیقت کا اعتراف کریں گے ۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ اہلِ جہنم جھوٹ بولنے پر اتر آئیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ جھوٹ بول کر رسوائی سے بچ جائیں گے جیسا کہ سورۂ انعام کی آیات ۲۳ اور ۲۴ میں ہے ؛

ثم لم تکن فتنتهم الّا ان قالوا واللّٰہ ربنا ما کنا مشرکین انظر کیف کذبوا علٰی

انفسهم وضل عنهم ما کانوا یفترون

ان کے عذر کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ کہیں گے اس خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ،

ہم مشرک نہیں تھے ۔ ذرا دیکھئے تو کہ وہ اپنے آپ پر کیونکر جھوٹ بول رہے ہیں ؟ اور جنہیں وہ جھوٹ موٹ سے خدا کا شریک سمجھتے تھے ان کی نگاہوں سے اوجھل اور گم ہو جائیں گے ۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : اس طرح خدا کافروں کو بھٹکا دیتا ہے (کذالک یضل اللّٰہ الکافرین) ۔

ان کا کفر اور ہٹ دھرمی ان کے قلب و فکر پر پردے کا کام دے گی لہٰذا حق کے سیدھے رستے کو چھوڑ کر بے راہروی کا شکار ہو جاتے ہیں لہٰذا بروز قیامت بھی بہشت کے رستے سے بھٹک کر دوزخ کی راہ اختیار کریں گے ۔ جی ہاں ! اس طرح خدا کافروں کو گمراہ کرتا ہے ۔

بعد کی آیت اس گروہ کی اس قدر مصیبتوں اور عذاب میں گرفتار ہونے کی وجوہات بیان کر رہی ہے کہتی ہے ، تمہیں یہ عذاب اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ تم زمین میں ناحق خوشیاں مناتے تھے اور غرور اور خواہشات نفسانی کی لذتوں میں مگن رہتے تھے (ذالکم بما کنتم تفرحون فی الارض بغیر الحق و بما کنتم تمرحون) ۔

انبیاء کی مخالفت کر کے ، مؤمنین کو شہید کر کے اور غریبوں مسکینوں کو مشکلات و مصائب میں ڈال کر مزے لیتے تھے ، گناہوں کا ارتکاب اور دین شکنی کر کے فخر و مباہات کرتے تھے ۔ اب ان ناجائز خوشیوں ، غرور ، غفلت اور مستی و شہوات کا کفارہ تم ان طوق اور زنجیروں میں جکڑ کر اور آگ کے بھڑکتے شعلوں میں جل کر ادا کرو ۔

"تفرحون" "فرح" کے مادہ سے ہے جس کا معنی مسرت اور خوشی ہے ۔ خوشی کبھی ممدوح اور قابل تعریف ہوتی ہے ۔ جیسا کہ سورۂ روم کی چوتھی اور پانچویں آیت میں ہے ؛

و یومئذ یفرح المؤمنون بنصر اللّٰہ

"جس دن (اہل کتاب رومیوں کو مشرک مجوسیوں پر) فتح حاصل ہو گی تو مؤمنین خوش ہوں گے ۔"

کبھی خوشی قابل مذمت اور ناجائز ہوتی ہے جیسا کہ سورۂ قصص کی آیت ۷۶ میں قارون کی داستان میں ہے ؛

اذ قال له قومه لا تفرح ان الله لا یحب الفرحین

وہ وقت یاد کرو جب اس کی قوم نے اسے کہا، اس قدر مغرورانہ خوشیاں نہ منا کیونکہ خدا خوشی منانے والے مغرور لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔

البتہ یہ فرق قرائن کے ذریعے ہی معلوم ہوگا اور ظاہر ہے کہ زیر تفسیر آیت میں "فرح" کی دوسری قسم مراد ہے۔

"تمرحون" "مرح" (بروزن "فرح") کے مادہ سے ہے جو بعض اربابِ لغت اور مفسرین کے بقول حد سے زیادہ اور بے پناہ خوشی کے معنی میں ہے۔

بعض حضرات کے نزدیک بے بنیاد باتوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی خوشی کا نام "مرح" ہے جب کہ بعض لوگ اسے ایسی خوشی کے معنی میں لیتے ہیں جس میں عیش ونشاط پائی جائے اور خدائی نعمتوں کو غلط راہ میں استعمال کیا جائے۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ سب معانی ایک ہی مقصود کی طرف لوٹ جاتے ہیں کیونکہ بے انتہا اور حد سے زیادہ خوشی کا سرچشمہ اس قسم کے مسائل ہوتے ہیں جو مختلف گناہوں، ناپاکیوں، عیاشیوں اور خواہشات نفسانی کے ساتھ مخلوط ہوتے ہیں[1]

جی ہاں اس قسم کی خوشی جس میں غرور، غفلت، ہوا وہوس اور خواہشات نفسانی پائی جائیں انسان کو بہت جلد خدا سے دور کرتی ہے اور حقائق کے ادراک سے روک دیتی ہے لہٰذا وہ واقعیت کو مذاق اور حقیقت کو مجاز سمجھنے لگتا ہے۔ اور پھر اس قسم کے لوگوں کا انجام وہی ہوتا ہے جو مندرجہ بالا آیات میں بتایا گیا ہے۔

ایسے موقع پر ان سے کہا جائے گا: جہنم کے دروازوں سے داخل ہوجاؤ اور اس میں ہمیشہ رہو (ادخلوا ابواب جهنم خالدین فیها)۔

اور متکبرین کے لیے کیا ہی برا ٹھکانا ہے (فبئس مثوی المتکبرین)۔

یہ جملہ اس بات کی ایک اور تاکید ہے کہ ان کی بدبختیوں کا اصلی مرکز تکبر اور غرور ہے۔ وہی تکبر جو ام الفساد، انسان اور حق کے درمیان پردہ، انبیاء کے مقابلے میں محاذ آرائی اور باطل کی راہ میں اصرار کرنے کا سبب ہے۔

اس آیت میں ہمیں پھر "ابواب جهنم" (جہنم کے دروازوں) کا تذکرہ ملتا ہے۔ کیا جہنم کے دروازوں سے داخل ہونے کا یہ معنی ہے کہ ہر ٹولہ ایک علیحدہ دروازے سے جہنم میں جائے گا یا ایک ٹولہ متعدد دروازوں سے داخل ہوگا؟ گویا جہنم بھی بعض وحشت ناک اور تاریک قید خانوں کی طرح ہے کہ جن کے کمرے ایک دوسرے میں داخل اور پیچھے ہوتے ہیں یا ان کے مختلف طبقے ہیں اور زبردست گمراہ لوگوں کے ایک ٹولے کو ان طبقات سے گزرنا پڑے گا اور جہنم کے نچلے سے نچلے طبقے میں انہیں ٹھہرایا جائے گا۔

اس بات کی شاہد امیرالمؤمنین علیہ السلام کی ایک حدیث ہے جو آپؑ نے "لها سبعة ابواب لکل باب منهم جزء مقسوم" (سورۂ حجر/ ۴۴) کی تفسیر میں ارشاد فرمائی ہے۔

---

[1] راغب مفردات میں کہتے ہیں: الفرح انشراح الصدر بلذة عاجلة واکثر ما یکون ذالک فی اللذات البدنية والمرح شدة الفرح والتوسع فيه۔

ان جهنم لها سبعة ابواب اطباق بعضها فوق بعض، ووضع احدی یدیه علی الاخری، فقال هکذا

جہنم کے سات دروازے ہیں، سات طبقے جو ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ پھر آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے کے اوپر کرکے فرمایا: اس طرح۔[1]

اس سلسلے میں ایک اور تفسیر بھی ملتی ہے جس کا خلاصہ یوں ہے:

جہنم کے دروازے — بہشت کے دروازوں کے مانند — ان مختلف ... کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو جنت یا جہنم میں لے جاتے ہیں۔ ہر قسم کا گناہ یا ہر قسم کا نیک عمل ... شمار ہوتا ہے۔ اسلامی روایات میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور سات ... "کثرت" کے بیان کے لیے ہے نہ کہ تعداد بتانے کے لیے۔ بہشت کے لیے جو کہا جاتا ہے کہ اس کے آٹھ دروازے ہیں تو یہ عذاب و غضب کے اسباب کی نسبت رحمت کے اسباب کی کثرت کی طرف اشارہ ہے۔ (غور کیجئے گا)

البتہ ان دونوں تفسیروں ... میں کوئی تضاد نہیں ہے۔[2]

---

[1] مجمع البیان جلد ۵، ۶، صفحہ ۳۳۸ (سورۂ حجر کی آیت ۴۴ کے ذیل میں) اس بارے میں اور بھی بہت سی روایات ہیں جنہیں علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار کی جلد ۸ صفحہ ۲۸۹، صفحہ ۳۰۱ اور صفحہ ۲۸۵ ... درج فرمایا ہے۔

[2] اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۶ (سورۂ حجر آیت ۴۴) کے ذیل میں مطالعہ فرمائیں۔

۷۷۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ○

۷۸۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِىَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِىَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ○

ترجمہ

۷۷۔ صبر کر کہ خدا کا وعدہ حق ہے، جن سزاؤں کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے ان میں سے کچھ سزائیں انہیں تیری زندگی میں تجھے دکھادیں یا تجھے (اس سے پہلے) اس دنیا سے اٹھالیں (اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا) کیونکہ ان سب کو ہماری طرف لوٹ آنا ہے۔

۷۸۔ ہم نے تجھ سے پہلے بھی رسول بھیجے ہیں، ان میں سے کچھ کے حالات تجھ سے بیان کئے ہیں اور کچھ کے بیان نہیں کئے۔ کسی رسول کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ حکم خدا کے بغیر کوئی معجزہ لے آئے اور جب (ان کے عذاب کے لیے) خدا کا فرمان صادر ہو گا تو ان کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا اور اس وقت اہلِ باطل خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔

تفسیر

پھر بھی صبر کیجیے

گزشتہ آیات میں کفار کے روڑے اٹکانے، تکبر اور غرور کا اظہار کرنے اور آیات الٰہی کو جھٹلانے کا ذکر تھا۔ زیر نظر دو آیات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلجوئی اور انہیں ان مشکلات کے مقابلے میں صبر و شکیبائی اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اب جبکہ صورت حال یہ ہے تو صبر کر کیونکہ خدا کا وعدہ برحق ہے (فاصبر ان وعد اللّٰہ حق)۔

آپ سے فتح و کامرانی کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ بھی اور مغرور متکبرین اور جھٹلانے والوں سے جس دردناک عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے وہ بھی دونوں برحق ہیں اور یقیناً ظہور پذیر ہو کر رہیں گے۔ اس لیے کہ حق کے دشمن یہ نہ سمجھ لیں کہ ان کی سزا میں تاخیر ہو گئی ہے لہٰذا وہ عذاب الٰہی سے بچ جائیں گے اس لیے فرمایا گیا ہے: ہم نے ان سے جس عذاب کا وعدہ کر رکھا ہے اگر اس کا کچھ حصہ تیری زندگی میں تجھے دکھلائیں یا ان کے عذاب میں مبتلا ہونے سے پہلے تجھے اس دنیا سے اٹھالیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ بہرحال ہماری طرف لوٹ کر آئیں گے اور ہم ان سے کئے ہوئے اپنے وعدے پر عمل درآمد کریں گے (فاما نرینک بعض الذی نعدھم او نتوفینک فالینا یرجعون)[1]۔

آپ کا کام صرف یہی ہے کہ آپ ان لوگوں کو واضح طور پر تبلیغ کریں اور ان پر اتمام حجت کریں تاکہ آپ کی تبلیغ کی برکت سے بیدار دل روشن ہو جائیں اور مخالفین کیلئے کسی عذر اور بہانے کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ آپ کو اپنے فریضے کی ادائیگی کے علاوہ کسی اور چیز سے سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ حتیٰ کہ آپ کو اس بات کی فکر بھی نہیں ہونی چاہیے کہ ان پر جلد عذاب الٰہی کے سبب آپ کے جلتے دل کو تسکین ہو جائے۔

یہ بات درحقیقت کفار کو ضمنی طور پر ایک واضح دھمکی ہے تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ کسی بھی وقت عذاب الٰہی کے چنگل میں پھنس سکتے ہیں جس طرح کہ ان کے دوسرے دوست جنگ بدر جیسے میدانوں میں اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکے ہیں اور ان میں سے اکثر لوگ بروز قیامت اپنے اعمال کی سزا پائیں گے۔

پھر آنحضرت کی مزید تسلی اور دلجوئی کی خاطر گزشتہ انبیاء کے حالات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ وہ بھی آپ جیسی مشکلات میں پھنسے ہوئے تھے لیکن انہوں نے اپنے کام کو جاری رکھا اور ساحل کامرانی سے ہمکنار ہوئے، ارشاد ہوتا ہے: ہم نے تجھ سے پہلے بھی رسولوں کو بھیجا ہے ان میں سے بعض پیغمبروں کا ذکر تو قرآن میں تجھ سے کر دیا ہے اور بعض کا نہیں کیا (ولقد ارسلنا رسلاً من قبلک منھم من قصصنا علیک ومنھم من لم نقصص علیک)۔

ان میں سے ہر ایک اس قسم کے حالات اور طاقت فرسا مشکلات سے دوچار رہا ہے۔ ان کا سامنا کثیر تعداد میں ضدی مزاج، متکبر اور مغرور لوگوں سے تھا۔ آخرکار حق کو کامیابی حاصل ہوئی اور ظالم و مجرم لوگ مغلوب ہوئے۔

---

[1] اس قسم کا مفہوم سورۂ یونس کی آیت ۴۶ میں بھی گزر چکا ہے۔

چونکہ مشرک اور ہٹ دھرم اور ضدی مزاج کافر ہر روز خدا کے انبیاء سے اپنے من پسند معجزے کا تقاضا کیا کرتے تھے اور آنحضرتؐ کے زمانے کے مشرکین نے بھی اسی طرز عمل کو اپنایا تھا لہٰذا اسی کے ساتھ ساتھ ارشاد فرمایا گیا ہے: کسی پیغمبر کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ حکم خدا کے بغیر کوئی معجزہ لے آئے (وما کان لرسول ان یأتی باٰیۃ الا باذن اللہ)۔

چونکہ اصولی طور پر تمام معجزات خدا کے اختیار میں ہیں اور کفار کی خاطر انہیں بازیچہ اطفال نہیں بنایا جاسکتا اور پیغمبر بھی ان کی روز روز کی مانگ کے آگے سر تسلیم خم نہیں کر سکتے لہٰذا جب لوگوں کی ہدایت اور حق کے اظہار کے لیے ضروری ہوتا ہے خدا اپنے انبیاء کے ذریعے ظاہر فرماتا ہے۔

پھر سنجیدہ انداز میں لیکن تنبیہ کی صورت میں ان لوگوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ جو یہ کہتے تھے کہ اگر سچ مچ آپ ہمیں عذاب الٰہی کی دھمکی دے رہے ہیں تو پھر وہ کیوں ہم پر نازل نہیں ہوتا؟ ارشاد ہوتا ہے: جب ان ضدی مزاج منکرین کے لیے عذاب الٰہی کا فرمان جاری ہوگا تو ان کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کیا جائے اور اس وقت باطل کے پیروکار نقصان اٹھائیں گے (فاذا جاء امر اللہ قضی بالحق وخسر ھنالک المبطلون)۔

اس وقت توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے، واپسی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی، فریاد و واویلا اور چیخ پکار نہیں سنی جائے گی تب باطل کے پیروکاروں کو پتہ چلے گا کہ وہ تو اپنا سب کچھ گنوار چکے ہیں اور کچھ بھی حاصل نہیں کر پائے۔ بلکہ الٹا خدائی غیظ و غضب اور دردناک الٰہی عذاب کا شکار ہو چکے ہیں، لہٰذا وہ کس لیے اس بات پر مصر ہیں کہ وہ دن جلد آجائے؟

اس تفسیر کے مطابق مندرجہ بالا آیت "استیصالی عذاب" کی جانب اشارہ کر رہی ہے۔

لیکن کچھ مفسرین نے اس کو بروز قیامت عذاب کے فرمان کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور وہیں پر سب لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا اور باطل کے پیروکار ہر لحاظ سے اپنے خسارہ اٹھانے سے آگاہ ہو جائیں گے۔

سورۂ جاثیہ کی آیت ۲۷ کی تعبیر بھی اسی تفسیر کی مؤید ہے جہاں پر فرمایا گیا ہے:

ویوم تقوم الساعۃ یومئذ یخسر المبطلون

جس دن قیامت برپا ہوگی اس دن باطل کے پیروکار خسارہ اٹھائیں گے۔

لیکن "امر اللہ" وغیرہ جیسی تعبیرات جو متعدد آیات میں ذکر ہوئی ہیں دنیاوی عذاب کے بارے میں استعمال ہوئی ہیں[1] یہ احتمال بھی ہے کہ آیت کا مفہوم وسیع ہو کہ جو دنیاوی عذاب ہو اور آخرت کی سزا دونوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہو۔ عذاب خواہ کہیں کا ہو باطل کے پیروکاروں کی زیاں کاری ضرور آشکار ہو جائے گی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ایک روایت کے مطابق:

شہر مدینہ میں ایک مسخرہ رہتا تھا جو لوگوں کو ہنسایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اس شخص (حضرت امام زین العابدینؑ) نے مجھے عاجز کر دیا ہے کہ میں نے اسے جتنا بھی ہنسانے کی

---

[1] مانند سورۂ ہود آیات ۴۳، ۴۰، ۶۶ اور ۱۰۱۔

کوشش کی ہے میری کوئی کارگر ثابت نہیں ہوئی اور وہ کبھی میری باتوں پر نہیں ہنسا۔

ایک دن حضرت امامؑ کہیں سے گزر رہے تھے تو وہ مسخرہ آیا اور آپ کے دوش مبارک سے عبا اُٹھا کر چلتا بنا، لیکن امام نے پھر بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ آپ کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے اس کا تعاقب کر کے عبا واپس لے کر کندھوں پر ڈال دی۔ امام نے پوچھا یہ کون شخص ہے؟ ساتھیوں نے عرض کی یہ ایک مسخرہ ہے جو شہر والوں کو ہنساتا رہتا ہے، امام نے فرمایا کہ اس سے کہہ دو ان الله یوماً یخسر فیه المبطلون (خدا کا ایک دن ایسا ہے جس میں اہل باطل نقصان اٹھائیں گے)[1]

انبیاء کی تعداد

بہت سے مفسرین نے آیات کی مناسبت سے یہاں پر انبیاء کی تعداد کے بارے میں گفتگو کی ہے اور اس بارے میں مختلف روایات نقل کی ہیں۔

اس بارے میں مشہور روایت سے انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار معلوم ہوتی ہے۔ جبکہ کچھ اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ جن میں سے چار ہزار بنی اسرائیل سے تھے اور چار ہزار ان کے علاوہ تھے۔[2]

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی زبانی پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث میں ہے:

خلق الله عز وجل مأة الف نبی وار بعة وعشرين الف نبی انا اکرمهم علی الله ولا فخر، وخلق الله عز وجل مأة الف وصی وار بعة وعشرين الف وصی، فعلی اکرمهم علی الله وافضلهم

خداوند عالم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی خلق کئے ہیں اور میں اللہ کے نزدیک ان سب سے زیادہ معزز ہوں لیکن میں اس بات پر مغرور نہیں ہوں اور خدا نے ایک لاکھ چوبیس ہزار وصی پیدا کئے ہیں اور اللہ کے نزدیک علی ان سب سے زیادہ معزز اور افضل ہیں۔[3]

ایک اور روایت میں انس بن مالک پیغمبر اسلامؐ سے یوں نقل کرتے ہیں:

بعثت علی اثر ثمانية آلاف نبی منهم اربعة آلاف من بنی اسرائیل

میں آٹھ ہزار انبیاء کے بعد مبعوث ہوا ہوں جن میں سے چار ہزار بنی اسرائیل سے تھے۔[4]

---

[1] امالی شیخ صدوق (منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۲۴)۔

[2] تفسیر مجمع البیان انہی آیات کے ذیل میں۔

[3] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۳۰ (حدیث ۲۱)۔

[4] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۳۱ (حدیث ۲۲)۔

ان دو حدیثوں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے دوسری حدیث اللہ کے عظیم انبیاء کی طرف اشارہ ہو (جیسا کہ اسی بات کی وضاحت علامہ مجلسیؒ نے بھی کی ہے)۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جناب ابوذرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انبیاء کی تعداد کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار، اور جب پوچھا کہ ان میں رسول کتنے ہیں تو فرمایا تین سو تیرہ۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی ہے جن میں سے پانچ اولوالعزم پیغمبر بتائے ہیں یعنی جناب نوحؑ، جناب ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور پیغمبر اسلام حضرت محمد (علیہم الصلوٰۃ والسلام)۔[2]

اس بارے میں اور بھی روایات منقول ہوئی ہیں جو مندرجہ بالا عدد کی تائید کرتی ہیں۔

بہر حال ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ روایت خبر واحد نہیں ہے جیسا کہ "بروسوی" نے "روح البیان" میں لکھا ہے۔ بلکہ متعدد روایات اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی اور اس بارے میں مختلف اسلامی مآخذ میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جن انبیاء کا صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں نام آیا ہے ان کی تعداد ۲۶ ہے۔ اور وہ یہ ہیں آدمؑ نوحؑ، ادریسؑ، صالحؑ، ہودؑ، ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یوسفؑ، لوطؑ، یعقوبؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، شعیبؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ الیاسؑ، الیسعؑ، ذوالکفلؑ، ایوبؑ، یونسؑ، عزیرؑ اور حضرت محمد (علیہم الصلوٰۃ والسلام)

لیکن کچھ انبیاء ایسے ہیں جن کی طرف قرآن میں صرف اشارہ ہوا ہے وضاحت کے ساتھ ان کا نام نہیں لیا گیا جیسے حضرت "اشموئیل" کہ جن کی طرف سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۸ میں "وقال لھم نبیھم" کے ہیں اشارہ کیا گیا ہے۔

اور حضرت "ارمیا" ہیں کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۹ میں "او کالذی مرّ علی قریۃ" کے جملے سے ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[3]

ایک اور نبی حضرت "یوشعؑ" ہیں جن کی طرف سورۂ کہف کی آیت ۶۰ میں "واذ قال موسیٰ لفتاہ" میں اشارہ کیا گیا ہے۔ (بنا بریں جناب یوشعؑ کا شمار بھی انبیاء میں ہوتا ہے)۔

اور جناب "خضرؑ" ہیں جن کی طرف سورۂ کہف کی آیت ۶۵ میں "فوجدا عبداً من عبادنا" میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح "اسباط بنی اسرائیل" ہیں جو اپنے قبیلوں کے سردار تھے اور سورۂ نساء کی آیت ۱۶۳ میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ ان کی طرف وحی ہوتی تھی۔

واوحینا الی ابراھیم واسماعیل واسحاق ویعقوب والاسباط ...

اگر یوسفؑ کے بھائیوں میں بھی کوئی نبی تھا تو اس کی طرف بھی سورۂ یوسف میں کئی بار اشارہ ہو چکا ہے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۳۲ (حدیث ۲۴)۔

[2] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۴۱ (حدیث ۴۲)۔

[3] البتہ اس بارے میں بعض مفسرین میں اختلاف ہے کہ بعض اسے "ارمیا" بعض "خضر" اور بعض "عزیر" سمجھتے ہیں۔

قصہ مختصر، جن انبیاء کی داستان اور سرگذشت کی طرف خداوند عالم نے اشارہ فرمایا ہے ان کی تعداد ۲۶ سے بہت زیادہ ہے اور یہ تعداد صرف ان کی ہے جن کا نام صراحت کے ساتھ قرآن میں آیا ہے۔

اس مقام پر آخری بات اور وہ یہ کہ بعض شیعہ اور سنی کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے سیاہ فاموں سے بھی ایک پیغبر مبعوث فرمایا ہے جیسا کہ طبرسیؒ "مجمع البیان" میں لکھتے ہیں :

روی عن علیؑ انہ قال بعث اللہ نبیًّا اسود لم یقص قصتہ

حضرت علیؑ نے فرمایا : خدا نے ایک سیاہ فام نبی بھیجا ہے لیکن اس کی داستان قرآن میں بیان نہیں کی[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان، انہی آیات کے ذیل میں۔ نیز تفسیر کشاف کے حواشی میں بھی اس بارے میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں (دیکھئے کشاف جلد ۴ ص ۱۸۰ مطبوعہ دار الکتب العربی۔

۷۹۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْکَبُوْا مِنْھَا وَمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ ○

۸۰۔ وَلَکُمْ فِیْھَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْھَا حَاجَۃً فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَعَلَیْھَا وَعَلَی الْفُلْکِ تُحْمَلُوْنَ ○

۸۱۔ وَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰہِ تُنْکِرُوْنَ ○

ترجمہ

۷۹۔ خدا وہ ہے جس نے تمہارے لیے چوپائے بنائے ہیں تاکہ کچھ پر سواری کرو اور کچھ سے غذا حاصل کرو۔

۸۰۔ اور (اس کے علاوہ بھی) ان میں تمہارے بہت سے فائدے ہیں تاکہ ان کے ذریعے تم اس مقصد تک پہنچ سکو جو دل میں رکھتے ہو اور تم ان پر اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہو۔

۸۱۔ وہ ہمیشہ تمہیں اپنی آیات دکھاتا رہتا ہے، تو تم اس کی کون کونسی آیات کا انکار کرو گے؟

تفسیر

چوپاؤں کے مختلف فوائد

ان آیات میں ایک بار پھر قدرت خدا اور انسان کے بارے میں اس کی وسیع نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان نعمات کے ایک حصے کو مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے تاکہ ایک تو لوگ اس کی عظمت سے خوب آشنا ہو جائیں اور دوسرے ان میں احساس تشکر اجاگر ہو جو معرفت الٰہی کا ایک ذریعہ ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے، خدا تو وہ ہے جس نے تمہارے لیے چوپائے بنائے ہیں تا کہ ان پر سواری کرو اور ان سے غذا حاصل کرو۔ (اللہ الذی جعل لکم الانعام لترکبوا منھا و منھا تأکلون)۔

کچھ جانور تو وہ ہیں جو صرف خوراک کا کام دیتے ہیں جیسے: بھیڑ بکریاں، اور کچھ وہ ہیں جو سواری کا کام بھی دیتے ہیں اور خوراک کا بھی جیسے اونٹ کہ جو سواری کے لحاظ سے خشک اور جلتے صحراؤں کا جہاز بھی ہے اور لوگوں کی غذا کا ذریعہ بھی۔

"انعام" "نعم" (بروزن قلم) کی جمع ہے جو دراصل صرف اونٹ کیلئے استعمال ہوتا تھا لیکن بعد میں اس نے مفہوم کے لحاظ سے اس قدر وسعت اختیار کی کہ اونٹ، گائے اور گوسفند کے لیے بھی بولا جانے لگا۔ یہ لفظ "نعمت" سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان کے لیے خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت چوپائے ہیں۔ حتیٰ کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی جب کہ آواز سے کئی گنا تیز ہوائی جہاز اور تیز رفتار زمینی ذرائع آمدورفت ایجاد ہو چکے ہیں پھر بھی بعض مقامات ایسے ہیں جہاں پر صرف اور صرف انہی جانوروں سے استفادہ کیا جانا ممکن ہے۔ ریتلے صحراؤں سے جدید ذرائع آمدورفت کا عبور نہایت مشکل ہے۔ پہاڑوں کی بعض تنگ و تاریک گزرگاہوں سے اب بھی صرف جانوروں کے ذریعے ہی گزرنا ممکن ہوتا ہے۔

اصولی طور پر جانوروں کی خصوصی تخلیق، خاص کر سدھائے جانے کے لیے تسلیم کا مادہ اور قابلیت خدا کی عظیم نشانیوں سے خود ایک نشانی ہے جب کہ بعض جانور تو انسان سے کئی گنا طاقتور ہوتے ہیں۔

ہم ایسے چھوٹے اور کم جثہ جانوروں کو بھی جانتے ہیں جو انسانوں سے دہشت رکھنے کی وجہ سے سخت خطرناک ہوتے ہیں۔ جبکہ بڑے بڑے اونٹوں کی قطاروں کی باگ ڈور اگر ایک معصوم بچے کے ہاتھ میں دے دی جائے تو

ع۔ می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اس کے علاوہ ان جانوروں سے اور بھی کئی خاطر خواہ فوائد حاصل کئے جاتے ہیں جیسا کہ بعد کی آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور اس کے علاوہ تمہارے لئے اور بھی کئی فوائد ہیں (ولکم فیھا منافع)۔

تم ان کے دودھ، اون، چمڑے اور دوسرے اجزاء سے استفادہ کرتے ہو حتیٰ کہ ان کے فضلے تک کو زراعت کے کام میں لاتے ہو۔ المختصر ان جانوروں کے تمام وجود کی کوئی چیز بھی بے فائدہ اور ناقابل مصرف نہیں ہے بلکہ ان کا سارے کا سارا وجود مفید اور سودمند ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض مواقع پر کئی دواؤں کا خام مواد بھی انہی سے لیا جاتا ہے۔

(دھیان رہے کہ لفظ "منافع" کو نکرہ لایا جانا اس کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے ہے)۔

پھر فرمایا گیا ہے: ان کی تخلیق کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تم ان پر سوار ہو کر دل خواہ مقاصد تک جا پہنچو (ولتبلغوا علیھا حاجۃ فی صدورکم)۔

بعض مفسرین نے اس جملے سے جانوروں کے ذریعے مال کی نقل و حرکت مراد لی ہے کیونکہ اس سے پہلے کے جملے میں اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ "حاجۃ فی صدورکم" (جو حاجت تم دل میں رکھتے ہو) سے مراد تفریح، ہجرت، سیر و سیاحت، مقابلہ بازی بلکہ شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ جیسے ذاتی اور شخصی فوائد مراد ہوں۔

چونکہ مسافرت کے ان تمام وسائل کا خشکی سے تعلق ہوتا ہے لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ان چوپاؤں اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہیں (وعلیھا وعلی الفلک تحملون)[1]

"علیھا" (ان جانوروں پر) کی تعبیر باوجودیکہ اس سے پہلے اس بارے میں گفتگو ہو چکی ہے یہاں پر "فلک" (کشتیوں) کے ذکر کے لیے مقدمہ کی حیثیت سے ہے یعنی خداوند عالم نے صحراؤں اور دریاؤں میں سفر اور مال کی نقل و حمل کے ذرائع تمہارے اختیار میں دے دیئے ہیں، تاکہ تم آسانی کے ساتھ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکو۔

بحری جہازوں اور کشتیوں میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ اپنے تمام بوجھ اور ثقل کے باوجود پانی پر تیرتی رہتی ہیں اور ہواؤں کو ایسے مقررہ رخ پر چلایا کہ ہمیشہ ان سے کسی نہ کسی معین راستے کے لیے استفادہ کر کے مقصد کی طرف جایا جا سکتا ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں تاکید کے طور پر اور ہر ایک سے اقرار حاصل کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: "خدا ہمیشہ اپنی نشانیاں تم کو دکھلاتا ہے، تم ہی بتاؤ کہ خدا کی کس کس آیت کا انکار کرو گے؟ (ویریکم ایاتہ فای ایات اللہ تنکرون)۔

کیا تم "آفاق" میں اس کی آیات کا انکار کرو گے یا "انفس" میں؟ آیا تم مٹی سے اپنی تخلیق، پھر جنین کے مراحل طے کرنے اور ولادت کے بعد کے مراحل کا انکار کرو گے یا موت و حیات کا؟

آیا زمین و آسمان میں خدا کی آیات کا انکار کرو گے یا روز و شب کی آفرینش کا؟ یا جانوروں اور چوپاؤں جیسے وسائل زندگی کی تخلیق کا؟ غرض "جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے"۔ "اندھی ہو جائیں وہ آنکھیں جو اسے نہ دیکھ سکیں"۔

سچ مچ جب کہ اس کی آیات اور نشانیاں ہر ایک کے لیے واضح ہیں تو پھر کئی لوگ انکار کا راستہ کیوں اپناتے ہیں؟ اس سوال کا جواب عظیم مفسر طبرسی نے ان الفاظ میں دیا ہے:

ممکن ہے کہ اس انکار کے تین اسباب ہوں:

۱۔ خواہشات نفسانی کی اتباع:

یہ اس بات کا سبب بنتی ہے کہ انسان بے بنیاد شکوک و شبہات کی وجہ سے حق کے چہرے کو چھپا دیتا ہے لہٰذا اپنی ان نفسانی خواہشات کو ہمیشہ اپناتے رہتا ہے، کیونکہ حق کی قبولیت تو اسے محدود کر دیتی ہے ایک تو اس کے لیے فرائض کا تعین کرتی ہے اور دوسرے اسے کچھ حدود کا پابند بناتی ہے۔ لیکن خواہشات کے پجاری نہ تو ان فرائض کو قبول کرنے پر تیار ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی حد کے اندر رہ کر مقید ہونا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ انکار

---

[1] جانوروں کے فوائد کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد (سورۂ نحل کی پانچویں آیت کے ذیل) میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

حق پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں ہر چند کہ اس کے دلائل اور براہین روشن اور آشکار ہی کیوں نہ ہوں۔

۲۔ دوسرے لوگوں، خاص کر باپ دادا کی اندھی تقلید :

یہ بھی حق کے چہرہ پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

۳۔ تحقیق کئے بغیر غلط فیصلہ :

اور سابقہ غلط عقائد جو ذہن میں راسخ ہو چکے ہیں وہ بھی آیات حق کے بارے میں غیر جانبدار تحقیق اور مطالعے مانع ہوتے ہیں لہٰذا انسان حق کا ادراک کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔

۸۲- اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

۸۳- فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○

۸۴- فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ○

۸۵- فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ○ع

ترجمہ

۸۲- کیا انہوں نے زمین پر چل پھر کر نہیں دیکھا تاکہ انہیں معلوم ہوتا کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا انجام کیا ہوا؟ وہی کہ جو افراد کی قوت کے لحاظ سے بھی ان سے زیادہ تھے اور زمین ان کی طاقت اور آثار بھی بہت تھے، جو کچھ وہ کماتے تھے وہ انہیں (عذاب الٰہی سے) بے نیاز نہ کر سکا۔

۸۳- جب ان کے رسول، واضح دلائل لے کر ان کے پاس آئے تو وہ اپنی موجود معلومات میں ہی مگن رہے (اور وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے تھے) لیکن جس (عذاب) کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہی ان پر آنازل ہوا۔

۸۴۔ انہوں نے جب ہمارے عذاب کی سختی کو دیکھا تو کہنے لگے : اب ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے ہیں اور جن معبودوں کو ہم اس کا شریک ٹھہراتے تھے ان کا انکار کیا۔

۸۵۔ لیکن ہمارا عذاب دیکھنے کے بعد ان کا ایمان انہیں فائدہ نہ پہنچا سکا، خدا کی سنت اس کے گزشتہ بندوں میں یہی رہی ہے اور اس وقت کافر لوگوں نے نقصان اٹھایا ہے۔

تفسیر

عذاب کے موقع پر ایمان لانا فضول ہے

یہ آیات جو سورۂ مومن کی آخری آیات ہیں درحقیقت تمام سورت کا خلاصہ اور گزشتہ تمام گفتگو کا نچوڑ ہیں کیونکہ آفاق و انفس پر مشتمل اس قدر آیات کے بیان، معاد اور قیامت کی عظیم عدالت کے بارے میں اس قدر لطیف و دلنشین مواعظ و گفتگو کے بعد ضدی مزاج منکروں اور متکبر کافروں کو زبردست لیکن استدلال پر مشتمل تنبیہ کرتے ہوئے ان کے انجام کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے : آیا انہوں نے روئے زمین کی سیر نہیں کی تاکہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا کیا انجام ہوا ؟ (افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلھم)۔

اگر انہیں مدوّن اور مرتب تاریخ اور تاریخی صفحات میں مندرج واقعات کی حقیقت اور اصلیت میں شک ہے تو وہ بادشاہوں کے ویران شدہ محلات، زمین کے اندر گلی سڑی ہڈیوں، مصائب کے شکار شہروں کے کھنڈرات اور ان کے آثار میں تو شک نہیں کر سکتے جو زبان حال سے پکار پکار کر ان کی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔

" وہی لوگ جو افرادی قوت کے لحاظ سے بھی اور زمین میں اپنی طاقت اور آثار کے لحاظ سے بھی ان سے زیادہ تھے (کانوا اکثر منھم واشد قوة و اٰثارًا فی الارض)۔

ان کی افرادی قوت ان کی قبروں سے اور ان کی طاقت اور آثار کی فراوانی روئے زمین پر چھوڑی ہوئی ان کی یادگاروں سے سمجھی جا سکتی ہے۔

" اٰثارًا فی الارض " کی تعبیر سے ممکن ہے کہ ان کی زراعت کی ترقی کی طرف اشارہ ہو ـــــ جیسا کہ ہم اسی سورت کی اکیسویں آیت کی تفسیر میں جو اس سے ملتی جلتی ہے، بیان کر چکے ہیں ـــــ (نیز جیسا کہ سورۂ روم کی آیت ۹ میں بھی گزر چکا ہے) یا پھر گزشتہ اقوام کی پہاڑوں کے اندر یا صحراؤں کے سینے پر موجود عمارتوں کی طرف اشارہ ہو (جیسا کہ سورۂ شعراء کی آیات ۱۲۸ ، ۱۲۹ میں بیان ہو چکا ہے)۔

لیکن اس کے باوجود "جو کچھ بھی انھوں نے کمایا وہ طوفانِ بلا اور عذابِ الٰہی کے موقع پر انہیں بے نیاز نہ کر سکا اور نجات نہ دلا سکا" (فما اغنٰی عنهم ما کانوا یکسبون)[1]

بلکہ یہ تمام طاقتیں پلک جھپکنے میں نیست و نابود ہوگئیں، محلات ایک دوسرے پر گر پڑے اور ویران ہو گئے، عظیم اور طاقتور لشکر پت جھڑ کے موسم میں درخت کے پتوں کی طرح روئے زمین پر گر پڑے یا پھر کو بیکراں موجوں کی نذر ہو گئے۔

جہاں پر اس قدر عظیم و جرار لشکروں اور بے انتہا طاقتوں کا یہ انجام ہوا ہو وہاں پر کمزور اور ناتواں مشرکین جن کا کسی کھاتے میں شمار نہیں، کیا سمجھتے ہیں؟

بعد کی آیت میں ان لوگوں کے انبیاء اور انبیاء کے واضح اور روشن معجزات کے ساتھ سلوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "جب ان کے رسول ان کے پاس معجزات اور روشن دلائل لے کر آئے تو انھوں نے ان سے روگردانی کی اور صرف انہی معلومات پر خوش رہے جو ان کے پاس پہلے سے تھیں۔ ان کے علاوہ باقی سب کو کچھ نہ سمجھا (فلما جاء تهم رسلهم بالبینات فرحوا بما عندهم من العلم)۔

یہی امر اس بات کا سبب ہوا کہ "وہ خدا کی جس دھمکی اور عذاب کا مذاق اڑایا کرتے تھے وہی ان پر نازل ہو کر رہا (وحاق بهم ما کانوا به یستهزءون)۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ معلومات اور علم کیا تھا جس پر وہ نازاں تھے اور اس کے ہوتے ہوئے خود کو بے نیاز تصور کرتے تھے؟ اس بارے میں مفسرین نے مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے جو سب کے سب باہم جمع ہو سکتے ہیں

۱۔ وہ بے بنیاد شکوک و شبہات اور بے اساس اوہام کو علم سمجھتے تھے اور انہی پر ان کو ناز تھا کہ جن کے کچھ نمونے قرآنی آیات میں ذکر ہوئے ہیں، کبھی تو وہ کہتے:

من یحی العظام و هی رمیم

کون ان گلی سڑی ہڈیوں کو زندہ کرے گا؟ (یٰس۔ ۷۸)

کبھی کہتے:

ءاذا ضللنا فی الارض ءانا لفی خلق جدید

ہم مٹی ہو کر مٹی میں گم ہو جائیں گے تو کیا ممکن ہے کہ دوبارہ نئی تخلیق حاصل کریں؟ (سجدہ۔ ۱۰)

کبھی کہتے:

ما هی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحیا و ما یهلکنا الا الدهر

بس اس دنیاوی زندگی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے، کچھ لوگ مر رہے ہیں کچھ پیدا ہو

---

[1] "ما اغنٰی" میں "ما" کونسا ہے، نافیہ ہے یا استفہامیہ؟ دونوں احتمال پائے جاتے ہیں لیکن بظاہر نافیہ ہے اور "ما کانوا یکسبون" میں "ما" موصولہ ہے یا مصدریہ؟ اس بارے میں بھی دو احتمال ہیں، لیکن پہلے معنی کو مسلماً ترجیح حاصل ہے۔

رہے ہیں اور صرف فطرت ہی ہمیں مار رہی ہے۔ (جاثیہ-۲۴)۔

اس قسم کے دوسرے واہیات اور بے بنیاد دعوے جنہیں وہ علم سمجھتے تھے۔

۲۔ اس سے مراد دنیا اور نظام زندگی کو چلانے کے متعلق معلومات ہیں جیسا کہ قارون نے کہا تھا:

انما اوتیتہ علٰی علم عندی

میں نے اس مال و دولت کو اپنی خاص معلومات کی وجہ سے حاصل کیا ہے جو میرے پاس تھیں۔ (قصص-۷۸)

۳۔ اس سے مراد عقلی اور فلسفی دلائل یعنی علوم و فنون ہیں خواہ وہ رسمی شکل میں ہوں یا غیر رسمی صورت میں کہ کچھ لوگ انکی معلومات رکھنے کی وجہ سے خود کو انبیاء سے بے نیاز سمجھتے تھے، ایسے لوگ پہلے زمانہ کے ہوں یا موجودہ دور کے۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ ان تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ مقصد یہ ہے محدود بشری علوم خواہ وہ عقلی معارف اور عقائد ہوں یا واہیات شکوک و شبہات کہ جنہیں وہ علم سمجھتے تھے کے بل بوتے پر وہ ایسے علوم کی نفی کیا کرتے تھے اور ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ جس کا ماخذ اور سرچشمہ وحی الٰہی ہوتا تھا اور اپنی ان محدود اور مختصر سی معلومات پر نازاں اور مسرور رہتے اور خود کو انبیاء سے بالکل بے نیاز سمجھتے تھے۔[1]

لیکن قرآن مجید نے اس خود خواہی، غرور اور تکبر کے نتیجے کو بعد کی آیات میں یوں بیان کیا ہے: "جب انہوں نے ہمارے عذاب کی شدت کو دیکھا، جو ان کے نیست و نابود کرنے کے لیے نازل ہو چکا تھا اور ان کی نابودی کے لیے اپنے پروردگار کا آخری حکم لے کر آگیا تھا، تو وہ اپنے کیے پر پشیمان ہو گئے اور اپنے آپ کو ذرۂ ناچیز و ناتواں سمجھنے لگے تو بارگاہ حق کی طرف متوجہ ہو گئے اور چلا کر کہا: اب ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے ہیں اور جن معبودوں کو ہم اس کا شریک ٹھہراتے تھے ان سے پھر چکے ہیں (فلمّا رآوا بأسنا قالوا اٰمنا باللّٰہ وحدہ وکفرنا بما کنا بہ مشرکین)۔

لیکن جب انہوں نے ہمارے عذاب کا مشاہدہ کر لیا تو ان کا ایمان ان کے لیے سودمند ثابت نہ ہوا (فلم یک ینفعھم ایمانھم لمّا رآوا بأسنا)۔

کیونکہ "استیصالی عذاب" کے نزول کے وقت توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور اصولی طور پر ایسے مجبوری کے ایمان کا اختیاری ایمان جیسا فائدہ بھی نہیں ہوتا اور مجبوری کے ایمان کی کچھ خاص وجوہات ہوتی ہیں اور جب یہ وجوہات ختم ہو جاتی ہیں اور طوفان بلا تھم جاتا ہے تو پھر

ع وہی ہے چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

یہی وجہ ہے کہ جب فرعون نے نیل کی امواج بلا میں گھر کر ایمان کا اظہار کیا تو قبول نہیں کیا گیا۔

یہ حکم کچھ خاص افراد یا اقوام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ایسا ہے جب کہ خود قرآن اسی آیت کے ضمن میں کہتا ہے:

---

[1] بعض مفسرین یہ سمجھتے ہیں کہ "جاءتھم" کی ضمیر انبیاء کی طرف لوٹ رہی ہے لہٰذا یہاں پر علوم سے مراد، انبیاء کے علوم ہیں اور "فرحوا" سے مراد کفار کا انبیاء کرام کے علوم کے ساتھ ہنسی مذاق اور استہزاء ہے لیکن یہ تفسیر بہت بعید نظر آتی ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

یہ ایک خدائی طریقہ کار ہے جو اس کے گزشتہ بندوں میں بھی نافذ العمل رہا ہے۔ (سنت اللہ التی قد خلت فی عبادہ)۔

آخر میں زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا گیا ہے: جب خدائی عذاب نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تو کافروں کا خسارہ اور نقصان ظاہر ہو گیا (وخسر هنالك الکافرون)۔

اب انہیں پتہ چلا کہ ان کے پاس تو صرف غرور اور تکبر کا مٹھی بھر سرمایہ تھا، جسے وہ آب حیات سمجھتے تھے وہ تو سراب نکلا، اپنے تمام سرمایہ وجودی کو دنیا کی اس بے راہروی میں گنوا چکے ہیں جس کا نتیجہ گناہ اور خدا کے دردناک عذاب کے سوا اور کچھ نہیں نکلا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا نقصان اور خسارہ ہوگا؟

تو اس طرح سے سورۂ مؤمن اپنے اختتام کو پہنچی، جس کا آغاز مغرور کفار کے حالات سے ہوا تھا اور اختتام ان کے دردناک انجام پر۔

نکتہ

اپنے علم پر گھمنڈ کرنے والے

جیسا کہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اس سورت میں بہت سے لوگوں کی گمراہی، بے راہروی اور بدبختی کا اصل سرچشمہ تکبر اور غرور بتایا گیا ہے۔

تکبر کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ کبھی تو مال و ثروت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، کبھی افرادی قوت اور (جی) طاقت کی وجہ سے اور کبھی تھوڑی سی معلومات کی وجہ سے جنہیں انسان عظیم علم تصور کر لیتا ہے۔

جس کا جیتا جاگتا ثبوت ہمارے اس دور میں ترقی یافتہ مادی اقوام میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے بعد ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہمیں اچھی طرح علم ہے کہ مذہب کی نفی اور الحادی مکاتب فکر کی ترویج کا ایک اہم اور مؤثر عامل وہی علمی غرور ہے جو کئی سائنس دانوں کے اندر پیدا ہوا۔ وہ فطرت کے بعض اسرار کا انکشاف اور سائنسی معلومات حاصل کر کے اپنے علم کی وجہ سے اس قدر مغرور اور بدمست ہو گئے کہ یہ تصور کر لیا کہ کائنات میں صرف وہی کچھ موجود ہے جسے وہ جانتے ہیں اور جو ان کے علم میں نہیں اس کا وجود بھی نہیں ہے اور چونکہ انہوں نے خدا کو اپنی لیبارٹریوں اور رصد گاہوں میں موجود نہیں پایا لہٰذا اس کے منکر ہو گئے۔

یہ علمی غرور اس حد تک وسعت پیدا کر گیا کہ وہ سرے سے مذہب اور انبیاء پر نازل ہونے وحی کو بھی انسان کی جہالت اور خوف کی پیدائش سمجھنے لگے اور کہنا شروع کر دیا کہ اب جبکہ علم اور سائنس اپنے عروج کمال کی سرحدوں کو چھو رہے ہیں ایسے مسائل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور بشری زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کر ڈالا:

۱۔ افسانوی دور

۲۔ مذہبی دور

۳۔ فلسفی دور

۴۔ سائنسی دور

البتہ ایسے دانشوروں کی فعالیت کے دور میں کچھ مذاہب کے خرافات پر مشتمل ہونے نے بھی ان کے باطل اور ناپاک مقاصد کو تقویت پہنچائی (البتہ زیادہ تر ارباب کلیسا کی خرافات مراد ہیں)۔ اس طرح سے انہوں نے اپنے زعم باطل کے تحت مذہب اور انبیاء کی تعلیمات کو ہمیشہ کے لیے انسانی زندگی کے پروگرام سے خارج کر دیا۔

لیکن خوش قسمتی سے یہ مستی اور غرور بھی ناپائیدار ثابت ہوئے اور دوسرے کچھ عوامل نے مل کر اس بے بنیاد نظریئے پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ اور مندرجہ بالا آیات کے مصداق "جب وہ اپنے علم پر مغرور ہو گئے تو عذاب خدا نے انہیں آلیا اور ان کی چیخ و پکار انہیں کچھ فائدہ نہ پہنچا سکی"۔

ایک طرف تو پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں نے ثابت کر دیا کہ سائنسی اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسان کو نہ صرف خوش بخت نہیں بنایا بلکہ دوسرے ادوار سے کہیں زیادہ تباہی کے کنارے لاکھڑا کیا ہے۔

دوسری طرف مختلف قسم کی اجتماعی اور اخلاقی بے راہروی، طرح طرح کے مصائب و مشکلات، بے اندازقتل و غارت اور نفسیاتی بیماریاں، لوٹ مار اور جنسی مسائل نے ثابت کر دیا کہ انسانی علوم خواہ جس قدر بھی ترقی کر جائیں تنہا وہ ان مشکلات کا حل پیش نہیں کر سکتے بلکہ ان کی غلط انداز میں تعلیم نے تو مشکلات میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

تیسری طرف، سائنسی علوم میں بہت سے معمے پیدا ہو گئے جن کو حل کرنے سے انسان نے خود کو عاجز پایا اور ایسے ایک نہیں کئی وسیع جہان نظر آنے لگے (خواہ وہ عظیم تر جہان ہوں یا نہایت ہی چھوٹے) انسان نے ان جہانوں کی شناخت سے بھی خود کو ناتواں پایا تو مجبوراً اسے انبیاء عظام کی تعلیمات کا سہارا لینا پڑا اور بہت بڑی تعداد میں دانشوروں کو وحی کے سائے میں پناہ لینا پڑی اور ایسی جانکاہ بیماریوں کا علاج انبیاء کے فرامین میں ڈھونڈنے لگے۔ کلیساؤں میں ایک بار پھر بہار آنے لگی اور مذہبی تعلیمات بہت سے لوگوں کی زندگی کا جزو قرار پائیں۔

اس دوران میں اسلام اپنی مخصوص، تازہ، ترقی یافتہ اور جامع تعلیمات لے کر ظہور پذیر ہوا اور حقیقی اسلام کی پہچان کی لگن لوگوں کے دل میں پیدا ہوئی۔

ہمیں اُمید ہے کہ قبل اس کے کہ بأس (عذاب) الٰہی ایک بار پھر اس دنیا کے لوگوں پر نازل ہو، بیداری کی یہ لہر عمومی صورت اختیار کرے گی اور اس غرور و تکبر کے آثار نیست و نابود ہو جائیں گے تاکہ انسانیت کو ایک بار پھر نقصان اور خسارہ نہ اُٹھانا پڑے۔

پروردگارا! ہمیں غرور، تکبر، ضد، ہٹ دھرمی اور خود خواہی سے اپنی امان میں رکھ کہ یہی چیزیں انسان کی ہلاکت، بدبختی اور شرمساری کا سبب ہیں۔

خداوندا! ہماری دنیا کو بیدار فرما! اور قبل اس کے کہ تیری "بأس شدید" ہمارے اس دور کے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے انہیں اپنے انبیاء کے محبت بھرے دامان کی طرف لوٹا۔

بارِالٰہا! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے جو دوسروں کے انجام سے عبرت حاصل کرتے ہیں تاکہ ہمارا انجام دوسروں کے لیے عبرت نہ بنے۔

آمین یارب العالمین

سورۂ مومن کی تفسیر اپنے اختتام کو پہنچی۔

شب ۲۷/محرم الحرام/۱۴۰۵ھ

اختتام ترجمہ اردو

۸ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ بوقت آٹھ بج کر ستائیس منٹ بمقام قم مقدسہ بر مکان خود جبکہ فرزند عزیزم سید محمد مہدی کی وفات کے سلسلے میں قم آیا ہوا تھا۔

عزیز مرحوم نجف آباد (اصفہان) میں ایک پک اپ سے ٹکرا جانے کی وجہ سے اصفہان کے ایک ہسپتال میں ۲۵ صفر المظفر ۱۴۰۷ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء بوقت ۱۲ بجے دوپہر چودہ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گیا، اور ہفتہ کے دن تقریباً گیارہ بجے قم کے باغ بہشت میں اسے دفن کیا گیا۔

خداوند عالم مرحوم کو جوار جناب قاسم علیہ السّلام میں جگہ عنایت فرمائے۔

احقر سید صفدر حسین نجفی

سورۂ حٰمٓ سجدہ (فُصّلت)

- مکّہ میں نازل ہوئی
- اس کی ۵۴ آیتیں ہیں

تاریخ آغاز
۲۸ محرم الحرام ۱۴۰۵ھ

سورۂ حٰم سجدہ کے مندرجات

چونکہ یہ سورت مکی ہے لہذا اس میں مکی سورتوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، یعنی وہی معارف اسلامی کی تاکید، اعتقادی مباحث، جنت کی خوشخبری اور جہنم سے ڈرانے کے مسائل۔ لیکن اس کے باوجود اس میں کچھ ایسے مسائل بھی بیان ہوئے ہیں جو دوسری سورتوں میں بیان نہیں ہوئے اور جو اسی سورت کے ساتھ ہی مختص ہیں۔

اس سورت کے مندرجات کو مندرجہ ذیل چند حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ قرآن مجید کی طرف توجہ اور اس کے بارے میں تفصیل سے گفتگو اس سورت کی مختلف آیات میں بیان ہوئی ہے ان میں سے یہ باتیں بھی ہیں کہ قرآن کی حاکمیت ہر دور میں باقی ہے اور ہر زمانے میں اس کا منطقی تسلط بحال اور برقرار ہے۔ جیسا کہ اسی سورت کی ۴۱ ویں اور ۴۲ ویں آیات میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے:

"یہ ناقابل شکست کتاب ہے اور باطل ہرگز اس پر غلبہ حاصل نہیں کرسکتا۔"

یہ بات اس میں تحریف نہ ہونے کی بھی دلیل ہے۔ نیز اسی سورت میں اس آسمانی کتاب کے مقابلے دشمن کی سخت محاذ آرائی کا تذکرہ بھی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی مخالفت کی یہ حالت تھی کہ وہ لوگوں کو آیات قرآنی سننے سے بھی روکا کرتے تھے۔

۲۔ تخلیق زمین و آسمان، خصوصاً گیس کی شکل کے مادہ (دخان) سے کائنات کی آفرینش کا آغاز اور کرۂ زمین، پہاڑوں، نباتات اور حیوانات کی پیدائش کے مراحل کی طرف توجہ دی گئی ہے۔

۳۔ قوم عاد و ثمود سمیت گزشتہ مغرور اور سرکش اقوام کے حالات زندگی اور ان کے دردناک انجام اور حضرت موسیٰؑ کی داستان کی طرف بھی اشارہ ہے۔

۴۔ مشرکین اور کفار کو ڈرایا گیا ہے۔ خاص کر قیامت کے بارے میں لرزا دینے والی آیات انسان کے اعضاء حتیٰ کہ بدن کی کھال کی گواہی کا ذکر بھی ہے اور جب وہ عذاب الٰہی کے سامنے پیش ہوں گے تو خدا ان کو زبردست طور پر جھڑکے گا۔

۵۔ معاد اور قیامت کے کچھ دلائل اور اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

۶۔ مندرجہ بالا عناوین کے ضمن میں جو وعظ و نصیحت کی گئی ہے وہ انسان کی روح کی تقویت کا سبب ہے۔ خاص کر راہِ حق میں استقامت، دشمن سے منطقی مقابلے کا طریقہ کار اور دین الٰہی کی طرف راہنمائی کے اسلوب کار کی نشاندہی کی گئی ہے۔

۷۔ سورت کو پروردگار عالم کی آفاقی اور انفسی آیات کے بارے میں دلچسپ لیکن مختصر گفتگو اور معاد کے مسئلے پر ختم کر دیا گیا ہے۔

اس سورت کی تلاوت کی فضیلت

اسلام کے عظیم الشان پیغمبرؐ کی ایک حدیث میں ہے:

من قرأ حٰم السجدة اعطی بکل حرف منها عشر حسنات

جو شخص حٰم سجدہ کی تلاوت کرے، اسے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں عطا کی جائیں گی۔[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

من قرأ "حٰم السجدة" کانت له نوراً یوم القیامة مد بصره، و سروراً، وعاش فی هٰذه الدنیا مغبوطاً محموداً

"جو شخص "حٰم سجدہ" کی تلاوت کرے گا قیامت کے دن یہی سورت اس کے سامنے نور بن کر آ جائے گی جہاں تک کہ اس کی نگاہ پہنچے گی نور ہی نور ہوگا اور اس کی مسرت اور خوشی کا سبب ہوگی۔ اور اس دنیا میں بھی وہ شخص ایسا اچھا مقام پیدا کرے گا کہ جو دوسروں کے لیے باعث رشک ہوگا۔[2]

ایک اور حدیث میں جو "بیہقی" سے نقل ہوئی ہے خلیل بن مرہ کہتے ہیں:

کوئی رات بھی ایسی نہیں ہوئی تھی جس میں پیغمبر اسلام سورہ "تبارک" اور سورہ "حٰم سجدہ" پڑھ کر نہ سوتے ہوں۔[3]

مسلّم ہے کہ اس سورت کی بیدارکن آیات جن میں روشنی عطا کرنے والی نصیحتیں بھی ہیں اور مطالب و معانی سے بھرپور معارف، جب تلاوت کے ذریعے انسانی روح میں جذب ہو جائیں اور اس کی زندگی میں اس کی راہنمائی کریں تو یقیناً بروز قیامت اس کے نور اور اس دنیا میں مؤثر کامیابی کا ذریعہ ثابت ہوں گی، کیونکہ تلاوت غور و فکر کا مقدمہ ہوتی ہے لہٰذا غور و فکر عمل کا مقدمہ۔

اس سورت کو "سورۂ فصلت" بھی کہتے ہیں اور وہ اس لیے کہ اس کی تیسری آیت میں یہ لفظ آیا ہے اور یہ سورت "حٰم سجدہ" سے اس لیے موسوم ہے کہ "حٰم" سے اس کا آغاز ہوا ہے اور اس کی ۳۷ ویں آیت میں سجدہ کا حکم ہے۔

---

[1] تفسیر "مجمع البیان" سورۂ حٰم سجدہ کے آغاز میں (جلد ۹ ص ۲)۔

[2] تفسیر "مجمع البیان" سورۂ حٰم سجدہ کے آغاز میں (جلد ۹ ص ۲)۔

[3] تفسیر روح المعانی جلد ۲۴ ص ۹۳۔

سورۂ حٰمٓ السّجدۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۱۔ حٰمٓ ○

۲۔ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۳۔ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

۴۔ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ○

۵۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حٰم۔

۲۔ یہ کتاب ہے جو خداوند رحمان اور رحیم کی جانب سے نازل ہوئی ہے۔

۳۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات نے ہر مطلب اپنے مناسب مقام پر بیان کیا ہے اور فصیح ہے ان لوگوں کے لیے جو آگاہ ہیں۔

۴۔ یہ قرآن وہ ہے کہ جو خوشخبری دینے والا بھی ہے اور ڈرانے والا بھی، لیکن ان میں سے اکثر نے منہ پھیر لیا ہے لہٰذا اب وہ کچھ نہیں سنتے۔

۵۔ انہوں نے کہا تیری دعوت کے بارے میں ہمارے دل پردوں میں لپٹے ہیں اور ہمارے کان بہرے ہیں، ہمارے اور تیرے درمیان پردہ حائل ہے اور جب صورت حال یہ ہے تو تو اپنا کام کر ہم اپنا کام کرتے ہیں۔

تفسیر

قرآن کی عظمت!

اسلامی روایات میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ مشرکین کے بتوں کی مذمت کیا کرتے تھے اور ان لوگوں کے سامنے قرآن پڑھا کرتے تھے تاکہ وہ توحید کی راہ پر آجائیں لیکن وہ کہتے تھے کہ یہ خدا کی آیات نہیں بلکہ محمدؐ کے اشعار ہیں۔ بعض کہتے تھے کہ یہ "کہانت" ہے۔ ("کہانت" غیب کی ان باتوں کو کہتے تھے جن کا کچھ لوگ دعویٰ کرتے تھے کہ جنات کی مدد سے انہیں معلوم ہوتی ہیں) بعض کہتے تھے کہ یہ اس کے دلچسپ خطبے ہیں جن کا نام اس نے قرآن رکھ لیا ہے۔

ولید بن مغیرہ قریش کے مشہور افراد میں سے تھا اور عرب اپنے اختلافات اسی سے حل کرایا کرتے تھے اور اپنے مسائل کا حل اسی سے پوچھا کرتے تھے۔

ایک دن ابوجہل نے ولید سے پوچھا: اے ابوعبدشمس! (ولید کی کنیت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ جو کچھ کہتا ہے آیا جادو ہے، کہانت ہے یا خطبہ؟

ولید: پہلے مجھے اس کی باتیں سننے دو پھر بتاؤں گا کہ کیا ہے۔

چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا آپؐ اس وقت حجر اسماعیل کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ولید نے آپؐ سے کہا: "محمد! اپنے کچھ اشعار تو مجھے سناؤ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شعر نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے جسے وہ اپنے انبیاء اور رسل پر نازل کرتا ہے۔

اس نے کہا: جو کچھ بھی ہے، پڑھو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ حٰم سجدہ کی تلاوت شروع کی، جب اس نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سنا تو مذاق کرتے ہوئے کہا: کیا یہ وہی رحمان ہے جو یمامہ میں رہتا ہے (رحمٰن نامی آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)؟

فرمایا: نہ، خدا کو پکار رہا ہوں جو "رحمٰن" اور "رحیم" ہے۔

پھر آپؐ نے تلاوت جاری رکھی جب اسی سورت کی ۱۳ ویں آیت " فان اعرضوا فقل انذرتکم

صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود " پر پہنچے تو ولید یہ سُن کر لرزہ براندام ہوگیا اور اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا پھر قریش کے پاس نہیں گیا۔

قریش، ابوجہل سے کہنے لگے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولید بن مغیرہ محمد کے دین کی طرف جھک گیا ہے کیونکہ اب تک وہ ہمارے پاس لوٹ کر نہیں آیا۔ شاید محمد کی باتوں میں آگیا ہے اور اسی کے گھر چلا گیا ہے۔ بہرحال قریش سخت پریشان اور مغموم ہوگئے۔

دوسرے دن ابوجہل، ولید کے پاس گیا اور ان کے درمیان کچھ یوں گفتگو کا تبادلہ ہوا :

ابوجہل : چچاجان! (ولید، ابوجہل کا چچا تھا) آپ نے تو ہمیں شرمسار اور ذلیل و رسوا کر دیا۔

ولید : بھتیجے! آخر کس وجہ سے ؟

—— : "آپ تو محمد کے دین پر فریفتہ ہوگئے۔"

—— : "میں اس کے دین پر فریفتہ نہیں ہوا بلکہ اپنے قبیلے اور بزرگوں کے اسی دین پر برقرار ہوں، البتہ اس سے کچھ ایسی سخت اور پیچیدہ باتیں سنی ہیں جس سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔"

—— : "کیا وہ شعر تھے ؟"

—— : "قطعاً شعر نہیں تھے۔"

—— : "موزون خطبات تھے ؟"

—— : "نہ! خطبہ ایسا کلام ہوتا ہے جو باہم پیوستہ اور یکساں ہوتا ہے، لیکن یہ ایسا کلام ہے جو اس سے جدا اور ایک دوسرے کے وزن پر بھی نہیں ہے لیکن اس کی اپنی ایک خاص چمک ہے۔"

—— : "پھر تو کہانت ہی ہوگی ؟"

—— : "نہ، کہانت بھی نہیں ہے۔"

—— : "تو پھر کیا ہے ؟"

—— : "مجھے کچھ مہلت دو تاکہ سوچ کر بتاؤں۔"

دوسرے دن لوگوں نے اس سے پوچھا،

: "ولید! تمھاری فکر نے کہاں تک رسائی کی ہے ؟"

: ولید: بس کہہ دو کہ وہ سحر ہے کیونکہ دلوں کو اپنی طرف کھینچ کرلے جاتا ہے۔"

موقع پر "مدثر" کی کچھ آیات (۱۱ تا ۳۰) اس کے بارے میں نازل ہوئیں۔[1]

۱۔ (الانوار جلد ۷، ص ۱۱۲۔ یہ روایت کچھ فرق کے ساتھ بعض دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے جن میں سے تفسیر قرطبی (جلد ۸، ص ۵۷۸۲ اسی سورت کے آغاز) میں بھی درج کی گئی ہے۔

اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کی آیات کس قدر پرکشش اور لرزا دینے والی ہیں حتیٰ کہ عرب کے متعصب دوراندیش شخص پر ان کا اس قدر اثر ہوا۔

اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف آتے ہیں۔

اس سورت کے آغاز میں ایک بار پھر ہم حروف مقطعات کی تلاوت کر رہے ہیں (حٰمٓ) قرآنی سورتوں کے آغاز میں یہاں پر دوسری بار سامنے آ رہا ہے۔ حروف مقطعات کے بارے میں ہم بارہا تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں یہاں پر اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہاں پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ بعض مفسرین اس "حٰم" کو سورت کا نام دیتے ہیں اور بعض کے نزدیک حرف "ح" "حمید" اور حرف "م" "مجید" کی طرف اشارہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عظیم ناموں میں سے ہیں۔

پھر قرآن پاک کی عظمت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ وہ کتاب ہے جو خداوند رحمان و رحیم کی طرف سے نازل ہوئی ہے (تنزیل من الرحمٰن الرحیم)۔

اس خدا کی رحمت عامہ اور رحمت خاصہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر ان آیات کے نزول کا سبب بنیں، ایسی آیات جو دوست اور دشمن دونوں کے لیے رحمت کا باعث ہیں اور اولیاء خدا کے لیے خاص برکتیں اور رحمتیں اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ درحقیقت اس آسمانی کتاب کی واضح اور نمایاں صفت وہ رحمت ہی ہے جو آیات قرآنی کے اندر ایسے سموئی ہوئی ہے جس طرح پھول کی پتیوں میں عطر کے ذرات ہوتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے لیے رحمت ہے جو اس کے راستے پر گامزن ہوں اور اس کی تعلیمات سے ہدایت حاصل کریں۔

قرآن کے بارے میں مندرجہ بالا اجمالی بیان کے بعد اب اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اور اس آسمانی کتاب کی پانچ صفات کا بیان ہے۔ یہ پانچ ایسی صفات ہیں جو قرآن مجید کے اصلی چہرہ کی تصویر کشی کرتی ہیں اور اس کی ایک منہ بولتی تصویر ہیں۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: یہ ایسی کتاب ہے جس کی تمام آیات روشن ہیں اور جس کا ہر مطلب اپنے مقام پر بیان ہوا ہے اور انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں (کتاب فصلت اٰیاته)[1]

ایسی کتاب ہے جو فصیح بھی ہے اور منہ بولتی بھی (قراٰناً عربیًّا)۔

ایسے لوگوں کے لیے جو صاحبان علم اور جویائے حقیقت ہیں (لقوم یعلمون)[2]

قرآن، جو کہ بشیر و نذیر ہے، اُمید بخش اور خوف آور ہے۔ نیک لوگوں کو خوش خبری دیتا ہے اور بدکاروں کو ڈراتا ہے (بشیرًا و نذیرًا)۔

لیکن ان میں سے اکثر نے روگردانی کر لی ہے لہٰذا وہ کچھ بھی نہیں سنتے (فاعرض اکثرھم فھم لایسمعون)۔

اس طرح سے اس آسمانی کتاب کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ اس میں انسانی ضروریات کے مختلف مسائل کو اس انداز

---

[1] "کتاب" خبر کے بعد خبر ہے وہ یوں کہ "تنزیل" مبتدا، محذوف کی خبر ہے اور کتاب اس کے بعد کی خبر ہے۔

[2] "لقوم یعلمون" ممکن ہے کہ "فصلت" کے متعلق ہو یا پھر ہو سکتا ہے "تنزیل" کے متعلق ہو۔

میں بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص بھی جس سطح کے فکر و فہم کا مالک ہوگا اور اسے جس مرحلے پر روحانی احتیاج ہوگی اپنی فکر کی اتنی مقدار اور اپنی ضرورت کی اسی حد تک بہرہ اندوز ہوگا۔

اس کی دوسری بڑی صفت یہ ہے کہ یہ کتاب ایک مکمل مجموعہ ہے کیونکہ "قرآن" "قرائت" کے مادہ سے ہے جس کا اصل معنی مختلف اجزائے سخن کو یکجا کرنا۔

اس کی تیسری صفت یہ ہے کہ اس کی خاص فصاحت اور بلاغت ہے کہ جس کے ذریعے حقائق کو صحیح صحیح، صراحت کے ساتھ بغیر کسی کم و کاست کے واضح طور پر نہایت ہی دلکش انداز اور جاذب پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔

اس کی چوتھی اور پانچویں صفت یہ ہے کہ خوشخبری دینے والی اور متنبہ کرنے والی ہونے کے باعث یہ کتاب گہرا تربیتی اثر رکھتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی آیات نیک اور پاک لوگوں کی ترغیب اور انہیں شوق دلانے کے لیے اس قدر حوصلہ بڑھاتی ہیں کہ انسان جھوم اٹھتا ہے اور کبھی مفسد اور مجرم لوگوں کو تنبیہ کرنے اور ڈرانے میں اس حد تک لرزا دیتی ہیں کہ انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان دونوں تربیتی اصولوں کو انہی آیات میں ایک دوسرے کے دوش بدوش بیان کیا گیا ہے۔

لیکن افسوس کہ ہٹ دھرم متعصب افراد کے پاس سننے والے کان نہیں ہیں۔ گویا وہ بہرے ہیں اور کچھ بھی نہیں سن پاتے۔ ان کے ظاہری کان صحیح سالم ہیں لیکن سننے کی صلاحیت اور حقائق کے ادراک کی توانائی کھو چکے ہیں۔

اور پھر یہ کہ ان دل کے اندھوں کا ردعمل یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دعوت اور تبلیغ سے محروم کر دیں اور یہ ثابت کریں کہ آپ کی دعوت کو سننے والا کان اس دھرتی میں کہیں نہیں ہے لہٰذا آپ کی اس قسم کی کوششیں بے فائدہ ہیں، جیسا کہ بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: انہوں نے کہا تیری دعوت کے بارے میں ہمارے دل پردوں میں لپٹے ہوئے ہیں، ہمارے کان بہرے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان پردہ حائل ہے (وقالوا قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا الیہ وفی اٰذاننا وقر ومن بیننا وبینک حجاب)۔

جب صورت حال یہ ہے تو تجھے ہم سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے، تو اپنا کام کر ہم اپنے عقائد اور مذہب کے مطابق عمل کریں گے (فاعمل اننا عاملون)۔

بالکل ویسے ہی جیسے نادان اور بیوقوف مریض، مسیحا نفس طبیب سے دور بھاگتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اور جیسے بھی ہو خود کو اس سے دور رکھے۔

پہلے وہ کہتے تھے کہ گویا ہماری عقول و افکار پردوں میں لپٹی ہوئی ہیں جن میں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔

خیال رہے کہ "اکنۃ" "کنان" کی جمع ہے جس کا معنی ہے پردہ، نہ صرف ایک درحقیقت جہل و تعصب، ہٹ دھرمی و عناد، اندھی تقلید اور اس نوع کے دوسرے بہت سے پردوں نے ان کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

وہ کہا کرتے تھے کہ نہ صرف یہ کہ ہماری عقل کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتی، ہمارے کان بھی بہرے ہیں لہٰذا ہم تیری باتوں کو نہیں سن سکتے۔ یعنی اصل مرکز بھی بیکار ہو چکا ہے اور اس کے وسائل اور ذرائع بھی کام نہیں کر پاتے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ بھی سمجھ رکھ کہ گویا ہمارے اور تیرے درمیان بڑے ضخیم پردے حائل ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے

کان ٹھیک بھی ہوں پھر بھی تیری آواز ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی لہٰذا تو اپنے آپ کو اس قدر کیوں پریشان کرتا ہے فریاد کرتا ہے، ہمدردی کا اظہار کرتا ہے، دن رات تبلیغ میں مصروف رہتا ہے! چھوڑ ہمیں اپنے حال پر کیونکہ یہاں تیری جنس کا کوئی خریدار نہیں ہے۔ تو اپنے دین پر، ہم اپنے دین پر۔

یہ بے شرمی، بے حیائی، ڈھٹائی اور بے وقوفی کی انتہا ہوگی کہ انسان اپنے تمام وجود کے ساتھ حق سے اس قدر گریزپا ہو۔

در روشنی اگر ید بیضا کند کسی　　　در چشم این سیاہ دلان صبح کاذب است

"اگر کوئی شخص ید بیضاء سے بھی روشنی کر دے، پھر بھی ان دل کے اندھوں کے سامنے یہ صبح کاذب ہی ہوگی"

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہ "و بیننا و بینک حجاب" (ہمارے اور تیرے درمیان حجاب ہے) نہیں کہا کرتے تھے بلکہ لفظ "من" کا بھی اضافہ کرتے تھے: "ومن بیننا و بینک حجاب" تاکہ زیادہ سے زیادہ تاکید کا اظہار کرسکیں کیونکہ لفظ "من" کے اضافے سے مفہوم یوں ہو جائے گا "ہمارے اور تمہارے درمیان کے فاصلہ کو پردے نے بھر دیا ہوا ہے" اور ظاہر سی بات ہے کہ جس پردے نے اس درمیانی فاصلے کو بھر دیا ہوا سے بہت ضخیم ہونا چاہیئے اور فطری سی بات ہے کہ اس قدر ضخیم حجاب کی اوٹ میں بات کرنے کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوگا۔

ممکن ہے "فاعمل اننا عاملون" کا جملہ رسول اکرمؐ کو مایوس کرنے کے لیے کفار کی طرف سے کہا گیا ہو کہ تم اپنے کام کو جاری رکھو اور ہم اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔

یہ بھی امکان ہے کہ کفار کی طرف سے آنحضرتؐ کو یہ دھمکی دی گئی ہو کہ تم جو کچھ کرسکتے ہو کرو، ہم بھی تمہاری ذات اور تمہارے دین کے خلاف اپنی تمام توانائیاں صرف کریں گے اور ان کا یہ نظریہ ان کی ہٹ دھرمی، ضد اور تعصب کی انتہا کو بیان کرتا ہے۔

۶۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝

۷۔ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

۸۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

ترجمہ

۶۔ کہہ دے! میں تو تمہاری طرح کا انسان ہی ہوں جبکہ اس حقیقت کی مجھ پر وحی ہوتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک خدا ہے، پس تم اپنی تمام تر توجہ اسی کی طرف کرلو اور اسی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور مشرکین کے لیے عذاب ہے۔

۷۔ وہی جو زکوٰۃ بھی ادا نہیں کرتے اور آخرت کے انکاری ہیں۔

۸۔ لیکن جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے اعمال صالح انجام دیئے ان کے لیے دائمی جزا ہے۔

تفسیر

مشرکین، کون ہیں؟

حسب سابق یہ آیات بھی مشرکین اور کفار کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں اور درحقیقت ان کے اس کلام کا جواب ہیں جو اس سے پہلی آیات میں ذکر ہوا ہے ان میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے سلسلے میں پیدا ہونے والے ہر طرح کے شک و شبہ کو دور کیا جا رہا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: کہہ دے میں تو صرف تمہاری طرح کا انسان ہوں، اور یہ حقیقت مجھ پر ہمیشہ وحی ہوتی رہتی ہے کہ تمہارا معبود صرف اور صرف ایک اللہ ہے (قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ انما الٰھکم الٰہ واحد)۔

میرا یہ دعویٰ نہیں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ ہی انسان کے علاوہ کسی اور نسل سے ہونے کا مدعی ہوں، نہ خدا ہوں نہ خدا کا بیٹا، بلکہ تمھاری طرح کا ایک انسان ہوں فرق صرف یہ ہے کہ فرمان توحید ہمیشہ مجھ پر وحی کی صورت میں آتا رہتا ہے۔ میں نے تمھیں اپنے دین کے قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا، یہ جو تم کہتے ہو کہ تم میرا ڈٹ کر مقابلہ کرو گے، یا تم میری زبردست مخالفت کرو گے تمھاری یہ دھمکیاں آخر کس لیے؟ یہ تو ایک روشن اور واضح راستہ ہے جو میں تمھیں دکھا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ میرا اور فرض بھی نہیں بنتا، آخری فیصلہ تو خود تمھارے اپنے ہاتھوں میں ہے۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں: اب جبکہ صورت حال یہ ہے تو تم اپنی تمام تر توجہات اسی معبود یکتا کی طرف مرکوز کر دو اور شرک و گناہ سے توبہ و استغفار کرو (فاستقیموا الیہ واستغفروہ)۔[1]

پھر انہیں خطرے سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا: اور مشرکین کے لیے خرابی ہے (وویل للمشرکین)۔

بعد کی آیت مشرکین کا تعارف کرواتے ہوئے اس سلسلے میں ایک جملہ پیش کرتی ہے جو صرف اسی آیت میں منحصر ہے ارشاد ہوتا ہے: وہی جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور آخرت کے منکر ہیں (الذین لا یؤتون الزکٰوۃ وھم بالاٰخرۃ ھم کافرون)۔

درحقیقت ان کفار و مشرکین کا تعارف دو چیزوں کے ساتھ کرایا جا رہا ہے ایک ترک زکوٰۃ اور دوسری انکار معاد۔

یہ آیت مفسرین کے درمیان ایک تفصیلی بحث کا سبب بن گئی ہے جس کی وجہ سے انھوں نے اس کی تفسیر میں کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ بحث کا اصل سبب یہ ہے کہ جب زکوٰۃ کا شمار دین اسلام کے فروع میں ہوتا ہے تو ترکِ زکوٰۃ کفر اور شرک کی دلیل کیونکر ہو سکتا ہے؟

لہٰذا بعض مفسرین نے آیت کے ظاہری معنی پر کاربند رہتے ہوئے کہا ہے کہ ترک زکوٰۃ اگرچہ اس کے وجوب کے انکار پر بھی مبنی نہ ہو پھر بھی کفر کی علامت ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ترکِ زکوٰۃ کفر ہے لیکن جب اس کا انکار کیا جائے کیونکہ زکوٰۃ کا شمار ضروریات دین میں سے ہوتا ہے اور اس کا منکر کافر ہوتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہاں پر زکوٰۃ طہارت اور پاکیزگی کے معنی میں ہے اور یہاں پر ترک زکوٰۃ سے مراد لوح دل سے شرک کی آلودگیوں کو ترک کرنا ہے جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت ۸۱ میں بھی آیا ہے:

خیرًا منہ زکٰوۃ

"ایسا بیٹا جو اس سے زیادہ پاکیزہ ہو"۔

لیکن یہ بات اس لیے مشکل بن جاتی ہے کہ یہاں پر "لا یؤتون" (ادا نہیں کرتے، نہیں دیتے) کا کلمہ آیا ہے جو اس

---

[1] "فاستقیموا" "استقامت" کے مادہ سے ہے اور یہاں پر کسی چیز کے سامنے سیدھا کھڑا ہونے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے لفظ "الیٰ" کے ساتھ متعدی ہوا ہے کیونکہ اس میں "استواء" کا معنی پایا جاتا ہے۔

معنی سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔

بنابریں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ یہاں پر زکوٰۃ کی ادائیگی مراد لی جائے۔

ایک اور مشکل یہ بھی درپیش ہے کہ زکوٰۃ کو ہجرت کے دوسرے سال مدینے میں شرعی حیثیت حاصل ہوئی اور یہ آیات مکی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض بزرگ مفسرین کے بقول یہ سورہ مکہ میں نازل ہونے والی سب سے پہلی سورت ہے۔ لہٰذا وہ اس مقام پر زکوٰۃ کا معنی "راہِ خدا میں ہر قسم کا انفاق" لینے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ یا پھر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ وجوب زکوٰۃ کا اصل حکم تو مکہ میں نازل ہو چکا تھا، لیکن اس کی حدود حدود، نصاب اور مقدار کی تفصیل ہجرت کے دوسرے سال نازل ہوئی۔

بہر حال جو چیز یہاں پر مفہوم آیت کے زیادہ نزدیک معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ زکوٰۃ سے مراد وہی عام انفاق ہے اور اسے ترک کرنا شرک کی علامتوں میں سے اس لیے شمار کیا گیا ہے کہ راہ خدا میں مال کا خرچ کرنا، ایثار، فداکاری اور خدا کی ذات سے عشق و محبت کی ایک نشانی ہے اس لیے کہ انسان کے نزدیک مال، دنیا کی محبوب ترین چیزوں میں سے ایک ہے اور راہ خدا میں خرچ کرنا اور نہ کرنا بہت سے مقامات پر ایمان اور شرک کی واضح علامت بن سکتا ہے۔ حتیٰ کہ کبھی بعض لوگ تو اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے ہیں، اس کی مثالیں ہم نے اپنی زندگی میں کئی مقامات پر دیکھی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں لا یؤتون الزکوٰۃ سے مراد راہِ خدا میں خرچ نہ کرنا ہے جو ان کے خدا پر ایمان نہ لانے کی علامت ہے اسی لیے اس کا ذکر معاد پر ایمان نہ لانے کے ساتھ ساتھ کیا گیا ہے، یا پھر اس سے مراد زکوٰۃ کی عدم ادائیگی اس کے وجوب کے انکار کے ساتھ ہے۔

ایک اور نکتہ جو تفسیر کی وضاحت کے لیے معاون ثابت ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی احکام میں "زکوٰۃ" کا اپنا ایک خاص مقام ہے جس کی ادائیگی اسلامی حکومت کو تسلیم کرنے کی علامت ہوتی ہے اور عدم ادائیگی عموماً اسلامی حکومت کے خلاف قیام، طغیان اور سرکشی شمار ہوتی ہے اور معلوم ہے کہ صحیح اسلامی حکومت کے خلاف قیام کفر کا موجب ہوتا ہے۔

اس بات کی شہادت اس واقعہ سے ملتی ہے جو تاریخ اسلام میں "اصحاب ردہ" (وہ گروہ جو بعد وفات پیغمبر مرتد ہو گئے) کے بارے میں آیا ہے۔ یہ لوگ بنی طی بنی غطفان اور بنی اسد کے قبائل سے تھے جنہوں نے حکومتِ اسلامی کے کارندوں کو زکوٰۃ دینے سے انکار کیا۔ اور حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ قرآن پر ثابت قدم مسلمانوں نے ان کے ساتھ جنگ کی اور ان کو کچل دیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت ابھی اسلامی حکومت تشکیل نہیں پائی تھی لیکن پھر بھی مندرجہ بالا مطلب کی طرف ایک مجمل سا اشارہ ہو سکتا ہے۔

کتب تواریخ میں مذکور ہے کہ وفات پیغمبرؐ کے بعد اہل ردہ نے کہا : اما الصلاۃ فصلی، واما الزکاۃ فلا یغصب اموالنا:
"ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن زکوٰۃ کے بارے میں ہم اجازت نہیں دیں گے کہ ہمارے مال کو غصب کیا جائے۔"

نتیجہ کے طور پر مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ اس جماعت کے ساتھ جنگ کریں کیونکہ وہ اس امر کو ان کے ارتداد پر محمول کرتے ہیں۔[1]

---

[1] تفسیر ابوالفتوح، جلد ۱۰ صفحہ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں ایسے لوگوں کا تعارف کروایا جا رہا ہے جو ان بخیل اور بے ایمان مشرکین کے برعکس صفات کے مالک ہیں اور ان کی جزا کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ "جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اعمال صالحہ انجام دیئے ان کے لیے دائمی اور منقطع نہ ہونے والا اجر ہے (ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات لهم اجر غیر ممنون)۔

"ممنون" "من" کے مادہ سے ہے جس کا معنی یہاں پر قطع (کاٹنا) اور نقص (کم ہونا) ہے۔ لہٰذا "غیر ممنون" کا معنی "غیر مقطوع" اور غیر ناقص ہے۔ اور بعض مفسرین نے "منون" (بروزن "زبون") کے لفظ کو بھی اسی مادہ سے سمجھا ہے جس کا معنی موت ہے، اسی طرح "منت جتانے" کو بھی اسی مادہ سے لیا ہے کیونکہ پہلا معنی زندگی کے قطع ہو جانے اور انتہا کا ہے اور دوسرا معنی ہے نعمت اور شکر کو قطع کر دینا[1]

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں پر "غیر ممنون" سے مراد یہ ہے کہ مومنین پر اس اجر کی کوئی منت نہیں جتائی جائے گی۔ (لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے)۔

اسلام میں زکوٰۃ کی غیر معمولی اہمیت

مندرجہ بالا آیت میں اس اسلامی فریضے کی اہمیت کو ایک بار پھر لرزا دینے والی تعبیر کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے، زکوٰۃ چاہے واجب کے معنی میں لی جائے اور چاہے اس سے بھی وسیع تر معنی میں، اس کی اس قدر اہمیت ہونی ہی چاہیے۔ کیونکہ زکوٰۃ عدالت اجتماعی برقرار کرنے، غربت کا مقابلہ کرنے، طبقاتی فاصلوں کو پاٹنے، اسلامی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے دل وجان کو دنیا اور مال پرستی کی محبت سے پاک کرنے غرض بارگاہِ الٰہی کا تقرب حاصل کرنے کا ایک اہم اور مؤثر ذریعہ ہے۔

بہت سی اسلامی روایات میں ایسے مطالب بیان کئے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے ترک کر دینے سے انسان کفر کی سرحد تک جا پہنچتا ہے اور جس طرح مندرجہ بالا آیت میں بیان کیا گیا ہے اس سے ملتی جلتی تعبیرات ان اسلامی روایات میں ملتی ہیں بطور نمونہ:

۱۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو جو وصیتیں فرمائی ہیں۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ:

> یا علی کفر باللّٰہ العظیم من ھٰذہ الامۃ عشرۃ، وعد منھم مانع الزکوٰۃ....
> ......ثم قال یا علی! من منع قیراطًا من زکوٰۃ مالہ فلیس بمؤمن ولا مسلم ولا کرامۃ، یا علی! تارك الزکوٰۃ یسئل اللّٰہ الرجعۃ الی الدنیا، و ذالک قولہ عزوجل حتّٰی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون.....

[1] دیکھئے "مفردات راغب" مادہ "من"۔

یا علی! (میری) اس امت کے دس قسم کے لوگ خدائے بزرگ و برتر کا کفر کر چکے ہیں اور ان دس قسم کے لوگوں میں سے مانع زکوٰۃ کو بھی شمار فرمایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر فرمایا اے علی! جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ سے ایک قیراط بھی ادا نہ کرے نہ تو وہ مومن ہے، نہ مسلمان اور نہ ہی خدا کے نزدیک اس کی کوئی قدر و قیمت ہے۔

یا علی! مانع زکوٰۃ مرتے وقت اس دنیا کی طرف لوٹ آنے کا خدا سے سوال کرتا ہے (تاکہ اپنے اس عظیم گناہ کی تلافی کر سکے، لیکن یہ سوال مانا نہیں جاتا) اور یہی وہ چیز ہے جس کی طرف خداوند عزوجل نے قرآن مجید میں اشارہ فرمایا ہے کہ جب ان میں سے کسی ایک کے پاس موت پہنچ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ خداوندا! مجھے واپس پلٹا، (لیکن جواب منفی پاتا ہے) [1]

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

ان اللہ عزوجل فرض للفقراء فی اموال الاغنیاء فریضۃ لا یحمدون الا باداثہا وھی الزکوٰۃ، بہا حقنوا دمائھم و بہا سموا مسلمین

اللہ نے امراء کے مالوں میں غرباء کے لیے فریضہ مقرر کر دیا ہے کہ جسے ادا کئے بغیر وہ لائق تعریف نہیں ہو سکتے اور وہ ہے زکوٰۃ کہ جس کے ذریعے وہ اپنے خون کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور مسلمان بھی کہلاتے ہیں [2]

۳۔ آخر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک اور فرمان:

من منع قیراطًا من الزکوٰۃ فلیمت ان شاء یہودیًا او نصرانیًا

جو شخص زکوٰۃ کا ایک قیراط ادا نہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ یہودی یا نصرانی ہو کر مرے [3]

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت، اس کا فلسفہ، اسی طرح اسلام میں وجوب زکوٰۃ کی تاریخ اور اس سے متعلق دوسری خصوصیات کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد (سورہ توبہ کی ساٹھویں آیت کے ذیل) میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

---

[1] و [2] و [3] وسائل الشیعہ جلد ۶ ص ۱۸ تا ۱۹ (باب ثبوت الکفر والارتداد والقتل بمنع الزکوٰۃ استحلالا وجحودًا) صاحب وسائل الشیعہ کی طرح بہت سے فقہاء اور محدثین نے مندرجہ بالا روایات کو انکار زکوٰۃ کے معنی میں لیا ہے۔

۹۔ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ○

۱۰۔ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ○

۱۱۔ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىِٕعِیْنَ○

۱۲۔ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖۗ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ○

ترجمہ

۹۔ کہہ دے کہ کیا تم اس ذات کا کفر کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں خلق فرمایا اور اس کے لیے نظیر اور مثل بناتے ہو؟ وہ تو سب جہانوں کا پروردگار ہے۔

۱۰۔ اس نے زمین میں پہاڑ بنائے اور اس میں برکت عطا کی اور اس میں مختلف غذائی مواد رکھا یہ سب کچھ چار دنوں میں تھا، ضرورت مندوں کی ضرورت کے عین مطابق۔

۱۱۔ پھر آسمان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا، جب کہ وہ دھوئیں کی صورت میں تھا، پس اسے اور زمین کو حکم دیا کہ وجود میں آؤ اور صورت اختیار کرو، خواہ خوشی سے خواہ مجبور ہو کر، تو انھوں نے کہا ہم اطاعت کرتے

ہوئے آتے ہیں۔

۱۲۔ اس وقت انہیں سات آسمانوں کی صورت میں دو دنوں میں پیدا کیا اور وہ جو کچھ چاہتا تھا ہر آسمان میں بنایا اور ہم نے نچلے آسمان کو (ستاروں کے) چراغوں سے مزین کیا اور (شہابوں کے ذریعے شیطانوں کو باتیں چرانے سے روک کر انہیں) محفوظ فرمایا۔ یہ ہے زبردست صاحب علم خدا کی تقدیر۔

تفسیر

آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے دورانئے

مندرجہ بالا آیات میں زمین و آسمان کی تخلیق اور موجودات عالم کی آغاز خلقت کے بارے میں خداوند عالم کی عظمت، علم اور قدرت کی آفاقی آیات اور نشانیوں کا ذکر ہے خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ کو حکم دے رہا ہے کہ کفار و مشرکین کو مخاطب کر کے ان سے سوال کریں کہ آیا وہ اس خداوند بزرگ و برتر کا کیونکر انکار کر سکتے ہیں جو اتنے وسیع و عریض جہانوں کا مبدأ ہستی ہے؟ تاکہ اس طرح سے ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر اور عقل اور ہوش و حواس کو بیدار کر کے انہیں خود ہی فیصلہ کرنے کی دعوت دی جائے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: کہہ دے آیا تم اس ذات کا کفر کرتے ہو جس نے زمین کو دو روز میں پیدا کیا (قل ءانکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین)۔

"اور کیا اس کے لیے نظیر اور مثل قرار دیتے ہو (و تجعلون لہ انداداً)

کتنی بڑی غلطی ہے اور کس قدر بے بنیاد گفتگو؟

وہ تو تمام جہانوں کا پروردگار ہے (ذالک رب العالمین)۔

آیا جو ذات اب ان جہانوں کو چلا رہی ہے، وہ اس زمین و آسمان کی خالق نہیں ہو سکتی؟ اگر وہ خالق کائنات اور مدبر عالم ہے تو پھر ان بتوں اور بناوٹی معبودوں کو اس کا ہم پلہ کیوں قرار دیتے ہو؟ عبادت کے لائق تو وہی ذات ہو سکتی ہے جس کے ہاتھ میں اس کائنات کی تخلیق، تدبیر، مالکیت اور حکومت ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں پہاڑوں کی تخلیق، زمین کے معدنیات اور اس کی برکتوں اور غذائی مواد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس نے زمین میں پہاڑ بنائے، اس میں برکتیں اور فائدے رکھے ہیں اور اس کے اندر مختلف غذائی مواد بھی رکھا ہے اور یہ سب کچھ چار دنوں میں (وجعل فیھا رواسی من فوقھا وبارک فیھا وقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام)۔

یہ غذائی مواد ضرورت مندوں اور مانگنے والوں کی ضرورت کے عین مطابق ہے (سواء للسائلین)۔[1]

تو اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے تمام ضرورت مندوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر بغیر کم و کاست ان سب کے لیے وہی کچھ پیدا کر دیا جو ان کے لیے لازم تھا، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی پچاسویں آیت میں فرمایا گیا ہے:

ربنا الذی اعطی کل شیء خلقه ثم هدٰی

ہمارا پروردگار تو وہ ہے کہ جس نے ہر مخلوق کو اس کی تخلیقی ضرورت کے عین مطابق سب کچھ عطا کر دیا پھر اسے اپنے رستے کی ہدایت کی۔

"سائلین" سے مراد یہاں پر ممکن ہے کہ انسان ہوں یا بطور عام انسان، حیوان اور نباتات ہوں، (اور اگر ذوی العقول کی جمع کی صورت میں مذکور ہوا ہے تو یہ "تغلیب" کے لیے ہے)۔

اس تفسیر کے مطابق نہ صرف انسانی ضروریات کو پورا کر دیا گیا ہے بلکہ زمین میں موجود تمام حیوانات اور نباتات کی ضروریات کو بھی پورا کیا گیا ہے اور زندگی کی بقا و دوام کے لیے جو چیز ضروری تھی اسے پیدا کیا گیا ہے۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

مذکورہ بالا آیات میں بتایا گیا ہے کہ زمین کی آفرینش دو دن میں اور پہاڑوں کی برکتوں اور غذاؤں کی آفرینش چار دن میں ہوئی ہے اور انہی آیات کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ آسمانوں کی تخلیق دو دن میں ہوئی ہے جو مجموعی طور پر آٹھ دن بنتے ہیں جبکہ قرآن مجید کی دوسری بہت سی آیات میں زمین و آسمان کی پیدائش کو چھ دن یا بالفاظ دیگر چھ دورانیوں میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے۔[2] آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

مفسرین نے اس سوال کے دو طرح کے جواب دیئے ہیں:

پہلا جواب جو کہ مشہور ہے یہ ہے کہ، جہاں پر "اربعة ایام" (چار دن) کہا گیا ہے وہاں پر مراد چار دنوں کا تتمہ ہے اور وہ اس طرح کہ ان چار دنوں میں سے پہلے دو دنوں میں زمین کو پیدا کیا گیا اور دوسرے دو دنوں میں زمین کی دوسری خصوصیات کو اور اس کے ساتھ ہی دو دنوں میں آسمانوں کو کہ سب مل کر چھ دن (چھ دورانیے) بنتے ہیں۔

---

[1] "سواء" اور اسی طرح "للسائلین" کا اعراب کیا بنتا ہے اور یہ کس کلمہ سے متعلق ہیں؟ اس بارے میں متعدد احتمال ہیں۔ پہلا یہ کہ "سواء" لفظ "اقوات" کا حال ہے اور "للسائلین" "سواء" کے متعلق ہے۔ اس صورت میں اس کا نتیجہ مندرجہ بالا تفسیر کی صورت میں نکلے گا۔ دوسرا یہ کہ "سواء" "ایام" کی صفت واقع ہو رہا ہے یعنی یہ چار دورانیے ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ لیکن "للسائلین" یا تو "قدر" سے متعلق ہوگا یا پھر کسی محذوف کلمہ سے، جو تقدیراً یوں ہے "کائنة للسائلین" یعنی یہ چار دن سوال کرنے والوں کے لیے جواب ہیں۔ (لیکن پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے)۔

[2] ملاحظہ ہوں سورۂ اعراف کی آیت ۵۴، سورۂ یونس کی آیت ۳، سورۂ ہود کی آیت ۷، سورۂ فرقان کی آیت ۵۹، سورۂ سجدہ کی آیت ۴، سورۂ ق کی آیت ۳۸ اور سورۂ حدید کی آیت ۴۔

اس قسم کی تعبیرات عربی اور فارسی زبانوں میں بہت موجود ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ یہاں سے مکہ تک دس دن کا سفر ہے اور مدینہ تک ۱۵ دن کا یعنی مکہ سے مدینہ کا سفر پانچ دن کا ہے اور یہاں سے مکہ کا دس دن کا۔[1]

البتہ اگر متعدد آیات میں آفرینش کا چھ دن کا ذکر نہ ہوتا تو ایسی کوئی تفسیر بھی قابل قبول نہ ہوتی لیکن قرآن کی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں اور ایک دوسرے کا قرینہ بنتی ہیں لہٰذا مندرجہ بالا تفسیر بخوبی قابل قبول ہے۔

دوسرا جواب جسے بہت کم مفسرین نے انتخاب کیا ہے وہ یہ ہے کہ: "اربعۃ ایام" (چار دن) کا تعلق خلقت کے آغاز سے نہیں ہے بلکہ سال کے چار موسموں (بہار، خزاں، سرما اور گرما) کی طرف اشارہ ہے جو انسانوں اور حیوانوں کے رزق کی پیدائش اور غذائی مواد کی پرورش کی طرف اشارہ ہے۔[2]

لیکن اس تفسیر سے ایک تو ان آیات کے جملوں کے درمیان ہم آہنگی برقرار نہیں رہتی، کیونکہ زمین و آسمان کی تخلیق کے بارے میں "یوم" آغاز پیدائش کے دورانیہ کے معنی میں ہے۔ اور اس تفسیر کے مطابق یوم کا استعمال زمین اور غذائی مواد کی خصوصیات کے بارے میں سال کے چاروں موسم ہیں، تو پھر بات مکرر (دوبارہ) ہو جائے گی۔

دوسرے یہ کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آفرینش کے چھ دنوں میں سے صرف دو دن زمین کی تخلیق کے اور دو دن آسمانوں کی تخلیق کے ہوتے ہیں گفتگو ہوئی ہے لیکن باقی دو دنوں کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں ہوئی جو آسمان اور زمین کے درمیان مخلوقات "و ما بینھما" کی پیدائش سے متعلق ہیں۔

بہرحال پہلی تفسیر کئی لحاظ سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

یہ بات بتانے کی شاید ضرورت نہ ہو کہ آیات مذکورہ میں "ایام" سے مراد یہ عام دن ہرگز نہیں ہیں کیونکہ زمین و آسمان کی پیدائش سے پہلے اس معنی میں دن کا تو بالکل وجود ہی نہیں تھا، بلکہ اس سے مراد آفرینش کے مختلف دورانیے ہیں جن پر لاکھوں بلکہ کروڑوں سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔

اس بات کی مکمل وضاحت ہم تفسیر نمونہ کی جلد ۴ (سورۂ اعراف کی ۵۴ ویں آیت کے ذیل) میں کر چکے ہیں۔

اس مقام پر دو اور نکتے باقی رہ جاتے ہیں جن کی طرف توجہ ضروری ہے۔

پہلا یہ کہ "بارک فیھا" سے کیا مراد ہے؟ بظاہر اس سے زمین کے اندرونی معادن اور وسائل اور بیرونی چیزوں، درختوں، نہروں اور پانی کے چشموں وغیرہ کی طرف اشارہ ہے۔ جو زمین کی تمام زندہ مخلوق کے لیے برکت اور استفادے کا ذریعہ ہیں۔

---

[1] آیت کی اس تفسیر کے مطابق اس کی تقدیر یوں ہوگی:

وقدر فیھا اقواتھا فی تتمۃ اربعۃ ایام

یا جس طرح کہ تفسیر کشاف میں آیا ہے:

کل ذالك فی اربعۃ ایام

[2] اس مضمون کی ایک حدیث تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی درج ہے۔

دوسرا یہ کہ "فی اربعۃ ایام" (چار دن میں) کی تعبیر آیت میں مذکور کس موضوع کی آفرینش اور تخلیق سے متعلق ہے؟ بعض مفسرین کے نزدیک یہ صرف "اقوات" (غذائی مواد) سے متعلق ہے جبکہ ایسا نہیں ہے. بلکہ آیت کی تینوں اقسام (پہاڑوں، زمین کے وسائل اور برکات اور غذائی مواد کی تخلیق) سے متعلق ہے. کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو آیات مذکورہ میں مذکور "ایام" میں ان میں سے بعض امور داخل نہیں ہوں گے اور آیات کے نظام سے بھی مطابقت نہیں ہوگی۔

زمین کی پیدائش اور اس کے ارتقائی مراحل سے متعلق گفتگو کے بعد آسمانوں کی تخلیق سے متعلق گفتگو کی گئی ہے. ارشاد فرمایا گیا ہے: پھر آسمان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا جبکہ وہ دھواں تھا، اس وقت زمین اور آسمان سے فرمایا وجود میں آؤ اور صورت اختیار کرو، خواہ از روئے اطاعت یا پھر مجبوراً (ثم استوٰی الی السماء وھی دخان فقال لھا وللارض ائتیا طوعًا او کرھًا)۔

انہوں نے کہا ہم از روئے اطاعت وجود میں آئیں گے (قالتا اتینا طائعین)۔

اس وقت خدا نے انہیں سات آسمانوں کی صورت میں دو دنوں میں پیدا کیا اور مکمل کر دیا (فقضاھن سبع سماوات فی یومین)۔

"اور ہر آسمان میں جو کچھ چاہا فرمان دیا" اور ان میں مختلف مخلوقات اور موجودات کو پیدا کیا اور انہیں نظم و ضبط عطا کیا (واوحٰی فی کل سماء امرھا)۔

"اور نچلے آسمان کو ستاروں کے چراغوں سے زینت بخشی اور شہابوں کے ذریعے ان کی حفاظت کی تاکہ شیطان باتیں نہ چرا سکیں (وزیّنّا السماء الدنیا بمصابیح وحفظًا)۔

جی ہاں! "یہ ہے خداوند قادر و علیم کی تقدیر" (ذالک تقدیر العزیز العلیم)۔

چند اہم نکات

۱۔ "ثم" کی تعبیر: یہ عام طور پر زمانے میں تاخیر کے لیے آتی ہے لیکن کبھی بیان میں تاخیر کے لیے بھی آجاتی ہے۔

اگر پہلے معنی میں ہو تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ آسمانوں کی تخلیق، زمین، پہاڑ، معادن اور غذائی مواد کی تخلیق کے بعد عمل میں آئی۔

لیکن اگر دوسرے معنی میں ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا آسمانوں کی تخلیق پہلے عمل میں آئی ہو اور زمین کی اس کے بعد. لیکن بوقت بیان پہلے زمین غذائی مواد اور ان کے منابع کا ذکر کیا کہ جو انسانوں کی ضرورت اور توجہ کا مرکز ہے پھر تخلیقِ آسمان کی تفصیل بیان کی۔

دوسرا معنی جہاں سائنسی انکشافات سے زیادہ ہم آہنگ ہے وہاں قرآن مجید کی دوسری آیات سے بھی زیادہ موافقت رکھتا ہے، کیونکہ سورۂ نازعات میں یوں فرمایا گیا ہے:

ءانتم اشد خلقًا ام السماء بناھا۔ رفع سمکھا فسوّاھا۔ واغطش لیلھا واخرج ضحاھا۔ والارض بعد ذالک دحاھا۔ اخرج منھا ماءھا ومرعاھا والجبال ارساھا۔ متاعًا لکم ولانعامکم

آیا تمھارا مرنے کے بعد زندہ کرنا زیادہ اہم ہے یا آسمان کی تخلیق ؟ خدا نے اسے بنایا پھیلایا اور منظم کیا۔ اس کی رات کو تاریک اور دن کو روشن کیا۔ اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ اس کے اندرونی پانیوں، نباتات اور چراگاہوں کو اس سے نکالا۔ بعد ازاں پہاڑوں کو محکم بنایا تاکہ تمھارے اپنے لیے اور تمھارے چوپاؤں کے لیے زندگی کے وسائل فراہم ہوں۔ (نازعات / ۲۷ تا ۳۳)۔

ان آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ زمین کا بچھانا، چشموں کا ابلنا، درختوں اور دوسرے غذائی مواد کی پیدائش غرض سب کچھ آسمانوں کی تخلیق کے بعد وجود میں آیا۔ جب کہ اگر "ثم" سے تاخیر زمانی مراد لیں تو پھر کہنا پڑے گا کہ یہ سب آسمان کی تخلیق سے پہلے موجود تھے اور چونکہ " بعد ذالك " کا کلمہ ان سب کو اس کے بعد شمار کرتا ہے۔ لہٰذا "ثم" سے تاخیر بیانی مراد لینا زیادہ واضح اور روشن ہے[1]

۲۔ "استوٰی" کا مفہوم : یہ استواء کے مادہ سے ہے جو دراصل اعتدال یا دو چیزوں کے ایک دوسرے کے برابر ہونے کے معنی میں آتا ہے، لیکن جیسا کہ بعض ارباب لغت اور مفسرین کہتے ہیں کہ یہ مادہ جب "علیٰ" کے ساتھ متعدی ہو تو کسی چیز پر غلبہ پانے اور مسلط ہونے" کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے :

الرحمٰن علی العرش استوٰی

خدائے رحمٰن عرش پر مسلط ہوگیا۔ (طٰہٰ - ۵)

اور جب "الیٰ" کے ساتھ متعدی ہو تو "قصد وارادہ" کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے زیر تفسیر آیت میں ہے :

ثم استوٰی الی السماء

پھر آسمان کی تخلیق کا ارادہ کیا۔ (حٰم سجدہ - ۱۱)

۳۔ **ھی دخان سے مراد** : اس کا معنی ہے کہ آسمان، اوائل میں دھوئیں کی صورت میں تھے یہ بتاتا ہے کہ آسمانوں کی تخلیق کا آغاز گیسوں کے بڑے بڑے مجموعوں سے ہوا اور یہ آغاز آفرینش کے بارے میں سائنس کی تازہ ترین تحقیقات سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے۔

اب بھی بہت سے آسمانی ستارے گیس اور دھوئیں کے بڑے بڑے مجموعوں کی صورت میں موجود ہیں۔

۴۔ " فقال لها وللارض ائتیا طوعًا او کرهًا " خدا نے آسمان اور زمین سے فرمایا وجود میں آؤ اور صورت اختیار کرو خواہ از روئے اطاعت یا از راہ مجبوری۔ اس معنی میں نہیں ہے کہ بات کو لفظوں سے ادا کیا گیا ہو بلکہ خدا کا قول تخلیق کے لیے فرمان تکوینی اور اس کا ارادہ ہی ہے اور "طوعًا او کرهًا" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسمان وزمین کے صورت اختیار کرنے کے بارے میں خدا کا قطعی ارادہ تھا اور انہیں ہر حالت میں ایک مطلوب صورت اختیار کرنا ہی تھی چاہے وہ یہ بات

---

[1] ابن عباس سے منقول ہے کہ زمین کی پیدائش آسمان سے پہلے ہوئی ہے لیکن (دحو الارض) بعد میں ہوا اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ گویا ابن عباس نے آیت کے آخر کی طرف توجہ نہیں فرمائی جس میں پہاڑوں اور غذائی مواد کی بات ہو رہی ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

چاہتے یا نہ چاہتے۔

۵۔ "اتینا طائعین" (ہم نے از روئے اطاعت یہ صورت اختیار کی ہے)۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسمان اور زمین کو تشکیل دینے والا مواد تکوینی اور تخلیقی لحاظ سے مکمل طور پر اس کے ارادے اور فرمان کے تابع تھا اس نے فوراً اپنی لازمی صورتیں اختیار کرلیں اور فرمان الٰہی کی ذرہ بھر بھی نافرمانی نہیں کی۔

بہر حال ظاہر ہے کہ وہ "امر" اور یہ "تعمیل امر" تشریعی حیثیت کا حامل نہیں تھا بلکہ ان کی صرف تکوینی صورت تھی۔

۶۔ "فقضاھن سبع سماوات فی یومین" (انہیں سات آسمانوں کی صورت میں دو دنوں میں پیدا کیا) یہ جملہ آسمانوں کی تخلیق کے سلسلے میں دو دورانیوں کی طرف اشارہ ہے جس کا ہر دورانیہ کروڑوں سال پر مشتمل ہے اور ہر دور اپنے لحاظ سے کئی ادوار میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ دونوں دورانیے تہ در تہ گیسوں سے مائع اور پگھلی ہوئی صورت میں تبدیل ہونے اور پگھلی ہوئی صورت سے ٹھوس صورت میں تبدیل ہونے کے دورانیے ہوں۔

ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ لفظ "یوم" (کہ فارسی میں جس کا ہم معنی لفظ "روز" ہے) دوسری زبانوں میں "دوران" کے معنی میں بہت ہی رائج اور مستعمل ہے۔ حتیٰ کہ ہماری روزمرہ کی گفتگو میں بھی بڑی حد تک استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "زندگی میں انسان ایک دن ناکامی کا شکار ہوتا ہے تو دوسرے دن ساحل کامرانی سے ہمکنار ہوتا ہے" یہ زندگی کے کامیابی اور ناکامی کے مختلف ادوار کی طرف اشارہ ہے۔

اس سلسلے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد (سورہ اعراف کی ۵۴ ویں آیت کے ذیل) میں بیان ہو چکی ہے۔

۷۔ "سبع" (سات) کا عدد ممکن ہے یہاں پر تکثیر کے معنی میں ہو۔ یعنی ہم نے بہت سے آسمان اور بے شمار کرّات پیدا کئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تعداد کا عدد ہو۔ یعنی آسمانوں کی صحیح تعداد صرف سات ہے اور یہ جو کواکب اور ستارے ثوابت اور سیارے ہمیں نظر آتے ہیں آیت کے بعد کے حصے کی گواہی کے مطابق اسی آسمان اول کا جزو ہیں۔ اس طرح سے عالم آفرینش سات عظیم مجموعوں سے تشکیل پایا ہے جن میں سے صرف ایک مجموعہ انسانی نگاہوں کے سامنے ہے اور انسان کے سائنسی، علمی اور تحقیقی وسائل اور ذرائع اسی آسمان اوّل سے آگے نہیں بڑھ سکے، باقی چھ عالم کیسے ہیں؟ اور کن چیزوں سے تشکیل پاتے ہیں؟ خدا کے سوا کسی کو اس بات کا علم نہیں ہے۔

یہی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس کی مزید تفصیل، تفسیر نمونہ کی پہلی جلد سورۂ بقرہ کی آیت ۲۹ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

۸۔ "واوحیٰ فی کل سماء امرھا" (ہر آسمان میں اپنے امر کی وحی کی اور اسے ضروری نظم وضبط عطا کیا) یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسمان کا مسئلہ صرف تخلیق پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ان میں سے ہر ایک میں اللہ نے کچھ موجودات اور مخلوقات کو بھی پیدا کیا ہے اور ان میں خاص قسم کا نظم وضبط مقرر فرمایا ہے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر خدا کی عظمت علم اور قدرت کی مستقل نشانی ہے۔

۹۔ "وزینا السماء الدنیا بمصابیح وحفظا" (اور ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کے چراغوں سے زینت بخشی اور اس میں شہاب پیدا کئے جو آسمان کو شیاطین سے بچائے ہوئے ہیں) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمام ستارے

آسمان اول کی زینت ہیں اور لوگوں کی نظر میں ایسے قمقموں کے مانند ہیں جو اس نیلگوں آسمان کے شامیانے سے لٹکائے گئے ہیں۔ یہ ستارے نہ صرف آسمان کی زینت ہیں جو اپنی خاص چمک دمک سے عاشقان اسرار آفرینش کے قلوب کو اپنی طرف جذب کر رہے ہیں اور زبان حال سے توحید کا نغمہ سنا رہے ہیں بلکہ تاریک راتوں میں صحراؤں میں سفر کرنے والوں کے لیے چراغ راہ بھی ہیں جو اپنی روشنی کے ذریعے ان کی راہنمائی بھی کرتے ہیں اور راستے کی جہت اور سمت کا بھی تعین کرتے ہیں۔

"شہب" جو ستارے ہیں تیز رفتاری کے ساتھ آسمان میں تیرتے پھرتے نظر آتے ہیں در حقیقت ایسے تیر ہوتے ہیں جو شیطانوں کے سینوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں اور اس قدر چوڑے چکلے آسمان کی ان سے حفاظت کرتے ہیں۔ (اس موضوع کی مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۶ سورۂ حجر کی آیت ۱۷ اور اس کی تکمیلی تشریح جلد ۱۰ سورۂ صافات کی آیت ۷ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں)۔

۱۰۔ "ذالك تقدير العزيز العليم" یہ خداوند قادر اور عالم کی تخلیق، صحیح تقدیر اور اندازہ ہے۔ یہ در حقیقت مذکورہ نویں نکتے کی تکمیل ہے اور یہ "عشرہ کاملہ" تشکیل دے رہا ہے اور زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ "آغاز آفرینش سے لے کر صورت اختیار کرنے اور منظم ہونے تک سب سوچے سمجھے منصوبے اور جچے تلے انداز میں پیدا کیا گیا ہے جو اس بے حد و حساب علم اور قدرت کے مالک مبدأ کی جانب سے مرتب کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک چیز کے بارے میں غور و فکر انسان کو اسی مبدأ بزرگ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

۱۳- فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۝

۱۴- اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

۱۵- فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝

۱۶- فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۳- اگر وہ منہ پھیر لیں تو پھر کہہ دے کہ تمھیں ویسی بجلی سے ڈراتا ہوں جیسی عاد و ثمود پر گری۔

۱۴- جس وقت کہ ان کے رسول ان کے آگے، پیچھے (اور ہر طرف) سے ان کے پاس آئے اور انھیں خدائے یگانہ کی پرستش کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: اگر ہمارا خدا چاہتا تو فرشتوں کو نازل کر دیتا، لہٰذا جو کچھ تم لے کر آئے ہو ہم اس کے منکر ہیں۔

۱۵۔ قوم عاد نے زمین میں ناحق تکبر کیا اور کہا: ہم سے بڑھ کر کون طاقتور ہے؟ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں پیدا کرنے والا خدا ان سے زیادہ قوی ہے وہ (اپنے اس گمان کی وجہ سے) ہمیشہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے۔

۱۶۔ آخر کار ہم نے ان پر نحوست کے دنوں میں زبردست ہولناک سرد اور سخت ہواؤں کے جھکڑ بھیجے تاکہ انہیں دنیاوی زندگی میں ہی ذلیل و خوار کرنے والا عذاب چکھائیں۔ اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسواکن ہوگا اور (کہیں سے بھی) ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔

تفسیر

عاد و ثمود کی سی صاعقہ سے ڈرو

گزشتہ آیات میں توحید اور معرفت الٰہی کے بارے میں مؤثر گفتگو ہو چکی ہے۔ اب ان آیات میں ان ہٹ دھرم اور ضدی مزاج مخالفین کو زبردست تنبیہ کی جارہی ہے جو ان تمام واضح اور روشن دلائل اور آیات کو دیکھنے کے باوجود صاف انکار کر دیتے ہیں۔ ان آیات میں انہیں خبردار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر ان تمام واضح اور روشن دلائل کے باوجود وہ روگردانی کریں تو انہیں کہہ دے کہ میں تمہیں ویسی ہی بجلی سے ڈراتا ہوں جیسی بجلی عاد و ثمود پر پڑی تھی (فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود)۔

اس بات سے ڈرو کہ ہولناک آگ لگا دینے والی تباہ کن بجلیاں تم پر آسمان سے ٹوٹ پڑیں اور تمہاری شرمناک زندگی کا خاتمہ کر دیں[1]

ہم اسی سورت کے آغاز میں پڑھ چکے ہیں کہ قرآن مجید اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے بارے میں تحقیقات کے لیے ولید بن مغیرہ (بروایتے عتبہ بن ربیعہ) جیسے مشرکین مکہ کے کچھ سردار آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچے اور کچھ سوال کئے تو آپؐ نے ان کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس سورہ کی کچھ ابتدائی آیات کی تلاوت کی جب زیر نظر آیات پر پہنچے (انہیں قوم عاد و ثمود جیسی صاعقہ سے ڈرایا) تو وہ اس حد تک لرز گئے اور وحشت و اضطراب کا شکار ہو گئے کہ ان میں بولنے کی طاقت

---

[1] "فان اعرضوا" میں "فاء" بقول "فاء تفریع" ہے جو اس زبردست انداز کو گزشتہ توحیدی آیات سے روگردانی کی فرع قرار دے رہی ہے۔

پڑی۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے دوستوں کے پاس آکر اپنی اضطرابی اور ہیجانی کیفیت بیان کی۔

راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ "صاعقہ" اس ہیبت ناک آواز کو کہتے ہیں جو آسمانی فضا میں پیدا ہوتی ہے جس میں آگ، موت یا عذاب بھی ہوتا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ کبھی اس لفظ کا اطلاق "موت" پر اور کبھی "آگ" پر بھی ہوتا ہے)۔

اور آج کے سائنسدانوں کی تحقیقات کے مطابق "صاعقہ" الیکٹرسٹی کے اس عظیم انگارے کو کہتے ہیں جو بادل کے مثبت اور زمین کے منفی پول کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور عام طور پر پہاڑوں کی مخروطی چوٹیوں، درختوں، بلند جگہوں، ہموار صحراؤں، بیابانوں، انسانوں اور حیوانوں پر گرتا ہے۔ اس بجلی کی حرارت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ جس چیز پر بھی گرتی ہے اسے جلا کر بھسم کر دیتی ہے اور اس جگہ پر ایک ہیبت ناک آواز اور زبردست زلزلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ خداوند عالم نے گزشتہ اقوام میں سے کچھ گروہوں کو اس کے ذریعے عذاب دیا اور پھر قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ موجودہ دور میں سائنس کی تمام تر ترقیوں کے باوجود آج تک کوئی ایسا ذریعہ ایجاد نہیں ہو سکا جس سے انسان اس عظیم بلا کو نازل ہونے سے پہلے روک دے۔ آج کا انسان اس کے مقابلے سے عاجز ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ دیگر تمام معذب اقوام کو چھوڑ کر قوم عاد و ثمود کا ذکر کیا گیا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں کو ان کے حالات کا اچھی طرح سے علم تھا اور وہ ان کے آثار قدیمہ کی صورت میں موجود کھنڈرات کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر چکے تھے اور چونکہ یہ صحرا نشین اور خانہ بدوش لوگ تھے لہذا "صاعقہ" کے خطرات سے اچھی طرح باخبر تھے۔

مزید فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب اللہ کے رسول ان کے آگے پیچھے غرض ہر طرف سے ان کے پاس آئے اور انہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی (اذ جاءتھم الرسل من بین ایدیھم ومن خلفھم الا تعبدوا الا اللہ)۔

"من بین ایدیھم ومن خلفھم" کی تعبیر ممکن ہے کہ اسی بات کی طرف اشارہ ہو جس کی طرف ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنی خدا کے رسولوں نے ہدایت اور تبلیغ کے تمام وسائل سے استفادہ کیا اور ہر ممکن کوشش کی کہ ان سیاہ دلوں کو کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوا سکیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ان پیغمبروں کی طرف اشارہ ہو کہ جو مختلف ادوار میں ان قوموں کے پاس آتے اور توحید کی آواز بلند کرتے رہے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ کے ان انبیاء کی عظیم کوششوں کا ان لوگوں نے کیا صلہ دیا اور انہیں کیا جواب دیا؟

خدا فرماتا ہے: "اگر ہمارا پروردگار چاہتا تو فرشتے نازل کر دیتا تاکہ اس کی دعوت ہم تک پہنچائیں" نہ کہ ہمارے جیسے انسان (قالوا لو شاء ربنا لانزل ملائکۃ)۔

اب جبکہ صورت حال یہ ہے "تو ہم یقیناً ان چیزوں کو نہیں مانتے جنہیں لے کر تم نازل ہوئے ہو" اور انہیں بالکل خدا کی طرف سے نہیں سمجھتے (فانا بما ارسلتم بہ کافرون)۔

اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم تو اللہ کے رسول ہو لیکن ہم تمہاری رسالت کو نہیں مانتے بلکہ مراد یہ ہے کہ تم سرے سے رسول ہی نہیں ہو اور رسالت کے بے بنیاد دعویدار ہو اسی لیے ہم تمہاری باتوں کو قطعاً نہیں مانتے (اسی لیے "ما ارسلتم بہ" کا جملہ یا تو ٹھٹھا مذاق کی صورت میں ہے یا پھر یہ مقصود ہے کہ تم اپنے دعویٰ کے مطابق رسول ہو)

یہ وہی بہانہ ہے جسے قرآن مجید کئی مرتبہ دعوت انبیاء کے منکرین کی زبانی نقل کر چکا ہے جنہیں یہ توقع تھی کہ خدا کے پیغمبر کو ہمیشہ فرشتہ ہونا چاہیئے، گویا بشر اس مقام اور مرتبے کی بالکل لیاقت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ سورہ فرقان کی آیت ۷ میں ہے:

وقالوا مال ھٰذا الرسول یأکل الطعام ویمشی فی الاسواق لولا انزل الیہ ملک فیکون معہ نذیرًا

انہوں نے کہا: یہ پیغمبر کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازار میں کیوں چلتا پھرتا ہے؟ کم از کم اس پر فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا؟

لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ انسان کا ہادی اور راہنما انسان ہی کو ہونا چاہیئے۔ تاکہ دوسرے انسانوں کے دکھ درد، ضروریات زندگی، مشکلات اور زندگی کے مختلف مسائل سے آشنا ہو تاکہ وہ انسانوں کے لیے نمونہ عمل اور اسوہ حسنہ قرار پائے چنانچہ سورۂ انعام کی آیت ۹ میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے:

ولو جعلناہ ملکًا لجعلناہ رجلًا

اگر ہم اسے فرشتہ بناتے تب بھی یقیناً اسے انسانی صورت میں ہی روانہ کرتے۔

قرآن مجید اپنی روش کے مطابق قوم عاد وثمود کے بارے میں اجمالی ذکر کے بعد تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: قوم عاد نے بہر صورت زمین میں تکبر کیا (اور ہر تکبر ناحق ہوتا ہے) حتیٰ کہ یہ بھی کہہ دیا کہ ہم سے بڑھ کر کون طاقتور ہو سکتا ہے؟ (فاما عاد فاستکبروا فی الارض بغیر الحق وقالوا من اشد منا قوۃ)۔

معلوم ہے کہ قوم عاد وہ تھی کہ جو جزیرۃ العرب کے جنوب میں حضرموت کے علاقے احقاف میں رہتی تھی جسمانی طاقت، مالی اقتدار اور مادی تمدن کے لحاظ سے ان کی نظیر نہیں تھی۔ وہ خوبصورت محلات محکم اور مضبوط قلعے بنایا کرتے تھے، پہاڑوں کی چوٹیوں اور بلند مقامات پر اپنے مکانات بنایا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے وہ اپنے دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ اور جاہ وجلال کا مظاہرہ کر سکیں۔ وہ نہایت سخت دل اور جنگجو لوگ تو تھے ہی مگر اس ظاہری شان وشوکت نے انہیں اور بھی مغرور کر دیا تھا لہٰذا وہ اپنے آپ کو ایک ناقابل تسخیر قوم اور سب سے برتر و بالا ملت سمجھنے لگ گئے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خدا اور اس کے پیغمبر جناب ہود علیہ السلام کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا اور طغیان وسرکشی اور تکذیب وانکار پر کمر باندھ لی۔

لیکن قرآن مجید اس دعوے کے جواب میں کہتا ہے: وہ یہ نہیں جانتے کہ جس خدا نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ طاقتور ہے (اولم یروا ان اللہ الذی خلقھم ھو اشد منھم قوۃ)۔

وہ صرف انہی کا خالق نہیں بلکہ زمین وآسمان کا بھی خالق ہے دراصل ان دونوں طاقتوں کا آپس میں تقابل ہی نہیں ہو سکتا کہاں ناچیز اور فانی قدرت اور کہاں بے انتہا پائیدار اور حق کی ذاتی طاقت؟ خاک کو خالق افلاک سے کیا نسبت؟

" مالك التراب و رب الارباب "[1]

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: وہ اپنی بے بنیاد سوچ اور فکر کی وجہ سے ہمیشہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہتے تھے۔ (وکانوا بایاتنا یجحدون)۔

جی ہاں: بے بضاعت اور کم ظرف انسان جب تھوڑی سی بھی طاقت اپنے اندر محسوس کرتا ہے تو سرکشی پر اتر آتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اپنی جہالت کی بنا پر خدا کے ساتھ بھی محاذ آرائی پر اتر آتا ہے۔ لیکن خداوند عالم نہایت سادگی کے ساتھ ایک ہی اشارے سے ان کی زندگی کے اسباب کو ان کی موت کے اسباب میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسا کہ قوم عاد کے اسی ماجرا میں بعد کی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: آخر کار تند و تیز، گرجدار، ہولناک، سرد اور سخت ہوا کو نحس اور غبار آلود ایام میں ان پر بھیجا تاکہ ان کو رسوا کرنے والا عذاب اسی دنیاوی زندگی میں چکھائیں (فارسلنا علیهم ریحًا صرصرًا فی ایام نحسات لنذیقهم عذاب الخزی فی الحیٰوة الدنیا)۔

یہ عجیب تیز و تند آندھی قرآن کے الفاظ میں انہیں زمین سے یوں اٹھاتی اور دوبارہ زمین پر دے مارتی جس طرح کھجور کے درخت کو تنے سے اکھاڑ کر پھر زمین پر مارا جائے۔[2]

یہ تیز و تند آندھی ان پر سات راتیں اور آٹھ دن متواتر چلتی رہی اور اس نے اس مغرور، سرکش اور خود پرست قوم کی زندگی الٹ کر دی اور پھر اس کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، اور پرشکوہ محلات و قصور کے چند کھنڈروں اور خوشحال زندگی اور مال و دولت کے نشان کے علاوہ اور کچھ نہیں چھوڑا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ تو دنیاوی عذاب ہے لیکن "آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہوگا" (و لعذاب الاٰخرة اخزٰی)۔

دنیا میں اس قدر عظیم اور دردناک عذاب تو اس عذاب کے مقابلے میں ایسے ہوگا جیسے آگ کے سمندر کے مقابلے میں ایک چنگاری۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "کوئی بھی شخص ان کی مدد کو نہیں پہنچے گا، اور کہیں سے بھی ان کی مدد نہیں کی جائے گی" (وھم لاینصرون)۔

جی ہاں وہ ساری زندگی اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ اپنے آپ کو بڑا بنا کر دنیا کے سامنے پیش کریں لیکن خداوند عالم نے بھی عذاب کے وقت انہیں اس دنیا میں رسوا کن اور ذلیل کرنے والی سزا سے دوچار کر دیا اور آخرت میں ان کے

---

[1] یہ تعبیر درحقیقت " اللہ اکبر " کے مشابہ ہے۔ جس میں خدا کے تمام موجودات عالم سے بلند تر اور بالاتر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ جب کہ یہ دونوں جملے آپس میں کسی بھی صورت میں تقابل کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ خداوند عالم ہماری زبان میں ہم سے گویا ہے لہٰذا ایسی تعبیرات کو استعمال کیا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو سورۂ قمر کی آیات ۱۹، ۲۰ اور سورۂ الحاقہ کی آیت ۶ کے بعد کی آیات۔

لیے زبردست عذاب مہیا کر رکھا ہے تاکہ ایسے مغرور اور سرکش افراد کو دنیا اور آخرت میں رسوا کرے۔

"صَرصَر" (بروزن "دَفتَر") دراصل "صَرّ" (بروزن شَرّ) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "اچھی طرح باندھ دینا" اسی لیے جس تھیلی میں رقم ڈال کر اس کے منہ کو اچھی طرح باندھ دیتے ہیں اسے "صُرّہ" (بروزن "طُرّہ") کہتے ہیں بعد ازاں اس کا اطلاق زبردست سرد، چیخنے چلانے والی، مسموم اور قاتل ہواؤں پر ہونے لگا۔ شاید جس تند و تیز ہوا نے قوم عاد کو ہلاک کیا تھا ان تینوں صفات کی حامل تھی۔

"ایام نحسات" کا معنی منحوس اور بُرے دن ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد گرد و غبار سے بھرپور ایام ہیں جب کہ بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں اس کا معنی ہے "بہت ہی سرد ایام" ان تینوں معانی کو ان آیات میں جمع کیا جا سکتا ہے۔

حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ایک خطبے میں بیدار کن اخلاقی درس کے لیے اسی قوم عاد کی داستان کو پیش فرمایا ہے یہ خطبہ نہج البلاغہ میں موجود ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

واتعظوا فیھا بالذین قالوا: من اشد منا قوۃ؟ حملوا الی قبورھم فلا یدعون رکبانًا، وانزلوا الاجداث فلا یدعون ضیفانًا، وجعل لھم من الصفیح اجنان، ومن التراب اکفان، ومن الرفات جیران

اس دنیا میں ان لوگوں کے حال سے نصیحت حاصل کرو جو کہتے تھے کہ ہم سے بڑھ کر کون طاقتور ہو سکتا ہے؟ لیکن انہی کو ان کی قبور کی طرف اس وقت لے جایا گیا، جب کہ ان کا اپنا کوئی بس نہیں چلتا تھا اور وہ قبروں کے اندر داخل کر دیئے گئے، جب کہ وہ بن بلائے مہمان تھے اور پتھروں کے دل میں ان کے لیے قبریں تیار کی گئیں، مٹی کے کفن بنے اور گلی سڑی ہڈیاں ان کی ہمسایہ تھیں [1]

چند اہم نکات

۱۔ قوم عاد کیونکر تباہ ہوئی؟ اسی سورہ کی تیرھویں آیت کی رو سے قوم عاد اور قوم ثمود دونوں "صاعقہ" کے ذریعے نیست و نابود ہوئیں، جب کہ زیر تفسیر آیات کہتی ہیں کہ "صرصر" یعنی تیز و تند ہوا کے ذریعے تباہ و برباد ہوئیں، تو کیا ان دونوں کا باہم تضاد ہے؟

جواباً گزارش ہے کہ ارباب لغت اور مفسرین نے "صاعقہ" کے دو معانی بتائے ہیں ایک عام اور دوسرا خاص۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۱۱۔

عام معنی کے لحاظ سے صاعقہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو ہلاک کر دیتی ہے اور بقول صاحب مجمع البیان "المھلکۃ من کل شیء" اور خاص معنی کے لحاظ سے آگ کے اس عظیم انگارے کو کہتے ہیں جو آسمان سے گرتا ہے اور جو کچھ بھی اس کی زد میں آجاتا ہے جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اس کی تشریح انہی آیات کی تفسیر میں ہم کر چکے ہیں (یہ عظیم چنگاری بادل اور زمین کی الیکٹریسٹی کے باہمی تبادلے سے پیدا ہوتی ہے)۔

اسی لیے اگر "صاعقہ" کا پہلا معنی مراد لیا جائے تو تیز ہوا کے معنی کے ساتھ اس کا تضاد نہیں ہوگا۔

راغب، مفردات میں کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے نزدیک "صاعقہ" تین قسم کی ہیں۔ ایک موت کے معنی ہیں، دوسری عذاب کے معنی ہیں اور تیسری آگ کے معنی ہیں۔ خاص کر "انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد وثمود" والی آیت میں عذاب کے معنی ہیں ہے۔

وہ آگے چل کر کہتے ہیں یہ سب ایک معنی میں جمع ہو جاتے ہیں کہ "صاعقہ" ایک زبردست مہیب آواز ہوتی ہے جو فضا میں اٹھتی ہے اور کبھی تو اس میں آگ ہوتی ہے، کبھی موت اور کبھی کوئی دوسرا عذاب، غرض "صاعقہ" ایک چیز ہوتی ہے اور یہ اس کے اثرات ہیں[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ قوم عاد دگنے عذاب میں مبتلا ہوئی ہو پہلے تو ان کے شہروں پر ایک عرصے تک تیز و تند ہوا کے جھکڑ چلتے رہے ہوں، پھر حکم خدا کے مطابق تباہ کن آتشین بجلی ان پر گری ہو کہ جس نے انہیں جلا کر بھسم کر دیا ہو۔

لیکن قوم عاد کی سزا کے سلسلے میں قرآن مجید کی دوسری آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلا جواب زیادہ مناسب نظر آتا ہے[2]

۲۔ قوم عاد کے نحس ایام: کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ سال کے ایام کی دو قسمیں ہیں ایک نحس اور دوسرے نیک اور سعد انہوں نے مندرجہ بالا آیات سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ راتوں اور دنوں کے اندر کچھ پر اسرار اور ناشناختہ تاثیر ہوتی ہے جس کے آثار ہمیں دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے اسباب و علل ہمارے لیے مبہم ہیں۔

جب کہ بعض دوسرے مفسرین نے ان زیر بحث آیات میں "ایام نحسات" سے گرد و غبار سے بھرپور ایام مراد لیے ہیں۔

قوم عاد اس قدر تیز و تند ہوا کا شکار ہو گئی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا اور لوگ ایک دوسرے کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جیسا کہ سورۂ احقاف کی آیت ۲۴ سے بھی استفادہ ہوتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

جب تیز ہواؤں نے ان کا رخ کیا تو وہ اس قدر تاریک اور غبار سے اٹی ہوئی

---

[1] "مفردات راغب" مادہ صعق"۔

[2] سورۂ "ذاریات" کی آیت ۴۱، سورۂ حاقہ کی آیت ۷ سورۂ قمر کی آیات ۱۸ اور ۱۹۔

تھیں کہ انہوں نے گمان کیا کہ بارش بھرے بادل ان کی طرف آرہے ہیں لیکن ان سے کہا گیا کہ یہ وہی عذاب ہے تم جس کی جلدی میں تھے۔ یہ تو ہوا کے تیز جھونکے اور جھکڑ ہیں جن میں دردناک عذاب چھپا ہوا ہے۔"

انشاء اللہ العزیز" سعد ونحس ایام "کے بارے میں مفصل گفتگو سورۂ قمر کی انیسویں آیت کے ذیل میں آئے گی۔

۱۷۔ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

۱۸۔ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۱۷۔ رہے ثمود تو انہیں ہم نے ہدایت کی مگر انہوں نے نابینائی کو ہدایت پر ترجیح دی، اسی لئے ذلیل و خوار کرنے والے عذاب صاعقہ نے ان کے اعمال کی بنا پر ان کو آلیا۔

۱۸۔ اور جو لوگ ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا ہم نے انہیں نجات بخشی۔

تفسیر

سرکش قوم ثمود کا انجام

گزشتہ آیات میں قوم عاد کے بارے میں ایک تفصیلی گفتگو تھی۔ زیر نظر دو آیات میں قوم ثمود کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے ارشاد ہوتا ہے: رہے ثمود تو ہم نے انہیں ہدایت کی (اپنے پیغمبر صالح کو واضح دلائل دے کر ان کی طرف بھیجا) مگر انہوں نے نابینائی اور گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی (واما ثمود فهدیناهم فاستحبوا العمٰی علی الهدٰی)۔

اسی لیے رسوا کن عذاب 'صاعقہ' نے ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا (فاخذتهم صاعقة العذاب الهون بما کانوا یکسبون)۔

قوم ثمود وہ لوگ تھے جو "وادی القریٰ" (مدینہ اور شام کے درمیانی علاقے) میں رہتے تھے۔ خداوند عالم نے انہیں آباد سرسبز و شاداب زمینیں اور نعمتوں سے معمور باغات عطا کئے ہوئے تھے۔ زرعی امور میں نت نئے تجربے اور زبردست طاقت خرچ کیا کرتے تھے، ان کی عمریں لمبی اور اعضاء طاقتور تھے۔ پختہ اور ترقی یافتہ عمارتیں تعمیر کرنے میں اس قدر ماہر تھے کہ

خداوند عالم سورۂ حجر کی ۸۲ ویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے :

وہ پہاڑوں کے دل میں محفوظ مکان تعمیر کیا کرتے تھے ۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم پیغمبر قوی منطق اور بے حد محبت کے ساتھ معجزے کر ان کے پاس آیا لیکن اس مغرور اور خود پسند قوم نے نہ صرف اس کی دعوت کو ٹھکرا دیا بلکہ اسے اور اس پر ایمان لانے والے تھوڑے سے لوگوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خداوند عالم نے ان مغرور اور سرکش لوگوں کو رسوا کن عذاب میں مبتلا کر دیا۔

سورۂ اعراف کی آیت ۷۸ میں ہے :

فاخذتهم الرجفة فاصبحوا فی دارهم جاثمین

وہ سخت زلزلے کی لپیٹ میں آگئے اور صبح کے وقت ان کی بے جان لاشیں ان کے گھروں میں باقی رہ گئی تھیں۔

سورۂ حاقہ کی آیت ۵ میں ہے :

فاما ثمود فاهلكوا بالطاغية

قوم ثمود ایک تباہ کن عامل کے ذریعے نیست و نابود ہو گئی ۔

سورۂ ہود کی آیت ۶۷ میں ہے :

واخذ الذین ظلموا الصیحة فاصبحوا فی دیارهم جاثمین

ثمود کی ظالم قوم آسمانی چیخ کے ذریعے نیست و نابود ہو گئی اور اپنے گھروں میں اوندھے منہ گر گر کر ہلاک ہو گئی۔

اور زیر تفسیر آیات میں عذاب کو " صاعقہ " سے تعبیر کیا گیا ہے اور ممکن ہے بادی النظر میں یہ تصور ہو کہ ان تعبیرات میں تضاد پایا جاتا ہے، لیکن اگر تھوڑا سا غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مندرجہ بالا چاروں تعبیریں[1] ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹ رہی ہیں، کیونکہ جس طرح ہم پہلے بیان کر چکے ہیں " صاعقہ " کا ایک معنی تو وحشتناک آواز ہے جسے آسمانی " صیحہ " یعنی چیخ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور بھسم کر دینے والی آگ بھی اسی کے ہمراہ ہوتی ہے اور یہ جس زمین پر گرتی ہے وہیں پر زلزلے کے شدید جھٹکے پیدا ہوتے ہیں اور یہ تباہی و بربادی کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی بلاغت اس بات کا موجب ہے کہ وہ ایک ہی عذاب کے مختلف پہلوؤں کو مختلف آیات میں مختلف تعبیرات کے ساتھ پیش کرتا ہے تاکہ انسانی نفوس میں اس کا زیادہ سے زیادہ اثر ہو۔ دراصل وہ لوگ ایک ہی واقعے میں موت کے مختلف عوامل سے دوچار ہوئے جن میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ بھی ان کی نابودی اور ہلاکت کے لیے کافی تھا۔ " موت کا پیغام بن کر آنے والی چیخ " ہو یا " جان سے مار ڈالنے والا زلزلہ "، " بھسم کر دینے والی آگ " ہو یا " وحشتناک صاعقہ "

---

[1] رجفہ ، طاغیہ ، صیحہ اور صاعقہ ۔

غرض سب کے سب عذاب اور ہلاکت کا ایک مؤثر عامل ہیں۔

لیکن چونکہ تھوڑے سے لوگ یعنی کچھ افراد حضرت صالحؑ پر ایمان تو ضرور لائے تھے لہٰذا ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہاں پر سوال کریں کہ اس مختصر سے گروہ کا اس وحشتناک عذاب کے موقع پر کیا بنا ؟ آیا وہ بھی دوسروں کی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے ؟ تو قرآن مجید بعد کی آیت میں ارشاد فرماتا ہے : جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہم نے انہیں نجات عطا فرمائی (و نجینا الذین اٰمنوا و کانوا یتقون)۔

ان لوگوں کو تو ان کے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے نجات دی اور اس سرکش گروہ کو ان کے کفر اور بداعمالیوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ ان میں سے ہر گروہ اس امت کے افراد کے لیے ایک نمونہ اور اسوہ بن سکتا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اتنی بڑی تعداد میں افراد کی موجودگی کے باوجود جناب صالحؑ پر صرف ایک سو دس افراد ایمان لے آئے اور خداوند عالم نے بھی بروقت ان ایماندار اور متقی لوگوں کو نجات عطا فرمائی۔

خدائی ہدایت کی قسمیں

ہم جانتے ہیں کہ ہدایت کی دو قسمیں ہیں، ایک "ہدایت تشریعی" ہے جس سے مراد "ارائۃ الطریق" (یا راستے کا دکھا دینا) ہے اور دوسری "ہدایت تکوینی" ہے جو "ایصال الی المطلوب" یعنی منزل مقصود تک پہنچا دینا ہے۔

زیر نظر آیات میں ہدایت کی دونوں قسمیں جمع ہیں، پہلے فرمایا گیا ہے : ہم نے قوم ثمود کو ہدایت کی۔ یہ ہدایت ہدایت تشریعی یا ارائہ طریق ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے : انہوں نے ہدایت پر نابینائی (گمراہی) کو ترجیح دی۔ یہ ہدایت تکوینی یا ایصال الی المطلوب ہے۔

اس لحاظ سے پہلے معنی کے لحاظ سے ہدایت تو حاصل ہو گئی جو انبیاءِ خدا کا مسلم الثبوت فریضہ ہے، لیکن دوسرے معنی کے لحاظ سے ہدایت عملی جامہ نہ پہن سکی جو انسان کے اپنے بس کی بات ہے اور اس مغرور اور سرکش قوم کی طرف سے رُک گئی۔ کیونکہ " فاستحبوا العمٰی علی الھدٰی "

اور یہ " انسان کے ارادہ اور اختیار کی آزادی " اور انسان کے مجبور نہ ہونے کے مسئلے پر بذات خود ایک واضح اور روشن دلیل ہے۔

تعجب ہے کہ آیات کے اس قدر واضح اور روشن ہونے کے باوجود فخرالدین رازی جیسے بعض مفسرین نے مکتب جبر کو ترجیح دی ہے اور اپنے مسلک پر اصرار اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے آیت کی دلالت سے انکار کر دیا ہے اور ایسی ایسی باتیں کہی ہیں جو کسی محقق کی شان سے کوسوں دور ہیں[1]

---

[1] فخر رازی کی تفسیر کبیر کا انہی آیات کے سلسلے میں مطالعہ فرمائیں۔

۱۹۔ وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَآءُ اللّٰهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ○

۲۰۔ حَتّٰى إِذَا مَا جَآءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

۲۱۔ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوٓا أَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيٓ أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

۲۲۔ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ ○

۲۳۔ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدٰىكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِينَ ○

ترجمہ

۱۹۔ وہ دن کہ جب دشمنان خدا کو اکٹھا کرکے دوزخ کی طرف لے جائیں گے اور اگلی صفوں کو روک لیں گے تاکہ پچھلی صفیں ان سے آملیں۔

۲۰۔ جب وہ اس تک پہنچ جائیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور بدن کی جلد ان کے اعمال کی گواہی دے گی۔

۲۱۔ وہ اپنے بدن کی جلد سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی ہے؟ تو وہ جواب دے گی جس خدا نے تمام موجودات کو بولنے کی طاقت دی ہے اس نے ہم سے بھی بلوایا ہے۔

اسی نے پہلے تمہیں پیدا کیا اور تمہاری بازگشت اسی کی طرف ہوگی۔

۲۲۔ اگر تم چھپ کر گناہوں کا ارتکاب کیا کرتے تھے اس لیے نہیں کہ تم کو کانوں، آنکھوں اور بدن کی جلد کی گواہی کا خوف تھا بلکہ تم سمجھتے تھے کہ تمہارے بہت سے اپنے اعمال کہ جنہیں تم انجام دیتے ہو اللہ نہیں جانتا۔

۲۳۔ جی ہاں! پروردگار کے بارے میں تمہارا یہ بُرا گمان تھا اور یہی بدگمانی تمہاری ہلاکت کا سبب بن گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگئے ہو۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں مغرور کفار اور ظالم مجرموں کی دنیاوی سزا کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ لیکن ان آیات میں ان کی آخرت کی سزا کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ قیامت کے مختلف مراحل میں دشمنان خدا کے مصائب کو کسی لرزا دینے والی آیات میں شمار کیا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اور اس دن کا سوچیے جب خدا کے دشمنوں کو اکٹھا کر کے جہنم کی طرف لے جایا جائے گا (و یوم یحشر اعداء اللہ الی النار)۔

اور ان کی صفوں کو باہم پیوستہ رکھنے کے لیے "اگلی صفوں کو روکے رکھیں گے تاکہ بعد والی صفیں ان سے آملیں" اور سب اکٹھے جہنم میں بھیجے جائیں (فھم یوزعون)[1]

جب وہ اس تک پہنچ جائیں گے تو ان کے کان، آنکھیں، اور بدن کی جلد ان کے اعمال کی گواہی دے گی (حتّٰی اذا ما جاءوھا شھد علیھم سمعھم و ابصارھم و جلودھم بما کانوا یعملون)[2]

کیسے عجیب گواہ ہوں گے یہ کہ جو خود انسان کے بدن کے اپنے اعضاء ہوں گے اور ان کی گواہی بھی کسی صورت میں مسترد نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ وہ ہر جگہ پر حاضر و ناظر رہے ہیں اور حکم خدا کے مطابق گفتگو کریں گے۔

---

[1] "یوزعون" "وزع" (بروزن "وضع") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "روکنا"۔ جب اس تعبیر کو فوجوں یا دوسری صفوں کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کے اگلے حصے کو روک لیا جائے تاکہ آخری افراد بھی ان سے آملیں۔

[2] "اذا ما جاءوھا" کے جملے میں "ما" زائدہ ہے اور تاکید کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اب یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان کی گواہی اس طریقے سے ہوگی کہ خداوند عالم ان میں شعور اور قوت گویائی ایجاد فرمائے گا یا جس طرح درخت کو قوت گویائی عطا کر کے موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کی تھیں یا انسان کے عمر بھر کے گناہوں کے آثار جو سینہ گیتی پر نقش ہو چکے ہیں اس "یوم البروز" اور اسرار کے آشکار ہونے کے دن ظاہر ہو جائیں گے۔ ہمارے روزمرہ کی گفتگو میں بھی کبھی اس قسم کے آثار کو گفتگو یا خبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں

ع رنگِ رُخسار ترے دل کا پتہ دیتا ہے

ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ سب تفسیریں قابل قبول ہیں اور کم و بیش مفسرین کی گفتگو میں یہ باتیں مل جاتی ہیں۔

البتہ اس میں بھی کوئی مانع نہیں کہ خداوند عالم ان میں ادراک اور شعور پیدا کر دے اور وہ علم اور آگاہی کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے حضور گواہی دیں۔ بادی النظر میں بھی شاید آیت کا ظاہر اسی طرح ہو اور اللہ کی بارگاہ میں کائنات کے ذرے ذرے کی تسبیح، حمد اور سجدے کے بارے میں بھی بہت سے مفسرین کا یہی نظریہ ہے۔

لیکن آخری معنی بھی کچھ بعید معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ معلوم ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی چیز فنا نہیں ہوتی اور ہمارے اعمال و گفتار کے آثار بھی ہمارے اعضاء و جوارح میں باقی رہ جاتے ہیں اتفاق سے یہ "شہادت تکوینی" سب سے معتبر اور ناقابل تردید شہادت ہے۔ جس طرح چہرے کے رنگ کا زرد ہو جانا یا چہرے کا رنگ اڑ جانا خوف وہراس کا معتبر گواہ ہوتا ہے اور چہرے کا سرخ ہو جانا غصے یا شرم کا گواہ ہوتا ہے اس معنی میں نطق کا اطلاق مکمل طور پر قابلِ قبول ہے۔

لیکن یہ دوسرا احتمال کہ خداوند عالم بغیر ادراک و شعور کے ان میں قوت گویائی پیدا کرے گا جیسے حضرت موسیٰؑ کے لیے درخت سے بات کروائی یا ان میں کسی قسم کا تکوینی اثر ہو، یہ بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں نہ تو تکوینی گواہی کا مصداق ہوگا اور نہ ہی تشریعی گواہی کا۔ نہ تو ان میں عقل و شعور ہوگا اور نہ ہی کسی قسم کا آثار عمل، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے حضور اس گواہی کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "حتّٰی اذا ما جاء وھا" سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی اعضاء کی شہادت دوزخ کی عدالت میں ہوگی، تو کیا اس بات کا مقصد یہ ہے کہ یہ گواہی دوزخ میں لی جائے گی جب کہ دوزخ تو برے کاموں کا انجام ہوگی یا یہ کہ ان کی عدالت دوزخ کے کنارے پر لگائی جائے گی اور یہ اعضاء وہیں پر گواہی دیں گے؟ دوسرا احتمال زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

لفظ "جلود" (جلدیں) سے کیا مراد ہے؟ جو جمع کے صیغہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد بدن کے مختلف حصوں کی جلد ہے۔ یعنی ہاتھ، پاؤں، چہرے وغیرہ کی جلد اور اگر بعض روایات میں اس سے "فروج" (شرم گاہیں) مراد لیا گیا ہے تو یہ درحقیقت اس کے مصداق میں سے ہے کہ "جلود" "فروج" میں منحصر ہے۔

یہاں پر تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اور بھی تو اعضاء ہیں آخر آنکھوں، کانوں اور جلد ہی کو گواہ کے طور پر کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ کیا گواہی صرف انہی اعضاء کے ساتھ خاص ہوگی یا دوسرے اعضاء بھی گواہی دیں گے؟

جہاں تک قرآن مجید کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان مذکورہ اعضاء کے علاوہ انسان کے کئی اور

اعضاء بھی گواہی دیں گے۔ چنانچہ سورۂ یٰسین آیت ۶۵ میں ہے:

وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون

ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

سورۂ نور کی آیت ۲۴ میں "زبان" اور "ہاتھ پاؤں" کی باتوں کا تذکرہ ملتا ہے:

یوم تشھد علیھم السنتھم و ایدیھم وارجلھم

جس دن ان کے خلاف ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں گواہی دیں گے۔

اسی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے اعضاء بھی اپنی اپنی باری کے موقع پر گواہی دیں گے، لیکن چونکہ انسان کے بیشتر اعمال انسان کی آنکھ اور کان کے ذریعے انجام پاتے ہیں اور بدن کی جلد وغیرہ ایسے اعضاء ہیں کہ جن کا اعمال کے ساتھ براہ راست تعلق ہوتا ہے اور وہ درجہ اول کے گواہ ہیں۔

بہرحال وہ بڑی رسوائی کا دن ہو گا، جس دن انسان کا تمام وجود بولنے لگے گا اور اس کے تمام راز فاش کرکے رکھ دے گا۔ اس سے تمام گناہگار عجیب و غریب دہشت کا شکار ہو جائیں گے اس وقت اپنے بدن کی کھال کی طرف منہ کرکے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی ہے (وقالوا لجلودھم لم شھدتم علینا)۔

ہم نے سالہا سال تک تمہاری دیکھ بھال کی، تمہیں سردی اور گرمی سے بچاتے رہے، تمہیں نہلاتے دھوتے تھے، ہم نے تمہاری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، تم نے یہ کیا کیا؟

تو وہ جواب دے گی: جس خدا نے تمام موجودات کو بولنے کی طاقت عطا کی ہے اس نے ہم سے بھی بلوایا ہے۔ (قالوا انطقنا اللہ الذی انطق کل شیء)۔

خداوند عالم نے اس دن اور اس عظیم عدالت میں راز فاش کرنے کا فریضہ ہمارے ذمہ لگایا ہے اور اس کے فرمان کی اطاعت کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارہ کار بھی نہیں۔ جی ہاں! جس خدا نے دوسری ناطق مخلوقات کو قوت گویائی عطا کی ہے ہمارے اندر بھی یہ طاقت پیدا کر دی ہے[1]

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ وہ اپنی جلد سے یہ سوال کریں گے آنکھ اور کان جیسے دوسرے اعضاء سے نہیں ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ جلد کی گواہی دوسرے اعضاء سے زیادہ عجیب، زیادہ باعث تعجب، زیادہ وسیع اور زیادہ عمومی ہو گی وہی جلد جو دوسرے تمام اعضاء سے پہلے عذاب الٰہی کا مزہ چکھے گی وہی سب گواہی دینے پر اتر آئے گی اور یقیناً یہ بات حیران کن اور تعجب انگیز ہے۔

---

[1] یہ تفسیر اس صورت میں ہو گی جب ہم آیت کا یہ معنی کریں "انطقنا اللہ الذی انطق کل شیء ناطق" لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ "انطق کل شیء" مطلق معنی میں ہو۔ یعنی جس خدا نے تمام موجودات کو بغیر کسی استثناء کے قوت گویائی عطا فرمائی ہے اور وہ آج تمام راز فاش کر رہی ہیں اس نے ہمیں بھی بولنے کی طاقت بخشی ہے۔ تم ہمارے بولنے پر تعجب نہ کرو بلکہ آج تو موجودات عالم کی ہر چیز بول رہی ہے۔

وہ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہیں گے : وہ خدا تو وہ ہے جس نے تمھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اور تم سب کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہے (وھو خلقکم اول مرۃ والیہ ترجعون)۔

اور پھر کہیں گے : اگر تم چھپ کر گناہ کرتے تھے تو اس لیے نہیں کہ تمھیں اپنے کانوں، آنکھوں، اور جلد کی اپنے خلاف گواہی کا خطرہ تھا، تمھیں تو اس بات کا بالکل خیال ہی نہیں تھا کہ یہ بھی کسی دن بولنے پر آجائیں گے اور تمھارے خلاف گواہی دیں گے (وما کنتم تستترون ان یشھد علیکم سمعکم ولا ابصارکم ولا جلودکم)۔

بلکہ تمھارے مخفی کام اس لیے تھے کہ تم گمان کرتے تھے کہ تمھارے بہت سے کاموں کو جو تم انجام دیتے ہو خدا نہیں جانتا (ولکن ظننتم ان اللہ لا یعلم کثیرًا مما تعملون)۔

تم اس بات سے غافل تھے کہ خدا ہر جگہ پر تمھارے اعمال کا شاہد و ناظر ہے اور تمھارے اندرونی اور بیرونی رازوں کو بھی طرح جانتا ہے ساتھ ہی اس کے محکمہ نگرانی کے کارندے بھی ہر جگہ تمھارے ساتھ ہیں، آیا تم سرے سے اپنی آنکھوں، کانوں بلکہ جلد بدن کے بغیر کوئی کام انجام دے سکتے ہو؟

جی ہاں! تم اس قدر اس کے قبضۂ قدرت میں جکڑے ہوئے ہو اور اس حد تک اس کے نگرانوں کی نگرانی میں ہو کہ تمھارے مخفی اور آشکار گناہوں کے آلات و اوزار تک تمھارے مخالف گواہ ہوں گے۔

بہت سے مفسرین نے اس آیت کی شان نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"کفار قریش اور بنی ثقیف کے تین آدمی جنکی کھوپڑیاں چھوٹی اور پیٹ بڑے تھے خانہ کعبہ کے پاس اکٹھے ہوئے اور ان میں سے ایک نے کہا : کیا تم باور کر سکتے ہو کہ خدا ہماری باتوں کو سن رہا ہے؟

دوسرے نے کہا : ذرا آہستہ! کیونکہ اگر بلند آواز سے بولیں تو سن لیتا ہے اور اگر آہستہ بولیں تو نہیں سنتا۔

تیسرے نے کہا : میرے خیال میں اگر بلند آواز کو سن سکتا ہے تو آہستہ کو بھی یقیناً سن لیتا ہے"۔

اسی موقع پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں [1]

بہر صورت بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے :

تمھارا یہ غلط گمان تھا جو تم نے اپنے پروردگار کے بارے میں کیا تھا اور یہی چیز تمھاری تباہی کا سبب بنی اور انجام کار تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گئے (وذالکم ظنکم الذی ظننتم بربکم اردٰکم فاصبحتم من

---

[1] اس حدیث کو کچھ فرق کے ساتھ بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے مثلاً تفسیر قرطبی، تفسیر مجمع البیان تفسیر کبیر فخر رازی، تفسیر روح البیان اور تفسیر مراغی کے مفسرین نے۔ اسی طرح صحیح بخاری، مسلم اور ترمذی میں بھی یہ حدیث آئی ہے۔ ہم نے جو حدیث متن میں نقل کی ہے وہ تفسیر قرطبی کی عبارت کا ترجمہ ہے (دیکھئے تفسیر مذکور جلد ۸ صفحہ ۵۷۹۵)۔

الخاسرین)۔[۲،۱]

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اعضاء و جوارح کی یہ گفتگو خدا کا کلام ہے یا انسانی بدن کی جلد کی گفتگو کا سلسلہ ہے؟

تو جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ دوسرا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور آیت کے الفاظ بھی اسی معنی سے ہم آہنگ ہیں۔ ہر چند کہ اعضائے بدن بھی یہ گفتگو خداوند عالم کے فرمان اور اس کی تعلیم کے تحت ہی کریں گے اور دونوں کا نتیجہ تقریباً ایک ہی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **خدا کے بارے میں نیک گمان اور بدگمانی :** مندرجہ بالا آیات سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کی ذات کے بارے میں بدگمانی اس حد تک خطرناک ہے کہ بعض اوقات انسان کی ہلاکت اور ابدی عذاب کا سبب بن جاتی ہے، اس کا نمونہ کفار کے اس ٹولے کی بدگمانی ہے جو سمجھتے تھے کہ خدا ان کے اعمال کو نہیں دیکھ رہا اور نہ ہی ان کی باتوں کو سُن رہا ہے۔ یہی بدگمانی ان کے نقصان اور تباہی کا سبب بن گئی۔

اس کے بالکل برعکس خداوند تبارک و تعالیٰ کی ذات کے ساتھ حسن ظن دنیا اور آخرت میں نجات کا سبب بن جاتا ہے، جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

> ینبغی للمؤمن ان یخاف الله خوفاً کانه یشرف علی النار ویرجوه رجاءً کانه من اهل الجنة، ان الله تعالیٰ یقول: وذالکم ظنکم الذی ظننتم بربکم ...... ثم قال ان الله عند ظن عبده ان خیراً فخیر، و ان شراً فشر

> مؤمن کے لیے سزاوار ہے کہ وہ خدا سے اس حد تک ڈرے کہ گویا وہ جہنم کے کنارے پر کھڑا ہے اور آتش جہنم کو دیکھ رہا ہے۔ اور اس حد تک اس سے پُر امید ہو کہ گویا وہ اہل بہشت ہے جیسا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے: یہ وہ گمان ہے جو تم نے خدا کے بارے میں کیا تھا اور تمھاری ہلاکت کا سبب بن گیا ......۔ پھر امامؑ فرماتے ہیں:
>
> خدا اپنے بندہ مؤمن کے گمان کے پاس ہی ہے اگر وہ نیک گمان کرتا ہے تو اس کا نتیجہ بھی نیک ہوتا ہے اور اگر بدگمانی کرتا ہے تو اس کا نتیجہ بھی بُرا ہوتا ہے۔[۳]

۱۔ "ذالکم" مبتدا ہے اور "ظنکم" اس کی خبر ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "ظنکم" بدل ہے اور "اردٰکم" "ذالکم" کی خبر ہے۔

۲۔ "اردٰی" "ردی" (بروزن رأی) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہلاکت اور تباہی ہے۔

۳۔ تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کرتے ہیں۔

جب آخری شخص کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو وہ ناگہاں اپنے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائے گا۔
خداوند عظیم و برتر حکم دے گا کہ اسے واپس لے آؤ، واپس لے آئیں گے خدا پوچھے گا
تو نے ادھر، اُدھر کیوں دیکھا اور کس فرمان کا انتظار کر رہا تھا؟ تو وہ عرض کرے گا، پروردگارا!
مجھے تیرے بارے میں ایسا گمان نہیں تھا۔ خدا پوچھے گا: تو تمہارا کیا گمان تھا؟ عرض کرے گا،
خدایا! میرا گمان یہ تھا کہ تو میرے گناہوں کو معاف کر کے مجھے بہشت برین کی طرف بھیجے گا۔
خدا ارشاد فرمائے گا: یاملائکتی! لا، وعزتی وجلالی والائی وعلوی وارتفاع
مکانی، ماظن بی عبدی ھذا ساعة من خیر قط، ولو ظن بی ساعة من خیر
ما ودعته بالنار، اجیزوا له کذبه وادخلوه الجنة ـــــ
اے میرے فرشتو! مجھے اپنی عزت وجلال اور نعمتوں اور بلند و برتر مقام کی قسم میرے اس بندے
نے میرے بارے میں کبھی نیک گمان نہیں کیا، اگر ایک ساعت بھی اس نے حسن ظن کیا ہوتا تو
میں نے اسے قطعاً جہنم نہ بھیجا ہوتا۔ اگرچہ اس نے جھوٹ بولا ہے لیکن پھر بھی اس کے حسن
ظن کے اظہار کو قبول کر لو اور اسے بہشت میں بھیج دو۔

پھر پیغمبرؐ فرماتے ہیں کہ
"کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جو حسن ظن کرتا ہو مگر یہ کہ خدا اس کے گمان کے پاس ہوتا ہے اور
یہی ہے وہ چیز جس کے بارے میں خدا فرماتا ہے (و ذالکم ظنکم الذی ظننتم ...)"[1]

۲۔ **قیامت کی عدالت میں گواہوں کی قسمیں:** جب ہم کہتے ہیں کہ اگلے جہان میں سب لوگوں پر مقدمہ چلایا جائے گا تو ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں وہاں کی عدالت کا یہ تصور پیدا ہو جائے جو دنیاوی عدالتوں کا ہوتا ہے کہ وہاں بھی ہر شخص اپنے چھوٹے یا بڑے ریکارڈ اور یہاں کے گواہوں کے ساتھ عدالت کے کٹہرے میں قاضی کے سامنے لا کھڑا کیا جائے گا۔ سوال و جواب ہوں گے اور آخری فیصلہ سنا دیا جائے گا۔

جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ وہاں پر الفاظ کا عمیق تر مفہوم ہوگا کہ جس کا تصور ہم دنیا کے اسیروں کے لیے مشکل بلکہ قطعاً غیر ممکن ہے۔ لیکن جب بھی آیات قرآنی یا روایات معصومین علیہم السلام میں پائے جانے والے اشارات میں غور و فکر سے کام لیں تو ہمارے لئے بہت سے حقائق کا انکشاف ضرور ہو جاتا ہے۔ وہاں کی زندگی کی عظمت اور گہرائی سے تھوڑا سا پردہ اٹھتا ہے اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے قیامت کی عدالت کس قدر عظیم اور عجیب ہوگی۔

مثلاً جب "میزان عمل" کا لفظ بولا جاتا ہے تو ممکن ہے اس سے یہ تصور پیدا ہو کہ اس دن ہمارے اعمال ہلکے اور بھاری

---

[1] تفسیر "علی بن ابراہیم" (منقول از نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۴۳)۔

اجسام کی صورت اختیار کریں گے اور ترازو کے دو پلڑوں میں تولے جائیں گے لیکن جب معصومین علیہم السلام کی روایات میں پڑھتے ہیں کہ "حضرت علی علیہ السلام میزان اعمال ہیں" یعنی اعمال کی قیمت اور افراد کی شخصیت عالم انسانیت کی اس عظیم شخصیت کے وجودی پیمانے پر پرکھی جائے گی اور جس قدر کوئی شخص ان کے مشابہ اور نزدیک ہوگا اسی قدر اس کا وزن زیادہ ہوگا اور جس قدر کوئی ان کے غیر مشابہ اور دور ہوگا اسی قدر اس کا وزن کم اور سبک ہوگا، تب جاکر پتہ چلتا ہے کہ قیامت کے دن میزان عمل سے کیا مراد ہے؟

گواہوں کے بارے میں بھی آیات قرآنی نے کچھ حقائق سے پردہ اٹھایا ہے اور کچھ ایسے گواہوں کا ذکر کیا ہے کہ دنیاوی عدالتوں میں ان کے متعلق ذرہ بھر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر قیامت کی عدالت میں ان کا اہم کردار ہوگا۔

کلی طور پر قرآنی آیات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ قیامت کی عدالت میں چھ قسم کے گواہ ہوں گے۔

(۱) **پہلا گواہ** جو سب سے برتر اور بالاتر ہے وہ خود خدا کی پاک ذات ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وما تکون فی شأن وما تتلوا منہ من قرآن ولا تعملون من عمل الا کنا علیکم شھودًا اذ تفیضون فیہ

تم جس حالت میں بھی رہو، قرآن کی جس آیت کو بھی پڑھو، کوئی بھی کام انجام دو ہم تمہارے گواہ ہیں جب کہ تم وہاں داخل ہوگے۔ (یونس۔ ۶۱)

البتہ یہی گواہی ہر چیز کے لیے اور ہر شخص کے لیے کافی ہے لیکن خدا نے اپنے لطف اور کرم کے پیش نظر اور عدالت کے تقاضوں کے مدنظر کئی اور گواہ بھی مقرر کئے ہیں۔

(۲) **انبیاء اور اوصیاء**، قرآن مجید کہتا ہے:

فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علٰی ھٰؤلاء شھیدًا

وہ دن کیسا ہوگا کہ جس میں ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے ان پر گواہ بنائیں گے۔ (النساء۔ ۴۱)۔

اسی آیت کے ذیل میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث اصول کافی میں ہے:

نزلت فی امۃ محمد خاصۃ، فی کل قرن منھم امام منا شاھد علیھم ومحمد شاھد علینا

یہ آیت خصوصی طور پر امت محمدیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ ہر قرن میں اس امت کے لیے ہم میں سے ایک امام ہوگا جو اس امت پر گواہ ہوگا اور محمدؐ ہم سب پر گواہ ہوں گے۔[1]

(۳) **اعضائے بدن**، جیسے زبان، ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور کان بھی گواہی دیں گے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

---

[1] اصول کافی جلد ا صفحہ ۱۹۰۔

یوم تشھد علیھم السنتھم وایدیھم وارجلھم بما کانوا یعملون

اس دن ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے اعمال کے گواہ ہوں گے۔ (نور۔ ۲۴)

زیر تفسیر آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ اور کان بھی گواہوں کی فہرست میں ہیں۔ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی بدن کے تمام اعضاء اپنی اپنی نوبت کے مطابق انسان کے اعمال کے گواہ ہوں گے۔[1]

(۴) **بدن کی جلد**، بھی گواہ ہوگی۔ چنانچہ زیر تفسیر آیات اس بات پر واضح طور پر دلالت کر رہی ہیں۔ بلکہ اس سلسلے میں یہ بات بھی بتا رہی ہیں کہ گنہگاروں کو اس بات کی توقع نہیں ہوگی لیکن وہ ان کے خلاف گواہی دے گی تو گنہگار اس کو مخاطب کر کے کہیں گے:

تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ تو وہ جواب دے گی جس خدا نے ہر چیز کو بولنے کی طاقت عطا فرمائی ہے، اسی نے ہمیں بھی بولنے کی طاقت بخشی ہے۔ (حٰم سجدہ۔ ۲۱)۔

(۵) **فرشتے**، بھی انسانی اعمال کے گواہ ہوں گے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وجاءت کل نفس معھا سائق و شھید

اس دن ہر شخص عرصہ محشر میں پاؤں رکھے گا، جب کہ ایک فرشتہ اس کے ساتھ ہوگا جو اسے حساب وکتاب کی طرف کھینچ کرلے جائے گا اور ایک گواہ فرشتوں میں سے ہوگا، جو اس کے اعمال کی گواہی دے گا۔ (ق /۲۱)

(۶) **زمین**، بھی انسان کے اعمال کی گواہی دے گی، جی ہاں! وہ زمین جو ہمیشہ ہمارے پاؤں کے نیچے ہے اور ہم اس کے ہمیشہ کے مہمان ہیں جو اپنی مختلف برکتوں کے ذریعے ہماری خاطر تواضع کرتی ہے اور ہر وقت ہماری فکر میں ہے، اس دن تمام باتیں بتا دے گی۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

یومئذ تحدث اخبارھا

اس دن زمین اپنی تمام خبریں بتا دے گی۔ (زلزال۔ ۴)۔

(۷) **زمانہ**، بھی گواہوں میں شامل ہے، اگرچہ قرآنی آیات میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں ہوا، لیکن معصومین علیہم السلام کی روایات اس چیز پر ضرور دلالت کرتی ہیں چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مامن یوم یمر علی ابن اٰدم الاقال لہ ذالک الیوم یا ابن اٰدم! انا یوم جدید، وانا علیک شھید، فقل فی خیرًا واعمل فی خیرًا، اشھد لک یوم القیامۃ

کوئی دن بھی فرزند آدم پر نہیں گزرتا جو یہ نہ کہتا ہو کہ اے فرزند آدم! میں ایک نیا دن ہوں اور تجھ پر گواہ ہوں، مجھ میں اچھی باتیں کر اور اچھے عمل لا تاکہ میں بروز قیامت تیرے حق

---

[1] لئالی الاخبار ص ۴۶۲۔

میں گواہی دوں ۔ [1]

توکیا یہ عجیب بات نہیں ہوگی کہ عظیم عدالت کے لیے اتنے برحق گواہوں کے باوجود ہم غفلت کا شکار ہوں اور ان سے بالکل بے خبر ہوں ۔ زمان گواہ، مکان گواہ، فرشتے گواہ، ہمارے اپنے اعضاء گواہ، انبیاء و اولیاء گواہ، اور ان سب سے بڑھ کر خود ذات کردگار ہمارے اعمال کی گواہ! لیکن ہم بالکل بے پرواہ!!

آیا اتنے نگہبانوں کے وجود پر ایمان کافی نہیں ہے کہ انسان مکمل طور پر حق و عدالت اور تقویٰ و طہارت کی راہ پر چلے۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ مادۂ یوم۔

۲۴۔ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ۝

۲۵۔ وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۴۔ اگر وہ صبر کریں (یا نہ کریں) جہنم ہر حالت میں ان کا ٹھکانا ہوگی اور اگر معافی کی درخواست کریں گے تو بھی انہیں معافی نہیں دی جائے گی۔

۲۵۔ اور ہم نے ان کے لیے (بُری سیرت والے) ہم نشین مقرر کئے ہیں، جو کہ برائیوں کو ان کے سامنے سے اور ان کے پس پشت ان کی نظر میں خوبصورت بنا کر پیش کرتے ہیں اور خدا کا فرمان ان کے بارے میں برحق ثابت ہوا اور وہ جن وانس کی گمراہ اقوام کے سے انجام سے دوچار ہوئے جو ان سے پہلے گزر چکی تھیں اور یقیناً وہ خسارہ اٹھانے والے تھے۔

تفسیر

برے ساتھی

گزشتہ آیات میں "اعداء اللہ" (دشمنان خدا) کے انجام کا ذکر تھا، اور مندرجہ بالا دونوں آیات میں دنیا اور آخرت میں ان کی دردناک سزا کا ذکر موجود ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: وہ صبر کریں یا نہ کریں آتش جہنم ان کا ٹھکانا ہے اور اس سے ان کا چھٹکارا ناممکن ہے۔ (فان یصبروا فالنار مثوی لھم)[1]

"مثوی" "ثوی" (بروزن "ھوی") کے مادہ سے ہے جس کا معنی رہائش گاہ اور ٹھکانا ہے۔

درحقیقت یہ آیت سورۂ طور کی آیت ۱۶ کے مشابہ ہے جس میں خدا فرماتا ہے:

اصلوھا فاصبروا اولا تصبروا سواء علیکم

جہنم کی آگ میں داخل ہو جاؤ، صبر کرو یا نہ کرو تمھارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اسی طرح سورۂ ابراہیم کی آیت ۲۱ میں ہے:

سواء علینا اجزعنا ام صبرنا مالنا من محیص

ہم صبر کریں یا نہ کریں ہمارے لیے ایک ہی بات ہے کہ نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

پھر اسی مطلب کی تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: اگر وہ خدا سے معافی کی درخواست بھی کریں، قبول نہیں ہوگی اور انہیں معافی نہیں ملے گی (وان یستعتبوا فماھم من المعتبین)۔

"یستعتبون" دراصل "عتاب" کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی غصّے کا اظہار ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ گناہگار شخص خود کو صاحب حق کی سرزنش کے سامنے پیش کر کے سر تسلیم خم کر دے تاکہ اس طرح سے وہ اس پر راضی ہو جائے اور اس کی خطائیں معاف کر دے۔ لہٰذا یہ مادہ "استعتاب" "استرضاء اور معافی مانگنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[2]

اس کے بعد ان کے دردناک دنیاوی عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے بداندیش اور بُری سیرت کے لوگوں کو ان کا ساتھی اور ہمنشین مقرر کیا ہے جو ہر چیز کو ان کی نگاہوں میں مزیّن کر چکے ہیں۔ انہوں نے برائیوں کو اچھائیوں کی صورت میں اور بدصورتی کو خوبصورتی کے رنگ میں پیش کیا ہے (وقیضنا لھم قرناء فزینوا لھم ما بین ایدیھم وما خلفھم)۔

"قیضنا" "قیض" (بروزن "فیض") کے مادہ سے ہے جس کا اصل معنی انڈے کا چھلکا ہے، پھر اس کا استعمال ان لوگوں پر ہونے لگا جو کسی پر مکمل طور پر مسلط ہوتے ہیں جس طرح چھلکا انڈے پر مسلط ہوتا ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کے فاسد اور مفسد دوست انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوتے ہیں جو کہ ان کے افکار کو غارت کر دیتے ہیں اور ان پر اس حد تک تسلط قائم کئے ہوتے ہیں کہ وہ اچھے اور بُرے کے درمیان تمیز بھی نہیں کر سکتے۔ اچھائیاں ان کی نگاہوں میں برائیاں اور خوبصورتی، بدصورتی میں تبدیل ہو چکی ہوتی ہے اور یہ حالت انسان کے لیے کس قدر دردناک ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ گرداب فساد کی لپیٹ میں آجاتا ہے اور پھر اس کا وہاں سے نکلنا محال ہو جاتا ہے کیونکہ نجات کے تمام رستے اس پر بند ہو جاتے ہیں۔

---

[1] یہ آیت تقدیری طور پر یوں ہے "فان یصبروا اولا یصبروا فالنار مثوی لھم"۔

[2] "مفردات راغب" "لسان العرب" مادۂ عتب۔

بسااوقات "قیضنا" کا مادہ ایک چیز سے دوسری چیز میں تبدیل ہو جانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ بنابریں آیت کی تفسیر یوں ہوگی کہ ہم نیک دوست ان سے چھین کر ان کی جگہ انہیں بُرے دوست دے دیتے ہیں۔

یہ معنی نہایت واضح صورت میں سورۂ زخرف کی ۳۶ویں اور ۳۷ویں آیات میں آیا ہے:

ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض له شیطانًا فهوله قرین وانهم لیصدونهم عن السبیل ویحسبون انهم مهتدون۔

جو لوگ ذکر خدا سے منہ موڑتے ہیں ہم بھی ان کے لیے شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور یہ شیاطین انہیں راہ حق سے روکتے رہتے ہیں جب کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہدایت یافتہ ہیں۔

سچ مچ جب ہم ظالموں، مفسدوں اور تباہکاروں کے ٹولوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کی زندگی میں شیطان کی علامات بخوبی دکھائی دیتی ہیں گمراہ ساتھی انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوتے ہیں اور ان کی عقل و فکر پر مکمل طور پر چھائے ہوتے ہیں اور حقائق کو ان کی نگاہوں میں الٹ پھیر کر پیش کرتے ہیں۔

"مابین ایدیهم وما خلفهم" (جو کچھ ان کے سامنے اور ان کے پیچھے ہے) یہ جملہ ممکن ہے شیاطین کے ہر جانب سے احاطے کی طرف اشارہ ہو جو ہر برائی کو ان کے لیے بھلائی بنا کر پیش کرتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "مابین ایدیهم" سے مراد دنیاوی چکاچوند اور عیش و عشرت ہو اور "وما خلفهم" سے مراد قیامت اور معاد کا انکار ہو۔

یہ تفسیر بھی ممکن ہے کہ "مابین ایدیهم" سے ان کی دنیاوی کیفیت کی طرف اشارہ ہو اور "وما خلفهم" ان کے مستقبل اور ان کی اولاد کے مستقبل کی طرف اشارہ ہو اور یہ لوگ بہت سے جرائم کا ارتکاب اپنے مستقبل کے لیے کرتے ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے:

اس افسوسناک صورت حال کے پیش نظر عذاب کے بارے میں خدا کا فرمان برحق ثابت ہوا اور وہ اپنے سے پہلے جن و انس کی اقوام کے سے انجام سے دوچار ہوئے۔

(وحق علیهم القول فی امم قد خلت من قبلهم من الجن والانس[1])۔

آیت کو ان الفاظ پر ختم کیا گیا ہے:

---

[1] "فی امم" کا جملہ فعل محذوف سے متعلق ہے جس کی تقدیر یوں ہے:

کائنین فی امم قد خلت۔۔۔۔

اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں پر "فی" "مع" کے معنی میں ہو۔

یقیناً وہ نقصان اٹھانے والے تھے۔ (انھم کانوا خاسرین)۔

اس قسم کی تعبیرات درحقیقت ان تعبیرات کا نقطہ مقابل ہیں جو بعد میں آنے والی آیات میں بااستقامت اور دھن کے پکے مومنین کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ کہ دنیا و آخرت میں جن کے دوست اور ساتھی خدا کے فرشتے ہیں اور انہیں خوشخبری دیتے ہیں کہ ان کے لیے کسی قسم کا رنج و غم نہیں ہوگا۔

۲۶۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○

۲۷۔ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

۲۸۔ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ○

۲۹۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ○

ترجمہ

۲۶۔ اور کافروں نے کہا : اس قرآن کو نہ سنو اور اس کی تلاوت کے وقت شور مچایا کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

۲۷۔ ہم یقیناً کافروں کو سخت عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے اور انہیں ان کے انجام دیئے ہوئے بدترین اعمال کی سزا دیں گے۔

۲۸۔ دشمنان خدا کی سزا آگ ہے اور وہ ان کی جاودانی سزا ہے، یہ سزا انہیں ہماری آیات کے انکار کے بدلے میں ہے۔

۲۹۔ کافروں نے کہا: خداوندا! جن وانس میں سے جن لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے وہ ہمیں دکھلا تاکہ ہم انہیں اپنے پاؤں

کے نیچے رکھیں (اور انھیں روند ڈالیں) تاکہ وہ پست ترین لوگوں میں سے ہوں۔

تفسیر

شور مچاؤ تاکہ لوگ قرآن کی آواز نہ سن سکیں

گزشتہ آیات میں قوم عاد و ثمود جیسی بعض اقوام نیز بدسیرت دوستوں اور ہم نشینوں جو حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ زیر نظر آیات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے مشرکین کی بداندیشی اور انحراف کا کچھ ذکر کیا جا رہا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں تلاوت کلام پاک اور خداوند عالم کے شیریں، دلکش اور معنی خیز کلمات ادا کرتے ہوئے اپنی آواز بلند فرماتے تو مشرکین مکہ لوگوں کو آپ سے دور کر کے کہتے شور مچاؤ، تالیاں پیٹو، سیٹیاں بجاؤ اور اونچی اونچی آواز میں شعر پڑھو تاکہ آپ کی آواز کوئی نہ سن سکے۔[1]

اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اور کافروں نے کہا: اس قرآن کو نہ سنو اور اس کی تلاوت کے وقت شور مچاؤ تاکہ تم غالب آجاؤ (و قال الذین کفروا لا تسمعوا لھذا القراٰن والغوا فیہ لعلکم تغلبون)۔

حق و حقانیت کا مقابلہ کرنے کی یہ ایک خطرناک قدیم روش ہے جو آج بھی پہلے سے زیادہ وسیع اور خطرناک صورت میں جاری وساری ہے تاکہ اس طرح سے لوگوں کے اذہان کو منحرف کیا جا سکے، حق و عدالت کے علمبرداروں کی آواز کو دبایا جا سکے اور ماحول کو اس حد تک شور و شرابے سے معمور کر دیں کہ کوئی بھی شخص ان کی آواز نہ سُن سکے اور اگر لفظ "الغوا" کی طرف مزید توجہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اس کا معنی بہت ہی وسیع ہے جو ہر قسم کے فضول اور بے ہودہ کلام کیلئے بھی بولا جاتا ہے، اس سے اس کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔

کبھی ڈھول بجا کر، تالیاں پیٹ کر اور سیٹیاں بجا کر،

کبھی بے ہودہ اور جھوٹی داستانیں بیان کر کے،

اور کبھی عشق و محبت اور خواہشات نفسانی کے افسانے پیش کر کے اس کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔

بلکہ بعض اوقات تو معاملہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے اور اخلاق باختگی کے مراکز قائم کر کے، لچر اور بے ہودہ فلمیں دکھا کر، سرگرم رکھنے والا بے مقصد بلکہ ہیجان انگیز اور گمراہ کن لٹریچر شائع کر کے، جھوٹی سیاست بازی اور اشتعال انگیزی قائم کر کے غرض جو چیز بھی لوگوں کے اذہان کو راہ حق سے منحرف کر دے اسے اختیار کیا جاتا ہے۔

---

[1] تفسیر "مراغی" جلد ۲۴ صفحہ ۱۲۵ اور تفسیر "روح المعانی" جلد ۲۴ صفحہ ۱۰۶۔

اور ان سب سے بڑھ کر کبھی کبھار تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی قوم کے دانشور طبقے میں فضول بحثیں چھیڑ دی جاتی ہیں اور پھر ان کو بحث مباحثے میں اس حد تک الجھا دیا جاتا ہے کہ ان سے بنیادی مسائل کے بارے ہیں ہر قسم کی سوچ بچار سلب ہو جاتی ہے۔

تو کیا مشرکین اپنے ان ذرائع اور بے ہودہ ہتھکنڈوں کی وجہ سے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے تھے اور قرآن پر غالب آ گئے تھے ؟ نہیں اور ہرگز نہیں ؛ وہ خود بھی اور ان کی شیطنت بھی قرآن کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور حرف غلط کی طرح مٹ گئے اور روز بروز قرآن کا بول بالا ہوتا گیا اور قرآن آج نصف النہار کے مانند کائنات پر چمک رہا ہے۔

بعد کی آیت اس قبیل کے لوگوں کے لیے سخت عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے : ہم یقینی طور پر کافروں کو ـــ اور ان کی اگلی صفوں میں موجود ان افراد کو جو لوگوں کو آیات الٰہی سننے سے روکتے تھے ـــ سخت عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے (فلنذيقن الذين كفروا عذابا شديدا)۔

ہو سکتا ہے انہیں یہ عذاب دنیا میں اسلام کی فاتح افواج کے ہاتھوں قتل ہونے یا قید ہونے کی صورت میں ملے یا آخرت میں ملے یا دونوں جہانوں میں ملے۔

"اور ہم انہیں ان کے بدترین اعمال کی سزا دیں گے" (ولنجزينهم اسوأ الذي كانوا يعملون)۔

کفر و شرک ، آیات الٰہی کے انکار اور لوگوں کو حق بات سننے سے روک دینے سے بڑھ کر بھی کوئی بدعمل ہو سکتا ہے ؟ جب وہ اپنے تمام برے اعمال کی سزا بھگتیں گے تو پھر "اسوأ" (بدترین عمل) پر کیوں زور دیا گیا ہے ؟ ہو سکتا ہے کہ اس سے سزا کے یقینی ہونے کی طرف اشارہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سننے سے لوگوں کو روکنے کی طرف اشارہ ہو۔

"كانوا يعملون" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زیادہ تر ان اعمال پر توجہ کی جاتی ہے جو بار بار انجام دیئے جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ ان کی اچانک لغزش نہیں تھی بلکہ ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔

پھر مزید زور دے کر قرآن کہتا ہے : یہ خدا کے دشمنوں کی سزا ہے، جہنم کی بھسم کر دینے والی آگ (ذالك جزاء اعداء الله النار)[1]

اور آگ کا یہ عذاب نہ تو عارضی ہو گا اور نہ ہی جلد ختم ہونے والا بلکہ" ان کے لیے اس آگ میں ہمیشہ کا ٹھکانا ہو گا (لهم فيها دار الخلد)۔

جی ہاں ! وہ اس آگ میں اس لیے دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے (جزاءً بما كانوا باٰياتنا يجحدون)[2]

وہ صرف آیات خداوندی کا ہی انکار نہیں کیا کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی ان کے سننے سے روکتے تھے۔

"يجحدون"، "جحد" کے مادہ سے ہے (جو بروزن "عہد" ہے) اور مفردات میں راغب کی تصریحات کے مطابق

---

[1] ہو سکتا ہے کہ "النار"، "جزاء" کا بدل یا عطف بیان ہو یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہو۔ جو اصل میں اس طرح ہے "هو النار"۔

[2] ہو سکتا ہے کہ لفظ "جزاء" فعل محذوف کا مفعول ہو جو "يجزون جزاءً" ہے یا پھر "مفعول لہ" ہو۔

اس چیز کی نفی کے معنی میں ہے جس کا دل میں اثبات ہو یا اس کا اثبات ہو جس کی دل میں نفی ہو، بالفاظ دیگر حقائق کا علم ہونے کے باوجود اس کا انکار کیا جائے اور یہ کفر کی بدترین قسم ہے۔ (اس کی مزید وضاحت تفسیر نمونہ کی آٹھویں جلد سورۂ نمل کی آیت ۱۴ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں)۔

جب انسان کسی مصیبت میں گھر جاتا ہے، خاص کر جب کسی خطرناک، سخت اور سنگین مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے اصل محرکات اور اس کا باعث بننے والوں کی تلاش شروع کر دیتا ہے تاکہ ان تک پہنچ کران سے اپنا انتقام لے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ اگر اس کے بس میں ہو تو انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ اسی لیے زیر نظر آیت میں دوزخ میں کفار کی اسی حالت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پروردگارا! جن وانس میں سے جن لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے تو ہمیں دکھلا تاکہ ہم انہیں روند ڈالیں اور پامال کر دیں اور وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہو جائیں (وقال الذین کفروا ربنا ارنا الذین اضلانا من الجن والانس نجعلھما تحت اقدامنا لیکونا من الاسفلین)۔

وہ ایک عرصے تک ہمارے سروں پر سوار رہے، ہمیں بدبختی کی راہوں پر چلاتے رہے، اب ہماری یہی خواہش ہے کہ ہم انھیں روند ڈالیں اور پامال کر دیں۔ تاکہ اپنے دل کا غصہ ٹھنڈا کریں، وہ لوگ ہمیں کہتے تھے کہ "محمدؐ کی باتوں پر کان نہ دھرو، وہ جادوگر ہے، دیوانہ ہے اور ہذیان کہتا ہے" وہ ڈھول پیٹ پیٹ کر تالیاں اور سیٹیاں بجا بجا کر، غل غپاڑہ برپا کر کے ہمیں ان کی دلکش آواز سننے سے روکتے تھے تاکہ آپؐ کا دلربا آہنگ ہمارے دلوں میں اثر نہ کر جائے، رستم واسفندیار کے قصے کہانیاں از خود بنا بنا کر ہمیں سناتے اور مشغول رکھتے تھے۔

ہمیں تو اب پتہ چلا ہے کہ آنحضرتؐ کی زبان پر تو آب حیات کے چشمے جاری تھے، انؐ کے دلنواز نغمے تو مسیحائی اعجاز کے حامل تھے اور مردوں کے لیے حیات بخش تھے، لیکن افسوس اب موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہاں پر جن وانس سے مراد شیطانوں کا گمراہ کن ٹولہ اور انسانوں کا شیطان صفت گروہ ہے نہ کہ دو معین افراد اور جہاں پر فاعل دو گروہ ہوں وہاں پر فاعل تثنیہ لانے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ "فبای الاء ربکما تکذبان" میں آیا ہے۔

بعض مفسرین نے "لیکونا من الاسفلین" کے جملہ کے بارے میں یہ کہا ہے:

> اس سے مراد یہ ہے کہ گمراہ کرنے والے جنات اور انسان جہنم کے بالکل ہی نچلے طبقوں میں جائیں گے۔

لیکن بظاہر صحیح معنی وہی ہے جو پہلے بتایا جا چکا ہے اور وہ یہ کہ وہ زبردست غم اور غصے کی وجہ سے یہ چاہیں گے جس طرح وہ دنیا میں بلند مقامات کے مالک تھے، یہاں پر اپنے پیروکاروں کے پاؤں تلے روندے جائیں اور انہیں پست جگہ نصیب ہو۔

۳۰۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

۳۱۔ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ؕ

۳۲۔ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝ۧ

ترجمہ

۳۰۔ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ڈٹ گئے، تو ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ نہ تو ڈرو اور نہ ہی غم کرو اور تمھیں اس بہشت کی خوشخبری ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

۳۱۔ ہم تمھاری اس دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے یار و مددگار ہیں اور آخرت میں بھی اور تمھارے لیے بہشت میں وہ سب کچھ فراہم ہے جو تم چاہو گے، اور جو کچھ تم طلب کرو گے تمھیں دیا جائے گا۔

۳۲۔ یہ سب کچھ تمھارے غفور و رحیم اللہ کی طرف سے تمھاری خاطر تواضع کے لیے ہے۔

تفسیر

با استقامت مومنین پر فرشتوں کا نزول

ہم جانتے ہیں کہ مطالب سمجھانے اور واضح کرنے کے لیے قرآن مجید کا طریقہ کار یہ ہے کہ دو متضاد چیزوں کو تقابل کے طور پر ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے، تاکہ ان کا باہمی موازنہ کیا جائے اور ان کی اچھی طرح سے شناخت ہو جائے

اور چونکہ گزشتہ آیات میں ضدی مزاج اور ہٹ دھرم منکرین کا تذکرہ تھا جو اپنے کفر پر ڈٹے ہوئے تھے اور خداوند عالم بھی انہیں دردناک عذاب اور مختلف سزاؤں کی وعید دے رہا تھا، لہٰذا ان آیات میں ان مؤمنین کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو اپنے ایمان میں پکے اور مستقل مزاج ہیں۔ اور خداوند عالم بھی انہیں سات قسم کی نعمتوں اور جزاؤں سے نوازنے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو غالباً گزشتہ سزاؤں کا نقطہ مقابل ہیں۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اپنے اس کہے پر ڈٹ جاتے ہیں اور ان میں ذرہ بھر لغزش پیدا نہیں ہوتی اور جو اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے اس کا وہ اپنے گفتار و کردار کے ذریعے اظہار کرتے ہیں تو اللہ کے فرشتے ان پر نازل ہوتے ہیں کہ نہ تو ڈرو اور نہ ہی غم کرو (ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا)۔

کیا ہی جامع اور دلکش تعبیر ہے جس میں درحقیقت تمام نیکیاں اور اہم صفات الٰہی ہیں۔ سب سے پہلے خدا کے ساتھ دل لگانا اور اس پر پختہ ایمان رکھنا، پھر تمام زندگی کو ایمان کے رنگ میں رنگ دینا اور اُسے اپنے تمام امور میں محور قرار دینا ہے[1]

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو عشق الٰہی کا دم تو بھرتے ہیں لیکن میدان عمل میں ثابت قدم دکھائی نہیں دیتے۔ وہ ایسے سست اور ناتواں ہوتے ہیں جب انہیں خواہشات نفسانی کے طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑ جاتا ہے تو ایمان کو بھی خیرباد کہہ دیتے ہیں اور میدان عمل میں بھی مشرک بن جاتے ہیں۔ اور جب اپنے مفادات کو خطرات میں گھرا دیکھتے ہیں تو برائے نام ایمان کو بھی ضائع کر دیتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک خطبے میں اس آیت کی تلاوت کرنے کے بعد اس کی واضح ترین اور پُر معنی تفسیر فرماتے ہیں:

> وقد قلتم "ربنا اللہ" فاستقیموا علی کتابہ وعلی منھاج امرہ وعلی الطریقۃ الصالحۃ من عبادتہ، ثم لا تمرقوا منھا، ولا تبتدعوا فیھا، ولا تخالفوا عنھا
>
> جب تم نے کہہ دیا ہے کہ "ہمارا رب اللہ ہے" تو اس پر ثابت قدم رہو۔ اس کی کتاب کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرو، جس راستے پر چلنے کا اس نے حکم دیا ہے اور جس طریقے سے اس نے عبادت کا حکم دیا ہے اس پر استقامت اور پامردی کے ساتھ چلتے رہو۔ اس کے دائرہ فرمان سے کبھی باہر نہ نکلو، اس کے دین میں کبھی بدعت نہ کرو اور کسی بھی موقع پر اس کی مخالفت

---

[1] "استقاموا" کا کلمہ "استقامت" کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی سیدھے راستے پر برقرار اور سیدھے راہ پر ثابت قدم رہنا ہے۔ بعض صاحبان لغت نے اس کی "اعتدال" سے بھی تفسیر کی ہے اور بعید نہیں کہ دونوں معانی صحیح ہوں۔

نہ کرو۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اور کہا:

قد قالها الناس، ثم کفر اکثرهم، فمن قالها حتی یموت فهو ممن استقام علیها

کچھ لوگوں نے یہ بات کہی پھر ان میں سے اکثر کافر ہو گئے لیکن جو شخص یہ کہے اور اس پر مرتے دم تک ثابت قدم رہے تو وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے استقامت کا ثبوت دیا ہے[2]

حضرت امام رضا علیہ السلام سے "استقامت" کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

هی والله ما انتم علیه

واللہ! استقامت ولایت ہی تو ہے جس پر تم قائم ہو[3]

اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ آیت کا مفہوم ولایت ہی پر موقوف ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی امامت اور رہبری کو قبول کر لینا خط توحید اور صحیح وحقیقی اسلام کی بقا اور عمل صالح کے تسلسل کا ضامن ہوتا ہے لہٰذا امامؑ نے "استقامت" کی اس معنی میں تفسیر کی ہے۔

مختصر یہ کہ کسی انسان کی قدر وقیمت اس کے ایمان اور عمل صالح میں ہی منحصر ہے اور وہ آیت کے اس جملے "قالوا ربنا الله ثم استقاموا" میں منعکس ہے لہٰذا ایک روایت میں اسلام کے عظیم الشان پیغمبرؐ سے مروی ہے کہ ایک شخص آپؐ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔

اخبرنی بامر اعتصم به

مجھے کوئی ایسا حکم دیجئے جسے میں مضبوطی سے تھامے رکھوں اور دنیا وآخرت میں نجات پا جاؤں؟

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

قل ربی الله ثم استقم

تم کہو میرا پروردگار اللہ ہے، اور پھر اس پر مضبوطی سے قائم رہو۔

سائل نے پھر پوچھا،

ارشاد فرمائیے کہ کونسی چیز سب سے زیادہ خطرناک ہے جس سے مجھے پرہیز کرنا چاہیئے؟

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶۔

[2] مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

[3] مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

توآنحضرتؐ نے اس کی زبان پکڑ کر فرمایا کہ

"یہ"[1]

اب دیکھنا یہ ہے کہ جو لوگ ان دو اصولوں پر قائم رہتے ہیں وہ خدا کے کن انعامات کے مستحق قرار پاتے ہیں ؟

اس بارے میں قرآن مجید میں خدا کی سات عظیم عنایات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ایسی عنایات کہ اللہ کے فرشتے ان پر نازل ہو کر انہیں ان کی خوشخبری سناتے ہیں۔

پہلی اور دوسری خوشخبری کے بعد جو کہ "خوف" اور "حزن" کو دل میں راہ نہ دینا ہے۔ تیسرے مرحلے پر ارشاد ہوتا ہے: تمھیں اس بہشت کی خوشخبری ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (وابشروا بالجنة التی کنتم توعدون)۔

چوتھی خوشخبری یہ ہے کہ "ہم تمھارے دنیاوی زندگی میں بھی یار و مددگار ہیں اور آخرت میں بھی" ہم تمھیں کہیں بھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے، نیکیوں میں تمھاری امداد کریں گے اور لغزشوں سے تمھیں بچائیں گے حتیٰ کہ تم بہشت میں پہنچ جاؤ گے (نحن اولیاء کم فی الحیٰوة الدنیا و فی الاٰخرة)۔

پانچویں بشارت کے سلسلے میں کہتے ہیں: تمھارے لیے بہشت میں غیر مشروط طور پر وہ سب کچھ مہیا ہے جو کچھ تمھارا جی چاہے گا (ولکم فیہا ماتشتھی انفسکم)۔

چھٹی خوشخبری یہ ہے کہ نہ صرف مادی نعمتیں تمھاری حسب منشاء تمھیں ملیں گی بلکہ "جو روحانی نعمتیں مانگو گے وہ بھی تمھیں ملیں گی" (ولکم فیہا ماتدّعون)۔

آخر میں ساتویں اور آخری نعمت کی خوشخبری انہیں یہ ملے گی کہ چونکہ تم جاودانی بہشت میں خدا کے مہمان ہو گے اور یہ سب نعمتیں تمھاری خاطر تواضع کے طور پر تمھیں عطا ہوں گی جس طرح کسی معزز مہمان کی کسی معزز میزبان کی طرف سے خاطر تواضع کی جاتی ہے لہٰذا "یہ سب غفور و رحیم اللہ کی طرف سے میزبانی کے طور پر ہو گا" (نزلاً من غفور رحیم)۔

چند اہم نکات

ان آیات اور مختصر لیکن پُر معنی تعبیرات میں نہایت باریک اور بہت سے نکات پوشیدہ ہیں۔

۱۔ **فرشتوں کا نزول کب ؟** آیا با استقامت مؤمنین پر فرشتوں کا نزول مرنے اور اس دنیا سے اُس جہاں کی طرف انتقال کے موقع پر ہوتا ہے، جیسا کہ کچھ مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے یا مندرجہ ذیل تین مواقع پر فرشتے ان کے پاس آئیں گے:

(۱) موت کے وقت

(۲) قبر میں تدفین کے وقت

(۳) قیامت کے دن دوبارہ اٹھنے کے وقت۔

---

[1] روح البیان جلد ۸ صفحہ ۲۵۴۔

یا کیا یہ خوشخبریاں ان کے لیے مستقل اور ہمیشہ کے لیے ہوتی ہیں کہ فرشتے روحانی طور پر ان حقائق کو ہمیشہ مؤمنین کے کانوں میں بیان کرتے رہتے ہیں ہر چند کہ بوقت مرگ یا قبر میں دفن کرتے وقت یا عرصۂ محشر میں فرشتوں کی یہ صدا زیادہ واضح صورت میں سنی جا سکے گی؟

چونکہ آیت میں کسی قسم کی کوئی قید و شرط نہیں ہے لہٰذا آخری معنی کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ خاص طور پر جب کہ فرشتے چوتھی خوشخبری میں کہتے ہیں کہ "ہم تمہارے دنیاوی زندگی میں بھی دوست ہیں اور آخرت میں بھی" اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس خوشخبری کو فرشتوں سے اس وقت سنتے ہیں جب وہ دنیا میں زندہ ہوتے ہیں لیکن یہ بشارت زبان اور الفاظ کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ مؤمنین اپنے دل کے کانوں کے ذریعے سنتے ہیں اور مشکلات و مصائب میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ اس کا احساس کرتے ہیں اور قلبی سکون محسوس کرتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ متعدد روایات میں اس آیت کی تفسیر موت کے وقت کے ساتھ کی گئی ہے لیکن بعض دوسری روایات میں وسیع معنی کے ساتھ بھی اس کی تفسیر وارد ہوئی ہے جس میں دنیاوی زندگی بھی شامل ہے[1]

ان تمام روایات کو ملا کر یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ موت کی حالت کا خصوصی ذکر اس وسیع مفہوم کا ایک واضح مصداق ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جو بھی روایات تفسیر کے طور پر وارد ہوئی ہیں غالب طور پر واضح مصداقوں کی صورت میں ہیں۔

بہر حال یہ خدا کے فرشتوں کی خوشخبریاں ہی تو ہیں جو با استقامت مؤمنین کے قلب و روح میں جلوہ فگن ہوتی ہیں اور زندگی کے تیز و تند طوفانوں میں انہیں طاقت بخشتی ہیں اور لغزش کے مقامات پر انہیں ثابت قدم رکھتی ہیں۔

۲۔ خوف اور حزن میں فرق : اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "خوف" اور "حزن" کے درمیان کیا فرق ہے؟ چنانچہ بہت سے مفسرین کہتے ہیں کہ "خوف" اور ڈر آیندہ کے خطرناک امور و حوادث سے متعلق ہے اور "حزن" اور غم کا گزشتہ زمانے کے ناگوار حالات سے تعلق ہے۔ تو گویا اس طرح سے فرشتے انہیں یہ کہتے ہیں کہ نہ تو تم آئندہ کے حوادث سے ڈرو خواہ وہ دنیا میں ہوں یا بوقت وفات اور برزخ و قیامت اور نہ ہی اپنے گزشتہ گناہوں کا غم کرو اور نہ ہی اپنی اولاد کا جو دنیا میں چھوڑے جا رہے ہو۔

اسی لیے ممکن ہے کہ "خوف" کو "حزن" پر مقدم کیا گیا ہو کیونکہ مؤمن شخص کو زیادہ خوف آئندہ کے امور سے ہوتا ہے خاص کر محشر کی عدالت سے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "خوف" اور ڈر "عذاب" سے ہوتا ہے اور "حزن" و غم "ثواب" کے ضائع ہو جانے سے۔ اور خدا کے فرشتے انہیں دونوں کے لیے پروردگار کے لطف و کرم کی اُمید دلاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین کی جلد ۴ ص ۵۴۶، ۵۴۷ روایات نمبر ۳۸، ۴۰، ۴۵ اور ۴۶ کو ملاحظہ کیا جائے۔

۳۔ "کنتم توعدون" (تم وعدہ دیئے جاتے تھے) کی تعبیر ایک نہایت ہی جامع ہے جو با استقامت مؤمنین کی نگاہوں میں بہشت کے تمام اوصاف کو مجتمع کر دیتی ہے۔ یعنی بہشت اپنے تمام اوصاف کے ساتھ تمہیں ملے گی۔ حور و قصور، روحانی اور نہایت ہی قیمتی نعمتوں سمیت تمہارے اختیار میں ہو گی۔ ایسی نعمتیں کہ بقول قرآن کوئی شخص بھی اس سے قطعاً آگاہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی کے ذہن میں آئی ہیں "فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین" (السجدة/۱۷)

۴۔ **فرشتے مومنین کے دوست :** فرشتے اپنی چوتھی خوشخبری میں اپنے آپ کو مؤمنین کا دنیا اور آخرت میں دوست کے عنوان سے تعارف کراتے ہیں اور یہ درحقیقت گزشتہ آیات کا نقطہ مقابل ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ بے ایمان کفار اپنے گمراہ کرنے والے اولیاء اور رہبروں سے نالاں ہوں گے اور دوزخ میں ان پلیدوں سے انتقام لینے کے خواہش مند ہوں گے۔

۵۔ **پانچویں اور چھٹی خوشخبری کے درمیان فرق :** فرشتے پانچویں خوشخبری میں انہیں کہتے ہیں کہ جو تمہارا جی چاہے گا وہاں پر تمہیں ملے گا۔ اور تمہارا چاہنا اور تمہیں مل جانا ایک ہی بات ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ "تشتهی انفسکم" کی تعبیر عموماً مادی لذتوں کے لیے ہوتی ہے جب کہ "ماتدعون" (جو کچھ مانگو گے) کا معنی روحانی لذتوں اور عنایتوں کا حصول ہے۔ غرض وہاں پر سب کچھ موجود ہو گا، خواہ مادی نعمتیں ہوں یا روحانی۔

۶۔ **بہشت الٰہی مہمان خانہ :** جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ "نزل" ایسے کھانوں کے معنی میں ہے جن کے ذریعہ مہمانوں کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے یہ اس چیز یا ان چیزوں کو کہتے جن سے مہمانوں کی پہلی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ تفسیر خواہ کچھ بھی ہو یہ لطیف اور دلکش تعبیر واضح کرتی ہے صاحبان استقامت مؤمنین سب کے سب اللہ کے مہمان ہوں گے اور بہشت "اللہ کا مہمان خانہ" ہے اور اس کی نعمتیں دوستان خدا کی خاطر تواضع کا ذریعہ ہیں۔

۷۔ ان مفاہیم کی گہرائیوں اور فرشتوں کے ذریعے کیے جانے والے خدا کے ان وعدوں کی عظمت میں غور و فکر کرنے سے انسان کا جی چاہتا ہے کہ اس کی روح پرواز کر جائے اور اس کا تمام وجود ایمان اور استقامت میں جذب ہو جانے کے لیے بے چین ہوتا ہے۔

انہی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ اسلام نے مٹھی بھر جاہل عربوں میں سے ایسے ایسے انسان تیار کیے جنہوں نے ہر قسم کی ایثار و قربانی اور فداکاری کی روشن مثالیں قائم کر دیں اور آج بھی تمام مشکلات پر قابو پانے کے لیے ایسے لوگوں کا اسوہ اور مثالیں مدنظر ہوتی ہیں۔

البتہ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ استقامت عمل صالح کی طرح ایمان کے درخت کا پھل ہے۔ کیونکہ جب ایمان کافی حد تک کسی میں راسخ ہو جاتا ہے تو پھر اسے استقامت کی دعوت دیتا ہے۔ جس طرح کہ راہ حق میں استقامت اور پائیداری ایمان کی گہرائی میں اضافہ کرتی ہے اسی طرح ایمان بھی استقامت کی تقویت کا باعث ہوتا ہے اور دونوں ایک

دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کی دوسری آیات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان اور استقامت، انسان کی طرف صرف روحانی برکتیں ہی نہیں لاتے، بلکہ اس دنیا میں مادی برکتوں کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں جس طرح کہ سورۂ جن کی آیت ۱۶ میں ہے۔

وان لو استقاموا علی الطریقة لاسقینا ھم ماء غدقًا

اگر ایمان دار لوگ راہ حق پر ثابت قدم رہیں تو ہم انہیں خوب سیراب کریں (بارشوں اور برکتوں سے معمور سال انہیں نصیب کریں)۔

۳۳۔ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○

۳۴۔ وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ ○

۳۵۔ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○

۳۶۔ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

ترجمہ

۳۳۔ کس کا قول اس شخص سے بہتر ہوسکتا ہے کہ جو خدا کی طرف بلاتا ہے، نیک عمل بجالاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

۳۴۔ نیکی اور بدی کبھی برابر نہیں ہوسکتیں، برائی کو اچھائی کے ذریعے دور کر، تاکہ تیرے زبردست دشمن بھی تیرے سچّے اور پکّے دوست بن جائیں۔

۳۵۔ لیکن اس مرحلہ تک وہی لوگ پہنچ سکیں گے جو صبر واستقامت کے حامل ہیں اور وہی لوگ پہنچ پائیں گے جو ایمان اور تقویٰ سے خوب بہرہ مند ہیں۔

۳۶۔ اور جب بھی شیطانی وسوسے تیرا رخ کریں تو تُو خدا کی پناہ طلب کر کیونکہ وہ سننے والا اور جاننے

والا ہے۔

تفسیر

برائی کو اچھائی کے ذریعے دور کیجئے

گزشتہ آیات میں ان افراد کی بات ہو رہی تھی جو لوگوں کو قرآنی آیات سننے سے روکتے تھے، یعنی گمراہی اور ضلالت کی دعوت دینے والوں سے متعلق گفتگو تھی۔

لیکن ان آیات میں اس کے بالکل برعکس ان لوگوں کا تذکرہ ہے جن کی گفتگو بہترین ہے، ارشاد ہوتا ہے: کس کی گفتگو اس شخص سے بہتر ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف دعوت دے اور نیک اعمال بجا لائے اور کہے کہ میں مسلمانوں سے ہوں اور مکمل طور اسلام کو قبول کر چکا ہوں (ومن احسن قولاً ممن دعا الی اللہ وعمل صالحًا وقال اننی من المسلمین)۔

اگرچہ آیت استفہام کی صورت میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ استفہام انکاری ہے۔ یعنی کسی بھی شخص کی بات ان لوگوں سے بہتر نہیں ہو سکتی جو اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور توحید کی دعوت دیتے ہیں۔ وہی مبلغین جو اپنے اعمال صالحہ کے ذریعے اپنی زبانی تبلیغ کا عملی ثبوت پیش کرتے ہیں اور اسلام پر اعتقاد رکھ کر اور حق کے سامنے سر جھکا کر اپنے نیک اعمال پر مہر توثیق ثبت کرتے ہیں۔

یہ آیت بڑی صراحت کے ساتھ ان لوگوں کو بہترین گفتگو کرنے والا بتا رہی ہے جن میں یہ تین صفات پائے جاتے ہوں:

(الف) خدا کی طرف دعوت

(ب) عمل صالح کی ادائیگی، اور

(ج) حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں نے ایمان کے تین مشہور ارکان (زبان کے ساتھ اقرار، ارکان کے ساتھ عمل اور دل کے ساتھ ایمان) کے علاوہ چوتھے رکن کو بھی مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے اور وہ ہے حق کی تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت کہ جس سے دینی بنیادوں پر دلیل قائم کی جاتی ہے اور خدا کے بندوں کے دلوں سے شک و شبہ کے آثار و نشانات کو مٹایا جاتا ہے۔ ان چار اوصاف کے حامل مبلغین کائنات کے بہترین مبلغ ہوتے ہیں۔

اگرچہ کچھ مفسرین نے ان اوصاف کو پیغمبر اسلام یا پیغمبر اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے ساتھ مختص سمجھا ہے یا بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت مؤذنین کے لیے مخصوص ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے جو ان سب منادیان توحید کے بارے میں ہے جن میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ کہ اس کا بہترین مصداق پیغمبر اسلامؐ کی ذات ہے (خاص کر

آیت کے نزول کے زمانے کو پیش نظر رکھتے ہوئے) پھر ائمہ اطہار علیہم السلام اور ان کے بعد تمام علماء، دانشور اور مجاہدین راہ حق ہیں اور وہ لوگ بھی ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور ہر طبقے کے مبلغین اسلام ہیں۔ اور یہ ایسے سب لوگوں کے لیے ایک عظیم خوشخبری اور بے مثال اعزاز ہے۔

کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مؤذن جناب بلال حبشی کی مدح وستائش ہے تو یہ بھی اس لیے ہے کہ انہوں نے نہایت تاریک اور وحشتناک دور میں توحید کا نغمہ الاپا اور اس کی حفاظت کے لیے اپنی جان وقف کر دی۔ اور راسخ ایمان، بے نظیر استقامت، اعمال صالح اور صحیح اسلامی خطوط پر عمل پیرا ہو کر ان اوصاف کی تکمیل کی۔

"وقال اننی من المسلمین" کی دو طرح سے تفسیر کی گئی ہے۔

پہلی یہ کہ یہاں پر "قال" "قول" (بمعنی اعتقاد) کے مادہ سے مشتق ہے یعنی اس کا اسلام پر پختہ عقیدہ ہے۔ اور دوسری یہ کہ یہاں پر "قول" بات کرنے کے معنی میں ہے یعنی وہ بڑے فخر سے اور علی الاعلان کہتا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے ہر چند کہ دونوں معانی کو آیت کے مفہوم میں جمع کرنے کا امکان بھی ہے۔

خدا کی طرف دعوت دینے اور خدا کی طرف بلانے والوں کے اوصاف کو بیان کرنے کے بعد اس دعوت کی روش کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں (لا تستوی الحسنة ولا السیئة)[1]

جبکہ مخالفین حق کے پاس بدگوئی، جھوٹ، مذاق، مسخرہ پن اور انواع واقسام کے مظالم کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہیں ہے اور ان کے مقابلے میں تمہارا ہتھیار پاکیزگی، تقویٰ، قول برحق اور محبت و نرمی ہونا چاہیئے۔

یقیناً ضلالت اور گمراہی کے مکتب ان ہتھیاروں کے علاوہ کسی اور چیز کو اچھا نہیں سمجھتے اور حق کا مکتب صرف مذکورہ ذرائع کو ہی بروئے کار لاتا ہے۔

اگرچہ "حسنة" اور "سیئة" کا مفہوم وسیع ہے اور ہر قسم کی نیکیاں، خوبیاں، اچھائیاں اور برکتیں "حسنہ" کے مفہوم میں آتی ہیں اور اسی طرح ہر قسم کی لغزشیں، برائیاں گمراہیاں اور عذاب "سیئہ" کے مفہوم میں ہیں لیکن زیر نظر آیت میں "حسنہ" اور "سیئہ" سے وہی مراد ہے جو تبلیغی طریقہ کار سے متعلق ہے۔

البتہ بعض مفسرین نے "حسنہ" کی اسلام اور توحید سے اور "سیئہ" کی کفر اور شرک سے تفسیر کی ہے جبکہ بعض نے "حسنہ" سے اعمال صالحہ اور "سیئہ" کی اعمال قبیحہ مراد لی ہے، بعض نے کہا ہے کہ "حسنہ" سے انسان کے صبر، حلم، اور عفو و بخشش جیسی بلند صفات اور "سیئہ" سے غیظ و غضب، جہل و نادانی، ترشروئی و بدمزاجی، بدلہ اور انتقام جیسی پست صفات مراد ہیں۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں فرمایا:

---

[1] "ولا السیئة" میں "لا" کو نفی کی تاکید کے لیے دوبارہ لایا گیا ہے۔

الحسنة التقية والسيئة الاذاعة

حسنہ تقیہ ہے اور سیئہ بات کو فاش کر دینا ہے۔

البتہ یہ حدیث ایسے موقع کے لیے ہے کہ جب عقیدے کے اظہار کی وجہ سے تمام توانائیاں ضائع اور تمام بنے بنائے پروگرام نقش برآب ہونے کا اندیشہ ہو اور مقاصد حاصل نہ ہو سکیں[1]

پھر اس بات کی تکمیل کے طور پر فرمایا گیا ہے: بہتر طریقہ کار کے ذریعے برائی کا جواب دے اور اسے دور کر (ادفع بالتی ھی احسن)۔

حق کے ذریعے باطل کو دفع کرو، حلم اور حسنِ خلق کے ذریعے جہالت اور بدمزاجی کا، اور عفو و درگزر سے ان کی سختیوں کا جواب دو۔ یاد رکھو کبھی بھی برائی کا برائی سے اور بدی کا بدی سے جواب نہ دو۔ کیونکہ یہ متکبر مزاج لوگوں کا طریقہ کار ہوتا ہے جس سے گمراہ، سرکش اور ضدی مزاج افراد کی سختی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

آیت کے آخر میں اس منصوبے کے عمیق فلسفے کو ایک مختصر سے جملے میں بیان فرماتے ہوئے کہا گیا ہے: اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سخت سے سخت دشمن بھی سچے اور پکے دوست بن جائیں گے (فاذاالذی بینك و بینه عداوة کانه ولی حمیم)۔

قرآن مجید نے اسی چیز کو سورۂ مومنین کی آیت ۹۶ میں ایک اور صورت میں بیان فرمایا ہے:

ادفع بالتی ھی احسن السیئة

سب سے اہم، سب سے مشکل اور سب سے فائدہ مند طریقہ تبلیغ کا طریقہ کار ہے خاص کر جب یہ تبلیغ نادان اور ضدی مزاج دشمن کو کی جائے اور ماہرین نفسیات کی آخری تحقیقات بھی یہی کہتی ہیں۔

کیونکہ جو شخص برائی کرتا ہے اسے اس جیسے سلوک کا انتظار رہتا ہے خاص کر بدقماش لوگ چونکہ خود ایسے ہوتے ہیں اور بعض اوقات ایک برائی کا کئی برائیوں سے جواب دیتے ہیں، جب وہ دیکھتے ہیں کہ فریق مخالف نہ صرف برائی کا جواب برائی سے نہیں دے رہا بلکہ اچھائی بھی کر رہا ہے تو اس وقت ان کے اندر ایک طوفان موجزن ہو جاتا ہے اور ان کا ضمیر زبردست دباؤ تلے آکر بیدار ہو جاتا ہے ان کے اندر انقلاب برپا ہو جاتا ہے، وہ شرمسار ہو کر اپنے آپ کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخالف کی عظمت کے تہ دل سے قائل ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر کینے اور عداوتیں دل سے کافور ہو جاتی ہیں اور محبت اور گرم جوشی ان کی جگہ لے لیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک غالب قانون ہے نہ کہ دائمی، کیونکہ ہر دور میں ایک اقلیت ایسی چلی آرہی ہے جو اس طریقہ کار سے ناجائز مفاد اٹھاتی ہے اور ایسے لوگوں کے منہ پر جب تک زوردار طمانچے رسید نہ کیے جائیں وہ انسان نہیں بنتے اور اپنی بری حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ البتہ ایسے لوگوں کی تعداد ہمیشہ بہت کم ہوتی ہے اور ان سے سختی کے ساتھ نمٹنا

---

[1] تفصیل مجمع البیان انہی آیات کے ذیل میں۔

چاہیے۔ لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ایسے افراد ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں جبکہ اکثریت پر حکم فرما قانون "برائی کو اچھائی سے دور کرنے" کا ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور معصوم پیشواؤں نے ہمیشہ قرآن مجید کی اس بلند مرتبہ روش سے استفادہ کیا ہے۔ بشال کے طور پر فتح مکہ کے موقع پر صرف دشمنوں ہی کو نہیں بلکہ دوستوں کو بھی یہی توقع تھی کہ آج مسلمان اپنے مخالفوں سے سخت انتقام لیں گے۔ آج شرک، کفر اور نفاق کی سرزمین اور بے رحم وسنگدل دشمنوں کے وطن میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ یہاں تک کہ سپاہ اسلام کے ایک علمبردار نے تو ابوسفیان کی طرف منہ کرکے یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا کہ

اليوم يوم الملحمة، اليوم تسبى الحرمة، اليوم اذل الله قريشًا۔

آج انتقام لینے کا دن ہے، آج دشمن کے جان و مال کا احترام ختم ہو جانے کا دن ہے، آج قریش کی ذلت اور خواری کا دن ہے۔

لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے :

اذهبوا فانتم الطلقاء

جاؤ! کہ تم آزاد ہو۔

کہہ کر سب کو معاف کر دیا۔ ابوسفیان کی طرف منہ کرکے انتقام پر مبنی نعرے کو اس نعرے میں تبدیل کر دیا :

اليوم يوم المرحمة، اليوم اعز الله قريشًا

آج رحمت کا دن ہے، آج قریش کی عزت کا دن ہے[1]

اسی طرز عمل نے مشرکین مکہ کے دل کی دنیا میں ایسا طوفان برپا کر دیا کہ قرآن کے بقول "يدخلون فى دين الله افواجًا" (نصر/۲) وہ گروہ در گروہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگ گئے اور دل وجان سے اسلام کو قبول کر لیا۔

لیکن تاریخ اسلام کے مطابق اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند لوگوں کا نام لے کر انہیں اس عام معافی سے مستثنیٰ کر دیا، کیونکہ وہ خطرناک مجرم اور ناقابلِ معافی افراد تھے جنہیں معاف فرمایا گیا ان سے مخاطب ہو کر آپ نے ارشاد فرمایا :

میں تمہارے بارے میں وہی کہوں گا جو یوسف نے اپنے ان بھائیوں سے کہا تھا جنہوں نے ان پر ظلم کیا تھا۔

لا تثريب عليكم اليوم يغفر الله لكم وهو ارحم الراحمين

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۱ ص ۱۰۹۔

آج تم پر کسی قسم کی کوئی ملامت نہیں ہے خدا تمہیں معاف کر دے کہ وہی ارحم الراحمین ہے[1] (یوسف - ۹۲)

"ولی" یہاں پر دوست کے معنی میں ہے اور "حمیم" دراصل گرم اور جلا دینے والے پانی کو کہتے ہیں، بدن کے پسینے کو "حمیم" اس کی گرمی کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور "حمام" کو بھی اسی لیے حمام کہتے ہیں اور محبت سے معمور اور گرم جوش کو بھی "حمیم" کہا جاتا ہے اور آیت میں بھی یہی معنی مراد ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ خدا فرماتا ہے "کانّہ ولی حمیم" (گویا وہ ایک گرم جوش اور پکا دوست ہے) یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ صحیح معنوں میں دوست نہ بھی ہو تو کم از کم بظاہر ایسا ضرور ہو گا۔

اور چونکہ مخالفین سے اس قسم کا رویہ کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور ایسے مقام تک پہنچنا گہری اخلاقی خود سازی کا مرہون منت ہوتا ہے لہٰذا بعد کی آیت میں دشمنوں سے اس قسم کے رویے اور طریقہ کار کی اخلاقی بنیادوں کو قرآن مختصر اور بامعنی عبارت میں ارشاد فرماتا ہے: اس خصلت کو صابر اور صاحبان استقامت لوگوں کے سوا کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ (وما یلقاھا الا الذین صبروا)[2]

"اور اس عظیم خلق و خصلت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان، تقویٰ اور اخلاق کے عظیم حصے سے بہرہ مند ہیں"۔ (وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم)۔

جی ہاں! انسان کو مدتوں خود سازی کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے غیظ و غضب اور غصے پر قابو پا سکے۔ ایمان اور تقویٰ کے پرتو میں اس کی روح کو اس قدر وسیع اور قوی ہونا چاہیے کہ آسانی کے ساتھ دشمن کی اذیتوں اور تکلیفوں سے متاثر نہ ہو پائے، اور اس کے انتقام کی آگ فوراً نہ بھڑک اٹھے، اس کام کے لیے باعظمت روح اور بہت کشادہ سینے اور دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے پھر کہیں جا کر انسان کمال انسانیت کے اس مرحلے تک پہنچتا ہے کہ برائیوں کا جواب نیکیوں سے دیتا ہے اور راہ خدا اور اپنے مقدس مقاصد تک پہنچنے کے لیے عفو و درگزر کے مراحل سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے اور "برائی کا جواب اچھائی" کے مقام پر جا پہنچتا ہے:

اس مقام پر ایک بار پھر "صبر" کا مسئلہ درپیش ہے کہ جو اعلیٰ اخلاق کے تمام ملکات کی بنیاد ہے[3]

اور چونکہ اس عظیم مقصد تک پہنچنے کے لیے بہت سی رکاوٹیں درپیش ہوتی ہیں اور شیطانی وسوسے بھی مختلف صورتوں میں انسان کے آڑے آتے ہیں لہٰذا زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت میں نمونے کی حیثیت سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: جب بھی اس راہ میں تجھے شیطانی وسوسے درپیش ہوں تو متوجہ رہ اور ان کے سامنے ڈٹ جا، خود کو خدا کے سپرد کر دے اور اس کی مہربانی کے سائے میں پناہ لے کیونکہ وہ سننے والا اور صاحب علم ہے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۱ ص ۱۳۲۔

[2] یلقاھا کی ضمیر خصلت یا ومیت کے معنی میں جو گزشتہ جملے سے ملتی ہے واپس لوٹتی ہے۔

[3] بعض مفسرین نے "وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم" کو ایسے شریف اور معاف کر دینے والے لوگوں کی آخرت میں جزا سمجھا ہے لیکن اگر اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ آیت تو اس عظیم عمل کی اخلاقی بنیادوں کو بیان کر رہی ہے، تو مذکورہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے۔

(و ما ينزغنك من الشيطان نزغ فاستعذ بالله انه هو السميع العليم) [1]

"نزغ" (بروزن "نزد") کا معنیٰ "کسی کام میں فساد کی غرض سے ہاتھ ڈالنا" ہے، اسی لیے شیطانی وسوسوں کو "نزغ" کہا جاتا ہے اور یہ تنبیہ درحقیقت اس لیے ہے کہ ایسے مواقع پر عام طور پر کچھ خیالات ذہن میں اٹھتے ہیں اور بنام نہاد مصلحت اندیش لوگ اس قسم کی ہدایات دیتے ہیں کہ،

"لوگوں کی ڈنڈے کے زور سے ہی اصلاح کی جا سکتی ہے"۔ "خون کے دھبے خون ہی سے دھوئے جا سکتے ہیں"۔ "تیز دانتوں والے بھیڑیوں پر رحم کرنا، بھیڑ بکریوں پر ظلم کرنے کے مترادف ہے"

وغیرہ۔ اس طرح سے وہ "ایسے کو تیسا" کے فارمولے کو ہر جگہ پر عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں اور برائی کا جواب برائی سے دینا چاہتے ہیں۔

لیکن قرآن فرماتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ لوگ ایسے وسوسوں کا شکار ہو جائیں، سوائے خاص اور استثنائی مواقع کے سختی سے کام لینا شروع کر دیں اور اگر کہیں ایسے مشکل مواقع در پیش بھی ہوں تو فوراً خدا کی پناہ طلب کریں اور اسی پر اعتماد کریں کہ وہی سب کی باتوں کو سنتا اور تمام دنیا کی نیتوں سے اچھی طرح آگاہ ہے،

البتہ مندرجہ بالا آیت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور وہ کہہ رہی ہے تمام شیطانی وسوسوں کے مقابلے میں خدا کی پناہ طلب کریں لیکن جو کچھ اوپر بتایا گیا ہے اس کے مصداقوں میں سے یہ ایک روشن مصداق ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **خدا کی طرف بلانے والوں کا مرحلہ وار پروگرام:** مندرجہ بالا چار آیات میں خدا کی طرف دعوت دینے کے سلسلے میں چار طرح کی گفتگو ہوئی ہے گویا اس دعوت کے پروگرام کے چار مرحلے بیان ہوئے ہیں۔

پہلا دعوت دینے والے افراد کے ایمان اور عمل صالح کے لحاظ سے خود سازی کا مرحلہ ہے۔

دوسرا "برائیوں کو نیکیوں سے دور کرنے" کا مرحلہ ہے۔

تیسرا اس طریقہ کار اور روش کو انجام دینے کے لیے اخلاقی مبادیات کے فراہم کرنے کا مرحلہ ہے۔

چوتھا راستے سے رکاوٹوں کے دور کرنے اور شیطانی وسوسوں کا مقابلہ کرنے کا مرحلہ ہے۔

حضرت پیغمبر اسلام اور ائمہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام اس پروگرام کا بہترین نمونہ عمل تھے، اور جہالت سے معمور اور تاریک ماحول میں اسلام کی جلد ترقی اور اس کے فوراً پھیلنے کا اصل راز بھی اسی طرز عمل کو اپنانے میں مضمر ہے۔

آج ماہرین نفسیات نے دوسرے لوگوں پر اثر انداز ہونے کے سلسلے میں کتابیں اور رسالے لکھے ہیں اور لکھ رہے ہیں لیکن مندرجہ بالا آیات کے مقابلے میں کوئی بھی مضمون یا کتاب آنکھوں میں نہیں جچتی، کیونکہ جس طرز عمل کو اپنانے کی وہ ہدایت کرتے ہیں وہ زیادہ تر ظاہر داری، دوسروں کو بے وقوف بنانے بلکہ فریب کی پالیسی پر مبنی ہوتی ہے جب کہ قرآنی روش ان باتوں سے بالاتر ایمان،

---

[1] "نزغ" مندرجہ بالا آیت میں ممکن ہے کہ مصدر کے طور پر یہی معنی رکھتا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ "اسم فاعل" کے معنی میں ہو۔

تقویٰ اور انسانی اصولوں پر مبنی ہے اور کیا ہی بہتر ہو کہ آج مسلمان اس قرآنی روش کا احیاء کریں۔ آج جب کہ اسلام کی زیادہ سے زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے وہ اس طریقہ سے اسے پوری کائنات میں پھیلا دیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہی چیز تفسیر علی بن ابراہیم میں حدیث کی صورت میں بیان ہوئی ہے۔

ادب اللہ نبیہ فقال، ولا تستوی الحسنة ولا السیئة ادفع بالتی ھی احسن قال ادفع سیئة من اساء الیك بحسنتك، حتی یکون الذی بینك وبینه عداوة کانه ولی حمیم

اللہ نے اپنے پیغمبر کو آداب بتائے ہیں اور کہا ہے کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتیں، لہٰذا برائی کو اچھائی کی روش کے ذریعے دور کر یعنی جن لوگوں نے تجھ سے برائی کی ہے ان سے اچھائی کر تاکہ جن لوگوں نے تجھ سے دشمنی کی ہوئی ہے وہ تیرے پکے اور سچے دوست بن جائیں[1]

۲۔ انسان اور وسوسوں کے طوفان: انسان کی سعادت اور رضائے خدا کے حصول کی راہ میں کچھ صعب العبور اور مشکل چوٹیاں بھی موجود ہیں جہاں پر شیطان گھات لگائے بیٹھے ہیں کہ اگر انسان وہاں سے اکیلے عبور کرنا چاہے تو ہرگز نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ خدا کے لطف و کرم کا سہارا لے اور خدا کی آس اور اس کی ذات پر توکل کو ساتھ لے کر ایسے خطرناک راستوں کو عبور کرنا چاہیے۔ طوفان جس قدر شدید ہوتے جائیں خدا کی ذات پر اس کا توکل اور اعتماد بڑھتا جائے اور خدا کے سایہ لطف و کرم میں زیادہ سے زیادہ پناہ لے۔

ایک روایت میں ہے کہ کسی شخص نے پیغمبر اسلامؐ کے سامنے دوسرے شخص کی بدگوئی کی اور غصّے کی آگ اس کے دل میں بھری ہوئی تھی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے سنا تو فرمایا:

انی لاعلم کلمة لو قالها لذهب عنه الغضب، اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر غصّے والا انسان اسے زبان پر لائے تو اس کا غصہ کافور ہو جائے اور وہ ہے "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم"

اس شخص نے عرض کی "امجنوناً ترانی" (آپ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں اور کیا شیطان مجھ میں سما چکا ہے؟) تو آنحضرتؐ نے قرآن سے استناد کرتے ہوئے اس آیت کو تلاوت فرمایا:

و اما ینزغنك من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ

جب شیطانی وسوسے تمھیں گھیر لیں تو خدا کی پناہ حاصل کرو[2]

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ ص ۵۴۹۔

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۴ ص ۱۱۱۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ طوفان غضب شیطانی وسوسوں سے اٹھتے ہیں جیسا کہ خواہشات نفسانی کے طوفان بھی وسوسوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔

کتاب خصال صدوق میں ہے کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی فوائد کے چار سو باب تعلیم فرمائے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

اذا وسوس الشیطان الی احدکم فلیستعذ باللہ ولیقل اٰمنت باللہ مخلصًا لہ الدین

جب بھی تم میں سے کسی کو شیطان وسوسوں میں ڈالنے لگے تو اسے چاہیئے کہ وہ خدا کی پناہ طلب کرے اور کہے میں خدا پر ایمان لایا اور میں نے اپنے دین کو اس کے لیے خالص کیا [1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۵۱۔

۳۷۔ وَمِنۡ اٰيٰتِهِ الَّيۡلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ‌ ؕ لَا تَسۡجُدُوۡا لِلشَّمۡسِ وَلَا لِلۡقَمَرِ وَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ الَّذِىۡ خَلَقَهُنَّ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ ○

۳۸۔ فَاِنِ اسۡتَكۡبَرُوۡا فَالَّذِيۡنَ عِنۡدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوۡنَ لَهٗ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَهُمۡ لَا يَسۡـَٔـمُوۡنَ ○ السجدۃ

۳۹۔ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الۡاَرۡضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ‌ ؕ اِنَّ الَّذِىۡۤ اَحۡيَاهَا لَمُحۡىِ الۡمَوۡتٰى‌ ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ○

ترجمہ

۳۷۔ رات، دن، سورج اور چاند ہیں تو اس کی نشانیوں میں سے ہیں، سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اسی کی عبادت کرو۔

۳۸۔ اگر وہ (پروردگار کی عبادت سے) تکبر کریں تو تمہارے رب کے پاس ایسے لوگ بھی ہیں جو رات دن اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور وہ تھکتے بھی نہیں۔

۳۹۔ اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تو دیکھتا ہے کہ زمین خشک اور خاضع ہے پس جب ہم اس پر پانی بھیجتے ہیں تو وہ حرکت میں آجاتی ہے اور نشو و نما کرتی ہے، جس نے کہ اسے زندہ کیا ہے وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

سجدہ صرف خدا کو کرو

درحقیقت ان آیات سے اس سورہ کے ایک نئے حصے کا آغاز ہو رہا ہے جس میں توحید، معاد، اور نبوت اور قرآن کی عظمت کا بیان ہے اور یہ درحقیقت مشرکین کی تہوں کی طرف دعوت کے مقابلے میں "دعوت الی اللہ" کا ایک روشن مصداق ہے۔

بات توحید کے مسئلہ سے شروع کی گئی ہے اور آفاقی آیات کے ذریعے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: رات، دن سورج اور چاند یہیں تو پروردگار کی نشانیوں میں سے ہیں [1] (ومن اٰیاتہ اللیل والنہار والشمس والقمر)۔

رات آرام وسکون کا ذریعہ اور دن کی روشنی اور چمک دمک تحرک اور فعالیت کا سبب ہوتی ہے۔ یہی دونوں مل کر منظم اور مرتب طریقے سے انسانی زندگی کے پہیے کو چلا رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے لاتعلق ہوتا یا کم از کم ایک دوسرے سے بہت زیادہ طویل ہوتا تو تمام ذی روح فنا ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ کرہ زمین کے جس خطے پر پندرہ دن کے برابر دن یا راتیں ہوتی ہیں وہ کسی بھی مخلوق کے لیے کسی صورت میں بھی قابل سکونت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی سرد اور تاریک راتوں میں سب چیزیں جم جاتی ہیں اور گرم اور جھلس دینے والے دنوں میں ہر چیز جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے انسان جیسی مخلوق کا وہاں پر زندہ رہنا محال ہے۔

لیکن یہ سورج ہمارے نظام شمسی میں تمام مادی برکات کا سرچشمہ ہے۔ روشنی، گرمی، حرکت، تحرک، بارش کا نازل ہونا، نباتات کا اگنا، پھلوں کا پکنا حتیٰ کہ پھولوں کے دلکش اور زیبا رنگ سب سورج کے وجود کے مرہون منت ہیں۔

اسی طرح چاند بھی تاریک راتوں کو روشنی بخشنے کا ذریعہ، بیابانوں میں سفر کرنے والوں اور صحراؤں میں مسافروں کے لیے دلکش اور زیبا چراغ ہے اور اپنے مدوجزر کے ذریعے بے انتہا برکتیں وجود میں لاتا ہے۔

اسی لیے تو کچھ لوگوں نے آسمان کے ان دونوں روشن چراغوں کے سامنے سجدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ درحقیقت انہوں نے عالم اسباب میں مسبب الاسباب کو دیکھے اور اس کی معرفت حاصل کیے بغیر اسباب کی پرستش شروع کر دی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن اس کے ساتھ ہی کہہ رہا ہے: سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اُسے سجدہ کرو جس نے ان کو خلق فرمایا ہے اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہتے ہو۔ (لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن ان کنتم ایاہ تعبدون)۔ [2]

---

[1] توجہ رہے کہ یہ آیات ان آیات میں سے ہیں جن کی تلاوت یا سماعت کے وقت سجدہ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

[2] یہاں پر "خلقھن" میں جمع مؤنث کی ضمیر لیل و نہار اور شمس و قمر کی طرف لوٹ رہی ہے۔ صاحبان ادب اور مفسرین (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تم ان برکتوں کے منبع و مرکز اور سرچشمہ کو تلاش کیوں نہیں کرتے؟ اس کے مقدس آستان پر جبہ سائی کیوں نہیں کرتے؟ کیوں ایسی مخلوق کی عبادت کرتے ہو جو خود قوانینِ آفرنیش کی اسیر ہے؟ ان میں تو طلوع بھی ہے اور غروب بھی، عروج بھی ہے اور زوال بھی اور یہ ہمیشہ تبدیلیوں کا محور چلی آرہی ہیں۔

کسی ایسے کی تلاش کرنی چاہیے جو قوانین کا خالق بھی ہو اور ان پر حاکم بھی، جس میں غروب و زوال نہ ہو اور تغیر و تبدل جس کی ذات کبریائی تک نہ پہنچ سکتے ہوں۔

سورج اور چاند چونکہ عالمِ طبیعت کا حصہ ہیں اس طرح سے شرک اور بت پرستی کے ایک شعبے کی نفی کی جارہی ہے اور انہیں سب کو پیغام دیا جارہا ہے کہ ان مخلوقات کے خالق کا سراغ لگاؤ، معلول پر ہی نہ رک جاؤ بلکہ علت العلل کی تلاش کرو۔

درحقیقت اس آیت میں سورج، چاند، رات اور دن پر جو یکساں نظام حاکم ہے اس کے ذریعے خداوند عالم کی وحدانیت اور یگانگت پر استدلال کیا گیا ہے اور اس کی خالقیت اور حاکمیت کو اس کی عبادت کا لازمہ بتایا گیا ہے۔

"ان کنتم ایاہ تعبدون" کا جملہ درحقیقت اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا کی عبادت کا قصد رکھتے ہو تو اس کے غیر کی عبادت چھوڑ دو اور کسی بھی چیز کو اس کی عبادت میں شریک قرار نہ دو۔ کیونکہ اس کی عبادت کبھی بھی دوسروں کی عبادت کے ساتھ نہیں ملائی جاسکتی۔

پھر قرآن فرماتا ہے کہ اگر یہ منطقی دلیل بھی ان کی افکار و عقول کے لیے مؤثر نہ ہو اور اس کے باوجود وہ بتوں اور مجازی معبودوں کی عبادت میں جُتے رہیں اور معبودِ حقیقی کو فراموش کردیں اور عبادتِ خدا کے بارے میں تکبر کا اظہار کریں، تو تُو ہرگز نہ گھبرا کیونکہ مقرب فرشتے اس کی بارگاہ میں شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور کبھی اس کی عبادت سے نہ تنگ آتے ہیں اور نہ ہی تھکاوٹ کا اظہار کرتے ہیں" (فان استکبروا فالذین عند ربك یسبحون له باللیل و النهار وهم لا یسأمون)۔[1]

اگر جاہل اور نادانوں کا ایک گروہ اس کی پاک ذات کو سجدہ نہیں کرتا تو کیا ہوا، یہ وسیع کائنات مقرب فرشتوں سے معمور ہے جو ہمیشہ رکوع، سجود، حمد اور تسبیح میں مصروف ہیں اور پھر یہ کہ اس پاک ذات کو تو ان فرشتوں کی عبادت کی بھی ضرورت

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ کا) کے بقول، جمع مؤنث عاقل کی ضمیر کبھی غیر جمع عاقل کی طرف بھی لوٹتی ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ ضمیر "آیات" کی طرف لوٹ رہی ہے کہ وہ بھی جمع مؤنث غیر عاقل ہیں۔ اور بعض کا احتمال ہے کہ یہ ضمیر سورج اور چاند کی طرف لوٹ رہی ہے اور وہ بھی ان کی جنس کے لحاظ سے گویا یہ تمام ستاروں کے لیے ہے کہ جن کے بارے میں وہ قائل تھے کہ یہ عقل و شعور رکھتے ہیں۔

[1] "لا یسأمون" "سآمت" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے مسلسل کام کرتے کرتے تھک جانا اور ضمنی طور پر "فان استکبروا" کا جملہ، جملہ شرطیہ ہے جس کی جزا محذوف ہے اور تقدیری طور پر یوں ہے "فان استکبروا من عبادة الله و توحیده لا یضره شیئاً"۔

نہیں بلکہ انہیں اس کی عبادت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس عالم امکان میں جو بھی اعزاز اور کمال ہے سب اس کی عبودیت کے زیر سایہ ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت، آیات سجدہ میں سے ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پہلی آیت کے آغاز "تعبدون" سے واجب ہے یا دونوں آیات کے اختتام "وھم لا یسأمون" پر؟ تو اس سلسلے فقہائے اہلسنت میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات جن میں شافعی اور مالک شامل ہیں نے پہلے قول کو اور بعض کہ جن میں ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل شامل ہیں نے دوسرے کو ترجیح دی ہے، لیکن علماء امامیہ کے مطابق ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے فرامین کی روشنی میں سجدے کا مقام "تعبدون" ہے اور اسی جگہ پر قرآن کا سجدہ واجب ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ واجب صرف سجدہ ہی ہے۔ رہا اس کا ذکر تو وہ مستحب ہے اور روایات کی رو سے سجدے میں یہ کہنا چاہیئے:

لا الٰہ الّا اللّٰہ حقّاً حقّاً، لا الٰہ الّا اللّٰہ ایماناً وتصدیقاً، لا الٰہ الّا اللّٰہ عبودیۃ ورقّاً، سجدت لک یارب تعبداً ورقّاً، لا مستنکفاً ولا مستکبراً بل انا عبد ذلیل خائف مستجیر[1]

ایک بار پھر قرآن توحید پر مشتمل آیات کی طرف لوٹتا ہے جو مسئلہ معاد کا پیش خیمہ ہے۔ اگر پہلی آیت میں سورج، چاند اور آسمانی آیات کے بارے میں گفتگو تھی تو یہاں پر ارضی اور زمینی نشانیوں کا تذکرہ ہے۔

ارشاد فرماتا ہے، اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تم زمین کو خاشع وخشک اور بے حرکت پاتے ہو تو جب ہم اس پر بارش کے حیات بخش قطرے بھیجتے ہیں تو وہ حرکت میں آجاتی ہے اور نشوونما کرنا شروع کر دیتی ہے (ومن اٰیاتہ انک تری الارض خاشعۃ فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت وربت)۔

بے حس وحرکت، خشک اور مردہ زمین کی اور اس کے یہ تمام آثار حیات اور گوناگون جلوے کہاں؟ کونسی قدرت ہے جو بارش کے چند قطرے برسا کر مردہ زمین میں اس قدر تحرک اور زندگی پیدا کر دیتی ہے؟ یہ سب کچھ اس خدا کے بے انتہا علم اور بے پایاں قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے وجود ذیجود کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔

اس واضح ترین توحیدی مسئلے یعنی زندگی کے مسئلے کہ جس کے اسرار اب بھی بہت سے عظیم دانشوروں سے پوشیدہ ہیں، سے خوبصورت طریقے سے گریز کرتے ہوئے معاد کے مسئلے کو بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: بے شک جس ذات نے اس مردہ زمین کو زندہ کیا ہے وہی مردوں کو بھی قیامت کے دن زندہ کرے گی (ان الذی احیاھا لمحی الموتٰی)۔

جی ہاں "وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے" (انہ علیٰ کل شیء قدیر)۔

اس کی قدرت کے دلائل ہر جگہ ظاہر اور اس کی نشانیوں کو ہر سال اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو، پھر معاد میں کیوں شک وشبہ

---

[1] "وسائل الشیعہ" جلد ۴ صفحہ ۸۸۴ (باب ۴۶، (ابواب قرائت القرآن سے دوسری حدیث)

کا اظہار کرتے ہو اور اسے محال سمجھتے ہو؟ کس قدر نادانی، جہالت، غفلت اور بے خبری کا شکار ہو؟

"خاشعة" "خشوع" کے مادہ سے ہے اور دراصل اس انکساری کو کہتے ہیں جس میں ادب کے پہلو کو مدنظر رکھا جائے خشک زمین کے بارے میں ایسی تعبیر کا استعمال دراصل ایک طرح کا کنایہ ہے۔ جی ہاں! جب زمین خشک اور پانی سے محروم ہوتی ہے تو ہر قسم کی نباتات اور پھولوں پھلوں سے عاری ہوتی ہے بالکل ایسے جیسے ایک خاضع و خاشع انسان یا بے جان مردہ ہوتا ہے۔ لیکن جونہی اس پر بارش برسی، تو اس نے بھی نئی زندگی حاصل کرنا شروع کر دی اور اس میں تحرک اور نشوونما شروع ہوگیا۔

"ربت" "ربو" (بروزن غلو) کے مادہ سے ہے جس کا معنی افزائش اور نشوونما ہے۔ اور "ربا" (سود) بھی اسی مادہ سے ہے۔ کیونکہ رباخوار (سودخوار) اپنا قرضہ اصل زر سے افزائش اور اضافے کے ساتھ واپس لیتا ہے۔

"اھتزت" "ھز" (بروزن "حظ") کے مادہ سے ہے جس کا معنی "زبردست حرکت" ہے۔

معاد جسمانی کے اثبات اور نباتات کے ذریعے اس پر استدلال کی تفصیل ہم نے تفسیر نمونہ کی دسویں جلد کے آخر اور سورۂ یٰسین کے اختتام پر درج کی ہے۔

۴۰۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۭ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

۴۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ ۙ

۴۲۔ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝

ترجمہ

۴۰۔ جو لوگ ہماری آیات میں تحریف کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکیں گے۔ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں ڈالا جائے گا یا وہ جو آرام وسکون کے ساتھ بروز قیامت عرصہ محشر میں آئے گا؟ جو کچھ چاہو بجالاؤ، تم جو کچھ بھی انجام دیتے ہو خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

۴۱۔ جو لوگ ذکر (قرآن) کے اپنے پاس آجانے کے بعد اس کے منکر ہو گئے ہیں (وہ بھی ہم سے نہیں چھپ سکیں گے) اور یہ ایک ایسی کتاب ہے جو قطعاً ناقابل شکست ہے۔

۴۲۔ کوئی باطل نہ تو اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے، کیونکہ یہ صاحب حکمت اور قابلِ تعریف خدا کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔

تفسیر

آیات حق کی تحریف کرنے والے

گزشتہ آیات میں پروردگار عالم کی آیات اور نشانیوں کا ذکر تھا اب ان آیات میں ان لوگوں کو متنبہ کیا جارہا ہے جو آیات توحید کی تحریف کرتے ہیں اور لوگوں کو غافل و گمراہ کرتے ہیں، خدا فرماتا ہے : جو لوگ کہ ہماری آیات میں تحریف کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکیں گے (ان الذین یلحدون فی اٰیاتنا لا یخفون علینا) ۔

ہوسکتا ہے وہ لوگوں کو مغالطے میں ڈال دیتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ان بداعمالیوں پر پردہ ڈالتے ہوئے خود کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپا لیتے ہوں لیکن ہم سے تو اپنا ایک تھوڑا سا عمل بھی نہیں چھپا سکتے ہو۔

"یلحدون" "الحاد" کے مادہ سے ہے جو دراصل "لحد" (بروزن "عہد") سے لیا گیا ہے اور "لحد" اس گڑھے کو کہتے ہیں جو قبر کے اندر ایک طرف مردے کو سلانے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ بعدازاں ہر اس کام کو "الحاد" کہا جانے لگا جو میانہ روی سے نکل کر افراط اور تفریط کا شکار ہو جائے۔ "شرک، بت پرستی، کفر اور بے دینی" کو بھی اسی وجہ سے "الحاد" کہا جاتا ہے۔

"آیات الٰہی میں الحاد" سے مراد توحید اور معاد کے دلائل میں وسوسے ڈالنا ہے جو پہلے کی آیات میں "ومن اٰیاتہ" کے عنوان سے بیان ہوا ہے۔ یا پھر تمام آیات مراد ہیں خواہ وہ تکوینی ہوں یا تشریعی جو کہ قرآن مجید اور آسمانی کتابوں میں نازل ہو چکی ہیں۔

یہ آیت موجودہ دور میں دنیا بھر کے اُن مادی اور الحادی مکاتب فکر کے بارے میں بھی ہے جو دنیا کے لوگوں کو توحید اور معاد سے منحرف کرتے رہتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ دین جہالت اور خوف کی پیداوار ہے، کبھی کہتے ہیں کہ اقتصادی عوامل نے دین کو جنم دیا ہے اور کبھی کچھ۔ یہ لوگ مادی عوامل کو دین کی پیدائش کا سبب بتلاتے ہیں۔

قرآن مجید ان تمام چیزوں کو اسی سلسلہ گفتگو میں ایک واضح موازنے کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے : "آیا جو شخص آگ میں ڈالا جائے وہ بہتر ہے یا وہ جو بروز قیامت ایمان کے زیر سایہ نہایت امن و اطمینان کے ساتھ عرصہ محشر میں قدم رکھے گا؟ (افمن یلقٰی فی النار خیر ام من یاتی اٰمنا یوم القیامۃ) ۔

جن لوگوں نے شک اور فساد کی آگ بھڑکا کر لوگوں کے ایمان کو جلا کر خاکستر کر دیا، اس دن انہیں خود کو بھی لقمہ آتش بننا ہوگا اور جن لوگوں نے ایمان کے زیر سایہ عالم بشریت کے لیے امن و امان کا ماحول مہیا کیا ہے انہیں قیامت کے دن بھی انتہائی اطمینان اور سکون کا ماحول میسر ہونا چاہیئے۔ تو کیا اس دن ہمارے اعمال جسمانی صورت اختیار نہیں کریں گے؟

اگرچہ بعض مفسرین نے آیت کے اس حصے کا مصداق ابوجہل اور ان کے مقابل جناب حمزہ اور حضرت عمار یاسر کو قرار دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف اس مصداق کی تطبیق ہی ہے، آیت کا مفہوم وسیع ہے جس میں وہ بھی اور دوسرے افراد بھی شامل ہو

سکتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جہنمیوں کے بارے میں "القاء" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں وہاں پر از خود کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا، جب کہ بہشتیوں کے بارے میں "یأتی" (آنا) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے جو اُن کے احترام، ارادے کی آزادی اور امن وسکون کے انتخاب کی دلیل ہے۔

علاوہ ازیں دوزخ کے مقابلے میں بہشت کو ہونا چاہیئے، جس میں اس عذاب سے امان ہوگی جو کہ دوزخ میں موجود ہوگا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن سب سے اہم مسئلہ ہی امن اور اطمینان وسکون کا ہوگا۔

جب کسی کی ہدایت سے مایوس ہو کر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں جو تمہارا جی چاہے کرو، چنانچہ اسی آیت میں اس سلسلے میں انہیں بھی خطاب کر کے یہی کہا گیا ہے، جو تمہارا جی چاہے کرو (اعملوا ما شئتم)۔

لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ "خدا تمہارے اعمال دیکھ رہا ہے (انه بما تعملون بصیر)۔

ظاہر ہے کہ یہ امر ان کی آزادی عمل یا کسی کام کو ضروری طور پر انجام دینے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ انہیں اس بارے میں تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کے کانوں میں کوئی بھی حق بات مؤثر واقع نہیں ہوتی۔ یہ ایسی بامعنی دھمکی ہے کہ جس میں سزا کا وعدہ بھی ساتھ ساتھ موجود ہے کیونکہ حساب کا محفوظ رکھنا اور اعمال پر نگاہ رکھنا بھی اسی غرض کے لیے ہے۔ بعد کی آیت میں توحید اور معاد کے بجائے موضوع سخن قرآن اور نبوت کو بنایا گیا ہے اور ضدی مزاج اور متعصب کفار کو ایک بار پھر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ اس ذکر اور خدا کی یاد دلانے والی چیز (قرآن مجید) کے اپنے پاس آجانے کے بعد کافر ہو گئے وہ ہم سے چھپ نہیں پائیں گے (ان الذین کفروا بالذکر لما جاء هم)[1]۔

"قرآن" پر "ذکر" کا اطلاق اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہ انسان کو ہر چیز سے پہلے بیدار کرتا اور اسے یاد دلاتا ہے اور جن حقائق کو انسان نے اجمالی طور پر خداداد فطرت کے ذریعے دریافت کیا ہے اس کی مکمل وضاحت اور مفصل تشریح کرتا ہے۔ اس قسم کی تعبیر قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی آچکی ہے۔ جن میں سے ایک سورہ حجر کی نویں آیت ہے، ارشاد ہوتا ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون

ہم نے ہی اس ذکر اور یاد آوری کو نازل کیا ہے اور ہم ہی یقینی طور پر اس کی حفاظت کریں گے۔

---

[1] "ان الذین" کی خبر کیا ہے؟ اس میں مفسرین کی رائے مختلف ہے۔ سب سے زیادہ مناسب یہی نظر آتا ہے کہ کہا جائے کہ "لا یخفون علینا" کا جملہ، پہلی آیت کے قرینے کے مطابق حذف ہو چکا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ گزشتہ آیت سے سمجھا جانے والا جملہ "یلقون فی النار" اس کی خبر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ آئندہ آیات میں ذکر ہونے والا جملہ "اولٰئك ینادون من مکان بعید" کی خبر ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: یقیناً یہ ناقابلِ شکست کتاب ہے (وانہ لکتاب عزیز)۔

یہ ایسی کتاب ہے جس کی مثال لانا کسی کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی اس پر کوئی غالب آسکتا ہے۔ یہ ایک بے نظیر کتاب ہے جس کی منطق پختہ اور واضح ہے، جس کے دلائل ٹھوس اور محکم ہیں، جس کی تعبیریں مربوط اور گہری ہیں، جس کی تعلیمات اصولی اور ثمرآور ہیں اور جس کے احکام و فرامین ہر دور میں انسان کی حقیقی ضروریات سے ہم آہنگ ہیں۔

پھر اس کتاب کی ایک اور واضح صفت اور عظمت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کسی قسم کا باطل، نہ تو اس کتاب کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے (لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ)۔

کیونکہ یہ "خداوند حکیم و حمید کی طرف سے نازل کی گئی ہے" (تنزیل من حکیم حمید)۔

وہ ایسا خدا ہے کہ جس کے تمام افعال حکمت پر مبنی ہیں اور نہایت ہی کمال و درستی کے حامل ہیں اسی لیے وہ تمام حمد و ستائش کا مستحق ہے۔

"لا یأتیہ الباطل ....." کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ جن میں سے زیادہ جامع یہ ہے کہ کسی قسم کا باطل، کسی لحاظ سے اور کسی طریقے سے قرآن کے پاس نہیں بھٹک سکتا۔

نہ تو اس کے مفاہیم میں کوئی تناقض گوئی ہے اور نہ سابقہ علوم اور کتب سے اس کے خلاف کوئی چیز ملتی ہے اور نہ ہی آئندہ کی علمی دریافتیں اس کے برخلاف ہوں گی۔

نہ تو کوئی شخص اس کے حقائق کو باطل کر سکتا ہے اور نہ ہی کبھی منسوخ کر سکتا ہے۔

اس کے معارف، قوانین، نصائح اور خبروں میں نہ اب کوئی تضاد ہے اور نہ ہی آئندہ ظاہر ہوگا۔

کوئی آیت بلکہ کوئی کلمہ نہ اس سے کم ہوا ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس پر اضافہ کی گئی ہے دوسرے لفظوں میں تحریف کرنے والوں کے ہاتھ اس کے بلند دامان تک نہ پہنچ سکے ہیں اور نہ ہی پہنچ پائیں گے۔

درحقیقت یہ آیت سورۂ حجر کی آیت ۹ کی دوسری تعبیر ہے جس میں کہا گیا ہے:

انّا نحن نزلنا الذکر و انّا لہ لحافظون

ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے[1]

---

[1] اسی تفسیر کو اجمالی طور پر زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں اپنایا ہے اور تفسیر المیزان میں بھی علامہ طباطبائیؒ کے اسی طرح کے الفاظ ہیں جبکہ بہت سے مفسرین نے "باطل" کے لفظ کو محدود کر دیا ہے اور اسے "شیطان یا تحریف کرنے والا یا جھوٹ وغیرہ کے معنی میں لیا ہے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں یوں بیان ہوا ہے:

انہ لیس فی اخبارہ عما مضی باطل ولا فی اخبارہ عما یکون فی المستقبل باطل

نہ تو اس کی گزشتہ خبروں میں باطل ہے اور نہ ہی مستقبل کی خبروں میں باطل ہوگا۔ (البیان انہی آیات

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جو ہم کہہ چکے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ "من بین یدیہ ولا من خلفہ" کا جملہ اس کے آفاقی ہونے کے لیے کنایہ ہے یعنی کہیں سے بھی اور کسی طرف سے بھی بطلان اور خرابی اس کے پاس نہیں آئی اور نہ ہی آسکتی ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے اسے "زمانۂ حال" اور "زمانۂ استقبال" کے لیے کنایہ سمجھا ہے جو درحقیقت اس کے پہلے وسیع مفہوم کا ایک مصداق ہے۔

لفظ "باطل" کے بارے میں راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ یہ حق کا نقطۂ مقابل ہے۔ علماء نے کبھی اس کا ایک مصداق بیان کیا ہے جیسے شرک، شیطان، فنا ہونے والی موجودات اور جادوگر اور شجاع اور پہلوان شخص کو اس لیے "بطل" کہتے ہیں کہ وہ اپنے مدمقابل کو باطل کر دیتا ہے۔ یا میدان سے باہر نکال دیتا ہے یا پھر قتل کر دیتا ہے

بہرحال آیت کا ظاہر مطلق ہے اور "باطل" کے مفہوم کو اس کے خاص مصداق میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

آیت کا آخری جملہ "تنزیل من حکیم حمید" درحقیقت اس بات کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ باطل کسی بھی شکل وصورت میں اس تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ باطل تو ان باتوں تک پہنچ پاتا ہے جو کسی انسان سے بیان ہوئی ہوں، جو کسی محدود علم اور معین کمال کے مالک سے بیان ہوئی ہوں لیکن جس کا علم اور حکمت لامحدود ہوں اور خود تمام کمالات کا جامع ہو اور ایسے کمالات اسے حمد وستائش کا مستحق بنا رہے ہوں تو اس کی باتوں میں تناقض، تضاد اور اختلاف کہاں پایا جاسکتا ہے؟ نہ تو اس پر خط نسخ کھینچا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے باطل کیا جا سکتا ہے، نہ تحریف کا ہاتھ اس تک پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی گذشتہ علوم اور کتابوں کے حقائق کے ساتھ اس کا تضاد ہوسکتا ہے اور نہ ہی موجودہ اور آئندہ زمانے میں علمی انکشافات کے ساتھ اس کا تضاد ہوسکتا ہے۔

بہرحال یہ آیت ان واضح آیات میں سے ہے جو قرآن میں ہر قسم کی تحریف اور کمی اور زیادتی کی نفی کرتی ہیں۔ (قرآن مجید میں تحریف نہ ہونے کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۶ سورۂ حجر کی آیت ۹ "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" کے ذیل میں بیان ہوئی ہے اور اس کے مختلف دلائل بیان کیے گئے ہیں اور اس سلسلے میں ہونے والے سوالوں کا جواب بھی دیا گیا ہے)۔

ایک سوال کا جواب

ممکن ہے یہاں پر یہ سوال کیا جائے کہ "باطل" کا معنی "حق کا مخالف" ہے جب کہ آپ نے بھی اور دوسرے مفسرین نے بھی اسے "مبطل" (باطل کرنے والا) کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔

(باقی حاشیہ صفحۂ گزشتہ کا)

کے ذیل میں)۔

تو واضح ہے کہ یہ سب اس آیت کے وسیع مفہوم کا مصداق ہیں۔ (خوب غور کیجئے گا)

ایک ظریف نکتے کی طرف توجہ سے اس کا جواب حاصل کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید یہ نہیں کہتا کہ اس آسمانی کتاب کے بعد باطل وجود میں نہیں آئے گا بلکہ کہتا ہے کہ کوئی باطل اس کے پاس نہیں آئے گا (یاتیہ" میں ضمیر کی طرف توجہ کریں) اور اس قول کا معنی یہ ہے کہ کوئی بھی چیز اس کے پاس آکر اسے باطل نہیں کر سکتی۔ (غور کیجئے گا)۔

۴۳۔ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ۝

۴۴۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّ عَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ۝

۴۵۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝

۴۶۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

ترجمہ

۴۳۔ جو ناروا تہمتیں تجھ پر لگائی جاتی ہیں وہی تجھ سے پہلے پیغمبروں پر لگائی گئی ہیں، تیرا پروردگار بخشش اور دردناک عذاب کا مالک ہے۔

۴۴۔ اور اگر ہم اسے عجمی قرآن بناتے تو وہ یقیناً یہی کہتے کہ اس کی آیات کیوں واضح نہیں ہیں؟ آیا عجمی قرآن، عربی پیغمبر کے لیے درست بات ہے؟ کہہ دے یہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے جو ایمان لے آئے ہیں لیکن جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں

بہرا پن ہے گویا وہ اندھے ہیں اور اسے نہیں دیکھ پاتے۔ وہ ان لوگوں کے مانند ہیں جنہیں دور سے پکارا جاتا ہے۔

۴۵۔ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، پھر اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر اس بارے میں تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی فرمان نازل نہ ہو چکا ہوتا (کہ انہیں مہلت دی جائے تاکہ اتمام حجت ہو جائے) تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ (اور وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہو چکے ہوتے) لیکن وہ ابھی تک تیری کتاب میں شک کرتے ہیں۔

۴۶۔ جو شخص نیک عمل بجا لاتا ہے خود اسی کے لیے فائدہ کے لیے ہے اور جو شخص برائی کرے وہ خود سے برائی کرتا ہے اور آپ کا پروردگار بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا۔

تفسیر

قرآن ہدایت اور شفاء ہے

چونکہ کفار مکہ دین اسلام اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ زبردست مقابلے کا آغاز کر چکے تھے اور گزشتہ آیات میں توحید کے دلائل تھے نیز ان کے الحاد و کفر اور آیات الٰہی کی تکذیب کی خبر تھی۔ لٰہذا زیر تفسیر ان آیات میں سے پہلی آیت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کی خاطر اور ان دوسرے مسلمانوں کو استقامت اور پامردی کا درس دینے کے لیے نازل ہوئی ہے جنہیں دشمن کے زبردست دباؤ کا سامنا ہو۔ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: ناروا نسبتیں جو تیری طرف دی جاتی ہیں وہی تجھ سے پہلے پیغمبروں کی طرف دی جا چکی ہیں (ما یقال لك الا ما قد قیل للرسل من قبلك)۔

اگر آپ کو ساحر کہتے ہیں تو آپ سے پہلے انبیاء کو بھی یہی کچھ کہتے تھے، اگر آپ کو جھوٹا کہتے ہیں تو وہ بھی اس تہمت سے محفوظ نہیں تھے۔ خلاصہ کلام یہ کہ نہ تو آپ کی طرف سے توحید اور دین حق کی طرف دعوت کوئی نئی بات ہے اور نہ ہی ان کی طرف تہمت اور تکذیب۔ لٰہذا آپ استقامت سے اپنے فریضے کو انجام دیجئے اور ان کی باتوں کی ہرگز پرواہ نہ کیجئے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو باتیں آپ کو بتائی جاتی ہیں

دی گئی جو آپ سے پہلے انبیاء کو بتائی گئی تھیں۔[1]

لیکن بعد کے جملے اور آئندہ کی آیات کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے،

پھر آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: بے شک تیرا پروردگار بخشش اور دردناک سزا کا مالک ہے (ان ربك لذو مغفرة و ذو عقاب اليم)۔

رحمت اور بخشش ان لوگوں کے لیے ہے جو قرآن کو تسلیم کرتے ہیں اور دردناک عذاب ان کے لیے ہے جو جھٹلاتے، تہمتیں لگاتے اور مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں اور درحقیقت یہ جملہ مومنین کے لیے خوشخبری اور تشویق ہے اور کافروں کے لیے تنبیہ اور دھمکی ہے۔

"مغفرت" کو "عقاب" پر مقدم کرنے کی وجہ، دوسرے مقامات کی طرح "غضب پر رحمت کی سبقت" پر دلیل ہے۔ جیسا کہ ایک دعا کا جملہ ہے "یامن سبقت رحمته غضبه"[2]

بعد کی آیت میں ان متعصب اور ضدی مزاج لوگوں کے عجیب و غریب بہانوں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے اور وہ یہ کہ وہ کہتے تھے: قرآن عجمی زبان میں کیوں نازل نہیں ہوا تاکہ ہم اسے بیشتر اہمیت دیتے اور غیر عرب بھی اس سے زیادہ استفادہ کرتے؟ لہٰذا ان کا مقصد یہ تھا کہ عوام الناس اس سے کچھ نہ سمجھ سکیں اس طرح سے انہیں یہ کہنے کی بھی ضرورت نہ رہے کہ:

لا تسمعوا لهٰذا القراٰن والغوا فيه (حٰم السجدة - ۲۶)

یہ قرآن نہ سنو اور شور مچا کر اسے بے اثر بنا دو۔[3]

اسی موقع پر قرآن مجید ان کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے: اگر ہم اسے عجمی قرآن بناتے تو وہ یقیناً یہی کہتے کہ اس کی آیات کیوں واضح نہیں ہیں؟ یہ اس قدر پیچیدہ کلام کیوں ہے؟ یہ تو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے (ولو جعلناه قراٰنا اعجميًا لقالوا لولا فصلت اٰياته)۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ قرآن عجمی اور پیغمبر عربی" (ءاعجمی وعربی)۔ یا کہتے "عجمی کتاب اور عربی لوگ!"

---

[1] یہ تفسیر، کتاب "مجمع البیان" اور کتاب تفسیر کبیر فخر رازی" میں ایک احتمال کے طور پر بیان ہوئی ہے جب کہ خود انہوں نے بھی پہلی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

[2] دعا جوشن کبیر فصل ۱۹ جملہ ۸۔

[3] فخر رازی کی تفسیر کبیر میں ہے:

نقلوا فی سبب نزول هذه الاٰية ان الكفار لاجل التعنت قالوا لو نزل القراٰن بلغة العجم

اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ بہانہ جو کفار نے کہا کہ اگر یہ قرآن عجمی زبان میں نازل ہوتا تو بہتر ہوتا۔

اب جبکہ یہ کتاب عربی زبان میں نازل ہو چکی ہے اور سب لوگ اس کے مفاہیم اور مطالب کو اچھی طرح سمجھ بھی سکتے ہیں اور قرآن کی دعوت اور اس کے پیام کی گہرائی تک بھی پہنچ سکتے ہیں پھر بھی وہ زور زور سے کہتے ہیں "اس قرآن کو مت سنو اور شور شرابا برپا کر کے لوگوں کو اس کے سننے سے روک دو۔"

خلاصہ کلام یہ کہ وہ دل کے ایسے بیمار ہیں کہ جو بھی منصوبہ بنایا جاتا اور پروگرام مرتب کیا جاتا اسی پر اعتراض کرتے اور طرح طرح کے بہانے بناتے اگر عربی ہو تو سحر اور جادو کہتے اگر عجمی ہو تو اپنی سمجھ سے بالاتر قرار دیتے اگر عربی اور عجمی زبانوں سے مل کر بنا ہوتا تو اسے غیر موزوں کہتے [1]

یاد رہے کہ "اعجمی" "عجمہ" (بروزن "لقمہ") عدم فصاحت اور گفتگو میں ابہام کے معنی میں ہے۔ اور "عجم" "غیر عرب" کو کہتے ہیں کیونکہ عرب ان کی زبان کو اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ اور "اعجم" اس شخص کو کہتے ہیں جو مطالب کو صحیح معنوں میں ادا نہ کر سکے (خواہ وہ عرب ہو یا غیر عرب)۔

بنا بریں "اعجمی" کا لفظ "اعجم" ہے کہ جس کے ساتھ یاء نسبت ملی ہوئی ہے۔

پھر قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے: کہہ دے کہ یہ آسمانی کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت اور شفاء کا سبب ہے جو ایمان لا چکے ہیں (قل ھو للذین اٰمنوا ھدًی و شفاء)۔

"اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بہرا پن ہے" اور اسے وہ سمجھ نہیں پاتے (والذین لا یؤمنون فی اٰذانھم وقر)۔

"اور نابینا ہونے کی وجہ سے اسے نہیں دیکھتے" (وھو علیھم عمًی)۔ [2]

"یہ بالکل ان لوگوں کی طرح ہیں کہ جنہیں دور سے پکارتے ہیں (اولئک ینادون من مکان بعید)

اور معلوم ہے کہ ایسے لوگ نہ تو سنتے ہیں اور نہ ہی دیکھتے ہیں۔

جی ہاں! راہ ڈھونڈنے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے صرف نور ہی کافی نہیں ہوتا۔ چشم بینا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح تعلیم حاصل کرنے کے لیے صرف صاحب علم اور فصیح مبلغ کا وجود ہی کافی نہیں ہوتا، سننے والے کان بھی اشد ضروری ہیں۔

بارش کے قطروں کی لطافت اور اس کی حیات بخش تاثیر میں ذرہ برابر شک نہیں لیکن

در باغ سبزہ روید و در شورہ زار خس

---

[1] بعض مفسرین نے "ءاعجمی و عربی" کے جملہ کا اسی معنی میں ترجمہ کیا ہے یعنی عجمی اور عربی سے ملا کر اس کی تفسیر کی ہے۔

[2] بعض مفسرین نے مندرجہ بالا جملے کا یوں معنی کیا ہے کہ "قرآن ایسے لوگوں کی عدم بصیرت کا سبب بن جاتا ہے" جب کہ راغب نے مفردات میں اور ابن منظور نے لسان العرب میں "عمی علیہ" کا معنی "اشتبہ حتی صار بالاضافۃ الیہ کالاعمی" یعنی اس پر بات اس قدر مشتبہ ہو جاتی ہے گویا وہ اس سے اندھا ہے۔ بنا بریں صحیح معنی وہی ہے جو ہم نے متن میں بیان کیا ہے۔

باغ میں سبزہ اگتا ہے مگر اور شوروالی زمین خس وخاشاک

جو لوگ حق کی جستجو میں قرآن کے پاس آئے اس سے ہدایت اور شفا پا جاتے، ان کی اخلاقی اور روحانی بیماریوں کا علاج قرآنی شفاخانہ سے ہو جاتا۔ پھر وہ رخت سفر باندھ کر اور قرآنی نور ہدایت کے پرتو میں کوئے دوست کی طرف بڑی تیزی سے چل پڑتے۔

لیکن ضدی مزاج اور ہٹ دھرم متعصب اور حق وحقیقت کے ازلی دشمن جنہوں نے پہلے ہی دن سے انبیاء کی مخالفت پر کمر باندھی ہوئی تھی وہ اس سے کیا فائدہ حاصل کر سکتے تھے؟ وہ تو ایسے اندھوں اور بہروں کے مانند تھے جو ایک دور دراز خطے میں رہتے ہوں۔ اس وجہ سے گویا اُن کے بہرے پن اور اندھے پن میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا تھا۔

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جو شخص کوئی بات سمجھتا ہے اسے اہل لغت " انت تسمع من قریب" کہتے ہیں یعنی تم نزدیک سے سنتے ہو اور جو نہیں سمجھتا اسے کہتے ہیں " انت تنادی من بعید " یعنی تجھے دور سے بلایا جاتا ہے کہ اگر صرف ہمہمہ کو سنتے ہو تو اس کے مطالب کو نہیں سمجھ پاتے ہو[1]

قرآن مجید انسانیت کے جانکاہ درد اور دُکھ کے لیے کس طرح شفا اور دوا ہے؟ اس سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد، سورۂ بنی اسرائیل کی ۸۲ ویں آیت کی تفسیر میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

بعد کی آیت میں پیغمبر اسلام اور اوائل اسلام کے مؤمنین کی تسلی اور دلجمعی کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس سرپھری قوم کی ہٹ دھرمی، انکار اور حیلے بہانوں سے آپ گھبرائیں نہیں یہ ان کا پرانا طریقہ کار ہے "ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب عطا کی" اس میں اختلاف پیدا ہو گیا کچھ نے اسے قبول کیا اور کچھ نے انکار کر دیا" (ولقد اٰتینا موسی الکتاب فاختلف فیه)۔

اگر آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم ان ضدی اور ہٹ دھرم دشمنوں کے عذاب میں جلدی نہیں کرتے تو یہ صرف اس لیے ہے کہ تربیت کی مصلحتوں کا تقاضا یہی ہے کہ وہ آزاد ہوں اور جہاں تک ممکن ہو اتمام حجت ہو جائے، "اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے اس بارے میں کوئی فرمان صادر نہ ہوا ہوتا تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا، اور خدائی عذاب بہت جلد انہیں آلیتا (ولولا کلمة سبقت من ربك لقضی بینهم)۔

یہ خدائی فرمان انسانی ہدایت کی مصلحت اور اتمام حجت کے طور پر تھا۔ یہ طریقہ کار تو سابقہ امتوں میں بھی رہا ہے اور آپ کی امت میں بھی جاری ہے۔

لیکن ابھی تک انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا اور تیرے قرآن میں شک کرتے ہیں اور شک بھی ایسا جس میں بدگمانی شامل ہے" (وانهم لفی شك منه مریب)۔

" مریب" " ریب" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ایسا شک جس میں بدگمانی شامل ہوتی ہے۔ انہیں نہ صرف آپ

---

[1] تفسیر قرطبی اسی آیت کے ذیل میں۔

کی باتوں میں شک ہے بلکہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ان میں مخالف قرائن بھی موجود ہیں جو بدگمانی کا سبب بنتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ آخری جملہ یہودیوں اور موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے بارے میں ہے یعنی اس قوم کو تو اب بھی تورات میں شک وشبہ ہے، لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے لہٰذا بظاہر وہی پہلی تفسیر بہتر ہے[1]

زیر بحث آخری آیت میں قرآن مجید نے انسانی اعمال کے بارے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے مؤمنین قرآن سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بے ایمان لوگ فیض الٰہی کے اس چشمے سے محروم ہیں اور یہ بات قرآن میں بار بار آئی ہے۔ یہی اس بحث کا تتمہ اور تکمیلی حصہ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "جو شخص نیک اعمال بجالائے ان کا فائدہ خود اس کے لیے ہے اور جو شخص برائی کرے وہ بھی اپنے آپ سے برائی کرے گا اور تمہارا پروردگار ہرگز بندوں پر ظلم نہیں کرتا" (من عمل صالحًا فلنفسہ و من اساء فعلیھا و ما ربك بظلام للعبید)۔

بنابریں اگر وہ اس کتاب پر اور اس عظیم دین پر ایمان نہ لائیں تو وہ نہ تو خدا کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی آپ کو کیونکہ اچھائی اور برائی اپنے کرنے والے کی طرف پلٹ جاتی ہے اور وہ لوگ خود ہی اپنے اعمال کا میٹھا یا کڑوا پھل کھائیں گے۔

چند ایک نکات

۱۔ **اختیار اور عدالت:** "و ما ربك بظلام للعبید" مسئلہ اختیار اور ارادے کی آزادی پر ایک روشن دلیل ہے۔ یہ جملہ اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ خداوند عالم نہ تو بغیر وجہ کے کسی کو سزا دیتا ہے اور نہ ہی کسی علت کے بغیر کسی کی سزا میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے سارے کام صرف اور صرف عدالت پر مبنی ہوتے ہیں کیونکہ ظلم وزیادتی کا اصل سبب کسی چیز کا نہ ہونا یا کم ہونا، یا پھر خواہشات نفسانی کی تکمیل ہوتا ہے اور اس کی ذات اقدس ان تمام امور سے منزہ ومبرا ہے۔

یہاں پر اور قرآن کے دوسرے مقامات پر "ظلام" (بہت ظلم کرنے والا) مبالغے کا صیغہ اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو بغیر دلیل کے خدا سزا دے تو یہ بہت بڑے ظلم کا مصداق بن جاتا ہے کیونکہ اس سے قطعاً اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ چونکہ اس کی مخلوق بہت بڑی تعداد میں ہے اگر ہر شخص پر بھی ذرہ بھر ظلم کرے تو بھی "ظلام" کا مصداق پیدا کرے گا۔ (ان دونوں تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں)۔

بہرحال قرآن مجید نے اپنی ان آیات بینات کے ذریعے جبر کے عقیدے کی یکسر نفی کر دی ہے، جو برائی کا سبب،

---

[1] توجہ رہے کہ یہ آیت بعینہٖ سورۂ ہود کی آیت ۱۱۰ کے مانند ہے جو گزر چکی ہے۔

ہر قسم کی خرابی کی تصدیق اور ہر طرح کی ذمہ داری سے پیچھا چھڑانے کا ایک بہانہ ہے۔ ان الفاظ کے ذریعے قرآن مجید نے ہر شخص کو اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور ہر قسم کے عمل کا نتیجہ اس کے بجالانے والے کو بھگتنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت امام رضا علیہ السلام سے آپؑ کے کسی ساتھی نے دریافت کیا:

هل یجبر الله عباده علی المعاصی

آیا خدا بندوں کو گناہ پر مجبور کرتا ہے؟

توامام عالی مقام نے فرمایا:

لا، بل یخیرهم و یمهلهم حتّٰی یتوبوا

نہیں بلکہ انہیں چھوٹ دے دیتا ہے اور مہلت عطا کرتا ہے تاکہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کریں۔

اس نے پھر پوچھا:

هل کلف عباده ما لا یطیقون

کیا بندوں کو اُن کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری دیتا ہے؟

توامامؑ نے فرمایا:

کیف یفعل ذالك وهو یقول "وما ربك بظلام للعبید"

وہ ایسا کیسے کرسکتا ہے جب کہ اس نے کہہ دیا ہے کہ تمہارا رب کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا۔

امامؑ نے سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا میرے والد ماجد موسیٰ بن جعفر اپنے والد جعفر بن محمد سے روایت کرتے ہیں:

من زعم ان الله یجبر عباده علی المعاصی او یکلفهم ما لا یطیقون فلا تأکلوا ذبیحته، ولا تقبلوا شهادته، و لا تصلوا ورائه، و لا تعطوه من الزکٰوة شیئًا

جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ خدا بندوں کو گناہ پر مجبور کرتا ہے یا انہیں ان کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری دیتا ہے تو اس کے ہاتھ سے ذبح شدہ جانور کا گوشت نہ کھاؤ، اس کی گواہی قبول نہ کرو، اس کے پیچھے نماز نہ پڑھو، اسے زکٰوۃ میں سے کچھ نہ دو (یعنی اس پر اسلامی احکام جاری نہ کرو)[1]

مندرجہ بالا حدیث ضمنی طور پر اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ جبر کا عقیدہ "تکلیف مالا یطاق" یعنی طاقت

---

[1] عیون اخبار الرضا، (منقول از نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۵۵۵)۔

سے زیادہ ذمہ داری کا بھی قائل ہے کیونکہ اگر انسان ایک طرف تو گناہ پر مجبور ہو اور دوسری طرف اس گناہ سے روکا جائے تو یہ بات یقیناً تکلیف مالایطاق کا مصداق بنتی ہے۔

۲۔ گناہ اور سلب نعمت : امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

وایم الله ما کان قوم قط فی غض نعمة من عیش فزال عنهم الا بذنوب اجترحوها ، لان الله لیس بظلام للعبید

خدا کی قسم کسی بھی قوم سے نعمتیں اس وقت تک نہیں چھینی گئیں جب تک انہوں نے گناہوں کا ارتکاب نہیں کیا کیونکہ خدا تو اپنے بندوں پر قطعاً ظلم نہیں کرتا۔

پھر فرمایا :

ولوان الناس حین تنزل بهم النقم ، و تزول عنهم النعم ، فزعوا الی ربهم بصدق من نیاتهم ، وولـه من قلوبهم ، لرد علیهم کل شارد واصلح لهم کل فاسد

اگر لوگ بلاؤں کے نازل ہونے اور نعمتوں کے سلب ہونے کے موقع پر صدق دل کے ساتھ اپنے پروردگار کی بارگاہ کا رخ کریں اور خدا کی محبت سے لبریز دل کے ساتھ اس سے مشکل دور ہونے کی درخواست کریں تو اللہ انہیں چھینی ہوئی نعمتیں پلٹا دے اور ان کے ہر قسم کے بگڑے امور کی اصلاح کر دے [1]

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گناہوں کا سلب نعمت کے ساتھ کس حد تک باہمی رابطہ ہے۔

۳۔ اس قدر بہانے کیوں بناتے ہیں ؟ : اس میں شک نہیں کہ عربی زبان دنیا کی تمام زبانوں سے زیادہ بھرپور اور مستغنی زبان ہے اور قرآن کی عظمت اس لیے نہیں کہ وہ عربی زبان میں ہے ، بلکہ یہ عربی میں اس لیے ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی زبان میں مبعوث کیا ہے تاکہ پہلے مرحلے میں وہ قوم ایمان لے آئے اور پھر اس کا دین اسی کے ذریعے وسعت اختیار کر جائے۔

لیکن حیلہ گر اور بہانہ جو افراد بچوں کے مانند ہر روز ایک نئی غیر منطقی بات پیش کیا کرتے تھے اور اپنی ان بچگانہ اور متضاد باتوں سے واضح کرتے تھے کہ انہیں حق کی تلاش نہیں ہے۔ کبھی تو وہ کہتے کہ آخر یہ قرآن عربی زبان ہی میں نازل کیوں ہوا ہے ؟ کیا بہتر نہیں تھا کہ سب یا کچھ قرآن غیر عربی زبان میں بھی نازل ہوتا تاکہ اس سے دوسرے لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ؟ (حالانکہ اس سے ان کا کچھ اور مقصد تھا۔ اور وہ یہ کہ عرب عوام اس کتاب کی انتہائی زیادہ متاثر کرنے والی جاذبیت سے محروم ہو جائیں)۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۸۔

اور اگر ان کی یہ خواہش پوری ہوجاتی تو پھر کہتے کہ یہ کیا تضاد ہے کہ پیغمبر تو عربی اور کتاب غیر عربی؟
ہر روز وہ ان حیلوں بہانوں سے دوسرے لوگوں کو راہ حق سے ردکا کرتے تھے۔
اصولی طور پر" بہانے بنانا" ہمیشہ اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ انسان کو تکلیف تو کچھ اور ہوتی ہے جس کو وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا اور بات کچھ اور کرتا ہے۔ ان لوگوں کو بھی تکلیف یہی تھی کہ عوام الناس تو اس قرآن کی طرف دیوانہ وار کھنچے چلے جارہے ہیں اور ان کے مفادات پر زد پڑ رہی ہے لہٰذا وہ نور اسلام کو بجھانے کے لیے ہر حربے سے کام لینے لگ گئے تھے۔

چوبیسویں پارے کی تفسیر تمام ہوئی۔

۴۷۔ اِلَیۡہِ یُرَدُّ عِلۡمُ السَّاعَۃِ ؕ وَ مَا تَخۡرُجُ مِنۡ ثَمَرٰتٍ مِّنۡ اَکۡمَامِہَا وَ مَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِہٖ ؕ وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ اَیۡنَ شُرَکَآءِیۡ ۙ قَالُوۡۤا اٰذَنّٰکَ ۙ مَا مِنَّا مِنۡ شَہِیۡدٍ ﴿ۚ﴾

۴۸۔ وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَ ظَنُّوۡا مَا لَہُمۡ مِّنۡ مَّحِیۡصٍ ﴿﴾

ترجمہ

۴۷۔ **قیامت** (اور اس کے واقع ہونے کے لمحے) کے راز صرف خدا جانتا ہے، کوئی پھل اپنے چھلکے سے باہر نہیں نکلتا، کوئی مؤنث حاملہ نہیں ہوتی اور کوئی وضع حمل نہیں کرتی مگر اسی کے علم کے ساتھ اور جس دن ان لوگوں کو پکارے گا کہ کہاں ہیں وہ شریک جو تم میرے لیے بناتے تھے تو وہ کہیں گے (پروردگارا!) ہم نے عرض کیا ہے کہ اپنی باتوں کا ہمارے پاس کوئی گواہ نہیں ہے۔

۴۸۔ اور جن معبودوں کو وہ اس سے پہلے بلایا کرتے تھے وہ محو اور گم ہو جائیں گے اور وہ جان لیں گے کہ ان کی کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

تفسیر

سب راز اسی کے پاس ہیں

گزشتہ آخری آیت میں یہ بات ہو رہی تھی کہ نیک اور بد اعمال کی بازگشت ان کے انجام دینے والوں کی طرف ہوتی ہے اور ضمنی طور پر روز قیامت کی جزا اور سزا کے بارے میں اشارہ تھا۔

اب یہاں پر مشرکین کی طرف سے کیے گئے اس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ جس قیامت کے بارے میں تم کہتے ہو وہ کب آئے گی ؟

قرآن مجید ان آیات میں پہلے تو ان کے اس سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ قیامت کے زمانے سے آگاہی خدا ہی کے ساتھ خاص ہے اور "اس کا علم صرف خدا کی طرف لوٹ جاتا ہے" (الیہ یرد علم الساعۃ)۔

اس سے نہ تو کوئی نبی مرسل آگاہ ہے اور نہ ہی ملک مقرب اور انہیں آگاہ ہونا بھی نہیں چاہیئے تاکہ سب لوگ ہر لمحے اس کے واقع ہونے کو ممکن سمجھیں اور اس انتظار کا ایک خاص اثر تمام مکلفین کے درمیان محفوظ رہے۔

پھر فرمایا گیا ہے کہ صرف قیام قیامت کے زمانے کا علم ہی خدا کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس کائنات اور موجودات عالم کے ظاہری اور باطنی رازوں کا علم بھی اسی کے پاس ہے "کوئی پھل اپنے چھلکے سے باہر نہیں نکلتا، کوئی عورت یا مادہ جانور حاملہ نہیں ہوتی اور وضع حمل نہیں کرتی مگر خدا کے علم اور اس کی آگاہی کے ساتھ" (وما تخرج من ثمرات من اکمامھا وما تحمل من انثٰی ولا تضع الا بعلمہ)۔[1]

نباتات، حیوانات کی دنیا اور عالم انسانیت میں جو نطفہ بھی منعقد ہوتا ہے اور ثمر آور ہو کر متولد ہوتا ہے خداوند عالم کے فرمان اور اس کے علم و حکمت کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

"اکمام" "کِم" (بروزن "جن") کی جمع ہے جس کا معنی وہ چھلکا ہوتا ہے جو پھل کو چھپائے ہوئے ہوتا ہے اور "کُم" (بروزن "قُم") اس آستین کو کہتے ہیں جو ہاتھ کو چھپائے ہوتی ہے اور "کمہ" (بروزن "قبہ") اس ٹوپی کو کہتے ہیں جو سر کو ڈھانپے ہوتی ہے۔[2]

طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں کہ جب انسان اپنے آپ کو لباس میں ڈھانپ لیتا ہے تو اس وقت کہتے ہیں۔ "تکمم الرجل فی ثوبہ"۔

فخر رازی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ "اکمام" اس چھلکے کو کہتے ہیں جو پھلوں کے اُوپر ہوتا ہے۔

---

[1] "من ثمرات"، "من انثٰی" اور "من شھید" میں "من" زائدہ اور تاکید کے لیے آیا ہے۔

[2] مفردات راغب۔

بعض مفسرین نے اسے " وعاء الثمرۃ " (میوے کا برتن) سے بھی تفسیر کیا ہے [1]
ظاہر یہ ہے کہ یہ سب تفسیریں ایک ہی معنی کی طرف پلٹ جاتی ہیں، کیونکہ اس کائنات میں سب سے ظریف اور اہم ترین مسائل میں سے نطفے کا رحم میں انعقاد اور اس کا تولد ہے۔ قرآن پاک نے بھی خاص کر اسی چیز پر زور دیا ہے خواہ یہ حیوانات میں ہو یا نباتات میں۔
جی ہاں! یہ خدا ہی ہے جو جانتا ہے کہ کونسا نطفہ، کس رحم میں کب منعقد ہوگا اور کب متولد ہوگا؟ کونسل پھل بار آور ہوگا اور کب اپنے چھلکے سے باہر سر نکالے گا؟
پھر فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ جو قیامت کا انکار کرتے ہیں یا اس کا مذاق اڑاتے ہیں "جس دن کہ قیامت برپا ہوگی انہیں خدا پکار کر کہے گا کہ کہاں ہیں وہ شریک جو تم میرے لیے قرار دیتے تھے؟ تو وہ کہیں گے، خداوندا! ہم نے عرض کر دیا ہے کہ ہم اپنی باتوں پر کوئی گواہ نہیں رکھتے" (و یوم ینادیھم این شرکائی قالوا اٰذنٰک ما منا من شھید) [2،3]
ہم جو کچھ کہتے تھے وہ سب بے اساس اور بے بنیاد باتیں تھیں۔ ایسی باتیں تھیں جو جہالت، لاعلمی اور اندھی تقلید کا نتیجہ تھیں۔ آج ہمیں اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ یہ سب باطل اور بے بنیاد دعوے تھے۔
اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ اس سے پہلے وہ جن معبودوں کو پکارا کرتے تھے آج ان میں سے کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا "سب مٹ گئے اور نیست و نابود ہو گئے ہیں" (وضل عنھم ما کانوا یدعون من قبل)۔
اصولی طور پر قیامت کا منظر ان کے لیے اس حد تک وحشتناک ہوگا کہ بتوں کی یادگاریں ان کی نگاہوں اور ذہنوں سے مٹ جائیں گی، وہی معبود کہ ایک دن وہ جن کے آستان پر اپنا سر جھکایا کرتے تھے، جن کے لیے قربانی کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ اگر ضرورت پڑ جاتی تو ان کی راہ میں اپنی جان تک کی بازی بھی لگا دیا کرتے تھے اور اپنی مشکلات و مصائب کے دنوں کے لیے انہیں اپنی جائے پناہ اور حلال مشکلات جانتے تھے وہ سب کے سب سراب کے مانند نیست و نابود ہو جائیں گے۔
جی ہاں! "اس دن انہیں معلوم ہوگا کہ کوئی جائے پناہ اور راہ فرار ان کے لیے موجود نہیں ہے" (وظنوا مالھم من محیص)۔

---

[1] تفسیر المیزان اور تفسیر مراغی۔
[2] "اذناک" "ایذان" کے مادہ سے ہے جس کا معنی اعلان ہے اور "و یوم ینادیھم" کا جملہ ایک محذوف سے متعلق ہے جو تقدیراً یوں ہے اذکر یوم ینادیھم ---- ہے
[3] اس جملے کی تفسیر میں ایک اور احتمال کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ہمارے درمیان میں سے کوئی بھی آج تیرے شریک کے وجود کی گواہی نہیں دیتا اور وہ سب اس چیز کا انکار کریں گے۔

"محیص" "حیص" (بر وزن "حیف") کے مادہ سے ہے جس کا معنی، لوٹنا، روگردانی کرنا اور کسی چیز سے علیحدہ ہو جانا ہے اور چونکہ "محیص" اسمِ مکان ہے لہٰذا یہ کلمہ جائے فرار در جائے پناہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ [1]

"ظنوا" "ظن" کے مادہ سے ہے جس کا لغوی طور پر دسیع معنی ہے۔ کبھی یقین کے لیے اور کبھی گمان کے معنی میں آتا ہے اور زیر نظر آیت میں یقین کے معنی میں ہے کیونکہ وہ اس دن یقین پیدا کریں گے کہ عذاب الٰہی سے نہ تو کوئی فرار کا راستہ ہے اور نہ ہی کوئی راہ نجات ہے۔

"راغب" "مفردات" میں کہتے ہیں کہ "ظن" اس عقیدے اور نظریے کو کہتے ہیں جو دلیل اور قرینے سے حاصل ہو۔ یہ عقیدہ کبھی تو قوی ہو کر یقین کے مرحلے تک جا پہنچتا ہے اور کبھی کمزور ہو کر گمان سے آگے نہیں بڑھتا۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۶ صفحہ ۵، پر یہ کلمہ "محص" کے مادہ کے طور پر ذکر ہوا ہے جس کی اصلاح ہونی چاہیے۔

۴۹۔ لَا يَسْأَمُ الْإِنسَانُ مِن دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِن مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ ○

۵۰۔ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِن بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ هَٰذَا لِي وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِندَهُ لَلْحُسْنَىٰ ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ○

۵۱۔ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ ۚ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ ○

۵۲۔ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن كَانَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُم بِهِ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ○

ترجمہ

۴۹۔ انسان کبھی بھی نیکی (اور نعمت) کی دعا سے نہیں تھکتا، اور جب کسی برائی سے دوچار ہوتا ہے تو مایوس اور نا اُمید ہو جاتا ہے۔

۵۰۔ اور جب ہم اسے کسی مصیبت کے بعد اپنی رحمت (کا لطف) چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میری لیاقت اور استحقاق کی بنا پر تھا اور میرا گمان نہیں ہے کہ قیامت برپا ہوگی (اور بالفرض قیامت ہو بھی تو) جس دن میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جاؤں گا تو اس

کے نزدیک میرے لیے اچھی جزا ہے لیکن کافروں نے جو اعمال انجام دیئے ہیں ہم انہیں (بہت جلد) آگاہ کردیں گے اور انہیں عذاب شدید چکھائیں گے۔

۵۱۔ اور جب ہم کسی انسان کو کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور تکبر کی حالت میں حق سے دور ہوجاتا ہے۔ لیکن جب بھی اسے تھوڑی سی تکلیف پہنچے تو (اس کے دور ہونے کے لیے) لمبی چوڑی دعائیں مانگتا ہے۔

۵۲۔ کہہ دے: مجھے بتاؤ، اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار کرو تو اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو دور کی مخالفت اور گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔

تفسیر

یہ کم ظرف انسان

گزشتہ آیات میں مشرکین اور ان کے انجام کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی اسی مناسبت سے زیر نظر آیات میں ضعیف الایمان بلکہ بے ایمان لوگوں کی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو بڑی وضاحت کے ساتھ ان کوتاہ اندیش اور کم ظرف افراد کی صورت حال کو مجسم کرکے پیش کر رہی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: انسان کبھی بھی نیکیوں، مال و دولت اور زندگی کی نعمتیں مانگنے سے نہیں تھکتا (لایسئم الانسان من دعاء الخیر)۔

اس کی حرص و ہوس کا تنور ہمیشہ گرم ہی رہتا ہے۔ اسے جتنا بھی مل جائے پھر کہتا ہے ھل من مزید اسے جس قدر بھی دے دیا جائے پھر بھی سیر ہونے کو نہیں آتا۔

"لیکن اگر دنیا اس سے منہ موڑ لے، اس کی نعمتیں زائل ہوجائیں، سختی، تنگدستی اور فقر و فاقہ اسے دامن گیر ہوجائے تو وہ بالکل مایوس اور نا امید ہوجاتا ہے" (وان مسه الشر فیئوس قنوط)۔

یہاں پر انسان سے مراد غیر تربیت یافتہ انسان ہیں جن کا دل معرفت الٰہی، خدا پر ایمان اور قیامت کے لیے جوابدہی کے احساس کے نور سے منور نہیں ہوا۔ ایسے انسان مراد ہیں جو کائنات کے بارے میں غلط سوچ کے تحت اس مادی دنیا کے چکروں میں پھنس گئے ہیں، ان کے پاس ایسی بلند روح نہیں ہے جو اس مادی دنیا کے ماوراء کو بھی دیکھ

سکے اور اعلیٰ انسانی اقدار کو پرکھ سکے۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب دنیا اپنی نعمتیں لے کر ان کے پاس آتی ہے تو وہ اس سے خوش وخرم، مسرور اور مغرور ہو جاتے ہیں اور جب دنیا منہ موڑ کر ان سے رخصت ہو جائے تو سخت غمگین اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ نہ تو ان کے پاس کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو انہیں پناہ دے اور نہ ہی کوئی ایسا روشن چراغ اُن کے پاس ہوتا ہے جو ان کے دلوں کو نورِ امید سے منور کر سکے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ لفظ "دعاء" کبھی تو بلانے اور پکارنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی کسی چیز کے طلب کرنے کے معنی میں اور زیر نظر آیت میں دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "لا یسئم الانسان من دعاء الخیر" کا معنی یہ ہوگا کہ انسان نیکیوں اور اچھائیوں کے مانگنے سے کبھی نہ ملول ہوتا ہے اور نہ ہی تھکنے میں آتا ہے،

آیا "یئوس" اور "قنوط" کا ایک ہی معنی ہے؟ یعنی "ناامید انسان" یا دو مختلف معانی ہیں؟ نیز ان کا آپس میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ دونوں کا ایک ہی معنی ہے (اور یہ تاکید کے لیے ہے) [1]

بعض کہتے ہیں کہ "یئوس" "یأس" کے مادہ سے ہے جس کا معنی دل کی اندرونی ناامیدی ہے اور "قنوط" کا معنی اس ناامیدی کا چہرے اور عمل سے اظہار ہے [2]

مرحوم طبرسیؒ نے تفسیر مجمع البیان میں ان دونوں کے درمیان موجود فرق کو یوں بیان کیا ہے کہ "یأس" خیر اور اچھائی سے ناامیدی ہے اور "قنوط" رحمت سے ناامیدی ہے [3]

لیکن قرآن مجید میں "یأس" اور "قنوط" کے استعمال سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ تقریباً ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان میں ہے کہ جناب یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو رحمت الٰہی سے مایوس ہونے سے روکا ہے جب کہ وہ یوسف کے بارے میں دلی طور پر مایوس ہو چکے تھے اور اس مایوسی کا اظہار بھی انہوں نے کر دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو سورۂ یوسف آیت ۸۷)

اور "قنوط" کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرزند کی بشارت کے سلسلے میں ہے کہ انھوں نے اس بارے میں تعجب ظاہر کیا لیکن فرشتوں نے ان سے کہا :

بشرناك بالحق فلا تكن من القانطين

ہم نے آپ کو حق وسچ پر مبنی خوشخبری دی ہے لہٰذا آپ مایوس نہ ہوں۔ (حجر/۵۵)

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۷ ص ۴۲۶ (اسی آیت کے ذیل میں)۔

[2] تفسیر کبیر جلد ۲۷ ص ۱۳۷ اور تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ ص ۴۔

[3] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص ۱۸۔

بعد کی آیت میں علم و ایمان سے دور انسان کی ناپسندیدہ حالت یعنی اس کے غرور اور خود پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب ہم کسی انسان کو اپنی طرف سے رحمت کا لطف چکھاتے ہیں جبکہ اس سے پہلے تکلیف پہنچ چکی ہوئی ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ میری اپنی لیاقت اور استحقاق کی وجہ سے ہے (ولئن اذقناہ رحمۃ منا من بعد ضراء مستہ لیقولن ھٰذا لی)[1]

یہ مغرور بےچارہ اس بات کو بھول چکا ہوتا ہے کہ اگر لطف خداوندی شامل حال نہ ہو تو اس نعمت کے بجائے مصائب میں گرفتار ہو جائے۔ اس کی کیفیت مغرور قارون کی سی ہے کہ جب خدا نے امتحان کی غرض سے اسے دولت سے مالا مال کر دیا اور اسے کہا گیا کہ جب خدا نے تمہیں فراواں دولت عطا کی ہے تو تو بھی لوگوں کے ساتھ نیکی کیا کر، تو اس نے کہا نہ نہ، یہ سب کچھ میرے علم اور ذاتی لیاقت کی وجہ سے ہے "قال انما اوتیتہ علی علم عندی" (قصص/۷۸)

اسی آیت میں ہے کہ آخر کار یہ غرور اسے آخرت کے انکار تک پہنچا دیتا ہے اور وہ کہتا ہے "مجھے یقین نہیں ہے کہ قیامت بھی قائم ہوگی" (وما اظن الساعۃ قائمۃ)۔

"بالفرض اگر قیامت ہو بھی تو جب میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جاؤں گا تو میرے لیے وہاں اچھی جزا اور بہت سی نعمتیں آمادہ ہیں" جس خدا نے مجھے اس دنیا میں اس قدر عزت عطا فرمائی ہے آخرت میں تو یقیناً اس سے بہتر خاطر تواضع کرے گا (ولئن رجعت الی ربی ان لی عندہ للحسنٰی)۔

اسی طرح کا ایک مفہوم سورۂ کہف میں بھی بیان ہوا جہاں پر ان دو دوستوں کی داستان بیان کی گئی ہے جن میں سے ایک دولت مند تھا اور کفر و غرور کی راہ اپنائے ہوئے تھا جب کہ دوسرا راہِ ایمان پر گامزن تھا، قرآن مجید اس دولت مند مغرور کی بات یوں بیان کرتا ہے:

ما اظن ان تبید ھٰذہ ابداً۔ وما اظن الساعۃ قائمۃ ولئن رددت الی ربی لاجدن خیراً منھا منقلبًا

میں ہرگز گمان نہیں کرتا کہ قیامت برپا ہوگی اور اگر قیامت آ بھی جائے تو بھی میں اپنے پروردگار کی طرف جاؤں گا اور اس سے بہتر اور اعلیٰ مقام و منزلت پاؤں گا۔

(کہف / ۳۵-۳۶)

لیکن خداوند عالم ان مغرور اور سرکش افراد کو آیت کے آخر میں یوں تنبیہ کرتا ہے کہ "ہم بہت جلد کافروں کو

---

[1] بعض مفسرین کے بقول "ھٰذا لی" کا معنی ہے "یہ نعمت میرے لیے ہمیشہ کے واسطے ہے" درحقیقت یہ معنی دوام اور ہمیشگی کا پتہ دیتا ہے، لیکن جو تفسیر ہم نے اوپر بتائی ہے وہ زیادہ مناسب ہے ہر چند کہ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، اور دونوں کو جمع کیا جا سکتا ہے کہ ایک تو اپنے آپ کو نعمت کا اہل سمجھتا ہے دوسرے اسے دائمی سمجھتا ہے۔

ان کے ان اعمال سے آگاہ کریں گے کہ جو وہ انجام دے چکے ہیں اور انہیں سخت عذاب چکھائیں گے (فلننبئن الذین کفروا بما عملوا ولنذیقنھم من عذاب غلیظ)۔[1]

یہی چیز قرآن مجید کے ایک اور موقع پر بھی ایک اور تعبیر سے آئی ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے۔

ولئن اذقناہ نعماء بعد ضراء مستہ لیقولن ذھب السیئات عنی انہ لفرح فخور

ہم جب بھی انسان کو مصیبت اور سختی کے بعد کسی نعمت کا لطف چکھاتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ مصائب اور مشکلات مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو چکی ہیں اور پھر لوٹ کر نہیں آئیں گی پھر وہ خوشی، غفلت، تکبر اور غرور میں بدمست ہو جاتا ہے۔ (ھود/۱۰)

بعد کی آیت میں اس قسم کے انسانوں کی اس حالت کو بیان کیا جا رہا ہے جو مادی دنیا کے آنے اور چلے جانے کے موقع پر ان پر طاری ہوتی ہے یعنی نعمتوں کے حصول کے وقت فراموشی اور مصیبت کے وقت آہ وزاری۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: جب ہم انسان کو کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور حق سے دور ہو جاتا ہے (واذا انعمنا علی الانسان اعرض ونا بجانبہ)۔

"لیکن جونہی اسے تھوڑی سی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے دور ہونے کے لیے لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے" (و اذا مسہ الشر فذو دعاء عریض)۔

"نا" "نأی" (بروزن "رأی") کے مادہ سے ہے جس کا معنی دور ہونا ہے اور جب اس کے بعد "جنب" (پہلو) کا لفظ آجائے تو وہ تکبر اور غرور کے لیے کنایہ ہوتا ہے کیونکہ متکبر آدمی اپنا منہ موڑ کر بڑی بے پروائی کے ساتھ دور ہو جاتے ہیں۔

"عریض" چوڑے کے معنی میں ہے جو کہ "طویل" لمبے کے مقابلہ میں ہے اور عرب ان دونوں تعبیروں کو کثرت اور زیادہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

اسی سے ملتی جلتی آیت سورۂ یونس میں بھی موجود ہے۔

واذا مس الانسان الضر دعانا لجنبہ او قاعدًا او قائمًا فلما کشفنا عنہ ضرہ مر کان لم یدعنا الی ضر مسہ کذالک زین للمسرفین ما کانوا یعملون

جب کبھی انسان کو تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے تو ہمیں ہر حالت میں پکارتا ہے خواہ پہلو کے بل لیٹا ہو یا سویا ہوا ہو یا بیٹھا ہوا ہو یا کھڑا ہوا۔ لیکن جونہی ہم اس سے یہ تکلیف دور

---

[1] "عذاب غلیظ" کا معنی سخت اور متواتر عذاب ہے۔

کر دیتے ہیں تو ایسے گزر جاتا ہے گویا اس نے ہمیں مشکل کے حل کرنے کے لیے پکارا ہی نہیں۔ اسراف کرنے والوں کے اعمال کو اسی طرح زینت دی جا چکی ہے۔ (یونس / ۱۲)

جی ہاں! ایمان اور تقویٰ سے خالی انسان کی یہی حالت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی حالتوں سے دوچار رہتا ہے۔ جب اسے نعمتیں مل جائیں تو اس وقت وہ حریص مغرور اور بھول جانے والا بن جاتا ہے اور جب نعمتیں منہ موڑ کر چلی جائیں تو مایوس اور ناامید ہو کر واویلا شروع کر دیتا ہے۔

لیکن اس کے مقابلے میں ایسے مردان حق اور مکتب انبیاء کے سچے پیروکار بھی ہیں جو اس قدر وسیع ظرف اور بلند حوصلوں کے مالک ہیں کہ نہ تو نعمتوں کا حصول انہیں آپے سے باہر کر دیتا ہے اور نہ ہی دنیا کے منہ پھیر لینے سے وہ بے حوصلہ ہو کر مایوس ہو جاتے ہیں اور "رجال لا تلهيهم تجارة و لا بيع عن ذكر الله (نور ۳۷)" کے مصداق انہیں نہ تو نفع بخش تجارت یاد خدا سے غافل کر سکتی ہے اور نہ ہی سودمند کاروبار۔ وہ زندگی کی تلخی اور شیرینی کے فلسفے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تلخیاں خطرے کی گھنٹی بن کر ہوشیار اور بیدار کر رہی ہیں اور شیرینیاں خدا کی آزمائش اور امتحان کا سبب ہیں۔

کبھی یہ تلخیاں بندوں کی غفلت کی سزا ہوتی ہیں اور نعمتیں ان کی شکرگزاری کا احساس پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔

یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ آیات بالا میں "اذقنا" اور "مسّه" کی تعبیریں آئی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی تھوڑی سی توجہ یا نعمتوں کے ذرا سے زوال سے ان کم ظرف لوگوں کی حالت تبدیل ہو جاتی ہے اور فوراً ہی غرور و تکبر یا مایوسی اور ناامیدی کی راہوں پر چل پڑتے ہیں اور اس حد تک کوتاہ اندیش اور کوتاہ فکر ہیں کہ مشہور مثال کے مطابق "ایک انگور سے کھٹے اور ایک میوے سے میٹھے ہو جاتے ہیں"۔

جی ہاں! خدا کی ذات پر ایمان کی ایک اہم ترین نشانی روح کی وسعت، افق فکر کی بلندی، سینے کی کشادگی، مشکلات و مصائب سے مقابلے کی تاب ہے اور نعمتوں کے موقع پر آپے سے باہر نہ ہو جانا ہے۔

حضرت امیرالمؤمنین علی علیہ السلام دوستوں کو سبق دیتے وقت ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں:

نسئل الله سبحانه ان يجعلنا و اياكم ممن لا تبطره نعمة، و لا تقصر به عن طاعة ربه غاية، و لا تحل به بعد الموت ندامة و كئابة

ہمارا خدا سے یہی سوال ہے کہ وہ ہمیں اور تمہیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے کہ نعمتیں جنہیں مست اور مغرور نہیں کرتیں اور کوئی بھی مقصد انہیں پروردگار عالم کی اطاعت سے باز نہیں رکھتا اور موت آنے پر انہیں کوئی ندامت اور پشیمانی لاحق نہیں ہوتی۔

(نہج البلاغہ خطبہ ۶۴)

زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت میں خود ان متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں کے بارے میں گفتگو کی

گئی ہے اور "دفع ضرر" کے مشہور اصول کی روشن اور واضح انداز میں وضاحت اور تشریح کی گئی ہے، پیغمبر اسلامؐ سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے "ان سے کہہ دے مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن خداوند واحد و یکتا کی طرف سے ہو (حساب و کتاب، سزا و جزا اور جنت و جہنم بھی ہو) اور تم کافر ہو جاؤ تو اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو دور کی مخالفت اور گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔

(قل ارءيتم ان كان من عند الله ثم كفرتم به من اضل ممن هو فى شقاق بعيد)[1]

البتہ یہ گفتگو ان لوگوں کے بارے میں ہے جن پر کوئی منطقی دلیل کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہ انداز گفتگو ان ہی ہٹ دھرم، متعصب اور مغرور لوگوں کے بارے میں اپنایا جاتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ:

> اگر تم قرآن، توحید اور مرنے کے بعد کی دنیا کی حقانیت کو سو فیصدی تسلیم نہیں کرتے تو اس کی نفی پر بھی یقیناً تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ لہٰذا یہ احتمال ابھی باقی ہے کہ قرآنی دعوت اور معاد کے مسئلے میں حقیقت صداقت ہو، تو ایسی صورت میں ذرا سوچو کہ تمہارا کیسا ہی تاریک اور وحشت ناک انجام ہوگا اور اس مکتب الٰہی کا مقابلہ اور مخالفت کر کے اور گمراہی کی راہ اختیار کر کے تم کیسے خطر ناک انجام سے دوچار ہو سکتے ہو۔

یہ وہی انداز گفتگو ہے جو ائمہ اطہار علیہم السلام متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں کے مقابلے میں اپناتے تھے چنانچہ کتاب کافی میں ایک روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے زمانے کے مشہور مادہ پرست اور ملحد ابن ابی العوجاء کے ساتھ کافی بحث و مباحثہ کیا اور آخری مرتبہ جب وہ موسم حج میں آپؑ کی ملاقات کے لیے آیا تو امامؑ کے ایک ساتھی نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی العوجاء مسلمان ہو چکا ہے۔ امامؑ نے ارشاد فرمایا وہ اس سے کہیں زیادہ دل کا اندھا ہے۔ یعنی ہرگز مسلمان نہیں ہوگا۔ جونہی اس کی نگاہ امامؑ پر پڑی تو بولا "اے میرے سید و سردار!"

امام نے ارشاد فرمایا:

> ما جاء بك الى هذا الموضع
>
> یہاں کیا کرنے آئے ہو؟

اس نے عرض کی۔

> عادة الجسد وسنة البلد، ولننظر ما الناس فيه من الجنون والحلق ورمى الحجارة.
>
> اس لیے کہ ہمارے جسم عادی ہو چکے ہیں علاقے کا رواج بھی ہے، پھر یہ بھی کہ لوگوں کی جنون آمیز حرکات، سر مونڈنے اور پتھر مارنے کے واقعات کو بھی دیکھوں۔

---

[1] "ارءيتم" کی عام طور پر "اخبرونی" کے معنی میں تفسیر کی جاتی ہے (یعنی مجھے بتاؤ) اور اس سلسلے میں ہم نے تفصیل سے تفسیر نمونہ کی پانچویں جلد میں سورۂ انعام کی آیت ۴۶ کے ذیل میں گفتگو کی ہے۔

امام ؑ نے فرمایا :

انت بعد علی عتوك وضلالك، یا عبد الکریم

اے عبدالکریم (کریم کے بندے!) تم ابھی تک اپنی سرکشی اور گمراہی پر ڈٹے ہوئے ہو ؟[1]

وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ امامؑ نے فرمایا :

لا جدال فی الحج

حج میں جدال و مجادلہ نہیں ہوتا۔

یہ کہہ کر اپنی عبا اس کے ہاتھوں سے چھڑائی اور یہ جملہ ارشاد فرمایا :

ان یکن الامر کما تقول — ولیس کما تقول — نجونا ونجوت، وان یکن الامر کما نقول — وھو کما نقول — نجونا وھلکت

اگر وہی ہے جیسے کہ تم کہتے ہو (کہ خدا اور قیامت کا وجود نہیں ہے) — حالانکہ ایسا نہیں ہے — تو تم بھی نجات پا گئے اور ہم بھی۔ لیکن اگر حقیقت وہی ہے جو ہم کہتے ہیں — اور ہے بھی ایسا ہی — تو ایسی صورت میں ہم بچ جائیں گے اور تم برباد ہو جاؤ گے۔

یہ سن کر ابن ابی العوجاء نے اپنے ساتھیوں کی طرف منہ کر کے کہا :

وجدت فی قلبی حزازۃ فردونی، فردوہ فمات

مجھے دل میں درد محسوس ہو رہا ہے لہٰذا مجھے واپس لے جاؤ، وہ اسے واپس لے گئے اور بہت جلد فوت ہو گیا۔[2]

ایک نکتہ

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے "واذا مسہ الشر فذو دعاء عریض" یعنی جب انسان کو برائی آلیتی ہے اور تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے۔ لیکن سورۂ بنی اسرائیل کی ۸۳ ویں آیت میں ہے :

واذا مسہ الشر کان یئوسا

جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔

---

[1] عبدالکریم، ابن ابی العوجاء کا اصلی نام تھا اور چونکہ وہ خدا کا منکر تھا لہٰذا امام نے اسے اس نام سے پکارا تاکہ وہ شرمندہ ہو۔

[2] کافی جلد اص ۷۱ (کتاب التوحید باب حدوث العالم)۔

اس قسم کا مفہوم انہی آیات میں بھی مذکور ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسلسل اور لمبی چوڑی دعائیں پُر اُمید ہونے کی دلیل ہوتی ہیں جب کہ دوسری آیات میں قرآن کہتا ہے کہ انسان ناامید ہو جاتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے ؟

اس کے جواب میں بعض مفسرین نے لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک وہ جو مشکلات اور سختیوں کے وقت بالکل مایوس ہو جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو دعا پر اصرار اور آہ وزاری کرتے ہیں [1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مایوسی سے مراد معمول کے ذرائع سے نااُمید ہو جانا ہے اور یہ خدا سے درخواست اور دعا کے منافی نہیں ہے [2]

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ " ذو دعاء عریض " سے مراد خدا سے دعا اور درخواست نہیں بلکہ بڑی حد تک چیخ و پکار مراد ہے۔ ان کے نزدیک اس بات کی گواہ سورۂ معارج کی ۱۹ اور ۲۰ آیت ہے جس میں خدا فرماتا ہے :

ان الانسان خلق هلوعًا اذا مسه الشر جزوعًا

انسان حریص پیدا کیا گیا ہے جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو زبردست چیخ و پکار شروع کر دیتا ہے۔

باوجودیکہ یہ دو حالتیں کم ظرف لوگوں کے لیے دو مختلف مرحلوں میں پیدا ہوتی ہیں، شروع شروع میں تو ہر سنگ دل کے آستان پر سر جھکاتے اور دعائیں مانگتے ہیں چیخ و پکار اور شور و غوغا بلند کرتے ہیں، لیکن زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ مایوسی ان کے تمام وجود پر حکم فرما ہو جاتی ہے اور وہ مایوس اور خاموش ہو جاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۲۸۰۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۷ صفحہ ۴۰۲ لیکن مندرجہ بالا آیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو کہ ایسے لوگوں کی مذمت میں ہیں جبکہ ظاہری اسباب سے امیدیں منقطع کر کے خدا کی طرف متوجہ ہونا عیب ہی نہیں بلکہ لائق تعریف بھی ہے یہ تفسیر زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتی۔

۵۳۔ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○

۵۴۔ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ○

ترجمہ

۵۳۔ ہم بہت جلد انھیں کائنات کے اطراف میں اور ان کے اپنے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھلائیں گے، تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے۔ آیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا پروردگار ہر چیز پر شاہد اور گواہ ہے۔

۵۴۔ آگاہ رہو کہ وہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے بارے میں شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں لیکن خدا ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تفسیر

چھوٹے اور بڑے جہان میں حق کی نشانیاں

یہ سورۂ حٰم سجدہ کی آخری دو آیات ہیں، جن میں دو اہم مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو درحقیقت اس پوری سورت کی جملہ مباحث کا خلاصہ ہیں۔ پہلی آیت توحید (یا قرآن) کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور دوسری معاد کے بارے میں۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے ، ہم بہت جلد انہیں کائنات کے اطراف وآفاق میں اور اسی طرح خود ان کے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھلائیں گے، تاکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہوجائے کہ خدا حق ہے (سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق و فی انفسھم حتّٰی یتبین لھم انہ الحق)۔

سورج، چاند اور ستاروں کی تخلیق اور ان پر صحیح انداز میں حاکم نظام، حیوانات، نباتات، پہاڑوں، سمندروں، دریاؤں کی آفرینش اور ان کے بے شمار اور حیران کن عجائبات اس کے بے شمار اسرار آمیز گوناگوں موجودات کہ جن کی تخلیق سے ہر روز نت نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک خداوند متعال کی ذات اقدس کی حقانیت پر واضح دلیل ہے آفاقی آیات کہلاتی ہیں۔

اور انسانی جسم کی تخلیق، انسانی دماغ کی حیرت انگیز ساخت، دل، رگوں اور ریشوں اور ہڈیوں کی منظم حرکت، نطفے کا انعقاد، رحم مادر میں جنین کی پرورش اور ان سب سے بڑھ کر روح انسانی کے حیرت انگیز اسرار و رموز کہ جن میں سے ہر ایک پروردگار عالم اور خالق کائنات کی کتابِ معرفت کا ایک گوشہ ہے، انفسی آیات کہلاتی ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ آیات اس سے پہلے پروردگار عالم کی طرف سے بڑی حد تک دکھائی جا چکی ہیں لیکن "سنریھم" کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو کہ فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کر رہا ہے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آیات کے دکھانے کا یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ اگر کوئی شخص لاکھوں سال تک زندہ رہے پھر بھی ہر زمانے میں آیات الٰہی کا نیا نمونہ دیکھے گا کیونکہ اس کائنات کے اسرار ختم ہونے میں نہیں آتے۔

سائنس اور انسان شناسی کے تمام شعبے (خواہ وہ علم تشریح ہو یا فزیالوجی علم نفسیات ہو یا وغیرہ اور وہ علم الاشیاء جو نباتات، حیوانات، اشیاء، فطرت اور ہیئت وغیرہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے درحقیقت کائنات کی یہ چیزیں توحید اور معرفت الٰہی کی کھلی کتاب ہیں کیونکہ یہ عام طور پر حیرت انگیز اسرار و رموز سے پردہ اٹھاتی ہیں جو اس کائنات کے اصلی خالق کے علم و حکمت اور بے انتہا قدرت پر دلالت کرتے ہیں۔

بعض اوقات ان علوم میں سے ایک علم بلکہ ان علوم کے بیسیوں رشتوں میں سے ایک رشتہ کے لیے ایک دانشور کی تمام زندگی وقف ہوجاتی ہے۔ آخر کار وہ بھی تھک کر یہی کہتا ہے کہ

افسوس! کہ میں اس سے کچھ بھی نہ جان سکا، جو کچھ معلوم کیا ہے اس نے مجھے مزید لاعلمی اور جہالت کی طرف راہنمائی کر دی ہے۔

آخر میں اس لطیف اور دلچسپ بیان کو ایک اور خوبصورت اور بامعنی جملہ کے ساتھ مکمل کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: آیا ان کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ خدا ہر چیز پر شاہد اور گواہ ہے (اولم یکف بربک انہ علی کل شیءٍ شھید)[1]

---

[1] آیت کے اس جملہ کی ترکیب جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے یوں ہے "با" زائدہ ہے اور "ربک" فاعل کی جگہ پر ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی قدرت کے خط تکوین سے کے ذریعے تمام موجودات کی پیشانی پر، تمام درختوں کے پتوں پر، تمام پھولوں کی پنکھڑیوں پر، ذہن کے تمام اسرار آمیز طبقوں پر، آنکھ کے نفیس و ظریف پردوں پر، آسمان کے صفحے پر اور زمین کے دل پر گویا ہر ہر چیز پر اپنی توحید کی نشانیاں لکھ کر اپنی تکوین کا شاہد بنا دیا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس آیت کی دو معروف تفسیروں میں سے ایک ہے کہ جس کی بنا پر آیت کی تمام گفتگو مسئلہ توحید اور آفاق و انفس میں آیات حق کے ظہور کے بارے میں ہے۔

رہی دوسری تفسیر تو وہ اعجاز قرآن کے سلسلہ میں ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خداوند عالم اس آیت میں فرماتا ہے:

> ہم نے اپنے گوناگوں معجزات اور مختلف نشانیاں انہیں دکھائی ہیں جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں میں بھی اور دنیا کے دوسرے مقامات پر بھی اور خود ان مشرکین کے بلکے میں بھی ہیں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ قرآن برحق ہے۔

آفاقی نشانیوں سے مراد جنگ اور منطقی مناظروں کے مختلف میدانوں میں اسلام کی کامیابی، پھر دنیا جہان کے مختلف مقامات پر جہاں جہاں دین اسلام پہنچا اور لوگوں کے افکار و اذہان پر حکومت کرنے لگا، ان آیات کے نزول کے وقت جو لوگ مکہ میں بظاہر اس حد تک اقلیت میں تھے کہ کسی قسم کی بھرپور سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے حتیٰ کہ انھوں نے پروردگار کے حکم سے ہجرت کی، لیکن مختصر سے عرصے میں ہر جگہ ان کے جھنڈے تلے آگئی اور ان کے دین کی دنیا کے عظیم طبقات میں پذیرائی ہونے لگی۔

جب کہ "آیات انفسی" سے مراد جنگ بدر میں مسلمانوں کی مشرکین مکہ پر کامیابی اور فتح مکہ کے دن اسلام کا غلبہ اور بہت سے لوگوں کے دلوں میں نور اسلام کا اثر و نفوذ ہے۔

ان آفاقی اور انفسی آیات نے بتایا ہے کہ قرآن مجید برحق ہے۔

جو خدا تمام چیزوں کا گواہ ہے اس نے قرآن کی حقانیت پر بھی گواہی دی ہے۔

ان دونوں تفسیروں کے اپنے اپنے قرینے اور اپنی اپنی ترجیحات ہیں لیکن اسی آیت اور بعد کی آیت کے ذیل کی طرف توجہ کرنے سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے[1]

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ کا) اور "انہ علی کل شیء شہید" اس کا بدل ہے اور اس کا معنی یوں ہوگا "اولم یکفھم ان ربک علی کل شیء شہید" (غور کیجئے گا)۔

[1] پہلی تفسیر کی یہ چار ترجیحات ہیں۔

پہلی یہ کہ آیات کی تعبیرات زیادہ تر توحیدی دلائل کے بارے میں ہیں۔

دوسری یہ کہ آفاق اور انفس کی تعبیر توحید کی نشانیوں سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

تیسری یہ کہ "اولم یکف بربک انہ علی شیء شہید" مسئلہ توحید اور پروردگار کی ذات پاک کی حقانیت کی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس آیت کی تفسیر میں اور بھی اقوال ہیں لیکن چونکہ زیادہ وزنی معلوم نہیں ہوئے لہٰذا ہم انہیں ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

اس سورت کی آخری آیت اس مشرک، مفسد اور ظالم ٹولے کی بدبختی کا اصل سرچشمہ بیان کرتے ہوئے کہتی ہے:

وہ پروردگار کی ملاقات اور قیامت کے دن کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہیں (الا انهم فی مرية من لقاء ربهم)۔

چونکہ حساب وکتاب و سزا و جزا پر انہیں ایمان نہیں ہے لہٰذا ہر جرم کا ارتکاب کر گزرتے ہیں اور ہر شرمناک انجام دے دیتے ہیں، ان کے دلوں پر غفلت اور غرور کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور پروردگار سے ملاقات کی فراموشی نے انہیں عظمت انسانیت کی بلندی سے پستی میں دھکیل دیا ہے۔

لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ "خدا ہر چیز پر محیط ہے" (الا انه بكل شيء محيط)۔

ان کے تمام اعمال، گفتار اور نیتیں خدا کی بارگاہ علم میں مکمل طور پر عیاں ہیں اور یہ سب کچھ قیامت کی عظیم عدالت کے لیے اکٹھا ہو رہا ہے۔

"مرية" (بروزن "جزية" یا بروزن "قرية") کسی امر کے بارے میں فیصلہ کر لینے کے بعد اس میں ڈانواں ڈول ہونے کے معنی میں ہے۔ بعض اسے بڑے شک وشبہ کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ اس کلمہ کا اصل سرچشمہ "مريت الناقة" اونٹنی کو دودھ لینے کے بعد اس کے پستانوں کو اس امید کے ساتھ زور زور سے نچوڑنا کہ شاید بچا کھچا دودھ بھی نکل آئے۔ چونکہ یہ کام شک وشبہ کی بنا پر انجام پاتا ہے اسی لیے یہ کلمہ بھی "شک وشبہ" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اگر "مجادلہ" کو "مراء" کہتے ہیں تو بھی اسی لیے کہ انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ فریق مخالف کے ذہن میں ہوتا ہے اسے باہر نکال دے۔

درحقیقت آخری جملہ معاد کے بارے میں کفار کے بعض شکوک وشبہات کا جواب ہے جن میں سے کچھ شبہات یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) تکوینی شہادت کی طرف اشارہ ہے۔

چوتھی یہ کہ بعد کی آیت معاد کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور معلوم ہے کہ مبداً اور معاد ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔

دوسری تفسیر کی بھی تین ترجیحات ہیں۔

پہلی یہ کہ "انه" کی ضمیر مفرد غائب کے لیے ہے جبکہ "اٰیاتنا" میں ضمیر متکلم مع الغیر کے لیے ہے اور مناسب یہی ہے کہ ہر ایک ضمیر ایک خاص مقصد کو بیان کرے۔

دوسری یہ کہ اس سے پہلے کی آیت خاص طور پر قرآن کے لیے ہے۔

تیسری یہ کہ "سنريهم" جو کہ فعل مضارع ہے اس مناسبت کا متقاضی ہے کہ مذکورہ آیات بعد میں دکھائی جائیں گی۔ (البتہ ہم نے متن میں ان ترجیحات کا جواب دے دیا ہے۔) (غور کیجئے گا)۔

بھی ہیں کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ یہ منتشر اور پھر مخلوط مٹی جدا ہو جائے؟ کون سی طاقت ہر انسان کے اجزاء کو یکجا کر سکے گی؟ علاوہ بریں پوری تاریخ کے تمام انسانوں کی نیتوں، اعمال اور گفتار سے کون آگاہ ہو سکتا ہے؟

قرآن مجید ان تمام سوالوں کے جواب میں کہتا ہے:

> جو تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس پر یہ تمام باتیں روشن ہیں تمام چیزوں پر اس کے علمی احاطہ کی دلیل تمام چیزوں پر اس کی تدبیر ہے، یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مدبر عالم دنیا جہان کے حالات سے بے خبر ہو؟

بعض مفسرین نے اس آیت کو بھی مسئلہ توحید سے متعلق سمجھا ہے نہ کہ مسئلہ معاد کے، وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ پروردگار عالم کی توحید کے بارے میں اس قسم کے استدلالات متعصب اور ضدی مزاج کفار کے لیے مؤثر ثابت نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کے لیے مفید ہوتے ہیں وہ تو توحید کی روشن ترین دلیل یعنی خدا کی ہر جگہ پر موجودگی کے بھی منکر ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ توحید کے دلائل سے کیونکر بہرہ ور ہو سکتے ہیں؟ [1]

لیکن اگر دیکھا جائے تو قرآن مجید میں "لقاء اللہ" کی تعبیر عموماً قیامت کے لیے کنایہ ہوتی ہے لہٰذا یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے۔

چند ایک نکات

۱۔ **برہان نظم اور برہان صدیقین:** ہم جانتے ہیں کہ فلسفی حضرات توحید کے دلائل میں سے دو دلیلوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، سب سے پہلے برہانِ نظم کو پھر برہان صدیقین۔

برہان نظم: جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس برہان کو کہتے ہیں جو اس کائنات اور اس کے مبدأ کے علم و قدرت کے اسرار و رموز کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ قرآن مجید اس روشن اور واضح دلیل کے ساتھ استدلالات سے پُر ہے اور ہر جگہ پر زمین و آسمان، عالم حیات اور مختلف موجودات میں حق کی نشانیوں کے مختلف نمونے پیش کرتا ہے اسی سے اس کی ذات کی طرف راستے کھلتے ہیں۔

یہ دلیل تمام طبقات کے لیے قابل ادراک ہے اور ہر شخص اپنی سمجھ اور معلومات کے مطابق اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے علماء و دانشور اپنی سمجھ کے مطابق اور کم تعلیم یافتہ یا ان پڑھ لوگ اپنی سمجھ کے مطابق۔

برہان صدیقین: یہ وہ برہان ہے جس کے ذریعے "ذات" سے "ذات" تک پہنچتے ہیں، اور باری تعالیٰ کے واجب الوجود سے ہی اسی کی ذات کی حقیقت تک رسائی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس برہان میں ممکنات اور مخلوقات عالم اس کے وجود کے اثبات کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ اسی کی پاک ذات ہی اسی کی ذات پر دلیل ہے اور

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۷ ص ۴۲۲۔

یامن دل علی ذاتہ بذاتہ[1] یا شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو (خدا گواہی دیتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں)[2] کا مصداق ہوتی ہے۔

یہ ایک پیچیدہ فلسفی استدلال ہے اور اس کی مبادیات کا علم رکھنے والوں کے علاوہ کوئی بھی اس کی گہرائیوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے اور یہاں پر ہمارا مقصد اس کی تفصیل بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ اس کی جگہ فلسفی کتابیں ہیں، بلکہ ہم تو یہاں پر صرف یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بعض مفسرین نے آیت سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق کے آغاز کو برہان نظم اور علت ومعلول کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور اولم یکف بربك انہ علیٰ کل شیء شھید کو برہان صدیقین کی طرف اشارہ سمجھا ہے لیکن خود آیت کے اندر اس بات پر کوئی واضح قرینہ موجود نہیں ہے۔

۲۔ خدا کے احاطہ کی حقیقت: یہ تصور ہرگز نہیں کرنا چاہیئے کہ خداوند عالم چیزوں کا احاطہ ایسے کئے ہوئے ہے جیسے کرۂ زمین کا ہوا نے احاطہ کیا ہوا ہے، کیونکہ اس قسم کا احاطہ اس کی محدودیت کی دلیل ہوتا ہے بلکہ خداوند عالم کا تمام چیزوں پر احاطہ نہایت ہی دقیق اور لطیف معنی رکھتا ہے اور وہ ہے تمام موجودات کا اپنی ذات میں اس کے وجود مقدس کے ساتھ وابستہ ہونا۔

دوسرے لفظوں میں اس ساری کائنات میں سوائے ایک پاک ذات کے کسی بھی چیز کا وجود اصالت نہیں رکھتا اور قائم بالذات نہیں ہے اور دوسرے تمام ممکنہ موجودات کا وجود اس طرح اسی کی ذات کے سہارے قائم اور اسی سے وابستہ ہے کہ اگر ایک لمحے کے لیے یہ رابطہ ختم ہو جائے تو تمام کائنات تباہ و برباد ہو جائے۔

اور یہ احاطہ اس حقیقت کا نام ہے جسے امیر المومنین علی علیہ السلام کے الفاظ میں نہج البلاغہ کے خطبہ اوّل میں ذکر کیا گیا ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں:

مع کل شیء لا بمقارنۃ وغیر کل شیء لا بمزایلۃ

خدا ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن ان کے ہم پلہ نہیں، ہر چیز کا غیر ہے لیکن ان سے جدا نہیں۔

اور شاید یہ وہی چیز ہے جسے حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی مشہور، معنی خیز، مطالب سے لبریز دعائے عرفہ میں بیان فرمایا ہے:

ایکون لغیرك من الظھور مالیس لك، حتی یکون ھو المظھر لك؟ متی غبت حتی تحتاج الی دلیل یدل علیك؟ ومتی بعدت حتی تکون الاٰثار ھی التی توصل الیك؟ عمیت عین لا تراك علیھا رقیبا! وخسرت صفقۃ عبد لم تجعل لہ من حبك نصیبا

---

[1] دعائے صباح منقول از علی علیہ السلام۔

[2] سورۂ آل عمران آیت۔ ۱۸۔

پروردگارا! کیا دوسری موجودات کے لیے کوئی ایسا ظہور ہے جو تیرے لیے نہ ہو کہ وہ تیری نشاندہی کریں؟ تو کب مخفی ہوا ہے کہ تجھے کسی دلیل کی ضرورت ہو کہ وہ تیرے وجود پر دلالت کرے؟ تو کب دور ہوا ہے کہ کائنات میں تیرے آثار ہیں تیری طرف راہنمائی کریں؟ اندھی ہوجائے وہ آنکھ جو تجھے اپنا نگران سمجھ کر نہ دیکھے اور نقصان اٹھائے بندے کی وہ تجارت جس میں تیری محبت کا کوئی حصہ نہ ہو[1]

ایک شاعر کہتا ہے۔

کے رفتہ ای زدل کہ تمنا کنم ترا ؛ کے گشتہ ای نہفتہ کہ پیدا کنم ترا
با صد ہزار جلوہ برون آمدی کہ من ؛ با صد ہزار دیدہ تماشا کنم ترا

تو میرے دل سے گیا ہی کب ہے کہ تیرے دیدار کی تمنا کروں اور تو کب مجھ سے غائب ہوا ہے کہ تجھے تلاش کروں؟

تو لاکھوں جلووں کے ساتھ ظہور پذیر ہے اور میں لاکھوں نگاہوں کے ساتھ تیرا دیدار کر رہا ہوں۔

۲۔ "آفاقی" اور "انفسی" آیات: ہم ہر چیز کا تو انکار کرسکتے ہیں لیکن اس کائنات میں خود اپنے اندر اور اپنے باہر ایک منظم اور حیرت انگیز نظام کا انکار ہرگز نہیں کرسکتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ماہر اور سپیشلسٹ شخص آنکھ، دماغ یا دل کی اسرار آمیز بناوٹ کے بارے میں تحقیقات کرتا ہے اور اس بارے میں لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے پھر بھی اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس موضوع کے سلسلے میں ابھی بہت کچھ تحقیق کرنا باقی ہے۔

پھر یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ آج کے محققین کے علوم تاریخی اعتبار سے لاکھوں دانشوروں اور سائنس دانوں کے مسلسل مطالعات کا نچوڑ اور نتیجہ ہیں۔

اس طرح سے ہم جہاں بھی اور جسے بھی دیکھیں اس کے ماوراء خداوند متعال کی بے انتہا قدرت اور علم کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اور جو انگوری بھی زمین سے اگتی ہے زبان حال کے ساتھ "وحدہ لا شریك له" کہہ کر سر اٹھاتی ہے، اور جس ذرے کا بھی دل چیریں اس کے درمیان سے ایک آفتاب پھوٹتا ہے۔

اسی پر اکتفا کرتے ہوئے بہتر یہی ہے کہ اس جہان کے اہم اور پیچیدہ موضوعات سے چشم پوشی کرکے سادہ اور اپنے آپ کے مسائل کا تجزیہ و تحلیل کریں۔ پھر بھی اس مبدأ عظیم و برتر کے وجود پر روشن دلائل میں سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں پر دو مثالیں پیش کریں۔

۱۔ یقیناً آپ جانتے ہیں کہ ہر انسان کے پاؤں کے تلوے میں ایک خاص قسم کا خلا یا گڑھا موجود ہے جو

---

[1] دعائے عرفہ سے اقتباس۔ یہ مشہور دعا روزِ عرفہ کے اعمال میں دعا کی مشہور کتابوں میں درج ہے۔

عام طور پر کوئی اہم چیز معلوم نہیں ہوتا، لیکن جب ہم یہ سنتے ہیں کہ فوج میں بھرتی کے خصوصی معائنے کے وقت جن افراد کے پاؤں میں اس قسم کا خلا نہیں ہوتا بھرتی نہیں کیا جاتا یا میدان میں بھیجنے کے بجائے انہیں دفتری کاموں میں کھپایا جاتا ہے۔ تو پھر پتہ چلتا ہے کہ جس چیز کو ہم عام اور سادہ سی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اس کی وجود انسانی کے لیے کس قدر اہمیت ہے اور وہ یہ کہ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے انسان کھڑا ہو جائے تو بہت جلد تھک جاتا ہے۔ فن سپاہ گری کے اظہار کے موقعے پر چلنے یا دوڑنے کی لازمی توانائی سے قاصر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کا سارا نظام جچا تلا اور کسی حساب کتاب کے تحت ہے حتیٰ کہ پاؤں کے تلوے کا خلا بھی۔

۲۔ انسان کی آنکھوں اور منہ میں پانی کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ جو نہایت ہی ظریف اور باریک سوراخوں سے تمام زندگی مسلسل کام کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو انسان میں دیکھنے کی قدرت ہوتی نہ بولنے اور غذا کو چبانے اور نگلنے کی طاقت۔ بالفاظ دیگر ان دو بظاہر چھوٹی لیکن نہایت اہم چیزوں کے بغیر انسانی زندگی ناممکن تھی۔

اگر آنکھ کی سطح ہمیشہ مرطوب نہ ہو تو ڈھیلوں کی گردش تکلیف دہ بن جائے بلکہ ناممکن ہو جائے اور جب پلکیں آپس میں ملیں تو اس سطح کو چھیل کر رکھ دیں بلکہ آنکھ کی حرکت ہی بالکل بند ہو کر رہ جائے۔

اگر زبان، گلا اور منہ مرطوب نہ ہوں تو بات کرنا ناممکن ہو جائے اور غذا کو نگلنا محال ہو جائے۔ آپ نے تجربہ کیا ہو گا کہ جب کسی کا منہ یا گلا خشک ہو جاتا ہے تو اس کے لیے بات کرنا تو بجائے خود سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے، غذا کھانا یا اسے نگلنا تو دور کی بات رہی۔ آپ خود ہی اندازہ کیجئے کہ اگر یہ پانی اور تری مکمل طور پر منقطع ہو جائے تو انسان کا کیا بنے؟

ناک کے اندرونی حصے کو بھی مرطوب ہونا چاہیئے تاکہ سانس کی ہمیشہ کی آمد و رفت آسانی سے جاری رہے۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ جو پانی آنسوؤں کی نالیوں کے ذریعہ سے نکل کر ناک میں آجاتا ہے اور جسے فالتو یا اضافی پانی کہتے ہیں اسی کے ذریعہ ناک ہمیشہ تر رہتا ہے اور جس ظریف و باریک سوراخ سے یہ پانی بہتا رہتا ہے اگر بالفرض ایک دن کے لیے بھی بند ہو جائے —— جیسا کہ بعض مریضوں میں یہ چیز دیکھنے آتی ہے —— تو ہمیشہ کے لیے آنکھ کا یہ پانی سیلاب کی صورت میں چہرے پر بہتا رہے اور انسان کے چہرے کو بگاڑ کر رکھ دے اور نہایت ہی بدنما بنا دے۔

اگر ان سوراخوں کی کشش کی وجہ سے آنسوؤں کے چشموں کا توازن بگڑ جائے پھر بھی یہی صورت حال درپیش ہو۔

لعاب دہن کی نالیوں کی بھی یہی کیفیت ہے اگر لعاب دہن کم ہو تو زبان، منہ اور گلا خشک ہو جائیں اور اگر

زیادہ ہو جائے تو بات کرنی دشوار ہو جائے اور منہ سے پانی بہنے لگے۔

آنکھ کے پانی کی ترکیب کچھ اس طرح سے ہے کہ اس کا ذائقہ نمکین ہوتا ہے اور اس سے آنکھ کی ظریف ولطیف صورت کی مکمل حفاظت ہوتی ہے اور جب بھی آنکھ میں گرد وغبار یا کوئی اور چیز پڑ جاتی ہے تو وہ پانی خود کار صورت میں بہنا شروع کر دیتا ہے اور جب تک اسے باہر نہیں پھینک دیتا تھمنے میں نہیں آتا۔

آنکھ کے پانی کے برخلاف لعاب دہن کی ترکیب ہی کچھ ایسی ہے کہ اس کا کوئی ذائقہ نہیں ہے تاکہ غذا کا ذائقہ اچھی طرح محسوس کیا جائے اور اس میں نمکیات کا وجود غذا کے ہاضمے کے لیے مؤثر عامل ہے۔

اگر ان دو چشموں کے فزیکل اور کیمیکل پہلوؤں پر غور کیا جائے اور ان کے چھے تلے اور حساب وکتاب کے تحت نظام کی ظرافت، منفعت اور برکت کے بارے میں سوچ بچار سے کام لیا جائے تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ کائنات کا یہ نظام اندھے اور بہرے "اتفاق" کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اسی ایک انفسی آیت جو بظاہر ایک چھوٹی سی آیت ہے کا مطالعہ ہم پر ظاہر کرتا ہے کہ ذات خداوند متعال برحق ہے "سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق و فی انفسھم حتّٰی یتبیّن لھم انہ الحق"۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام "توحید مفضل" نامی مشہور حدیث میں جو پروردگار عالم کی آفاقی اور انفسی آیات سے لبریز ہے، اسی مطلب کی طرف ایک بامعنی اشارہ فرماتے ہیں:

> ای مفضل! تأمل الریق و ما فیہ من المنفعۃ، فانہ جعل یجری جریانًا دائمًا الی الفم، لیبل الحلق واللھواۃ فلا یجف فان ھذہ المواضع لوجعلت کذالک کان فیہ ھلاک الانسان، ثم کان لا تستطیع ان یسیغ طعامًا اذا لم یکن فی الفم بلۃ تنفذہ، تشھد بذالک المشاھدۃ۔
>
> اے مفضل! لعاب دہن اور اس کے فوائد کے بارے میں ذرا غور کرو، یہ لعاب ہمیشہ منہ میں چلتا رہتا ہے، تاکہ حلق اور چھوٹی سی زبان (جس کا غذا نگلنے میں اہم کردار ہے) کو ہمیشہ مرطوب رکھے۔ اور اسے خشک نہ ہونے دے کیونکہ اگر یہ اعضاء خشک ہو جائیں تو انسان ہلاک ہو جائے اور اصولی طور پر اگر منہ میں رطوبت نہ ہو تو انسان غذا نہیں نگل سکتا، تجربہ اور مشاہدہ اسی بات کا گواہ ہے[1]

انسانی جسم کے علاوہ انسانی روح بھی عجائبات کا خزانہ ہے جس نے تمام علماء اور دانشوروں کو حیران اور ششدر کر رکھا ہے۔ اس کائنات میں اسی قسم کی لاکھوں کروڑوں آیات بیّنات موجود ہیں جو سب کی سب

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ ص ۷۷۔

بیک زبان کہہ رہی ہیں " انہ الحق "۔

یہیں پر ہم بھی سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے ہم صدا ہو کر کہتے ہیں۔

عمیت عین لاتراك

خداوندا ! اندھی ہو جائے وہ آنکھ جو تجھے نہ دیکھے۔

سورۂ حٰم سجدہ (فصلت) کی تفسیر اختتام کو پہنچی۔

بتاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۰۵ھ
مطابق : ۱۳۶۳/۹/۱۵ ہجری شمسی

عرض مترجم

اپنے عزیز بیٹے سید محمد مہدی مرحوم کی وفات کے سلسلے میں گزشتہ دنوں میں پاکستان سے ایران پہنچا تھا۔ وہاں سے زیارات کے لیے شام گیا اور وہاں سے ہوتا ہوا اب عمرہ کی غرض سے حجاز پہنچا ہوں۔ پہلے مدینہ منورہ آیا ہوں اور سورہ حٰم سجدہ کی تفسیر کے ترجمے کا اختتام آج یہیں پر محلہ سخاولہ میں جناب سید سجاد حسین صاحب بخاری کے مکان پر ہوا ہے۔ یہاں سے انشاء اللہ مکہ جانے کا ارادہ ہے۔

احقر
صفدر حسین نجفی
۱۵ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ ہجری
مطابق : ۱۸ دسمبر ۱۹۸۶ء
بروز جمعرات

سورۂ شوریٰ

◎ — اس کی ۵۳ آیتیں ہیں

◎ — مکہ میں نازل ہوئی

(البتہ چند آیات کے بارے میں اختلاف ہے)

آغاز

۱۲، ربیع الاوّل ۱۴۰۵ھ

بروز جمعرات

سورۂ شوریٰ کے مندرجات

اس سورت کا نام اس کی آیت ۳۸ کی وجہ سے ہے جس میں مسلمانوں کو اپنے امور میں باہمی مشورے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں مکی سورتوں کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں یعنی مبدأ و معاد اور قرآن و نبوت کے بارے میں گفتگو ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس میں اور بھی مختلف چیزیں ملتی ہیں جن کا مندرجہ ذیل حصوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے :

پہلا حصہ جو اس سورت کا اہم ترین حصہ شمار ہوتا ہے، اس میں وحی، انبیاء کے ساتھ خدا کا اس مرموز طریقے سے رابطہ کے متعلق گفتگو ہوئی ہے، جو اس سورہ کا سرآغاز بلکہ حرف آخر بھی ہے اور تمام مندرجات پر حادی ہے کیونکہ سورت کے درمیان میں بھی کہیں نہ کہیں اس کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اسی مناسبت سے قرآن مجید اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا تذکرہ بھی ہے اور نوح علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا بھی ذکر ہے۔

دوسرا حصہ مشتمل ہے توحید کے دلائل، آفاق و انفس میں خدا کی آیات کے اشارات پر کہ جن سے وحی کی گفتگو کی تکمیل ہوتی ہے اسی طرح توحید ربوبیت کی گفتگو بھی ہے۔

تیسرے حصہ میں معاد کے مسئلے اور قیامت کے دن کفار کے انجام کی طرف اشارہ ہے۔ البتہ دوسری سورتوں کی نسبت اس سورت میں یہ مسائل بہت کم بیان ہوئے ہیں۔

چوتھے حصہ میں اخلاقی مباحث کا ایک سلسلہ ہے جو نہایت ہی احسن انداز میں بیان ہوا ہے جس میں عموماً صبر و استقامت، توبہ، عفو و درگزر اور آتش غضب کو بجھانے جیسے برجستہ ملکات کی طرف، لطیف انداز میں دعوت دی گئی ہے۔

اسی طرح خدائی نعمات کے حصول کے وقت سرکشی، ضد اور ہٹ دھرمی، دنیا پرستی، مشکلات کے وقت چیخ و پکار جیسی صفات رذیلہ سے واضح طور پر روکا گیا ہے۔

قصہ مختصر یہ راہ حق کے راہیوں کے لیے ایک مکمل مجموعہ اور شفا عطا کرنے والی دوا ہے۔

تلاوت کی فضیلت

اس سورت کی تلاوت کے بارے میں اسلام کے عظیم الشان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے :

من قرء سورة حٰمٓ عٓسٓقٓ کان ممن تصلی علیه الملائکة، و

یستغفرون له و یسترحمون

جو شخص سورہ شوریٰ کی تلاوت کرے گا وہ ان لوگوں میں سے ہوگا کہ جن کے لیے فرشتے درود بھیجتے اور استغفار کرتے ہیں[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

جو شخص سورۂ شوریٰ کی تلاوت کرے وہ بروز قیامت آفتاب کے مانند چمکدار چہرے کے ساتھ محشور ہوگا اور اسی حالت میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں پیش ہوگا۔ خدا فرمائے گا: میرے بندے! تو نے سورۂ حٰم عسق کی پابندی کے ساتھ تلاوت جاری رکھی جبکہ تو اس کے ثواب سے بے خبر تھا اور اگر اس ثواب سے باخبر ہوتا تو تُو اس کی تلاوت سے کبھی نہ تھکتا۔ لیکن آج میں تجھے اس کا ثواب ضرور عطا کروں گا، پھر حکم دے گا کہ اسے بہشت کی خصوصی نعمتوں تک پہنچا دیا جائے[2]

---

[1] مجمع البیان سورۂ شوریٰ کا آغاز۔

[2] ثواب الاعمال (منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص۵۵۵۔ مختصر سی تلخیص کے ساتھ)۔

سورة الشوریٰ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

۱۔ حٰمٓ ○

۲۔ عٓسٓقٓ ○

۳۔ كَذٰلِكَ يُوۡحِىۡۤ اِلَيۡكَ وَاِلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۙ اللّٰهُ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ○

۴۔ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ وَهُوَ الۡعَلِىُّ الۡعَظِيۡمُ ○

۵۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرۡنَ مِنۡ فَوۡقِهِنَّ‌ وَالۡمَلٰٓـئِكَةُ يُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ وَيَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حٰم

۲۔ عسق

۳۔ خداوند عزیز و حکیم تیری طرف اور جو پیغمبر تجھ سے پہلے ہو گزرے ہیں اسی طرح وحی کرتا ہے۔

۴۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے وہ بھی اور جو کچھ زمین میں ہے وہ بھی سب خدا کے لیے ہے اور وہ بلند مرتبہ اور صاحب عظمت ہے۔

۵۔ نزدیک ہے کہ (مشرکین کی ناجائز تہمتوں کی وجہ سے) آسمان اُوپر سے پھٹ جائیں۔ فرشتے ہمیشہ اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں اور جو لوگ زمین پر ہیں ان کے لیے استغفار کرتے ہیں، آگاہ رہو کہ خداوند عالم بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

نزدیک ہے، آسمان پھٹ جائیں

اس سورت میں ایک بار پھر ہم "حروف مقطعات" کی تلاوت کر رہے ہیں اور اب کی مرتبہ نسبتاً زیادہ تعداد میں انہیں دیکھ رہے ہیں۔ یعنی پانچ حروف کی تعداد میں (حٰمٓ عٓسٓقٓ)۔

"حٰمٓ" قرآن مجید کی سات سورتوں (مومن، حٰم سجدہ، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ اور احقاف) کے آغاز میں آیا ہے لیکن اس سورت (شوریٰ) میں "عسق" کا اس کے ساتھ اضافہ ہے۔

ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ قرآن پاک کے حروف مقطعات کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے، اور ہر مفسر نے اس بارے میں لمبی چوڑی گفتگو کی ہے۔ عظیم مفسر مرحوم طبرسی کے بقول قرآن کے حروف مقطعات کی گیارہ تفسیریں بیان ہوئی ہیں۔ جن میں سے اہم تفسیروں کو ہم سورۂ بقرہ، آل عمران، اعراف اور مریم میں بیان کر چکے ہیں اور چونکہ باقی تفسیریں چنداں قابل توجہ نہیں تھیں، لہٰذا ہم نے انہیں ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

البتہ ان میں کچھ ایسی تفسیریں ہیں جو کسی حد تک قابل ذکر ہیں ہر چند کہ کوئی دلیل قاطع ان کے ثبوت میں نہیں ملتی۔

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "حروف مقطعات" کفار کو خاموش کرنے اور لوگوں کی توجہ قرآن کی جانب مبذول کرانے کے لیے ذکر کیے گئے ہیں۔ کیونکہ ہٹ دھرم مشرکین نے خاص طور پر ایک دوسرے کو ہدایت کر رکھی تھی کہ جب بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کی تلاوت کریں کوئی شخص بھی اس کو کان لگا کر نہ سنے۔ بلکہ اس حد تک شور و غل برپا کریں کہ دوسرے لوگ بھی آپ کی آواز نہ سن سکیں لہٰذا خداوند عالم نے قرآن مجید کی بہت سی سورتوں (تقریباً ۲۹ سورتوں) میں حروف مقطعات کو ذکر فرمایا ہے جن میں تازہ مطالب تھے اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا رہے تھے۔

علامہ طباطبائی (رضوان اللہ علیہ) نے ایک اور احتمال کو ذکر کیا ہے جسے ان حروف کی بارہویں تفسیر کہا جاسکتا ہے ہر چند کہ خود انہوں نے بھی اسے ایک احتمال کے طور پر ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

جب ہم ان سورتوں میں غور کرتے ہیں جن کی ابتدا حروف مقطعات سے ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی سورتیں جن کا آغاز ایک جیسے حروف مقطعات سے ہوتا ہے ان کے مطالب بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جو سورتیں "حٰم" سے شروع ہوتی ہیں تو اس کے فوراً بعد "تنزیل الکتاب من اللہ ...." کا جملہ یا اس سے ملتا جلتا ذکر ہوا ہے اور جو سورتیں "الٓر" سے شروع ہوتی ہیں تو اس کے فوراً بعد "تلک اٰیات الکتاب...." یا اس کے مانند کوئی اور جملہ ہوتا ہے۔

جن سورتوں کا آغاز "الٓم" سے ہوتا ہے "ذالک الکتاب لا ریب فیہ" یا اس جیسا کوئی اور جملہ بھی اسی کے ساتھ آیا ہے۔

یہاں سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ حروف مقطعات اور ان سورتوں کے درمیان ایک خاص قسم کا رابطہ ہے۔ حتیٰ کہ مثلاً سورۂ اعراف کہ جس کا آغاز "المٓصٓ" سے ہوتا ہے، "الٓم" کے ساتھ شروع ہونے والی سورتوں اور سورہ "صٓ" کے مضامین کی جامع ہے۔ یعنی ان تمام سورتوں کے مضامین سورۂ اعراف میں جمع ہیں۔

البتہ ایسا رابطہ نہایت ہی گہرا اور دقیق ہوسکتا ہے جس تک عام معمولی اذہان کی رسائی ناممکن ہے اور شاید اگر ان سورتوں کی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھ کر ان کا آپس میں تقابل کریں تو ہمیں کوئی نئے مطالب مل جائیں۔[1]

ایک اور تفسیر کہ جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں یہ ہے کہ ممکن ہے یہ حروف خداوند عالم کے ناموں اور اس کی نعمتوں وغیرہ کی طرف اشارات اور ان کے رموز ہوں، مثال کے طور پر اسی سورۂ شوریٰ میں بعض مفسرین نے "ح" کو "رحمٰن" "م" کو "مجید" "ع" کو "علیم" "س" کو "قدوس" اور "ق" کو "قاھر" کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔[2]

اگرچہ بعض مفسرین نے اس گفتگو پر اعتراض کیا ہے کہ اگر اسرار اور رموز سے مراد یہ ہے کہ ان سے کوئی دوسرا شخص آگاہ نہ ہو تو یہ تعریف حروف مقطعات کے بارے میں صادق نہیں آتی، کیونکہ خداوند متعال کے یہ عظیم نام دوسری آیات میں صراحت کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔

لیکن ان معترضین کو معلوم نہیں کہ اشاروں اور رموز کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کوئی بات ہمیشہ کے لیے محرمانہ

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۸ ص ۶
[2] یہ تفسیر امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث سے منقول ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۵۸۴۲)۔

رہے بلکہ بعض اوقات ان سے مراد اختصار بھی ہوتا ہے اور یہی چیز گزشتہ زمانے میں مروج تھی اور آج بھی رائج ہے، بلکہ اس دور میں تو اس کا رواج بڑی وسعت اختیار کر چکا ہے اور وہ اس طرح کہ بہت سے اداروں، انجمنوں اور محکموں وغیرہ کے ناموں کو بھی حروف مقطعہ کی صورت میں لکھتے اور بولتے ہیں اور وہ اس طرح کہ ہر لفظ کے پہلے ایک حرف کو لے کر انہیں پھر آپس میں ملا دیتے ہیں۔

حروف مقطعات کے بعد حسب معمول وحی اور قرآن کی بات شروع ہوتی ہے ارشاد ہوتا ہے: اسی طرح خداوند عزیز و حکیم تیری طرف اور تجھ سے پہلے انبیاء کی طرف وحی کرتا ہے (کذالک یوحی الیک و الی الذین من قبلک اللہ العزیز الحکیم)۔

"کذالک" کا کلمہ درحقیقت اس سورہ کے عظیم مطالب اور مضامین کی طرف اشارہ ہے۔

وحی کا سرچشمہ تو ہر جگہ ایک ہی ہے اور وہ ہے خداوند عالم کا علم اور اس کی قدرت اور تمام انبیاء کی وحی کے مطالب و مضامین بھی اصول اور قواعد بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ہرچند کہ ان کی خصوصیات زمانے کی ضرورتوں کے مطابق اور انسان کے ارتقائی مراحل کے پیش نظر بدلتی رہتی ہیں[1]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ انہی آیات میں خداوند متعال کی صفات کمالیہ میں سے سات صفتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جن میں سے ہر ایک کا کسی نہ کسی طرح وحی سے تعلق ہے، جن میں سے دو صفات اسی آیت میں ہیں، ایک عزیز اور دوسری حکیم۔

اس کی ناقابل شکست عزت اور قدرت کا تقاضا ہے کہ وہ وحی اور اس کے عظیم مضامین پر قدرت رکھتا ہو۔

اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وحی ہر لحاظ سے حکمت پر مبنی اور انسان کی ارتقائی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہو، "یُوحی" (وحی بھیجتا ہے) فعل مضارع ہونے کی بنا پر آغاز خلقت آدمؑ سے لے کر عصر پیغمبر خاتم تک استمرار اور تسلسل پر دلالت کر رہا ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے صرف اس کے لیے ہے اور وہ بلند مرتبے اور عظمت کا مالک ہے (لہ ما فی السماوات و ما فی الارض و ھو العلی العظیم)۔

زمین اور آسمان میں اس کی ملکیت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ اپنی مخلوق اور اس کے انجام سے بے خبر نہ ہو، بلکہ ان کے امور کو سنبھالے اور وحی کے ذریعے ان کی ضروریات کو پورا کرے اور یہ خدا کی مذکورہ سات صفات میں سے تیسری صفت ہے۔

---

[1] اگرچہ مفسرین نے "کذالک" کے مشارالیہ کے بارے میں مختلف احتمالات اور مختلف تفسیریں بیان کی ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ اس کا مشارالیہ یہی آیات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں، اسی لیے آیات کا مفہوم یوں ہوگا "وحی اسی انداز کی ہے جو مجھ پر اور تجھ سے پہلے انبیاء پر نازل کرتا ہے" اور مشارالیہ کے نزدیک ہونے کے باوجود "دور" کا اشارہ اس کی عظمت اور احترام کے لیے ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔

اس کے مقام کی بلندی اور عظمت جو اس آیت میں خدا کی چوتھی اور پانچویں صفتیں ہیں اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ اُسے بندوں کی اطاعت اور بندگی کی قطعاً احتیاج نہیں۔ اگر اس نے بندوں کے لیے عبادات کے پروگرام مرتب کئے ہیں اور وحی کے ذریعے ان کے لیے نازل کئے ہیں تو صرف بندوں پر جود وسخا کے لیے ہیں۔

بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: قریب ہے کہ (خدا کی طرف سے باعظمت وحی کے نزول یا مشرکین کی خدا کی ذات پاک کی طرف ناروا تہمتوں اور بتوں کے شریک بنانے کی وجہ سے) آسمان اوپر سے پھٹ جائیں (تکاد السماوات یتفطرن من فوقھن)۔

جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس جملے کی دو طرح سے تفسیر کی جاتی ہے کہ جن میں سے ہر ایک کے لیے شاہد موجود ہے۔ پہلی تو یہ کہ اس کا تعلق مسئلہ وحی سے ہے جو گزشتہ آیات میں زیر بحث رہ چکا ہے اور درحقیقت یہ آیت سورہ حشر کی ۲۱ ویں آیت سے ملتی جلتی ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

لوانزلنا ھٰذا القراٰن علی جبل لرأیتہ خاشعًا متصدعًا من خشیۃ اللہ

یعنی اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ خوف خدا کی وجہ سے خاشع ہو جاتے اور پھٹ جاتے۔

جی ہاں! یہ کلام خدا ہی ہے، آسمان سے جس کا نزول پہاڑوں پر لرزہ طاری کر دیتا ہے اور قریب ہے کہ انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ اگر واقعاً یہ پہاڑوں پر نازل ہوتا تو انہیں ریزہ ریزہ کر دیتا کیونکہ یہ خداوند حکیم کا عظیم کلام ہے۔ یہ تو صرف اس ضدی مزاج اور ہٹ دھرم انسان کا دل ہے جو نہ تو نرم ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے آگے جھکتا ہے۔

جبکہ دوسری تفسیر یہ ہے کہ نزدیک ہے کہ ان مشرکین کے شرک اور بت پرستی کی وجہ سے آسمان پھٹ پڑے کیونکہ وہ پست ترین مخلوق کو کائنات کے عظیم مبدأ کا شریک بناتے ہیں۔

لیکن پہلی تفسیر وحی کے سلسلے میں زیر تفسیر آیات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور دوسری تفسیر سورہ مریم کی آیت ۹۰، ۹۱ سے مناسبت رکھتی ہے۔ جن میں خداوند عالم نے ان کفار کی نامناسب گفتگو کے ذکر کے بعد فرمایا ہے جو خدا کی اولاد کے قائل ہیں:

تکاد السماوات یتفطرن منہ و تنشق الارض و تخر الجبال ھدًّا ان دعوا للرحمٰن ولدًا

نزدیک ہے کہ اس بات کی وجہ سے آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، زمین پھٹ جائے اور پہاڑ زور سے ٹوٹ پڑیں کیونکہ وہ خداوند رحمان کے لیے اولاد کے قائل ہو چکے ہیں۔

یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہیں اور آیت کے مفہوم میں جمع بھی ہو سکتی ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے

لہ یتفطرن "فطر" (بروزن "سطر") کے مادہ سے ہے۔ جس کا معنی طول میں شگاف ہے۔

کہ آسمان اور پہاڑ دو ٹھوس چیزیں ہیں وہ وحی کی عظمت یا کفار و مشرکین کی ناہنجار گفتگو کے سامنے کیسے پھٹ سکتی ہیں؟ اس بارے میں متعدد تفسیریں ملتی ہیں۔ جن کی تفصیل ہم سورۂ مریم کی آیت ۹۰ اور ۹۱ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں اور جن کا خلاصہ یہ ہے:

عالم ہستی جو کہ جمادات اور نباتات وغیرہ کا مجموعہ ہے ایک طرح کے عقل و شعور کا حامل ہے خواہ ہم اس کا ادراک نہ بھی کر سکیں اور اسی بنا پر وہ خدا کی حمد و تسبیح کرتے ہیں اور اس کے کلام کے آگے سر جھکائے ہوتے ہیں۔

یا یہ کہ یہ تعبیر اس مطلب کی اہمیت اور عظمت کیلئے کنایہ ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں حادثہ اس قدر عظیم تھا گویا آسمان زمین پر ٹوٹ پڑا۔

سلسلہ آیت کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: فرشتے اپنے رب کی تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں اور زمین میں رہنے والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں (والملائکۃ یسبحون بحمد ربھم و یستغفرون لمن فی الارض)۔

اس جملے کا پہلے حصے سے رابطہ پہلی تفسیر کی بنا پر یوں ہوگا کہ اس عظیم آسمانی وحی کے حامل فرشتے ہمیشہ خدا کی حمد اور تسبیح بجالاتے ہیں اور اس کی ہر کمال کے ساتھ ستائش کرتے ہیں اور اسے ہر نقص سے منزہ و مبرا سمجھتے ہیں اور چونکہ اس وحی کے مضامین میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ فرائض اور ان کی ادائیگی کا حکم ہے اور ہو سکتا ہے اس بارے میں مؤمنین سے کسی قسم کی لغزش سرزد ہو جائے۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے کہ فرشتے مؤمنین کی امداد کے لیے آگے بڑھتے ہیں اور ان کی لغزشوں کی معافی چاہتے ہیں اور خدا سے ان کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں۔

لیکن دوسری تفسیر کی بنا پر ملائکہ کی حمد و تسبیح خداوند عالم کو دی جانے والی شرک کی نسبت کے سلسلے میں ہے اور ان کی استغفار بھی مشرکین کے لیے ہے۔ کہ وہ بیدار ہو کر ایمان لے آئیں، توحید کی راہ پر گامزن ہو کر وحدہ لاشریک خدا کی طرف لوٹ جائیں۔

جب فرشتے مؤمنین کے بارے میں ان کے اس عظیم گناہ کے لیے استغفار کرتے ہیں تو دوسرے گناہوں کے لیے تو بطریق اولیٰ استغفار کریں گے اور آیت میں استغفار کا مطلق ہونا بھی شاید اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

اس عظیم خوشخبری کے مانند سورۂ مؤمن کی ساتویں آیت میں بھی ایک بشارت ہے:

الذین یحملون العرش ومن حولہ یسبحون بحمد ربھم و
یؤمنون بہ ویستغفرون للذین اٰمنوا ربنا وسعت کل شیء رحمۃ وعلما
فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلک

حاملین عرش اور جو فرشتے عرش کے اطراف میں ہیں اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح بجالاتے ہیں اور مؤمنین کے لیے استغفار کرتے ہیں اور کہتے ہیں پروردگارا! تیری رحمت اور علم نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے جن مؤمنین نے تیرے راستے کی پیروی کی ہے انہیں بخش دے۔

آخر میں خداوند عالم کی چھٹی اور ساتویں صفات کا ذکر فرمایا گیا ہے جو رحمت اور مغفرت کے بارے میں ہے اور مسئلہ

اور اس کے مطالب ومضامین اور مومنین کے فرائض کے سلسلے میں ہے ارشاد فرمایا گیا ہے: آگاہ رہو! خداوند عالم بخشنے والا مہربان ہے (الا ان اللہ ھو الغفور الرحیم)۔

تو اس طرح سے مسئلہ وحی سے متعلق خداوند عالم کے اسمائے حسنہ بیان ہوئے ہیں اور ان کے ضمن میں مومنین کے بارے میں فرشتوں کی دعا کی قبولیت بلکہ اس پر رحمت الٰہی کے اضافے کی طرف اشارہ ہے جو اس کا فضل عظیم ہے۔

"وحی" کی حقیقت کے بارے میں اسی سورت کے آخر میں ۵۱، ۵۲ ویں آیات کی تفسیر میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

آیا فرشتے سب کیلئے استغفار کرتے ہیں؟

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ "ویستغفرون لمن فی الارض" کا جملہ مطلق ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام روئے زمین پر رہنے والوں کے لیے فرشتے استغفار کرتے ہیں، خواہ وہ مومن ہوں یا کافر، آیا یہ بات ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب سورۂ مومن کی ساتویں آیت میں دیا جا چکا ہے جہاں فرمایا گیا ہے "ویستغفرون للذین اٰمنوا" وہ باایمان لوگوں کے لیے استغفار کرتے ہیں اور پھر یہ کہ فرشتے معصوم ہیں اور ان لوگوں کے لیے ہرگز محال چیز کا تقاضا نہیں کرتے جو بخشش کی لیاقت نہیں رکھتے۔

۶۔ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ اللّٰهُ حَفِیْظٌ عَلَیْهِمْ ۖ٘ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ○

۷۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَ تُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَ فَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ ○

۸۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ○

ترجمہ

۶۔ جنہوں نے خدا کے علاوہ اوروں کو اپنا ولی بنایا ہے اللہ ان کے تمام اعمال کا حساب محفوظ رکھتا ہے اور تیرا یہ کام نہیں ہے کہ انہیں حق کے قبول کرنے پر مجبور کرے۔

۷۔ اور اس طرح ہم نے تیری طرف (فصیح) عربی قرآن نازل کیا ہے تاکہ ام القریٰ اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو ڈرائے اور انہیں اس روز سے بھی خوف دلائے جس میں تمام لوگ جمع ہوں گے اور اس میں کسی قسم کا شک بھی نہیں ہے، وہی دن جس میں کچھ لوگ تو بہشت میں اور کچھ جہنم میں ہوں گے۔

۸۔ اور اگر خدا چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت قرار دیتا (اور انہیں زبردستی ہدایت کرتا) لیکن

زبردستی ہدایت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا) لیکن خدا جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کر دیتا ہے اور ظالموں کے لیے کوئی ولی اور مددگار نہیں ہے۔

تفسیر

"ام القریٰ" سے قیام

چونکہ گذشتہ آیات میں شرک کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہوچکا ہے لہٰذا زیرِ نظر آیات میں سے پہلی آیت میں مشرکین کے انجام کی نشاندہی کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: جن لوگوں نے خدا کے علاوہ دوسرے لوگوں کو اپنا ولی بنایا ہے خدا ان کے اعمال کا حساب محفوظ رکھتا ہے اور ان کی نیتوں سے آگاہ ہے (والذین اتخذوا من دونہ اولیاء اللہ حفیظ علیھم)۔

تاکہ موقع پر ہی ان کا حساب چکا دے اور انہیں ضروری سزا دے دے۔

پھر روئے سخن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر کے فرمایا گیا ہے: تیرا یہ کام نہیں ہے کہ انہیں حق قبول کرنے پر مجبور کرے (وما انت علیھم بوکیل)۔

آپ کا کام تو صرف تبلیغ رسالت اور خدا کے احکام خدائی بندوں تک پہنچانا ہے۔ اس جملہ سے ملتے جلتے اور بھی بہت سے جملے قرآن مجید میں ملتے ہیں جیسے:

لست علیھم بمصیطر
تیرا کنٹرول تو نہیں ہے (غاشیہ/۲۲)

وما انت علیھم بجبار
تیرا کام انہیں مجبور کرنا نہیں (ق ۴۵)

وما جعلناک علیھم حفیظًا
ہم نے تجھے ان کے اعمال کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا (انعام/۱۰۷)

ماعلی الرسول الا البلاغ
رسول کا کام صرف تبلیغ و پیام رسانی ہے (مائدہ/۹۹)

یہ آیات اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ خداوند تبارک وتعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندے آزاد رہ کر اس کے راستے کو اپنائیں کیونکہ ایمان اور عمل صالح کی حقیقی قدر وقیمت بھی اسی وقت ہوتی ہے جب اسے بغیر کسی پابندی کے اپنایا جائے اور مجبوری سے لایا جانے والا ایمان اور انجام دیا جانے والا عمل صحیح معنوں میں کسی قدر وقیمت اور اہمیت کا حامل

نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ایک بار پھر مسئلہ وحی کو بیان کیا جا رہا ہے اور اگر سابقہ آیات میں خود وحی کی بات ہو رہی تھی تو یہاں پر وحی کا مقصد بتایا جا رہا ہے، فرمایا گیا ہے: اور اسی طرح ہم نے تیری طرف فصیح عربی قرآن نازل کیا ہے اور تجھ پر اس کی وحی کی ہے۔ تاکہ تو ام القریٰ (مکہ) اور اس کے اردگرد والوں کو ڈرائے (وکذالك اوحینا الیك قرانا عربیًا لتنذر ام القرٰی ومن حولها)۔

اور انہیں اس دن سے ڈرائے کہ جس دن تمام لوگ جمع ہوں گے اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ بھی نہیں ہے (و تنذر یوم الجمع لا ریب فیه)۔

جس دن کہ لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے "ایک گروہ بہشت میں اور ایک جہنم کی آگ میں ہوگا" (فریق فی الجنة و فریق فی السعیر)۔

"کذالك" کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جس طرح ہم نے گزشتہ انبیاء کی طرف ان کی اپنی زبان میں وحی نازل کی ہے آپ کی طرف بھی اسی طرح قرآن عربی زبان میں وحی کیا ہے۔ (بنابریں "کذالك" کا اشارہ "والی الذین من قبلك" کی طرف ہوگا)۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعد کے جملے کی طرف اشارہ ہو یعنی آپ پر ہماری وحی اس طرح ہے: قرآن کو عربی زبان میں اور ڈرانے کی غرض سے۔

یہ ٹھیک ہے کہ "فریق فی الجنة و فریق فی السعیر" سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ پیغمبر خدا کا فریضہ انذار بھی ہے اور بشارت دینا بھی ہے۔ لیکن چونکہ "انذار" کی تاثیر خصوصاً نادان اور ہٹ دھرم لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتی ہے لہٰذا آیت میں بھی دو مرتبہ "انذار" کو بیان کیا گیا ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے پہلے مرحلے میں ڈرائے جانے والے لوگوں کی بات ہے اور دوسرے مرحلے میں جس چیز سے ڈرایا جا رہا ہے یعنی قیامت کی۔

جس دن کہ تمام انسانوں کے اجتماع کی وجہ سے ذلت و رسوائی سخت اور دردناک ہوگی۔[1]

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آیا "لتنذر ام القرٰی ومن حولها" سے یہ بات نہیں سمجھی جاتی کہ قرآن کے نزول کا مقصد مکہ اور اس کے اطراف کے لوگوں کو ڈرانا نہیں ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر یہ بات اسلام کے عالمگیر ہونے کے منافی نہیں ہے؟

لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ "ام القریٰ" کا کلمہ دو الفاظ سے مرکب ہے ایک "ام" ہے جس کا اصل معنی کسی چیز کی بنیاد، ابتدا اور آغاز ہے اور "ماں" کو "ام" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اولاد کے لیے اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

[1] توجہ رہے کہ "انذار" دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور زیر نظر آیات میں پہلے جملہ میں اس کا پہلا مفعول ذکر ہوا ہے اور دوسرے جملے میں اس کا دوسرا مفعول۔ البتہ کبھی اس کا دوسرا مفعول "با" کے ساتھ آتا ہے اور کہتے ہیں "انذرہ بذالك"۔

جبکہ "قریٰ" "قریہ" کی جمع ہے جس کا معنی ہر قسم کی آبادی ہے خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی۔ شہر بڑے ہوں یا چھوٹے، اس بات کے شواہد قرآن میں بہت ملتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ "مکہ" کو "ام القریٰ" (تمام آبادیوں کی اصل و بنیاد) کس لیے کہتے ہیں؟ چنانچہ روایات اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ پہلے پہل تمام زمین، پانی میں غرق تھی اور آہستہ آہستہ خشکی پانی سے ظاہر ہونا شروع ہوئی (جدید سائنس بھی اسی نظریے کی تائید کرتی ہے)۔

یہی روایات کہتی ہیں کہ سب سے پہلے جس سرزمین نے پانی سے سر نکالا "خانہ کعبہ" تھا پھر اس کے اطراف کی زمین ظاہر ہونا شروع ہوئی جسے "دحوالارض" (یعنی زمین کا پھیلنا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس تاریخی پس منظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ روئے زمین کی تمام آبادیوں کی بنیاد، اصل اور نقطہ آغاز ہے۔ اسی لئے جب بھی "ام القریٰ ومن حولها" کہا جاتا ہے اس سے مراد روئے زمین کے تمام لوگ ہوتے ہیں۔[1]

علاوہ ازیں ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسلام نے تدریجی ترقی کی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلے پہل حکم ہوا کہ وہ اپنے قریب کے رشتہ داروں کو تبلیغ کریں جیسا کہ سورۂ شعراء کی ۲۱۴ ویں آیت میں ہے "وانذر عشيرتك الاقربين" تاکہ اس طرح سے اسلام کی بنیادیں مضبوط ہوں اور بڑھنے پھیلنے کے لیے آمادہ ہو۔

پھر دوسرے مرحلے میں آپ کو حکم ہوا کہ عرب قوم کو تبلیغ وانذار کریں، جیسا کہ سورۂ حٰم سجدہ کی تیسری آیت میں آیا ہے:

قرانا عربيا لقوم يعلمون

یہ قرآن عربی ہے اس قوم کے لیے جو فہم و ادراک رکھتی ہے۔[2]

سورۂ زخرف کی ۴۴ ویں آیت میں بھی ہے:

وانه لذكر لك ولقومك

یہ قرآن تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے یاد آوری ہے۔

چنانچہ جب اس قوم میں اسلام کی بنیادیں پختہ ہوگئیں تو پھر آپ کو وسیع اور عالمی سطح پر تبلیغ اسلام کا حکم ہوا جیسا کہ سورۂ فرقان کے آغاز میں ہے،

تبارك الذى نزل الفرقان على عبده ليكون للعالمين نذيرا

---

[1] یہ تعبیر سورۂ انعام کی آیت ۹۲ میں بھی آئی ہے اور ہم نے اس بارے میں مذکورہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں تفسیر نمونہ کی تیسری جلد میں مزید تفصیل بیان کی ہے۔

[2] یہ اس صورت میں ہے جب "عربی" کا معنی "عربی زبان" کیا جائے۔ لیکن اگر اس کا معنی "فصیح" کیا جائے تو پھر اس کا مفہوم کچھ اور ہوگا۔

بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کو ڈرائے۔

یہ اور اس قسم کی کئی دوسری آیات ہیں۔

یہ اسی حکم کی وجہ تھی کہ اس زمانے میں پیغمبر اسلام علیہ وآلہ السلام نے جزیرۃ العرب سے باہر کے بادشاہوں کے نام خطوط روانہ کئے اور کسریٰ، قیصر اور نجاشی جیسے بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دی۔

اور انہی خطوط اور بنیادوں پر ہی آپ کے بعد آپ کے پیروکاروں نے تبلیغ اسلام کا سلسلہ جاری رکھا اور عالمی سطح پر آگے بڑھ کر پوری دنیا میں اسلام کو روشناس کروایا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کو " یوم الجمع " کیوں کہتے ہیں ؟ چنانچہ اس بارے میں کئی تفسیریں ملتی ہیں۔

کئی مفسرین کہتے ہیں چونکہ اس دن ارواح اور اجسام جمع ہوں گے۔

بعض کہتے ہیں چونکہ اس دن انسان اور اس کے اعمال جمع ہوں گے۔

بعض کہتے ہیں چونکہ اس دن ظالم اور مظلوم جمع ہوں گے۔

لیکن بظاہر یہ ہے کہ اس عظیم دن میں تمام مخلوقات جمع ہوں گی خواہ وہ اولین میں سے ہوں یا آخرین میں سے جیسا کہ سورہ واقعہ کی ۴۹- ۵۰ آیت میں آیا ہے : (قل ان الاولین والاٰخرین لمجموعون الی میقات یوم معلوم)۔

اور چونکہ " فریق فی الجنة وفریق فی السعیر " کا جملہ لوگوں کی دو حصوں میں تقسیم کی نشاندہی کرتا ہے لہٰذا بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے : اگر خدا چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت قرار دیتا ان کو جبری طور پر ہدایت کرتا اور مؤمن بناتا (ولو شاء الله لجعلهم امة واحدة)۔

لیکن جبری طور پر ایمان لانے کا کیا فائدہ ؟ اور یہ انسانی کمال کا معیار کیونکر قرار پا سکتا ہے ؟ حقیقی تکامل اور ارتقاء وہی ہو ہے جو انسان اپنے ارادے، اختیار اور مکمل آزادی سے طے کرے۔

قرآنی آیات، انسان کی آزادی، ارادے اور اختیار کے دلائل سے معمور ہیں اصولی طور پر انسان کو یہی چیز دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اگر انسان سے آزادی چھین لی جائے تو گویا اس سے انسانیت چھین لی جاتی ہے۔

یہ ایک عظیم ترین امتیاز اور اعزاز ہے جو خدا نے انسان کو عطا فرمایا ہے اور تکامل وارتقاء کا غیر محدود راستہ بھی اس کے لیے کھول دیا گیا ہے اور یہ خداوند عالم کی ناقابل تردید اور اٹل سنت ہے۔

تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ اب بھی کچھ نا آگاہ اور بے خبر لوگ ایسے ہیں جو جبر کے عقیدے کی حمایت کرتے ہیں اور طرۃ یہ کہ انبیاء کے پیروکار بھی کہلاتے ہیں۔ حالانکہ جبر کے عقیدے کو مان لینا تمام انبیاء کے مسلک کی نفی اور انکار کے مترادف ہے، اس طرح نہ تو فرائض وواجبات کا کوئی مفہوم ہوگا، نہ سوال وجواب کا اور نہ ہی وعظ ونصیحت کا حتیٰ کہ ثواب اور عقاب یعنی جزا اور سزا اپنی حیثیت کھو دیں گے۔

اس طرح سے نہ تو انسان اپنے اعمال پر نظر ثانی کر سکتا ہے، نہ ندامت اور پشیمانی کا کوئی مفہوم ہوگا اور نہ ہی توبہ اور

گزشتہ اعمال کی اصلاح کی ضرورت ہوگی۔

پھر اس بارے میں ایک اور اہم مسئلہ بیان فرمایا گیا ہے اور ایسے لوگوں کی تعریف اور توصیف کی گئی ہے جو بہشت کے مستحق اور سعادت مند ہیں اور یہ ان لوگوں کے مقابلہ میں ہے جو جہنم میں جائیں گے۔ ارشاد ہوتا ہے: لیکن خدا جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کر دے اور ظالموں کے لیے کوئی ولی اور مددگار نہیں ہے (ولکن یدخل من یشاء فی رحمتہ والظالمون مالھم من ولی ولا نصیر)۔

چونکہ دوزخی لوگوں کو "ظلم" کی صفت سے موصوف کیا جا رہا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے جملے میں "من یشاء" (جسے چاہے) سے مراد وہ لوگ ہیں جو ظالم نہیں ہیں اور اس طرح سے گویا عادل افراد بہشتی اور ظالم جہنمی ہیں۔

لیکن توجہ رہے کہ اس آیت میں اور قرآن مجید کی بہت سی دوسری آیات میں لفظ "ظالم" وسیع معنی ہے اور صرف ان لوگوں کے لیے نہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کے لیے بھی ہے جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں یا عقیدے کے لحاظ سے گمراہ ہیں اور شرک و کفر سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے؟ حضرت لقمان اپنے فرزند سے فرماتے ہیں:

یا بنیّ لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم

میرے بیٹے خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ کہ شرک عظیم ظلم ہے۔ (لقمان/۱۳)

ایک اور آیت میں ہے:

الا لعنۃ اللہ علی الظالمین الذین یصدون عن سبیل اللہ و یبغونھا عوجًا وھم بالاٰخرۃ ھم کافرون

خبردار رہو کہ خدا کی لعنت ظالموں پر ہے وہی کہ جو لوگوں کو راہ حق سے روکتے ہیں اور اسے تبدیل کر دیتے ہیں اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ (ہود-۱۹)

"ولی" اور "نصیر" کے درمیان فرق کے بارے میں بعض کہتے ہیں "ولی" وہ ہوتا ہے جو کسی درخواست کے بغیر کسی انسان کی مدد کرے لیکن "نصیر" کا معنی اس سے عام ہے[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ "ولی" ایسے سرپرست کی طرف اشارہ ہے جو ولایت کے حکم کے تحت اور کسی درخواست کے بغیر حمایت اور مدد کرتا ہے اور "نصیر" وہ فریادرس ہے جو امداد کی درخواست کے بعد انسان کی امداد کو آتا ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" طبرسی جلد ۸ صفحہ ۲۷۹ (سورۂ عنکبوت کی آیت ۲۲ کے ذیل میں)۔

۹۔ اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۚ فَاللّٰہُ ہُوَ الۡوَلِیُّ وَ ہُوَ یُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ؏

۱۰۔ وَ مَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِیۡہِ مِنۡ شَیۡءٍ فَحُکۡمُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبِّیۡ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ٭ۖ وَ اِلَیۡہِ اُنِیۡبُ ○

۱۱۔ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا وَّ مِنَ الۡاَنۡعَامِ اَزۡوَاجًا ۚ یَذۡرَؤُکُمۡ فِیۡہِ ؕ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ۚ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ○

۱۲۔ لَہٗ مَقَالِیۡدُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ○

ترجمہ

۹۔ آیا انہوں نے خدا کے علاوہ دوسروں کو اپنا ولی بنالیا ہے ؟ جبکہ ولی تو صرف اللہ ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔

۱۰۔ تم جس چیز میں بھی اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے، وہی خدا میرا پروردگار ہے، میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف پلٹ جاؤں گا۔

۱۱۔ وہی آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے اور تمہاری جنس ہی سے تمہارے لیے جوڑا

بنایا ہے اور جانوروں میں بھی جوڑے بنائے ہیں۔ اور اسی (جوڑے ہونے کے) کے ذریعے تمھاری تعداد بڑھاتا ہے، اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے وہی سننے اور دیکھنے والا ہے۔

۱۲- آسمانوں اور زمین کی چابیاں اسی کے پاس ہیں۔ جس کے لیے چاہتا ہے اس کا رزق وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے محدود کر دیتا ہے یقیناً وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

ولی مطلق صرف خدا ہے

چونکہ گزشتہ آیات کی تفسیر میں یہ حقیقت بیان ہوئی تھی کہ خدا کے سوا کوئی بھی ولی اور مددگار نہیں ہے۔ زیرِ نظر آیات میں اس حقیقت کی تائید اور غیر خدا کی ولایت کی نفی میں کچھ معتبر اور مضبوط دلائل پیش کیے جا رہے ہیں، چنانچہ سب سے پہلے تعجب اور انکار کے انداز میں ارشاد فرمایا گیا ہے، آیا انہوں نے خدا کے علاوہ دوسروں کو اپنا ولی بنا لیا ہے (ام اتخذوا من دونه اولیاء)[1]

جبکہ ولی تو صرف خدا ہے (فالله هو الولی)۔

لہٰذا اگر وہ اپنے لیے کوئی ولی اور سرپرست بنانا بھی چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ خدا کو ہی بنائیں کیونکہ گزشتہ آیات میں اس کی ولایت کے دلائل اس کی صفات کمالیہ کے ساتھ ہی بیان ہو چکے ہیں یعنی جو خداوند عزیز و حکیم ہے، جو مالک، علی اور عظیم ہے، جو غفور اور رحیم ہے۔ یہ سات اوصاف جو ابھی بیان ہو چکے ہیں بذات خود خداوند عالم کی ولایت کے لیے بہترین دلیل ہیں۔

اس کے بعد ایک اور دلیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے (وهو یحی الموتیٰ)۔

اور چونکہ معاد اور قیامت کا معاملہ اسی کے ہاتھ میں ہے اور انسان کی سب سے بڑی پریشانی اس کی مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کی کیفیت کے بارے میں ہے لہٰذا اسی کی ذات پر توکل کرنا چاہیے نہ کہ کسی اور پر۔

پھر تیسری دلیل بیان فرماتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہی ہر چیز پر قادر و توانا ہے (وهو علیٰ کل شیء قدیر)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "ولی" ہونے کی اصل شرط قدرت رکھنے اور صحیح معنوں میں قادر ہونے میں مضمر ہے۔

---

[1] زمخشری نے کشاف میں اور فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور دوسرے بہت سے مفسرین نے یہاں پر "ام" کا معنی استفہام انکاری لیا ہے۔ اور بعض دوسرے مفسرین مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں اور قرطبی نے الجامع لاحکام القرآن میں اس کا معنی "بل" کا لیا ہے۔

بعد کی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی ولایت کی چوتھی دلیل کو اس صورت میں بیان کرتا ہے: "تم جس چیز میں اختلاف کرو گے اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھوں میں ہے" اور وہی تمہارے اختلافات ختم کر سکتا ہے (وما اختلفتم فیہ من شیء فحکمہ الی اللہ)۔

جی ہاں! ولایت کی ایک شان یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس کے پرچم تلے زندگی بسر کر رہے ہوں اگر ان کے درمیان کسی قسم کا اختلاف ہو جائے تو وہ صحیح فیصلے کے ذریعے اس اختلاف کو ختم کر دے۔ کیا بت یا شیاطین کہ جنہیں معبود بنا لیا گیا ہے اس بات کی قدرت رکھتے ہیں یا پھر یہ کام خداوند عالم کی ذات کے ساتھ خاص ہے؟ جو ہر قسم کے اختلافات حل کرنے کے ذریعوں سے بھی آگاہ ہے حکیم بھی ہے اور اپنے فیصلہ پر عملدرآمد کروانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا خداوند عزیز و حکیم ہی کو حاکم ہونا چاہیئے نہ کہ کسی اور کو۔

اگرچہ بعض مفسرین نے "ما اختلفتم فیہ من شیء" کے مفہوم کو آیات متشابہات کی تاویل کے بارے میں اختلافات یا صرف قانونی لڑائی جھگڑوں میں محدود کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے اور اس مفہوم میں ہر قسم کے اختلافات آجاتے ہیں خواہ وہ معارف الٰہیہ اور عقائد کے بارے میں ہوں یا احکام تشریعی کے بارے میں اور یا قانونی معاملات وغیرہ میں۔ کیونکہ انسانی معلومات محدود اور ناچیز ہوتی ہیں لہٰذا ان کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو علم حق کے سرچشمہ فیض اور وحی کے ذریعے دور کیا جانا چاہیئے۔

خداوند عالم کی پاک ذات میں ولایت کے انحصار کے مختلف دلائل ذکر کرنے کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی ارشاد فرمایا گیا ہے: "وہی خدا میرا پروردگار ہے" جس میں کمال کی یہ صفات پائی جاتی ہیں (ذالکم اللہ ربی)[1]

"اسی لیے تو میں نے اسے اپنا ولی اور مددگار منتخب کیا ہے، اسی پر توکل کیا ہے اور تمام مشکلات و مصائب کے وقت اسی کی جانب رجوع کرتا ہوں (علیہ توکلت و الیہ انیب)۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے "ذالکم اللہ ربی" کا جملہ خداوند عالم کی ربوبیت مطلقہ کی طرف اشارہ ہے یعنی ایسی مالکیت جس میں تدبیر بھی پائی جاتی ہو، اور ربوبیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو ربوبیت تکوینی جو کائنات کا نظام چلانے کے لیے ہوتی ہے اور دوسری ربوبیت تشریعی جو خداوند عالم کے سفیروں کے ذریعے احکام و قوانین وضع کرنے اور لوگوں کو ہدایت اور تبلیغ کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

اسی بنیاد پر اس کے بعد "توکل" اور "انابہ" کے الفاظ آئے ہیں جن میں سے پہلا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تکوینی نظام میں اپنے تمام امور کو خدا کے سپرد کر دیا جائے اور دوسرا اس امر کی جانب کہ تشریعی امور کی بازگشت بھی اسی کی ذات

---

[1] اس جملے کے آغاز میں لفظ "قل" مقدر ہے لہٰذا صرف یہی جملہ اور اس کے بعد کا جملہ پیغمبر اسلامؐ کی زبانی ادا ہو رہا ہے۔ اور "وما اختلفتم فیہ من شیء" کا جملہ پروردگار عالم کے بیانات کا تسلسل ہے اور جن لوگوں نے اس کے علاوہ کوئی اور مؤقف اپنایا ہے بظاہر وہ صحیح نہیں ہے۔

کی جانب ہے (غور کیجئے گا)۔[1]

بعد کی آیت خداوند کریم کی ولایت مطلقہ کی پانچویں دلیل بھی ہو سکتی ہے اور مقام ربوبیت اور توکل و انابہ کی لیاقت اور اہلیت کی دلیل بھی ہو سکتی ہے۔ فرمایا گیا ہے: وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو وجود بخشا ہے (فاطر السماوات والارض)۔

"فاطر" "فطر" (بروزن سطر) کے مادہ سے ہے جس کا اصل معنی کسی چیز کو پھاڑنا ہے۔ جو کہ "قطّ" کے مقابل میں ہے جس کا معنی بعض لوگوں کے بقول عرض میں کاٹنا ہے۔ گویا چیزوں کی تخلیق کے وقت عدم کا تاریک پردہ چاک ہو جاتا ہے اور ہستی اس سے باہر نکل آتی ہے۔ اسی مناسبت کے تحت ہی جب خرما کے خوشہ کا غلاف شق ہوتا ہے اور خوشہ اس سے باہر نکلتا ہے تو اسے "فطر" (بروزن شتر) کہتے ہیں۔[2]

البتہ یہاں پر آسمانوں اور زمین سے مراد تمام آسمان، زمین اور ان میں موجود تمام چیزیں ہیں۔ کیونکہ خداوند عالم کی خلاقیت ان سب پر محیط ہے۔

پھر خدا کے دوسرے افعال کی توصیف کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: تمہاری جنس ہی سے تمہارے لیے جوڑا بنایا ہے اور جانوروں کے بھی جوڑے بنائے ہیں اور تمہیں اس (جوڑے ہونے کے) ناطے سے بڑھاتا اور پھیلاتا ہے" (جعل لکم من انفسکم ازواجًا ومن الانعام ازواجًا یذرؤکم فیہ)[3]

یہ بذات خود پروردگار عالم کی تدبیر اور اس کی ربوبیت اور ولایت کی عظیم نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے انسانوں کے لیے جوڑا بھی انسانی جنس ہی سے بنایا ہے کہ ایک طرف تو روحانی طور پر اس کی تسکین و آرام کا سبب ہے اور دوسری طرف اس کی نسل کی بقاء، تولید اور اس کے وجود کو برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے۔

اگرچہ قرآن مجید نے "یذرؤکم" (تم انسانوں کو بڑھاتا اور پھیلاتا ہے) کہہ کر انسانوں کو مخاطب کیا ہے لیکن ظاہر سی بات ہے کہ نسل کے بڑھانے کا سلسلہ جانوروں اور دوسرے زندہ موجودات میں بھی جاری اور ساری ہے۔ لیکن درحقیقت خداوند عالم نے سب کو ایک خطاب میں جمع نہ کر کے انسانی عظمت کو برقرار رکھا ہے۔ لہٰذا خطاب صرف انسانوں ہی کو کیا ہے تاکہ دوسری چیزوں کا حکم بھی اس کے ضمن میں آجائے۔

---

[1] المیزان جلد ۱۸ ص ۲۳۔

[2] "فطر" کے معنی کے سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی تیسری جلد میں سورۂ انعام کی آیت ۱۴ کے ذیل میں دلچسپ گفتگو ہو چکی ہے یہاں پر اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

[3] "فیہ" کی ضمیر یا تو "تدبیر" کی طرف لوٹ رہی ہے یا پھر "جعل ازواج" کی طرف ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ "یذرؤ" "ذرأ" (بروزن "زرع") کے مادہ سے ہے جس کا معنی "تخلیق" اور "پیدائش" ہے۔ بلکہ تخلیق ایسی جس سے متعلق ظاہری طور پر منصۂ شہود پر آجائے اور یہ لفظ پھیلانے اور منتشر کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

اس آیت میں جو تیسری صفت بیان ہوئی ہے وہ یہ کہ "اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے" لیس کمثلہ شیء)۔

دراصل یہ جملہ تمام خدائی صفات کی معرفت کی بنیاد ہے۔ جب تک اس جملے کو پیش نظر نہ رکھا جائے خدا کی کسی بھی صفت کی حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ "معرفۃ اللہ" کی راہ کے راہیوں کے لیے جو سب سے زیادہ اور خطرناک مقام آتا ہے وہ ہے "تشبیہ کا مقام" کہ جہاں پر وہ اسے مخلوق کی صفات سے تشبیہ دیتے ہیں اور یہ امر اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ انسان شرک کی گھاٹی میں جا گرتا ہے۔

بالفاظ دیگر خدا ہر لحاظ سے غیر محدود اور لامتناہی وجود ہے اور اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ ہر لحاظ سے محدود اور متناہی ہے عمر، قدرت، علم، حیات، ارادہ، فعل غرض ہر لحاظ سے اور اسی چیز کا نام "تنزیہ" ہے جس کے ذریعے خداوند عالم کو ممکنات کے تمام نقائص سے پاک سمجھا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے مفہوم ایسے ہیں جو غیر خدا کے لیے تو ثابت ہیں لیکن ذات خداوند ذوالجلال کے لیے ان کا اطلاق بے معنی ہے۔ بطور مثال بعض کام ہمارے لیے آسان ہوتے ہیں اور بعض سخت، بعض چیزیں ہم سے دور ہیں اور بعض نزدیک، بعض واقعات ماضی میں رونما ہوئے ہیں اور بعض حال اور مستقبل میں رونما ہوں گے۔ اسی طرح بعض چیزیں ہمارے لیے چھوٹی ہیں اور بعض بڑی ہیں۔ کیونکہ ہمارا وجود محدود ہے اور دوسری چیزوں کے ساتھ موازنہ کرنے سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے لیکن جو وجود ہر لحاظ سے غیر متناہی ہے اور ازل اور ابد پر محیط ہے اس کے لیے اس قسم کے معانی کا تصور کرنا ہی غلط ہے۔ نزدیک یا دور کا سوال اس کے نزدیک بے معنی سی بات ہے۔ سب اس کے نزدیک ہیں۔ اس کے لیے مشکل اور آسان کی اصطلاح کوئی حقیقت نہیں رکھتی سب کام اس کے لیے آسان ہیں۔ ماضی اور مستقبل کا مفہوم اس کے لیے بے معنی مفہوم ہیں اس کے لیے سب حال ہی حال ہے اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ان معانی کے ادراک کے لیے خوب غور وخوض کی ضرورت ہے اور ذہن کو ان تمام چیزوں سے خالی کرنا ہوگا جن کا وہ خوگر ہو چکا ہے۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں وجود خدا کی معرفت تو آسان ہے لیکن اس کی صفات کی شناخت بہت ہی مشکل ہے۔ امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

و ما الجلیل واللطیف والثقیل والخفیف والقوی والضعیف فی خلقہ الا سواء

چیزیں خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی، بھاری ہوں یا ہلکی، طاقتور ہوں یا کمزور، تخلیق و پیدائش میں سب یکساں ہیں اور اس کی قدرت کے سامنے سب ایک سی ہیں[1]

آیت کے آخر میں اس کی پاک ذات کی ایک اور صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ سننے اور دیکھنے والا ہے (وھو السمیع البصیر)۔

جی ہاں وہی خالق بھی ہے اور مدبر بھی، سننے والا بھی ہے اور دیکھنے والا بھی۔ اس کے باوجود نہ تو اس کی کوئی مثال ہے نہ

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۴۔

شبیہ اور نظیر۔ اس لیے اسی کے سایۂ ولایت و ربوبیت میں پناہ لینی چاہیے اور اس کے غیر کی بندگی کا جُوا گردن سے اتار کر پھینک دینا چاہیے۔

زیرِ نظر آیات میں سے آخری آیت میں خداوند عالم کی تین اور صفات بیان کی جارہی ہیں کہ جن میں سے ہر ایک صفت ولایت اور ربوبیت کے مسئلے کو خاص انداز میں پیش کر رہی ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: آسمانوں اور زمین کی چابیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں (لہ مقالید السماوات والارض)۔

اسی لیے جو شخص بھی جو کچھ رکھتا ہے سب اسی کا ہے جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے اسی سے حاصل کرے صرف چابیاں ہی اس کے ہاتھ میں نہیں بلکہ زمین و آسمان کے خزانے بھی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں:

و للہ خزائن السماوات والارض

آسمانوں اور زمین کے خزانے خدا کے لیے ہیں۔ (منافقون / ۷)

"مقالید" "مقلید" (بروزن "اقلید") کی جمع ہے جس کا معنی ہے چابی۔ یہ کلمہ بہت سے مقامات پر کنایہ کی صورت میں کسی چیز پر کامل تسلط حاصل ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ اس کام کی چابی میرے ہاتھ میں ہے، یعنی وہاں تک رسائی اور اسے سر کرنے اور اس پر تسلط پانے کا سارا اختیار میرے پاس ہے۔ (اس لفظ کی اصل، اور خصوصیات کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۱۱ سورۂ زمر کی آیت ۶۳ کے ضمن میں بیان ہوئی ہے)۔

بعد کی صفت (جو کہ درحقیقت پہلی صفت کا نتیجہ ہے) کے بارے میں فرمایا گیا ہے: جس کے لیے چاہے رزق کو کشادہ کر دے اور جس کے لیے چاہے روزی تنگ کر دے (یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر)۔

چونکہ خزائن عالم اسی کے ہاتھ میں ہیں لہٰذا ہر شخص کا رزق و روزی بھی اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ اپنی مشیت کے مطابق جو کہ اس کی حکمت سے ظاہر ہوتی ہے اور بندگانِ خدا کی مصلحت بھی اسی میں ہوتی ہے رزق تقسیم کرتا ہے۔

چونکہ تمام موجودات کو رزق سے بہرہ مند کرنا، ان کی ضروریات اور دوسری بہت سی خصوصیات کو جاننے اور ان سے آگاہ ہونے پر موقوف ہے لہٰذا آخری صفت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وہ ہر چیز کو جانتا ہے (انہ بکل شیء علیم)۔

یہاں بعینہ وہی بات ہو رہی ہے جو سورۂ ہود کی چھٹی آیت میں آئی ہے کہ:

وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا و یعلم مستقرھا ومستودعھا کل فی کتاب مبین

روئے زمین پر کوئی بھی چلنے والا ایسا نہیں ہے جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔ وہ اس کے رہنے اور منتقل ہونے کی جگہ کو جانتا ہے۔ یہ سب کچھ کتاب مبین میں درج ہے۔

تو اس طرح سے چار آیات میں خدا کی گیارہ (ذاتی اور فعلی) صفات بیان ہوئی ہیں۔ یعنی اس کی ولایت مطلقہ، مردوں کو

زندہ کرنا، ہر چیز پر قدرت رکھنا، آسمان وزمین کی تخلیق، انسانوں کے جوڑے جوڑے بنانا اور انہیں پھیلانا اور بڑھانا، اس کا شریک نہ ہونا، سننے اور دیکھنے والا ہونا، آسمان وزمین کے خزانوں پر قدرت رکھنا، رازق ہونا اور تمام چیزوں سے آگاہ اور عالم ہونا۔

یہ صفات بیان کے لحاظ سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور سب اس کی ولایت اور ربوبیت کی دلیل ہیں نتیجتاً توحید عبادت کے ثبوت کا راستہ ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ **خدائی صفات کی معرفت:** چونکہ ہماری معلومات بلکہ ہمارا تمام وجود محدود ہے لہٰذا ہم لامحدود ذات خداوند عالم کی کنہ وحقیقت تک نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ کسی چیز کی حقیقت سے آگاہی دراصل اس کے احاطہ کرنے کے معنی میں ہوتا ہے، اسی لیے ایک محدود چیز کسی لامحدود ذات کا کیسے احاطہ کر سکتی ہے؟ نیز جس طرح اس کی ذات کی حقیقت سے آشنائی مشکل ہے اسی طرح اس غیر محدود ذات کی صفات کے بارے میں بھی آگاہی ہم جیسے محدود افراد کے بس سے باہر ہے کیونکہ اس کی صفات بھی تو عین ذات ہوتی ہیں۔

بنابریں ہم خدا کی ذات اور صفات کے بارے میں جو کچھ بھی جانتے یا سمجھتے ہیں وہ صرف اپنے ایک اجمالی علم کی بنا پر ہے جس کا زیادہ تر محور اس کے آثار ہیں۔

پھر یہ کہ ہمارے الفاظ، ہماری روزمرہ کی زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ہوتے ہیں اور برحق خدا کی لامحدود ذات اور صفات کو بیان نہیں کر سکتے۔ لہٰذا علم وقدرت، حیات وولایت اور مالکیت جیسے الفاظ جو کہ اس کی صفات ثبوتیہ اور صفات سلبیہ کو بیان کرتے ہیں درحقیقت ان کا اصل معنی کچھ اور ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ہمیں ایسی تعبیرات دیکھنے میں آتی ہیں جو بادی النظر میں تناقص اور متضاد معلوم ہوتی ہیں لیکن جب ان پر اچھی طرح غور وخوض کیا جائے تو کچھ اور حقیقت سامنے آتی ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ خدا "اول" بھی ہے اور "آخر" بھی "ظاہر" بھی ہے اور "باطن" بھی۔ سب کے ساتھ بھی ہے مگر ان کے ہمراہ نہیں، سب سے جدا ہے لیکن ان سے اجنبی نہیں۔

البتہ اگر ان الفاظ کے معیار اور مفہوم کے ساتھ محدود اور ممکن موجودات کے متعلق بات کریں تو یہ چیز سمجھ میں آتی ہے کہ جو چیز اوّل ہوتی ہے وہ آخر نہیں ہو سکتی اور جو ظاہر ہوتی ہے وہ باطن نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب ان الفاظ کو غیر متناہی اور لامحدود ذات کے افق میں دیکھنا چاہیں تو سب اس میں جمع ہیں۔ کیونکہ غیر متناہی وجود اول ہونے کے باوجود آخر ہے اور ظاہر ہونے کے ساتھ ساتھ باطن ہے۔

جب یہ بات سمجھ آگئی تو ہم یہیں پر ایک اور بات کہیں گے اور وہ یہ کہ اس کی جمالی اور جلالی صفات کی معرفت کے لیے جو سب سے ضروری اور اہم بات پیش نظر رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رہے کہ "نہ تو کوئی چیز اس کی مثل ہے اور نہ ہی وہ کسی کے مشابہ ہے" یعنی (لیس کمثلہ شیء)

امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اسی حقیقت کو بڑی وضاحت کے ساتھ نہج البلاغہ کے خطبات میں

بیان فرمایا ہے، مثلاً

ما وحده من كيفه، ولا حقيقته اصاب من مثله، ولا اياه عنى من شبهه، ولا صمده من اشار اليه و توهمه

جو شخص اس کی کیفیت کا قائل ہوا اس نے اسے اکیلا نہ جانا اور جس نے اس کے لیے شبیہ اور مثال قرار دی وہ اس کی ذات کی حقیقت تک رسائی حاصل نہ کر سکا اور جس نے اسے کسی کے مشابہ سمجھا اس نے اس کا قصد نہیں کیا اور جو اس کی طرف اشارہ کرے گا یا اپنے وہم و گمان میں لے آئے گا وہ اسے منزہ نہیں سمجھے گا۔[1]

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں :

كل مسمى بالوحدة غيره قليل

ہر وہ چیز جس کو وحدت کے نام سے موسوم کیا جائے وہ بہت قلیل اور کم مقدار میں ہوتی ہے سوائے ذات خدا کے کیونکہ اس کی وحدت اس کی غیر متناہی عظمت پر واضح دلیل ہے۔[2]

مختصر یہ کہ صفات خداوندی کے باب میں، ہمیشہ " ليس كمثله شیء " (اس کے مانند کوئی چیز نہیں) کا چراغ لے کر حرکت کرنی چاہیئے اور " لم يكن له كفوًا احد " (اس کے مانند و مشابہ کوئی چیز نہیں) کے پرتو میں اسے دیکھنا چاہیئے اور عبادات وغیرہ میں " سبحان الله " (وہ پاک و پاکیزہ ہے) کا ارشارہ بھی اسی حقیقت کی طرف ہے۔

۲۔ ایک ادبی نکتہ : " ليس كمثله شیء " میں " کاف " حرف تشبیہ ہے، جس کا معنی ہے " مثل " اور یہ پورا جملہ مل کر یہ معنی دے گا " اس کی مثل جیسی کوئی چیز نہیں " اس لفظی تکرار کی وجہ سے بہت سے مفسرین نے " کاف " کو زائدہ تسلیم کیا ہے جو عام طور پر تاکید کے لیے آتا ہے۔ فصحاء عرب کے کلام میں ایسی ہزاروں مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن یہاں پر ایک نہایت ہی لطیف تفسیر ملتی ہے اور وہ یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں تمھارے جیسے میدان سے فرار نہیں کرتے۔ یعنی تمھارے جیسے لوگوں کو میدان حوادث سے نہیں بھاگنا چاہیئے جن میں اس قدر شجاعت، بہادری، عقل اور ہوش و خرد ہو۔ (یعنی جن لوگوں میں تمھارے جیسی صفات پائی جائیں انہیں یہ کام کرنا چاہیئے)۔

زیر بحث آیات کا یہ معنی ہو گا : خداوند عالم کی مثل کی مثل کبھی نہیں ہو سکتی جس میں وسیع علم اور عظیم و لا متناہی صفات پائی جائیں۔

یہ نکتہ بھی پیش نظر رہے کہ بعض ارباب لغت کے بقول چند الفاظ ایسے ہیں جو " مثل " کا معنی دیتے ہیں۔ البتہ اس

---

[1] خطبہ ۱۸۶۔

[2] خطبہ ۶۵۔

کے مفہوم کے جامع ہونے کو نہیں پہنچ سکتے۔
" ندّ " (بروزن ضد) کا لفظ وہاں بولا جاتا ہے جہاں پر صرف جوہر اور ماہیت میں شباہت مقصود ہو۔
"شبہ" کا لفظ وہاں بولا جاتا ہے جہاں کیفیت کی بات درپیش ہو۔
" مساوی " کا اطلاق وہاں ہوتا ہے جہاں پر تعداد (کمیت) کی بات کرنی مقصود ہو۔
"شکل" وہاں پر بولتے ہیں جہاں پر مقدار کی بات ہو۔
لیکن "مثل" کا مفہوم وسیع اور عام ہے کہ جس میں سب مفاہیم جمع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب خداوند عالم اپنی ذات سے ہر قسم کی شبیہ و نظیر کی نفی کرنا چاہتا ہے تو فرماتا ہے "لیس کمثلہ شیء"[1]

۳۔ خدا کے رازق ہونے کے بارے میں کچھ باتیں۔

(الف) : روزی کے وسیع اور تنگ ہونے کا معیار کیا ہے ؟ یہ بات تو ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیئے کہ کسی کے رزق کی وسعت کا ہمیشہ یہ مطلب نہیں کہ خدا اس پر راضی ہے اور کسی پر رزق کی تنگی سے ہمیشہ یہ مراد نہیں کہ خدا اس پر ناراض ہے۔ کیونکہ خدا کبھی انسان کو روزی کی وسعت کے ذریعے آزماتا ہے اور بے انتہا مال اس کے اختیار میں دے دیتا ہے اور کبھی معیشت کی تنگی کی وجہ سے اس کے صبر، استقامت اور پامردی کا امتحان لینا چاہتا ہے اور اس طرح سے ان صفات کو پروان چڑھاتا ہے۔

کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ مال و دولت کی فراوانی صاحبان مال کے لیے وبال جان بن جاتی ہے اور ان سے ہر قسم کا سکھ اور چین چھین لیتی ہے چنانچہ سورۂ توبہ کی ۵۵ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے :

فلا تعجبك اموالهم ولا اولادهم انما يريد الله ليعذبهم بها في الحيوة الدنيا و تزهق انفسهم وهم كافرون

ان لوگوں کے مال و دولت اور اولاد کی فراوانی تجھے حیران نہ کر دے، خدا تو یہی چاہتا ہے کہ انھیں اس ذریعے سے دنیاوی زندگی میں عذاب دے اور وہ کفر کی حالت میں مریں۔

سورۂ مؤمنون کی آیات ۵۵۔۵۶ میں فرمایا گیا ہے :

ايحسبون انما نمدهم به من مال و بنين نسارع لهم في الخيرات بل لا يشعرون

کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم نے جو انہیں مال و اولاد عطا کی ہے اس لیے ہے کہ ان پر اچھائیوں کے دروازے کھول دیئے ہیں، ایسا نہیں ہے، وہ اس بات کو نہیں سمجھتے۔

(ب) : روزی کا مقرر کرنا اس کی تلاش کے منافی نہیں : روزی کے بارے میں خداوند عالم کی طرف سے

---

[1] مفردات راغب۔ مادہ "مثل"۔

تقدیر کی جو آیات قرآن مجید میں آئی ہیں ان سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ چونکہ خداوند عالم نے انسان کی روزی تو مقرر فرما ہی دی ہے لہٰذا اس بارے میں تلاش اور کوشش کی کیا ضرورت ہے۔ اس بات کو سستی کا بہانہ بنا کر انفرادی اور اجتماعی کوششوں سے فرار نہیں کرنا چاہیئے۔ وگرنہ یہ سوچ قرآن مجید کی ان اکثر و بیشتر آیات کے خلاف ہوگی جن میں سعی و کوشش اور تلاش وحصول کو کامیابی کا معیار سمجھا گیا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ تمام تلاش اور کوششوں کے باوجود بھی کبھی ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ کوئی ایسا ہاتھ کار فرما ہوتا ہے کہ ان سب کوششوں کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا اور کبھی اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے ایسا اس لیے ہے تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اس عالم اسباب کے پس پردہ ذات "مسبب الاسباب" کا دست قدرت کار فرما ہے۔

بہر حال سستی اور کاہلی کی وجہ سے حاصل ہونے والی محرومیوں کو ہرگز خدا کے کھاتے میں نہیں ڈالنا چاہیئے کیونکہ اس نے تو پہلے دن سے فرما دیا ہے کہ تلاش و کوشش کے مطابق روزی ملے گی۔

(ج)، **رزق صرف دنیاوی نعمتوں ہی کا نام نہیں**، رزق اور روزی کا وسیع معنی ہے جو معنوی اور روحانی روزی پر بھی بولا جاتا ہے۔ بلکہ حقیقت میں روزی کہتے ہی معنوی رزق کو ہیں۔ دعاؤں میں بھی اسی معنوی روزی کے بارے میں رزق کا لفظ اکثر مقام پر بولا گیا ہے۔ مثلاً حج کے بارے میں ہم دعا مانگتے ہیں۔

اللّٰھم ارزقنی حج بیتك الحرام

اطاعت کی توفیق اور معصیت سے دوری کے لیے کہتے ہیں:

اللّٰھم ارزقنی توفیق الطاعة وبعد المعصیة ..."

ماہ رمضان کی دعاؤں میں کہتے ہیں (۱۵ ویں روزے کی دعا میں):

اللّٰھم ارزقنی فیه طاعة الخاشعین

اور اسی طرح دوسری چیزوں کے بارے میں ہے۔

(د)، **قرآن مجید اور روزی کی کثرت**، قرآن مجید نے چند امور ایسے ذکر کیے ہیں جو بذات خود انسانی تربیت کے لیے تعمیری درس کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

لئن شکرتم لازیدنکم

اگر تم نے نعمتوں کا شکر ادا کیا (انہیں اپنے صحیح مصرف میں خرچ کیا) تو تمہیں زیادہ نعمتیں عطا کریں گا۔ (ابراہیم / ۷)

ایک دوسرے مقام پر لوگوں کو تلاش وحصول روزی کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

ھو الذی جعل لکم الارض ذلولاً فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقه

خدا تو وہ ذات ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے خاضع اور خاشع بنا دیا ہے تاکہ تم اس کی پشت پر چلو پھرو اور اس کے رزق سے کھاؤ پیو۔ (ملک / ۱۵)

ایک اور مقام پر تقویٰ اور پرہیز گاری کو وسعت رزق کا معیار بتایا ہے، ارشاد ہوتا ہے :

ولوان اھل القریٰ اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض

یعنی اگر روئے زمین کے لوگ ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کر لیں تو ہم آسمان وزمین کی برکتیں ان کے لیے کھول دیں۔ (اعراف/۹۶)

(ھ) : **رزق کی تنگی اور تربیتی مسائل** : بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگوں پر رزق کی تنگی اس لیے کی جاتی ہے تاکہ ان کی طرف سے پیدا ہونے والے فتنہ وفساد کے آگے بند باندھا جا سکے جیسا کہ اسی سورہ (شوریٰ) کی ۲۷ ویں آیت میں ہے :

ولو بسط اللہ الرزق لعبادہ لبغوا فی الارض

اگر خدا اپنے بندوں کے لیے روزی کشادہ کر دے تو وہ ظلم وطغیان کی راہ اختیار کریں۔

(و) : **رزق صرف خدا کے ہاتھ میں ہے** : قرآن مجید نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انسانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنا روزی رسان صرف خدا کو جانیں اور غیر خدا سے کبھی روزی نہ مانگیں اور اس کے ساتھ ساتھ خدا پر ایمان اور توکل کے بعد سعی وکوشش سے کام لیں سورۂ فاطر کی تیسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض

آیا خدا کے علاوہ کوئی اور خالق ہے جو تمہیں زمین وآسمان سے روزی بہم پہنچائے ؟

سورۂ عنکبوت کی آیت ۱۷ میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

فابتغوا عند اللہ الرزق

رزق صرف خدا ہی سے مانگو۔

اس طرح کا حکم دے کر انسان کے اندر عزت نفس، بے نیازی، خودداری اور غیر وابستگی کی روح کو اجاگر کر دیا ہے۔

روزی کی تقسیم، زندگی بسر کرنے کے لیے رزق کی تلاش، روزی کے اسباب اور اس کے سرچشمے کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد ۶ (سورۂ نحل کی ۷۱ ویں آیت کے ذیل) میں اور جلد ۵ (سورۂ ہود کی چھٹی آیت کے ذیل) میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

۱۳۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝

۱۴۔ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝

ترجمہ

۱۳۔ تمھارے لیئے وہی دین مقرر کیا ہے کہ جس کے متعلق نوح کو ہدایت کی تھی اور وہ جو ہم نے تیری طرف وحی بھیجی اور جو ہدایت ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو کی (وہ یہ تھی) کہ دین کو قائم و برقرار رکھو اور اس میں تفرقہ ایجاد نہ کرو۔ ہر چند کہ تیری یہ دعوت مشرکین پر سخت گراں ہے، خدا جسے چاہے منتخب کرلیتا ہے اور جو اس کی طرف لوٹے اس کی ہدایت کرتا ہے۔

۱۴۔ وہ علم اور آگاہی کے بعد ہی تفرقہ کا شکار ہوئے ہیں اور یہ تفرقہ بازی حق سے انحراف (اور عداوت وحسد) کی وجہ سے تھی اور اگر تیرے پروردگار کی جانب سے فرمان صادر نہ ہو چکا ہوتا کہ وہ ایک خاص مقرر شدہ مدت تک کے لیے زندہ اور آزاد رہیں تو خدا نے ان کے درمیان

فیصلہ کر دیا ہوتا اور جو لوگ ان کے بعد کتاب کے وارث ہوئے ہیں وہ بدگمانی پر مبنی شک و شبہ میں مبتلا ہیں۔

تفسیر

آپ کا دین تمام انبیاءؑ کے دین کا نچوڑ ہے

اس سورہ کی اکثر گفتگو مشرکین سے متعلق ہے اور گزشتہ آیات میں بھی اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ لہٰذا زیر نظر آیات بھی اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ توحید الٰہی کی طرف اسلام کی دعوت کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ تمام اولوالعزم انبیاء کی دعوت ہے نہ صرف توحید کی حد تک، تمام بلکہ بنیادی مسائل میں تمام انبیاء کی دعوت کے اصول تمام آسمانی ادیان میں ایک ہی تھے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: خدا نے ایسا دین تمہارے لیے مقرر فرمایا ہے جس کی ہدایت پہلے اولوالعزم پیغمبر نوح کو فرمائی تھی (شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحًا)۔

"اور اسی طرح جس چیز کی ہم نے تیری طرف وحی بھیجی اور ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو اس کی سفارش کی" (والذی اوحینا الیك وما وصینا بہ ابراھیم و موسٰی و عیسٰی)۔

تو اس طرح سے جو کچھ گزشتہ پیغمبروں کی شریعتوں میں موجود تھا وہ سب کچھ آپ کی شریعت میں موجود ہے۔

ع آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری

"من الدین" کی تعبیر سے واضح ہوتا ہے آسمانی شریعتوں کی ہم آہنگی صرف توحید یا اصول دین کے دوسرے مسائل تک محدود نہیں ہے بلکہ دین الٰہی اساسی اور بنیادی لحاظ سے مجموعی طور پر ہر جگہ ایک ہے ہر چند کہ انسانی معاشرے کے ارتقائی تقاضوں کے تحت فروعی قوانین کو انسان کے ارتقائی مراحل سے ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ بالتدریج اپنی آخری حد اور "خاتم ادیان" تک پہنچ جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کی دیگر آیات میں بہت سارے شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تمام ادیان کے عقائد، فرائض اور قوانین کے کلی اصول ایک جیسے ہیں۔

مثلاً قرآن مجید میں بہت سے انبیاء کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ ان کی ابتدائی دعوت یہی تھی "یا قوم اعبدوا اللہ"[1]

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ اعراف کی آیات ۵۹، ۶۵، ۷۳، ۸۵۔ سورۂ ہود کی آیات ۵۰، ۶۱، ۸۴ جو بالترتیب جناب نوح، ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام کے بارے میں ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے :

و لقد بعثنا فی کل امۃ رسولاً ان اعبدوا اللہ

ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو کہے کہ خدائے واحد کی عبادت کرو۔

قیامت کے بارے میں ڈرانے کا سلسلہ بھی بہت سے انبیاء کی دعوت میں آیا ہے ملاحظہ ہوں سورۂ انعام کی ۱۳۰ ویں آیت، سورۂ اعراف کی ۵۹ ویں آیت، سورۂ شعراء کی ۱۳۵ ویں، سورۂ مریم کی ۳۱ ویں اور طٰہٰ کی ۱۵ ویں۔

حضرت موسیٰ، عیسیٰ اور شعیب علیہم السلام نماز کی تبلیغ کرتے ہیں ملاحظہ ہو سورۂ طٰہٰ / ۱۴، سورۂ مریم / ۳۱ اور سورۂ ہود / ۸۷، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام حج کی دعوت دیتے ہیں ملاحظہ ہو سورۂ حج / ۲۷۔

روزہ تمام گزشتہ اقوام میں تھا۔ ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ / ۱۸۳۔

لہٰذا آیت میں ایک کلی حکم کے تحت تمام انبیاء کے بارے میں فرمایا گیا ہے : ہم نے ان سب کو حکم دیا : دین کو قائم و برقرار رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو (ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ)۔

دو اہم امور کا حکم تھا، ایک تو تمام امور میں خدا کے دین کو قائم و برقرار رکھیں (صرف عمل کی حد تک نہیں بلکہ اسے قائم، زندہ اور برقرار بھی رکھیں) اور دوسرے بہت بڑی بلا سے پرہیز کریں یعنی دین میں تفرقہ اور نفاق ایجاد نہ کریں۔

اسی آیت میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے : ہر چند کہ تیری یہ دعوت مشرکین کے لیے سخت گراں ہے (کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ)۔

سالہا سال کے تعصب اور جہالت کی وجہ سے وہ لوگ شرک اور بت پرستی سے مانوس ہو چکے ہیں اور شرک ان کے وجود میں حلول کر چکا ہے جس کی بناء پر توحید کی دعوت سے انہیں وحشت ہوتی ہے علاوہ ازیں شرک سے مشرکین کے سرغنوں کے شخصی مفادات وابستہ ہیں جبکہ دعوت توحید تو مستضعفین کو ایسے لوگوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے پر آمادہ کرتی ہے اور مشرکین کی ہوا و ہوس پرستی اور مظالم کی روک تھام کرتی ہے۔

لیکن پھر بھی جس طرح انبیاء کا انتخاب خدا کے ہاتھ میں ہے اسی طرح لوگوں کی ہدایت بھی اسی کے دست قدرت میں ہے "خدا جسے چاہے منتخب کرے اور جو اس کی طرف لوٹ جائے اسے ہدایت کرتا ہے" (اللہ یجتبی الیہ من یشاء و یھدی الیہ من ینیب)۔

قابلِ غور نکات

۱۔ شَرَعَ "شرع" (بروزن "زرع") کا اصل معنی روشن اور واضح راستہ ہے اور جو راستہ نہر یا دریا میں داخل ہوتا ہے اسے بھی "مشریعۃ" کہتے ہیں۔ بعد ازاں یہ کلمہ خدائی ادیان اور آسمانی شریعتوں کے بارے میں استعمال ہونے لگا کیونکہ سعادت اور بھلائی کا روشن اور واضح راستہ انہی میں ہے اور ایمان، تقویٰ، صلح اور عدالت کے آب حیات تک پہنچنے کے لیے بھی یہی راستہ ہے۔

اور چونکہ پانی طہارت، پاکیزگی اور زندگی کا بہت بڑا ذریعہ ہے لہٰذا یہ لفظ بھی خدائی دین کے ساتھ واضح مناسبت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی معنوی لحاظ سے انسانی معاشرے اور انسان کی جان اور روح کے ساتھ وہی کچھ کرتا ہے جو پانی کرتا ہے [1]

۲۔ اس آیت میں خدا کے صرف پانچ انبیاء کی طرف اشارہ ہوا ہے (یعنی نوح، ابراہیم، موسٰی، عیسٰی اور حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرف) کیونکہ یہی پانچ اولوالعزم رسول ہیں یعنی نئے دین و آئین کے مالک صرف یہی پانچ بزرگوار ہیں در حقیقت یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شریعت صرف ان پانچ بزرگوں میں منحصر ہے۔

۳۔ سب سے پہلے حضرت نوحؑ کا ذکر ہے کیونکہ سب سے پہلی شریعت کہ جس میں ہر قسم کے عبادی اور اجتماعی قوانین موجود تھے آپ ہی سے آغاز ہوئی ہے اور آپ سے پہلے کے انبیاءؑ کے پاس محدود پروگرام اور احکام تھے [2]

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اور روایات میں نوح علیہ السلام سے پہلے کسی آسمانی کتاب کا ذکر نہیں ملتا۔

۴۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان پانچ اولوالعزم رسولوں میں سب سے پہلے جناب نوحؑ کا ذکر آیا ہے پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پھر ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسٰی علیہ السلام کا اور اس طرح کی ترتیب اس لیے ہے کیونکہ نوح علیہ السلام بوجہ آغاز گر شریعت کے پہلے ذکر ہوئے ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر بوجہ ان کی عظمت کے ہے پھر دیگر حضرات کا ذکر بلحاظ ان کے زمانہ کے ہے۔

۵۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں "اوحینا الیک" (ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی) کی تعبیر آئی ہے لیکن دوسرے انبیاء کے لیے "توصیہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے شاید یہ فرق اس لیے ہے کہ دوسرے آسمانی ادیان کی نسبت اسلام کی اہمیت کو واضح کیا جائے۔

۶۔ آیت کے آخر میں انبیاء کے انتخاب کے طریقہ کار کو "من یشاء" کے اشارہ کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے یعنی انبیاء کا انتخاب ان کی وجودی لیاقت کی بناء پر ہوتا ہے۔

لیکن امت کے بارے میں "من ینیب" (جو خدا کی طرف رجوع کرے، گناہوں سے توبہ کرے اور اطاعت اختیار کرے) کی تعبیر ہے تاکہ خداوند عالم کی ہدایت کا معیار اور اس کی شرائط سب لوگوں پر واضح ہو جائیں اور ان پر عمل پیرا ہو کر اس کے دریائے رحمت تک پہنچ جائیں۔

حدیث قدسی میں آیا ہے :

من تقرب منی شبرًا تقربت منہ ذراعًا ومن اتانی یمشی، اتیتہ ھرولۃ

جو ایک بالشت کے برابر میرے قریب ہوگا میں ایک ہاتھ کے برابر اس کے قریب ہوں گا۔ جو شخص چل کر میرے پاس آئے گا میں دوڑ کر اس کی طرف جاؤں گا [3]

---

[1] یہ معنی اجمالی طور پر لسان العرب، مفردات راغب اور لغت کی دوسری کتابوں میں آیا ہے۔

[2] اس سلسلے میں مزید تفصیل سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۳ کے ذیل (تفسیر نمونہ جلد اوّل) میں ملاحظہ فرمائیں۔

[3] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۲۷ ص ۱۵۷ (اسی آیت کے ذیل میں)۔

آخری جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "اجتباء" اور انتخاب صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ خدا کے وہ خالص و مخلص بندے جو اس مقام کی لیاقت کے حامل ہیں وہ بھی اس کا مصداق ہیں۔

چونکہ اولوالعزم انبیاء کی دعوت کے دو ارکان میں سے ایک دین میں تفرقہ بازی سے پرہیز ہے اور یقیناً ان سب نے اسی اساس پر تبلیغ بھی کی ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان مذہبی اختلافات کا سرچشمہ کیا ہے اور یہ کہاں سے پیدا ہوئے ہیں؟

بعد کی آیت اسی سوال کا جواب دیتی ہے اور دینی اختلافات کے سرچشمہ کی نشاندہی یوں کرتی ہے: انہوں نے تو تفرقہ بازی کا رستہ اُس وقت اختیار کیا جب ان پر اتمام حجت ہوگئی اور کافی حد تک علم ان کے پاس پہنچ گیا اور یہ فرقہ بازی دنیاوی محبت، جاہ طلبی، ظلم، حسد اور عداوت کی وجہ سے تھی" (وما تفرقوا الا من بعد ما جاءھم العلم بغیا بینھم)۔

جی ہاں ظالم دنیا پرست اور کینہ پرور حاسد لوگ انبیاء کے اس یکجہتی پر مبنی دین و آئین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ہر ایک گروہ کے لیے ایک ایک رستہ بنا کر انہیں اسی راہ پر لگا دیا تاکہ اس طرح سے اپنی حکومتوں کی بنیادوں کو مستحکم بنا سکیں، دنیاوی منفعت حاصل کر سکیں اور سچے مومنین اور انبیاء کے ساتھ اپنے بغض و حسد کو آشکار کر سکیں۔ لیکن یہ سب کچھ اتمام حجت ہو جانے کے بعد تھا۔

معلوم ہوا کہ ان کے مذہبی اختلافات کا سرچشمہ جہالت اور بے خبری نہیں بلکہ بغاوت، سرکشی، ظلم، راہ حق سے انحراف اور ذاتی آراتھیں۔

یہ آیت ان لوگوں کے لیے ایک واضح جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب نے آکر آدمیت کے درمیان اختلاف اور انتشار پیدا کر دیا ہے۔ اور پوری تاریخ میں منصب ہی خونریزی کا سبب بنا ہے۔ کیونکہ اگر اچھی طرح غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمیشہ مذہب ہی اپنے ماحول اور محیط میں اتحاد اور وحدت کا سبب رہا ہے۔ (جیسا کہ اسلام نے حجازی قبائل بلکہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر کی اقوام کو بھی ساتھ ملا کر اُن کے درمیان موجود اختلافات کو ختم کر کے انہیں "امت واحدہ" قرار دیا)۔

لیکن استعماری سیاست نے لوگوں کے درمیان تفرقہ پیدا کر دیا اور اختلافات کو ہوا دی جس سے لوگوں کا خون بہا اور سر بلند ہوئی۔ شخصی اور ذاتی خواہشات اور طریقہ کار کو مذہب میں شامل کر لیا گیا اور اسے آسانی مذاہب پر مسلط کر دیا گیا جس کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان تفرقہ بڑھ گیا۔ اور یہ سب کچھ لوگوں کی سرکشی یعنی "بغی" کے باعث ہوا۔ "بغی" کا اصلی معنی جو ارباب لغت نے ذکر کیا ہے کچھ اس طرح ہے "درمیانی خط سے انحراف و تجاوز کی طلب اور افراط و تفریط کی جانب رجحان" خواہ یہ طلب پایہ تکمیل تک پہنچے خواہ نہ پہنچے، کبھی تو یہ طلب افراط و تفریط کسی چیز کی کمیت میں ہوتی ہے اور کبھی کیفیت میں۔ اسی لیے عام طور پر یہ لفظ ظلم کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ کبھی ہر قسم کی "طلب اور حصول" کے معنی میں بھی آتا ہے ہر چند کہ یہ امر مناسب ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا راغب نے مفردات میں "بغی" کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک "قابل تعریف" اور دوسرا "قابل مذمت"

پہلا عدالت کی حد سے بڑھ کر احسان اور ایثار تک اور واجبات سے بڑھ کر مستحبات تک جا پہنچنے کے معنی میں اور دوسرا حق سے ہٹ کر باطل کی طرف جھک جانے کے معنی میں آتا ہے۔

پھر خداوند عالم فرماتا ہے: اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے فرمان جاری نہ ہو چکا ہوتا کہ وہ ایک مقررہ وقت تک کے لیے زندہ اور آزاد رہیں تو خدا نے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا ہوتا یعنی وہ باطل کے طرفداروں کو نیست و نابود کر دیتا اور حق کے پیروکاروں کو کامیابی عطا کرتا (ولولا کلمة سبقت من ربك الی اجل مسمی لقضی بینهم)۔

یقیناً یہ دنیا آزمائش، نشوونما اور ارتقاء کا گھر ہے اور یہ چیز آزادی عمل کے بغیر امکان پذیر نہیں ہے۔ یہ خداوند عالم کا تکوینی فرمان ہے جو ابتدائے آفرینش سے چلا آرہا ہے جس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ یہ دنیاوی زندگانی کی طبیعت میں شامل ہے۔ لیکن آخرت کے امتیازات میں سے یہ بات ہے کہ یہ تمام اختلافات وہاں پر حل ہوں گے اور انسانیت ایک ہی لڑی میں منسلک ہوگی۔ اسی لیے تو قیامت کو "یوم الفصل" کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔

آخری جملے میں ان لوگوں کے حالات بیان فرمائے گئے ہیں جو ان لوگوں کے بعد برسرکار آئے ہیں یعنی جنہوں نے انبیاء کا زمانہ نہیں دیکھا اور ایسے زمانے میں آنکھ کھولی جس میں نفاق پرور اور تفرقہ انداز لوگوں نے عالم انسانیت کی فضا کو اپنے شیطانی اعمال کے ذریعے تاریک کر دیا تھا۔ لہٰذا یہ لوگ بخوبی حق تک نہیں پہنچ سکے اور اسے حاصل نہیں کر پائے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: جو لوگ ان کے بعد آسمانی کتاب کے وارث ہوئے ہیں وہ اس کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو گئے اور شک بھی ایسا کہ جس میں بدگمانی شامل ہے (وان الذین اورثوا الکتاب من بعدهم لفی شك منه مریب)[1]۔

مفسرین نے "ریب" کے معنی کی حقیقت میں اس شرط کو بھی ذکر کیا ہے کہ "ریب ایسے شک کو کہتے ہیں کہ جس سے آخرکار پردہ اٹھایا جائے اور وہ حقیقت میں بدل جائے اور شاید یہ امر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی طرف اشارہ ہو کہ جنہوں نے روشن دلائل کے ذریعے حق طلب لوگوں کے دلوں سے شک و ریب کو دور کر دیا۔

ایک نکتہ: تفسیر علی بن ابراہیم میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے "شرع لکم من الدین" کی تفسیر میں فرمایا کہ "ان اقیموا الدین" سے مخاطب امام ہے اور "لا تتفرقوا فیه" کا جملہ امیرالمؤمنین علی علیہ السلام کے بارے میں کنایہ ہے[2]۔

ظاہر سی بات ہے کہ دین سے منحصراً علیؑ کی ولایت مراد نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ امیرالمؤمنین کی ولایت کا شمار ارکان دین میں تو ضرور ہوتا ہے۔

---

[1] اسی تفسیر کی بنا پر جو کہ پہلے جملوں سے مکمل ہم آہنگ ہے "بعدهم" کی ضمیر گزشتہ امتوں کی طرف لوٹ رہی ہے جنہوں نے مذہب میں تفرقے ڈالے۔ نہ کہ انبیاء کی طرف جو گزشتہ آیت میں مذکور ہوئے ہیں۔ (غور کیجئے گا)۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۶۷۔

۱۵۔ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۖ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۖ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

ترجمہ

۱۵۔ تو بھی ان لوگوں کو اس خدا کے واحد دین کی طرف بلا اور جیسا تجھے حکم دیا گیا ہے استقامت دکھا اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر اور کہہ دے کہ میں ہر اس کتاب پر ایمان لا چکا ہوں جو نازل ہوئی ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمھارے درمیان عدالت کروں۔ اللہ ہمارا اور تمھارا رب ہے، ہمارے اعمال کا نتیجہ ہمارے لیے اور تمھارے اعمال کا نتیجہ تمھارے لیے ہے۔ ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی ذاتی جھگڑا تو ہے نہیں۔ خدا ہمیں اور تمھیں ایک جگہ پر جمع کرے گا، اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

تفسیر

حکم کے مطابق استقامت کیجئے

گزشتہ آیات میں بغاوت، ظلم اور انحراف کی وجہ سے امتوں کے درمیان اختلافات اور تفرقہ بازی کی بات ہو رہی تھی، لہٰذا ان آیات میں خداوند عالم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ اختلافات کو دور کرنے اور انبیاء کے دین کے احیاء کی کوشش میں لگے رہیں اور اس راہ میں پوری استقامت سے کام لیں۔

ارشاد ہوتا ہے : انسانوں کو خدا کے واحد دین کی طرف دعوت دے اور انہیں اختلافات سے نجات دلا (فلذالك فادع)[1]

پھر اس راہ میں استقامت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے : اور جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے استقامت دکھا (واستقم کما امرت)۔

"کما امرت" (جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے) ہو سکتا ہے کہ استقامت کے اعلیٰ درجہ کی طرف اشارہ ہو اور یا پھر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ استقامت بھی کمیت، کیفیت، مدت اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے خدائی احکام کے مطابق ہونی چاہیئے۔

چونکہ انسانی خواہشات اس راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں لہٰذا تیسرے حکم میں ارشاد ہوتا ہے : ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر (و لا تتبع اھواءھم)۔

کیونکہ یہ لوگ آپ کو اپنے ذاتی رجحانات اور مفادات کی طرف دعوت دیتے ہیں، جس کا انجام تفرقہ جدائی انتشار اور نفاق ہے۔ ان کی خواہشات کو ٹھوکر لگائیں اور سب کو پروردگار کے ایک دین پر جمع کریں۔

ہر دعوت کا ایک نقطہ آغاز ہوتا ہے اور اس کا نقطہ آغاز خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرار دیتے ہوئے چوتھا حکم دیا گیا ہے : کہہ دے کہ میں ایمان لایا ہوں ہر اس کتاب پر جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے (وقل اٰمنت بما انزل اللہ من کتاب)۔

میں آسمانی کتابوں کے درمیان فرق کا قائل نہیں ہوں، سب کو مانتا ہوں اور سب کو توحید، پاک دینی معارف، تقویٰ، پاکیزگی، حق اور عدالت کا داعی سمجھتا ہوں۔ میرا دین درحقیقت ان سب کا جامع اور تکمیل کنندہ ہے۔

میں اہل کتاب کی طرح نہیں ہوں کہ جو ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہیں۔ یہود، نصاریٰ کو اور نصاریٰ یہود کو، حتیٰ کہ ہر دین کے پیروکار بھی اپنی دینی کتابوں کی ان آیات کو مانتے ہیں جو ان کی خواہشات سے ہم آہنگ ہوں، میں کسی استثناء کے بغیر سب کو تسلیم کرتا ہوں کیونکہ بنیادی اصول سب کے ایک ہیں۔

وحدت اور اتحاد کو وجود میں لانے کے لیے "اصول عدالت" کی پاسداری ضروری ہوتی ہے لہٰذا پانچویں حکم میں ارشاد فرمایا گیا ہے : کہہ دے کہ مجھے حکم مل چکا ہے کہ تم سب کے درمیان عدالت کروں (وامرت لاعدل بینکم)۔

یہ عدالت خواہ فیصلہ جات میں ہو یا اجتماعی حقوق اور دوسرے مسائل میں[2]

اس طرح سے زیر نظر آیت پانچ اہم احکام پر مبنی ہے، جن کا آغاز اصل دعوت سے ہوتا ہے، پھر اس کی ترقی کے

---

[1] کچھ مفسرین نے "لذالك" کی "لام" کو "الی" کے معنی میں لیا ہے اور کچھ نے "علت" کے معنی میں۔ پہلی صورت میں "ذالك" گزشتہ انبیاء کے دین کی طرف اشارہ ہے اور دوسری صورت میں امتوں کے اختلافات کی طرف۔

[2] اس مقام پر کچھ مفسرین نے "عدالت" کو صرف فیصلوں کی حد تک محدود رکھا ہے جبکہ اس محدودیت پر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

وسائل کو بیان کیا گیا ہے اس کے بعد ہوا اور ہوس پرستی کا ذکر ہے جو اس دعوت کے موانع میں سے ہے۔ اس سے آگے چل کر اپنی ذات سے اس کے آغاز کرنے کا بیان ہے اور آخر میں ان سب کا آخری مقصد ذکر ہوا ہے جو کہ عدالت کو عام کرنا اور پھیلانا ہے۔

ان پانچ احکام کے بعد تمام اقوام کے مشترک نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے: اللہ ہمارا اور تمہارا پروردگار ہے (اللہ ربنا و ربکم)۔

ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں اور ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ ہے (لنا اعمالنا ولکم اعمالکم)۔

ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی لڑائی اور کسی قسم کا جھگڑا نہیں، کسی کو ایک دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ہے اور ہمارا تم سے کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے (لاحجۃ بیننا و بینکم)۔

اصولی طور پر احتجاج اور استدلال کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ حق کافی حد تک واضح ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ آخر کار ہم ایک جگہ اکٹھے ہوں گے "اور خدا ہمیں اور تمہیں قیامت میں جمع کرے گا" (اللہ یجمع بیننا)[1]

اور اس دن ہم سب کے درمیان فیصلہ کرنے والا ایک ہی ہوگا اور "ہم سب کی بازگشت اسی کی طرف ہوگی" (و الیہ المصیر)۔

تو اس طرح سے ہم سب کا خدا ایک، انجام ایک، قاضی اور مرجع ایک اور پھر یہ کہ ہم سب اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں اور اور ایمان اور عمل صالح کے بغیر کسی کو کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔

اس تمام بحث کو ایک جامع حدیث کے ذریعے ہم پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں:

ثلاث منجیات وثلاث مهلکات، فالمنجیات: العدل فی الرضا والغضب، والقصد فی الغنی والفقر، وخشیة اللہ فی السر والعلانیة، والمهلکات: شح مطاع وهوی متبع واعجاب المرء بنفسه

تین چیزیں انسان کی نجات کا سبب ہیں اور تین ہلا کا ذریعہ ہیں۔ جو تین چیزیں اس کی نجات کا باعث ہیں وہ خوشی اور غصے کی حالت میں عدل و انصاف، خوشحالی اور تنگدستی کی حالت میں اعتدال پسندی اور جلوت و خلوت میں خوف خدا ہے جو تین چیزیں انسان کی ہلاکت کا سبب بنتی ہیں وہ ہیں بخل کہ جس کی انسان پیروی کرتا ہے، سرکشی اور حاکم خواہشات نفسانی کی اتباع اور تکبر اور غرور[2]

---

[1] "بیننا" میں متکلم مع الغیر کی ضمیر پیغمبر اکرمؐ اور مؤمنین کی طرف اشارہ ہے اور "بینکم" کی ضمیر جمع تمام کفار کی طرف اشارہ ہے خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک۔

[2] مجمع البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں وتحف العقول کلمات پیامبر اسلام۔

۱۶۔ وَالَّذِيْنَ يُحَاۗجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ○

۱۷۔ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ○

۱۸۔ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ○

ترجمہ

خدائے واحد کے بارے میں

۱۶۔ جو لوگ اس کی دعوت قبول کر لینے کے بعد جھگڑا کرتے ہیں ان کی دلیل ان کے پروردگار کے نزدیک باطل اور بے بنیاد ہے (ان) پر خدا کا غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے۔

۱۷۔ اللہ تو وہ ہے جس نے کتاب (بر) حق نازل کیا اور (حق و باطل کی پہچان کا) ترازو بھی۔ تجھے کیا معلوم کہ شاید قیام قیامت کی گھڑی قریب ہو۔

۱۸۔ جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے وہ اس کے بارے میں جلدی کرتے ہیں لیکن جو ایمان دار ہیں وہ ہمیشہ خوف و ہراس کے ساتھ اس کے منتظر ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ حق ہے۔ آگاہ رہو جو لوگ قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں وہ پرلے درجے کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

تفسیر

جلدی نہ کرو قیامت آکر رہے گی

گزشتہ آیات میں آنحضرت کو حکم ملا تھا کہ تمام آسمانی کتابوں کا احترام کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف بھی رائج فرمائیں۔ اور ان سے کسی قسم کا جھگڑا نہ کریں زیر نظر آیات میں ان باتوں کی تکمیل ہو رہی ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس کی دعوت لوگوں کی طرف سے ہو جانے کے بعد خدائے واحد کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں ان کی دلیل ان کے پروردگار کے نزدیک باطل اور بے بنیاد ہے (والذین یحاجون فی اللہ من بعد ما استجیب لہ حجتھم داحضۃ عند ربھم)۔

"اور ان پر خدا کا غضب ہے کیونکہ وہ جان بوجھ کر اس کی مخالفت کرتے ہیں (و علیھم غضب)۔

اور قیامت کے دن بھی ان کے لیے خدا کا سخت عذاب ہوگا (ولھم عذاب شدید)۔

کیونکہ ہٹ دھرمی اور جھگڑے کا انجام یہی ہوتا ہے۔

یہاں پر من بعد ما استجیب لہ (اس کی دعوت قبول کر لیے جانے کے بعد) سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس بارے میں کئی تفاسیر بیان کی ہیں۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد پاک دل اور بے لوث لوگوں کی طرف سے دعوت کی قبولیت ہے جو فطرت الٰہی کی راہنمائی، وحی پروردگار کے مضامین اور پیغمبر اسلام علیہ وآلہ السلام کے مختلف معجزات دیکھنے کی وجہ سے مسلمان ہو گئے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں اس سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی قبولیت ہے جو آپ نے جنگ بدر کے دن اسلام دشمن طاقتوں کے برخلاف کی تھی، جس کے نتیجے میں ان کا ایک عظیم لشکر نیست و نابود ہو گیا اور ان کی شان و شوکت جاتی رہی اور انہیں رسوا کن شکست نصیب ہوئی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد خود ان اہل کتاب کی اپنی دعا کی قبولیت ہے، جو وہ اسلام سے پہلے کیا کرتے تھے اور آنحضرتؐ کے ظہور کی انتظار میں تھے اور اپنی کتابوں سے آپؐ کی نشانیاں لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور آنحضرتؐ کی ذات سے اپنے ایمان اور تعلق کا اظہار کیا کرتے تھے۔ لیکن جب اسلام کا ظہور ہو گیا اور ان کے ناجائز مفادات کو خطرات لاحق ہونے لگے تو انہوں نے انکار کر دیا۔

سب سے زیادہ مناسب تفسیر وہی پہلی ہے کیونکہ دوسری تفسیر کی رو سے ان آیات کو غزوہ بدر کے بعد نازل ہونا چاہیئے تھا جب کہ ہمارے پاس اس بارے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب آیات مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہیں۔

تیسری تفسیر آیت کے لب و لہجہ سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اس کے مطابق یوں کہنا چاہیئے تھا " من بعد

استجابوا لہ" یعنی۔ اس کے بعد کہ وہ اس (رسول) کی دعوت کو قبول کر چکے۔

اور پھر یہ کہ "یحاجون فی اللہ" کا جملہ بظاہر مشرکین کی خدا کے بارے میں گفتگو کی طرف اشارہ ہے نہ کہ اہل کتاب کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں۔ اب یہ باطل اور غلط جھگڑا کن مسائل کی طرف اشارہ ہے، اس میں بھی مختلف آراء ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہود کے اس دعویٰ کی طرف اشارہ ہے جس میں وہ کہتے تھے کہ ہمارا دین، اسلام سے پہلے کا ہے لہٰذا بہتر اور برتر ہے۔

یا یہ کہ آپ چونکہ اتحاد کے علمبردار ہیں لہٰذا آیئے موسیٰ علیہ السلام کے دین کو اختیار کر لیں جو سب کے لیے قابل قبول ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے کہ ان آیات میں روئے سخن یہود اور اہل کتاب کی طرف ہو، کیونکہ "خدا کے بارے میں جھگڑا" زیادہ تر مشرکین کی طرف سے ہی متوقع معلوم ہوتا ہے۔ بنابریں مندرجہ بالا جملہ ان بے بنیاد اور بودے دلائل کی طرف اشارہ ہے جو مشرک لوگ شرک کی قبولیت کے لیے گھڑا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک دلیل تو یہ ہے کہ یہ بُت ان کی شفاعت کریں گے اور دوسری یہ کہ وہ اپنے بزرگوں کے دین کی پیروی کر رہے ہیں۔

بہرحال جو ضدی مزاج لوگ حق آشکار ہو جانے کے بعد بھی اپنی ہٹ دھرمی اور ضد پر باقی رہ جاتے ہیں وہ مخلوق خدا کی نگاہوں میں بھی رسوا ہیں اور اس دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں غضب الٰہی کے بھی مستحق ہیں۔

پھر خداوند عالم کی توحید اور اس کی قدرت کے دلائل میں سے ایک دلیل کو بیان فرمایا گیا ہے جس میں بے منطق جھگڑا کرنے والوں کے لیے نبوت کا ثبوت بھی موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا تو وہ ہے جس نے آسمانی کتاب کو برحق نازل فرمایا ہے اور اسی طرح میزان کو بھی (اللہ الذی انزل الکتاب بالحق والمیزان)۔

"حق" ایک جامع کلمہ ہے جو معارف اور عقائد حقہ، صحیح خبروں، فطری اور اجتماعی ضرورتوں اور اس قسم کی دوسری تمام چیزوں پر محیط ہے۔ کیونکہ حق وہ چیز ہوتی ہے جو عینیت خارجی سے موافق ہو اور ذہنی اور خیالی پہلو نہ رکھتی ہو۔

اسی طرح ایسے مواقع پر "میزان" کا بھی ایک جامع معنی ہے، ہرچند کہ لغوی طور پر اس کا اطلاق "ترازو" اور وزن کرنے والے آلات پر ہوتا ہے لیکن کنائے کے طور پر اس کا اطلاق پرکھنے کے ہر قسم کے معیار، خدا کے صحیح قوانین اور حتیٰ کہ پیغمبر اسلام اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی ذات پر بھی ہوتا ہے کیونکہ ان کا وجود بھی حق اور باطل کے درمیان امتیاز کا معیار ہے۔ اور قیامت کے دن کا میزان بھی اسی معنی کا ایک نمونہ ہے۔

اسی طرح سے خداوند عالم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک ایسی کتاب نازل فرمائی ہے جو حق بھی ہے اور اقدار کو پرکھنے کا معیار اور میزان بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس کتاب کے مضامین میں غور کرنے سے بہت سے امور ظاہر ہوتے ہیں۔ معارف و عقائد سے لے کر اس کے منطقی طرز استدلال تک، اجتماعی قوانین سے لے کر ان پروگراموں تک جو تہذیب نفوس اور ارتقائے انسانیت کے لیے بنائے گئے ہیں، سب اس کی حقانیت کی دلیل ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے کہ اس قدر اعلیٰ اور

میاری مطالب اور وہ بھی اس گہرائی اور عظمت کے ساتھ اور پھر ایک اُمّی شخص کی طرف سے جس نے دنیا کے کسی فرد سے تعلیم حاصل نہیں کی اور ایک پسماندہ ترین ماحول سے ابھرا ہوا۔ یہ سب کچھ بذات خود پروردگار عالم کی عظمت اور عالم ماورائے طبیعت پر روشن بُرہان اور اس کتاب کے لانے والے کی حقانیت و صداقت پر کھلی دلیل ہے۔

تو گویا مندرجہ جملہ مشرکین کے لیے بھی ایک جواب ہے اور اہل کتاب کے لیے بھی۔

چونکہ ان تمام مسائل کا خصوصی نتیجہ حق وعدالت اور قیامت کے دن میزان اعمال کا ظہور رہے لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تجھے کیا معلوم، شاید قیامت کی گھڑی قریب ہو (و ما یدریك لعل الساعة قریب)۔

وہی قیامت جو جب برپا ہوگی تو سب اس کی عدالت میں حاضر ہوں گے اور وہاں پر ان کے اعمال کو میزان پر تولا جائے گا اور رائی کے دانے کے برابر بلکہ اس سے بھی کمتر کو ٹھیک ٹھیک سے پرکھا اور تولا جائے گا۔

پھر قرآن قیامت کے بارے میں کفار اور مؤمنین کے ردعمل کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے وہ اس کے بارے میں جلدی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قیامت کب آئے گی (یستعجل بها الذین لا یؤمنون بها)۔

وہ اس قسم کی باتیں اس لیے ہرگز نہیں کرتے کہ انہیں قیامت سے کوئی محبت ہے یا محبوب سے ملاقات کا شوق ہے، نہیں بلکہ وہ تو قیامت کا مذاق اڑانے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں، لیکن اگر وہ جان لیں کہ قیامت ان کے لیے کیا لے کر آئے گی تو وہ ایسی باتیں ہرگز نہ کریں۔

البتہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ ہمیشہ خوف وہراس کے ساتھ اس کے منتظر ہیں اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ حق ہے اور یقیناً آکر رہے گی (والذین اٰمنوا مشفقون منها و یعلمون انها الحق)[1]

البتہ قیام قیامت کا لمحہ ہر شخص سے پوشیدہ ہے حتیٰ کہ انبیائے مرسل اور ملائکہ مقرب بھی اسے نہیں جانتے۔ تاکہ ایک طرف سے تو مؤمنین کے لیے ہمیشہ کی تربیت کا ذریعہ بن جائے اور دوسری طرف منکرین کے لیے آزمائش اور اتمام حجت ہو۔ لیکن اس کے واقع ہونے میں انہیں کوئی شک نہیں ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قیامت اور خدا کی عظیم عدالت پر ایمان، خاص کر اس امر کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قیامت کسی وقت بھی واقع ہو سکتی ہے، مؤمنین کی تربیت کے لیے کس قدر مؤثر ہے۔

آیت کے آخر میں ایک عمومی اعلان کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے: آگاہ رہو! جو لوگ قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں اور اس کے بارے میں کٹ حجتی کرتے ہیں وہ سخت گمراہی میں ہیں (الا ان الذین یمارون فی الساعة لفی ضلال بعید)۔

---

[1] "مشفقون" "اشفاق" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ایسی محبت جس میں خوف پایا جاتا ہو۔ جب یہ لفظ "من" کے ساتھ متعدی ہو تو خوف کا پہلو غالب ہوتا ہے اور جب "علیٰ" کے ساتھ متعدی ہو تو توجہ اور محبت وانتظار کا اس میں غلبہ ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان اپنے دوست سے کہتا ہے "انا مشفق علیك"۔ ملاحظہ ہو تفسیر روح المعانی اور مفردات راغب۔

کیونکہ اس دنیا کا نظام بذات خود اس بات پر دلیل ہے کہ یہ کسی اور جہان کا مقدمہ ہے کہ جس کے بغیر اس دنیا کی آفرنیش لغو اور بے معنی ہو گی جو نہ تو حکمت الٰہی سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی اس کی عدالت سے۔

"ضلال بعید" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی کبھار انسان راہ کو گم کر بیٹھتا ہے لیکن اس سے زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا ممکن ہے تھوڑی سی تلاش اور جستجو سے اسے پالے، لیکن کبھی فاصلہ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ راستے کی تلاش مشکل یا ناممکن ہو جاتی ہے۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ آنحضرتؐ کے بارے میں روایت ہے کہ
ایک شخص نے ایک سفر کے دوران میں آنحضرتؐ سے بلند آواز سے پوچھا: یا محمد!
تو آنحضرت نے بھی بلند آواز میں فرمایا: "کیا کہتے ہو؟"
اس نے کہا متی الساعۃ "(قیامت کب برپا ہو گی؟)
آپ نے فرمایا "انہا کائنۃ فما اعددت لہا" (قیامت تو آکر رہے گی، لیکن تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟)
اس نے عرض کیا: "حب اللہ و رسولہ" (خدا اور رسولِ خدا سے محبت ہی میرا سرمایہ ہے)۔
نبی اکرمؐ نے فرمایا: "انت مع من احببت" (تم ان لوگوں کے ساتھ ہو گے جن سے محبت کرتے ہو)[1]

---

[1] تفسیر مراغی جلد ۲۵ ص ۳۲۔

۱۹- اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝

۲۰- مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝

ترجمہ

۱۹۔ خدا اپنے بندوں کے لیے صاحب لطف وکرم ہے۔ جسے چاہے رزق عطا کرتا ہے۔ اور وہ طاقتور اور ناقابل تسخیر ہے۔

۲۰۔ جو شخص آخرت کی کھیتی کو چاہتا ہے ہم اسے برکت دیتے ہیں اور اس کے محصول میں اضافہ کر دیتے ہیں اور جو شخص دنیاوی کھیتی کا طلب گار ہے اسے اس میں سے حصہ دیتے ہیں لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

تفسیر

دنیا اور آخرت کی کھیتی

گزشتہ آیات میں خداوند عالم کے سخت عذاب کی بات ہو رہی تھی اور ساتھ ہی منکرین قیامت کا یہ تقاضا بھی زیر بحث آیا تھا کہ قیامت جلدی کیوں نہیں آتی؟ اب زیر نظر آیات میں سے سب سے پہلی آیت میں اس کے "قہر" کا تذکرہ اس کے "لطف" کے ساتھ ساتھ کیا گیا ہے اور منکرین معاد کے قیامت کے بارے میں بے معنی جلد بازی پر مبنی سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا

گیا ہے: خدا اپنے بندوں کے بارے میں لطیف ہے اور صاحب لطف و کرم ہے (الله لطیف بعباده)۔

اگر وہ کہیں پر عذاب شدید کی دھمکی دیتا ہے تو دوسری طرف اپنے لطف و کرم کا وعدہ بھی کرتا ہے اور لطف بھی ایسا جو غیر محدود اور نہایت وسیع ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر مغرور جاہلوں کو عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا تو یہ بھی اس کا لطف و کرم ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے لطف عمیم کے مظاہر میں سے ایک کو بیان فرماتا اور وہ ہے اس کی طرف سے عطا ہونے والا رزق۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ جسے چاہے رزق عطا فرماتا ہے (یرزق من یشاء)

اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگ اس کی روزی سے محروم ہیں بلکہ اس سے مراد رزق کی وسعت ہے کہ جسے چاہے وسیع روزی عطا فرما دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ رعد کی ۲۶ ویں آیت میں فرمایا گیا ہے:

الله یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر

خدا جسے چاہے وسیع روزی دے دیتا ہے اور جس پر چاہے روزی تنگ کر دیتا ہے۔

ہر چند کہ اسی سورت کی بعد والی آیت میں ہے:

ولو بسط الله الرزق لعباده لبغوا فی الارض

اگر خدا سب بندوں کے لیے روزی فراخ کر دے تو وہ زمین میں سرکشی کرنے لگیں۔

(شوریٰ / ۲۷)

ظاہر ہے کہ یہاں پر "روزی" کے مفہوم میں معنوی اور مادی دونوں طرح کی روزی شامل ہے اور جسمانی اور روحانی روزی بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ جب لطف و کرم کا مبدأ اور روزی رسان وہی ذات ہے تو پھر تم بتوں کے پیچھے کیوں جاتے ہو جو نہ تو رازق ہیں اور نہ لطیف، نہ تو کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: وہ طاقتور اور ناقابل تسخیر ہے (وهو القوی العزیز)۔

اگر وہ اپنے بندوں کے ساتھ روزی اور لطف کا وعدہ کرتا ہے تو اس کی انجام دہی پر قادر بھی ہے۔ اسی لیے اس کے وعدہ کے بارے میں خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ "لطیف" کے دو معنی ہیں ایک تو وہی جو سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے یعنی صاحب لطف و کرم اور دوسرا معنی ہے باریک ترین اور مخفی ترین امور سے آگاہی رکھنے والا اور چونکہ بندوں کے بارے میں اس کی رزاقیت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ اپنے تمام بندوں کی ضروریات سے اچھی طرح آگاہ ہو چاہے وہ زمین میں ہیں یا آسمان میں۔ لہٰذا آیت کے آغاز میں اپنے لطیف ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے پھر اپنی رزاقیت کے مقام کو بیان فرماتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ ہود کی چھٹی آیت میں فرماتا ہے: "روئے زمین پر تمام چلنے والوں کی روزی خدا کے ذمہ ہے اس کے بعد پھر فرماتا ہے:

و یعلم مستقرها و مستودعها

وہ ان کے ٹھکانوں اور آمدورفت کے مقامات کو بھی جانتا ہے۔

البتہ ان دونوں معانی میں نہ صرف تناقض نہیں بلکہ یہ ایک دوسرے کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔ لطیف وہ ہوتا ہے جو علم اور آگاہی کے لحاظ سے بھی کامل ہو اور بندوں کے حق میں لطف و کرم کی رو سے بھی مکمل ہو۔ چونکہ خداوند عالم اپنے بندوں کی ضروریات سے بخوبی آگاہ بھی ہے اور بہترین طریقے سے ان کی ضروریات کو پورا بھی فرماتا ہے لہٰذا سب سے بڑھ کر یہ نام اسی کے شایان شان ہے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت میں خدا کے اوصاف میں سے چار کی طرف اشارہ ہوا ہے، لطف، رازقیت، قوت اور عزت اور یہی چیز اس کی "ربوبیت" کی بہترین دلیل ہے کیونکہ "رب" (مالک و مدبر) کو ان صفات کا حامل ہونا چاہیے۔

بعد کی آیت میں ایک لطیف تشبیہ کے ذریعے دنیا والوں کو خدا کی روزی سے استفادہ کرنے کے لحاظ سے ایسے کسانوں سے تشبیہ دی گئی ہے جن میں سے کچھ تو آخرت کے لیے کھیتی باڑی کرتے ہیں اور کچھ دنیا کے لیے اور پھر ان دونوں زراعتوں کا نتیجہ واضح طور پر بیان فرمایا گیا ہے، جو شخص آخرت کی زراعت کا طلب گار ہے ہم اسے برکت دیں گے اور اس کے محصولات میں اضافہ کریں گے (من کان یرید حرث الاٰخرۃ نزد لہ فی حرثہ)۔

اور جو لوگ صرف دنیا کے لیے کاشت کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر بھی صرف یہی فانی دنیا اور اس کا مال و متاع ہے تو اس میں سے کچھ حصہ ہم انہیں دیں گے لیکن آخرت میں انہیں کچھ بھی نصیب نہیں ہوگا (و من کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منھا و مالہ فی الاٰخرۃ من نصیب)۔[1]

یہ ایک عمدہ تشبیہ اور خوبصورت کنایہ ہے۔ تمام انسان کسان ہیں اور یہ دنیا ایک کھیتی ہے۔ ہمارے اعمال اس کا بیج ہیں۔ خدائی ذرائع بارش کے مانند ہے جو اس پر برستی ہے۔ لیکن یہ بیج مختلف ہوتے ہیں بعض بیج تو ایسے ہوتے ہیں جن کا محصول غیر محدود اور جاودانی ہوتا ہے اس کے پودے ہمیشہ سرسبز و شاداب اور ثمرات سے معمور ہوتے ہیں۔ جب کہ کچھ بیج ایسے ہوتے ہیں جن کا محصول بہت کم، زندگی مختصر اور پیداوار کڑوی اور ناخوشگوار ہوتی ہے۔

"یرید" (چاہتا ہے، ارادہ کرتا ہے) کی تعبیر درحقیقت لوگوں کی نیتوں کے مختلف ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ آیت گزشتہ آیت میں مجموعی طور پر پروردگار عالم کی عطا کردہ روزی اور نعمتوں کے بارے میں اس کی شرح ہے کہ کچھ لوگ تو ان نعمتوں سے بیج کی صورت میں آخرت کے لیے استفادہ کریں گے اور کچھ لوگ صرف دنیاوی فائدہ اٹھائیں گے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ آخرت کے زراعت کاروں کے لیے ہے "نزد لہ فی حرثہ"

---

[1] راغب نے مفردات میں لفظ "حرث" کے بارے میں لکھا ہے کہ "حرث" دراصل زمین میں بیج ڈالنے اور زمین کو کھیتی باڑی کے لئے تیار کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اور قرآن مجید میں بھی کئی مرتبہ یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ بعض مفسرین نے اس سے "عمل اور کام" کیونکر مراد لیا ہے۔

(ہم اس کی زراعت میں اضافہ کر دیں گے) لیکن یہ نہیں کہا کہ وہ دنیاوی متاع سے محروم جائیں گے۔ لیکن دنیاوی کسانوں کے بارے میں ہے: "جو وہ چاہیں گے اس میں سے کچھ انہیں دیں گے" پھر فرمایا گیا ہے: آخرت میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہو گا۔

اس طرح سے نہ تو دنیا پرست اپنی آرزو کو پہنچ پائیں گے اور نہ ہی آخرت کے طلب گار دنیا سے محروم رہ جائیں گے لیکن فرق یہ ہو گا کہ دنیا کے طلب گار خالی ہاتھ آخرت کو سدھاریں گے اور آخرت کے خواہاں بھرے دامن کے ساتھ وہاں پہنچیں گے۔

اسی سے ملتی جلتی سورۂ بنی اسرائیل کی ۱۸ویں اور ۱۹ویں آیت دوسری صورت میں بیان ہوئی ہیں: ارشاد ہوتا ہے:

من کان یرید العاجلة عجلنا له فیها ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا له جهنم یصلاها مذمومًا مدحورًا ومن اراد الاٰخرة وسعیٰ لها سعیها وهو مؤمن فاولٰئك کان سعیهم مشکورًا

یعنی جو شخص اس جلد گزر جانے والی زندگی کو پسند کرتا ہے ہم جتنی مقدار جس شخص کے لئے چاہیں اسے دے دیتے ہیں۔ پھر اس کے لیے جہنم قرار دیتے ہیں۔ وہ اس میں ایسی صورت میں داخل ہو گا جب کہ قابل مذمت اور راندہ درگاہ ہو گا اور جو شخص سرائے آخرت کا طلبگار ہے اور اپنی کوشش بھی اسی کے لیے صرف کرتا ہے اور ایمان بھی رکھتا ہے، اس کی کوشش کو سراہا جائے گا اور اسے بدلہ دیا جائے گا۔

"نزد له فی حرثه" کی تعبیر قرآن مجید کی دیگر آیات سے ہم آہنگ ہے جو اس بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے سورۂ انعام کی آیت ۱۶۰ میں ہے:

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها

جو نیک کام انجام دے اس کا دس گنا ثواب ہے۔

سورۂ فاطر کی آیت ۳۰ میں ہے:

لیوفّیهم اجورهم ویزیدهم من فضله

خدا انہیں مکمل جزا دے گا اور اپنے فضل و کرم کی وجہ سے اس میں مزید اضافہ کرے گا۔

بہرحال زیر بحث آیت دنیاوی زندگی کے بارے میں اسلامی نکتہ نظر کی جیتی جاگتی تصویر ہے جو دنیا مطلوب بالذات ہے وہ ناپسندیدہ ہے اور جو دنیا دوسرے جہان کے لیے مقدمہ اور مطلوب بالغیر ہے، اسلام اس دنیا کو ایک ایسی کھیتی کی حیثیت سے دیکھتا ہے جس کا ثمر قیامت میں ملے گا۔

روایات اور قرآن مجید کی بعض دیگر آیات میں جو تعبیرات بیان ہوئی ہیں وہ اسی معنی کی تائید اور تاکید کرتی ہیں۔ مثلاً

سورۂ بقرہ کی ۲۶۱ ویں آیت میں راہ خدا میں خرچ کرنے والوں کے خرچ کو اس بیج سے تشبیہ دی گئی ہے جس سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں اور اس سے بھی بیشتر، اور یہ آخرت میں اجرِ جزیل کی علامت ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے:

وهل تكب الناس على مناخرهم في النار الا حصائد السنتهم

آیا لوگوں کو جہنم میں منہ کے بل ڈالنے والی چیزیں سوائے زبان کے بوئے کو کاٹنے کے کچھ اور ہو سکتا ہے؟[1]

امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے منقول ہے:

ان المال والبنين حرث الدنيا والعمل الصالح حرث الأخرة وقد يجمعهما الله لاقوام

مال اور اولاد دنیا کی کھیتی ہیں اور عمل صالح آخرت کی اور کبھی بعض قوموں کے لیے اللہ ان دونوں کو جمع کر دیتا ہے[2]

آیت مذکورہ بالا سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کے لیے سعی اور کوشش کی ضرورت ہے۔ اور کوئی بھی مشقت اور تکلیف اٹھائے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ جس طرح کوئی بیج تکلیف اٹھائے بغیر محصول نہیں دیتا۔ لہٰذا کیا ہی بہتر ہے کہ انسان رنج و مشقت کے ذریعہ ایسے درخت کو پروان چڑھائے جس کا ثمر میٹھا، مستقل، دائم اور برقرار ہو نہ کہ ایسا درخت جو خزاں میں خشک ہو کر تباہ ہو جائے۔

ہم اس گفتگو کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں:

من كانت نيته الدنيا فرق الله عليه امره، وجعل الفقر بين عينيه، ولم يأته من الدنيا الا ما كتب له، ومن كانت نيته الأخرة جمع الله شمله، وجعل غناه في قلبه، واتته الدنيا وهي راغمة

جس شخص کی نیت دنیا ہو خدا اس کے امور کو دگرگون کر دیتا ہے، فقر و تنگدستی کو اس کی آنکھوں کے سامنے مجسم کر دیتا ہے اور اس کے پاس، دنیاوی حصے میں سے وہی کچھ آ کر رہتا ہے جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور جس کی نیت آخرت

---

[1] محجۃ البیضاء جلد ۵ ص ۱۹۳ (کتاب آفات اللسان)۔

[2] کافی (نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۶۹ کے مطابق)۔

کا جہان ہو خدا اسکے منتشر امور کو بھی یکجا کر دیتا ہے۔ اس کے دل کو تونگری اور بے نیازی سے معمور کر دیتا ہے اور دنیا سر جھکائے اس کے پاس آجاتی ہے[1]

یہ جو علماء کے درمیان مشہور ہے کہ " الدنیا مزرعة الاخرة " (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) درحقیقت مندرجہ بالا فرمان ہی سے حاصل شدہ ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان انہی آیات کے ذیل میں۔

۲۱۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

۲۲۔ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ○

۲۳۔ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ○

ترجمہ

۲۱۔ آیا ان کے ایسے معبود ہیں جنہوں نے خدا کی اجازت کے بغیر ان کے لیے کوئی دین بنا دیا ہے؟ اگر ان کے لیے ایک مہلت مقرر نہ ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا (اور خدا کے عذاب کا حکم نازل ہو چکا ہوتا) اور ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۲۲۔ اس دن تو ظالموں کو دیکھے گا کہ وہ اپنے انجام دیئے ہوئے اعمال کی وجہ سے سخت خائف ہوں گے لیکن وہ انہیں اپنی لپیٹ میں لے لے گا لیکن جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے عمل صالح بھی انجام دیئے وہ بہشت کے بہترین باغوں میں ہوں گے اور جو کچھ بھی وہ چاہیں

گے ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے فراہم ہے اور یہی فضل عظیم ہے۔

۲۳۔ یہ وہی چیز ہے جس کی خدا اپنے ان بندوں کو خوشخبری دیتا ہے جو ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے ہیں کہہ دے میں تم سے رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اپنے قریبیوں کی دوستی کے۔ جو شخص نیک عمل انجام دے گا ہم اس کی نیکی میں اضافہ کریں گے، کیونکہ خداوند عالم بخشنے والا اور قدر دان ہے۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں اس سورت کی ۲۳ویں تا ۲۶ویں آیت کی شان نزول پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں مروی ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے:

جب پیغمبر اسلام مدینہ تشریف لا چکے اور اسلام کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں تو انصار نے کہا کہ ہم رسول اللہ کی خدمت میں جا کر عرض کرتے ہیں کہ اگر آپ کو مالی مشکلات درپیش ہیں تو ہمارے یہ مال غیر مشروط طور پر آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ جب آنحضرتؐ نے ان کی باتیں سُن لیں تو یہ آیت نازل ہوئی "قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الّا المودة فی القربٰی"

(کہہ دیجیے کہ میں تم سے اپنی رسالت کا اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے نزدیکیوں سے محبت کرو) تو آنحضرتؐ نے یہ آیت انہیں سنائی اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میرے بعد بھی میرے قریبیوں سے محبت کرنا۔

یہ سُن کر وہ خوشی خوشی وہاں سے واپس آگئے، لیکن منافقین نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ یہ بات (معاذ اللہ) رسول نے از خود کہی ہے اور خدا پر جھوٹ باندھا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے بعد ہمیں اپنے رشتہ داروں کے آگے ذلیل و رسوا کرے۔

چنانچہ اس کے بعد اگلی آیت نازل ہوئی "ام یقولون افترٰی علی اللہ کذبًا........" جو ان لوگوں کا جواب تھا۔ پیغمبر اسلامؐ نے کسی کو بھیج کر یہ آیت انہیں سنائی۔ کچھ لوگ نادم ہو کر رونے لگے اور سخت پریشان ہوئے آخر کار اس کے بعد والی آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا ہے "وھو الذی یقبل التوبة عن عبادہ ...."

آنحضرتؐ نے پھر کسی کو بھیج کر یہ آیت ان تک پہنچائی اور انہیں خوشخبری دی کہ ان کی خالص توبہ قبول بارگاہ ہو چکی ہے۔[1]

تفسیر

مودّت اہل بیتؑ اجرِ رسالت ہے

اسی سورت کی ۱۳ ویں آیت میں ذکر تھا دین کا تعین پروردگار عالم کی طرف سے اور تبلیغ کا کام الوالعزم انبیاء کے ذریعے ہوتا ہے۔ اب مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں اس تعین کی غیر خدا سے نفی کی بات ہو رہی ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ قانون الٰہی کے مقابلے میں کسی اور قانون کو کوئی قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ اصولی طور پر قانون گزاری کا حق ہی صرف خدا کو حاصل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آیا ان کے ایسے معبود ہیں جنہوں نے خدا کی اجازت کے بغیر ان کے لیے کوئی دین بنا دیا ہے (ام لھم شرکاء شرعوا لھم من الدین مالم یأذن بہ اللہ)۔

جبکہ کائنات کا خالق، مالک اور مدبر صرف خدا ہے۔ لہٰذا قانون گزاری کا حق بھی صرف اسے حاصل ہے اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص بھی اس کی اس قلمرو میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کی قانون سازی کے مقابلے میں جو کچھ بھی ہوگا وہ باطل ہوگا۔

اس کے فوراً بعد باطل قانون سازوں کو دھمکی اور تنبیہ کے لہجے میں خبردار کیا جا رہا ہے: اگر ان لوگوں کو مہلت دینے کے بارے میں خدا کا فرمانِ حق نہ ہوتا اور ان کے لیے مہلت مقرر نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ ان کے لیے عذاب کا حکم آچکا ہوتا اور انہیں کسی قسم کی مہلت نہ ملتی (ولولا کلمۃ الفصل لقضی بینھم)۔

اس کے باوجود انہیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ "ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے" (وان الظالمین لھم عذاب الیم)۔

"کلمۃ الفصل" سے مراد وہ مقررہ مہلت ہے جو خدا نے انہیں دی ہے تاکہ وہ آزادی سے کام کریں اور ان پر اتمام حجت ہو جائے۔

خدائی قوانین کے مقابلے میں اپنے خود ساختہ قوانین اپنانے والے مشرکین پر "ظالمین" کا اطلاق اس لیے کیا گیا ہے کہ "ظلم" کے مفہوم میں اس قدر وسعت ہے کہ اس کا اطلاق ہر اس کام پر ہوتا ہے جو بے موقع و محل انجام دیا جائے اور "عذاب الیم" سے بظاہر مراد روز قیامت کا عذاب ہے کیونکہ قرآن مجید میں عام طور پر "عذاب الیم" اسی معنی میں استعمال ہوا ہے اور بعد کی آیت بھی اسی حقیقت کی گواہ ہے اور قرطبی جیسے بعض مفسرین نے جو اس سے دنیا اور آخرت کا عذاب مراد لیا ہے، بعید معلوم

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۹۔

ہوتا ہے۔

پھر "ظالمین کے لیے عذاب" اور ان کے مقابلے میں "مؤمنین کی جزا" کی کچھ مزید وضاحت فرماتے ہوئے کہا گیا ہے: اس دن آپ ظالموں کو دیکھیں گے کہ وہ اپنے انجام دیئے گئے اعمال سے سخت خائف ہوں گے، لیکن اس کا کیا فائدہ ان کے اعمال کی سزا انہیں مل کر رہے گی (تری الظالمین مشفقین مما کسبوا وھو واقع بھم)۔

لیکن جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیئے وہ بہشت کے بہترین اور سرسبز و شاداب باغات میں ہوں گے (والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات فی روضات الجنات)۔

"روضات" "روضۃ" کی جمع ہے جس کا معنی ایسی جگہ ہے جہاں پانی اور درخت وافر مقدار میں ہوں۔ لہذا سرسبز و شاداب باغات کو "روضۃ" کہا جاتا ہے۔ اس تعبیر سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ بہشت کے باغات بھی مختلف ہیں اور صالح مؤمنین کی رہائش بہشت کے بہترین باغات میں ہوگی۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب گناہگار مؤمنین کو خدا کی طرف سے معافی ملے گی تو وہ بہشت میں تو ضرور جائیں گے مگر ان کی جگہ "روضات" نہیں ہوگی۔

جبکہ صالح مؤمنین کے بارے میں خداوند عالم کا فضل و کرم یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ ان پر خدا کی اس قدر مہربانی ہوگی کہ جو کچھ بھی چاہیں گے ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے سب کچھ فراہم ہوگا (لھم ما یشاءون عند ربھم)۔

گویا ان کے "عمل" اور "جزا" کا کوئی تقابل نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ "لھم ما یشاءون" کا جملہ اس حقیقت کا ترجمان ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر دلچسپ بات "عند ربھم" (ان کے پروردگار کے پاس) کی تعبیر ہے، جو مؤمنین کے بارے میں خداوند عالم کے بے حد حساب لطف و کرم کو بیان کر رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا مہربانی ہوسکتی ہے کہ انہیں خدا کا قرب حاصل ہوگا۔ جیسا کہ شہدائ کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

بل احیاء عند ربھم یرزقون

اور صالح مؤمنین کے بارے میں فرماتا ہے:

لھم ما یشاءون عند ربھم

چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، یہ ہے خدا کا بہت بڑا فضل (ذالک ھو الفضل الکبیر)۔

ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ بہشت کی نعمتیں اس قدر وسیع و عظیم ہیں کہ قلم و زبان ان کے بیان سے قاصر ہیں اور ہم مادی دنیا کے اسیروں کے لیے اس کا تصور بھی محال ہے کہ ہم سمجھ سکیں کہ لھم ما یشاءون عند ربھم کے جملے میں کیا کیا مفہوم پوشیدہ ہیں؟ مؤمنین کیا چاہیں گے اور خداوند عالم کے قرب میں انہیں کیا کچھ ملے گا؟

اصولی طور پر خداوند عالم جس چیز کی فضل کبیر کے عنوان سے توصیف کرے صاف ظاہر ہے کہ وہ چیز اس قدر عظمت کی مالک ہوگی کہ ہم جس قدر بھی اس کا تصور کریں پھر بھی ہمارا طائر خیال وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

دوسرے لفظوں میں خدا کے ان خاص بندوں کا مرتبہ اس قدر بلند ہوگا کہ وہ جس چیز کا ارادہ کریں گے وہ چیز فوراً

مہیا ہو جائے گی۔ گویا وہ اس خداوند عالم کی اس لا متناہی قدرت و طاقت کے آئینہ دار ہوں گے جو فرماتا ہے:

انما امرہ اذا اراد شیئًا ان یقول لہ کن فیکون (یٰس - ۸۲)

اور اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہو سکتی ہے۔

اس عظیم جزا کی عظمت کو بعد کی آیت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ وہی چیز ہے جس کی خوشخبری خدا نے اپنے ان بندوں کو دی ہے جو ایمان لے آئے اور عمل صالح بجا لائے ہیں (ذالك الذی یبشر الله عبادہ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات)۔

وہ خوشخبری دیتا ہے تاکہ اطاعت اور بندگی کرتے ہوئے اور خواہشات نفسانی سے مقابلے کے دوران میں اور دشمنوں سے جہاد کرتے ہوئے وہ جن مشکلات سے گزریں انہیں خوشی سے جھیل لیں اور وہ اس عظیم جزا کی وجہ سے خداوند کریم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے زندگی کے نشیب و فراز والے راستوں میں زیادہ سے زیادہ ہمت و طاقت کا مظاہرہ کریں۔

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ رسالت کی وجہ سے یہ خیال لوگوں کے دل میں آسکتا تھا کہ آپ اپنی رسالت کی تبلیغ کا لوگوں سے اجر طلب فرمائیں گے۔ اسی بارے میں فوراً پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ "کہہ دے: میں اس بارے میں تم سے کچھ نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے قریبیوں کے ساتھ محبت کرو" (قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الّا المودۃ فی القربیٰ)۔

ذوی القربیٰ کی دوستی جیسا کہ آگے چل کر بیان ہو گا ولایت کے مسئلے اور خاندان رسالت میں سے ہونے والے ائمہ معصومین کی پیشوائی اور رہبری کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ جو درحقیقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہبری اور ولایت الٰہیہ کے تسلسل کے مترادف ہے اور ظاہر ہے کہ اس ولایت اور رہبری کو تسلیم کرنا ایسا ہے جیسا کہ رسول پاکؐ کی رسالت و نبوت کو تسلیم کرنا، جو کہ انسان کی اپنی سعادت کا ذریعہ ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ خود انسان کی طرف ہی لوٹ جاتا ہے۔

مودّت فی القربیٰ کی وضاحت

اس جملہ کے بارے میں مفسرین نے لمبی چوڑی گفتگو اور خوب بحث کی ہے اور جب ہم خالی الذہن ہو کر ان کے پہلے سے طے شدہ فیصلے کے تحت بیان کردہ تفاسیر کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف عوامل اور اسباب کی وجہ سے آیت کے اصلی مفہوم سے ہٹ گئے ہیں اور انہوں نے ایسے احتمالات کو اپنایا ہے جو نہ تو آیت کے مفہوم سے مطابقت رکھتے ہیں نہ شان نزول سے اور نہ ہی دوسرے تاریخی اور روایاتی قرائن سے۔

اس سلسلے میں تقریباً چار مشہور تفسیریں بیان ہوئی ہیں:

۱۔ جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ ذوی القربیٰ سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت ہیں اور ان کی محبت ائمہ معصومین علیہم السلام کی امامت اور رہبری کو تسلیم کرنے کا ایک ذریعہ اور فریضے کی ادائیگی کی ضمانت ہے۔

اس معنی کو بہت سے قدیمی مفسرین اور تمام شیعہ مفسرین نے اپنایا ہے۔ شیعہ، سنی دونوں کی طرف سے اس بارے سے

میں بہت سی روایات منقول ہوئی ہیں جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

۲- دوسری تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ رسالت کا اجر یہی ہے کہ تم ان چیزوں کو دوست رکھو جو تمہیں خدا کے قرب کی دعوت دیتی ہیں۔

اس تفسیر کو بعض اہلسنت مفسرین نے اپنایا ہے جو کسی بھی لحاظ سے آیت کے ظاہری مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ میں تم سے یہ چاہتا ہوں کہ تم خدا کی اطاعت کو دوست رکھو اور اس کی محبت کو دل میں جگہ دو، جبکہ کہنا یہ چاہیے تھا کہ میں تم سے خدا کی اطاعت کو چاہتا ہوں (نہ کہ اطاعت الٰہی کی محبت)

اس کے علاوہ آیت کے مخاطب افراد میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو خدا کا قرب نہ چاہتا ہو، حتیٰ کہ مشرکین بھی اس بات کے خواہش مند تھے کہ خدا کے نزدیک ہوں اور اصولی طور پر وہ بتوں کی پرستش کو اسی بات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

۳- تیسری تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ تم اجر رسالت کے طور پر اپنے قریبی رشتہ داروں کو دوست رکھو اور صلہ رحمی بجالاؤ۔

اس تفسیر میں رسالت اور اجر رسالت کے درمیان کوئی مناسبت نظر نہیں آتی کیونکہ اپنے رشتہ داروں سے دوستی کرنے سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کونسی خدمت ہوسکتی ہے؟ اور پھر یہ دوستی کس طرح اجر رسالت قرار پاسکتی ہے؟

۴- چوتھی تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ تم سے جو میری قرابت ہے اس کی حفاظت کرو اور اسے محفوظ رکھو یہی میری رسالت کا اجر ہے۔ چونکہ میرا، تمہارے اکثر قبائل سے رشتہ ہے لہٰذا مجھے تکلیف نہ پہنچایا کرو (کیونکہ آنحضرت کا نسبی لحاظ سے قریش کے قبائل سے رشتہ تھا اور سببی (ازدواجی) لحاظ سے بہت سے قبائل سے تعلق تھا نیز مادری لحاظ سے مدینہ میں قبیلہ بنی نجار کے متعدد لوگوں سے اور رضاعی ماں کے لحاظ سے قبیلہ بنی سعد سے آپ کا رشتہ تھا۔

یہ تعبیر تمام معنوں میں سے بدترین معنی ہے جو آیت کے لیے کیا جاتا ہے کیونکہ اجر رسالت کا تقاضا ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جو آپ کی رسالت کو قبول کر چکے ہیں جب یہ لوگ آپ کی رسالت کو قبول کر چکے ہیں تو پھر ان سے اس قسم کی خواہش کا اظہار غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ آنحضرت کا بحیثیت رسول اللہ احترام کیا کرتے تھے۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ وہ آپ کا بحیثیت نسبی یا سببی رشتہ دار کے احترام کریں، کیونکہ رسالت کی وجہ سے کیا جانے والا احترام دوسرے تمام اسباب و وجوہات سے بالاتر ہوتا ہے۔ درحقیقت اس تفسیر کا شمار بہت بڑی غلطیوں میں سے ہوتا ہے جو بعض مفسرین سے سرزد ہوئی ہے اور اس نے آیت کے مفہوم کو مکمل طور پر مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

یہاں پر آیت کے مضمون و مفہوم کی حقیقت سے خوب آگاہی کے لیے بہترین راہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی دوسری آیات سے امداد حاصل کریں۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ، انبیاء کرام فرماتے تھے:

وما اسئلکم علیه من اجر ان اجری الا علیٰ رب العالمین [1]

---

[1] سورہ شعراء آیت ۱۰۹- آیت ۱۲۷- آیت ۱۴۵- آیت ۱۶۴- آیت ۱۸۰-

دعوت رسالت کے بدلے ہم تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے، ہمارا اجر تو صرف پروردگار عالم کے پاس ہے۔

اور خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے بارے میں بھی مختلف تعبیریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کہیں ارشاد ہوتا ہے:

قل ما سئلتکم من اجر فھو لکم ان اجری الا علی اللہ

کہہ دے میں نے جو بھی اجر رسالت تم سے طلب کیا ہے وہ صرف تمہارے ہی فائدہ کے لیے ہے اور میرا اجر تو صرف خدا کی ذات پر ہے۔ (سبا / ۴۷)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

قل ما اسئلکم علیه من اجر الا من شاء ان یتخذ الی ربه سبیلاً

کہہ دے میں تبلیغ رسالت کے بدلے تم سے کچھ بھی اجر نہیں مانگتا مگر جو لوگ پروردگار کے راستے کو اختیار کریں۔ (فرقان - ۵۷)۔

اور آخر میں ایک اور آیت:

قل ما اسئلکم علیه من اجر وما انا من المتکلفین

کہہ دے، میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ ہی تم پر کوئی بوجھ ڈالتا ہوں۔ (ص - ۸۶)

جب ہم ان تینوں آیات کو زیر بحث آیت کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں تو نتیجہ نکالنا آسان ہو جاتا ہے ایک مقام پر تو اجر اور اجرت کی بالکل نفی کی گئی ہے۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں میں اجر رسالت صرف ان لوگوں سے مانگتا ہوں جو خدا کی راہ کو اپناتے ہیں۔

تیسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے میں تم سے جو بھی اجر مانگتا ہوں وہ صرف اور صرف تمہارے فائدہ کے لیے ہے۔

اور زیر نظر آیت میں فرماتے ہیں، میرے قریبیوں سے مودت ہی میری رسالت کا اجر ہے۔ یعنی:

میں نے تم سے ایسا اجر رسالت طلب کیا ہے کہ جس کی یہ خصوصیات ہیں کہ یہ بالکل ایسی چیز نہیں ہے جس کا فائدہ مجھے پہنچے، بلکہ اس کا سو فیصد فائدہ خود تمہیں ہی ملے گا اور یہ ایسی چیز ہے جو خدا تک پہنچنے کے لیے تمہاری راہ ہموار کرتی ہے۔

اس لحاظ سے کیا اس کا اس کے علاوہ کوئی مفہوم ہو سکتا ہے کہ رسول اللہؐ کے مکتب کے راستے کو ان ہادیانِ الٰہی اور آپؐ کے معصوم جانشینوں کے ذریعے تسلسل بخشا جائے کہ جو تمام تر آپؐ کے خاندان میں سے ہوں۔ اور چونکہ مودت کا مسئلہ اس تسلسل اور رابطے کی بنیاد ہے لہٰذا اس آیت میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر ہوا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی آیت "مودت فی القربیٰ" کے علاوہ قرآن مجید میں اور پندرہ مقامات پر "القربیٰ" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو ہر جگہ پر قریبیوں اور نزدیکیوں کے معنی میں ہے۔ پھر معلوم نہیں کہ بعض لوگ اس بات پر کیوں اصرار کرتے ہیں کہ صرف اسی آیت میں "قربیٰ" کو "تقرب الی اللہ" کے معنی میں منحصر کر دیا جائے اور اس کے واضح اور ظاہر معنی کو جو کہ قرآن

میں ہر جگہ استعمال ہوا ہے، صرف نظر کر دیا جائے۔

پھر یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسی زیر بحث آیت کے آخر میں آیا ہے، جو شخص نیک عمل بجالائے تو ہم اس کی نیکیوں میں اضافہ کریں گے کیونکہ خدا بخشنے والا اور شکر گزار ہے اور بندوں کے اعمال کی مناسب جزا عطا فرماتا ہے (ومن یقترف حسنة نزد لہ فیھا حسنًا ان اللہ غفور شکور)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا نیکی ہو سکتی ہے کہ انسان ہمیشہ خدائی رہبروں کے پرچم تلے رہے، ان کی محبت کو دل میں جگہ دے، ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل پیرا ہو، کلام الٰہی کے سمجھنے میں جہاں ابہام پیدا ہو وہاں ان سے وضاحت حاصل کرے، ان کے اعمال کو اپنے لیے معیار عمل قرار دے اور خود ان کی ذات کو اپنے لیے اسوہ اور نمونہ قرار دے۔

مودت فی القربیٰ روایات کی نظر سے

مندرجہ بالا آیت کی اس تفسیر پر شاہد ناطق وہ بہت سی روایات ہیں جو شیعہ اور سنی کتب میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی نقل ہوئی ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ "قربیٰ" سے مراد پیغمبر اسلام علیہ وآلہ السلام کے نزدیکی اور مخصوص لوگ ہیں۔ نمونے کے طور پر:

۱۔ احمد نے "فضائل الصحابہ" میں اسناد کے ساتھ سعید بن جبیر سے اور انہوں نے عامر سے یوں روایت نقل کی ہے:

لما نزلت قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الا المودة فی القربیٰ، قالوا یا رسول اللہ! من قرابتک؟ من ھؤلاء الذین وجبت علینا مودتھم؟ قال علی وفاطمة وابناھما (علیھم السلام) وقالھا ثلاثًا

جب آیت "قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الا المودة فی القربیٰ" نازل ہوئی تو اصحاب نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے وہ نزدیکی کون لوگ ہیں کہ جن کی مودت ہم پر واجب ہوئی ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا علی، فاطمہ اور ان کے دو بیٹے ہیں۔ اور اس بات کو آپ نے تین مرتبہ دہرایا۔[1]

۲۔ "مستدرک الصحیحین" میں امام علی بن الحسین (زین العابدین) علیہ السلام سے منقول ہے کہ امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام حسن علیہ السلام نے لوگوں سے جو خطاب فرمایا اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے:

انا من اھل البیت الذین افترض اللہ مودتھم علیٰ کل مسلم فقال تبارک

---

[1] "احقاق الحق" جلد ۳ صفحہ ۲، نیز قرطبی نے بھی اسی روایت کو اسی آیت کے ذیل میں درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی جلد ۸ صفحہ ۵۸۴۳۔

وتعالٰی لنبیه (ص) قل لا اسئلکم علیه اجرًا الّا المودة فی القربٰی ومن یقترف حسنة نزدله فیها حسنًا فاقتراف الحسنة مودتنا اهل البیت

میں اس خاندان میں سے ہوں خدا نے جس کی مودت ہر مسلمان پر فرض کر دی ہے اور اپنے رسول سے فرمایا ہے قل لا اسئلکم علیه اجرًا..... اور "نیکی کمانے سے خدا کی مراد ہم اہلبیت کی مودت ہے۱

۳- "سیوطی" نے "درمنثور" میں اسی آیت کے ذیل میں مجاہد سے، انہوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ "قل لا اسئلکم علیه اجرًا الّا المودة فی القربٰی" کی تفسیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان تحفظونی فی اهل بیتی و تودوهم بی

مراد یہ ہے کہ تم میرے حق کی میرے اہلبیتؑ کے بارے میں حفاظت کرو اور میری وجہ سے ان سے محبت کرو۲

یہاں سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ابن عباس سے جو ایک اور روایت نقل ہوئی ہے وہ مسلم نہیں ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے پیغمبر اسلامؐ کی عرب قبائل سے قرابت کی وجہ سے انہیں تکلیف نہ دی جائے کیونکہ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے ابن عباس سے اس کے خلاف روایت نقل ہوئی ہے۔

۴- ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اپنی اسناد کے ساتھ سعید بن جبیر سے اور دوسری اسناد کے ساتھ عمر بن شعیب سے نقل کیا ہے کہ اس آیت سے مراد

هی قربٰی رسول الله

رسول خدا کے نزدیکی افراد ہیں۳

۵- مشہور مفسر مرحوم طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے حاکم حسکانی کی کتاب "شواهد التنزیل" سے ایک روایت نقل کی ہے۔ حاکم کا شمار اہل سنت کے مشہور مفسرین اور محدثین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے "ابوامامہ باہلی" سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ان الله خلق الانبیاء من اشجار شتی، وانا وعلی من شجرة واحدة، فانا اصلها، وعلی فرعها، وفاطمة لقاحها، والحسن والحسین ثمارها، واشیاعنا

---

۱ "مستدرک الصحیحین" جلد ۳ ص ۱۷۲ - محب الدین طبری نے بھی اسی حدیث کو اپنی کتاب "ذخائر العقبیٰ" کے ص ۱۳۷ میں اور ابن حجر مکی نے اپنی کتاب "صواعق محرقہ" میں نقل کیا ہے ملاحظہ ہو ص ۱۰۱۔

۲ تفسیر درمنثور جلد ۶ ص ۷ اسی آیت کے ذیل میں۔

۳ تفسیر طبری جلد ۲۵ ص ۱۶، ۱۷۔

اوراقھا ، ـــــ یہاں تک کہ فرمایا ـــــ لوان عبدًا عبد الله بین الصفا والمروۃ الف عام ، ثم الف عام . ثم الف عام ، حتی یصیر کالشن البالی، ثم لم یدرك محبتنا کبہ الله علی منخریہ فی النار، ثم تلا قل لا اسئلکم علیہ اجرًا

خدا نے تمام انبیاء کو مختلف درختوں سے پیدا کیا ہے لیکن مجھے اور علی کو ایک ہی درخت سے پیدا کیا۔ جس کی جڑیں ہوں، شاخ علی ہیں، فاطمہ اس کی افزائش کا ذریعہ ہیں، حسن اور حسین اس کے میوے ہیں اور ہمارے شیعہ اس کے پتے ہیں ـــــ پھر فرمایا ـــــ اگر کوئی شخص صفا اور مروہ کے درمیان ہزار سال تک خدا کی عبادت کرے، پھر ہزار سال اور، پھر ہزار اور اس کی عبادت کرے اور اتنی عبادت کرے کہ سوکھ کر پرانی مشک کے مانند ہو جائے لیکن ہماری محبت اس کے دل میں نہ ہو تو خدا اسے منہ کے بل جہنم میں ڈالے گا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الّا المودۃ فی القربیٰ"۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس روایت کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی ہے کہ مشہور شاعر کیت نے بھی اپنے اشعار میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے اور کہا ہے ؛

وجدنا لکم فی آل حامیم اٰیۃ ـــ تاولھا منا تقی و معرب

تمہاری (اہلبیتؑ) شان میں ہمیں حٰم سورتوں میں ایک ایسی آیت مل گئی ہے جسے تقیہ کرنے والوں نے تاویل کر کے اور واضح بیان کرنے والوں نے آشکارا طور پر بیان کیا ہے[1]

۶۔ "سیوطی" نے اپنی تفسیر در منثور میں "ابن جریر" سے انہوں نے "ابی دیلم" سے یوں نقل کیا ہے:
جب علی بن الحسین کو قید کر کے دمشق کے دروازے پر لایا گیا تو اہل شام میں سے ایک شخص نے کہا "الحمد لله الذی قتلکم واستاصلکم" (خدا کا شکر جس نے تمہیں قتل کیا اور تمہاری بیخ کنی کر دی) تو علی بن الحسینؑ نے فرمایا؛ کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہا، ہاں؛ پھر فرمایا حٰم سورتوں کو بھی پڑھا ہے؟ کہا نہیں۔ امام نے کہا؛ آیا اس آیت کی تلاوت نہیں کی قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الّا المودۃ فی القربیٰ؟ وہ کہنے لگا تو کیا وہ "قربیٰ" آپ لوگ ہیں جن کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے؟ فرمایا، جی ہاں[2]

۷۔ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں ایک حدیث نقل کی ہے جسے فخر رازی اور قرطبی نے اپنی تفسیروں میں لکھا ہے۔ یہ حدیث بڑی صراحت کے ساتھ آل محمدؐ کے مقام اور ان کی محبت کی اہمیت کو بیان کر رہی ہے، رسولؐ خدا فرماتے ہیں ؛

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۹ ۔

[2] تفسیر در منثور جلد ۷ ص ۔

من مات علیٰ حب اٰل محمدؐ مات شهیدًا
الاومن مات علیٰ حب اٰل محمدؐ مات مغفورًا له۔
الاومن مات علیٰ حب اٰل محمدؐ مات تائبًا۔
الاومن مات علیٰ حب اٰل محمدؐ مات مؤمنًا مستکمل الایمان۔
الاومن مات علیٰ حب اٰل محمدؐ بشره ملك الموت بالجنة ثم منکر و نکیر۔
الاومن مات علیٰ حب اٰل محمدؐ یزف الی الجنة کما تزف العروس الی بیت زوجها۔
الاومن مات علیٰ حب اٰل محمدؐ فتح له فی قبره بابان الی الجنة۔
الاومن مات علیٰ حب اٰل محمدؐ جعل الله قبره مزار ملائکة الرحمة۔
الاومن مات علیٰ حب اٰل محمدؐ مات علی السنة والجماعة۔
الاومن مات علیٰ بغض اٰل محمدؐ جاء یوم القیامة مکتوب بین عینیه ایس من رحمة الله۔
الاومن مات علیٰ بغض اٰل محمدؐ مات کافرًا۔
الاومن مات علیٰ بغض اٰل محمدؐ لم یشم رائحة الجنة۔

جو شخص آل محمدؐ کی محبت پر مرا وہ شہید ہو کر مرا۔
خبردار رہو! جو شخص آل محمدؐ کی محبت کے ساتھ مرا اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔
خبردار رہو! جو شخص آل محمدؐ کی محبت کے ساتھ مرا وہ تائب ہو کر مرا۔
خبردار رہو! جو شخص آل محمدؐ کی محبت کے ساتھ مرا وہ کامل الایمان مؤمن ہو کر مرے گا۔
خبردار رہو! جو شخص آل محمدؐ کی محبت کے ساتھ مرا موت کے فرشتے اسے بہشت کی خوشخبری دیں گے، پھر (قبر میں سوال کرنے والے فرشتے) منکر اور نکیر اسے خوشخبری دیں گے۔
خبردار رہو! جو شخص آل محمدؐ کی محبت کے ساتھ مرا اسے یوں آراستہ کر کے احترام کے ساتھ بہشت میں لے جایا جائے گا جس طرح دلہن کو اس کے دولہا کے گھر لے جایا جاتا ہے۔
خبردار رہو! جو شخص آل محمدؐ کی محبت پر مرا اس کی قبر میں بہشت کے دو دروازے کھول دیئے جائیں گے۔
خبردار رہو! جو شخص آل محمدؐ کی محبت کے ساتھ مرا خدا اس کی قبر کو ملائکہ رحمت کی زیارت گاہ بنا دے گا۔
خبردار رہو! جو شخص آل محمدؐ کی محبت کے ساتھ مرا وہ اسلام کی سنت اور مسلمانوں کی جماعت پر مرے گا۔
آگاہ رہو! جو شخص آل محمدؐ کی دشمنی کے ساتھ مرا قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں عرصہ محشر میں داخل ہو گا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہو گا کہ یہ خدا کی رحمت سے مایوس ہے۔

آگاہ رہو! جو شخص آلِ محمدؐ کی دشمنی کے ساتھ مرے گا وہ کافر ہو کر مرے گا۔
آگاہ رہو! جو شخص آلِ محمدؐ کی دشمنی کے ساتھ مرے گا وہ بہشت کی خوشبو کو نہیں سونگھ پائے گا۔[1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ فخر رازی اس حدیث شریف کو جسے صاحب کشاف نے "حدیث مرسل مسلم" کے نام سے یاد کیا ہے، ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں :

"آلِ محمدؐ وہ لوگ ہیں جن کے امور کی بازگشت آپؐ ہی کی طرف ہوتی ہے، جن لوگوں کا رابطہ زیادہ محکم اور کامل ہوگا انہی کا "آل" میں شمار ہوگا اور اس میں شک نہیں کہ فاطمہ، علی، حسن اور حسین (علیہم السلام) کا رسول خدا سے محکم ترین رشتہ ہے اور یہ بات مسلمات میں سے ہے اور متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ بنا بریں لازم ہے کہ ہم انہیں "آلِ رسولؐ" سمجھیں۔"

آگے چل کر کہتے ہیں :

"کچھ لوگوں نے آل کے مفہوم میں اختلاف کیا ہے، بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قریبی رشتہ دار ہی آلِ رسول ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ آپؐ کی امت آپؐ کی آل ہے۔ اگر ہم اس لفظ کو پہلے معنی پر محمول کریں تو اس سے مراد صرف اور صرف مذکورہ بزرگ ہستیاں ہیں اور اگر اس سے مراد امت یعنی وہ افراد ہیں جنہوں نے آنحضرتؐ کی دعوت کو قبول کیا تو پھر بھی رسول خداؐ کے نزدیکی رشتہ دار آپؐ کی آل سمجھے جائیں گے، بنا بریں ہر لحاظ سے یہ ہستیاں تو آپؐ کی آل ہیں، البتہ ان کے علاوہ لوگ آل میں داخل ہیں یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔"

اس کے بعد فخر رازی نے صاحب کشاف سے یوں نقل کیا ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے عرض کی، یا رسول اللہ! آپؐ کے قریبی رشتہ دار کون ہیں جن کی محبت ہم پر فرض ہوئی ہے؟ تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: وہ علی و فاطمہ اور ان کے دو فرزند ہیں۔

پس معلوم ہوا یہ چار بزرگوار ہستیاں پیغمبر اسلامؐ کی ذوی القربیٰ ہیں اور جب یہ ثابت ہوگیا تو پھر ضروری ہے کہ اُن کا انتہائی احترام کیا جائے۔

فخر الدین رازی مزید کہتے ہیں کہ اس مسئلے پر مختلف دلائل دلالت کرتے ہیں :

---

[1] تفسیر کشاف جلد ۴ ص ۲۲۰، ص ۲۲۱ تفسیر فخر رازی جلد ۲۷ ص ۱۶۵ و ص ۱۶۶ تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۸۴۳ تفسیر ثعلبی جلیل بن عبداللہ بجلی سے اسی آیت کے ذیل میں۔ (منقول از المراجعات خط ۱۹)۔

۱۔ "الا المودۃ فی القربیٰ" کا جملہ کہ جس کا طرز استدلال بیان ہو چکا ہے۔

۲۔ اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ کو حضرت فاطمہ سے محبت تھی اور ان کے بارے میں فرمایا "فاطمة بضعة منی یؤذیني ما یؤذیها" (فاطمہ میرے بدن کا ٹکڑا ہے جو چیز اسے تکلیف دے گی وہ مجھے تکلیف دے گی) اور رسول خدا کی متواتر حدیثوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آپ علی، حسن اور حسین سے محبت فرماتے تھے، اور جب یہ بات ثابت ہو گئی تو ان کی محبت تمام امت پر واجب ہے چونکہ خدا فرماتا ہے "واتبعوہ لعلکم تهتدون" (رسول خدا کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ[1]) نیز فرماتا ہے "فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ" (جو لوگ فرمان رسول کی مخالفت کرتے ہیں انہیں عذاب الٰہی سے ڈرنا چاہیئے[2]) اور یہ بھی فرماتا ہے "قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" (پیغمبر! کہہ دیجیئے کہ اگر خدا کو دوست رکھنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو تاکہ خدا تمہیں دوست رکھے[3]) ساتھ ہی اس کا یہ فرمان بھی ہے کہ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" (تمہارے لیے رسول خدا کی زندگی بہترین نمونہ ہے[4])۔

۳۔ "آل" کے لیے دعا ایک عظیم اعزاز ہے لہٰذا یہ دعا تشہد کے اختتام پر موجود ہے "اللھم صل علیٰ محمد و علیٰ آل محمد، وارحم محمداً و آل محمد اور اس قسم کی عظمت اور احترام آل کے علاوہ کسی اور کے بارے میں نظر نہیں آتا لہٰذا ان سب دلائل کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آل محمدؐ کی محبت واجب ہے۔

آخرالامر فخرالدین رازی اپنی گفتگو کو امام شافعیؒ کے ان مشہور اشعار پر ختم کرتے ہیں:

یاراکبا قف بالمحصب من منی — واھتف بساکن خیفها والناھض

سحرًا اذا فاض الحجیج الی منی — فیضا کما نظم الفرات الفائض

ان کان رفضا حب آل محمد — فلیشهد الثقلان انی رافضی

اے حج کے لیے جانے والے سوار! جہاں پر منیٰ کے نزدیک رمی جمرات کے لیے کنکریاں اکٹھا کرتے ہیں اور جو خانۂ خدا کے زائرین کا عظیم اجتماعی مرکز ہے تو وہاں پر ٹھہر جا اور ان لوگوں کو

---

[1] سورہ اعراف آیت ۱۵۸۔

[2] سورہ نور آیت ۶۳۔

[3] سورہ آل عمران آیت ۳۱۔

[4] سورہ احزاب آیت ۲۱۔

آواز دے جو مسجد خیف میں مصروف عبادت ہیں یا چل رہے ہیں۔
اس وقت پکار جب بوقت سحر حجاج مشعر الحرام سے منیٰ کی جانب چل پڑتے ہیں اور عظیم اور ٹھاٹھیں مارتے دریا کے مانند سرزمین منیٰ میں داخل ہوتے ہیں۔
ہاں تو باآواز بلند کہہ دے کہ اگر آل محمدؐ کی محبت کا نام رفض (رافضی ہونا) ہے تو تمام جن وانس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔[1]

جی ہاں یہ ہے آل محمدؐ کا مقام اور ان کی قدر و منزلت، ہم جن کے دامان سے متمسک ہیں اور جنہیں ہم نے اپنا دین اور دنیا کا راہبر و راہنما تسلیم کیا ہے۔ ہم انہیں اپنے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونہ کامل سمجھتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اُن کی امامت کے ذریعے راہِ نبوت کا تسلسل باقی ہے۔

البتہ مندرجہ بالا احادیث کے علاوہ اسلامی کتابوں میں اور بھی بہت سی احادیث موجود ہیں لیکن ہم اختصار اور تفسیری پہلوؤں پر قناعت کرتے ہیں اور مندرجہ بالا سات احادیث پر اکتفا کرتے ہیں، لیکن اس نکتے کو بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ علم کلام کی بعض کتابوں مثلاً "احقاق الحق" اور اس کی بسوط شرح میں "قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ" کی تفسیر میں مذکورہ بالا مشہور حدیث اہل سنت کی پچاس سے زائد کتابوں سے نقل کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت کس قدر مشہور و معروف ہے۔ البتہ کتب شیعہ میں بھی یہ حدیث اہل بیت کے حوالے سے بہت سی کتب حدیث میں نقل کی گئی ہے۔

چند نکات

۱۔ **مشہور مفسر آلوسی سے کچھ باتیں:** یہاں پر ایک سوال جو بہت سے لوگوں کے پیش نظر ہے اور مشہور مفسر آلوسی نے اسے شیعوں پر ایک اعتراض کی صورت میں اپنی تفسیر روح المعانی میں پیش کیا ہے، بیان کر کے اس کا تجزیہ و تحلیل کریں گے آلوسی کی گفتگو کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

"بعض شیعوں نے اس آیت کو علیؑ کی امامت پر دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ علیؑ کی محبت واجب ہے اور جس کی محبت واجب ہوتی ہے اس کی اطاعت بھی واجب ہوتی ہے اور جس کی اطاعت واجب ہوتی ہے وہ امام ہوتا ہے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ علیؑ مقام امامت کے مالک ہیں اور اسی آیت کو انہوں نے دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔
لیکن ان کی یہ باتیں کئی لحاظ سے قابل اعتراض ہیں پہلے تو یہ کہ اس آیت کو محبت کے وجوب پر دلیل ہم اس وقت مانیں گے جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ آیت پیغمبر خدا کے اقرباء

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۷ صفحہ ۱۶۶۔

کی محبت کے معنی میں ہے جب کہ بہت سے مفسرین نے اس معنی کو تسلیم نہیں کیا ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ بات مقام نبوت کے شایان شان نہیں ہے کیونکہ اس سے آپ کی ذات پر تہمت آتی ہے کہ آپ کا یہ مقام دنیا پرستوں کے کام جیسا ہوگا کہ پہلے تو وہ کسی کام کو شروع کر دیتے ہیں پھر اس کے فوائد اور منافع کا اپنی اولاد اور رشتہ داروں کے لیے مطالبہ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۴ کے بھی منافی ہے جس میں ارشاد ہے "وما تسئلهم عليه من اجر" یعنی اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے اپنی اجرت طلب نہیں کرتے۔

دوسرے یہ کہ ، ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ محبت کا وجوب اطاعت کی دلیل بن سکے کیونکہ ابن بابویہ اپنی کتاب "اعتقادات" میں کہتے ہیں کہ امامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ علویوں کی محبت لازم ہے جبکہ وہ ان سب کو واجب الاطاعت نہیں سمجھتے۔

تیسرے یہ کہ ، ہم یہ بات بھی نہیں مانتے جس شخص کی اطاعت واجب ہوتی ہے وہ امام یعنی زعامت کبریٰ کا مالک بھی ہو ورنہ ہر پیغمبر اپنے زمانے میں امام ہوتا ، جب کہ ہم جناب طالوت کی داستان میں پڑھتے ہیں کہ وہ ایک گروہ کے امام ہوئے جبکہ اس زمانے میں ایک اور پیغمبر بھی موجود تھے۔

چوتھے یہ کہ : آیت کا تقاضا ہے کہ تمام اہلبیت واجب الاطاعت ہوں ، اور اسی بنا پر وہ سب امام ہوں جبکہ امامیہ کا ایسا عقیدہ نہیں ہے[1]

اعتراض پر ایک تحقیقی نظر

آیۂ مؤدت اور دوسری آیات میں بہت سے موجود قرائن میں غور کرنے سے ان میں سے کئی اعتراضات کا جواب واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔

کیونکہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ یہ محبت کوئی معمولی اور عام چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو نبوت کی جزا اور رسالت کا اجر ہے اور فطرۃً اس محبت کو بھی نبوت و رسالت کے ہم پلہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس کا اجر قرار پا سکے۔

پھر دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ اس محبت کا فائدہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچے بلکہ اس کا سو فیصد فائدہ خود مؤمنین کو پہنچتا ہے ، دوسرے لفظوں میں یہ ایک ایسا معنوی امر ہے جو مسلمانوں کی ہدایت کے ارتقاء میں مؤثر ہے۔

اس طرح سے اگرچہ آیت کے ظاہر سے محبت کے وجوب کے علاوہ اور کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی لیکن اس محبت کے وجوب کے لیے جو قرائن مذکور ہوئے ہیں وہ مسئلہ امامت کو واضح کرتے ہیں کہ جو مقام نبوت و رسالت کا مددگار اور پشت پناہ ہے۔

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ صفحہ ۲۸ (اسی آیت کے ذیل میں)

مندرجہ بالا مختصر سی وضاحت کے بعد ہم مذکورہ اعتراضات کا جواب پیش کرتے ہیں۔

پہلے تو یہ کہ : آلوسی کہتے ہیں کہ بعض مفسرین اس آیت سے مودت اہلبیت مراد نہیں لیتے۔ یہ بات ماننی پڑے گی کہ پہلے سے کئے ہوئے فیصلے اور رسومات ایسا کرنے میں حائل ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ تو "قربیٰ" کا معنی "خدا کا تقرب" کرتے ہیں جب کہ قرآن مجید کی تمام آیات میں جہاں جہاں بھی یہ کلمہ استعمال ہوا ہے وہاں پر "قریبی رشتہ داروں" کے معنی میں ہے۔

یا بعض لوگ اس کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عرب قبائل کے ساتھ رشتہ داری سے تفسیر کرتے ہیں جب کہ یہ تفسیر آیت کے نظام کو مکمل طور پر درہم برہم کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اجر رسالت ان لوگوں سے طلب کیا جا رہا ہے جنہوں نے رسالت کو قبول کر لیا ہے اور جو لوگ پیغمبر اسلامؐ کی رسالت کو قبول کر چکے ہوں پھر کیا ضرورت ہے کہ ان سے یہ تقاضا کیا جائے کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کی رشتہ داری کا پاس کرتے ہوئے انہیں تکلیف دینے سے باز رہیں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ جب بے انتہا روایات آیت کو اہلبیتؑ کی ولایت سے تفسیر کرتی ہیں انہیں چھوا تک نہ جائے ؟

اس لیے یہ بات قبول کرنا پڑے گی کہ مفسرین کے اس گروہ نے ہرگز ہرگز خالی الذہن ہو کر آیت کی تفسیر نہیں کی، ورنہ کوئی پیچیدہ بات آیت کے مطلب میں موجود نہیں ہے۔

اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ مودت اہلبیتؑ کا تقاضا نہ تو مقام نبوت کے منافی ہے اور نہ ہی اسے دنیا پرستوں کے طریقہ کار پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ معنی سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۴ سے بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہے جو ہر قسم کی اجرت کی نفی کر رہی ہے، کیونکہ اہلبیتؑ کی مودت کا اجر حقیقت میں ایسا اجر نہیں ہے جس سے خود رسول اللہ کو کوئی فائدہ ہو، بلکہ اس میں خود مسلمانوں کا اپنا فائدہ ہے۔

دوسرے یہ کہ : یہ صحیح ہے کہ عام اور معمولی محبت اطاعت کے وجوب کی ہرگز دلیل نہیں بن سکتی لیکن جب ہم اس بات کو پیش نظر لاتے ہیں کہ یہ محبت کوئی عام محبت نہیں بلکہ نبوت و رسالت کے ہم پلہ ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ اطاعت کا وجوب بھی اسی میں پوشیدہ ہے اور یہیں پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ابن بابویہ (شیخ صدوق) کی گفتگو بھی اس امر کے منافی نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ : یہ ٹھیک ہے کہ ہر اطاعت کا وجوب زعامت کبریٰ اور امامت کی دلیل نہیں بن سکتی لیکن یہ بات بھی تو مدنظر ہونی چاہیئے کہ جس اطاعت کا وجوب، رسالت کا اجر قرار پا رہا ہے وہ امام کے علاوہ کسی اور کے شایان شان نہیں ہو سکتی۔

چوتھے یہ کہ : امام بمعنی رہبر و پیشوا ـــــ ہر دور میں صرف ایک ہی شخصیت ہو سکتی ہے اور بس لہٰذا تمام اہلبیت کی امامت کا کوئی معنی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آیت کا معنی سمجھنے میں روایات کے تعلق کو بھی بہر صورت پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

پھر یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ آلوسی نے ذاتی طور پر مودت اہلبیت کو بہت بڑی اہمیت دی ہے اور مندرجہ بالا بحث سے چند سطور پہلے وہ لکھتے ہیں :

حق بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے اقرباء کی مودت بوجہ ان کے پیغمبر کا رشتہ دار ہونے کے واجب

ہے اور قرابت جتنی زیادہ قوی ہوگی محبت کا وجوب اس قدر بیشتر ہوگا۔

آخر میں کہتے ہیں :

اس مودت کے آثار پیغمبر اسلامؐ کے اقرباء کی تعظیم، احترام اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے ظاہر ہوتے ہیں جبکہ بعض لوگ اس بارے میں سستی سے کام لیتے ہیں حتیٰ کہ اقرباء پیغمبرؐ سے محبت کو ایک قسم کی رافضیت سمجھتے ہیں لیکن میں ایسا نہیں کہتا بلکہ وہی کچھ کہتا ہوں جو امام شافعی نے اپنے جاذب اور دل نشین اشعار میں کہا ہے۔

پھر وہ امام شافعی کے مذکورہ اشعار نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں :

اس کے ساتھ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ میں اہلسنت کے بزرگوں کے عقائد سے باہر نہیں ہوں جو وہ صحابہ کرام کے بارے میں رکھتے ہیں اور ان کی محبت کو بھی واجب سمجھتا ہوں [1]

۲۔ **کشتی نجات** : جناب فخر الدین رازی نے اسی بحث کے ذیل میں ایک نکتے کو بیان کیا ہے اور اسے اپنا پسندیدہ نکتہ قرار دیا ہے اور مفسر آلوسی نے بھی اسے "ایک لطیف نکتہ" کے عنوان سے اپنی تفسیر روح المعانی میں، انہیں سے نقل کیا ہے، یہ وہ نکتہ ہے جو ان کے خیال کے مطابق بہت سے تضادات کو برطرف کر رہا ہے :

ایک طرف تو پیغمبرؐ اسلام ارشاد فرماتے ہیں " مثل اھل بیتی کمثل سفینۃ نوح من رکبھا نجی " (میرے اہل بیت کشتی نوح کے مانند ہیں جو اس پر سوار ہوا وہ نجات پا گیا) اور دوسری طرف ارشاد فرماتے ہیں "اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم" (میرے اصحاب ستاروں کے مانند ہیں ان میں سے جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے)۔

اب ہم فرائض کی ادائیگی کے سمندر میں گرفتار ہیں، شکوک و شبہات اور خواہشات نفسانی کی موجیں ہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور جسے سمندر عبور کرنا ہوتا ہے اسے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک کشتی جو ہر طرح کے عیب و نقص سے پاک ہو اور دوسرے چمکدار اور روشن ستارے جن کے ذریعے کشتی کی راہوں کو متعین کیا جاتا ہے، جب انسان کشتی پر سوار ہو جائے اور اپنی نگاہیں ستاروں پر لگائے رکھے تو نجات کی امید ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اہل سنت میں سے جو شخص آل محمدؐ کی محبت کی کشتی پر سوار ہو کر ستاروں جیسے اصحاب پر اپنی نگاہیں جمائے رکھے تو امید ہے کہ خدا اسے دنیا و آخرت کی سلامتی اور سعادت سے بہرہ مند کر دے [2]

لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ شاعرانہ تشبیہ اگرچہ ظاہری طور پر دلکش اور جاذب نظر تو ہے لیکن صحیح معنوں میں درست نہیں

---

[1] روح المعانی جلد ۲۵ ص ۲۸ ۔

[2] تفسیر فخر الدین رازی جلد ۲۷ ص ۱۶۷ ۔

ہے کیونکہ

ایک تو : کشتی نوح اس وقت نجات کا ذریعہ بنی جبکہ طوفان کے پانی نے ہر جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور وہ ہمیشہ چلتی رہی تھی، دوسری عام کشتیوں کے مانند کسی ایک منزل مقصود کی طرف اس کی حرکت نہیں تھی کہ ستاروں کے ذریعے اس منزل کا تعین کیا جاتا۔ بلکہ منزل مقصود خود کشتی ہی تھی اور یہ اس وقت تک اپنے حال پر قائم رہی جب تک کہ طوفان کا پانی ختم نہیں ہوگیا اور کشتی کوہ جودی پر ٹھہر نہیں گئی اور کشتی کے سواروں نے نجات نہیں پائی۔

دوسرے یہ کہ : اہلسنت بھائیوں کی کتابوں میں درج ایک روایت میں جو کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے یوں آیا ہے :

النجوم امان لاھل الارض من الغرق واھل بیتی امان لامتی من الاختلاف فی الدین

ستارے اہل زمین کے لیے امان ہیں ان کے غرق ہونے سے اور میرے اہل بیت میری امت کے لیے دین میں اختلاف سے امان ہیں [1]

۴۔ "ومن یقترف حسنة ......" کی تفسیر : "ومن یقترف حسنة نزد لہ فیھا حسناً" (جو شخص کوئی نیکی کمائے گا ہم اس کی اچھائی میں اضافہ کردیں گے) اس جملے میں لفظ "اقتراف" اصل میں "قرف" (بروزن "حرف") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے درخت کی اضافی چھال کا اتار لینا یا زخم کی اضافی کھال کا اتار لینا کہ بعض اوقات جس سے صحت وتندرستی حاصل ہو جاتی ہے۔ بعد میں یہ کلمہ اکتساب (کمانے اور حاصل کرنے) کے معنی میں استعمال ہونے لگا، خواہ یہ اکتساب اچھا ہو یا برا۔ لیکن راغب کہتے ہیں کہ یہ کلمہ خوبی کی نسبت برائی کے لیے زیادہ استعمال ہوتا ہے (اگرچہ اس آیت میں خوبی کے لیے استعمال ہوا ہے)

یہی وجہ ہے کہ عربوں میں ایک ضرب المثل مشہور ہے :

الاعتراف یزیل الاقتراف

گناہ کا اعتراف گناہ کو مٹا دیتا ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ ابن عباس اور ایک اور متقدم مفسر "سدی" سے منقول ہے کہ آیت میں "اقتراف حسنة" سے مراد، آل محمدؐ کی مودت ہے [2]

ایک اور حدیث میں جو کہ ہم امام حسن علیہ السلام کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں، آیا ہے :

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۴۹ منقول از عباس، حاکم پھر کہتے ہیں کہ "ھٰذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ" (یہ حدیث معتبر ہے لیکن بخاری اور مسلم نے اسے نقل نہیں کیا ہے)۔

[2] تفسیر "مجمع البیان" اسی آیت کے ذیل میں، تفسیر صافی اور تفسیر قرطبی۔

اقتراف الحسنة مودتنا اهل البيت

نیکی کمانے سے مراد ہم اہلبیت کی مودت ہے۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کی تفسیروں کی مراد اکتساب حسنہ کے معنی کو اہلبیتؑ کی مودت میں محدود کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا نہایت وسیع اور عمومی معنی ہے لیکن چونکہ یہاں پر ذوی القربیٰ کی مودت کے بعد آیا ہے لہٰذا اس کا واضح ترین مصداق یہی مودت ہے۔

۴۔ **یہ چند آیات مدنی ہیں :** جیسا کہ ہم آغاز میں کہہ چکے ہیں کہ سورۂ شوریٰ مکی ہے۔ لیکن بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ چار آیات (آیت ۲۳ تا ۲۶) مدینہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن جیسا کہ ہم آغاز میں بتا چکے ہیں کہ ان آیات کی شان نزول ہمارے اس مدعا کی دلیل ہے اور وہ روایات بھی اسی بات کے لیے اچھی دلیل ہیں جن کے مطابق اہل بیت سے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ مراد ہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت علیؑ کا سیدہ طاہرہؑ سے عقد مدینہ منورہ میں انجام پایا اور مشہور روایات کی بنا پر جناب حسنؑ اور جناب حسینؑ کی ولادت تیسری اور چوتھی ہجری میں ہوئی۔

۲۴۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ۚ فَاِنۡ یَّشَاِ اللّٰہُ یَخۡتِمۡ عَلٰی قَلۡبِکَ ؕ وَ یَمۡحُ اللّٰہُ الۡبَاطِلَ وَ یُحِقُّ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ ؕ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝

۲۵۔ وَ ہُوَ الَّذِیۡ یَقۡبَلُ التَّوۡبَۃَ عَنۡ عِبَادِہٖ وَ یَعۡفُوۡا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَ یَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝ۙ

۲۶۔ وَ یَسۡتَجِیۡبُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ یَزِیۡدُہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَ الۡکٰفِرُوۡنَ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۝

ترجمہ

۲۴۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے لیکن اگر خدا چاہے تو تیرے دل پر مہر لگا دے (اور ان آیات کے اظہار کی قدرت تجھ سے چھین لے) اور وہ باطل کو نابود کر دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمان سے قائم کر دیتا ہے، کیونکہ وہ دلوں کے اندر سے آگاہ ہے۔

۲۵۔ وہ وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہ معاف کر دیتا ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو اسے جانتا ہے۔

۲۶۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے ہیں ان کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور ان پر اپنے فضل کا اضافہ کر دیتا ہے لیکن کافروں کے لیے سخت عذاب ہے۔

تفسیر

وہ بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے

یہ آیات، رسالت، اجر رسالت، مودت ذی القربیٰ اور اہلبیتؑ کے بارے میں سابقہ آیات کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ اس وحی خدا کو قبول نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ اس نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے یہ سب باتیں اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں جنہیں خدا کی طرف منسوب کرتا ہے" (ام یقولون افترٰی علی اللہ کذبًا)۔

"جب کہ اگر خدا چاہے تو تیرے دل پر مہر لگا دے اور ان آیات کے اظہار کی قدرت تجھ سے چھین لے" (فان یشا اللہ یختم علیٰ قلبك)۔

در حقیقت یہ چیز اس مشہور منطقی استدلال کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے اور معجزے اور آیات بینات بھی اس کے ہاتھوں اور زبان سے ظاہر ہوں اور خدا کی تائید اور نصرت بھی اسے حاصل ہو۔ لیکن وہ خدا پر جھوٹ باندھنا شروع کر دے تو حکمت الٰہی اس بات کی متقاضی ہو گی کہ وہ تمام معجزات اور خدا کی نصرت وحمایت سب اس سے واپس لے لی جائے اور خدا اسے ذلیل ورسوا کر دے جیسا کہ سورہ "حاقہ" کی آیت ۴۴ تا ۴۶ میں ہے:

ولو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منه بالیمین ثم لقطعنا منه الوتین

اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھنا شروع کر دے تو ہم اس سے پوری طاقت سے مؤاخذہ کریں گے اور اسے سزا دیں گے اور اس کے دل کی رگ کو کاٹ ڈالیں گے۔

البتہ آیت کی اس تفسیر میں مفسرین نے اور بھی بہت سے احتمال ذکر کئے ہیں لیکن جو تفسیر ہم سطور بالا میں بیان کر چکے ہیں وہ زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ کفار ومشرکین منجملہ دیگر ناجائز تہمتوں کے جو وہ رسول گرامی اسلامؐ پر لگایا کرتے تھے ایک تہمت یہ بھی تھی کہ رسول اللہؐ نے خدا پر جھوٹ باندھ کر اپنی رسالت کا اجر اپنے اہلبیت سے مودت کی صورت میں لیا ہے۔ (جیسا کہ گزشتہ آیات میں اس چیز کا ذکر ہو چکا ہے) اور یہ آیت اس تہمت کی نفی کر رہی ہے۔

لیکن اس کے باوجود آیت کا مفہوم اس معنی میں منحصر بھی نہیں کیونکہ دوسری قرآنی آیات کی رو سے دشمنان دین واسلام تمام قرآن اور وحی کے بارے میں بھی آنحضرتؐ کی ذات بابرکات کو مورد الزام ٹھہرایا کرتے تھے۔ چنانچہ سورۂ یونس کی آیت ۳۸ میں ہے:

ام یقولون افتراہ قل فأتوا بسورۃ مثله۔

بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبرؐ) نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے تو کہہ دے کہ تم بھی اس جیسی ایک سورت لے آؤ۔

اسی سے ملتی جلتی بات لیکن کچھ فرق کے ساتھ سورۂ ہود کی تیرھویں اور پینتیسویں آیات کے علاوہ قرآن پاک کی بعض دوسری آیات میں بھی موجود ہے اور یہ آیات ہماری مذکورہ تفسیر کی گواہ ہیں۔

پھر اسی امر پر تاکید کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے : خدا باطل کو مٹاتا ہے اور حق کو اپنے حکم سے قائم اور ثابت کرتا ہے (ویمح اللہ الباطل و یحق الحق بکلماتہ)[1]۔

یہ خداوند عالم کا فریضہ ہوتا ہے کہ اپنی حکمت کی بنا پر حق کو ظاہر اور باطل کو ذلیل و خوار کرے تو پھر کیونکر کسی کو اس بات کی کھلی چھٹی دے سکتا ہے کہ وہ اس پر افترا پردازی کرے اور پھر وہ اس کی امداد بھی کرے اور پھر معجزات کو اس کے ہاتھوں پر آشکار کرے؟

اور اگر کوئی شخص یہ تصور کرے کہ پیغمبر اسلام علم خدا سے چھپ کر ایسا اقدام کرتے ہیں تو یہ اس کی زبردست غلطی ہوگی کیونکہ وہ تو دلوں میں موجود ہر چیز سے آگاہ ہے" (انہ علیم بذات الصدور)۔

جیسا کہ سورۂ فاطر کی آیت ۳۸ کی تفسیر میں ہم بتا چکے ہیں کہ عربی زبان میں "ذات" کا لفظ اشیاء کی عین اور حقیقت کے لیے استعمال نہیں ہوا بلکہ یہ تو فلاسفہ کی اصطلاح ہے جبکہ عربی میں "ذات" "صاحب" کے معنی میں آیا ہے۔[2] لہٰذا اس لحاظ سے "انہ علیم بذات الصدور" کے جملہ کا معنی اور مفہوم یہ ہوگا کہ خدا ان افکار اور عقائد سے اچھی طرح واقف ہے جو ان لوگوں کے دلوں پر حاکم ہیں اور گویا ان دلوں کے مالک ہو چکے ہیں اور یہ انسانوں کے قلوب و ارواح پر ان کے افکار کی حاکمیت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے (غور کیجئے گا)

اور چونکہ خداوند عالم نے اپنے بندوں کے لیے بازگشت کا راستہ ہمیشہ کھلا رکھا ہے اور آیات قرآن مجید میں بارہا مشرکین اور گناہگاروں کے برے اعمال کا ذکر کرنے کے بعد گناہگاروں کے لیے توبہ کے دروازوں کو کھلا رکھنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ زیر تفسیر آیات میں بھی سابق گفتار کے بعد فرمایا گیا ہے : خدا تو وہ ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کرتا ہے (وھو الذی یقبل التوبۃ عن عبادہ و یعفوا عن السیئات)۔

---

[1] توجہ رہے کہ "یمح" دراصل "یمحو" تھا جو عام طور پر قرآن کے بہت سے رسم الخط میں "و" کے ساقط ہونے کے ساتھ آیا ہے، جیسا کہ "ویدع الانسان بالشر" (سورۂ بنی اسرائیل - ۱۱) اور "سندع الزبانیۃ" (سورۂ علق - ۱۸) —— ایسے تمام موارد میں موجودہ رسم الخط میں واؤ ذکر ہوتی ہے لیکن عام طور پر قرآن میں محذوف ہے۔

[2] دیکھئے مفردات راغب۔

لیکن اگر ظاہر میں تو توبہ کر لو اور باطن میں کچھ اور کام کرو تو یہ تصور مت کرو کہ تمہارا یہ طریقہ کار خداوند عالم کے علم کی تیز بین نگاہوں سے چھپا رہے گا نہ ! نہ !! "جو کچھ تم بجالاتے ہو وہ اسے جانتا ہے۔ (ویعلم ماتفعلون)۔

گزشتہ آیات کے آغاز میں شان نزول کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ آیۂ مودت نازل ہونے کے بعد بعض منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ

یہ تو وہ باتیں ہیں جو محمدؐ نے خدا پر جھوٹ باندھتے ہوئے اپنی طرف سے گھڑلی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے بعد ہمیں اپنے رشتہ داروں کے آگے ذلیل کرے۔

اس پر "امیقولون افتریٰ علی اللہ کذبًا" والی آیت نے نازل ہو کر ان کے اعتراض کا جواب دے دیا اور جب وہ نزول آیات سے باخبر ہوئے تو کچھ لوگوں نے اظہار ندامت کیا اور پشیمان ہوتے، رونے لگے اور غمگین ہوئے تو آیت "وھو الذی یقبل التوبۃ ......" نازل ہوئی، یعنی اگر ان لوگوں نے خاص توبہ کر لی ہے تو خدا نے بھی ان کی توبہ کو قبول فرمالیا ہے اور ان کی خطاؤں کو معاف کر دیا ہے۔

زیر تفسیر آیات کے سلسلے کی آخری آیت میں مؤمنین کی عظیم جزا اور کافرین کے دردناک عذاب کو مختصر سے جملوں میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا ان لوگوں کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے جو ایمان لے آئے ہیں اور اعمال صالح بجالاتے ہیں (ویستجیب الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات)۔

"بلکہ ان کے لیے اپنا فضل بڑھا دیتا ہے" اور جن چیزوں کے لیے وہ دعا بھی نہیں کرتے انہیں عطا کر دیتا ہے (ویزیدھم من فضلہ)۔

"لیکن کافروں کے لیے سخت عذاب ہے" (والکافرون لھم عذاب شدید)۔

اور یہ کہ مؤمنین کی کن دعاؤں کو قبول کرتا ہے، اس بارے میں مختلف تفسیریں ہیں بعض مفسرین نے انہیں بعض دعاؤں میں محدود سمجھا ہے جن میں سے:

بعض کہتے ہیں کہ وہ مؤمنین کی ایک دوسرے کے حق میں دعاؤں کو قبول کرتا ہے،

بعض کہتے ہیں کہ ان کی عبادتوں اور اطاعتوں کو قبول کرتا ہے۔

اور بعض مفسرین نے یہ دعائیں مؤمنین کی ان کے اپنے بھائی بندوں کے بارے میں شفاعت کے بارے میں سمجھی ہیں۔

لیکن اس قسم کی محدودیت پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ خداوند عالم صالح مؤمنین کی ہر قسم کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے اور اس سے بڑھ کر ان باتوں کو بھی جو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہیں کہ وہ خدا سے طلب کریں لیکن وہ اپنے فضل وکرم کی بناء پر انہیں عطا فرماتا ہے اور مؤمنین کے بارے میں یہ خدا کا انتہائی لطف وکرم ہے۔

"ویزیدھم من فضلہ" کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے جو آپؑ نے حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرمائی ہے:

الشفاعة لمن وجبت له النار ممن احسن الیهم فی الدنیا

خدا ان پر اپنا اضافی فضل یہ فرمائے گا کہ ان مومنین کی ان لوگوں کے بارے میں شفاعت قبول فرمائے گا جنہوں نے دنیا میں ان کے ساتھ کوئی نیکی کی ہوگی (لیکن اپنے بُرے اعمال کی بنا پر) جہنم کے مستحق ہو چکے ہوں گے۔[1]

اس معنی خیز حدیث کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ خدا کا اضافی فضل اسی چیز میں منحصر ہے بلکہ یہ تو صرف اس کے روشن مصداقوں میں سے ایک ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

۲۷۔ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ○

۲۸۔ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ○

۲۹۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ○

۳۰۔ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ ○

۳۱۔ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

ترجمہ

۲۷۔ جب اللہ اپنے بندوں کی روزی وسیع کر دیتا ہے تو وہ زمین میں سرکشی اور ظلم کرنے لگ جاتے ہیں، لہٰذا جتنی مقدار وہ چاہتا ہے نازل کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں سے آگاہ اور بینا ہے۔

۲۸۔ اور وہ تو وہی ہے جو مفید بارش کو اس وقت نازل کرتا ہے جب وہ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں، اور اپنی رحمت کا دامن پھیلا دیتا ہے اور وہ ولی اور حمید ہے۔

۲۹۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی خلقت، اور ان کے اندر چلنے والی مخلوق

بھی کہ جسے اُس نے پھیلایا ہے اور جب بھی وہ چاہے انہیں اکٹھا کرنے پر قادر ہے۔

۳۰۔ جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوتی ہے وہ خود تمھارے اپنے ہی انجام دیئے ہوئے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے اور وہ بہت سے تو معاف کر دیتا ہے۔

۳۱۔ اور تم زمین میں خدا کی قدرت سے ہرگز فرار نہیں کر سکتے اور خدا کے علاوہ تمھارا کوئی بھی ولی اور مددگار نہیں ہے۔

شانِ نزول

مشہور صحابی خباب بن ارت کہتے ہیں کہ پہلی آیت " ولو بسط اللہ ..... " ہم لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری یہودی قبائل بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع کے فراواں مال پر نظر تھی اور ہماری آرزو تھی کہ اے کاش! ہمارے پاس بھی ایسا ہی مال ہوتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے ہمیں خبردار کر دیا کہ اگر خداوند عالم اپنے بندوں کی روزی فراواں کر دے تو وہ سرکشی پر اتر آئیں گے۔[1]

تفسیر "درمنثور" میں ایک اور حدیث بیان ہوئی ہے وہ یہ کہ یہ آیت اصحاب صفہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ ان کی آرزو تھی کہ ان کی دنیاوی زندگی بہتر ہو جائے۔[2]

(اصحاب صفہ کون لوگ تھے، انشاء اللہ اس بارے میں ان آیات کے آخر میں تفصیلی ذکر ہوگا)۔

تفسیر

سرکش ثروتمند

ان آیات کا گزشتہ آیات سے تعلق شاید اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ گزشتہ آیات میں سے آخری آیت میں آیا تھا کہ خدا مومنین کی دعا قبول فرماتا ہے، جس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہی صورت حال ہے تو پھر ان مومنین میں لوگ غریب

---

[1] تفسیر فخر رازی، تفسیر ابو الفتوح رازی اور تفسیر قرطبی (اسی آیت کے ذیل میں)۔

[2] تفسیر درمنثور میں اس روایت کو حاکم، بیہقی اور ابو نعیم سے نقل کیا گیا ہے (ج ۶ ص ۸)۔

کیوں ہیں اور وہ، جو دعا کرتے ہیں قبول کیوں نہیں ہوتی ؟

اس قسم کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے خداوند عالم فرماتا ہے : اگر خدا اپنے بندوں کی روزی وسیع کردے تو وہ زمین میں طغیان، سرکشی اور ظلم کرنے لگتے ہیں (ولو بسط الله الرزق لعباده لبغوا فی الارض)۔

"لہٰذا جتنی مقدار میں وہ چاہتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے، روزی نازل کرتا ہے" (ولکن ینزل بقدر ما یشاء)۔

گویا اس طرح سے روزی کی تقسیم کا مسئلہ باقاعدہ حساب وکتاب کے تحت ہے، جو خدا نے اپنے بندوں کے بارے میں مقرر کر دیا ہوا ہے "کیونکہ وہ اپنے بندوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان سے خوب واقف ہے" (انه بعباده خبیر بصیر)

وہ ہر شخص کی طرف کو اچھی طرح جانتا ہے اور اسی کی مصلحت کے پیش نظر اسے روزی عطا کرتا ہے، نہ اس قدر زیادہ دیتا ہے کہ سرکش ہو جائے اور نہ اس قدر کم دیتا ہے کہ فقر وفاقہ سے داد وفریاد کرنے لگے۔

اسی طرح کی دو اور آیتیں سورۂ علق میں بھی آئی ہیں :

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝

انسان اس وقت سرکشی کرتا ہے جب وہ خود کو بے نیاز اور غنی سمجھنے لگتا ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے اور انسان کے بارے میں مطالعہ بھی اس حقیقت کا سچا گواہ ہے کہ جب دنیا کسی کی طرف رُخ کرتی ہے، وہ خوشحال ہو جاتا ہے اور حالات اُس کی مرضی کے مطابق ہو جاتے ہیں تو پھر وہ خدا کا بندہ نہیں رہتا، بہت جلد خدا سے دور ہو جاتا ہے، دریائے شہوات میں غرق ہو جاتا ہے اور ایسی ایسی حرکتوں کا ارتکاب کرتا ہے جن کے ذکر سے شرم آتی ہے اور ہر ظلم وفساد روا سمجھنے لگتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس نے کہا ہے کہ "بغی" سے مراد یہاں پر ظلم وستم اور سرکشی نہیں بلکہ اس سے مراد طلب ہے یعنی اگر خدا اپنے بندوں کو وسیع روزی بھی دے دے پھر بھی وہ اس پر قانع نہیں ہوتے بلکہ اور مانگتے ہیں اور کبھی سیر ہونے میں نہیں آتے۔

لیکن پہلی تفسیر جسے بہت سے مفسرین نے انتخاب کیا ہے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ قرآن مجید کی کئی آیات میں "یبغون فی الارض" کا مفہوم زمین میں فساد اور ظلم لیا گیا ہے، جیسے سورۂ یونس آیت ۲۳ میں ہے :

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

نیز سورۂ شوریٰ ہی کی ۴۲ ویں آیت میں ہے :

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

یہ ٹھیک ہے کہ "بغی" "بمعنی" "طلب" بھی آیا ہے لیکن جب اس کا اطلاق "فی الارض" کے ساتھ ہو تو زمین میں فساد اور ظلم کے معنی میں ہوتا ہے۔

دو سوال : یہاں پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں،

پہلا سوال : اگر روزی کی تقسیم کا مسئلہ ایسا ہی ہے تو پھر ہم کچھ لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس بے انتہا دولت

ہوتی ہے اور وہ طغیان اور فساد برپا کرکے دنیا کو تباہ کر رہے ہیں اور خدا انہیں کچھ نہیں کہتا اور یہی حالت طاقتور استعماری حکومتوں کی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

اس سوال کے جواب کے لیے اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ کبھی رزق کی فراوانی امتحان اور آزمائش کا ذریعہ بھی ہوتی ہے کیونکہ اس دنیا میں ہر شخص کا امتحان ہوتا ہے اور امتحان کبھی دولت اور ثروت کے ذریعے بھی عمل میں آتا ہے۔

نیز کبھی اس لیے کہ دولت حاصل کرکے انسان خود بھی اور دوسرے لوگ بھی یہ جان لیں کہ دولت مندی خوش قسمتی کا موجب نہیں ہوا کرتی اور اس طرح سے ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اس وقت جو صورت حال ہے وہ یہ کہ ہم بہت سے ایسے معاشروں کو دیکھ رہے ہیں جو ہر طرح کی نعمت، ثروت اور خوشحالی کی زندگی میں غرق ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مختلف مصائب اور مشکلات سے بھی دوچار ہیں، بے چینی، قتل وغارت، انتہائی اخلاقی بے راہروی، اضطراب اور دوسری کئی مادی اور روحانی پریشانیوں نے انہیں گھیر رکھا ہے۔

علاوہ ازیں کبھی بے اندازہ مال و دولت خدا کا ایک طرح کا عذاب بھی ہوتا ہے جس میں خداوند عالم بعض لوگوں کو مبتلا کر دیتا ہے۔ دور سے تو ایسے لوگوں کی زندگی بڑی بھلی اور دل فریب ہوتی ہے لیکن اگر انہیں نزدیک سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے آپ ہی سے بیزار ہوتے ہیں۔ اس بارے میں کئی بادشاہوں کے قصے کہانیاں ہیں جنہیں بیان کرنے سے بات لمبی ہو جائے گی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا اس بات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جب انسان محروم، غریب اور فقیر ہی ہے تو پھر اسے وسعت رزق کے لیے ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ خدا کی مصلحت بھی اس کی غربت اور افلاس ہی میں ہو۔

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے بھی اس نکتے کی جانب توجہ کرنی چاہیے کہ بعض اوقات رزق کی تنگی انسان کی اپنی غفلت، سستی اور کاہلی کی وجہ سے ہوتی ہے، اس قسم کی محرومی اور رزق کی کمی خدا کے حتمی منشاء کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ انسان کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے جسے وہ دیکھ رہا ہوتا ہے اور اسلام نے سعی و کوشش کے اصولوں کے پیش نظر جو قرآن کی متعدد آیات، سنت رسولؐ اور سیرت آئمہ ھدیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام میں بیان ہوئے ہیں سب لوگوں کو تلاش اور جدوجہد کی دعوت دی ہے۔

لیکن جب انسان بے حد جدوجہد اور سعی و کوشش میں بھی ناکام ہو جاتا ہے اور اس پر رزق کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو پھر اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس امر میں ضرور کوئی مصلحت ہے۔ لہٰذا اسے کسی قسم کی بے چینی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے اور مایوس ہو کر کفر کے کلمے اپنی زبان پر جاری نہیں کرنے چاہئیں بلکہ اپنی کوشش کو جاری رکھتے ہوئے رضائے الٰہی پر راضی رہنا چاہیئے۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ "عبادہ" (اس کے بندے) کی تعبیر، رزق کی فراوانی کی صورت میں ان کے طغیان اور سرکشی کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی تعبیر ہر قسم کے نیک، بد اور متوسط قسم کے لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جیسے

قرآن میں ہے :

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ

کہہ دے لے میرے وہ بندو کہ جنہوں نے اپنے بارے میں اسراف کیا ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ (زمر۔ ۵۳)

یہ ٹھیک ہے کہ خدا تعالیٰ روزی کو حساب کے ساتھ نازل کرتا ہے تاکہ اس کے بندے سرکشی نہ کریں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ انہیں محروم کر دے اور روزی ان سے بالکل روک دے۔ لہٰذا بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے :

اور وہ تو وہ ہے جو مفید بارش، لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد نازل کرتا ہے اور اپنی رحمت کا دامن پھیلا دیتا ہے (وھوالذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا و ینشر رحمتہ)۔

ایسا ہونا بھی چاہیئے "کیونکہ وہ ایک ولی و سرپرست اور تعریف کے لائق ہے" (وھوالولی الحمید)۔

یہ آیت باوجودیکہ پروردگار عالم کی نعمتوں اور مہربانیوں کو بیان کر رہی ہے لیکن توحید کی نشانیوں کو بھی ظاہر کر رہی ہے، کیونکہ باران کا نزول ایک دقیق اور منظم نظام کے تحت عمل میں آتا ہے۔ سورج، سمندروں پر ضیا پاشی کرتا ہے، پانی کے لطیف ذرات کو نمکیات سے جدا کرتا ہے اور انہیں بادلوں کے ٹکڑوں کی صورت میں آسمان کی طرف بھیجتا ہے، جب فضا کا سرد بالائی حصہ انہیں آپس میں جوڑ کر ملا دیتا ہے تو پھر ہوائیں انہیں اپنے دوش پر سوار کر لیتی ہیں اور تشنہ اور خشک زمینوں کی فضا میں جا پہنچاتی ہیں جہاں پر وہ ہوا کے مخصوص دباؤ اور ٹھنڈک کی وجہ سے بارش کے چھوٹے چھوٹے قطروں میں تبدیل ہو کر آہستہ آہستہ زمین پر اترنے لگتے ہیں اور نقصان پہنچائے بغیر زمین کے اندر جذب ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم اس نظام کا بغور مطالعہ کریں تو اس میں ہمیں خدا کے علم و قدرت کی نشانیاں واضح طور پر نظر آئیں گی۔ وہ ایسا ولی اور حمید ہے جو اپنے بندوں کی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور انہیں اپنی رحمت میں شامل کر دیتا ہے۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ "غیث" کا معنی "مفید بارش" ہے ـــــ جیسا کہ بہت سے مفسرین اور بعض اہل لغت نے اس کی وضاحت کی ہے ـــــ اور "مطر" ہر مفید اور غیر مفید بارش کو کہا جاتا ہے۔

اسی لیے اس کے فوراً بعد "وینشر رحمتہ" (اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے) کا جملہ آیا ہے۔

کس قدر زیبا اور جامع تعبیر ہے؟ مردہ زمینوں کو زندہ کرنے میں، نباتات کے اگانے میں، فضا کو دھونے اور صاف کرنے میں، انسانوں اور دوسرے زندہ موجودات کے لیے پینے کا پانی مہیا کرنے میں غرض تمام صورتوں میں اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے اور اسے ہر چیز تک پہنچاتا ہے۔

اگر کوئی شخص اس قرآنی جملے کا صحیح معنوں میں مفہوم سمجھنا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ بارش ہو جانے کے بعد جب مطلع صاف ہو جاتا ہے پہاڑ، جنگل یا بیابان کی سیر کرے اور خدا کی رحمت کے نظارے کرے کہ کیونکر اس کی رحمت نے لطافت، زیبائی اور طراوت کی صورت میں کرشمہ سازی کی ہے ؟

"غیث" کے لفظ سے یہ معنی شاید اس لیے مراد لیا گیا ہے کیونکہ وہ "غوث" بمعنی فریاد رسی، کے ساتھ مشترک ہے، اسی لیے بعض مفسرین نے مندرجہ بالا تعبیر کو ہر قسم کی ناامیدیوں کے بعد خدا کی فریاد رسی اور اس کا دامن رحمت پھیلنے کی طرف اشارہ سمجھا ہے[1]

اور اسی مناسبت سے ایک بار پھر بعد کی آیت میں خداوند عالم کے علم و قدرت کی اہم ترین نشانیوں میں سے ایک نشانی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمان اور زمین کی تخلیق اور ان کے اندر چلنے والی مخلوق بھی کہ جسے اس نے پھیلایا ہے (ومن اٰیاتہ خلق السماوات والارض وما بث فیہما من دآبۃ)۔

یہ سب آسمان اس قدر عظمت کے ساتھ، اس قدر نظام ہائے شمسی اور کہکشانوں کے ساتھ، کروڑوں عظیم اور روشن ستاروں کے ساتھ اور ایسے نظام کے ساتھ کہ جس کے مطالعے سے انسان ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہے اور زمین اپنے مختلف حیاتیاتی منابع کے ساتھ، رنگارنگ اور مختلف النوع نباتات کے ساتھ، پھولوں اور پھلوں کے ساتھ، مختلف نعمتوں اور برکتوں کے ساتھ اور مختلف زیبائیوں کے ساتھ سب کے سب خدائے واحد کی آیات اور نشانیاں ہیں۔

یہ تو تھا ایک طرف، ادھر دوسری طرف زمین اور آسمان میں چلنے والی مخلوق، مختلف قسم کے پرندے، لاکھوں قسم کے حشرات اور کیڑے مکوڑے، وحشی اور پالتو جانوروں کی مختلف قسمیں رینگنے اور کاٹنے والے جانور، چھوٹی سے چھوٹی خوبصورت اور اسی طرح بڑی سے بڑی اور غول پیکر مچھلیاں اور پانی میں رہنے والی دوسری مخلوق اور پھر مذکورہ مخلوقات کے ڈھانچے اور طرز تخلیق محیر العقول اور حیرتناک ہے اور ان سب سے زیادہ اہم اور اصل چیز زندگی کی حقیقت اور اس پر حکم فرما وہ اسرار اور رموز ہیں کہ لاکھوں سائنس دان ہزار ہا سال کی تحقیق اور ریسرچ کے بعد بھی اس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکے، یہ سب کچھ خدا کی نشانیاں ہیں۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ "دابۃ" کے لفظ کا اطلاق اس زندہ چیز پر بھی ہوتا ہے جو خوردبین کے علاوہ دکھائی نہیں دیتی اور اس کی حرکت انتہائی ظریف اور مخفی ہوتی ہے اور ان غول پیکر حیوانات پر بھی ہوتا ہے جن کی لمبائی بیسیوں میٹر اور وزن بیسیوں ٹن ہوتا ہے۔ ہر ایک چیز کسی نہ کسی صورت میں تسبیح حق بیان کرتی ہے اور اس کی ثناخوانی میں مصروف ہے اور زبان حال کے ساتھ اس کے بے پایاں علم کی عظمت اور قدرت بیان کر رہی ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اور وہ ان کو جب چاہے، جمع کرنے پر قادر ہے (وھو علی جمعھم اذا یشاء قدیر)[2]

اس آیت میں تمام چلنے والی چیزوں کو جمع کرنے سے کیا مراد ہے؟ بہت سے مفسرین نے انہیں بروز قیامت حساب و

---

[1] راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ "غوث" مدد کرنے کے موقع پر بولا جاتا ہے اور "غیث" بارش کے لئے: الغوث یقال فی النصرۃ والغیث فی المطر۔

[2] صاحب کشاف کے بقول "اذا" کا کلمہ جس طرح فعل ماضی پر داخل ہوتا ہے اسی طرح فعل مضارع پر بھی داخل ہوتا ہے جیسے واللیل اذا یغشیٰ" لیکن "اذا" کے بعد کا فعل زیادہ تر ماضی کی صورت میں ہوتا ہے اور مضارع کی صورت میں بہت کم ہوتا ہے۔

کتاب اور اعمال کی جزا کے لیے جمع ہونے کے معنی میں لیا ہے اور جن آیات میں قیامت کو "یوم الجمع" کے نام سے یاد کیا گیا ہے، انہیں اس معنی پر شاہد کی صورت میں لایا جا سکتا ہے۔ (جیسے اسی سورۂ شوریٰ کی ساتویں اور سورۂ تغابن کی نویں آیت ہے)۔

لیکن اس صورت میں یہ سوال در پیش آتا ہے کہ آیا قیامت میں تمام چلنے والی چیزیں محشور ہوں گی حتیٰ کہ غیر انسانی مخلوق بھی؟ بلکہ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ "دابہ" (چلنے والی چیز) کا اطلاق ہی عام طور پر غیر انسانی مخلوق پر ہوتا ہے۔ تو ایسی صورت میں یہ مشکل پیش آ جاتی ہے کہ چلنے والی غیر انسانی مخلوق کا حشر و نشر اور حساب و کتاب کیسا جب کہ نہ ان کا عقل و شعور ہے اور نہ ہی ان کے ذمہ کسی فرض کی ادائیگی ہے؟

ہم اس سوال کا جواب سورۂ انعام کی ۳۸ ویں آیت کی تفسیر میں دے چکے ہیں آیت یوں ہے:

وما من دآبة فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیه الا امم امثالکم
ما فرطنا فی الکتاب من شیء ثم الی ربهم یحشرون

ہم بتا چکے ہیں کہ بہت سے حیوانات کی زندگی کا نظام جاذب نظر اور محیر العقول ہے اور کیا مانع ہے کہ یہ اعمال ان کے اندر موجود عقل و شعور کی کسی قسم کو بیان کر رہے ہوں؟ یہ کیا ضروری ہے کہ ہم ان سب اعمال کو جبلت کے زیر اثر قرار دیں تو ایسی صورت میں ان کے لیے ایک طرح کے حشر و نشر اور حساب و کتاب کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ (اس موضوع کی مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۳ میں سورۂ انعام کی ۳۸ ویں آیت کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں)۔

زیر تفسیر آیت میں یہ امکان بھی ہے کہ یہاں پر "جمع" کا لفظ "بث" کا نقطہ مقابل ہو۔ یعنی "بث" کا لفظ تمام زندہ اور چلنے والی مخلوق کی پیدائش اور توسیع کی طرف اشارہ ہو۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ جب بھی خدا چاہے گا انہیں "جمع" کر کے نیست و نابود کر دے گا۔

جیسا کہ تاریخی طور پر اب تک روئے زمین پر کئی قسم کی چلنے پھرنے والی چیزیں عجیب طریقے پر بڑھیں اور ساری زمین میں پھیل گئیں اور اس کے کچھ عرصے بعد جمع اور منقرض ہو گئیں۔ ان کی افزائش اور وسعت بھی خدا کے ہاتھ میں ہے اور ان کا جمع کرنا اور خاتمہ کرنا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ آیت درحقیقت ان آیات کے مشابہ ہے جن میں کہا گیا ہے کہ زندگی دینے والا بھی خدا ہے اور مارنے والا بھی وہی ہے۔

ایسی صورت میں اس آیت میں جانوروں کے لیے حساب و کتاب اور سزا اور جزا کا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔

ستاروں میں مخلوق رہتی ہے

اس آیت سے جو قابل غور نکتہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ آسمانوں میں بھی کئی قسم کی زندہ مخلوق رہتی ہے۔ اگرچہ اس بارے میں سائنس دانوں نے کوئی قطعی اور حتمی فیصلہ نہیں کیا بلکہ وہ صرف اسی حد تک دبے لفظوں میں کہتے ہیں کہ آسمانی ستاروں میں قوی اندازے کے مطابق بہت سے ستارے ایسے ہیں جن میں زندہ مخلوق رہتی ہے لیکن "وما بث فیهما من دآبة" (جو کہ آسمانوں اور زمین میں چلنے والی مخلوق پھیلا دی ہے) کا جملہ واضح طور پر اس حقیقت کو بیان کر رہا ہے کہ آسمانی وسعتوں میں بھی چلنے والی زندہ مخلوق کی فراوانی ہے۔

بعض مفسرین نے جو یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ "فیھما" صرف کرۂ زمین ہی میں منحصر ہے، بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ ضمیر تثنیہ کی ہے اور زمین و آسمان دونوں کی طرف لوٹ رہی ہے اسی طرح "دابۃ" کے لفظ کا فرشتوں پر اطلاق بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس لفظ کا اطلاق عام طور پر چلنے پھرنے والی مادی مخلوق پر ہوتا ہے اور قرآن مجید کی کئی اور آیات سے بھی یہی معنی معلوم ہوتا ہے۔

حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے منقول ہے :

هٰذه النجوم التی فی السمآء مدائن مثل المدائن التی فی الارض مربوطة کل مدینة الی عمود من نور

یہ ستارے جو آسمان میں ہیں ان میں بھی زمین کے شہروں کے مانند شہر ہیں ہر شہر دوسرے شہر سے (ہر ستارہ دوسرے ستارے سے) نور کے ستون کے ذریعے ملا ہوا ہے[1]

اس بارے میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں (مزید تفصیلات کے لیے کتاب "الھیئة والاسلام" کا مطالعہ فرمائیں)

گزشتہ آیات میں رحمت خدا کی بات ہو رہی تھی اور اس سے فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن مصائب میں ہم گھرے ہوئے ہیں یہ کہاں سے آتے ہیں ؟

تو بعد کی آیت اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے : جو مصائب اور ناخوشگوار واقعات تمہیں پیش آتے ہیں وہ ان اعمال کی وجہ سے ہوتے ہیں جن کو تم نے خود انجام دیا ہے (وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم)۔

نیز یہ بات بھی یاد رکھو کہ یہ تمہارے غلط اعمال کی مکمل سزا نہیں ہے کیونکہ "وہ تمہارے بہت سے کاموں کو بخش دیتا ہے" (ویعفوا عن کثیر)۔

مصائب کیوں نازل ہوتے ہیں ؟

اس آیت میں چند ایک قابل غور نکتے موجود ہیں :

۱۔ یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ جو مصائب انسان پر نازل ہوتے ہیں وہ خداوند عالم کی ایک قسم کی سزا ہے جو انسان کو خبردار کرنے کے لیے ہوتی ہے (مگر بعض استثنائی مقامات ہیں کہ جن کی طرف بعد میں اشارہ ہو گا) اس طرح دردناک حوادث اور زندگی کی مشکلات کا ایک فلسفہ تو واضح ہو جاتا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

خیر اٰیة فی کتاب الله هٰذه الاٰیة ! یا علی ! ما من خدش عود، ولا نکبة

---

[1] سفینۃ البحار مادہ نجم جلد ۲ ص ۵۷۴ (منقول از تفسیر علی بن ابراہیم)۔

قدم الا بذنب و ما عفی اللہ عنہ فی الدنیا فھو اکرم من ان یعود فیہ و ما عاقب علیہ فی الدنیا فھو اعدل من ان یثنی علی عبدہ

یہ آیت (وما اصابکم من مصیبۃ ....) قرآن کی بہترین آیات میں سے ہے۔ یا علی! انسان کے جسم پر اگر لکڑی کی بھی خراش واقع ہوتی ہے یا قدم سے کوئی لغزش سرزد ہوتی ہے تو یہ ان گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہے جن کا انسان ارتکاب کرتا ہے۔ اور جو گناہ خدا دنیا میں معاف کر دیتا ہے (قیامت کے دن) ان پر پھر نظر کرنا اس کی شان کے خلاف ہے، اور دنیا میں جن گناہوں کی سزا دے دیتا ہے آخرت میں ان کی سزا دینا اس کے عدل کے منافی ہے[1]

گویا اس قسم کے مصائب ایک تو انسان کے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور دوسرے اسے مستقبل کے لیے کنٹرول بھی کر لیتے ہیں۔

۲۔ اگرچہ آیت ظاہری طور پر عمومیت کی حامل ہے اور اس میں تمام مصائب آجاتے ہیں لیکن معمول کے مطابق، عموم میں استثناء ہوتا ہے۔ جیسے وہ مصائب اور مشکلات جو ائمہ یا انبیاء علیہم السلام کو پیش آتے رہے ہیں۔ وہ یا تو ان کے مقامات کی بلندی کے لئے تھے یا پھر ان کی آزمائش کے لیے۔ اسی طرح بعض مصائب جو غیر معصوم پر نازل ہوتے ہیں ان میں بھی آزمائش کا پہلو ہوتا ہے۔

یا پھر کچھ مصائب ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی اپنی غور نہ کرنے، بے ربطی اور کسی سے مشورہ لئے بغیر کام کرنے یا سہل انگاری سے کام لینے کی وجہ سے لاحق ہوتے ہیں درحقیقت ایسے مصائب انسان کے اپنے اعمال کا تکوینی نتیجہ ہوتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں قرآن کی مختلف آیات اور اسلامی روایات کو جب ایک جگہ اکٹھا کیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ اس آیت کا عمومی حکم کچھ صورتوں میں تخصیص پیدا کرے گا اور یہ کوئی ایسی نئی بات نہیں ہے۔ لہٰذا بعض مفسرین نے جو اس پر اعتراض کیا اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ سخت مصائب اور مشکلات کے کئی فلسفے ہیں جن کی طرف توحید اور عدل کے مباحث میں اشارہ ہو چکا ہے، مثلاً مصیبتوں کے سائے میں استعداد اور لیاقتوں کا اجاگر ہونا، مستقبل کے بارے میں تنبیہ، خدا کی آزمائش، غرور اور غفلت سے بیداری اور گناہوں کا کفارہ وغیرہ۔

البتہ چونکہ ان میں سے اکثر کا تعلق سزا اور کفارے سے ہوتا ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت نے اسے عمومی صورت میں پیش کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ روایت میں ہے کہ جب حضرت امام زین العابدین علیہ السلام یزید ملعون کے دربار میں پہنچے تو اس نے امام کی طرف منہ کرکے کہا:

یا علی! ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص ۳۱۔ (اسی آیت کے ذیل میں) اس سے ملتی جلتی حدیث در منثور اور روح المعانی میں بھی آیات زیر بحث کے ذیل میں کچھ فرق کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اس بارے میں احادیث بھی بہت ملتی ہیں۔

اس کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ حادثات کربلا خود تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہیں۔
توامام زین العابدین علیہ السلام نے فوراً اس کا ان لفظوں میں جواب دیا :

کلّا ما ھذہ فینا نزلت، انما انزل فینا" ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الّا فی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذالك علی الله یسیر، لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم" فنحن الذین لا نأسی علی ما فاتنا من امر الدنیا، ولا تفرح بما اوتینا[1]

ایسی بات نہیں ہے، یہ آیت ہمارے بارے میں نازل نہیں ہوئی، بلکہ ہمارے بارے میں ایک اور آیت اتری ہے جس میں کہا گیا ہے "جو مصیبت بھی زمین یا تمہارے جسم وجان پر نازل ہوتی ہے، تمہاری تخلیق سے پہلے کتاب (لوح محفوظ) میں درج تھی اور اس بات کا علم خدا کے لیے آسان ہے اور یہ صرف اس لیے ہے کہ جو چیز تمہارے ہاتھوں سے چلی جائے اس پر غمگین نہ ہو اور جو کچھ تمہارے پاس موجود ہے اس پر زیادہ خوشی نہ مناؤ۔ (ان مصیبتوں کا مقصد یہ ہے کہ چند روزہ دنیاوی زندگی کے ساتھ دل نہ لگا اور یہ ایک طرح سے تمہاری تربیت اور آزمائش ہے)۔

پھر امامؑ نے فرمایا :

ہم جو کچھ دے چکے ہیں اس پر ہرگز غمگین نہیں ہیں اور جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے اس پر خوش نہیں ہیں۔ (ہم سب چیزوں کو عارضی اور چند روزہ سمجھتے ہیں اور صرف خدا کے لطف وعنایت کے منتظر ہیں)۔

ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں کہ جس کے مطابق جب امامؑ سے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو آپؑ نے فرمایا :

"تم جانتے ہو کہ علی اور ان کے اہلبیت مصیبتوں میں گرفتار ہوتے آیا یہ ان کے اعمال کی وجہ سے تھا ؟ حالانکہ وہ سب اہل بیت طہارت ہیں اور ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہیں! پھر فرمایا :

ان رسول الله کان یتوب الی الله ویستغفر فی کل یوم ولیلة مأة مرة من غیر ذنب۔

ان الله یخص اولیائه بالمصائب لیأجرھم علیھا من غیر ذنب

رسول اللہ ہمیشہ توبہ کیا کرتے تھے اور ہر دن رات میں سو مرتبہ استغفار کیا کرتے تھے، حالانکہ کسی قسم کا گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا تھا۔ خدا نے اپنے دوستوں کے لیے کچھ مصائب مقرر کئے

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم، مطابق نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۵۸۰۔

ہیں تاکہ ان پر صبر کرکے وہ اس کا ثواب پائیں، حالانکہ ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا[1]

۳۔ کچھ لوگوں کو اس بات میں تردد ہے کہ مذکورہ آیت میں مصائب سے مراد دنیاوی مصیبتیں ہیں کیونکہ دنیا عمل کا گھر ہے نہ کہ سزا یا جزا کا گھر۔

لیکن یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے بہت سی آیات اور روایات شاہد ہیں کہ بعض اوقات انسان اسی دنیا میں اپنے کیے کا نتیجہ سزا یا جزا کی صورت میں دیکھ لیتا ہے۔ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا سزا یا جزا کا گھر نہیں ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے تمام اعمال کی سزا یا جزا یہاں نہیں ملتی۔ نہ یہ کہ اسے ہرگز سزا یا جزا نہیں ملتی اور آیات وروایات سے باخبر لوگوں کی نگاہ میں اس حقیقت کا انکار ایسے ہی ہے جیسے کسی ظاہر چیز کا انکار ہوتا ہے۔

۴۔ کبھی مصائب، مجموعی حیثیت کے ہوتے ہیں جو کئی لوگوں کے مجموعی گناہوں کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں جیسا کہ سورۂ روم کی ۴۱ ویں آیت میں ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

لوگوں کے اعمال کی وجہ سے خشکی اور سمندروں میں خرابی پیدا ہوگئی تاکہ خدا انہیں ان کے کچھ ایسے اعمال کے انجام کا مزہ چکھائے جو انھوں نے انجام دیئے ہیں تاکہ وہ ان سے باز آجائیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہ بات انسانی معاشروں سے متعلق ہے کہ جن کے افراد مل کر گناہوں کا ارتکاب کرکے مشکلات اور مصائب میں پھنس جاتے ہیں۔

سورۂ رعد کی ۱۱ ویں آیت میں ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ

اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو نہیں بدلتی۔

اس قسم کی آیات اس بات کی شاہد ہیں کہ انسانی اعمال اور کائنات کے تکوینی نظام زندگی کا ایک گہرا اور نزدیکی رابطہ ہے کہ اگر وہ فطری اصولوں اور تخلیقی قوانین کے مطابق چلیں گے تو خدا کی برکتیں ان کے شامل حال ہوں گی اور اگر بے راہروی اختیار کریں گے تو ان کی زندگی میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مذکورہ صورت انسانوں میں سے ہر ایک فرد پر صادق آجاتی ہے اور جو بھی شخص کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں اس کا اپنا جسم وجان یا مال ومتعلقات کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں جیسا کہ زیر تفسیر آیت میں مذکور ہے[2]

---

[1] اصول کافی، منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۵۸۱۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۸ ص ۶۱۔

بہر حال ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس بات کا تصور کریں کہ وہ خدا کے اس حتمی قانون اور ناقابل اجتناب طریقہ کار سے راہ فرار اختیار کر سکتے ہیں لہٰذا اس سلسلے کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے تم زمین میں خدا کی قدرت سے ہرگز فرار نہیں کر سکتے (وما انتم بمعجزین فی الارض)[1]

تم کس طرح اس کی قدرت اور حکومت کے دائرہ اختیار سے فرار کر سکتے ہو جبکہ تمام کائنات ارض وسماوی پر بلا شرکت غیرے اسی کی حکومت ہے۔

اگر تم یہ باور کرتے ہو کہ اس بارے میں کوئی امداد کو آپہنچے گا تو یاد رکھو "خدا کے علاوہ نہ تو کوئی تمہارا ولی ہے اور نہ ہی مددگار (ومالکم من دون اللّٰہ من ولی ولا نصیر)۔

ممکن ہے "ولی" اور "نصیر" کے درمیان فرق اس لحاظ سے ہو کہ "ولی" وہ سرپرست ہوتا ہے جو فائدہ چاہتا ہے اور "نصیر" وہ مددگار ہوتا ہے جو نقصان دور کرتا ہے یا یہ فرق اس لحاظ سے ہو کہ "ولی" اس شخص کو کہتے ہیں جو مستقل صورت میں کسی کا دفاع کرے اور "نصیر" وہ ہوتا ہے جو خود شانہ بشانہ رہ کر مدد کرتا ہے۔

درحقیقت آخری آیت انسان کی کمزوری اور ناتوانی کو مجسم کرتی ہے جب کہ اس سے پہلی آیت خدا کی عدالت اور رحمت کو[2]

چند اہم نکات

۱۔ **تمہاری مصیبتیں خود تمہاری ہی پیدا کردہ ہیں:** بہت سے لوگ گمان کرتے ہیں کہ انسانی اعمال کا خدا کی سزا اور جزا کے ساتھ رابطہ اس کے مقرر کردہ قوانین سے ایسے ہی ہے جیسے دنیاوی قوانین اور جرم کا باہمی رابطہ ہوتا ہے، حالانکہ ہم بار ہا بتا چکے ہیں کہ انسانی جرم اور خدائی قانون کا باہمی رابطہ تشریعی اور مقرر کردہ سزاؤں کی نسبت تکوینی بنیادوں سے زیادہ مشابہ ہے۔ بالفاظ دیگر گناہوں کی سزا بیشتر انسان کے اعمال کا طبعی اور تکوینی نتیجہ ہے کہ جو انسان کو بھگتنا پڑے گا اور مندرجہ بالا آیات اس بات کی واضح گواہ ہیں۔

اسی سلسلے میں احادیث اسلامی کی کتابوں میں بہت سی روایات ذکر ہوئی ہیں جن میں سے چند ایک کو ہم گفتگو کی تکمیل کے لیے بیان کرتے ہیں:

(۱) نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۷۸ میں ہے کہ امیرالمومنینؑ نے فرمایا:

ماکان قوم قط فی غض نعمة من عیش، فزال عنهم، الا بذنوب اجترحوها،

---

[1] "معجزین" کا کلمہ "اعجاز" کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے کسی کو عاجز کر دینا لیکن یہی کلمہ قرآن کی بہت سی آیات میں قدرت الٰہی اور اس کے عذاب سے فرار کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے جو اصل معنی کا لازمہ ہے۔

[2] تفسیر فی ظلال القرآن ج ۷، ص ۲۹۰۔

لان اللہ لیس بظلام للعبید، ولو ان الناس حین تنزل بھم النقم، وتزول عنھم النعم، فزعوا الی ربھم بصدق من نیاتھم، وولہ فی قلوبھم، لرد علیھم کل شارد، واصلح لھم کل فاسد

کوئی بھی قوم ناز و نعمت کی آغوش سے اسی وقت جدا ہوئی ہے کہ اس نے گناہوں کا ارتکاب کیا۔ کیونکہ خدا اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا، اگر لوگ بلاؤں کے نزول اور نعمتوں کے چھن جانے کے موقع پر سچی نیت کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں اپنی عاجزی کا اظہار کریں اور خدا کی محبت سے والہ و شیفتہ دل کے ساتھ ان کی تلافی کی دعا کریں، تو یقیناً خدا ان کی ضائع شدہ چیزوں کو پلٹا دے اور ان کے ہر قسم کے بگاڑ کی اصلاح فرما دے۔

(۲) جامع الاخبار میں امیر المؤمنین علیہ السلام سے ایک اور حدیث بھی منقول ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں :

ان البلاء للظالم ادب، وللمؤمن امتحان، وللانبیاء درجة وللاولیاء کرامة

بلائیں، ظالموں کے لیے تادیب ہوتی ہیں، مومنوں کے لیے امتحان، انبیاء کے لیے درجات اور اولیاء کے لیے مقام و مرتبہ اور بزرگی ہوتی ہیں۔[1]

یہ حدیث ہمارے بیان کردہ اس استثناء کی شاہد ہے جو آیت مذکورہ کے بارے میں ہے۔

(۳) کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک اور حدیث یوں مروی ہے :

ان العبد اذا کثرت ذنوبہ، ولم یکن عندہ من العمل ما یکفرھا، ابتلاہ بالحزن لیکفرھا

جب انسان کے گناہ زیادہ ہو جاتے ہیں اور عمل بھی اتنی مقدار میں نہیں ہوتے جو ان گناہوں کا کفارہ بن سکیں تو خدا اسے رنج و غم میں مبتلا کر دیتا ہے جس سے اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔[2]

(۴) کتاب کافی میں اس موضوع پر مستقل اور مکمل باب قائم کیا گیا ہے جس میں بارہ حدیثیں درج کی گئی ہیں۔[3]

پھر یہ کہ یہ گناہ ان گناہوں کے علاوہ ہیں جو مذکورہ صریح آیت کے مطابق خداوند کریم کی عفو و رحمت کی وجہ سے معاف کر دیئے جائیں گے اور وہ بھی اپنے مقام پر بہت سے ہیں۔

۲۔ **ایک زبردست غلط فہمی کا ازالہ :** ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس قرآنی حقیقت سے غلط نتیجہ نکالتے ہوئے،

---

[1] بحار الانوار جلد ۸۱ صفحہ ۱۹۸۔

[2] کافی جلد دوم کتاب الایمان والکفر باب تعجیل عقوبة الذنب حدیث ۲۔

[3] ایضاً۔

جو مصیبت بھی ان پر آن پڑے اسے قبول کرلیں اور کہیں کہ ہر تکلیف مصیبت اور ناخوش گوار واقعے کے سامنے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں اور یوں وہ قرآن کے ایک سبق آموز اور متحرک اصول کا الٹا نتیجہ نکالیں، یہ بہت ہی خطرناک بات ہوگی۔

قرآن مجید یہ کبھی نہیں کہتا کہ مصیبتوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے جائیں، مشکلات کو دور کرنے کے لیے کسی قسم کی کوشش نہ کی جائے اور اپنے آپ کو ظلم وستم اور بیماریوں کے حوالے کر دیا جائے بلکہ وہ تو کہتا ہے کہ اگر سعی و کوشش اور تلاش بسیار کے بعد بھی مصیبتیں تم پر غالب ہیں تو تمہیں جان لینا چاہیئے کہ تم سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہوگیا ہے جس کا نتیجہ اور کفارہ اب بھی تمہارا دامن نہیں چھوڑ رہا، لہٰذا اپنے گزشتہ اعمال پر نظر کرو، اپنے کیے کی معافی مانگو، اپنی اصلاح کرو اور خامیوں کی تلافی کرو۔

یہ جو بعض روایات میں اس آیت کو بہترین قرآنی آیت قرار دیا گیا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس میں اہم تربیتی آثار پائے جاتے ہیں، یہ آیت انسان کا بوجھ ہلکا کرتی ہے، قلب و روح میں عشق پروردگار کی جوت جگاتی ہے اور چراغ اُمید کو روشن کرتی ہے۔

۳۔ "اصحاب صفہ" کون لوگ ہیں؟ جو لوگ آج کل مسجد نبوی کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ جاتے ہیں تو مسجد کے پاس اور قبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک ایک جگہ دیکھتے ہیں جو زمین سے قدرے بلند ہے اور اس کے اطراف کو ایک مختصر اور معمولی سی دیوار کے ذریعے باقی مسجد سے زیبا اور دلپذیر صورت میں جدا کیا گیا اور بہت سے لوگ نماز اور تلاوت کلام پاک کے لیے اس جگہ کا انتخاب کرتے ہیں۔

یہ جگہ اس "صفہ" اور چبوترے کی یادگار کے طور پر ہے جس پر پیغمبر اسلام کے حکم سے چھپر ڈال کر مدینے سے باہر سے آنے والے ان لوگوں کے لیے تیار کیا گیا تھا جو اسلام قبول کرتے تھے لیکن ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا تھا۔[1]

اس کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے جس ایسے شخص نے اسلام قبول کیا کہ مدینہ میں جس کی کوئی رہائش گاہ نہیں تھی یمامہ کا رہنے والا ایک جوان تھا جس کا نام جویبر تھا کہ جس کی شادی کی داستان کو تاریخ اسلام میں شہرت حاصل ہے اور اس کی شادی دلفا نامی خاتون سے ہوئی اور شادی طبقاتی نظام پر ایک اچھی ضرب تھی۔

چونکہ جویبر کے لیے رہائش کی کوئی جگہ نہیں تھی لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں رات کو مسجد میں سونے کی اجازت دے دی، لیکن جوں جوں اسلام قبول کرنے والے بے گھر افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ سب کے سب مسجد میں اپنا ڈیرہ بسیرا کرنے لگے تو مسجد کے انتظامی امور میں پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں لہٰذا انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مسجد سے باہر جا کر رہیں تاکہ مسجد ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ رہے اور ساتھ ہی آنحضرتؐ کا یہ حکم بھی ہوا کہ اصحاب کے گھروں کے جو دروازے مسجد کی طرف تھے ان سب کو بند کر دیا جائے سوائے علی و فاطمہ علیہما السلام کے دروازہ کے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اسی موقع پر رسول گرامیؐ نے حکم دیا کہ ایک جگہ پر کھجور کی لکڑیوں کا چھپر ڈال دیا جائے تاکہ باہر سے آنے والے اور فقیر مسلمان وہاں رہا کریں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذاتی طور پر ان کی دیکھ بھال فرماتے تھے۔ روٹی، کھجور اور دوسری اشیاء

---

[1] "صفہ" بروزن "غصہ" لغت میں گرمیوں کے اس حجرے کو کہتے ہیں جس پر کھجور کی لکڑیوں کی چھت ڈالی جائے۔

خورونی انہیں عطا فرمایا کرتے تھے۔ دوسرے مسلمان بھی ان کا خیال رکھا کرتے تھے اور زکوٰۃ و صدقات وغیرہ سے ان کی اعانت کیا کرتے تھے۔

وہ بھی ہر اسلامی جنگ میں شرکت کیا کرتے تھے اور پورے خلوص کے ساتھ جہاد کیا کرتے تھے۔ قرآن مجید کی کچھ آیات بھی ان کی فضیلت، پاکدامنی، صفائے قلبی اور تقدس کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ بہرحال اس "صفہ" میں ان کے رہنے کی وجہ سے انہیں "اصحاب صفہ" کہا جانے لگا۔

۳۲- وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝

۳۳- اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝

۳۴- اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ۝

۳۵- وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ۝

۳۶- فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۲- اس کی نشانیوں میں سے وہ کشتیاں ہیں جو پہاڑوں کی طرح سمندر میں رواں دواں ہیں۔

۳۳- اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے اور یوں وہ کشتیاں پشت سمندر پر رکی رہیں، اس میں ہر صبر اور شکر کرنے والے کے لیے نشانیاں ہیں۔

۳۴- یا اگر وہ چاہے تو ان میں سوار افراد کے انجام شدہ اعمال کی وجہ سے انہیں تباہ کر دے جبکہ وہ بہت سے لوگوں کو معاف کر دیتا ہے۔

۳۵- تاکہ جو لوگ ہماری آیات کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں وہ یہ بات جان لیں کہ ان کی کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔

۳۶- جو چیز تمھیں عطا کی گئی ہے وہ دنیاوی زندگی کا ناپائیدار مال ومتاع ہے اور جو کچھ پروردگار کے پاس

ہے وہ ایمانداروں اور اپنے رب پر بھروسہ کرنے والوں کے لئے زیادہ بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔

تفسیر

ہواؤں اور کشتیوں کی روانی ۔ خدا کی نشانی

قرآن مجید نے ان آیات میں ایک بار پھر پروردگار عالم کی نشانیوں اور توحید کے دلائل کو بیان کیا ہے، اور اس سلسلے کی گزشتہ گفتگو کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

یہاں پر ان چیزوں کو بیان کیا جا رہا ہے جن سے انسان کو اپنی مادی زندگی میں ہر روز سروکار رہتا ہے۔ خاص کر جو لوگ ساحل پر رہتے ہیں یا دریائی سفر اختیار کرتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے: خدا کی آیات اور نشانیوں میں سے وہ کشتیاں ہیں جو پہاڑوں کی طرح سطح سمندر پر رواں دواں ہیں (ومن ایاتہ الجوار فی البحر کالاعلام)۔

"جوار"، "جاریۃ" کی جمع ہے، جو "سفن" یعنی "سفینۃ" بمعنی کشتی کی جمع کی صفت ہے کہ جو عبارت کے اختصار کے پیش نظر حذف ہے۔ اور چونکہ آیت کشتیوں کی حرکت کو خاص طور پر بیان کر رہی ہے لہٰذا اسی صفت کو بطور خاص موضوع سخن بنایا گیا ہے۔

یہ جو لغت عرب میں جوان لڑکیوں کو "جاریۃ" کہا جاتا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کے وجود میں نشاط جوانی جاری ہوتا ہے۔

"اعلام" "علم" (بروزن قلم) کی جمع ہے، جس کا معنی "پہاڑ" ہے، لیکن اصولی طور پر علم کا معنی ایسی علامت اور نشان ہوتا ہے جو کسی چیز کی خبر دیتا ہے جیسے "علم الطریق" (نشان راہ) اور "علم الجیش" (لشکر کا نشان) وغیرہ اور اگر پہاڑ کو "علم" کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ دور سے نمایاں ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کی چوٹی پر آگ جلائی جاتی تھی تاکہ مسافروں کے لیے کوئی نشانی موجود ہو۔ لیکن آگ کے ہونے یا نہ ہونے کا اس کی وجہ تسمیہ میں کوئی کردار نہیں ہے۔

اس طرح سے قرآن مجید نے متعدد دوسری آیات کے مانند اس آیت میں بھی منظم ہواؤں کی وجہ سے سطح سمندر پر کوہ پیکر کشتیوں کی حرکت کو خدا کی نشانیوں میں شمار کیا ہے۔

اگر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہواؤں کی وجہ سے سطح آب پر حرکت کریں تو کوئی اہم بات نہیں ہے، اہم بات تو یہ ہے کہ کوہ پیکر بحری جہاز ہوا کی لطیف لہروں کے ذریعے بڑی تعداد میں مسافروں اور سامان کے ساتھ ہزاروں میل کا سمندری سفر کریں اور منزل مقصود تک جا پہنچیں۔

سچ مچ کس ذات نے ان گہرے اور عمیق سمندروں کو اس خصوصیت کا حامل بنا کر پیدا کیا ہے؟ کس ذات نے لکڑی اور کشتی کے دوسرے مواد کو اس مخصوص انداز میں پیدا کیا ہے کہ اس سے کشتیاں بنا کر انہیں پانی کی سطح پر چلایا جاتا ہے؟ کس ذات نے

ہواؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ پانی اور سمندروں کی سطح پر ایسی منظم صورت میں چلیں کہ جس شخص کا جیسے جی چاہے ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک پہنچنے کے لیے اس سے استفادہ کرے ؟

نظم و انضباط ہر جگہ عقل و دانش کی علامت ہے اور یہاں پر بھی یہی صورت حال ہے ۔

اصولی طور پر اگر ان نقشوں کو غور سے دیکھا جائے جو سمندری سفر کرنے والے لوگوں کے پاس ہوتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ ہواؤں کے چلنے کے انداز کس قدر منظم اور باقاعدہ حساب و کتاب کے مطابق ہیں۔ ان نقشوں میں ہواؤں کے چلنے کے بارے میں جو معلومات درج ہوتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہ راستے قطب شمالی اور قطب جنوبی سے خط استواء اور خط استواء سے قطب شمالی اور قطب جنوبی کی طرف، اسی طرح ساحل اور خشکی سے سمندروں کی طرف اور سمندروں سے خشکی کی جانب ہوتے ہیں، جنہیں دیکھ اور سمجھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔

البتہ موجودہ دور میں کشتیوں اور بحری جہازوں کو چلانے کے لیے زبردست طاقتور انجنوں سے کام لیا جاتا ہے جو جہازوں کے پروں کو متحرک کرتے اور انہیں چلاتے ہیں لیکن پھر بھی ان جہازوں کے چلانے میں ہواؤں کا بڑا عمل دخل ہے ۔

مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے : اگر خدا چاہے تو ہواؤں کو روک دے اور کشتیاں سطح سمندر پر ٹھہر جائیں (ان یشأ یسکن الریح فیظللن رواکد علیٰ ظھرہ) ۔

آیت کے آخر میں نتیجے کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے : اس میں ہر اس شخص کے لیے نشانیاں ہیں جو صبر اور شکر کرتا ہے (ان فی ذالک لاٰیات لکل صبار شکور) ۔

یقیناً ہواؤں کی اس حرکت، کشتیوں کے چلنے، سمندروں کی تخلیق اور ان امور میں حکم فرما نظام اور ہم آہنگی میں خدا کی پاک ذات کے لیے گوناگون نشانیاں ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہواؤں کی حرکت پہلے مرحلے میں، روئے زمین پر دو نقاط کے درجہ حرارت کے اختلاف کی وجہ سے عمل میں آتی ہے۔ کیونکہ حرارت کی وجہ سے ہوا پھیلتی ہے۔ پھر وہ اوپر کی طرف اٹھتی ہے جس کی وجہ سے ایک تو اطراف کی ہوا میں دباؤ پیدا ہو جاتا ہے کہ جو اسے متحرک کرتا ہے اور دوسرے جب وہ اوپر کو اٹھتی ہے تو اپنی جگہ اطراف کی ہوا کو دے دیتی ہے، لہٰذا اگر خداوند عالم صرف پھیلاؤ کی اس خاصیت کو سلب کرے تو فضا پر ٹھہراؤ اور سکوت حکم فرما ہو جاتے اور بادبانوں سے جانے والی کشتیاں بے حس و حرکت سطح سمندر پر کھڑی رہ جائیں۔

"صبار" اور "شکور" دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں ایک میں زیادہ صبر اور دوسرے میں زیادہ شکر کا معنی پایا جاتا ہے۔

زیر تفسیر آیت اور قرآن کی دوسری آیات میں[1] ان دونوں صیغوں کا استعمال چند لطیف نکات کی طرف راہنمائی کرتا ہے :

۱۔ یہ دو اوصاف مجموعی صورت میں حقیقت ایمان کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ کیونکہ مومن مشکلات اور مصائب میں صبور

---

[1] سورۂ ابراہیم آیت ۵، سورۂ لقمان آیت ۳۱ و سورۂ سبا آیت ۱۹ اور آیت زیر بحث ۔

ہوتا ہے اور نعمتوں پر شکور۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

الایمان نصفان : نصف صبر و نصف شکر

ایمان کے دو حصے ہیں، ایک صبر ہے اور دوسرا شکر[1]

علاوہ ازیں تخلیق کائنات کے نظام کے اسرار میں مطالعہ اور غور و فکر کے لیے جہاں صبر اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں پر یہ منعم حقیقی کے شکر کا موجب بھی ہوتا ہے۔

جب یہ دونوں صفات مل جاتی ہیں تو انسان کو ان آیات کے مطالعے کے لیے آمادہ کرتی ہیں بلکہ اصولی طور پر تو اسرار آفرینش کا مطالعہ بذات خود شکر کی ایک قسم ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جب انسان کشتی پر سوار ہوتا ہے تو اس میں یہ دونوں صفتیں دیگر اوقات کی نسبت زیادہ نمایاں ہوتی ہیں صبر، سمندر کی مشکلات اور حادثات کے موقع پر اور شکر، ساحل مقصود پر پہنچ جانے کے موقع پر۔

بعد کی آیت میں اس نعمت الٰہی کی عظمت کو ایک بار پھر اجاگر کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے :

یا اگر اللہ چاہے تو ان کشتیوں میں سوار افراد کے انجام شدہ اعمال کی وجہ سے انہیں تباہ و برباد کر دے (او یوبقھن بما کسبوا)۔

جیسا کہ ہم گذشتہ آیات میں بھی پڑھ چکے ہیں کہ جو مصیبتیں انسان پر نازل ہوتی ہیں عام طور پر اس کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بھی لطف خداوندی انسان کے شامل حال ہوتا ہے" اور وہ بہت سے لوگوں کو معاف کر دیتا ہے" (و یعف عن کثیر)۔

اگر وہ معاف نہ کرے تو اس کے خاص و پاک بندوں اور معصومین کے علاوہ کوئی بھی شخص اس کی سزا سے نہ بچ سکے، جیسا کہ سورۂ فاطر کی آیت ۴۵ میں ہے :

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى

اگر خدا لوگوں کو ان کے کئے کی سزا دینا شروع کر دے تو زمین پر کوئی بھی چلنے والی چیز باقی نہ رہے لیکن (اپنی مہربانی کی وجہ سے) وہ انہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دیتا ہے۔

جی ہاں ! اگر وہ چاہے تو ہواؤں کو چلنے سے روک دے جس کی وجہ سے کشتیاں سمندروں کے بیچ میں رکی رہیں اور اگر چاہے تو ہواؤں کو زبردست طوفانوں میں تبدیل کر دے جن کی وجہ سے کوہ پیکر جہاز ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں اور سمندر کی موجوں میں تنکوں کے مانند اڑتے پھریں، لیکن اس کا لطف و کرم ان چیزوں سے مانع ہے۔

---

[1] تفسیر صافی، تفسیر مجمع البیان، تفسیر فخر رازی اور تفسیر قرطبی، سورۂ لقمان کی آیت ۳۱ کے ذیل میں۔

"تاکہ جو لوگ ہماری آیات کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں اور مخالفت اور انکار پر کمربستہ ہو جاتے ہیں وہ جان لیں کہ (ذات خدا کے علاوہ) ان کی کوئی بھی پناہ گاہ نہیں ہے" (و یعلم الذین یجادلون فی اٰیاتنا مالھم من محیص)[1]

کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو عفو الٰہی کے مستحق نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر مخالفت پر کمربستہ ہو چکے ہیں اور دشمنی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی ستیزہ کاری جاری رکھے ہوئے ہیں، لہٰذا وہ خدا کے عفو و رحمت کے فیضان سے محروم ہیں اور عذاب کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔

"محیص" "حیص" (بروزن "حیف") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے، بازگشت، لوٹ آنا اور کسی چیز سے کنارہ کشی اختیار کر لینا اور چونکہ "محیص" کا لفظ اسم مکان ہے لہٰذا فرار کی جگہ یا پناہ گاہ کے معنی میں آتا ہے۔[2]

اس سلسلے کی آخری آیت میں روئے سخن تمام لوگوں کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

جو کچھ تمہیں عطا کیا گیا ہے وہ دنیاوی زندگی کا ناپائیدار مال و متاع ہے (فما اوتیتم من شیء فمتاع الحیٰوۃ الدنیا)۔

مبادا دنیا تمہیں فریب دے کر غفلت میں ڈال دے اور تم یہ سمجھتے رہو کہ وہ ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی، وہ تو بجلی کی ایسی رو ہے جو ایک لمحے میں گزر جاتی ہے، ایسا شعلہ ہے جو ہوا کے ایک جھونکے سے بجھ جاتا ہے، سطح آب پر ایک بلبلہ ہے اور طوفانوں کی راہ میں ایک غبار ہے" لیکن جو کچھ پروردگار کے پاس ہے وہ ایمانداروں اور اپنے رب پر بھروسہ کرنے والوں کے لیے زیادہ بہتر اور زیادہ پائیدار ہے (وما عند اللّٰہ خیر و ابقٰی للذین اٰمنوا وعلٰی ربھم یتوکلون)۔

اگر تم کر سکتے ہو تو اس مادی کائنات کی پست، محدود اور چند روزہ متاع زندگی کا اس جاودانی سرمائے سے تبادلہ کر لو، یہی تمہاری سودمند تجارت اور بے مثال کامیابی ہے۔

کیونکہ اس دنیا کی نعمتیں سر دردی سے خالی نہیں، ہمیشہ ہر گل کے ساتھ خار اور ہر نوش کے ساتھ نیش ہوتا ہے جب کہ خدا کی جزا خیر ہی خیر اور ہر قسم کی ناخوشگوار چیزوں سے بالکل پاک ہوتی ہے پھر یہ دنیاوی نعمتیں جس قدر اور جیسی بھی ہیں دیرپا نہیں ہیں لیکن وہ نعمتیں پائیدار اور جاودانی ہیں، کونسی عقل اس بات کی اجازت دے گی کہ انسان اس قسم کے سودمند سودے کو چھوڑ کر غرور و غفلت کا شکار ہو جائے اور دنیاوی زرق برق کے فریب میں آ جائے؟

یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ کی ۳۸ ویں آیت کہتی ہے:

أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ

---

[1] تفسیر کشاف میں زمخشری کے بقول "ویعلم الذین یجادلون ...." کا جملہ اس لیے منصوب ہے کیونکہ اس کا عطف، محذوف تعلیل پر ہے جس کی تقدیر یوں ہے "ولینتقم منھم ویعلم الذین یجادلون ...." یعنی جس کا مقصد یہ ہے کہ خدا اس گروہ سے انتقام لے اور ہدف یہ ہے کہ مجادلہ کرنے والے جان لیں کہ نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

[2] تفسیر نمونہ جلد دہم صفحہ ۲۶۳ پر یہ کلمہ "محص" کے مادہ کے طور پر ذکر ہوا ہے جس کی اصلاح ہونی چاہیے۔

اے وہ لوگو! جو جہاد سے روگردانی کرتے ہو! آیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی پر راضی ہو گئے ہو؟ حالانکہ دنیاوی زندگی کی متاع آخرت کے مقابلے میں بہت ہی معمولی ہے۔

اصولی طور پر اگر دیکھا جائے تو "الحیٰوۃ الدنیا" (اس کے وسیع معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے) پست اور گھٹیا زندگی کی طرف اشارہ ہے اور واضح سی بات ہے کہ ایسی زندگی سے بہرہ مند ہونے کے وسائل اور مال و متاع بھی ایسا ہی ناچیز ہوگا۔

اسی لیے تو اسلام کے عظیم الشان پیغمبرؐ فرماتے ہیں:

والله ما الدنیا فی الاٰخرۃ الامثل ان یجعل احدکم اصبعہ ھٰذہ فی الیم فلینظر بم ترجع

خدا کی قسم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنی انگلی کو سمندر میں ڈبوئے اور پھر اسے نکال کر دیکھے کہ اس سے اسے کیا ملا ہے؟ [1]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں زیادہ زور خدا پر ایمان اور بھروسے پر دیا گیا ہے کیونکہ خدا کی سزا و جزا کی امید ان لوگوں کو ہوتی ہے جو خدا پر ایمان کے علاوہ اپنے کاموں کو بھی اسی کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس گروہ کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو دنیا سے محبت اور اس کی ناپائیدار متاع سے دلچسپی کی وجہ سے خدائی آیات کے بارے میں جھگڑے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں اور حقائق کو پامال کر دیتے ہیں۔ تو اس طرح سے یہ آخری آیت علت کے بیان کی وجہ سے پہلی آیت کے ساتھ بالکل ملتی جلتی ہے جس میں آیات الٰہی کے بارے میں مجادلہ کرنے والوں کی بات کی گئی ہے۔

---

[1] تفسیر روح البیان، جلد ۳ ص ۴۲۹ (سورۂ توبہ کی ۳۸ ویں آیت کے ذیل میں)۔

۳۷۔ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝

۳۸۔ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

۳۹۔ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝

۴۰۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۷۔ وہی لوگ جو بڑے گناہوں اور بُرے اعمال سے اجتناب کرتے ہیں اور جب غصے میں آتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں۔

۳۸۔ وہی جنہوں نے اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کیا ہے اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان کے کام باہم مشورے کے ذریعے انجام پاتے ہیں اور ہم نے جو کچھ انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

۳۹۔ وہی لوگ جب ان پر ظلم ہوتا ہے تو (وہ ظلم کے آگے جھک نہیں جاتے بلکہ) مدد طلب کرتے ہیں۔

۴۰۔ اور برائی کا بدلہ اسی جیسی سزا ہے اور جو شخص معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر خدا پر ہے،

بے شک خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر

اہل ایمان ظلم کے آگے نہیں جھکتے

یہ آیات اس گفتگو کا تسلسل ہیں جو گزشتہ آیات میں توکل پیشہ مومنین کے لیے خدا کی جزا کے بارے میں ہو چکی ہے۔

ایمان اور توکل کی صفات کے بعد جو کہ قلبی صفات ہیں ان آیات میں ان کے سات قسم کے اعمال کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ان میں سے کچھ تو منفی پہلو کے حامل ہیں اور کچھ مثبت کے، کچھ انفرادی ہیں اور کچھ اجتماعی، کچھ مادی ہیں اور کچھ معنوی۔ اور یہ ایسے اعمال ہیں جو ایک صالح اور طاقتور حکومت اور صحیح وسالم معاشرے کے بنیادی ارکان ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ظاہری طور پر یہ آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور ان دنوں میں نازل ہوئی ہیں جب اسلامی معاشرے کی تشکیل نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اسلامی حکومت کا وجود عمل میں آیا تھا۔ لیکن ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہی دنوں سے ایسی آیات کے ذریعے مسلمانوں کو صحیح اسلامی بصیرت سے آگاہ کیا جانے لگا تھا، کیونکہ مکہ میں قیام کے دوران ہی مستقبل کے لیے ایک صحیح اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں مسلسل اور مکمل تعلیم سے بہرہ مند فرما رہے تھے۔

پہلی صفت کو اصلاح سے شروع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا کی جزا اور جو کچھ خدا کے پاس ہے ان لوگوں کے لیے سب سے بہتر اور سب سے زیادہ پائیدار ہے جو گناہان کبیرہ سے اجتناب کرتے ہیں اور بری باتوں سے پرہیز کرتے ہیں (والذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش)[1]

"کبائر" "کبیرۃ" کی جمع ہے جس کا معنی ہے بڑے گناہ۔ اب رہا یہ سوال کہ گناہوں کے بڑا ہونے کا کیا معیار ہے؟ کچھ مفسرین نے تو اس سے ایسے گناہ مراد لیے ہیں جو قرآن میں مذکور ہوئے ہیں اور خداوند عالم نے ان کے ارتکاب پر عذاب کی وعید کی ہے، یا ایسے گناہ جو شرعی حد کا سبب بنتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ شاید اس سے مراد بدعتیں ہیں اور لوگوں کے ذہن میں اعتقادی شکوک وشبہات کا پیدا کرنا ہے۔

لیکن جس طرح کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اگر ہم "کبیرۃ" کے لغوی معنی کی طرف رجوع کریں تو معلوم ہوگا کہ کبیرہ سے

---

[1] اکثر مفسرین کے خیال کے مطابق "الذین یجتنبون" کا عطف گزشتہ آیت "للذین اٰمنوا" پر ہے۔ ہر چند کہ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ جملہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ جو تقدیری طور پر یوں ہوگا۔

والذین یجتنبون ...... لھم مثل ذالک من الثواب

لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مراد ہر وہ گناہ ہے جو اسلامی نکتہ نظر سے بڑا اور با اہمیت ہے۔ اس کے بڑا ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ قرآن مجید میں اس کے بارے میں عذاب کی دھمکی دی گئی ہو۔ اسی لیے روایات اہلبیتؑ میں بھی "کبائر" کی اس صورت میں تفسیر ہوئی ہے کہ:

التی اوجب اللّٰہ عز وجل علیہ النار

گناہان کبیرہ وہ ہوتے ہیں جن کی سزا خداوند عزوجل نے جہنم مقرر فرمائی ہے[1]

اسی طرح اگر کسی گناہ کی عظمت اور بڑائی دوسرے حوالوں سے ثابت ہو جائے تو بھی اس پر کبیرہ کا عنوان صادق آتا ہے۔

"فواحش" "فاحشہ" کی جمع ہے جس کا معنی ہے "نہایت ہی برے اور ناپسندیدہ اعمال"۔ اس کلمہ کو "کبائر" کے بعد ذکر کرنا اصطلاحی طور پر عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سچے مومنین کے بارے میں یہ بتانے کے بعد کہ وہ تمام کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں اب برے اور شرم آور گناہوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ ان کی اہمیت واضح ہو۔

اس طرح سے خدا پر ایمان اور توکل کی پہلی نشانی گناہان کبیرہ سے پرہیز اور اجتناب ہے۔ یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ انسان، خدا پر ایمان اور توکل کا دعویٰ تو کرے لیکن خود کئی قسم کے گناہوں سے آلودہ ہو اور اس کا دل شیطان کا ٹھکانا ہو؟

دوسری صفت بھی پاکیزگی اور اصلاح کے پہلو کی حامل ہے اور انسان کے زبردست بحرانی حالات میں غیظ و غضب پر کنٹرول کی علامت ہے، خدا فرماتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو غصے کے وقت معاف کر دیتے ہیں (واذا ما غضبوا ھم یغفرون)۔

نہ صرف غصے کے وقت زمام اختیار ان کے قابو میں رہتی ہے اور وہ کسی غلط کام کا ارتکاب نہیں کرتے بلکہ آپ عفو و غفران سے اپنے اور دوسرے لوگوں کا دل کینوں سے صاف کر دیتے ہیں۔

یہ وہ صفت ہے جو خدا پر صحیح معنوں میں ایمان اور ذات حق پر توکل کے سوا پیدا نہیں ہوتی۔ یہ بات لائق غور ہے کہ خدا یہ نہیں فرماتا کہ وہ غصہ نہیں کرتے، کیونکہ یہ تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور بعض مقامات پر تو اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے جیسے خدا کی راہ اور مظلوم لوگوں کے حق کو ثابت کرنے کے لیے غیظ و غضب کا اظہار، بلکہ فرماتا ہے کہ وہ غصے کے وقت گناہوں سے آلودہ نہیں ہوتے اور معاف بھی کر دیتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ انسان کیونکر خدا کی مغفرت کی توقع کر سکتا ہے جبکہ وہ خود کینہ پرور اور منتقم مزاج ہو اور غیظ و غضب کے موقع پر کسی قانون کو خاطر میں نہ لاتا ہو؟

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں پر "غصے" کے مسئلے پر زیادہ زور دیا گیا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ حالت ایک ایسی جلا ڈالنے والی آگ ہوتی ہے جو انسان کے اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے اور بہت سے لوگ ایسی حالت میں اپنے نفس پر قابو پانے سے عاجز ہوتے ہیں لیکن حقیقی مومن کسی بھی حالت میں مغلوب الغضب نہیں ہوتے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

من ملك نفسه اذا رغب، واذا رهب، واذا غضب، حرم الله جسده على النار

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول ص ۴۷۳۔

جو شخص خواہشات، خوف اور غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھتا ہے، خدا اس کے جسم کو جہنم کی آگ پر حرام کر دیتا ہے۔[1]

بعد کی آیت میں تیسری سے چھٹی صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وہی لوگ کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کیا ہے اور اس کے فرمان کو دل و جان سے مانا ہے (والذین استجابوا لربھم)۔

اور نماز کو قائم کیا ہے (واقاموا الصلوٰۃ)۔

اور ان کے کام باہم مشورے کی صورت میں انجام پاتے ہیں (وامرھم شوریٰ بینھم)۔[2]

اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں (ومما رزقناھم ینفقون)۔

گزشتہ آیت میں مومنین کے وجود کی گناہوں سے دوری اور غیظ و غضب پر قابو پانے کی بات کی گئی تھی لیکن زیر تفسیر آیت میں ان کے وجود کی مختلف پہلوؤں سے اصلاح کی بات ہو رہی ہے جن میں سے اہم ترین چیز دعوت پروردگار کی قبولیت اور اس کے فرمان کے آگے سر تسلیم خم کر دینا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس میں تمام نیکیاں، اچھائیاں اور فرمان الٰہی کی اطاعت سب کے سب یکجا ہیں اور مومنین اپنے تمام وجود کے ساتھ اس کے حکم کے آگے سر جھکائے ہوتے ہیں، اس کے ارادے کے مقابلے میں اپنے ارادے کو نہیں لاتے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ گناہ کہ جو راہ حق میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں، قلب و روح کو ان کے آثار سے پاک کرنے کے بعد، اسی کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا مرحلہ قطعی ہو جاتا ہے۔

نیز خدائی احکام میں سے بھی بعض ایسے ہیں جو نہایت ہی اہم مسائل پر مشتمل ہیں کہ خاص طور پر جن کی نشاندہی کی جانی چاہیے، چنانچہ یہاں پر اسی قسم کے مسائل کو ذکر کیا گیا ہے جن میں سے اہم ترین نماز ہے۔ نماز دین کا ستون ہے، خالق اور مخلوق کے درمیان رابطہ ہے، نفوس کی تربیت کنندہ ہے، مومن کی معراج ہے اور برائیوں سے روکنے والی ہے۔

اس کے بعد اہم معاشرتی اور اجتماعی مسئلہ بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے "شوریٰ" کا مسئلہ، جس کے بغیر تمام کام ناقص ہوتے ہیں۔ ایک انسان فکری لحاظ سے جتنا بھی قوی کیوں نہ ہو مختلف مسائل کو ایک یا چند پہلوؤں سے سوچتا ہے، اس لیے دوسرے پہلو اس سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں مگر جب مسائل کو شوریٰ میں پیش کیا جاتے اور مختلف عقلیں، تجربے اور نقطہ ہائے نظر ایک دوسرے کی مدد کریں تو مسائل یقیناً مکمل، پختہ اور نقص و عیب سے تقریباً خالی ہو کر سامنے آجاتے ہیں جن میں لغزش

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۵۸۳ منقول از تفسیر علی بن ابراہیم۔

[2] "شوریٰ" کا لفظ مصدر ہے اور مشاورت کے معنی میں ہوتا ہے لہٰذا مذکورہ آیت میں "ذو" کے لفظ کو مقدر ماننا چاہئے گا اور اسے تقدیری طور پر یوں سمجھا جائے گا "امرھم ذو شوریٰ بینھم" یہ بعض مفسرین کا موقف ہے۔ یا پھر اسے مبالغے اور تاکید پر محمول کیا جائے گا کیونکہ جہاں پر "صفت" کے بجائے "مصدر" ذکر ہوتا ہے عام طور پر یہی معنی ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اگر "شوریٰ" کا معنی ایسا کام ہو جس میں مشورہ لیا جاتا ہے تو مفردات میں راغب کے بقول: "الامر الذی یتشاور فیہ" کے معنی میں ہو گا اور کسی چیز کو مقدر ماننے کی ضرورت در پیش نہیں آئے گی۔ (غور کیجئے گا)

کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

انه مامن رجل یشاور احداً الا هدی الی الرشاد

جو شخص بھی اپنے کاموں میں کسی دوسرے شخص سے مشورہ کرتا ہے اسے مطلوبہ اور سیدھے راستے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں پر عبارت کے الفاظ ایسے انداز میں ذکر ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مومنین کے مستقل طرز عمل میں شامل ہے۔ نہ صرف ایک فوری اور عارضی کام میں مومنین ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں بلکہ ان کے سارے کام ہی باہمی مشوروں سے انجام پاتے ہیں اور پھر دلچسپی کی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عقل کل ہونے اور مبدأ وحی سے مستقل رابطہ رکھنے کے باوجود مختلف اجتماعی، معاشرتی، انتظامی نیز جنگ اور صلح کے مسائل اور دوسرے اہم امور میں صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات ان کی رائے کو ترجیح دیا کرتے تھے، خواہ اس میں انہیں مشکلات کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔ اس طرح سے آپؐ نے لوگوں کے لیے ایک مثال قائم کر دی کیونکہ مشورے کی برکتیں اس کے امکانی نقصانات سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔

مشورے کی اہمیت، شوریٰ کی شرائط اور مشیر کے اوصاف اور فرائض کے بارے میں تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں سورۂ آل عمران کی ۱۵۹ ویں آیت کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ گفتگو ہو چکی ہے یہاں پر اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ چند ایک موضوعات کو یہاں پر اضافی صورت میں ذکر کیا جاتا ہے۔

الف : شوریٰ صرف انتظامی امور اور موضوع کی شناخت کے بارے میں ہوتا ہے نہ کہ احکام الٰہی کے سلسلے میں، کیونکہ احکام الٰہی کا تعلق مبدأ وحی اور کتاب وسنت سے ہوتا ہے اور "امرھم" (ان کے کام) کی تعبیر بھی اسی بات کو بیان کرتی ہے کیونکہ احکام کا نفاذ خدا کا کام ہوتا ہے لوگوں کا نہیں۔

بنا بریں اگر آلوسی جیسے بعض مفسرین نے اس کے دائرہ کو وسیع کر دیا ہے اور جن احکام کے بارے میں خاص نص وارد نہیں ہوئی انہیں بھی اس میں شامل کر دیا ہے تو ان کا یہ نظریہ بے بنیاد ہے بالخصوص جب ہم اس بات کے معتقد ہیں کہ اسلام میں کوئی ایسا امر نہیں ہے جس کے بارے میں خاص یا عام نص موجود نہ ہو، وگرنہ " الیوم اکملت لکم دینکم" (مائدہ ۵ - ۳) کا نزول صحیح نہیں ہوگا۔ (اس کی تفصیل اور تشریح کا اصول فقہ کی کتابوں میں مطالعہ کیا جائے جہاں پر اسلام میں قانون سازی کے بارے میں اجتہاد کے باطل ہونے کے بارے میں بحث کی گئی ہے)۔

ب : بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "امرھم شوریٰ بینھم" کا جملہ انصار کے بارے میں نازل ہوا ہے اور ان کے لیے یہ حکم یا تو اس لیے ہے کہ قبل از اسلام بھی ان کے امور شورائی طریقے پر انجام پاتے تھے یا پھر انصار کے اس گروہ کے لیے ہے جو ہجرت سے پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے، مقام "عقبہ" پر آپؐ کی بیعت کی اور آپؐ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی (چونکہ یہ سورت مکی ہے اور مذکورہ بالا آیات بھی بظاہر مکہ ہی میں نازل ہوئی ہیں)۔

صورت حال خواہ کچھ بھی ہو آیت کا حکم اپنی شان نزول کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک عام اور وسیع حکمت عملی کو بیان کر رہا ہے۔

ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں آپؑ فرماتے ہیں:

لا ظهير كالمشاورة والاستشارة عين الهداية

باہمی مشورت جیسا کوئی پشت پناہ نہیں اور مشورہ لینا عین ہدایت ہے[1]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں جو آخری صفت بیان ہوئی ہے صرف مال خرچ کرنے کو بیان نہیں کر رہی بلکہ ہر اس چیز میں سے خرچ کرنے کو بیان کر رہی ہے کہ جو خدا نے انسان کو عطا فرمائی ہے خواہ وہ مال ہو یا علم، عقل ہو یا فکر اور یا پھر اجتماعی تجربہ، غرض ہر ایک چیز میں سے خرچ کرنے کا بتا رہی ہے۔

ایک اور توصیف میں جو کہ مؤمنین کی ساتویں صفت ہے فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب بھی ان پر ظلم کیا جاتا ہے (ظلم کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ) دوسروں سے مدد طلب کرتے ہیں (والذين اذا اصابهم البغي هم ينتصرون)۔

یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جہاں پر ستم رسیدہ لوگوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ظلم و ستم کے مقابلے کے لیے دوسرے لوگوں سے مدد طلب کریں، وہاں پر دوسرے لوگوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ ان کی مدد کریں۔ کیونکہ جب مدد کرنے والا موجود نہ ہو مدد طلب کرنا فضول ہوتا ہے۔ درحقیقت مظلوم کا فرض ہے کہ ظلم کا مقابلہ کرے اور دوسروں سے مدد طلب کرے اور دوسرے مؤمنین پر لازم ہے کہ اس کی فریاد کو پہنچیں اور مدد کریں۔ چنانچہ سورۂ انفال کی ۷۲ ویں آیت میں ہے:

ان استنصروكم في الدين فعليكم النصر

جب بھی وہ تم سے دین کی حفاظت کے لیے نصرت طلب کریں تو تم پر بھی لازم ہے کہ ان کی مدد کرو۔

"ینتصرون" کا کلمہ "انتصار" سے لیا گیا ہے جس کا معنی مدد طلب کرنا ہے، لیکن بعض مفسرین نے اسے "تناصر" (باہم مدد کرنا) کے معنی میں لیا ہے لیکن اگر توجہ سے کام لیا جائے تو مندرجہ بالا تشریح کے پیش نظر دونوں کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔

بہرصورت اگر مظلوم تنہا ظلم و ستم کے دور کرنے پر قادر نہیں ہے تو خاموشی اختیار نہ کرے بلکہ دوسرے لوگوں کی توانائیوں سے استفادہ کرتے ہوئے، ظالم کے مقابلے میں ڈٹ جائے اور تمام دوسرے مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ اس کی نصرت طلبی کا مثبت جواب دیں۔

لیکن جہاں تک ایک دوسرے کی مدد کرنے کا سوال ہے وہ مدد عدل و انصاف کی راہوں سے ہٹ کر جذبہ انتقام، کینے اور تجاوز کی حد تک نہ پہنچ جائے، اسی لیے بعد کی آیت میں فوراً ہی اسے ان چیزوں سے مشروط کرتے ہوئے خداوند عالم

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۸ صفحہ ۴۲۵ (احکام العشرۃ کا ۲۱ واں باب)۔

فرماتا ہے کہ اس بات کا خاص خیال رہے کہ "برائی کی سزا، اسی برائی جیسی ہوتی ہے" (وجزاء سیئة سیئة مثلها)۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے دوستوں پر ظلم ہوا ہے تو تم حد سے بڑھ جاؤ اور خود ظالم بن جاؤ۔ خاص کر بعض معاشروں میں جیسے اوائل اسلام میں عرب معاشرہ تھا، ظلم کا جواب دیتے وقت حد سے بڑھ جانے کا بہت بڑا اندیشہ تھا، اسی لیے مظلوم کی نصرت اور جذبۂ انتقام کا فرق بتا دینا ضروری تھا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ظالم کے کام کو تو "سیئة" اور برائی سے تعبیر کرنا صحیح ہے لیکن اسے سزا دینا تو یقیناً "سیئة" اور برائی نہیں ہے، یہاں پر "سیئة" کا لفظ کیوں استعمال ہوا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آیت میں مظلوم کی نصرت طلبی کے جواب میں ظالم کی سزا کو "سیئة" سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ درحقیقت برابر کے قرینے کے طور پر استعمال ہوا ہے یا اس لیے کہ چونکہ سزا پانے والے ظالم کی نگاہ میں یہ ردعمل "سیئة" ہوتا ہے نیز ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس کو "سیئة" سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ سزا بھی ایک تکلیف اور دکھ ہوتی ہے جو بذاتہٖ ایک بری چیز ہے ہرچند کہ قصاص اور ظلم کی سزا اچھی چیز شمار ہوتی ہے۔

یہ بات اُس تعبیر سے ملتی جلتی ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۴ میں یوں بیان ہوئی ہے:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

جو شخص تم پر تجاوز کرے تم بھی ایسے ہی اس پر تجاوز کرو اور خدا سے ڈرو (اور حد سے نہ بڑھ جاؤ)۔

لیکن صورت حال خواہ کچھ بھی ہو، ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس عفو و درگزر کا مقدمہ ہو جو بعد کے جملے میں بیان ہوا ہے۔ گویا قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ: سزا جیسی بھی ہو ایک قسم کی تکلیف ضرور ہے لہٰذا اگر فریق مخالف نادم اور پشیمان ہو جائے تو عفو و درگزر کے لائق ہے۔

ایسے حالات میں درگزر سے کام لو کیونکہ "جو شخص عفو اور اصلاح سے کام لیتا ہے اس کا ثواب خدا کے پاس ہے" (فمن عفا واصلح فاجره على الله)۔

یہ ٹھیک ہے کہ ضائع شدہ حقوق کے بدلے میں بظاہر کوئی چیز نہیں ملتی، لیکن درگزشت سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ ایسے حقوق سے کہیں زیادہ فوائد کا حامل ہوتا ہے کیونکہ اس سے ایک تو معاشرے میں اتحاد فروغ پاتا ہے، دوسرے دلوں سے کینے اور بغض دور ہوتے ہیں، تیسرے محبت بڑھتی ہے، چوتھے جذبۂ انتقام ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور پانچویں معاشرے میں سکون اور سکھ کا سانس لیا جاتا ہے۔ اسی لیے اس کا اجر خدا خود ہی عطا فرماتا ہے جو یقیناً اس کا بے انتہا فضل و کرم ہے اور کیا ہی بہترین تعبیر ہے "علی اللہ" کے کلمے، گویا خداوند عالم اپنے آپ کو ایسے افراد کا مرہون سمجھتا ہے اور فرماتا ہے کہ اس کا اجر میرے ذمہ ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا ظالموں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا (انه لا یحب الظالمین)۔
ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ ذیل کے چند نکات کی طرف اشارہ ہو:

پہلا نکتہ یہ کہ عفو و درگزر کا حکم شاید اس لیے ہے کہ قصاص یا سزا کی صورت میں بعض اوقات انسان خود کو صحیح معنوں میں کنٹرول نہیں کر پاتا اور حد سے بڑھ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ظالموں کی فہرست میں آجاتا ہے۔

دوسرا نکتہ یہ کہ اگر عفو کا حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ظالموں کا دفاع کیا گیا ہے کیونکہ خدا ظالموں کو تو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔ بلکہ اصل مقصد گمراہوں کی ہدایت اور اجتماعی رابطوں کو مضبوط بنانا ہے۔

تیسرا نکتہ یہ کہ جو لوگ عفو کے مستحق ہیں وہ ظلم کا راستہ ترک کریں، اپنے کیے پر ندامت اور پشیمانی کا اظہار کریں اور اپنی اصلاح پر آمادہ ہوں وہ ایسے ظالم نہ ہوں جنہیں عفو مزید جسارت پر آمادہ کرے اور وہ مزید جری ہو جائیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ ہے کہ ہر ایک کے لیے عفو اور سزا کے اپنے حالات اور مواقع ہوتے ہیں۔ عفو ایسے مقام پر ہوتا ہے جہاں انسان انتقام کی قدرت رکھتا ہو، اگر معاف کر دے تو یہ اس کی کمزوری نہیں ہوگی ایسی معافی کا بہت فائدہ ہوتا ہے کامیاب مظلوم کے لیے اس لیے مفید ہوتی ہے کہ وہ اپنے نفس پر قابو رکھتے ہوئے اور صاف دل کے ساتھ معاف کر دیتا ہے اور مغلوب ظالم کے لیے اس لیے کہ اسے اپنے نفس کی اصلاح پر آمادہ کرتی ہے۔

کسی کے کیے کی سزا اور انتقام ایسے مقام پر عمل میں آنے چاہئیں جہاں ظالم ہنوز شیطانی راستے پر قائم ہو اور مظلوم اپنی طاقت کی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم نہ کر سکا ہو اور معاف کرنا کمزوری سمجھا جاتا ہو تو ایسے مقامات پر ظالم کو سزا ملنی چاہیے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اذا کان یوم القیامة نادی مناد من کان اجره علی الله فلیدخل الجنة فیقال من ذا الذی اجره علی الله؟ فیقال العافون عن الناس فیدخلون الجنة بغیر حساب

جب قیامت کا دن ہوگا، (خدا کی طرف سے) ایک منادی ندا دے گا کہ جس جس شخص کا اجر خدا کے ذمہ ہے وہ بہشت میں چلا جائے۔ تو پوچھا جائے گا، خدا کے ذمہ کس کا اجر ہے؟ تو جواب ملے گا، جنہوں نے لوگوں کو معاف کر دیا ہے، چنانچہ وہ حساب کے بغیر بہشت میں چلے جائیں گے۔[1]

درحقیقت یہ حدیث زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت سے نتیجے کے طور پر اخذ کی گئی ہے۔ اور اسلام کا اصل اور صحیح راستہ بھی یہی ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

۴۱۔ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝
۴۲۔ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝
۴۳۔ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

ترجمہ

۴۱۔ جو شخص مظلوم ہونے کے بعد مدد طلب کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔
۴۲۔ اعتراض اور سزا تو ان لوگوں کے لیے ہے جو دوسرے لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق ظلم روا رکھتے ہیں۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔
۴۳۔ لیکن جو لوگ صبر کرتے ہیں اور معاف کر دیتے ہیں تو یہ بڑے کاموں میں سے ہے۔

تفسیر

نصرت طلبی عیب نہیں ظلم کرنا عیب ہے

یہ آیات درحقیقت نصرت طلبی، ظالم کی سزا اور عفو و درگزر کے سلسلے میں گزشتہ آیات کی تاکید، تشریح اور تتمہ ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ظالم کو سزا دینا اور اس سے انتقام لینا مظلوم کا حق ہے اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ کھڑی کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اگر مظلوم کو اس پر غلبہ حاصل ہو جائے تو اگر وہ صبر سے کام لے کر اس سے انتقام نہ لے تو یہ اس کے لیے بہت بڑی فضیلت ہو گی۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جو شخص مظلوم ہونے کے بعد کسی سے مدد طلب کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے (ولمن

انتصر بعد ظلمہ فاولئک ما علیھم من سبیل)[1]
کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کام سے اسے روکے یا اسے ملامت اور سرزنش کرے یا اسے سزا دے، بلکہ ایسے مظلوم کی مدد کرنے میں کسی قسم کے شک و شبہ کا شکار بھی نہ ہو۔ کیونکہ استغاثہ اور نصرت طلبی مظلوم کا مسلم حق ہے اور مظلوم کی مدد کرنا ہر آزادی پسند اور بیدار ضمیر کے مالک انسان کا فرض ہے۔

اعتراض اور سزا تو صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو لوگوں پر ستم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق ظلم کو روا رکھتے ہیں (انما السبیل علی الذین یظلمون الناس و یبغون فی الارض بغیر الحق)۔

دنیا میں کیفر اور سزا پانے کے علاوہ "ان کے لیے آخرت میں بھی دردناک عذاب ہے" (اولئک لھم عذاب الیم)

"یظلمون الناس" اور "یبغون فی الارض بغیر الحق" کا آپس میں کیا فرق ہے؟ بعض مفسرین نے پہلے جملے کو "ظلم و ستم" کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور دوسرے جملے کو "تکبر اور خود پسندی" کی طرف[2] جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے پہلے جملے کو "ظلم" کی طرف اور دوسرے جملے کو "اسلامی حکومت کی مخالفت" کی طرف اشارہ قرار دیا ہے۔

"بغی" کا اصل معنی کسی چیز کے حصول کے لیے سعی و کوشش کرنا ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ لفظ دوسروں کے حقوق غصب کرنے یا خدا کے حقوق و حدود سے تجاوز کرنے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ اسی لیے "ظلم" کا مفہوم خاص ہوتا ہے اور "بغی" کا مفہوم عام ہوتا ہے اور حقوق الٰہی سے ہر قسم کے تجاوز اور تعدی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

"بغیر الحق" کی تعبیر بھی اسی معنی کے لیے تاکید کے طور پر آئی ہے اور اس طرح سے دوسرا جملہ خاص کے بعد عام کا ذکر ہے۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں صبر و استقامت اور عفو و درگزر کے مسئلے کو ایک بار پھر بیان کیا گیا ہے تاکہ ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو زوردار لفظوں میں بیان کر دیا جائے کہ مظلوم کا ظالم سے انتقام، قصاص اور اسے سزا، ہرگز عفو و درگزشت سے مانع نہیں ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے: جو لوگ صبر کرتے ہیں اور فریق مخالف کو معاف کر دیتے ہیں تو یہ ان کے بڑے کاموں میں سے ہے (ولمن صبر وغفر ان ذالک لمن عزم الامور)[3]

"عزم" دراصل کسی کام کے انجام دینے کے لیے پختہ ارادہ کر لینے کو کہتے ہیں اور محکم ارادے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔
"عزم الامور" کی تعبیر سے ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ ایسے کاموں سے ہے جن کا خدا نے حکم دیا ہے اور ہرگز منسوخ نہیں ہوگا۔ یا ایسے کاموں میں سے ہے جن کے بارے میں انسان کو عزم راسخ سے کام لینا چاہیئے۔ ان دونوں معانی میں سے جو بھی مراد ہو ہر صورت میں اس کام کی اہمیت کی دلیل ہے۔

---

[1] "ظلمہ" میں مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔

[2] ملاحظہ ہوں، تفسیر کشاف، تفسیر روح المعانی اور تفسیر روح البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

[3] "لمن صبر" میں لام، لام قسم ہے اور "لمن عزم الامور" میں لام تاکید ہے اور دونوں اس خدائی حکم (عفو) کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "صبر" کا ذکر "غفران" سے پہلے ہوا ہے کیونکہ اگر صبر وشکیبائی نہ ہو تو عفو و درگزر کی نوبت نہیں آتی۔ نفس، انسان کے قابو میں نہیں رہتا اور وہ انتقام پر ہی ڈٹا رہتا ہے۔

اس حقیقت کی ایک بار پھر یاد دہانی کروائی جاتی ہے کہ "عفو اور درگزر" ایسی صورت میں مطلوب اور قابل تعریف ہے کہ مظلوم طاقتور ہو اور طاقت کے ہوتے ہوئے اسے معاف کر دے اور فریق مخالف بھی اس سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھائے اور "من عزم الامور" کی تعبیر بھی شاید اسی معنی کی تاکید کر رہی ہے کیونکہ کسی چیز کے بارے میں حتمی فیصلہ اسی وقت کیا جاتا ہے کہ جب انسان اس کے انجام دینے پر قادر ہو۔ لیکن جو معافی ظالم کی طرف سے مسلط کی جائے یا اسے اپنے اعمال میں زیادہ جری اور گستاخ بنا دے وہ قابل تعریف اور مطلوب نہیں ہے۔

بعض روایات کے مطابق مندرجہ بالا آیات میں حضرت امام مہدی عجل اللہ فرجہ کے قیام اور زمین میں آپ کے اور آپ کے رفقار کار کے ظالموں اور مفسدین سے انتقام لینے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ بارہا بتایا جا چکا ہے کہ اس قسم کی تفسیریں آیات کا واضح اور روشن مصداق ہوا کرتی ہیں اور آیت سے عمومی مفہوم مراد لینے سے مانع نہیں ہوتیں۔[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص۵۸۵۔

۴۴۔ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۚ

۴۵۔ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ۝

۴۶۔ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ

ترجمہ

۴۴۔ جسے خدا گمراہی میں ڈال دے اس کے لیے اس کے بعد کوئی بھی ولی اور مددگار نہیں ہوگا اور (قیامت کے دن) تم ظالموں کو دیکھو گے کہ جب وہ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کریں گے تو کہیں گے کہ آیا واپسی (اور تلافی) کی کوئی سبیل ہے؟

۴۵۔ اور تو انہیں دیکھے گا کہ وہ آگ کے لیے پیش کئے جائیں گے جب کہ سخت ذلت کی بنا پر وہ سر جھکائے ہوں گے، اور کنکھیوں سے (اس کی طرف) دیکھیں گے اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ کہیں گے صحیح معنوں میں ان لوگوں نے خسارہ اٹھایا ہے جو بروز قیامت اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو کھو چکے ہیں۔ آگاہ رہو! (آج کے دن) ظالم دائمی عذاب میں ہیں۔

۴۶۔ ان کے لیے خدا کے علاوہ اُن کے اولیاء اور مددگار نہیں کہ جو ان کی مدد کو پہنچیں اور جسے خدا گمراہی میں ڈال دے اس کے لیے نجات کی کوئی سبیل نہیں ہے۔

تفسیر

آیا واپسی کی کوئی سبیل ہے؟

گزشتہ آیات میں ظالموں، ستمگاروں اور تجاوز کاروں کے بارے میں گفتگو تھی، زیرِ نظر آیات میں ان کے انجام اور کچھ سزاؤں کی بات ہو رہی ہے۔

پہلے تو انہیں ایسا گمراہ قرار دیا گیا ہے جن کا کوئی ولی اور سرپرست نہیں ہوتا، ارشاد ہوتا ہے: جسے خدا گمراہی میں چھوڑ دے، اس کے بعد اُس کا کوئی ولی اور مددگار نہیں ہوگا (ومن یضلل اللہ فمالہ من ولی من بعدہ)۔

جو لوگ ہدایت اور ضلالت کے بارے میں قرآنی تعبیرات سے آشنا ہیں ان کے لیے یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ نہ تو ہدایت کا پہلو جبری ہوتا ہے اور نہ ہی ضلالت کا۔ بلکہ یہ انسانوں کے اپنے اعمال کا براہِ راست نتیجہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان ایسے کام انجام دیتے ہیں جن کی وجہ سے خدا ان کی توفیق سلب کر لیتا ہے اور نورِ ہدایت ان کے دل میں خاموش کر دیتا ہے اور انہیں گمراہی کی تاریکیوں میں چھوڑ دیتا ہے۔

یہ انسان کا عین اختیار ہے۔ جس طرح اگر کوئی شخص زبردست مے خواری کی وجہ سے گوناگوں بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ برا انجام اس شخص نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے فراہم کیا ہے، چونکہ خدا کا کام اشیاء کو اسباب فراہم کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نتیجہ اسی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔[1]

بہر حال یہ ان ظالموں کی دردناک سزاؤں میں سے ایک ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے: تم ظالموں کو دیکھو گے کہ جب وہ عذابِ الٰہی کا مشاہدہ کریں گے تو سخت پشیمان ہو کر کہیں گے کہ آیا واپسی اور ان گناہوں کی تلافی کی کوئی سبیل ہے؟ (وتری الظالمین لما رأوا العذاب یقولون ھل الی مرد من سبیل)۔

قرآن مجید نے کئی مرتبہ کافروں اور ظالموں کی واپسی کی درخواست کا ذکر کیا ہے، کبھی تو یہ درخواست موت کے قریب ہونے کے وقت ہوتی ہے، جیسا کہ سورۂ مؤمنون کی آیات ۹۹ تا ۱۰۰ میں ہے کہ:

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا

---

[1] اس بارے میں تفصیلی گفتگو ہم نے تفسیر نمونہ کی ۱۱ ویں جلد میں سورۂ زمر کی ۳۶ ویں آیت کے ذیل میں کی ہے اور اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

فِيمَا تَرَكْتُ۔

جب ان میں سے کسی ایک کے پاس موت آجاتی ہے تو کہتا ہے کہ پروردگارا! مجھے لوٹا دے تاکہ میں نے جو کوتاہی کی تھی، اس کے لیے کوئی عمل صالح بجالاؤں۔

کبھی یہ تقاضا عرصہ محشر میں ہوگا، جب وہ جہنم کے کنارے لاکھڑے کئے جائیں گے، جیسا کہ سورۂ انعام کی ۲۷ ویں آیت میں ہے:

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ○

جب وہ آگ کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے اگر تم دیکھو تو وہ کہیں گے اے کاش! ہم دنیا کی طرف لوٹ جاتے اور اپنے رب کی آیات کو نہ جھٹلاتے اور مومنین میں سے ہوتے۔

لیکن ان کی درخواست خواہ کسی بھی صورت میں ہو، مسترد کر دی جائے گی کیونکہ واپسی کے سب امکانات ختم ہو چکے ہوں گے اور یہ خدا کا ایک اٹل فیصلہ ہے۔ جس طرح انسان بڑھاپے سے جوانی کی طرف، جوانی سے بچپن کی طرف اور بچپن سے شکم مادر کی طرف واپس نہیں جا سکتا، اسی طرح عالم برزخ اور آخرت سے بھی رجعت قہقرائی قطعاً ناممکن ہے۔

بعد کی آیت اس گروہ کی تیسری سزا کو یوں بیان کرتی ہے: اس دن تم ان کو دیکھو گے کہ جب وہ جہنم کی آگ کے سامنے پیش کئے جائیں گے تو سخت ذلت کی وجہ سے سر جھکائے ہوئے کنکھیوں سے اس کی طرف نگاہ کریں گے (وتراھم یعرضون علیھا خاشعین من الذل ینظرون من طرف خفی)[1]

وحشت اور اضطراب کی حالت ان کے تمام وجود پر مسلط ہوگی اور ذلت انہیں سرتاپا گھیرے ہوئے ہوگی اب نہ تکبر کا نام ونشان ہوگا، نہ ہی مقابلہ بازی، سرکشی، ظلم، استبداد اور مظلوموں کے لیے اذیت اور آزار کا کوئی موقع ہوگا اور وہ کنکھیوں سے آتش جہنم کو دیکھیں گے اور بس۔

یہ اس شخص کی صورت حال ہوتی ہے جو کسی چیز سے زبردست ڈر جاتا ہے اور پوری آنکھ سے اسے نہیں دیکھنا چاہتا اور اس سے غافل بھی نہیں رہنا چاہتا۔ مجبوراً اسے اس چیز کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے اور بار بار اسے دیکھنا بھی پڑتا ہے لیکن پوری آنکھ سے نہیں بلکہ نظر بچا کے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر "طرف خفی" کا معنی نیم باز آنکھوں کے ساتھ دیکھنا ہے، کیونکہ وہ سخت گھبراہٹ

---

[1] "طرف" (بر وزن "برف") مصدر ہے اور آنکھ کی گردش کرنے کے معنی میں ہے اور "طرفۃ العین" آنکھ کی ایک گردش کے معنی میں ہے نیز "علیھا" میں "ھا" کی ضمیر عذاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگرچہ عذاب مذکر ہے لیکن چونکہ یہاں پر نار اور جہنم کے معنی میں ہے لہٰذا مونث کی ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اور زبردست خوف کی وجہ سے پوری آنکھ کھولنے پر قادر نہیں ہوں گے یا اس حد تک ہلکے اور رسوا ہو جائیں گے کہ پوری آنکھ بھی نہیں کھول سکیں گے۔

جب جہنم میں داخل ہونے سے پہلے یہ حال ہوگا تو جب وہ اس کے اندر چلے جائیں گے تو ان کی کیا کیفیت ہوگی اور جب وہ عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے تو پھر ان کا کیا حال ہوگا ؟

آخری سزا جو یہاں پر بیان ہوئی ہے وہ مؤمنین کی طرف سے سخت ملامت اور دردناک سرزنش ہوگی، جیسا کہ آیت کے آخر میں ہے: ایماندار لوگ کہیں گے صحیح معنوں میں وہ لوگ خسارے میں ہیں جو اپنے وجود کا سرمایہ اور اپنے اہل خاندان کو قیامت کے دن کھو چکے ہیں اور نقصان اٹھا چکے ہیں (و قال الذین اٰمنوا ان الخاسرین الذین خسروا انفسهم و اهليهم يوم القيامة)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا نقصان ہوگا کہ انسان اپنی ہستی کو کھو دے اور پھر اپنے بیوی بچوں اور قریبی عزیزوں سے جدا ہو جائے اور عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر حسرت اور جدائی کی آگ میں بھی جلتا رہے ؟

پھر فرمایا گیا ہے: اے اہلِ محشر! تم سب کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ آج سے تمام ظالم اور ستمگر دائمی عذاب میں ہوں گے (الا ان الظالمين فى عذاب مقيم)۔

ایسا عذاب جس کے ختم ہونے کی کوئی امید نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی مدت مقرر ہے، ایسا عذاب جو جسم و جان کے اندرونی اور بیرونی حصوں کو جلاتا اور بھسم کرتا رہے گا۔

بعید نہیں ہے کہ یہ الفاظ کامل الایمان مومنین کے ہوں کہ جن میں سرفہرست انبیاء، وائمہ اور خدا کے اولیا اور خاص بندے ہیں، کیونکہ وہ گناہوں سے پاک اور سربلند ہوتے ہیں اور انہیں ایسی باتیں کہنے کا حق بھی پہنچتا ہے وہ ایسے مظلوم ہیں جو ان ظالموں کے ہاتھوں بہت دکھ جھیلتے رہے ہیں وہ ایسی باتیں کہنے کے مجاز اور مستحق ہیں۔ (بعض روایات اہلبیتؑ میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے) [1]

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ جن ظالموں کے لیے "دائمی عذاب" ہے قرینے کے مطابق ان سے کافر لوگ مراد ہیں۔ جس طرح کہ قرآن کی بعض آیات میں اسی چیز کو بیان کیا گیا ہے، مثلاً :

وَالْكَافِرُوْنَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ

کافر ہی ظالم ہیں۔

بعد کی آیت بھی اسی بات کی گواہ ہے کہ جس میں کہا گیا ہے: ان کے اولیاء اور مددگار نہیں ہیں جو ان کی مدد کریں اور عذاب الٰہی ان سے دور کریں (و ما كان لهم من اولياء ينصرونهم من دون الله)۔

ان لوگوں نے اپنے تعلقات خدا کے خالص بندوں، انبیاء، و اولیاء سے منقطع کر لئے تھے، لہٰذا وہاں پر بھی ان کا کوئی یار و

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۵۸۶ ۔

مددگار نہیں ہوگا، مادی طاقتیں بھی بیکار ہو چکی ہوں گی، اسی لیے وہ تن تنہا عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں گے۔

اس معنی کو مزید تاکید کے لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جسے خدا گمراہی میں چھوڑ دے اس کی نجات کی کوئی سبیل نہیں ہے (ومن یضلل اللہ فما لہ من سبیل)۔

اس سے پہلی آیات میں "ومن یضلل اللہ فما لہ من ولی من بعدہ" آیا ہے جس میں ولی اور سرپرست کی نفی کی گئی ہے اور یہاں پر "راہ نجات" کی نفی ہے۔ کیونکہ مقصد تک پہنچنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک راہ اور دوسرے راہنما لیکن یہ گمراہ ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں۔

۴۷۔ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ○

۴۸۔ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ○

۴۹۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ○

۵۰۔ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ○

ترجمہ

۴۷۔ اپنے پروردگار کی دعوت قبول کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آپہنچے جس کے لئے ارادہ خداوندی کے سامنے کوئی بازگشت نہیں۔ اس دن نہ تو تمھاری کوئی پناہ گاہ ہے اور نہ ہی کوئی بچانے والا۔

۴۸۔ اگر وہ منہ پھیرلیں (تو غم نہ کھا کیونکہ ہم نے تجھے ان کا نگران بنا کر نہیں بھیجا۔ تیرا فرض صرف پیغام پہنچانا ہے اور جب ہم اپنی رحمت (کا لطف) انسان کو چکھاتے ہیں تو وہ اس سے خوش ہو جاتا ہے اور جب ان کے انجام دیئے ہوئے عمل کی وجہ سے ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو

پھر انسان کفران کرنے لگتا ہے۔

۴۹۔ زمین و آسمان کی ملکیت اور حاکمیت خدا ہی کے لیے ہے وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جسے چاہے بیٹی عطا کرتا ہے اور جسے چاہے بیٹا عطا کرتا ہے۔

۵۰۔ یا اگر چاہے تو بیٹا اور بیٹی دونوں عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہے بانجھ بنا دیتا ہے کیونکہ وہ علیم اور قدیر ہے۔

تفسیر

اولاد، اس کا عطیہ ہے

جہاں تک گزشتہ آیات کا تعلق ہے ان میں کافروں اور ظالموں کی کچھ دردناک، ہولناک اور وحشت ناک جسے کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن زیر نظر آیات میں روئے سخن تمام لوگوں کی طرف ہے اور انہیں خبردار کیا جا رہا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی دردناک انجام سے دوچار ہونے سے پہلے اپنے پروردگار کی دعوت کو لبیک کہتے ہوئے راہ حق کو اختیار کریں۔

ارشاد ہوتا ہے: اپنے پروردگار کی دعوت قبول کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آپہنچے کہ جس کے لیے ارادہ خداوندی کے سامنے کوئی بازگشت نہیں (استجیبوا لربکم من قبل ان یأتی یوم لا مرد لہ من اللہ)[1]

اور اگر تم یہ خیال کرو کہ اس دن لطف الٰہی کے سائے کے علاوہ کوئی جائے پناہ اور اس کی رحمت کے علاوہ اور کوئی بچانے والا اور مدافع ہوگا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ کیونکہ "اس دن تمہارے لیے نہ تو کوئی جائے پناہ ہے کہ جہاں تم عذاب الٰہی سے پناہ لو اور نہ ہی کوئی یار و مددگار ہے جو تمہارا دفاع کرے گا" (مالکم من ملجإ یومئذ و مالکم من نکیر)۔

"یوم لا مرد لہ من اللہ" کا جملہ قیامت کے دن کی طرف اشارہ ہے نہ کہ موت کے دن کی طرف اور "من اللہ" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے ارادے اور فرمان جو واپس نہ لوٹ سکنے پر مبنی ہے کے مقابلے میں کوئی شخص اپنے ارادے پر عمل درآمد نہیں کر سکتا۔

---

[1] مندرجہ بالا جملے میں "من اللہ" کا کلمہ ہو سکتا ہے "من قبل اللہ" کے معنی میں ہو یعنی خدا کی طرف سے کوئی بازگشت نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ "فی مقابل اللہ" کے معنی میں ہو۔ یعنی خدائی ارادے کے مقابلے میں کوئی شخص دنیا میں لوٹانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

بہرحال عذاب الٰہی سے بچنے کے لیے جو راہیں تصور میں آسکتی ہیں ان سب کے دروازے بند کئے جا چکے ہوں گے۔ عذاب سے بچنے کی جو راہیں تصور میں آسکتی ہیں ان میں سے ایک تو دنیا میں واپس جا کر گناہوں اور غلطیوں کی تلافی کرنا ہے۔ دوسرے ایسی جائے پناہ کا تصور کہ جس کے زیر سایہ انسان خود کو محفوظ کر سکے اور تیسرے کسی ایسے شخص کا وجود جو اس کا دفاع کر سکے۔ اور مذکورہ بالا آیت میں مذکور تینوں جملوں کے ذریعے ہر راستے کی نفی کر دی گئی ہے۔

بعض مفسرین نے "مالکم من نکیر" کے جملے کی اس معنی میں تفسیر کی ہے کہ "تم ہرگز وہاں پر اپنے گناہوں کا انکار نہیں کر سکو گے"، کیونکہ دلائل اور شواہد اس قدر زیادہ ہوں گے کہ انکار کی گنجائش ہی باقی نہیں رہے گی۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

بعد کی آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر کے ان کی دلجوئی کے طور پر فرمایا گیا ہے: اس کے باوجود اگر وہ تجھ سے منہ پھیر لیتے ہیں تو غم نہ کھا کیونکہ ہم نے تجھے انہیں روگردانی سے روکنے کے نگران بنا کر نہیں بھیجا (فان اعرضوا فما ارسلناك عليهم حفيظًا)۔

"تیرا فریضہ تو صرف خدائی پیغام پہنچانا ہے اور بس" خواہ وہ مانیں نہ مانیں (ان عليك الّا البلاغ)۔

اپنے فریضہ کو صحیح معنوں میں انجام دیتا رہ اور ان پر اتمام حجت کرتا رہ۔ جن لوگوں کے دل اس کے لیے آمادہ ہیں وہ مان لیں گے اگرچہ بہت سے لوگ اس سے منہ ہی پھیر لیں، تو اس بارے میں جوابدہ نہیں ہے۔ اسی مفہوم سے ملتی جلتی ایک آیت اسی سورت کے اوائل میں بھی آچکی ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

وَمَآ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ

تو انہیں حق قبول کرنے کے لیے آمادہ کرنے پر مامور نہیں ہے (شوریٰ-۶)۔

پھر ایمان اور روگردانی کرنے والے افراد کی صورت حال اور ان کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے "جب ہم انسان کو اپنی طرف سے کوئی رحمت نصیب کرتے ہیں تو وہ اس سے خوش ہو جاتا ہے"۔ ———— (وانا اذا اذقنا الانسان منا رحمة فرح بها)۔

"اور جب ان کے عمل انجام دینے کی وجہ سے ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو انسان کفران کرتا ہے (وان تصبهم سيئة بما قدمت ايديهم فان الانسان كفور)۔

جب کہ شکرِ منعم ضروری ہے لیکن خدا کی نعمتیں پا کر بھی وہ بیدار نہیں ہوتے اور اس کا شکر بجا نہیں لاتے اور اس منعم حقیقی کی معرفت اور اطاعت کا فریضہ انجام نہیں دیتے اور نہ ہی گناہوں کی وجہ سے ملنے والی سزاؤں کے ذریعے وہ خواب غفلت سے بیدار ہوتے ہیں اور نہ رسول اللہ کی دعوت حق ان پر کچھ اثر کرتی ہے۔

تشریعی لحاظ سے ہدایت کا ذریعہ انبیاء الٰہی کی دعوت ہے اور تکوینی لحاظ سے کبھی مصیبتیں ہوتی ہیں اور کبھی نعمتیں۔ لیکن ان دل کے اندھوں کے لیے کوئی بھی چیز مؤثر نہیں ہوتی۔ قصور خود ان کا اپنا ہے تو اس معاملے میں بالکل بے قصور ہے تو نے اپنا پیغام رسانی سے اپنا فریضہ انجام دے دیا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں "اذا اذقنا" (جب ہم چکھاتے ہیں) کی تعبیر رحمت کے بارے میں ہے اور کئی دوسری قرآنی آیات میں عذاب الٰہی کے بارے میں ہے اور ممکن ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس دنیا کی نعمتیں ہوں یا مصیبتیں جس قدر زیادہ ہوں پھر بھی آخرت کی نعمتوں اور مصیبتوں کے مقابلے میں بالکل معمولی ہوتی ہیں۔ یا پھر یہ مراد ہے کہ یہ کم ظرف لوگ معمولی سی نعمت پر مست اور مغرور ہو جاتے ہیں اور ذرا سی مصیبت پر مایوس اور منکر۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ خدا نعمت کو اپنی طرف نسبت دیتا ہے کیونکہ یہ اس کی رحمت کا تقاضا ہوتا ہے اور مصائب کو انسانوں کی طرف، کیونکہ یہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

پہلے بھی ہم یہ نکتہ بتا چکے ہیں کہ اس قسم کی آیات میں لفظ "انسان" کی تعبیر "غیر تربیت یافتہ انسانوں کے مزاج کی طرف اشارہ ہوتی ہے جن کی فکر کوتاہ اور روح کمزور اور پست ہوتی ہے اور آیت بالا میں اس کا تکرار اسی معنی کی تاکید کے لیے ہے۔

پھر اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے کہ اس دنیا میں ہر طرح کی نعمت اور رحمت خدا کی طرف سے ہے اور کوئی شخص از خود کسی بھی چیز کا مالک نہیں ہے ایک کلی مسئلہ اور اس کے واضح مصداق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: آسمانوں اور زمین کی ملکیت اور حکومت خدا ہی کے لیے ہے، وہ جو چاہے پیدا کرے (لله ملک السماوات والارض یخلق ما یشاء)۔

اسی وجہ سے سب اس کے خوان نعمت کے ریزہ خوار ہیں اور اسی کی مہربانی اور رحمت کے نیاز مند، اسی لیے نہ تو نعمت کے موقع پر غرور کوئی عقلمندی کی بات ہے اور نہ ہی مصیبت کے وقت مایوسی۔

اس حقیقت کا کہ کوئی شخص از خود کسی بھی چیز کا مالک نہیں جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے کا ایک واضح نمونہ یہ ہے کہ "جسے چاہے لڑکی عطا کر دے اور جسے چاہے لڑکا دے دے" (یھب لمن یشاء اناثا و یھب لمن یشاء الذکور)۔

"یا اگر چاہے تو لڑکا اور لڑکی دونوں دے دے اور جسے چاہے بانجھ اور بے اولاد بنا دے" (او یزوجھم ذکرانا و اناثا و یجعل من یشاء عقیمًا)۔

تو اس لحاظ سے لوگ چار حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ جن کے ہاں صرف لڑکا ہے اور وہ بیٹی کے خواہش مند ہیں۔ دوسرے وہ جن کے ہاں صرف لڑکی ہے اور لڑکے کے خواہش مند ہیں، تیسرے وہ جن کے ہاں دونوں ہیں اور چوتھے وہ جو ان دونوں سے محروم ہیں اور ان کا دل اولاد کی آرزو میں تڑپ رہا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ نہ تو گزشتہ دور میں اور نہ ہی آج کے سائنسی اور ترقی یافتہ دور میں کسی شخص کو اس بارے میں انتخاب کی قدرت حاصل ہے اور تمام تر کوششوں کے باوجود آج تک کوئی بھی شخص حقیقی معنوں میں بانجھ عورت کو بچہ جننے کے قابل نہیں بنا سکا اور نہ ہی اولاد کی نوع کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اگرچہ بعض غذاؤں یا دواؤں کی وجہ سے لڑکے یا لڑکی کی پیدائش کے امکان میں اضافے کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ صرف امکان اور احتمال کی حد تک ہی

ہوتا ہے کسی چیز کا قطعی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ ان آیات میں "اناث" (لڑکیوں) کو "ذکور" (لڑکوں) پر مقدم کیا گیا ہے تاکہ ایک تو اس اہمیت کو بیان کیا جائے جو اسلام نے عورتوں کو عطا فرمائی ہے اور دوسرے یہ کہ جو لوگ غلط تصور کی بنا پر لڑکیوں کی پیدائش کو ناپسند کرتے ہیں انہیں ذہن نشین کرا دے کہ وہ (خدا) تمہاری مرضی کے خلاف ایسی اولاد عطا کرتا ہے جسے تم پسند نہیں کرتے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اولاد کا انتخاب تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔

"یھب" (عطا کرتا ہے) کی تعبیر اس بات کی روشن دلیل ہے کہ جس طرح لڑکے خدا کا عطیہ ہوتے ہیں اسی طرح لڑکیاں بھی اسی کا عطیہ ہیں اور ان میں فرق سمجھنا ایک سچے مسلمان کے لیے صحیح نہیں ہے کیونکہ دونوں خدائی "ھبہ" (عطیہ) ہیں۔

یہاں پر "یزوجھم" کا لفظ "تزویج" کے معنی میں نہیں ہے بلکہ انسانوں کے لیے ان دو نعمتوں کو ملا کر دینے کے معنی میں ہے۔ بالفاظ دیگر "تزویج" کا لفظ بعض اوقات دو مختلف چیزوں یا دو مختلف جنسوں کو اکٹھا کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ کیونکہ اصل میں "زوج" دو ایسی چیزوں یا دو شخصوں کے جوڑے کے معنی میں آتا ہے جو ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوں۔ بعض مفسرین نے لڑکوں اور لڑکیوں کی بالترتیب اور پے در پے پیدائش کے معنی میں لیا ہے جب کہ بعض نے جڑواں بچوں کی پیدائش کے معنی کئے ہیں یعنی ایک لڑکا اور دوسری لڑکی۔

لیکن مندرجہ بالا تفاسیر پر آیت میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ معانی ظاہر آیت کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں کیونکہ آیت تیسرے گروہ کی خبر دینا چاہتی ہے جن کے ہاں لڑکے بھی ہیں اور لڑکیاں بھی۔

بہر حال یہ صرف اولاد کی پیدائش ہی کی بات نہیں بلکہ ہر چیز پر خدا کی مشیت مطلقاً حکم فرما ہے اور وہ ایسا حاکم ہے جو قادر بھی ہے اور آگاہ و حکیم بھی جس کا علم اور قدرت ساتھ ساتھ ہیں۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے: وہ دانا و قادر ہے (انہ علیم قدیر)۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ رہے کہ لفظ "عقیم" "عقم" (بروزن "بخل"، یا بروزن "فھم") کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ایسی خشکی اور یبوست ہے جو کسی بھی اثر کو قبول کرنے سے مانع ہوتی ہے اور "عقیم عورتیں" ان عورتوں کو کہا جاتا ہے جن کا رحم، مرد کا نطفہ قبول کرنے یا بچے کو اپنے اندر پرورش دینے کے لیے آمادہ نہ ہو اور عقیم ہواؤں کو اس لیے عقیم کہا جاتا ہے کہ وہ بارش برسانے والے بادلوں کو آپس میں نہیں جوڑ سکتیں نیز روز عقیم اس دن کو کہا جاتا ہے جس میں کسی قسم کی مسرت اور خوشی نہ ہو جب کہ قیامت کو "یوم عقیم" کے عنوان سے اس لیے یاد کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بعد کوئی اور دن نہیں ہے کہ جس میں گذشتہ اعمال کی تلافی کی جا سکے۔

اور جس غذا کے تمام جراثیم ختم کر دیئے گئے ہوں اسے "معقم" کہتے ہیں کیونکہ یہ ضرر رساں چیزیں اس میں پرورش نہیں پاتیں۔

۵۱- وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ○

ترجمہ

۵۱- کسی انسان کے لائق یہ بات نہیں ہے کہ خدا اس سے باتیں کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ اپنے کسی پیغامبر کو بھیجتا ہے اور وہ حکم خدا کے مطابق جو کچھ اللہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے کیونکہ وہ بلند مرتبہ اور حکمت والا ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک شان نزول بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر عرض کی "آپ، خدا کے ساتھ براہ راست باتیں کیوں نہیں کرتے ؟ اسے اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے ؟ اگر آپ نبی ہیں تو جیسے موسیٰ نے خدا سے گفتگو کی ہے اور اسے دیکھا ہے تو آپ کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے، ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ یہی کام انجام نہیں دیں گے! یہ سن کر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا "موسیٰ علیہ السّلام نے خدا کو کبھی نہیں دیکھا" اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی کہ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انبیاء کا رابطہ اللہ سے کن ذرائع سے ہوتا ہے[1]۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۸۵۵۔

تفسیر

انبیاء کے خدا کے ساتھ رابطے کے ذرائع

جیسا کہ سورت کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے کہ اس سورت میں زیادہ تر وحی و نبوت جیسے مسئلہ پر زور دیا گیا ہے، سورت کا آغاز بھی وحی کے مسئلہ کے ساتھ ہوا اور اس کا اختتام بھی اسی مسئلہ پر ہو رہا ہے۔

گزشتہ آیات میں خدائی نعمتوں کا تذکرہ تھا لیکن ان آیات میں عالم انسانیت میں پروردگار کی تمام نعمتوں میں سے اہم ترین نعمت اور تمام مہربانیوں میں سے بالاترین مہربانی وحی اور انبیاء کے خدا کے ساتھ رابطے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

پہلے تو فرمایا گیا ہے: کسی بھی انسان کے لائق نہیں ہے کہ خدا اس سے باتیں کرے اور اس کے آمنے سامنے آئے، کیونکہ وہ جسم و جسمانیت سے منزہ اور مبرا ہے مگر اس کے دل پر وحی اور مخفیانہ ہر آیت کے ذریعے (وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیًا)۔

"یا پردے کے پیچھے سے" خدا کی باتیں سننے کے ذریعے (او من وراء حجاب)۔

جیسے حضرت موسیٰ بن عمران کوہ طور پر خدا سے باتیں کیا کرتے تھے اور جواب بھی سنا کرتے تھے۔ یہ باتیں صوتی لہروں کے ذریعے پیدا ہوتی تھیں جنہیں خدا فضا میں ایجاد کر دیتا تھا اور وہ خود خدا کو نہیں دیکھا کرتے تھے کیونکہ وہ دکھائی دینے والا نہیں ہے۔

"یا کوئی پیغامبر بھیجنے کے ذریعے کہ جو اس تک خدا کا پیغام پہنچائے" (او یرسل رسولًا)۔

جس طرح کہ وحی کا فرشتہ اور خدا کا قاصد "جبرائیل امین" پیغمبر اسلام پر نازل ہوتا تھا۔

"اس وقت خدا کا بھیجا ہوا حکم پروردگار کے مطابق جو کچھ خدا چاہتا ہے اس کے پیغمبر پر وحی کرتا ہے" (فیوحی باذنہ ما یشاء)۔

جی ہاں! خدا کا اپنے بندوں کے ساتھ گفتگو کا ذریعہ ان تین راستوں کے علاوہ اور کوئی نہیں "کیونکہ وہ بلند مرتبہ اور صاحب حکمت ہے" (انہ علیٌّ حکیم)۔

اس کی شان اس سے بالاتر ہے کہ وہ دیکھا جائے یا زبان کے ساتھ بات کرے اور اس کے تمام افعال حکیمانہ ہیں اور اس کا اپنے انبیاء کے ساتھ رابطہ حساب و کتاب پر مبنی ہے۔

یہ آیت ان لوگوں کے لیے ایک واضح جواب ہے جو شاید اپنی بے خبری کی بنا پر یہ خیال کریں کہ وحی کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء کرام خدا کو دیکھتے ہیں اور اس کے ساتھ باتیں کرتے ہیں چنانچہ اس آیت نے وحی کی حقیقت اور روح کو خلاصے کی صورت میں اور جچے تلے الفاظ کے ساتھ منعکس کر دیتا ہے۔

آیت سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انبیاء کا خدا کے ساتھ رابطہ ان تین ذریعوں ہی میں منحصر ہے:

۱۔ دل پر القاء: ایسا بہت سے انبیاء کے ساتھ ہوتا تھا جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

فَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡهِ اَنِ اصۡنَعِ الۡفُلۡكَ بِاَعۡیُنِنَا وَ وَحۡیِنَا

ہم نے نوح کی طرف وحی کی کہ ہمارے سامنے اور ہمارے حکم کے مطابق کشتی تیار کرو۔

(مؤمنون / ۲۷)

۲۔ پردہ کے پیچھے سے: جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خدا نے کوہ طور پر باتیں کیں۔ چنانچہ فرماتا ہے:

وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِیۡمًا (نساء ۔ ۱۶۴)

بعض مفسرین نے "من وراء حجاب" میں سچے خوابوں کو بھی شمار کیا ہے۔

۳۔ پیغامبروں کو بھیج کر: جس طرح کہ اسلام کے عظیم پیغمبرؐ کے بارے میں ہے:

قُلۡ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِیۡلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلۡبِكَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ

کہہ دے جو شخص جبرائیل کا دشمن ہے (وہ خدا کا دشمن ہے) کیونکہ اس نے خدا کے حکم سے قرآن تیرے دل پر اتارا ہے۔ (بقرہ / ۹۷)

البتہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کا نزول صرف اسی طریقے سے نہیں تھا بلکہ اور بھی طریقوں سے آپ پر وحی نازل ہوتی تھی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ دل پر القاء کے ذریعے وحی کا نزول کبھی بیداری کی صورت میں انجام پاتا تھا جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے اور کبھی نیند میں رؤیائے صادقہ کے ذریعے عمل میں آتا تھا۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جناب اسماعیلؑ کے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ (ہر چند کہ بعض مفسرین نے اسے "من وراء حجاب" کا ایک مصداق شمار کیا ہے)۔

اگرچہ نزول وحی کی اصل قسمیں وہی تین ہیں جو مذکورہ بالا آیت میں مذکور ہو چکی ہیں لیکن ان تینوں قسموں میں سے بعض کی کئی فروعی قسمیں بھی ہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات کا عقیدہ ہے کہ فرشتے کے ذریعے وحی کا نزول بذات خود مندرجہ ذیل چار طریقوں سے عمل میں آتا تھا:

(۱) فرشتہ پیغمبر پر ظاہر ہوئے بغیر وحی ان کی روح میں القاء کر دیتا تھا۔ جیسا کہ خود رسولؐ اسلام ارشاد فرماتے ہیں:

ان روح القدس نفث فی روعی انه لن تموت نفس حتی تستکمل رزقها فاتقوا الله واجملوا فی الطلب

روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا جب تک اپنی روزی مکمل طور پر نہ لے لے۔ اسی لیے تم خدا سے ڈرتے رہو اور روزی طلب کرنے

میں حریص نہ ہو۔

(۲) کبھی فرشتہ انسانی صورت میں ظاہر ہوتا تھا اور نبی کو مخاطب کر کے اس پر وحی کرتا تھا۔ جیسا کہ جبرائیلؑ کے بارے میں حدیثیں ہیں کہ وہ دحیہ کلبی کی صورت ظاہر ہوتے تھے۔[1]

(۳) کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وحی کا نزول گھنٹی کی سی آواز پیدا ہونے کے ساتھ شروع ہو جاتا تھا اور یہ پیغمبر اکرمؐ پر وحی کے نزول کی سخت ترین صورت تھی۔ حتیٰ کہ جب ایسا ہوتا تو سخت سردی کے دنوں میں بھی آپ کی پیشانی اور چہرہ پسینے سے شرابور ہو جاتا تھا۔ اگر کسی سواری پر سوار ہوتے تو سواری اس قدر بوجھل ہو جاتی تھی کہ بے اختیار زمین پر بیٹھ جاتی۔

(۴) کبھی جبرائیل اپنی اس اصلی صورت میں ظاہر ہوتے تھے جس میں خدا نے انہیں پیدا کیا ہے اور یہ صورت حال آنحضرتؐ کی ساری زندگی میں صرف دو بار پیش آئی (جیسا کہ آگے چل کر سورۂ نجم کی ۱۳ویں آیت کی تفسیر میں بیان ہوگا)۔[2]

چند نکات

۱۔ وحی قرآن اور سنت کی روشنی میں: جیسا کہ راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں وحی کا اصل معنیٰ "تیزی کے ساتھ اشارہ ہے۔ خواہ وہ رمز یہ کلام کے ذریعے ہو یا لفظی ترکیب سے خالی آواز کی صورت میں، یا (ہاتھ، آنکھ اور سر جیسے) اعضاء کے ذریعے یا تحریر کے ذریعہ"۔

ان تعبیرات سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ وحی میں دو چیزیں مخفی ہیں ایک اشارہ اور دوسرے تیزی۔ اسی لیے انبیاء کے عالم غیب اور خدا کی ذات سے مرموز اور سریع رابطے کے لیے اسی کلمے کا انتخاب کیا گیا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث معصومینؑ میں لفظ "وحی" کو مختلف معانی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ کبھی انبیاء کے بارے میں، کبھی دوسرے انسانوں کے بارے میں، کبھی انسانوں کے باہمی روابط کے بارے میں، کبھی شیاطین کے مرموز باہمی رابطوں کے بارے میں اور کبھی حیوانات کے بارے میں۔

اس بارے میں سب سے زیادہ جامع گفتگو امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی وہ گفتگو ہے جو آپؑ نے ایک شخص کے وحی کے بارے میں سوال کے جواب میں ارشاد فرمائی۔ اس گفتگو میں امام علیہ السلام نے وحی کو سات قسموں پر تقسیم فرمایا:

---

[1] "دحیہ بن خلیفہ کلبی" پیغمبر اسلامؐ کے رضاعی بھائی تھے اور اپنے زمانے کے خوبصورت ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے جب جناب پیغمبرؐ کے پاس جبرائیل آتے تھے تو ان کی صورت اختیار کر کے آتے تھے۔ (مجمع البحرین مادہ "دحی") ان کا شمار پیغمبر اکرمؐ کے مشہور صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ خوبصورت لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ آنحضرت نے ۶ھ یا ۷ھ میں انہیں اپنا قاصد بنا کر قیصر روم ہرقل کے پاس بھیجا تھا۔ وہ معاویہ کی خلافت کے زمانے تک زندہ رہے۔ (ملاحظہ ہو لغتنامہ دہخدا)

[2] تفسیر فی ظلال القرآن جلد، ص ۳۰۶۔

(۱) وحی رسالت و نبوت : جیسے قرآن مجید میں ہے :

انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ واوحینا الیٰ ابراھیم واسماعیل واسحاق ویعقوب والاسباط وعیسٰی وایوب ویونس وھارون وسلیمان و اٰتینا داؤد زبورًا

ہم نے تیری طرف ویسے ہی وحی بھیجی جیسے نوح اور ان کے بعد دوسرے انبیاء کی طرف وحی بھیجی تھی اور ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اسباط (بنی اسرائیل کے طائفوں) عیسٰی، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی تھی اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کی۔[1]

(۲) وحی بمعنی الہام و ہدایت : جیسے قرآن مجید میں ہے :

وَاَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ

اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف الہام کیا۔[2]

(۳) وحی بمعنی اشارہ : جیسے قرآن مجید میں ہے :

فخرج علی قومہ من المحراب فاوحٰی الیھم ان سبحوا بکرۃً وعشیًّا

زکریا نے محراب عبادت سے باہر کے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ صبح و شام خدا کی تسبیح کیا کرو۔[3]

(۴) وحی بمعنی تقدیر : جیسے قرآن میں ہے :

واوحٰی فی کل سماءٍ امرھا

خدا نے ہر آسمان میں تقدیر اور تدبیر کو لازم فرمادیا ہے۔[4]

(۵) وحی بمعنی امر : جیسے قرآن میں ہے :

واذ اوحیت الی الحواریین ان اٰمنوا بی وبرسولی

اس وقت کو یاد کرو جب میں نے حواریوں کو حکم دیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ۔[5]

---

[1] سورۂ نساء آیت ۱۶۳۔

[2] سورۂ نحل آیت ۶۸۔

[3] سورۂ مریم آیت ۱۱۔

[4] سورۂ حم سجدہ آیت ۱۲۔

[5] مائدہ ۔ ۱۱۱۔

(۶) وحی بمعنی جھوٹ بولنا : جیسے قرآن میں ہے :

وکذالك جعلنا لکل نبی عدوًّا شیاطین الانس والجن یوحی بعضهم الیٰ بعض زخرف القول غرورًا

اسی طرح ہم نے ہر نبی کے مقابلے میں انسانوں اور جنوں کے شیطانوں میں سے ایک نیا ایک دشمن قرار دیا کہ وہ شیاطین جھوٹ اور فریب پر مبنی باتوں کو ایک دوسرے تک مخفی طور پر پہنچاتے ہیں لہ

(۷) وحی بمعنی خبر : جیسے قرآن میں ہے :

وجعلناهم ائمة یهدون بامرنا واوحینا الیهم فعل الخیرات

اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا جو ہمارے فرمان کے مطابق ہدایت کیا کرتے تھے اور ہم نے انہیں نیک کاموں کے بجالانے کی خبر دی ۲ہ، ۳ہ

البتہ ان سات قسموں میں سے کچھ ایسی بھی ہیں جن کی اور قسمیں بھی بن سکتی ہیں جنکی رو سے کتاب وسنت میں وحی کے استعمال کے موارد زیادہ ہو جائیں گے۔ اسی لیے تفلیسی نے کتاب وجوہ القرآن میں وحی کی دس قسمیں شمار کی ہیں بلکہ بعض علماء نے دس سے بھی زیادہ اقسام بتائی ہیں۔

لیکن ایک لحاظ سے وحی اور اس کے مشتقات کے مقامات استعمال سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پروردگار عالم کی طرف سے وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وحی تشریعی اور دوسری وحی تکوینی۔

وحی تشریعی وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی تھی اور ان کے اور خدا کے درمیان یہ ایک رابطہ تھا جس سے وہ احکام وفرامین الٰہی اور حقائق وصول کیا کرتے تھے۔

اور **وحی تکوینی** درحقیقت وہ خاص تکوینی جبلتیں، استعداد، شرائط اور قوانین ہیں جو خدا نے کائنات کی مختلف موجودات کے اندر مقرر کر دیئے ہیں۔

۲۔ **وحی کی اسرار آمیز حقیقت** : وحی کی ماہیت کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مخفی اور مرموز رابطہ ہمارے ادراک کی حدود سے خارج ہے لہٰذا یہ سب بیانات بھی مسئلے کو صحیح صورت میں اور واضح طور پر بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو غلط راستے کی نشاندہی بھی کرتے ہیں درحقیقت جو کہنے کی بات تھی وہ تو خلاصے کے طور پر خوبصورت انداز میں زیر تفسیر آیت میں بیان ہو چکی ہے اور اس بارے میں علماء کی بہت زیادہ کوشش بھی کسی نتیجے پر نہیں

لہ انعام - ۱۱۲۔

۲ہ انبیاء - ۷۳۔

۳ہ بحار الانوار جلد ۱۸ صفحہ ۲۵۴۔

پہنچی۔ لیکن پھر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر قدیم اور جدید فلاسفہ کی ان تفاسیر کو پیش کیا جائے جو انہوں نے وحی کے بارے میں کی ہیں۔

الف: **بعض قدیم فلاسفہ کی تفسیر**

بعض قدیم فلسفی تفصیلی مقدمات کی بنا پر اس بات کے معتقد تھے کہ وحی نام ہے نفس پیغمبر کے "عقل فعال" کے ساتھ انتہائی زیادہ اتصال کا کہ جس عقل کا سایہ "مشترک حس" اور "خیال" پر بھی چھایا ہوا ہے۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ

① انسانی روح میں تین قوتیں پائی جاتی ہیں۔

(i) حس مشترک

(ii) قوۂ خیال

(iii) قوۂ عقل

(i) حس مشترک وہ ہوتی ہے جس کے ذریعے انسان محسوس چیزوں کا ادراک کرتا ہے۔

(ii) قوۂ خیال وہ ہوتی ہے جس کے ذریعے انسان جزئی صورتوں کا ادراک کرتا ہے۔

(iii) قوۂ عقل وہ ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ کلی صورتوں کا ادراک کرتا ہے۔

② وہ نو بطلیموسی افلاک پر بھی عقیدہ رکھتے تھے اور ان افلاک کے لیے "نفس مجرد" (جس طرح ہمارے بدن کے لیے روح کی حیثیت ہوتی ہے) کے بھی قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ فلکی نفوس، مجرد موجودات کے جن کا نام "عقول" ہے سے ہدایت پاتے ہیں۔ اس طرح سے وہ نو افلاک کے ساتھ نو عقول کے ارتباط کے قائل تھے۔

③ ان کا عقیدہ تھا کہ انسانی نفوس اور ارواح کو اپنی استعدادات اور صلاحیتوں کو عملی وجود میں لانے اور حقائق کا ادراک کرنے کے لیے "مجرد وجود" سے کسب فیض کرنا چاہیئے جسے وہ "عقل فعال" کا نام دیتے تھے۔ اس کا نام تو "دسویں عقل" "عقل عاشر" تھا لیکن اسے "عقل فعال" اس لیے کہتے تھے کہ وہ جزئی عقول کی صلاحیتوں کو عملی صورت عطا کرنے کا سبب تھی۔

④ ان کا نظریہ تھا کہ انسان کی روح جس قدر قوی ہوگی، عقل فعال سے اس کا رابطہ اور اتصال اتنا ہی زیادہ ہوگا کہ جو معلومات کا منبع اور خزانہ ہے۔ اسی لیے ایک قوی اور کامل روح انتہائی کم مدت میں حکم الٰہی کے مطابق عقل فعال سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکتی ہے۔

اسی طرح قوت خیال جس قدر قوی ہوگی ان مطالب کو حسی صورتوں میں اسی قدر زیادہ سے زیادہ ڈھال سکے گی۔ اور حس مشترک جتنی زیادہ قوی ہوگی انسان اتنا ہی زیادہ خارج میں موجود محسوس چیزوں کا ادراک کر سکے گا۔

پھر وہ ان تمام مقدمات سے یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ پیغمبر کی روح چونکہ انتہائی زیادہ قوی ہوتی ہے اور اس کا "عقل فعال" کے ساتھ رابطہ اور اتصال بہت قوی ہوتا ہے اسی لیے وہ اکثر اوقات، معلومات کو کلی صورت میں "عقل فعال" سے حاصل کر سکتا ہے۔

نیز نبی کی قوت خیال بھی چونکہ زبردست قوی ہوتی ہے اور ساتھ ہی قوت عقل کے تابع ہوتی ہے لہٰذا "عقل فعال" سے حاصل ہونے والی محسوس اور مناسب صورتوں کو وہ ان کلی صورتوں کے حوالے کرسکتا ہے اور اپنے ذہنی افق میں انہیں حسّی لباس میں دیکھ سکتا ہے۔ مثلاً اگر وہ کلی حقائق، معانی اور احکام کی قسموں سے ہیں تو انہیں نہایت ہی موزوں اور نہایت ہی فصیح و بلیغ الفاظ میں کسی شخص کی زبان سے نہایت ہی مکمل صورت میں سن سکتا ہے۔

نیز چونکہ اس کی قوت خیال کو اس کی حس مشترک پر مکمل تسلط حاصل ہوتا ہے لہٰذا وہ ان صورتوں کو محسوسیت کے سانچے میں ڈھال سکتی ہے اور نبی اس شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے اور اس کی باتوں کو اپنے کانوں سے سن سکتا ہے۔

تنقید و تبصرہ : یہ سب تصریحات ایسے مقدمات پر مشتمل ہیں جن میں سے اکثر آج مسترد کئے جا چکے ہیں، ان مسترد شدہ مقدمات میں سے نو افلاک اور ان سے متعلقہ عقول اور نفوس کا بطلیموسی نظریہ بھی ہے، جسے آج قصے کہانیوں سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے اثبات پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ ان کے خلاف دلائل موجود ہیں۔

اور ساتھ ہی یہ مفروضہ، وحی کے بارے میں قرآن کی واضح آیات کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ قرآنی آیات صراحت کے ساتھ وحی کو خدا کے ساتھ ایک طرح کا رابطہ بتاتی ہیں جو کبھی تو دل پر الہام، کبھی فرشتۂ وحی کے نزول اور کبھی صوتی لہروں کے سننے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور ان کا یہ اعتقاد کہ یہ سب کچھ قوت خیال اور حس مشترک کی فعالیت کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے، بالکل بے بنیاد اور قرآنی تصریحات کے یکسر منافی ہے۔ اس عقیدے کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے نبی کو بھی فلاسفہ اور دوسرے نابغہ روزگار لوگوں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ البتہ نبی کو ان سے زیادہ طاقتور عقل اور زبردست روح کا مالک مانا جاتا ہے۔ جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ وحی کا راستہ کچھ اور ہے اور عقلی ادراکات کا راستہ کچھ اور۔ اس قسم کے فلاسفہ نے سوچے سمجھے بغیر وحی اور نبوت کی بنیادوں کو بگاڑ کر رکھ دیا اور حقیقت انہیں سمجھ نہ آئی تو یوں افسانہ بنا دیا۔ اس کی مزید تشریح آئندہ گفتگو میں پیش کی جائے گی۔

ب : وحی کے بارے میں جدید فلاسفہ کیا کہتے ہیں ؟

فلاسفہ کا یہ گروہ بطور خلاصہ وحی کو "باطنی شعور" یا "ناآگاہ شعور" کا ایک مظہر سمجھتے ہیں۔

بیسویں صدی کے انسائیکلوپیڈیا میں "وحی" کے مادہ میں لکھا ہے کہ "اہل یورپ سولہویں صدی عیسوی تک دوسری اقوام کے مانند وحی کے قائل تھے کیونکہ ان کی مذہبی کتابیں انبیاء کرام علیہم السلام کی خبروں سے بھری ہوئی تھیں۔ نئے علوم کی آمد سے تمام روحی اور ماوراء طبیعت مباحث پر انہوں نے خط تنسیخ کھینچ دیا اور وحی کا مسئلہ بھی قدیم افسانوں میں شمار ہونے لگا۔

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہی دانشوروں اور اسکالروں کے ذریعے سے روح کی دنیا کا حسّی دلائل سے اثبات کیا جانے لگا اور مسئلہ وحی پھر ایک بار زندہ ہوگیا۔ ان مباحث کی انہوں نے تجربی اور عملی بنیادوں پر تحقیق کی اور ایسے نتائج پر پہنچے جو اگرچہ مسلم دانشوروں کے نظریے سے تو مختلف تھے لیکن ایک اہم موضوع کے اثبات کی جانب اسے ایک اہم اقدام ضرور سمجھا جانے لگا جسے کل تک خرافات میں شمار کیا جاتا تھا۔

فلاسفہ کے اس گروہ نے روحی مباحث کا مطالعہ کیا اور اب تک (اس انسائیکلوپیڈیا کے زمانے تک) پچاس ضخیم کتابیں مذکورہ موضوع کے بارے میں ان کی طرف سے لکھی جا چکی ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے انہوں نے بہت سے اہم روحی مسائل کو حل کر دیا ہے جن میں سے ایک مسئلہ وحی بھی ہے[1]

اس بارے میں بھی بہت سی باتیں قابل بحث ہیں لیکن ان کی گفتگو کا لب لباب یہی ہے کہ وہ وحی کو "ناآگاہ شعور" کی ایک تجلی سمجھتے ہیں۔ (ناآگاہ شعور کا دوسرا نام مخفی وجدان ہے) جو آگاہ شعور سے کئی درجے زیادہ قوی اور طاقتور ہے اور چونکہ انبیاء عام آدمی نہیں تھے بلکہ غیر معمولی انسان تھے لہٰذا ان کا مخفی وجدان یا ناآگاہ شعور بھی زبردست طاقتور تھا اور اس کے نتائج بھی نہایت اہم اور قابل توجہ تھے۔

تنقید اور تبصرہ: یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ان حضرات نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف ایک مفروضہ ہے اور اس پر کوئی ٹھوس اور وزنی دلیل پیش نہیں کی۔ ان لوگوں نے درحقیقت انبیاء کا نابغہ روزگار اور عظیم شخصیت کے عنوان سے تعارف کروایا ہے۔ نہ کہ اس عنوان سے کہ ان کا عالم ہستی کے مبدا خدا سے کوئی رابطہ ہوتا ہے اور یہ کہ وہ اپنے وجود سے باہر سے علوم حاصل کرتے ہیں۔

ان کی غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے وحی کو بھی اپنے سائنسی معیار پر جانچنے کی کوشش کی ہے اُن کے اس معیار پر جو چیز بھی پوری نہیں اترتی وہ اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ وہ صرف انہیں موجودات عالم تسلیم کرتے ہیں کہ جنہیں وہ درک کرتے ہیں اور جس چیز کو درک نہیں کرتے اسے معدوم سمجھتے ہیں۔

اس قسم کی طرز فکر کے غلط نتائج نہ صرف وحی کے سلسلے میں ظاہر ہوئے ہیں بلکہ اور بھی بہت سے فلسفی اور عقائدی مسائل میں ظاہر ہو چکے ہیں۔ اصولی طور پر اس طرح کے طرز فکر کی بنیاد ہی غلط رکھی گئی ہے کیونکہ وہ کائنات کی تمام موجودات کو مادیت اور اس کے عوارض میں منحصر کر دینے کو کسی دلیل کے ساتھ ثابت نہیں کر پائے۔

ج: نبوغ فکری

بعض اور حضرات مذکورہ دانشوروں سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے ہیں اور انہوں نے وحی کو انبیاء کے نبوغ فکر کا نتیجہ سمجھ لیا ہے اور وہ کہتے ہیں چونکہ انبیاء پاک فطرت اور بالاترین نبوغ کے حامل لوگ تھے لہٰذا وہ انسانی معاشروں کی مصلحتوں کو سمجھتے تھے اسی لیے وہ معارف اور قوانین کی صورت میں انسانوں کے سامنے اپنے افکار کو پیش کیا کرتے تھے۔

درحقیقت اس قسم کی باتیں انبیاء کی نبوت کا صریح انکار اور ان کی باتوں کی کھلی تکذیب ہے اور اس طرح سے انہیں طرح طرح کی کذب بیانی سے متہم کرنے کی کوشش ہے۔ (العیاذ باللہ)

زیادہ واضح الفاظ میں ہم بتا دیں کہ فلاسفہ کی مذکورہ بیان شدہ عبارتوں میں کوئی بھی وحی کی تفسیر نہیں ہے، بلکہ ان کے اپنے مفروضے ہیں جو ان کے افکار و خیالات کی اختراع ہیں چونکہ وہ اپنی معلومات کے ماوراء، دوسرے تمام حقائق کے انکار

---

[1] دائرۃ المعارف قرن بیستم (بیسویں صدی کا انسائیکلوپیڈیا) از فرید وجدی (مادہ وحی)۔

پر تکے ہوئے ہیں لہٰذا ایسی گمراہی کا شکار ہو گئے ہیں۔

وحی کے بارے میں سچی بات

اس میں شک نہیں کہ ہم وحی کے رابطے اور اس کی حقیقت سے کما حقہ واقف نہیں ہیں کیونکہ یہ ایک قسم کا ادراک ہے جو ہمارے ادراکات کی حدود سے باہر ہے اور ایک ایسا رابطہ ہے جو ہماری پہچان کے ذرائع سے خارج ہے، غرض عالم وحی ہمارے لیے ایک نامعلوم اور ہمارے ادراک سے بالاتر عالم ہے۔

سچ مچ ایک خاکی انسان کائنات کے مبدأ سے کس طرح رابطہ پیدا کرتا ہے اور ازلی و ابدی اور بے انتہا خالق اپنی محدود اور ممکن الوجود مخلوق سے رابطہ پیدا کرتا ہے اور نزول وحی کے وقت نبی کو کیسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے رابطہ ہے؟

یہ سب ایسے سوالات ہیں جن کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے اور اس بارے میں اصرار کرنا بھی بے موقع ہے۔

یہاں پر جو بات ہماری عقل میں آتی ہے اور بحث کرنے کے قابل بھی ہے وہ ہے اس قسم کے رمزیہ رابطے کا اصل وجود یا امکان۔ چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جو اس امر کے امکان کی نفی کرے بلکہ اس کے برعکس ہم کائنات میں بہت سے رمزیہ رابطے دیکھتے ہیں لیکن ان کی تفسیر کرنے سے عاجز ہیں اور ایسے رابطے ثابت کرتے ہیں کہ ہمارے حواس اور رابطوں کے مافوق بھی کچھ ادراکات اور ارتباط موجود ہیں۔

مناسب ہوگا اگر ہم یہاں پر ایک مثال کے ذریعے اس بات کی وضاحت کریں۔

فرض کیجیئے کہ آپ ایک ایسے شہر میں رہتے ہیں جس میں تمام (مادر زاد) اندھے رہتے ہیں لیکن ان سب لوگوں میں سے صرف آپ ہی آنکھوں سے دیکھنے والے ہیں۔ اس شہر میں سارے لوگ چار حس والے ہیں (اگر انسان کی ظاہری حسیں پانچ مانیں یعنی حواس خمسہ) صرف آپ ہی ہیں جو حواس خمسہ کے مالک ہیں۔ آپ ہمیشہ اس شہر میں نت نئے واقعات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور ان مشاہدات کو اہل شہر تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ سب اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ مرموز پانچویں حس کیا ہے جس کا دائرہ کار اس قدر وسیع ہے؟ اور آپ جس قدر بھی حس باصرہ کے متعلق وضاحت اور اس کے طریقے کے بارے میں تفصیلی گفتگو کریں بے فائدہ ہے سوائے موہوم سے تصور کے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔

ادھر ایک تو وہ اس کا انکار بھی نہیں کر سکیں گے کیونکہ وہ اس کے مختلف آثار کو محسوس کر رہے ہوتے ہیں اور دوسرے اس کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ بھی نہیں کر پائیں گے کہ بینائی کی حقیقت کیا ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے اپنی ساری زندگی کے دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی بینائی سے کام نہیں لیا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ وحی "چھٹی حس" ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک قسم کا ادراک اور عالم غیب اور خدا کی پاک ذات کے ساتھ رابطہ ہوتا ہے۔ چونکہ ہم اس قسم کے ادراک اور رابطے سے محروم ہیں اس لیے اس حقیقت کا کما حقہ ادراک نہیں کر سکتے۔ صرف اس کے آثار کی وجہ سے اس کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں۔

ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ بڑے عظیم لوگ انسانوں کی طرف ایسی دعوت لے کر آئے جس کے مطالب افکار انسانی

کی پہنچ سے بہت بلند ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دی اور اپنے ساتھ کچھ معجزات بھی لائے جو انسان کے بس کی بات نہیں تھے البتہ ان سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان انبیاء کا عالم غیب سے رابطہ ہے۔ آثار ظاہر ہیں لیکن حقیقت امر مخفی ہے۔

کیا ہم نے کائنات کے تمام رازوں سے پردہ اٹھا لیا ہے اور صرف وحی کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں اس لیے اس کا انکار کرتے ہیں ؟

جب کہ ابھی تک تو ہم جانوروں کے مرموز طریقہ کار کے سمجھنے اور اس کی تفسیر کرنے سے عاجز ہیں۔ آیا ان مہاجر پرندوں کی اسرار آمیز زندگی ہم پر روشن ہو چکی ہے جو بعض اوقات سالانہ اٹھارہ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے قطب جنوبی سے قطب شمالی تک اور قطب شمالی سے قطب جنوبی تک جا پہنچتے ہیں ؟

ہمیں تو آج تک اس بات کا پتہ بھی نہیں چل سکا کہ وہ سمت کی پہچان کیونکر کرتے ہیں ؟ راستے کو صحیح طور پر کس طرح پہچانتے ہیں ؟ دن رات، روشنی اور تاریکی میں دور دراز کا سفر کس طرح طے کرتے ہیں ؟ جب کہ اگر ہم یہ سفر فنی وسائل اور راہ شناس کی مدد کے بغیر طے کرنا شروع کریں تو اس کا ایک فیصد فاصلہ طے کئے بغیر گم ہو جائیں۔ یہ ایک ایسا راز ہے جس سے علم و دانش، سائنس اور ٹیکنالوجی نے ابھی تک پردہ نہیں اٹھایا۔

اسی طرح سمندروں کی گہرائیوں میں مچھلیوں کے غول کے غول بستے ہیں جو عام طور پر انڈے دینے کے لئے ہزاروں میلوں کا فاصلہ طے کر کے اپنی اصل پیدائش گاہ کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ وہ اپنی اصل پیدائش گاہ کو اس آسانی کے ساتھ کیسے پا لیتے ہیں ؟

اس قسم کے مرموز حقائق ہماری اس دنیا میں بے انتہا ہیں اور یہی مرموز حقائق ہمیں وحی کا انکار اور نفی کرنے سے روکتے ہیں اور شیخ الرئیس بو علی سینا کے اس قول کی یاد دلاتے ہیں :

كل ما قرع سمعك من الغرائب فضعه فى بقعة الامكان، لم يذدك عنه قاطع البرهان

اگر عجائبات کے بارے میں تم سنو تو ان کا فوراً انکار نہ کر دو بلکہ انہیں امکانی خطے میں رکھ چھوڑو، جب تک کہ کوئی قاطع دلیل اس کے قبول کرنے سے نہ روکے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ مادہ پرستوں نے مسئلہ وحی کے انکار کے لیے کیا ہاتھ پاؤں مارے ہیں ؟

منکرین وحی کے دلائل

جونہی وحی کے مسئلے کی بات ہوتی ہے تو بعض مادہ پرست بڑی جلدی سے یہ جواب دے دیتے ہیں کہ یہ چیز سائنسی اصول کے خلاف ہے۔

لیکن جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اس کی کونسی چیز سائنسی اصولوں کے خلاف ہے ؟ تو وہ فوراً ہی مغرور ہو کر دو ٹوک انداز میں کہہ دیتے ہیں کہ جن چیزوں کو سائنس نے ثابت نہیں کیا ان کو نہیں مانا جا سکتا وہ کہتے ہیں کہ اصولی طور پر دری چیز

ہمارے لیے قابل قبول ہے جو سائنسی تجربات سے ثابت ہو۔

وہ کہتے ہیں کہ وحی کی بات تو بعد کی ہے، سائنسی تجربات اور تحقیقات سے وہ کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ ابھی انسانی جسم و روح کے بارے میں تحقیقات اور سائنسی مطالعات سے ہمیں کسی ایسی حس مرموز کا پتہ نہیں چلا کہ جو ہمیں عالم ماوراء سے مربوط کرے۔

وہ کہتے ہیں کہ انبیاء بھی ہماری ہی نوع سے تھے ہم کس طرح باور کرسکتے ہیں کہ ان میں ہمارے احساس وادراک سے کوئی مافوق احساس وادراک ہو۔

ہمیشہ کا اعتراض اور ہمیشہ کا جواب

مادہ پرستوں کا یہ طریقہ کار صرف مسئلہ وحی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ ہر ماوراء طبیعت مسئلے کے بارے میں یہی رویہ اختیار کرتے ہیں اور ہم بھی ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے ہمیشہ انہیں یہ کہتے ہیں کہ

یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ علمی قلمرو (البتہ جہاں پر علم کی بات ہوتی ہے وہاں پر ان کی مراد سائنسی اور تجرباتی علوم ہوتے ہیں) یہی مادی دنیا ہے، سائنسی مباحث کے معیار اور آلات یا تو لیبارٹریاں ہیں یا پھر ٹیلی سکوپ، مائیکروسکوپ اور پوسٹ مارٹم کے لیے آپریشن تھیٹر ہیں اور سب ریسرچ اسکالرز اسی محدودے میں اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ علوم اپنے ان آلات اور معیار کے ذریعے کبھی بھی مادی دنیا سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کرتے، نہ تو کسی بیرونی چیز کی نفی کرتے ہیں اور نہ اس کا اثبات۔ اس کی دلیل واضح ہے کہ اس قسم کے آلات اور معیار کی توانائی محدود اور حد کار مخصوص ہے۔

بلکہ سائنس کے آلات اسی چیز کے لیے کارآمد ہیں جس کے لیے وہ بنائے گئے ہیں اور دوسری چیز کے لیے وہ بیکار ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم تپ دق کے جراثیموں کو ستارے دیکھنے والے کسی عظیم ٹیلی سکوپ کے ذریعے دیکھنا چاہیں تو نظر نہیں آئیں گے لیکن اس طرح سے ہم ان جراثیموں کا انکار نہیں کرسکتے۔ یا اگر پلوٹون ستارے کو ہم خوردبین کے ذریعے دیکھنا چاہیں تو وہ نظر نہیں آئے گا لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ ہے ہی نہیں۔

غرض کسی علم کی شناخت کے لیے اسی سے متعلق آلات کا استعمال کیا جاتا ہے اور ماوراء طبیعت کائنات کی شناخت کا آلہ بھی قوی عقلی دلائل کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جو ہمارے لیے اس عظیم کائنات کی راہیں کھولتے ہیں۔

جو لوگ علم کو اس کی قلمرو سے خارج کرتے ہیں درحقیقت نہ تو وہ عالم ہیں اور نہ ہی فیلسوف بلکہ علم کے صرف جھوٹے اور گمراہ دعویدار ہیں۔

ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ کچھ عظیم انسان اس دنیا میں آئے اور انہوں نے ہمارے سامنے ایسے مسائل پیش کئے جو انسانی طاقت سے بالکل باہر ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مادی کائنات سے ماوراء دنیا کے ساتھ ان کا بہت مستحکم رابطہ تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ ان کا یہ رمزیہ رابطہ کس قسم کا تھا؟ تو اس کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں ہے، سب سے اہم بات یہی ہے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس طرح کا رابطہ تھا ضرور۔

مسئلہ وحی کے بارے میں چند حدیثیں

وحی کے بارے میں اسلامی کتب میں بہت ساری حدیثیں وارد ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کا مبدأ وحی کے ساتھ اسرار آمیز رابطہ تھا۔

۱۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرشتے کے ذریعے وحی نازل ہوتی تھی تو اس وقت آپ کی حالت معمول کے مطابق ہوتی تھی لیکن جب براہ راست رابطہ قائم ہوتا تھا تو آپ ایک زبردست بوجھ محسوس کرتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات آپ پر غشی طاری ہو جاتی تھی، جیساکہ شیخ صدوقؒ نے اپنی کتاب "توحید" میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ جب آپؑ سے پوچھا گیا:

ما الغشية التي كانت تصيب رسول الله (ص) اذا نزل عليه الوحي؟
قال ذالك اذا لم يكن بينه و بين الله احد، ذاك اذا تجلى الله له

وہ غشی کیا تھی جو وحی کے موقع پر رسول اللہ پر طاری ہو جاتی تھی؟
تو امامؑ نے فرمایا:
یہ اس وقت ہوتا تھا جب آپ کے اور خدا کے درمیان کسی اور کا واسطہ نہیں ہوتا تھا اور آپ پر براہ راست خدا کی تجلی ہوتی تھی۔[1]

۲۔ جب جناب جبرائیل علیہ السلام حضور گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتے تھے تو نہایت ہی ادب اور احترام کے ساتھ آپؐ کے پاس آتے تھے، جیساکہ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

كان جبرئيل اذا اتى النبيّ قعد بين يديه قعدة العبيد، و كان لا يدخل حتى يستأذنه

جب جبرائیل نبیؐ کی خدمت میں آتے تو آپؐ کے سامنے غلاموں کی طرح بیٹھ جاتے اور بغیر اجازت کے کبھی بھی اندر نہ آتے تھے۔[2]

۳۔ ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ ایک طرح کی توفیق الہٰی (اور باطنی شہود) کے ذریعے جبرائیل کو اچھی طرح پہچان لیتے تھے جیساکہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

ما علم رسول الله ان جبرئيل من قبل الله الا بالتوفيق

رسول اللہ جبرائیل کو توفیق الہٰی کے ذریعے پہچان لیا کرتے تھے۔[3]

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۸ ص ۲۵۶ بحوالہ توحید صدوق۔

[2] بحار الانوار جلد ۱۸ ص ۲۵۶ بحوالہ علل الشرائع۔

[3] بحار الانوار جلد ۱۸ ص ۲۵۶۔

۴۔ ایک اور روایت میں عبداللہ بن عباس سے، نزول وحی کے وقت پیغمبر اسلامؐ پر غشی طاری ہوجانے کی تفسیر یوں بیان ہوئی ہے :

کان النبی اذا نزل علیه الوحی وجد منه الما شدیدًا و یتصدع راسه و یجد ثقلا و ذالك قوله" انا سنلقی علیك قولًا ثقیلًا"، وسمعت انه نزل جبرئیل علی رسول الله ستین الف مرة

جب رسول اللہ پر وحی نازل ہوتی تو آپ اپنے اندر سخت درد محسوس کرتے اور سر مبارک میں بھی درد ہوجاتا اور آپ زبردست بوجھ بھی محسوس کرتے اور یہی وہ چیز ہے جسے قرآن نے بیان کیا ہے کہ" ہم بہت جلد تجھ پر سنگین باتیں القا کریں گے" (عبداللہ کہتے ہیں کہ) میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ کے پاس جبرائیل ساٹھ ہزار مرتبہ نازل ہوئے ہیں[1]

---

[1] بحارالانوار جلد ۱۸ ص ۲۶۱ ۔

۵۲- وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ

۵۳- صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِىْ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۧ

ترجمہ

۵۲- اور جس طرح ہم نے گزشتہ انبیاء کی طرف وحی بھیجی اسی طرح تیری طرف بھی اپنے فرمان سے روح کو وحی کیا، قبل ازیں تجھے معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہے؟ اور ایمان کیا ہے (اور قرآن کے مطالب سے آگاہ نہ تھا) لیکن ہم نے اسے نور بنایا ہے کہ اس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور تو یقیناً سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔

۵۳- اس خدا کا راستہ، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، آگاہ رہو کہ سب چیزوں کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے۔

تفسیر

قرآن، خدا کی طرف سے رُوح ہے

گزشتہ آیت میں وحی کی کلی اور عمومی گفتگو کے بعد، زیر تفسیر آیات میں خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر وحی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس طرح ہم نے گزشتہ انبیاء پر مختلف طریقوں سے وحی نازل کی تجھ پر بھی اپنے فرمان سے

روح کو وحی کیا (وکذالك اوحینا الیك روحًا من امرنا)۔

" کذالك " اسی طرح کی تعبیر سے ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ گزشتہ آیت میں وحی کی جو تین قسمیں بیان ہوئیں ان سب صورتوں میں تجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ کبھی تو براہ راست تیرا پروردگار کی پاک ذات سے رابطہ پیدا ہوا ہے، کبھی وحی کے فرشتے کے ذریعے اور کبھی صوتی لہروں سے ملتی جلتی آواز کے ذریعے، جیسا کہ روایات میں بھی ان تینوں قسموں کی طرف اشارہ ہوا ہے اور گزشتہ آیت کی تفسیر میں ہم تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کر چکے ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت میں مذکور " روح " سے کیا چیز مراد ہے؟ تو اس بارے میں مفسرین کے دو نظریے ہیں۔

ایک یہ کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے جو قلب و روح کی زندگی کا سبب ہے، اسی قول کو اکثر مفسرین نے اپنایا ہے[1]

راغب بھی مفردات میں یہی کہتے ہیں کہ :

سمی القراٰن روحًا فی قولہ وکذالك اوحینا الیك روحًا من امرنا و ذالك لکون القراٰن سببًا للحیٰوۃ الاخرویۃ

قرآن کو " وکذالك اوحینا ...." کی آیت میں روح کے نام سے یاد کیا گیا ہے، کیونکہ وہ اخروی زندگی کا سبب ہے۔

یہ معنی آیت میں موجود مختلف قرائن کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ جیسے " کذالك " کا کلمہ ہے جو مسئلہ وحی کی طرف اشارہ ہے اور " اوحینا " کا کلمہ ہے، اسی طرح اور بھی کلمات ہیں جو اسی آیت میں ذکر ہوئے ہیں۔

اگرچہ قرآن کی دوسری آیات میں " روح " کا لفظ زیادہ تر دوسرے معانی کے لیے آیا ہے لیکن مندرجہ بالا قرائن کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت میں موجود روح کا ظاہری معنی قرآن مجید ہے۔

سورۂ نحل کی دوسری آیت " ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علیٰ من یشاء من عبادہ " کی تفسیر میں بھی ہم بتا چکے ہیں کہ قرائن کی رو سے " روح " وہاں بھی " قرآن، وحی اور نبوت " کے معنی میں ہے اور حقیقت میں دونوں آیات ایک دوسرے کی تفسیر کر رہی ہیں۔

قرآن مانند روح کیوں نہ ہو جب کہ سورۂ انفال کی ۲۴ویں آیت میں ہے :

یا ایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم

اے ایماندارو ! خدا اور اس کے رسول کے بلاوے کا جواب دو جب وہ تمھیں ایسی چیزوں کی طرف بلائیں جو تمھاری زندگی کا سبب ہیں۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان میں طبرسی نے، تبیان میں شیخ طوسی نے، تفسیر کبیر میں فخر رازی نے، تفسیر مراغی میں مراغی نے اور دوسرے بہت سے مفسرین نے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہاں پر "روح" سے مراد "روح القدس" ہے۔ (یا وہ فرشتہ جو جبرائیل اور میکائیل سے بھی بڑا ہے اور ہمیشہ رسول اسلامؐ کے ہمراہ رہا ہے)۔

تو اس تفسیر کے مطابق "اوحینا" کا معنی "انزلنا" بنے گا، یعنی "روح القدس" یا وہ عظیم فرشتہ ہم نے تجھ پر نازل کیا۔ (اگرچہ قرآن مجید میں کسی اور مقام پر "اوحینا" "انزلنا" کے معنی میں نہیں دیکھا گیا)۔

بعض روایات سے بھی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ پہلی تفسیر آیت میں موجود متعدد قرائن کے لحاظ سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ ایسی روایات جن میں روح کی تفسیر "روح القدس" یا خدا کے بلند مقام فرشتے سے کی گئی ہے ان میں آیت کے باطنی معنی کی طرف اشارہ ہو۔

بہرحال سلسلہ آیت کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس سے پہلے تو کتاب اور ایمان سے آگاہ نہیں تھا لیکن ہم نے اسے ایسا نور بنایا ہے کہ جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں ہدایت کریں (ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان ولکن جعلناہ نوراً نہدی بہ من نشاء من عبادنا)۔

یہ خدا کی مہربانی تھی جو تیرے شامل حال رہی اور یہ آسمانی وحی تھی جو تجھ پر نازل ہوئی اور تو نے اس کے تمام مطالب کو مان لیا۔

خدا کا ارادہ بھی یہی تھا کہ اس عظیم آسمانی کتاب اور اس کی تعلیمات کے ذریعے وہ تیرے علاوہ اپنے دوسرے بندوں کو بھی اس آسمانی نور کے پرتو میں ہدایت کرے، کائنات کے مشرق و مغرب کو، ہر زمانے میں تا قیام قیامت اس نور کی تابانیوں سے منور فرماتا رہے۔

بعض کج فہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت سے پہلے (معاذ اللہ) خدا پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ جب کہ آیت کا معنی بالکل واضح ہے آیت کہتی ہے کہ قرآن نازل ہونے سے پہلے آپ قرآن کو نہیں جانتے تھے اور اس کے مندرجات اور مطالب سے آگاہ نہیں تھے اور یہ چیز پیغمبر اکرمؐ کے عقیدۂ توحید اور عبادت و بندگی کے اصولوں کے بارے میں انکی اعلیٰ معرفت کے قطعاً منافی نہیں ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ قرآنی مندرجات سے ناآشنائی اور بات ہے اور خدا کی عدم معرفت اور بات ہے۔

دورِ نبوت سے پہلے آنحضرت کے بارے میں جو کچھ تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے وہ بھی اسی بات کا روشن گواہ ہے۔ اور اس سے بڑھ کر روشن بات امیرالمومنین علی علیہ السلام کا وہ کلام ہے جو نہج البلاغہ میں درج ہے: آپؑ فرماتے ہیں:

ولقد قرن اللہ بہ (ص) من لدن ان کان فطیماً اعظم ملک من ملائکتہ یسلک بہ طریق المکارم، و محاسن اخلاق العالم لیلہ و نہارہ:

جب سے پیغمبر اسلامؐ کی دودھ بڑھائی ہوئی، خدا نے اپنے فرشتوں میں سے ایک عظیم فرشتہ آپ کے ساتھ ملا دیا جو شب و روز مکارم اخلاق اور نیک راستوں پر آپؐ کو اپنے ساتھ رکھتا تھا[1]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲ (خطبہ قاصعہ)

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یقیناً تو لوگوں کو، صراط مستقیم کی ہدایت کرتا ہے (و انك لتهدی الی صراط مستقیم)۔

یہ قرآن صرف تیرے لیے نور نہیں بلکہ دوسرے تمام لوگوں کے لیے بھی نور ہے اور صراط مستقیم کی طرف لوگوں کی ہدایت کرتا ہے۔ اور راہ حق پر چلنے والوں کے لیے یہ خدا کا ایک عظیم احسان ہے اور تمام تشنہ کاموں کے لیے آب حیات ہے یہی مفہوم سورۂ حم سجدہ کی چوالیسویں آیت میں آیا ہے البتہ دوسرے لفظوں کے ساتھ:

قل هو للذين اٰمنوا هدًى و شفاء والذين لا يؤمنون فی اٰذانهم وقر

کہہ دے کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت اور شفا کا سبب ہے جو ایمان لائے ہیں اور جو اس پر ایمان نہیں لاتے ان کے کان بہرے ہیں۔

لہٰذا تفسیر کے طور پر "صراط مستقیم" سے مراد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ کی راہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب کی سب اسی کی ہیں" (صراط الله الذی له ما فی السماوات وما فی الارض)۔

اس راہ سے بڑھ کر اور کون سی راہ سیدھی ہوگی جو مبدأ عالم ہستی تک جا پہنچائے؟ اس سے بڑھ کر اور کون سی راہ زیادہ صاف ہوگی جو کائنات کے خالق تک جا پہنچے؟

حقیقی سعادت وہ ہوتی ہے جس کی طرف خدا بلائے اور اس تک پہنچنے کی تنہا دہی راہ ہے جسے اس نے خود منتخب کیا ہے۔

اس آیت کا آخری جملہ جو سورۂ شوریٰ کا آخری جملہ بھی ہے درحقیقت اس معنی کی دلیل ہے کہ راہ مستقیم صرف وہ راہ ہے جو خدا کی طرف جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: آگاہ رہو! سب چیزوں کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے (الا الی الله تصير الامور)۔

چونکہ وہ کائنات کا مالک اور حاکم و مدبر ہے اور چونکہ انسان کے ارتقائی مراحل اسی عظیم مدبر کے زیر عنایت انجام پانے چاہئیں لہٰذا سیدھی راہ وہی ہے جو اسی کی طرف جاتی ہے اور اس کے علاوہ دوسرے تمام راستے گمراہی کے ہیں کیونکہ وہ باطل کی طرف جاتے ہیں۔ آیا اس کی ذات پاک کے علاوہ کچھ اور عالم وجود میں حق ہو سکتا ہے؟

یہ جملہ جہاں پرہیز گاروں کے لیے خوشخبری ہے وہاں ظالموں اور گناہگاروں کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے کہ یاد رکھو تم سب نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل بھی ہے کہ وحی کو صرف خدا ہی کی جانب سے نازل ہونا چاہیئے کیونکہ ہر ایک چیز کی بازگشت اسی کی طرف اور ان کی تدبیر خدا کی طرف سے ہے۔ اسی لیے اسے انبیاء پر نازل ہونے والی وحی کا مبدأ بھی ہونا چاہیے تاکہ صحیح معنوں میں ہدایت انجام پا سکے۔ اس طرح سے ان آیات کا سیاق و سباق ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور مربوط ہے اور سورت کا اختتام بھی اسی کے آغاز کے ساتھ مربوط اور ہم آہنگ ہے اور سب پر ایک ہی طریقہ کار حکم فرما ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ نبوت سے پہلے آنحضرتؐ کس دین پر تھے ؟ : اس بات میں تو شک کی گنجائش ہی نہیں کہ بعثت سے پہلے آنحضرتؐ نے نہ تو کسی بت کو سجدہ کیا اور نہ ہی توحید کی راہ سے سرِ مو انحراف کیا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس دین پر کاربند تھے ؟ تو اس بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ آپ دین مسیحؑ پر تھے، کیونکہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے جو مستقل، قانونی اور غیر منسوخ دین تھا وہ حضرت عیسیٰ مسیحؑ کا دین ہی تھا۔

بعض علماء آپ کو دین ابراہیمی پر کاربند سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جناب ابراہیم شیخ الانبیاء اور ابوالانبیاء تھے اور قرآن کی بعض آیات میں بھی دینِ اسلام کا دین ابراہیم کے نام سے تعارف کروایا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ حج کی ۸۷ ویں آیت میں ہے :

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ

بعض علماء نے اس بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ آپ یقیناً کسی دین پر تو کاربند تھے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کونسا دین تھا ؟

اگرچہ ان احتمالات میں سے ہر ایک کی اپنی جگہ پر دلیل تو ہے لیکن مسلّم کوئی بھی نہیں۔ البتہ ان تینوں اقوال سے ہٹ کر ایک چوتھا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ "آنحضرتؐ خداوند عالم کی طرف سے اپنے لئے ایک خاص پروگرام رکھتے تھے، اور اسی پر عمل پیرا تھے اور درحقیقت یہ ان کی ذات کے لیے مخصوص ایک دین تھا، جب تک کہ اسلام نازل نہیں ہوگیا۔

اس قول پر وہ حدیث شاہد ہے جو نہج البلاغہ میں موجود ہے اور ہم بھی اسے اوپر بیان کر چکے ہیں کہ

"جس وقت سے پیغمبرؐ کی دودھ بڑھائی ہوئی اللہ نے اپنے فرشتوں میں سے ایک عظیم فرشتے کو آپ کے ساتھ ملا دیا، جو شب و روز مکارم اخلاق اور نیک راستوں پر آپ کو اپنے ساتھ رکھتا۔"

اس فرشتے کی ماموریت رسول اللہ کے لیے مخصوص پروگرام کی دلیل ہے۔

اس قول کا ایک اور گواہ یہ ہے کہ کسی بھی تاریخ میں نہیں ملتا کہ پیغمبر اسلامؐ یہود یا نصاریٰ یا کسی اور مذہب کے عبادت خانوں میں عبادت کے لیے تشریف لے گئے ہوں، نہ تو کفار کے ساتھ مل کر کبھی کسی بت خانے میں گئے اور نہ ہی اہل کتاب کے ساتھ کسی عبادت خانے میں ! بلکہ ہمیشہ راہ توحید پر گامزن رہے اور آپ اخلاقی اصولوں اور عبادت الٰہی کے سخت پابند تھے۔

بحار الانوار میں علامہ مجلسیؒ کے مطابق، بہت سی اسلامی روایات اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ اپنی عمر کے آغاز ہی سے روح القدس کے ساتھ مؤید تھے اور اس تائید کے ساتھ یقیناً وہ روح القدس کی راہنمائی کے مطابق عمل کیا کرتے تھے [۱]

---

[۱] بحار الانوار جلد ۱۸، ص ۲۸۸ ۔

علامہ مجلسی ذاتی طور پر اس بات کے معتقد ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ رسالت کے مرتبے پر فائز ہونے سے پہلے مقام نبوت پر فائز تھے، کبھی تو فرشتے آپؐ سے باتیں کیا کرتے تھے اور کبھی آپؐ ان کی آواز سنا کرتے تھے اور کبھی سچے خواب کی صورت میں آپؐ پر خدائی الہام ہوا کرتا تھا۔ چالیس سال کے بعد اعلان رسالت کا حکم ہوا اور اسلام و قرآن باقاعدہ طور پر آپؐ پر نازل ہوئے۔

علامہ مجلسیؒ نے اپنے اس مدعا پر چھ دلائل ذکر کئے ہیں جن میں سے کچھ ان دلائل کے ساتھ ملتے جلتے اور ہم آہنگ ہیں جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے بحار الانوار جلد ۱۸ ص۲۷۷ ملاحظہ فرمائیں۔)

۲۔ **ایک سوال اور اس کا جواب:** اس گفتگو کی روشنی میں یہ سوال پیش آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبل از نبوت ایمان اور اعمال کے بارے میں اگر یہ کچھ ہے تو پھر مندرجہ بالا آیت میں یہ کیوں کہا گیا ہے: ماکنت تدری ماالکتاب و لا الایمان (قبل ازیں تجھے معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے)

اگرچہ اس سوال کا جواب تو کسی حد تک ہم آیت کی تفسیر کے دوران میں ہی دے چکے ہیں لیکن پھر بھی مزید وضاحت کے طور پر اس سوال پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں:

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ نزول قرآن و اسلام سے پہلے حضورؐ اس دین کی تفصیلات اور قرآن مجید کے مضامین سے باخبر نہیں تھے۔

لیکن جہاں تک "ایمان" کا تعلق ہے چونکہ "کتاب" کے بعد ذکر ہوا ہے اور ان جملوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو آیت میں اس کے بعد آئے ہیں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد آسمانی کتاب کے مضامین پر ایمان ہے نہ کہ مطلقاً ایمان، لہٰذا مذکورہ گفتگو اور اس آیت کے درمیان تضاد پیدا نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی ان دل کے اندھے لوگوں کے لیے کوئی دستاویز ثابت ہو سکتی ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں قبل از بعثت مطلقاً ایمان کی نفی کرنا چاہتے ہیں اور تاریخی حقائق کو پس پشت ڈالنا چاہتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس سوال کے کئی اور جواب بھی دیئے ہیں، جن میں سے کچھ جواب یہ ہیں:

الف: ایمان سے مراد صرف تصدیق اور عقائد ہی نہیں ہے بلکہ اسلامی تعبیرات کے مطابق مجموعی طور پر دل سے اعتقاد، زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل کا نام ہے۔

ب: ایمان سے مراد توحید اور رسالت پر اعتقاد ہے اور ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ قبل از اعلان رسالت توحید پرست تو تھے لیکن ابھی تک انہیں اپنی رسالت پر ایمان نہ تھا۔

ج: اس سے مراد ارکان ایمان کا وہ حصہ ہے جن تک انسان کی رسائی عقلی دلائل کے ساتھ نہیں ہوتی اور صرف نقلی دلائل سے انہیں تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ (جیسے معاد کی بہت سی خصوصیات)

د: اس آیت میں ایک محذوف موجود ہے جو اس طرح ہے۔ "ماکنت تدری کیف تدعوا الخلق الی الایمان" (تجھے معلوم نہیں تھا کہ لوگوں کو ایمان کی دعوت کیسے دے)[1]

---

[1] آلوسی نے تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ ص۵۵ میں کچھ اور احتمالات کا ذکر بھی کیا ہے لیکن چونکہ ان کی زیادہ اہمیت نہیں ہے لہٰذا یہاں پر وہ ذکر نہیں کئے گئے۔

لیکن ہمارے نزدیک تمام جوابات سے زیادہ مناسب اور آیت کے مفہوم سے زیادہ ہم آہنگ وہی پہلا جواب ہے۔

۳۔ ایک ادبی نکتہ: "ولکن جعلناہ نوراً ....." (لیکن ہم نے اسے نور بنایا ہے) کے جملے میں ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اس بارے میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے اس سے مراد قرآن مجید ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس نور سے مراد، نور ایمان ہے جو خدا کا نور ہے۔

لیکن ان دونوں میں سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس سے مراد "قرآن" اور "ایمان" دونوں ہیں، اور ضمیر ان دونوں کی طرف لوٹ رہی ہے اور چونکہ یہ دونوں ایک حقیقت پر ہی جا کر ختم ہوتے ہیں لہذا اس مقام پر مفرد کی ضمیر لائی جا سکتی ہے۔

پروردگارا! ہمارے دلوں کو ہمیشہ کے لیے نور ایمان کے ساتھ منور فرما اور ہمیں اس طرف ہدایت فرما جہاں خیر اور سعادت ہے۔

بارالٰہا! ہمیں اس قدر بلند ظرفی اور صبر عنایت فرما کہ نعمتوں کے موقع پر سرکشی نہ کریں اور مصائب و مشکلات میں ہمت نہ ہار دیں۔

خداوندا! جس دن ظالم اور متکبر لوگ حیران و سرگردان اور بغیر کسی جائے پناہ کے ٹھوکریں کھاتے پھریں گے اور مؤمنین تیری پناہ اور حمایت میں محفوظ و مامون ہوں گے ہمیں مخلص مؤمنین کی صف میں قرار دینا۔

آمین یا رب العالمین

سورۂ شوریٰ اور تفسیر نمونہ کی بیسویں جلد ختم ہوئی

بتاریخ ۱۵ رجمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ

اس جلد کا ترجمہ ۲۱ رجمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۲ رجنوری ۱۹۸۷ء بروز جمعرات بوقت آٹھ بجے شب، سیٹھ نوازش علی کے مکان E-81 ماڈل ٹاؤن لاہور میں اختتام پذیر ہوا۔

— الحمد للہ اوّلاً و آخراً و صلی اللہ علی محمد و آلہ دائماً ابداً۔ —

— سید صفدر حسین نجفی —

سُورۂ زُخرف

یہ سُورۃ مکہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۸۹ آیات ہیں

تاریخ آغاز

۷ رجمادی الاول ۱۴۰۵ھ

سُورت زخرف کے مضامین :

سورت زخرف مکی سورتوں میں سے ہے۔ اس کی صرف آیت ۴۵ کے بارے میں بعض مفسرین نے کچھ اختلاف کیا ہے اور اسے مدنی سورت سمجھا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کے بیشتر مطالب کا تعلق اہل کتاب سے ہے۔ یا پھر معراج کے واقعے کو بیان کر رہی ہے، چونکہ ان دونوں واقعات کا مدینہ سے ربط ہے لہٰذا انہوں نے اسے مدنی شمار کیا ہے۔ ہم انشاءاللہ اسی آیت کی تفسیر کے موقع پر اس کی بھی وضاحت کریں گے۔

بہر حال مکی سورتیں اکثر و بیشتر اسلام کے بنیادی عقائد کے محور کے گرد گھومتی ہیں اور مبداء و معاد، نبوت و قرآن اور انذار و تبشیر کے متعلق گفتگو کرتی ہیں اور یہی مزاج اس سورت کا ہے۔

اس سورت کے مضامین کو خلاصے کے طور پر سات حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

پہلا حصّہ :

یہ سورت کا سر آغاز ہے اس میں قرآن مجید، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی اہمیت اور اس آسمانی کتاب یعنی قرآن پاک کے ساتھ جہلا کی ناپسندیدہ روش کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا حصّہ :

"آفاق" میں توحید کے کچھ دلائل اور انسان پر خدا کی گوناگوں نعمتوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

تیسرا حصّہ :

اسی حقیقت کی تکمیل کرتا ہے یعنی اس حصے میں شرک کے خلاف جدوجہد، خدا کی ذات کی طرف ناروا نسبتوں کی نفی، اندھی تقلید اور لڑکیوں سے نفرت اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھنے جیسی خرافات کے خلاف بات کی گئی ہے۔

چوتھا حصّہ :

حقائق کو مجسم کرنے کے لیے کچھ سابق انبیاء اور ان کی اقوام کی سرگزشت بیان کی گئی ہے اور خصوصی طور پر حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی داستانوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

پانچواں حصّہ :

اس میں معاد کے مسئلے کے ضمن میں مؤمنین کی جزا اور کفار کے دردناک انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ اور مجرمین کو زوردار الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے۔

چھٹا حصّہ :

یہ اس سورت کا اہم ترین حصّہ ہے اور اس میں ان جھوٹی اقدار کا ذکر ہے جو بے ایمان لوگوں کے افکار پر حکم فرما چلی آرہی ہیں۔ اور انہی جھوٹی اور بے بنیاد اقدار کی وجہ سے وہ زندگی کے اہم مسائل کو بھی سمجھنے میں گوناگوں غلطیوں کے مرتکب ہوتے

چلے آرہے ہیں حتیٰ کہ وہ اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ قرآن مجید کو بھی ایک متمول اور ثروتمند شخص پر نازل ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ وہ انسانی شخصیت اور عظمت کو دولت ہی میں منحصر سمجھتے تھے۔ قرآن مجید نے اس سورت کی متعدد آیات میں اس احمقانہ سوچ کی خوب سرکوبی کرتے ہوئے صحیح اسلامی اور انسانی اقدار کو اجاگر کیا ہے۔

ساتواں حصہ :

دوسری سورتوں کی طرح اس میں بھی موثر اور مفید پند و نصیحت پائی جاتی ہے۔ یوں یہ حصہ دوسرے حصّوں کی تکمیل کرتا ہے تاکہ سورت کی مجموعی آیات کو معجون شفا کی صورت عطا کرے اور سننے والے کے دل پر گہرا اثر ڈالے۔

اس سورت کا نام اس کی ۳۵ ویں آیت کے لفظ سے لیا گیا ہے جس میں مادی اقدار اور "زخرف" (سونا اور اس جیسی چیزوں) کے بارے میں بات چیت کی گئی ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت :

تفسیر اور حدیث کی مختلف کتابوں میں اس سورت کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بھی ہے :

من قرأ سورة الزخرف، كان ممن يقال له يوم القيامة يا عباد لا خوف عليكم اليوم ولا انتم تحزنون ادخلوا الجنة بغير حساب

جو شخص سورہ زخرف کی تلاوت کرے گا وہ ان لوگوں میں قرار پائے گا جنہیں روز قیامت اس طرح مخاطب کیا جائے گا ہاے میرے بندو! آج نہ تو تم پر کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ہی غم، تم بہشت میں حساب وکتاب کے بغیر چلے جاؤ۔[1]

البتہ یا عباد لا خوف علیکم الیوم و لا انتم تحزنون - کا خطاب اسی سورت کی ۶۸ ویں آیت میں موجود ہے۔ ادخلوا الجنۃ کا جملہ اس کی ۷۰ ویں آیت سے لیا گیا ہے اور "بغیر حساب" کا جملہ کلام کے لوازمات میں سے اور قرآن مجید کی دوسری آیات سے لیا گیا ہے۔

صورت حال خواہ کچھ ہو، یہ عظیم بشارت اور بے حد وحساب فضیلت، غور و فکر اور ایمان وعمل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ تلاوت تو سمجھنے کے لیے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ایمان و عمل اس کے ثمر ہوتے ہیں۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان سورہ زخرف کا آغاز۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ حٰمٓ ۝

۲۔ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝

۳۔ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

۴۔ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝

۵۔ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝

۶۔ وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝

۷۔ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

۸۔ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حٰم۔

۲۔ اس کتاب کی قسم جس کے حقائق آشکار ہیں۔

۳۔ کہ ہم نے اسے فصیح اور عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو۔

۴۔ اور وہ اصلی کتاب (لوح محفوظ) میں ہمارے پاس ہے جو کہ بڑی عظمت والا اور حکمت آموز ہے۔

۵۔ آیا اس ذکر (قرآن مجید) کو ہم اس لیے تم سے واپس لے لیں کہ تم اسراف کرنے والی قوم ہو؟

۶۔ اور گزشتہ قوموں میں ہم نے (ہدایت کے لیے) کس قدر انبیاء بھیجے ہیں!

۷۔ لیکن ان کے پاس کوئی بھی پیغمبر نہیں جاتا تھا مگر یہ کہ وہ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

۸۔ ہم نے تو ان لوگوں کو بھی ہلاک کر ڈالا، جو طاقت کے لحاظ سے ان سے بہت زیادہ تھے اور پہلے لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے۔

تفسیر

گناہ رحمت کو نہیں روک سکتے

سُورت کے آغاز میں ہم ایک بار پھر حروف مقطعات (حٰمٓ) کو پاتے ہیں۔ یہ چوتھی سُورت ہے، جس کا آغاز حٰمٓ سے ہو رہا ہے۔ تین اور سُورتوں کا آغاز بھی انہی دو حروف سے ہوا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ساتوں سُورتیں "حٰمٓ کا خاندان" تشکیل دیتی ہیں۔ سُورتیں بالترتیب یہ ہیں۔ ۱۔ مؤمن ۔۲۔ حٰمٓ سجدہ ۔۳۔ شوریٰ ۔۴۔ زخرف ۔۵۔ دخان ۔۶۔ جاثیہ ۔۷۔ احقاف۔

حروفِ مقطعات کے بارے میں ہم پہلے ہی تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ کی جلد اوّل سورۂ بقرہ کا آغاز، جلد دوم سُورہ آلِ عمران کی ابتداء، جلد چہارم سورہ اعراف کا آغاز اور جلد ۱۱ سُورہ حٰمٓ سجدہ کی ابتداء)۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں قرآن مجید کی قسم کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: قسم ہے اس آشکار کتاب کی (والکتاب المبین)۔

اس کتاب کی قسم جس کے حقائق آشکار، مفہوم واضح، اس کی سچائی کے دلائل نمایاں اور اس کی ہدایت کی راہیں واضح اور روشن ہیں۔

ہم نے اسے ایک عربی قرآن قرار دیا ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو۔ (انا جعلناہ قرانا عربیا لعلکم

تعقلون)۔ ؎

قرآن کا عربی ہونا یا تو اس لحاظ سے ہے کہ وہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے جو حقائق بیان کرنے کے لیے دنیا کی وسیع اور جامع ترین زبانوں میں سے ہے اور باریک سے باریک مطالب نہایت ہی ظرافت اور لطافت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔

یا "عربی" بمعنی "فصاحت" کے ہے (کیونکہ لفظ "عربی" کا ایک معنی "فصیح" بھی ہے)۔ اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے اس قرآن کو نہایت ہی فصاحت کے انداز میں نازل کیا ہے تاکہ جملات اور کلمات کے ذریعے اچھے سے اچھے حقائق کو ظاہر کرے اور سب لوگ اسے بخوبی سمجھ سکیں۔

یہاں پر ایک دلچسپ بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ قسم اور جواب قسم دونوں ایک چیز ہیں، قرآن کی قسم اٹھائی جارہی ہے کہ یہ کتاب عربی قرار دی جاچکی ہے، تاکہ سب لوگ اس کے مطالب سمجھ سکیں، اور یہ بات شاید اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن سے بڑھ کر اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی قسم اٹھائی جاسکے۔ اگر قرآن سے بڑھ کر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے تو وہ صرف قرآن پاک ہی ہے۔ کیونکہ یہ خدا کا کلام ہے اور یہ کلام الٰہی اسی کی ذات اقدس کا مظہر ہے۔

"لعل" (شاید، ہوسکتا ہے وغیرہ) کی تعبیر اس لیے نہیں ہے کہ خداوند عالم کو قرآن مجید کی تاثیر میں کسی قسم کا شک ہے، یا امید و آزادی کی آرزو کی کوئی صورت ہے کہ جس تک پہنچنے کے لیے کسی قسم کی مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آیات قرآنی سننے والوں کی فکری اور اخلاقی سطح مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن کی تاثیر بھی ان کی اسی سطح کے مطابق ہوتی ہے کہ جس طرف "لعل" کے ساتھ اجمالی اشارہ کیا گیا ہے (اس بات کی مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۲۰ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں)۔

پھر اس آسمانی کتاب کی تین اور صفات کو بیان فرماتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اور وہ اصل کتاب لوح محفوظ میں ہمارے پاس ہے جو بلند مرتبہ اور حکمت آموز ہے (وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم)۔

پہلی صفت میں تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن مجید "ام الکتاب" میں پروردگار عالم کے پاس ثبت اور محفوظ ہے، جیسا کہ سورۂ بروج کی آیات ۲۱، ۲۲ میں بھی ہے۔

"بل ھو قراٰن مجید فی لوح محفوظ۔"

"وہ قرآن مجید ہے جو لوح محفوظ میں ہے"

اب دیکھنا یہ ہے کہ "ام الکتاب" یا "لوح محفوظ" سے کیا مراد ہے؟

لغت عرب میں "ام" کا لفظ ہر چیز کی اصل، بنیاد اور اساس کے معنی میں آتا ہے۔ اگر اہل عرب ماں کو "ام" کہتے ہیں تو اس لیے کہ وہ خاندان کی بنیاد اور اولاد کے لیے جائے پناہ ہوتی ہے۔ اسی لیے "ام الکتاب" کا معنی ایسی کتاب ہے جو تمام آسمانی کتابوں کی اصل و اساس ہے اور وہ وہی لوح ہے جو خدا کے نزدیک ہر قسم کے

؎ "والکتاب المبین" میں "واؤ" قسم کے لیے ہے اور "انا جعلناہ قراٰنا عربیا" کا جملہ جواب قسم ہے۔

تغیر، تبدل اور تحریف سے محفوظ ہے اور ایسی کتاب "پروردگار عالم کا علم" ہے، جو خود اسی کے پاس ہے اور تمام کائنات میں حقائق کائنات کے ماضی اور حال و مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے حالات اور تمام آسمانی کتابیں اس میں درج ہیں اور اس حد تک خدا کے علاوہ کسی کو رسائی حاصل نہیں ہے مگر جنہیں خدا خود آگاہ کرے۔

یہ قرآن مجید کی بہت بڑی عظمت ہے جس کا سرچشمہ حق تعالیٰ کا بے پایاں علم ہے، جس کی اصل و اساس خود خدا کے پاس ہے۔

اسی دلیل کی بنا پر قرآن مجید کی دوسری صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ بلند مرتبہ کتاب ہے۔ (لعلی)۔

تیسری صفت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: حکمت آموز، مستحکم، پختہ اور حساب شدہ ہے (حکیم)۔

اور جس چیز کا براہ راست تعلق خدا کے لامتناہی علم سے ہو، اسے ایسی اوصاف کا حامل ہونا ہی چاہیئے۔

بعض مفسرین قرآن مجید کو اس بنا پر بلند مرتبہ کتاب سمجھتے ہیں کہ وہ دوسری تمام آسمانی کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے اور ان پر سبقت حاصل کر گئی ہے اور ان سب کو منسوخ کر کے اعجاز کے بلند ترین مقام پر فائز ہو چکی ہے۔

کچھ اور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ یہ اس لیے بلند مقام کی حامل کتاب ہے کہ اس کے مندرجات ایسے حقائق پر مشتمل ہیں جو انسانی افکار کی رسائی سے بالا ہیں (ان حقائق کے علاوہ جن کا ظاہری مفہوم ہر شخص سمجھ لیتا ہے)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ لفظ "حکیم" عام طور پر انسان کی یا شخص کی صفت کے لیے استعمال ہوتا ہے، کتاب کے لیے نہیں، لیکن چونکہ یہ آسمانی کتاب بذات خود ایک عظیم معلم اور حکمت آموز کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اس کے لیے یہ تعبیر نہایت ہی موزوں اور سچا ہے۔

البتہ "حکیم" کا معنی "مستحکم" اور ہر قسم کے خلل سے محفوظ بھی ذکر ہوا ہے اور یہ تمام مفہوم اور مطالب مذکورہ لفظ میں موجود ہیں اور قرآن پر صحیح معنوں میں صادق آتے ہیں، کیونکہ قرآن ان معانی کے لحاظ سے حکیم ہے۔

بعد کی آیت میں قرآن سے منہ موڑنے اور اس کا انکار کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: آیا ہم قرآن کو جو کہ تمہاری بیداری اور توجہ کا سبب ہے تم سے اس لیے واپس لے لیں کہ تم اسراف اور تجاوز کرنے والے لوگ ہو (افنضرب عنکم الذکر صفحا ان کنتم قوما مسرفین)۔

یہ ٹھیک ہے کہ تم نے حق کی مخالفت اور دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور مخالفت کو افراط و اسراف کی حد تک پہنچا چکے ہو، لیکن خدا کا لطف و کرم اور رحمت و مہربانی بھی اس قدر وسیع ہے کہ وہ تمہاری ایسی باتوں کو اپنی رحمت کے آگے سد راہ نہیں سمجھتا اور اس بیدار کرنے والی آسمانی کتاب کو مسلسل تمہارے لیے بھیجتا رہتا ہے تاکہ جن دلوں میں تھوڑی سی آمادگی پائی جاتی ہے ان میں حرکت پیدا ہو اور وہ سیدھی راہ پر آجائیں اور پروردگار عالم کی عمومی رحمت اور رحمانیت کا یہی معنی ہے جو دوست اور دشمن دونوں کے لیے ہے۔

"افنضرب عنکم" کا معنی "افنصرف عنکم" (آیا ہم تم سے منصرف کر دیں یا پھیر دیں) کیا گیا ہے۔ کیونکہ جب کوئی سوار اپنی سواری کو ایک راستے سے دوسرے راستے کی طرف پھیرنا چاہتا ہے تو اسے چابک مارتا ہے، لہٰذا اس جیسے مقام پر "ضرب" کا لفظ "صرف" (پھیرنے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان انہی آیات کے ذیل میں۔

"صفح" دراصل "جانب" اور کسی طرف (SIDE) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور عرض یعنی چوڑائی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس آیت میں پہلے پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی کیا ہم اس قرآن کو جو تذکر کا موجب ہے، تمہاری طرف سے دوسری جانب پھیر دیں؟

"مسرف" "اسراف" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی حد سے بڑھ جانا ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مشرکین اور رسول اللہ کے دشمن اپنی عداوت اور مخالفت میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ وہ مخالفت اور عناد کی کسی حد کو نہیں پہچانتے۔

پھر مذکورہ فرمان کے لیے شاہد کے طور پر بھی اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی اور تشفی کے لیے بھی اور ساتھ ہی ہٹ دھرم منکرین کو تنبیہ اور تہدید کے طور پر بھی مختصر لیکن محکم انداز میں فرمایا گیا ہے:

ہم نے گزشتہ قوموں میں ہدایت کی خاطر بہت سارے انبیاء کو بھیجا ہے (وکم ارسلنا من نبی فی الاولین)۔

لیکن ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آتا تھا مگر یہ کہ اس کا مذاق اڑاتے تھے (وما یأتیھم من نبی الا کانوا بہ یستھزءون)۔

اس قسم کے مخالفین، مذاق اور تمسخر لطف الٰہی سے ہرگز مانع نہ ہوئے یہ وہ فیض الٰہی ہے جو ازل سے ابد تک جاری و ساری ہے اور ایسی سخاوت ہے جو تمام بندگان خدا کے لیے یکساں ہے، بلکہ اصولی طور پر خدا نے انہیں خلق ہی رحمت کے لیے فرمایا ہے (ولذالك خلقھم) (ہود۔ ۱۱۹)

اسی لیے تمہاری روگردانی اور ہٹ دھرمی کبھی اس کے لطف و کرم کی سدِ راہ نہیں بن سکتی اور رسول پاک اور مومنین کو بھی مایوس و پریشان نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ حق سے روگردانی اور خواہشات نفسانی کی پیروی آج کی پیداوار نہیں، بلکہ زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔

البتہ یہ بات بھی ان (کفار) کو نہیں بھولنی چاہیئے کہ خداوند کریم کا بے حد و حساب لطف و کرم اس کی سزا سے مانع بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ مجرم کو سزا بھی اس کی حکمت کا تقاضا ہوتی ہے۔ اسی لیے بعد کی آیت میں فرمایا گیا: ہم نے تو ان لوگوں کو بھی ہلاک اور نیست و نابود کر دیا ہے جو ان سے زیادہ طاقت ور تھے۔ (فاھلکنا اشد منھم بطشا)۔

اور گزشتہ لوگوں کی داستان بھی گزر چکی ہے۔ (ومضٰی مثل الاولین)۔

جو آیات ہم نے اس سے پہلے آپ پر نازل فرمائی ہیں ان میں ایسی ہی سرکش قوموں کی سرکشی اور نافرمانی کے بہت سے نمونے پیش کیے گئے ہیں اور وحی کے ذریعے ان کے تفصیلی حالات آپ تک بے کم و کاست پہنچ چکے ہیں۔ ان اقوام میں کچھ ایسی قومیں بھی تھیں جو مشرکین عرب سے کئی گنا زیادہ طاقتور تھیں۔ ان کے پاس ذرائع اور وسائل کی فراوانی تھی۔ افرادی قوت کی کوئی کمی نہیں تھی فوج کے لحاظ سے بھی وہ بہت قوی تھیں استعداد بھی ان کی زیادہ تھی۔ جیسے فرعون اور اس کی قوم اور طاقت کے لحاظ سے عاد و ثمود کی قومیں، لیکن اب تم جاؤ اور ان کے شہروں کو کھنڈرات کی صورت میں جا کر دیکھو، ان کی سرگزشت تاریخ کی کتابوں میں پڑھو اور ان سب سے واضح کیفیت قرآن میں موجود ہے اس کا مطالعہ کرو اور اس میں غور و خوض سے کام لو۔ پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ ہٹ دھرم اور سرکش افراد اللہ کے دردناک عذاب سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔

"بطش" (بروزن "فرش") کا معنی جیسا کہ راغب نے "مفردات" میں تحریر کیا ہے "کسی چیز کو طاقت کے ساتھ پکڑنا" ہے۔

اور یہاں پر "اشد" کا کلمہ بھی ساتھ استعمال ہوا ہے، جس سے طاقت میں شدت بتانا مقصود ہے۔

"منھم" میں موجود ضمیر مشرکین عرب کی طرف لوٹ رہی ہے، جو اس سے پہلی آیات میں مخاطب تھے۔ لیکن یہاں پر ضمیر کو غائب اس لیے لایا گیا ہے کہ وہ خدا کے مسلسل خطاب کے اہل نہیں ہیں۔

بعض بزرگ مفسرین "مضٰی مثل الاولین" (گذشتہ اقوام کا انجام پہلے گزر چکا ہے) کے جملے کو اس پہلی سورت شوریٰ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو اس سے پہلے گزر چکی ہے اور اس میں اس قسم کے لوگوں کا کچھ ذکر موجود ہے، لیکن اس قسم کی محدودیت پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ خاص کر جب کہ سورہ شوریٰ میں گزشتہ اقوام کی سرگزشت کی جانب بہت ہی کم اشارہ ہوا ہے۔ اور دوسری قرآنی سورتوں میں ان کے تفصیلی حالات درج ہیں۔

بہر حال یہ آیت سورۂ قصص کی ۷۸ ویں آیت سے ملتی جلتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

"اولم یعلم ان اللہ قد اھلک من قبلہ من القرون من ھو اشد منہ قوۃً واکثر جمعًا"

"آیا قارون نہیں جانتا تھا کہ خدا نے اس سے پہلے کئی قوموں کو نیست و نابود کر دیا، جو اس سے طاقت میں بھی زیادہ تھیں اور مال و دولت میں بھی؟"

یا پھر سورۂ مومن کی آیت ۲۱ سے ملتی جلتی ہے، جس میں مشرکین عرب کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین کانوا من قبلھم کانوا ھم اشد منھم قوۃ واٰثارًا فی الارض فاخذھم اللہ بذنوبھم وما کان لھم من اللہ من واق"

"آیا انہوں نے زمین کی سیر نہیں کی تاکہ وہ دیکھتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا انجام کیا ہوا ہے؟ وہ ان سے طاقت میں بھی زیادہ تھے اور زمین پر اپنے آثار میں بھی۔ لیکن خدا نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے اپنی گرفت میں لے لیا اور انھیں عذاب الٰہی سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔

۹- وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝

۱۰- الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

۱۱- وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝

۱۲- وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۝

۱۳- لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝

۱۴- وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝

ترجمہ

۹- اور اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، تو وہ یقیناً یہی کہیں کہ خداوند قادر و علیم ہی نے انہیں پیدا کیا ہے۔

۱۰۔ وہی جس نے زمین کو گہوارہ اور تمہارے سکون کی جگہ بنایا ہے اور تمہارے لیے زمین میں رستے مقرر کیے ہیں تاکہ تم ہدایت پا جاؤ (اور مقصد تک پہنچ جاؤ)۔

۱۱۔ وہی خدا جس نے آسمان سے مقرر مقدار میں پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے ہم نے مُردہ زمینوں کو زندگی عطا کی اور اسی طرح تم قیامت میں زندہ ہوگے۔

۱۲۔ وہی خدا تو ہے، جس نے ہر چیز کو جوڑے کی صُورت میں پیدا کیا ہے اور تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں میں سے سواریاں بنائی ہیں، جن پر تم سوار ہوتے ہو۔

۱۳۔ تاکہ تم ان کی پشت پر بخوبی بیٹھ سکو، پھر جب تم ان پر سوار ہو جاؤ تو اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو اور کہو کہ پاک و منزّہ ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارے لیے مسخر کر دیا، ورنہ ہم میں تو اس کی طاقت نہیں تھی۔

۱۴۔ اور ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے۔

تفسیر

توحید کے کچھ دلائل

یہاں سے توحید اور شرک کی گفتگو شروع ہوتی ہے اور سب سے پہلے انسانی فطرت اور سرشت کو پیش نظر رکھ کر توحید پر اثبات کیا جاتا ہے اور کائنات پر حکم فرما نظام کے دلائل کو ذکر کرنے اور پروردگار عالم کی پانچ نعمتوں کو بیان کرنے کے بعد انسانوں کی شکر گزاری کی حس کو بیدار کیا گیا ہے اور پھر بت پرستی اور دوسرے مشرکانہ عقائد اور خرافاتی نظریات کو باطل کیا گیا ہے۔

آیت کے پہلے حصے میں فرمایا گیا ہے، اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو یقیناً وہ جواب میں یہی کہیں گے کہ انھیں عزیز و حکیم خدا نے پیدا کیا ہے۔ (ولئن سألتهم من خلق السماوات والارض ليقولن خلقهن العزيز العليم)۔

اس قسم کی تعبیر کہ جو قرآن مجید کی چار آیات میں مختصر سے فرق کے ساتھ بیان ہوئی ہے (سورۂ عنکبوت آیت ۶۱، سورۂ لقمان آیت ۲۵، سورہ زمر آیت ۳۸ اور سورۂ زخرف کی اسی آیت میں)[1] جہاں خداشناسی کی فطری دلیل اور انسانی فطرت میں نورالہٰی کی تجلی کی غماز ہے، وہاں پر اس بات کی دلیل بھی ہے کہ مشرکین اس بات کے معترف بھی تھے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے اور سوائے شاذ و نادر مواقع کے اپنے معبودوں کے لیے خالقیت کے قائل نہیں تھے۔

تیسری طرف ان کا یہ اعتراف بتوں کی معبودیت کے باطل ہونے کی بنیاد ہے، کیونکہ عبادت کے لائق وہی ہے جو کائنات کا خالق اور مدبر ہے، نہ کہ وہ چیزیں جن کا اس سلسلے میں کوئی حصہ ہی نہیں، بنا بریں ان کا اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا اعتراف خود ان کے فاسد اور غلط مذہب کے خلاف دندان شکن دلیل ہے۔

"عزیز و حکیم" کی تعبیر جو کہ پروردگار عالم کی مطلق قدرت، علم اور حکمت کو ظاہر کرتی ہے، اگرچہ ایک قرآنی تعبیر ہے، لیکن یہ کوئی ایسا مطلب نہیں ہے کہ مشرکین جس کا انکار کر سکتے ہوں۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی خدا کی طرف نسبت کے اعتراف کا لازمہ ہی اس کے عزیز و حکیم ہونے کا اعتراف کرنا ہے۔ وہ تو بتوں کے علم و قدرت کے قائل تھے، چہ جائیکہ خدا کے کہ جس تک رسائی کے لیے بتوں کو اپنا وسیلہ سمجھتے تھے۔

پھر خدا کی ان پانچ عظیم نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک نظام آفرینش کا ایک نمونہ اور خدا کی آیات میں سے ایک آیت ہے۔

سب سے پہلے زمین کا ذکر ہے فرمایا گیا ہے: وہی خدا تو ہے، جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ اور سکون کا مقام بنایا ہے (الذی جعل لکم الارض مهدا)۔

"مهد" اور "مهاد" دو ایسے کلمے ہیں جو اس جگہ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں جو بیٹھنے، سونے اور آرام کرنے کے لیے بنائی جائے۔ اصل میں یہ ایسی جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں پر بچے کو سلایا جاتا ہے خواہ گہوارہ ہو یا کوئی اور چیز۔

یقیناً خداوند عالم نے زمین کو انسان کے لیے گہوارہ قرار دیا ہے حالانکہ اس کی کئی قسم کی حرکتیں ہیں، کشش ثقل کے قانون اور ہوا کے ہر طرف دباؤ اور دوسرے کئی مختلف عوامل کے باوجود اس قدر ساکن و ساکت ہے کہ اس پر رہنے والے ذرہ بھر بھی اضطراب کا احساس نہیں کرتے اور واضح سی بات ہے کہ آرام و سکون اور امن و امان ہی دوسری نعمتوں سے استفادہ کی اصل بنیاد ہے۔ یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اگر یہ مختلف عوامل ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملتے تو یہ سکون بھی کبھی وجود میں نہ آتا۔

دوسری نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس نے زمین میں تمہارے لیے راہیں مقرر کی ہیں تاکہ تم ہدایت

---

[1] قرآن مجید کے دو اور مقامات پر بھی ان کا "خدا کی خالقیت" کا اعتراف نقل ہوا ہے۔ البتہ ایک مقام پر آسمان سے بارش کے نزول کے بارے میں۔ (عنکبوت/۶۳) اور دوسرے مقام پر ان کی اپنی ذات کے بارے میں خدا کی خالقیت کے بارے میں۔ (زخرف/۸۷)

پاجاؤ اور منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ (وجعل لکم فیھا سبلاً لعلکم تھتدون)۔

یہ نعمت کہ جسے قرآن مجید میں بارہا بیان کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو سورۂ طٰہٰ ۵۳، انبیاء ۳۱ اور نحل ۱۵) ان نعمتوں میں سے ہے جس سے بہت سے لوگ غافل ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تقریباً تمام خشکی کو بہت سے نشیب و فراز نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے، اور چھوٹے بڑے پہاڑوں اور مختلف ٹیلوں نے اسے ڈھانپ رکھا ہے، پھر دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ دُنیا کے بڑے بڑے پہاڑی سلسلوں کے درمیان عام طور پر کٹاؤ موجود ہیں جن کے درمیان میں سے انسان اپنی راہیں بنا سکتا ہے اور بہت کم اتفاق ہوگا کہ یہ پہاڑ مکمل طور پر زمین کے مختلف حصّوں کے درمیان جدائی کا سبب بنے ہُوئے ہوں۔

یہ نظامِ آفرینش کے اسرار میں سے ایک راز اور بندوں پر خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

اس کے علاوہ زمین کے بہت سے حِصّے دریائی راستوں کے ذریعے ایک دوسرے سے مربُوط ہیں اور یہ بات بھی آیت کے عمومی مفہوم میں شامل ہے۔[1]

اس تمام گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ "لعلکم تھتدون" سے مراد منزلِ مقصود تک ہدایت اور زمین کے مختلف علاقوں کو تلاش کرنا ہے۔ ہر چند کہ مفسرین نے اس سے امر توحید اور خداشناسی کے سلسلے میں ہدایت مراد لی ہے۔ (البتہ دونوں معانی کو جمع کرنے میں کوئی مانع موجود نہیں)۔

تیسری نعمت بارش کا نزول ہے کہ جو مُردہ زمینوں کو زندہ کرتی ہے۔ بعد کی آیت میں اس بات کو یوں بیان کیا جا رہا ہے وہی خدا تو ہے جس نے مقررہ مقدار میں آسمان سے پانی نازل کیا ہے (والذی نزل من السماء ماء بقدر)۔

"اور اس کے ذریعے ہم نے مُردہ زمین کو زندگی عطا کی۔ (فانشرنا بہ بلدۃ میتا)۔

جس طرح مردہ زمینیں بارش کے پانی کی وجہ سے زندہ ہو جاتی ہیں تم بھی مرنے کے بعد اسی طرح زندہ ہو کر قبروں سے باہر آجاؤ گے" (کذالک تخرجون)۔

"قدر" کا لفظ اس خاص نظام کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو نزولِ باران پر حکم فرما ہے۔ بارش اسی حد تک ہوتی ہے جو مفید اور ثمر بخش ہو نہ کہ مضر اور نقصان دہ۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات سیلاب بھی آتے ہیں اور زمینوں کو ویران کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ استثنائی صُورتِ حال ہوتی ہے جو ایک قسم کی سرزنش کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں تک اکثر و بیشتر بارشوں کا تعلق ہے وہ سُودمند اور مفید ہوا کرتی ہیں۔ اصُولی طور پر تمام درختوں، سبزہ زاروں، پھولوں پُر ثمر باغوں کی رونق بارش کے مقدار کے مطابق نازل ہونے کی برکت سے ہی ہے۔ اگر بارش کا کوئی نظم و نظام نہ ہوتا تو یہ تمام برکتیں بھی حاصل نہ ہو پاتیں۔

آیت کے دوسرے حِصّے میں لفظ "انشرنا" آیا ہے جو "نشور" کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی پھیلنا اور وسعت

---

[1] لفظ "سبل" "سبیل" کی جمع ہے، جس کا خشکی کے راستوں پر بھی اطلاق ہوتا ہے اور تری کے راستوں پر بھی۔ جیسا کہ دُعائے جوشن کبیر میں ہے۔
"یا من فی البر والبحر سبیلہ۔"

اختیار کرتا ہے۔ اس سے نباتات کی دُنیا کا روزِ محشر نگاہوں کے سامنے مجسم ہو جاتا ہے، خشک بیجیں نباتات کے بیجوں کو اپنے دِل میں ویسے ہی جگہ دیئے ہوئے ہوتی ہے جس طرح مُردوں کو قبروں نے چھپایا ہوتا ہے اور جونہی "نزولِ باران" کا "صور" پھونکا جاتا ہے تو وہ حرکت میں آجاتے ہیں اور مردوں کی طرح نباتات اور سبزہ، زمین کے اندر سے اپنا سر باہر نکالتے ہیں اور شادابی اور تروتازگی کا ایک محشر برپا ہو جاتا ہے، جو بذاتِ خود انسانوں کے محشر کا ایک نمونہ ہے جس کی طرف اسی آیت کے آخر میں اور متعدد دوسری آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

بارش کے نازل ہونے اور نباتات کی زندگی کے تذکرے کے بعد چوتھے مرحلے میں مختلف حیوانات کی تخلیق کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: وہی خدا ہے جس نے سب کو جوڑوں کی صُورت میں پیدا کیا ہے (والذی خلق الازواج کلھا)۔

"ازواج" کے معنی "جوڑے" ہیں اور یہ لفظ مختلف قسم کے جانوروں کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس سے پہلے کی آیات میں نباتات کا ذکر آچکا ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اسے موجودات کی تمام قسموں کی طرف اشارہ سمجھا ہے خواہ وہ جمادات ہوں یا نباتات، حیوانات ہوں یا انسان۔ کیونکہ قانونِ زوجیت ان سب میں حکم فرما ہے اور ہر ایک کی مخالف جنس موجود ہے۔ آسمان اور زمین، رات اور دن، نور اور ظلمت، تلخ اور شیریں، خشک اور تر، سُورج اور چاند، بہشت اور دوزخ، غرض سوائے خدا کی ذات پاک کے کوئی بھی یگانہ اور یکتا نہیں ہے۔ یہ صرف خدا ہی ہے جس میں دوئی نہیں پائی جاتی۔

لیکن جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں، قرینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر حیوانات کے "جوڑے" مراد ہیں اور ہر ایک جانتا ہے کہ زوجیت کا قانون تمام جانداروں میں حکم فرما ہے اور اگر کچھ شاذ و نادر قسم کے افراد اس سے مستثنٰی ہوں تو یہ بات قانون کے کلی ہونے سے مانع نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے "ازواج" سے مراد حیوانات کی مختلف قسمیں مراد لی ہیں، جیسے پرندے، چوپائے، آبی جانور اور حشرات الارض وغیرہ۔

پانچویں مرحلے پر اس سلسلے کی آخری نعمت کا تذکرہ کرتے ہُوئے ان سواریوں کے بارے میں گفتگو فرمائی گئی ہے، جنہیں خداوندِ عالم نے برّی اور بحری راہیں طے کرنے کے لیے انسان کے اختیار میں دے دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: اس نے تمہارے لیے کشتیوں اور چوپایوں میں سے سواریاں بنائی ہیں کہ جن پر تم سوار ہوتے ہو (وجعل لکم من الفلک والانعام ما ترکبون)۔

یہ بنی نوعِ انسان پر خداوندِ عالم کا ایک بہت بڑا احسان اور اس کی کرم نوازی ہے کہ جو کسی دوسری زندہ مخلوق میں دیکھنے میں نہیں آتی، کیونکہ خداوند عالم نے بنی نوعِ انسان کو ایسی سواریاں عطا کی ہیں۔ جو برّی اور بحری راستوں کو طے کرنے میں اس کی معاون و مددگار ہیں۔

جیسا کہ سُورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۰ میں ارشاد ہو رہا ہے۔

"ولقد کرمنا بنی ادم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من

الطیبات وفضلناھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلاً "

" ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی اور انھیں بر و بحر میں (سواریوں پر) سوار کیا اور انہیں پاک و پاکیزہ رزق عطا کیا اور اپنی دوسری مخلوق پر برتری عطا کی۔"

حقیقت یہ ہے کہ ان سواریوں کی وجہ سے انسانی سرگرمیوں اور اس کی زندگی کی تگ و دو میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ موجودہ دور کی تیز رفتار سواریاں جو مختلف چیزوں کے خواص سے استفادہ کرکے تیار کی گئی ہیں اور انسان ان سے بہرہ برداری کر رہا ہے، یہ بھی خداوند عالم کی ایک بہت بڑی کرم نوازی ہے۔ یہ ایسے ذرائع آمد و رفت ہیں جنہوں نے زندگی کے چہرے کو مکمل طور پر تبدیل کرکے رکھ دیا ہے اور ہر چیز کو تیز رفتاری عطا کر دی ہے اور بنی نوع انسان کے لیے طرح طرح کی آسائش مہیا کر دی ہے۔

بعد کی آیت میں اس قسم کی سواریوں کے آخری تخلیقی مقصد کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، تاکہ تم ان سواریوں کی پشت پر بخوبی سوار ہو جاؤ، پھر اپنے پروردگار کی نعمت کو یاد کرو اور کہو، پاک و پاکیزہ ہے وہ ذات کہ جس نے ان کو ہمارے لیے مسخر کر دیا ورنہ یہ ہمارے بس میں تو نہ تھیں۔ (لتستووا علیٰ ظھورہ ثم تذکروا نعمۃ ربکم اذا استویتم علیہ وتقولوا سبحان الذی سخر لنا ھٰذا وما کنا لہ مقرنین)۔

"لتستووا علیٰ ظھورہ" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے ان سواریوں کو اس طرح سے پیدا کیا ہے کہ تم ان پر سوار ہو کر آرام اور سکون کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ جاؤ۔ [1]

اس آیت میں بری اور بحری سواریوں کی تخلیق کے دو بنیادی مقاصد بیان ہوئے ہیں ایک تو سوار ہوتے وقت خدا کی نعمتوں کی یاد آوری اور دوسرے اس خدا کی ستائش جس نے ان کو انسان کے تابع فرمان بنایا ہے۔ کشتیوں اور بحری جہازوں کو اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ سمندر کے سینوں کو چیر کر منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں اور چوپایوں کو انسان کے تابع فرمان بنا دیا ہے۔

" مقرنین" " اقران" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے" کسی چیز پر قابو پانا" اور" قدرت حاصل کرنا"۔ بعض صاحبان لغت نے یہ بھی کہا ہے کہ" اقران" کا معنی کسی چیز کو" ضبط" کرنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے جو دراصل کسی چیز کے" قرین" (ساتھی) ہونے کے معنی میں پنہاں ہے، جس کا لازمہ اس چیز کی حفاظت اور اپنے قابو میں رکھنا ہوتا ہے۔ [2]

بنابریں" وما کنا لہ مقرنین" کا مفہوم یہ ہوگا، کہ اگر خدا کا لطف و کرم نہ ہوتا تو ہم میں ان سواریوں کو قابو

---

[1] "علیٰ ظھورہ" میں موجود ضمیر" ما" موصولہ کی طرف لوٹ رہی ہے جو" ما ترکبون" میں ہے اور کشتیوں اور چوپایوں دونوں قسموں کے لیے ہے اور ضمیر ظاہری لفظ کی وجہ سے مفرد ہے۔

[2] کتاب" لسان العرب" میں آیا ہے کہ" اقرن لہ" اور" اقرن علیہ" کا معنی ہے۔ اطاق وقوی علیہ واعتلا " یعنی اس پر قابو پایا اور سوار ہوا۔ قرآن پاک میں ہے" وما کنا لہ مقرنین" یعنی" مطیقین"۔

میں رکھنے کی طاقت نہیں تھی۔ مخالف ہوائیں ہمیشہ کشتیوں اور بحری جہازوں کو اُلٹ کر رکھ دیتیں اور ہم ہرگز ساحل نجات تک نہ پہنچ سکتے۔ یہ طاقت ور سرکش جانور کہ جن کی طاقت انسان سے کئی گناہ زیادہ ہوتی ہے، اگر ان میں فرمانبرداری کی رُوح حکم فرما نہ ہوتی تو انسان ان کے نزدیک بھی نہ پھٹک سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کوئی جانور طیش میں آجاتا ہے اور فرمانبرداری کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو وہ ایک ایسے خطرناک جانور میں تبدیل ہو جاتا ہے، جس کا مقابلہ کئی انسان مل کر بھی نہیں کر سکتے، جب کہ عام طور پر ممکن ہے، بیسیوں بلکہ سینکڑوں جانوروں کو ایک رسی میں باندھ کر ان کی مُہار اگر ایک بچے کے ہاتھ میں بھی دے دی جائے تو وہ انھیں خاطر خواہ مقامات پر لے جائے۔

گویا خدا تعالیٰ چوپایوں کے ان استثنائی حالات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے معمول کے حالات کو بھی واضح کرنا چاہتا ہے۔

اسی آیت کے آخری حصے میں سوار ہوتے وقت سچے مؤمنین کی گفت گو کا ذکر ہے، اور اسی پر یہ آیت مکمل ہو جاتی ہے وہ سواری پر سوار ہوتے وقت کہتے ہیں، اور ہم ہر صورت میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ (وانا الی ربنا لمنقلبون)۔

یہ جملہ گذشتہ آیات میں توحید کے بارے میں گفت گو کے بعد مسئلہ معاد کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ہمیشہ خالق اور مبدا کی طرف توجہ انسان کو معاد کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

نیز اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مبادا تم ان سواریوں پر سوار ہوتے وقت اور ان پر قابو پانے کے بعد مغرور اور دنیاوی چکا چوند میں مگن ہو جاؤ، بلکہ تمھیں ہر حالت میں آخرت کی فکر کرنی چاہیئے، کیونکہ ایسے مواقع پر خاص طور پر انسان مغرور اور متکبر ہو جاتا ہے اور اپنی سواریوں کو فوقیت اور تکبر کا ذریعہ قرار دینے والے افراد دُنیا میں کم نہیں ہیں۔

پھر تیسری بات یہ ہے کہ سواریوں پر سوار ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقلی ہمیں اس دُنیا سے دوسرے جہان کی طرف عظیم انتقال کی جانب متوجہ کرتی ہے اور انجام کار ہمیں خدا کی جانب منتقل ہو کر جانا ہی ہے۔

نعمتوں کے موقع پر خدا کی یاد

قرآنی آیات میں قابل توجہ نکات میں سے ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ مؤمنین کو کچھ دُعائیں بتائی گئی ہیں کہ جب وہ خدا کی نعمتوں سے استفادہ کریں تو ان دُعاؤں کو پڑھا کریں۔ یہ ایسی دُعائیں ہیں جو اپنے تعمیری مطالب کی وجہ سے انسانی قلب کی رُوح کی بالیدگی کا سبب بنتی ہیں اور غرور و غفلت کے آثار مٹا دیتی ہیں۔

جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے۔

"فاذا استویت انت ومن معک علی الفلک فقل الحمد للہ الذی نجانا من القوم الظالمین"

" جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی پر سوار ہو جاؤ تو کہو کہ اس خدا کی حمد ہے، جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات بخشی۔" (مومنون - ۲۸)

نیز حضرت نوح علیہ السلام ہی کو یہ حکم ملتا ہے کہ کسی بابرکت منزل پر اترنے کے لیے یہ کہیں:

" رب انزلنی منزلاً مبارکاً وانت خیر المنزلین۔"

" پروردگارا! مجھے بابرکت منزل پر اُتار اور تو بہترین اتارنے والا ہے۔ (مومنون - ۲۹)

زیر تفسیر آیات میں سواری پر بیٹھ جانے کے وقت ہم کو پروردگار کی نعمتوں کی طرف توجہ اور اس کی تسبیح کا حکم دیا گیا ہے۔

جب انسان کی یہ عادت ہو جائے کہ کسی بھی نعمت سے بہرہ مندی کے وقت منعم حقیقی اور نعمت کے مبداء کو یاد کرے تو نہ غفلت کی تاریکی میں ڈوبے گا اور نہ ہی غرور کی لغزش سے دوچار ہو گا۔ بلکہ مادی نعمتیں اس کے لیے پروردگار عالم کی طرف پل کی حیثیت اختیار کریں گے۔

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات میں ہے کہ آپ جب اپنا پاؤں رکاب میں رکھتے تھے تو " بسم اللہ" کہتے تھے اور جب سواری پر اچھی طرح بیٹھ جاتے تو فرماتے:

" الحمد للہ علیٰ کل حال، سبحان الذی سخرلنا ھٰذا وما کنا لہ مقرنین وانا الیٰ ربنا لمنقلبون۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے سامنے ایک شخص نے سواری پر سوار ہوتے وقت کہا: سبحان الذی سخرلنا ھٰذا" تو امامؑ نے فرمایا، تمہیں ایسا کہنے کا حکم نہیں ملا، بلکہ یوں کہا کرو:

" الحمد للہ الذی ھدانا للاسلام، الحمد للہ الذی من علینا بمحمد والحمد للہ الذی جعلنا من خیر امۃ اخرجت للناس"

پھر کہو: سبحان الذی سخرلنا ھٰذا ......"[2]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمیں صرف " سبحان الذی سخرلنا ھٰذا ..... کہنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ اس سے پہلے خداوند عالم کی عظیم نعمتوں کو یاد کرنے کا حکم ہے، جو اسلام کی طرف ہدایت کی نعمت، رسول اللہ کی رسالت کی نعمت ہیں۔ پھر اس سواری کو قابو میں لانے پر خدا کی تسبیح کا حکم ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص سواری پر بیٹھتے وقت " سبحان الذی سخرلنا ھٰذا ..... الیٰ ربنا لمنقلبون" کہے تو وہ ہر قسم کی مصیبتوں سے محفوظ رہے گا۔

---

[1] تفسیر فخر الرازی جلد ۲۷، ص ۱۹۹۔

[2] تفسیر فخر الرازی جلد ۲۷، ص ۱۹۹۔

یہ بات اصول کافی کی ایک روایت میں آئمہ معصومین علیہم السلام سے بھی منقول ہے۔ [1]

اسلامی تعلیمات اور مغرور ہوس پرست لوگوں کے رویئے کے درمیان کتنا فرق ہے، جو اپنی سواریوں کو خود نمائی اور فخر و غرور کا ذریعہ سمجھتے ہیں بلکہ کبھی انھیں اپنے مختلف گناہوں کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ جیسا کہ "زمخشری" نے اپنی تفسیر "کشاف" میں ایک بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنی مخصوص سواری پر بیٹھ کر ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف جا رہا تھا۔

شہروں کا درمیانی فاصلہ ایک ماہ کا سفر تھا، اس نے اس سفر میں اس قدر شراب پی کہ اسے سفر کا پتہ ہی نہیں چلا، اور تب ہوش آئی، جب وہ منزل مقصود تک پہنچ چکا تھا۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص۵۹۳۔

۱۵۔ وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ۚ إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ ○
۱۶۔ أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَاكُم بِالْبَنِينَ ○
۱۷۔ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ○
۱۸۔ أَوَمَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ○
۱۹۔ وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا ۚ أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ ۚ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ ○

ترجمہ

۱۵۔ اور انہوں نے خدا کے لیے اس کے بندوں میں سے ایک جز قرار دیا ہے (اور ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہا ہے) انسان واضح کفر کرنے والا ہے۔

۱۶۔ آیا اس نے اپنی مخلوقات میں سے بیٹیوں کو اپنے لیے چن لیا ہے اور بیٹوں کو تمہارے لیئے؟

۱۷۔ حالانکہ جب ان میں سے جنہوں نے رحمان کے لیے شبیہ قرار دیا ہے، کسی کو بھی اسی چیز (بیٹی کی پیدائش) کی خوشخبری دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے بھر جاتا ہے۔

۱۸۔ آیا جو زیب و زینت میں پرورش پائے اور جھگڑے کے وقت اپنا مدعا اور

مقصود بھی بیان نہ کر سکے، (اسے خدا کی اولاد سمجھتے ہو؟)

۱۹۔ ان لوگوں نے فرشتوں کو، جو کہ خدا کے بندے ہیں، مؤنث سمجھ رکھا ہے۔ آیا وہ ان کی تخلیق کے وقت شاہد اور موجود تھے؟ ان کی یہ گواہی لکھی جائے گی اور اس بارے میں ان سے پوچھا جائے گا۔

تفسیر

فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں سمجھتے ہو؟

گزشتہ آیات میں کائنات میں خداوندِ عالم کی نشانیوں اور اس کی نعمتوں اور کرم نوازیوں کو شمار کیا گیا ہے اور عقیدۂ توحید کی بنیادوں کو مستحکم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد زیرِ نظر آیات میں اس کے نقطۂ مقابل یعنی شرک اور غیر اللہ کی پرستش کے خلاف نبرد آزمائی کا آغاز فرمایا گیا ہے اور سب سے پہلے شرک کی ایک قسم یعنی فرشتوں کی پوجا پاٹ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے خدا کے لیے اس کے بندوں میں سے ایک جزو قرار دیا ہے (وجعلوا لہ من عبادہ جزءًا)۔

فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں اور اپنا معبود سمجھنا ایک ایسی خرافات تھی جو بہت سے بت پرستوں میں رائج تھی۔

"جزء" کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی اولاد سمجھتے تھے، کیونکہ ہمیشہ اولاد اپنے ماں باپ کے وجود کا جزو ہوا کرتی ہے، جو نطفے کی صورت میں ان سے جدا ہوتی ہے اور آپس میں مرکب ہو جاتی ہے۔ اسی سے اس کے وجود کا آغاز ہوتا ہے۔

ساتھ ہی یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ وہ فرشتوں کی عبادت بھی کیا کرتے تھے کیونکہ وہ ان کو خدا کے مقابل معبودوں میں شمار کیا کرتے تھے۔

یہ تعبیر ضمنی طور پر مشرکین کے خرافاتی عقیدے کے باطل ہونے کی ایک واضح دلیل بھی ہے، کیونکہ اگر فرشتے خدا کی اولاد ہوں تو اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ خداوندِ عالم کا بھی جزو ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ خدا کی پاک ذات مرکب ہے۔ جبکہ عقلی اور نقلی دلائل خدا کے بسیط اور احد ہونے پر کثرت سے موجود ہیں، اور جزو تو صرف امکانی موجودات کے ساتھ مخصوص ہے۔

پھر ارشاد فرمایا گیا ہے: انسان واضح طور پر کفر کرنے والا ہے۔ (ان الانسان لکفور مبین)۔

اس قدر خدائی نعمتوں نے اس کے تمام وجود کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے کہ جن میں سے پانچ قسمیں گذشتہ آیات میں بھی بیان ہو چکی ہیں، ایسی حالت میں اسے تو یہ چاہیئے تھا کہ اپنی پیشانی اپنے خالق اور ولیٔ نعمت کے آستان پر جھکا دیتا۔ لیکن اس نے کفر و انکار کی راہ اختیار کرتے ہوئے اس کی مخلوق کے دامن کو جا پکڑا۔

بعد کی آیت میں قرآن ان کے اس خرافاتی نظریئے اور بودے فکر کی مذمت کرنے کے لیے خود ان کے ذہنی اور مسلمہ امور سے استدلال فرماتا ہے کیونکہ وہ مرد کی جنس کو عورت کی جنس پر ترجیح دیتے تھے، بلکہ اصولی طور پر وہ لڑکیوں کو اپنے لیے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتا ہے: آیا خدا نے اپنی تمام مخلوقات میں سے بیٹیوں کو اپنے لیے اور بیٹوں کو تمھارے لیے منتخب کیا ہے (ام اتخذ مما یخلق بنات و اصفٰکم بالبنین)۔

تمھارے خیال میں بیٹی کا مرتبہ پست ہے، تو پھر کیونکر تم اپنے آپ کو خدا پر ترجیح دیتے ہو؟ اس کے حصے میں بیٹیاں اور اپنے حصے میں بیٹے کس لیے قرار دیتے ہو؟

یہ ٹھیک ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں انسانی اقدار کے لحاظ سے مرد اور عورت یکساں ہیں، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخاطب کے ذہنی افکار کے ذریعے استدلال اس کی فکر و نظر میں کافی حد تک موثر ہوتا ہے اور اسے نظر ثانی پر آمادہ کرتا ہے۔

ایک بار پھر اسی موضوع کو دوسرے انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوشخبری دی جاتی ہے جس چیز کو انھوں نے خداوند رحمان کے لیے شبیہ قرار دیا ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے بھر جاتا ہے۔ (و اذا بشر احدھم بما ضرب للرحمٰن مثلا ظل وجھہ مسوداً وھو کظیم)۔

"بما ضرب للرحمٰن مثلاً" سے مراد وہی فرشتے ہیں جنہیں وہ لوگ خدا کی بیٹیاں سمجھتے اور اپنے معبود قرار دیتے تھے، بالکل خدا کی طرح اور خدا جیسے معبود۔

"کظیم" کا لفظ "کظم" (بروزن "نظم") سے لیا گیا ہے، جس کا معنی ہے "گلا" یہ لفظ مشک پانی سے بھر جانے کے بعد اس کے گلے کو تسمے سے بند کرنے کے لیے بھی آیا ہے۔ لہٰذا یہ کلمہ ان لوگوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے، جن کا دل غم و غصہ اور رنج سے بھر چکا ہو۔

یہ تعبیر لڑکیوں کی پیدائش کے بارے میں زمانۂ جاہلیت کے احمق مشرکین کے خرافاتی افکار کو بخوبی بیان کر رہی ہے کہ وہ خود اپنے گھر میں بیٹی کی ولادت کی خبر سن کر کس قدر پریشان اور غمگین ہو جاتے تھے لیکن اس کے باوجود فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: "آیا جو بناؤ سنگار میں پرورش پائے اور بحث و مباحثہ، نزاعی گفتگو اور جدل مجادلہ کے موقع پر اپنا مدعا اور مقصود بھی بخوبی بیان نہ کر سکے، اسے خدا کی اولاد سمجھتے ہو اور بیٹوں کو اپنی اولاد سمجھتے ہو؟" (او من ینشؤا فی الحلیۃ وھو فی الخصام غیر مبین)۔ [1]

---

[1] "ینشؤ" مادہ "نشاء" کسی چیز کی ایجاد کے معنی میں ہے، لیکن یہاں پر پرورش پانے کے معنی میں ہے۔ اور "حلیۃ" (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

یہاں پر قرآن مجید نے عورتوں کی دو ایسی صفات بیان کی ہیں جو اُن میں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں اور یہ ان کے احساساتی پہلو سے پیدا ہوتی ہیں، ایک تو ان کا زیورات اور بناؤ سنگار کی چیزوں سے قلبی لگاؤ، اور دوسرے شرم و حیا کی وجہ سے لڑائی جھگڑے اور بحث و مباحثہ کے وقت اپنے مقصود کے بیان کرنے پر نا کافی قدرت۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ عورتیں ایسی ہیں جنہیں زیب و زینت کی زیادہ خواہش نہیں ہوتی اور اس بات میں بھی کسی کو شک نہیں کہ "اعتدال کی حد تک" زینت سے لگاؤ عورت کے لیے کوئی عیب بھی نہیں ہے، بلکہ اسلام میں عورت کو بناؤ سنگار کرنے کے لیے تاکید بھی کی گئی ہے۔ البتہ یہاں پر مُراد عورتوں کی وہ اکثریت ہے جو عام طور پر انسانی معاشروں میں زیب و زینت کے ساتھ حد سے زیادہ لگاؤ رکھتی ہیں گو یا وہ زینت و آرائش کی دُنیا میں قدم رکھ چکی ہوتی ہیں اور اسی بناؤ سنگار میں پرورش پاتی ہیں۔

اس بات میں بھی شک نہیں ہے کہ کچھ ایسی عورتیں بھی ہیں جو گفتگو میں مکمل طور پر ماہر ہیں، لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکثریت ایسی عورتوں کی ہے جو شرم و حیا کی وجہ سے بحث و مباحثہ اور لڑائی جھگڑوں کے موقع پر مردوں کے مقابلے میں آنے کی قدرت نہیں رکھتیں۔

اصل مقصد اس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ آخر کس بنا پر تم خدا کے لیے تو بیٹیاں اور اپنے لیے بیٹے قرار دیتے ہو؟
اسی سلسلے کی آخری آیت میں بات کو زیادہ صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے فرشتوں کو جو کہ خدا کے بندے ہیں، مؤنث (اور خدا کی بیٹیاں) سمجھ رکھا ہے (وجعلوا الملائكة الذين هم عباد الرحمن اناثا)۔

جی ہاں! وہ خدا کے بندے ہیں، اس کے حکم کے پابند ہیں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہُوئے ہیں، جیسا کہ سُورۂ انبیاء کی آیت ۲۶ و ۲۷ میں بھی فرمایا گیا ہے:

"بل عباد مكرمون لا يسبقونه بالقول وهم بامره يعملون"

"بلکہ وہ تو خدا کے معزز بندے ہیں، کسی بھی بات میں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور ہمیشہ اس کے فرمان پر عمل کرتے ہیں"

یہاں پر لفظ "عباد" ذکر کرنے کی وجہ درحقیقت ان کی ایک غلط سوچ کا جواب ہے، کیونکہ اگر فرشتے مؤنث ہوتے تو اس لفظ کے بجائے "عبادات" کہا جاتا۔ البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ لفظ "عباد" جہاں جمع مذکر کا صیغہ ہے، وہاں پر ان تمام موجودات کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو مذکر یا مؤنث کے دائرہ سے خارج ہوتی ہیں جیسے فرشتے وغیرہ، جیسا کہ خدائے عالم کے بارے میں مفرد مذکر کی ضمیروں سے استفادہ کیا جاتا ہے، جبکہ وہ ایسی تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس جملے میں "عباد" کو "الرحمٰن" کی طرف مضاف کیا گیا ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہو

(بقیہ حاشیہ ص ۵۹۳ کا) کے معنی زینت ہے اور "خصام" کا معنی کسی چیز پر بحث و مباحثہ اور کشمکش ہے۔

کہ اکثر و بیشتر فرشتے خدا کی رحمت کا اجرا کرتے اور کائنات کے نظام کو چلاتے ہیں کہ جو سراسر رحمت ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خرافات زمانہ جاہلیت کے عربوں میں کیونکر پیدا ہوئی اور آج تک کئی لوگوں کے اذہان میں اس کے اثرات کیوں موجود ہیں؟ یہاں تک کہ وہ جب بھی کسی فرشتے کی تصویر کشی کریں تو اسے عورت یا لڑکی کے روپ میں پیش کرتے ہیں، بلکہ جب کسی نام نہاد "فرشتۂ آزادی" کا مجسمہ بناتے ہیں تو عورت کے چہرے اور لمبے چوڑے زنانہ بالوں کے ساتھ اسے منصۂ شہود پر لاتے ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ فکر اس لیے پیدا ہوئی ہو، کیونکہ فرشتے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں اور عورتیں بھی عام طور پر پردے میں ہوا کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ لغت عرب میں بعض مقامات پر مجازی مؤنث کے بارے میں بھی یہی سوچ کار فرما نظر آتی ہے مثلاً وہ "سورج" کو مجازی مؤنث اور چاند کو مذکر سمجھتے ہیں کیونکہ سورج کی ٹکیہ عام طور پر اپنے نور کی شعاعوں میں ڈھکی رہتی ہے اور اسے آنکھوں سے آسانی کے ساتھ نہیں دیکھا جا سکتا، جب کہ چاند کی ٹکیہ ایسے نہیں ہے۔

یا پھر اس لیے کہ فرشتوں کے وجود کی لطافت اس بات کا باعث بنی ہے کہ انھیں بھی عورتوں کی جنس سے شمار کیا جائے جو مردوں کی نسبت لطیف وجود ہیں۔ تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ اسلام نے اس قسم کی خرافات کے خلاف جو اقدام کیا ہے اس کے باوجود جب کبھی کوئی کسی عورت کی خوبی بیان کرتا ہے تو کہتا ہے کہ "وہ تو ایک فرشتہ ہے"، جبکہ مردوں کے بارے میں اس قسم کے الفاظ بہت کم سننے جاتے ہیں۔ اور "فرشتہ" کے لفظ کو عورت کے نام کے لیے منتخب کیا جاتا ہے، مرد کے نام کے لیے نہیں۔

پھر انکاری استفہام کے طور پر ان کے جواب میں فرمایا گیا ہے: آیا وہ فرشتوں کی تخلیق کے وقت موجود تھے اور انہوں نے اپنی موجودگی کی وجہ سے اس قسم کا نتیجہ نکالا ہے (اشھدوا خلقھم)۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اس بے بنیاد عقیدے کے بارے میں ان کی گواہی ان کے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے اور قیامت کے دن ان سے اس بارے میں پوچھا جائے گا (ستکتب شھادتھم ویسئلون)۔

جو کچھ ہم مندرجہ بالا آیات میں پڑھ چکے ہیں اسی چیز کو دوسرے انداز میں سورۂ نحل کی آیت ۵۷ تا ۵۹ میں بھی بیان کیا گیا ہے، ہم نے وہاں پر زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے عقیدہ کو مسئلہ "وئاد" (بچیوں کو زندہ درگور کرنے) کے سلسلے میں تفصیل سے بیان کیا ہے، بلکہ اصولی طور پر صنف نازک کے بارے میں ان کے عقیدے اور اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی شخصیت اور اس کے مقام کو بڑی تشریح اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد ۶ صفحہ ۲۲۳ تا ۲۳۱)۔

۲۰- وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ؕ

۲۱- اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ○

۲۲- بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ○

ترجمہ

۲۰- انہوں نے کہا: اگر خدا چاہتا تو ہم ان کی ہرگز عبادت نہ کرتے، لیکن وہ اس بات پر یقین نہیں رکھتے اور جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں کہتے۔

۲۱- یا یہ کہ ہم نے اس سے پہلے انھیں کوئی کتاب دی ہے اور وہ اس سے تمسک کیے ہوئے ہیں؟

۲۲- بلکہ وہ کہتے ہیں: ہم نے اپنے آباء و اجداد کو جس مذہب پر پایا ہے انہی کے نقش قدم پر ہم کو بھی ہدایت کی گئی ہے۔

تفسیر

تقلید آباء کی دلیل

گزشتہ آیات میں بت پرستوں کے اس خرافاتی عقیدے کا منطقی جواب دیا گیا ہے جو وہ فرشتوں کے بارے میں

رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں اور وہ یہ کہ کسی دعوے کے ثبوت کے لیے سب سے پہلے موقع پر موجود ہونا، کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور اس کا مشاہدہ کرنا ضروری ہوتا ہے، جبکہ کوئی بھی بت پرست ہرگز اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ فرشتوں کی تخلیق کے وقت وہ اس بات کے شاہد اور ناظر تھے۔

زیر تفسیر آیات بھی اسی چیز کو آگے بڑھاتے ہوئے اس بارے میں مزید تحقیقات کا دروازہ کھولتی ہیں اور اس بے ہودہ خرافات کو دوسرے طریقوں سے باطل کرتی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ان کے بودے دلائل میں سے ایک دلیل کو خلاصہ کے طور پر بیان کرتے ہوئے اس کا جواب بھی دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: انہوں نے کہا: "اگر خدا چاہتا تو ہم ان کی ہرگز عبادت نہ کرتے" یہ تو اُس کی مرضی ہے کہ ہم اُن کی عبادت کرتے ہیں (وقالوا لو شاء الرحمٰن ما عبدناھم)۔

ممکن ہے یہ تعبیر اس لیے بھی ہو کہ وہ عقیدۂ جبر کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں سب خدا کی مرضی اور اس کی منشاء سے انجام دیتے ہیں۔

یا پھر اس لیے کہ اگر ہمارے عقائد اور اعمال خدا کی مرضی کے مطابق نہ ہوتے تو خدا فوراً ہمیں ان سے روک دیتا اور چونکہ اس نے ہمیں اس بات سے روکا نہیں ہے لہٰذا اسی میں اس کی خوشنودی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے غلط اور خرافاتی عقائد کو صحیح ثابت کرنے اور ان کی توجیہہ کرنے کے لیے کئی اور خرافات کے مرتکب ہوتے تھے اور اپنے جھوٹے افکار کو سچا ثابت کرنے کے لیے کئی اور جھوٹ بولا کرتے تھے۔ مذکورہ دونوں احتمالات میں سے جو بھی ان کا مقصود اور ان کی مراد ہو غلط اور بے اساس ہے

یہ ٹھیک ہے کہ کائنات میں کوئی بھی چیز خدا کے ارادہ کے بغیر واقع پذیر نہیں ہو سکتی لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ کائنات میں جبر حکم فرما ہے کیونکہ یہ بات فراموش کرنے کے قابل نہیں ہے کہ خدا کی مرضی اور منشاء اسی بات میں ہے کہ ہم صاحب اختیار، صاحب ارادہ اور صاحب آزادی ہوں تاکہ وہ ہمیں آزمائے اور ہماری پرورش کرے۔

یہ بات درست ہے کہ خدا کو اپنے بندوں کے اعمال پر نظر رکھنا چاہیئے اور اس بات سے بھی انکار ناممکن ہے کہ تمام انبیاء نے شرک اور دوئی پرستی کی نفی کی ہے۔

اس بات سے قطع نظر انسانی عقل سلیم بھی اس بات کا انکار کرتی ہے۔ تو کیا انسان کے باطنی وجود میں "عقل" خدا کا پیغمبر نہیں ہے؟

اسی آیت کے آخر میں بت پرستوں کے اس بے ہودہ عقیدے کا ایک مختصر سے جملے کے ذریعے یوں جواب دیا گیا ہے: وہ اپنے اس دعوے پر یقین نہیں رکھتے اور جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں کہتے (ما لھم بذالک من علم ان ھم الا یخرصون)۔

انھیں تو مسئلہ جبر اور اپنے اعمال پر خدا کی رضامندی کا علم اور یقین بھی نہیں ہے، بلکہ بہت سے دوسرے نفس پرستوں اور مجرمین کے مانند اپنے سر سے گناہ کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جبر کے موضوع کا سہارا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تقدیر کے

ہاتھوں نے ہمیں اس راہ پر لا کھڑا کیا ہے۔

حالانکہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں اور یہ ان کا صرف ایک بہانہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے حقوق پامال کرتا ہے تو وہ ہرگز اس بات کے پیش نظر چشم پوشی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ اپنے اس کام میں مجبور تھا۔

"یخرصون" "خرص" (بروزن" غرس) کے مادہ سے ہے جس کا اصلی معنی اندازہ لگانا ہے۔ پہلے تو اس کا اطلاق پھل میووں کے بارے میں تخمینہ لگانے پر ہوتا تھا پھر ہر قسم کے اندازے کے بارے میں یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ چونکہ بعض اوقات اندازے اور تخمینے غلط ثابت ہوتے ہیں اسی لیے یہ لفظ جھوٹ کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور زیر نظر آیت میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بہر حال قرآن مجید کی متعدد آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بت پرست لوگ اپنے خرافاتی اور غلط عقائد کی توجیہ کے لیے کئی بار مشیت الٰہی کے عقیدے کا سہارا لیتے تھے اور اس سے اپنے لیے استدلال کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جہاں انھوں نے اپنے لیے کئی چیزوں کو حلال اور کئی چیزوں کو حرام کر دیا تھا تو اس کی نسبت بھی انہوں نے خدا کی طرف دے دی تھی جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت نمبر ۱۴۸ میں ہے۔

"سیقول الذین اشرکوا لو شاء الله ما اشرکنا ولا اٰباؤنا ولا حرمنا من شیء"

"مشرک لوگ بہت جلد یہ کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم مشرک ہوتے اور نہ ہی ہمارے آباؤ اجداد اور کسی چیز کو حرام بھی نہ کرتے۔"

سورۂ نحل کی آیت ۳۵ میں بھی اس چیز کو دہرایا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

"وقال الذین اشرکوا لو شاء الله ما عبدنا من دونه من شیء نحن ولا اٰباؤنا ولا حرمنا من دونه من شیء"

قرآن مجید سورہ انعام کی آیت کے ذیل میں ان کی تکذیب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"کذالک کذب الذین من قبلھم حتیٰ ذاقوا بأسنا"

"اس قسم کا جھوٹ اس سے پہلے لوگ بھی بولا کرتے تھے لیکن انھوں نے ہماری سزا کا مزہ چکھ لیا۔"

سورہ نحل کی آیت کے ذیل میں تصریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"فھل علی الرسل الا البلاغ"

"تو کیا خدا کے رسولوں پر تبلیغ رسالت کے علاوہ کچھ اور فرض ہے؟"

زیر تفسیر آیت کے سلسلے میں بھی جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں قرآن ان کی طرف جھوٹے تخمینوں کی نسبت دے رہا ہے۔

یہ درحقیقت سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

بعد کی آیت میں ایک اور دلیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ممکن ہے وہ اس کے ذریعے استدلال کریں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: یا یہ کہ ہم نے اس کتاب سے پہلے انہیں کتاب دی ہے اور وہ اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ (ام اٰتینٰھم کتابًا من قبلہ فھم بہ مستمسکون)۔[1]

یعنی انھیں اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لیے یا تو عقلی دلائل سے کام لینا چاہیئے یا پھر نقلی دلائل سے حالانکہ نہ تو ان کے پاس کوئی عقلی دلیل موجود ہے اور نہ ہی نقلی۔ تمام عقلی دلائل توحید کی دعوت دیتے ہیں اور تمام انبیاء اور آسمانی کتابوں نے بھی توحید کی طرف دی ہے۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں ان کے اصل بہانے کی طرف اشارہ کیا گیا اور یہ بہانہ بھی محض ایک خرافات اور ایک اور خرافات کی بنیاد ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک مذہب پر پایا ہے اور ہم بھی ان کے آثار کی طرف ہدایت کئے گئے ہیں۔ (بل قالوا انا وجدنا اٰباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ اٰثارھم مھتدون)۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس صرف اپنے آبا و اجداد کی اندھی تقلید کے سوا اور کوئی دلیل نہیں تھی اور پھر تعجب اس پر ہوتا ہے کہ اس تقلید کے ذریعے وہ خود کو ہدایت یافتہ بھی سمجھتے تھے۔ حالانکہ اعتقادی مسائل میں آزاد خیال انسان کے افکار و عقائد کی بنیاد تقلید پر نہیں ہوتی اور تقلید بھی "جاہل سے جاہل کی"۔

کیونکہ واضح سی بات ہے کہ ان کے آباء و اجداد کے پاس نہ تو علم تھا اور نہ ہی دانش، بلکہ ان کے دماغ خرافات اور توہمات سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے معاشرے اور افکار پر بھی جہالت ہی حکم فرما تھی جیساکہ قرآن مجید کی سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۰ میں ہے:

"اولو کان اٰباؤھم لا یعقلون شیئًا ولا یھتدون"

"کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباء اجداد نہ تو کچھ سمجھتے تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ تھے"

تقلید تو صرف فروعی اور غیر اعتقادی مسائل میں ہوتی ہے اور وہ بھی صحیح بنیادوں پر اور پھر یہ کہ عالم کی تقلید کی جاتی ہے یعنی جاہل کو عالم کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جیسے بیمار ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے یا غیر ماہر افراد ماہرین کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسی لیے مشرکین کی یہ اندھی تقلید دو طرح سے باطل اور قابل مذمت ہے۔

"امۃ" کا لفظ جیساکہ راغب، مفردات میں کہتے ہیں، اس جماعت پر بولا جاتا ہے، جس کے افراد ایک دوسرے کے

---

[1] یہاں پر "ام" متصلہ ہے اور "اشھدوا خلقھم" پر اس کا عطف ہے اور "من قبلہ" کی ضمیر "قرآن" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض مفسرین نے جو یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ "ام" منقطعہ ہے یا ضمیر "رسول" کی طرف لوٹ رہی ہے، قرینے کے لحاظ سے قطعاً مناسب نہیں ہے۔

ساتھ ایک قسم کا رابطہ رکھتے ہیں۔ یا وہ رابطہ دینی بنیادوں پر ہوتا ہے یا مکان کے لحاظ سے یا زمانے کے اعتبار سے، اگرچہ ان کا باہمی اتصال اختیار یا مجبوری کی صورت میں ہو (اسی لیے بسا اوقات اس کو "مذہب" کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسی آیت میں ہے۔ لیکن اس کا اصل معنی وہی جماعت اور گروہ ہے اور اس کلمہ کا مذہب پر اطلاق قرینے کا محتاج ہوتا ہے)۔[1]

---

[1] "انا علیٰ اٰثارھم مھتدون" میں لفظ "مھتدون" "ان" کی خبر ہے اور "علیٰ اٰثارھم" اس سے متعلق ہے۔ بعض مفسرین نے احتمال ذکر کیا ہے کہ "علیٰ اٰثارھم" "ان" کی پہلی خبر اور "مھتدون" اس کی دوسری خبر ہے۔ بعید معلوم ہوتا ہے۔

۲۳۔ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ○

۲۴۔ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○

۲۵۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ ع النصف

ترجمہ

۲۳۔ اسی طرح ہم نے کسی دیار میں تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ بدمست و مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک مذہب پر پایا ہے، اور ہم ان کے آثار کی پیروی کرتے ہیں۔

۲۴۔ (ان کے پیغمبر نے) کہا اگرمیں اس سے بھی زیادہ ہدایت کرنے والا دین تمارے پاس لا چکا ہوں، جس پر تم اپنے آباء و اجداد کو پاتے ہو (تو کیا پھر بھی تم انکار کروگے ؟) انھوں نے کہا (ہاں !) ہم اس ہر چیز کا انکار کرتے ہیں جو تم لوگ لا چکے ہو۔

۲۵۔ لہذا ہم نے ان سے انتقام لیا، پس دیکھ کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔

تفسیر

ان اندھے اور بہرے مقلدین کا انجام

یہ آیات بُت پرستی کے بارے میں مشرکین کے اصلی بہانے کے سلسلے میں جو کہ باپ دادا کی اندھی تقلید پر مبنی ہے گذشتہ آیات کا تتمہ ہیں۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے، یہ صرف عرب مشرکوں کا ہی دعویٰ نہیں بلکہ" اس طرح ہم نے کسی شہر و دیار میں تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر بدمست اور مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو کسی مذہب پر پایا ہے اور ہم ان کے آثار کی اقتدار کرتے ہیں۔ (وکذالك ما ارسلنا من قبلك فی قریة من نذیر الا قال مترفوها انا وجدنا اٰبائنا علیٰ امة وانا علیٰ اٰثارهم مقتدون)۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے ساتھ محاذ آرائی کے سرغنے اور باپ دادا کی تقلید کا مسئلہ پیش کرنے والے اور اس مسئلے پر ڈٹے رہنے والے لوگ "مترفین" ہی تھے، بدمست، مغرور اور خوشحال گھرانوں کے افراد، کیونکہ "مترف" "ترفہ" (بروزن نقمہ) کے مادہ سے ہے، جس کا معنیٰ ہے نعمت کی فراوانی اور چونکہ بہت سے خوشحال گھرانوں کے لوگ اور ثروت مند افراد شہوات حیوانی اور خواہشات نفسانی میں مگن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا "مترف" کا لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو نعمتوں میں بدمست اور مغرور ہو کر سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ [1] اس کا مصداق اکثر بادشاہ، ظالم و جابر حکمران، متکبر، دولت مند، اور خود پرست لوگ ہوتے ہیں۔

جی ہاں! انبیاء کے قیام کی وجہ سے ایسے ہی لوگوں کی خود سری اور من مانی کارروائیوں کا خاتمہ ہوتا تھا اور ان کے ناجائز مفادات کو خطرہ درپیش ہوتا تھا اور محروم و مستضعف افراد ان کے چنگل سے نجات پاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے لوگوں کے ذہن کو مسموم کرتے تھے اور انہیں احمق بنایا کرتے تھے۔ آج کے دور میں بھی دنیا بھر میں رونما ہونے والی برائیاں اور فسادات انہی "مترفین" کے مرہون منت ہیں۔ جہاں بھی ظلم و گناہ اور تجاوز و تعدّی ہے وہاں انہی لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہم نے پہلی آیت میں ان کا یہ قول پڑھا ہے کہ " انا علیٰ اٰثارهم مهتدون" یعنی ہم ان کے آثار پر ہدایت کیے گئے ہیں اور یہاں پر ان کا یہ قول پڑھتے ہیں کہ " انا علیٰ اٰثارهم مقتدون" یعنی

---

[1] لسان العرب میں ہے، " اترفته النعمة ای اطغته "

ہم ان کے آثار کی اقتدار اور پیروی کرتے ہیں ۔ اگرچہ دونوں تعبیریں ایک ہی معنیٰ کی طرف لوٹ رہی ہیں لیکن پہلی تعبیر ان کے بزرگوں کے مذاہب کی حقانیت کے دعویٰ کی طرف اشارہ ہے اور دوسری ان لوگوں کے اس مذہب پر ڈٹے رہنے اور باپ دادا کی پیروی کرنے کی طرف اشارہ ہے ۔

بہرحال صورت خواہ کچھ بھی ہو، یہ آیت پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے لیے ایک قسم کی تسلی اور تسکین ہے کہ انھیں معلوم ہو جائے کہ مشرکین کے حیلے بہانے کوئی نئی چیز نہیں ہیں ، بلکہ یہ ان کا وہی راستہ ہے، جس پر تاریخی طور پر تمام گمراہ لوگ گامزن چلے آرہے ہیں ۔

بعد کی آیت اس جواب کو بیان کر رہی ہے جو انبیائے ماسلف انھیں دو ٹوک الفاظ میں دیا کرتے تھے ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ، ان کے پیغمبروں نے انھیں کہا ، آیا اگر میں کوئی ایسا دین لا چکا ہوں جو تمھارے آباء و اجداد کے طریقۂ کار سے زیادہ واضح اور زیادہ ہدایت کرنے والا ہو ، پھر بھی تم اس کا انکار کرو گے ۔ (قال اولو جئتکم باھدیٰ مما وجدتم علیہ اٰبائکم) ۔ [1]

یہ سب سے زیادہ مؤدب تعبیر ہے جو ہٹ دھرم اور مغرور قوم کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے ، کہ جس سے ان کے جذبات کو کسی طرح ٹھیس نہ پہنچے ۔ پیغمبر یہ نہیں کہتے ، کہ جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ سب جھوٹ ، خرافات اور حماقت ہے ، بلکہ یہ کہتے ہیں جو کچھ میں لایا ہوں وہ تمھارے باپ دادا کے دین سے زیادہ ہدایت کرنے والا ہے ، آؤ ، دیکھو اور اس کا مطالعہ کرو ۔

اس قسم کی قرآنی تعبیرات ، مباحثہ و مناظرہ کے موقع پر خاص کر جاہل اور مغرور افراد کے ساتھ بحث و مباحثہ کے وقت ہمیں گفتگو کرنے کا سلیقہ بتاتی ہیں ۔

لیکن اس کے باوجود وہ جہالت ، تعصب اور ہٹ دھرمی میں اس قدر غرق ہو چکے تھے کہ یہ جچی تلی اور مؤدبانہ گفتگو بھی مؤثر ثابت نہ ہو سکی ، انھوں نے اپنے انبیاء کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ ہم ہر اس چیز کا انکار کرتے ہیں جس کو تم لے کر آئے ہو ۔ (قالوا انا بما ارسلتم بہ کافرون) ۔

انہوں نے اپنی مخالفت کی کوئی دلیل پیش کیے بغیر اور انبیاء الٰہی کی پیش کش کے بارے میں ذرہ بھر غور و خوض کیے بغیر فوراً ہی یہ کہہ دیا ۔

ظاہر ہے کہ ایسی سرکش ، ہٹ دھرم اور بے منطق قوم کو جینے اور زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور جلد یا بدیر ان پر عذاب الٰہی نازل ہونا ہی چاہیئے تاکہ اس قسم کے گھاس پھوس اور خس و خاشاک کا خاتمہ کر دے اور اسے راستے سے ہٹا دے ۔ لہٰذا اسی سلسلے کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے : لہٰذا ہم نے ان سے انتقام لیا اور انھیں سخت سزا دی ۔ (فانتقمنا منھم) ۔

---

[1] اس جملے کا ایک لفظ محذوف ہے ، جس کی تقدیر یوں ہے : " انتبعون اٰبائکم ولو جئتکم بدین اھدیٰ من دین اٰبائکم " (ملاحظہ ہو تفسیر کشاف ، مراغی ، قرطبی اور روح المعانی) ۔

کسی قوم کو طوفان کے ذریعے، کسی کو تباہ کن زلزلے کے ذریعے، کسی کو تیز و تند جھکڑ اور کسی کو بجلی کی چنگھاڑ کے ذریعے
غرض ہم نے ان میں سے ہر ایک کو تباہ کن حکم کے ذریعے نیست و نابود کر دیا اور ہلاک و فنا کر دیا۔
مشرکین مکہ کی عبرت آموزی کے لیے آیت کے آخر میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے اور فرمایا گیا ہے: دیکھ تو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا (فانظر کیف کان عاقبة المکذبین)۔
مکہ کے ہٹ دھرم مشرکین کو بھی ایسے ہی انجام کا انتظار کرنا چاہیئے۔

۲۶۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖۤ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝

۲۷۔ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ۝

۲۸۔ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

۲۹۔ بَلْ مَتَّعْتُ هٰۤؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝

۳۰۔ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ اس وقت کو یاد کرو، جب ابراہیم نے اپنے (منہ بولے) باپ (چچا آذر) اور اپنی قوم سے کہا کہ میں اس چیز سے بیزار ہوں، جن کی تم عبادت کرتے ہو۔

۲۷۔ سوائے اس خدا کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی میری راہنمائی بھی کرے گا

۲۸۔ اور اس نے کلمۂ توحید کو باقی رہنے والے کلمہ کی صورت میں اپنی اولاد میں قرار دیا تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں۔

۲۹۔ لیکن ہم نے ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد کو دنیاوی نعمتوں سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور خدا کا آشکار رسول پہنچ گیا۔

۳۰۔ لیکن جب ان کے پاس حق آگیا تو انھوں نے کہا: یہ تو جادو ہے اور ہم ہرگز اسے ماننے والے نہیں۔

تفسیر

توحید۔ انبیاء کا دائمی پیغام

ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت اور بابل کی بت پرست قوم کے واقع کی طرف اشارہ ہے تاکہ اس طرح سے گزشتہ آیات میں مذکور تقلید کی خدمت کو مکمل کیا جا سکے۔ کیونکہ:

ایک تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ملت عرب کے سب سے بڑے بزرگ اور جد امجد تھے۔ سب لوگ ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور انکی تاریخ پر فخر کیا کرتے تھے۔ جب وہ تقلید کے پردوں کو چاک کرتے ہیں تو اگر یہ لوگ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو انہیں ان کی اقتدار کرنی چاہیئے۔

اگر یہ بات طے ہے کہ آباء و اجداد کی تقلید کی جانی چاہیئے تو پھر بت پرستوں ہی کی تقلید کیوں کریں، ابراہیمؑ کی پیروی کیوں نہ کریں؟

دوسرے، جو بت پرست حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلے میں آگئے تھے وہ بھی اسی بے مقصد اور کھوکھلی دلیل (باپ دادا کی تقلید) کا سہارا لیتے تھے۔ لیکن جناب ابراہیم علیہ السلام نے ان کی اس دلیل کو یکسر مسترد کر دیا، جیسا کہ سورۂ انبیاء کی ۵۳ ویں اور ۵۴ ویں آیت میں ہے:

«قالوا وجدنا آباءنا لها عابدين قال لقد كنتم انتم و آباؤكم فی ضلال مبين»

«بت پرستوں نے کہا: ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا ہے کہ وہ ان (بتوں) کی پرستش کرتے ہیں تو اس (ابراہیمؑ نے) کہا: یقیناً تم اور تمہارے باپ دادا آشکار اور واضح گمراہی میں ہو»

تیسرے یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابتدائے اسلام کے مسلمانوں کے لیے ایک قسم کی تسلی اور دل جوئی کی صورت ہے کہ انھیں معلوم ہو کہ اس قسم کی مخالفتیں اور حیلے بہانے ہمیشہ رہے ہیں اُنھیں دل تنگ اور مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے اس وقت کو یاد کیجئے، جب ابراہیم نے اپنے (منہ بولے) باپ (آذر) اور اپنی بت پرست قوم سے کہا: میں اس چیز سے بیزار ہوں، جس کی تم عبادت کرتے ہو (واذ قال ابراهيم لابيه وقومه انني براء مما تعبدون)۔[1]

---

[1] "براء" (بروزن "سواء") مصدر ہے اور "تبری" کے معنی میں ہے اور ایسے مقامات پر وصفی معنی میں تاکید اور مبالغہ پایا جاتا ہے، جیسے "زید عدل" اور چونکہ مصدر ہے لہٰذا اس میں مفرد اور جمع مذکر اور مؤنث یکساں ہیں۔

چونکہ بہت سے بُت پرست خدا کی پرستش بھی کیا کرتے تھے لہٰذا اُنھوں نے فوراً ان کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا: سوائے اس خدا کے کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی میری راہنمائی کرے گا (الا الذی فطرنی فانہ سیھدین)۔

انھوں نے اس مختصر سی عبارت میں ایک تو معبودیت کو پروردگار عالم میں منحصر کردیا کیونکہ معبود وہی ہوسکتا ہے جو خالق کائنات اور مدبر عالم ہو اور یہ بات سب مانتے تھے کہ خالق، خدا ہے اور ساتھ ہی خدا کی تکوینی اور تشریعی ہدایت کی طرف اشارہ بھی ہے، کیونکہ لُطف کا قاعدہ اسی بات کا متقاضی ہے۔[1]

اس قسم کی باتیں سورۂ شعراء کی آیات ۷۷ تا ۸۲ میں بھی ذکر ہوچکی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فقط اپنی زندگی میں اصول توحید کے طرف دار اور ہر قسم کی بُت پرستی کے دشمن نہیں تھے۔ بلکہ انھوں نے سرتوڑ کوشش کی کہ کلمۂ توحید دُنیا میں ہمیشہ کے لیے باقی اور برقرار رہے۔ جیسا کہ بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: انھوں نے کلمۂ توحید کو باقی رہنے والے کلمہ کی صُورت میں اپنی اولاد میں مقرر کردیا تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں (وجعلھا کلمۃ باقیۃ فی عقبہ لعلھم یرجعون)۔[2]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آج روئے زمین پر جو دین بھی توحید کا دم بھرتا ہے وہ ابراہیم کی توحید پر مبنی تعلیمات سے ہدایت لیتا ہے اور خدا کے تینوں عظیم پیغمبروں یعنی جناب مُوسیٰؑ، جناب عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفےٰ علیہم السلام انھی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اس بارے میں قرآن مجید کی یہ ایک سچی پیش گوئی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کے انبیاء مثلاً نوح علیہ السلام نے بھی شرک اور بُت پرستی کے خلاف نبرد آزمائی کی اور دُنیا والوں کو توحید کی دعوت دی لیکن جس پیغمبر نے کلمۂ توحید کو استحکام بخشا اور اس کے پرچم کو ہر جگہ بلند کیا وہ ابراہیم بت شکن ہی تھے۔

انھوں نے نہ صرف اپنے زمانے میں رلو توحید کو دوام بخشنے کی جدوجہد کی بلکہ اپنی دعاؤں میں بھی پروردگار عالم سے اسی بات کی درخواست کرتے رہے کہ:

"واجنبنی و بنیّ ان نعبد الاصنام"

"مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے دور رکھ کہ ہم بتوں کی عبادت کریں"

(ابراھیم۔ ۳۵)

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "الا الذی فطرنی" میں استثناء متصل ہے کیونکہ بہت سے بُت پرست اللہ کے منکر نہ تھے۔ بلکہ اس کے غیر کو اس کا شریک سمجھتے تھے۔ البتہ یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ استثنائے منقطع ہے اور "الا" "لٰکن" کے معنی میں ہے کیونکہ "ما تعبدون" کی تعبیر بتوں کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ خدا کے بارے میں عموماً یہ تعبیر نہیں ہوتی (غور کیجیے گا)

[2] "عقب" بنیادی طور پر پاؤں کی ایڑی کے معنی میں ہے۔ البتہ بعد ازاں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی اور یہ لفظ اولاد اور پھر اولاد کی اولاد کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

یہاں پر ایک اور تفسیر بھی ملتی ہے اور وہ یہ کہ "جعل" میں جو ضمیر ہے وہ خدا کی طرف لوٹ رہی ہے اس لحاظ سے اس جملے کا معنی یوں ہوگا: خدا نے کلمۂ توحید کو ابراہیمؑ کی اولاد میں برقرار رکھا۔

لیکن پہلی تفسیر یعنی ضمیر کا ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلے جملے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کارناموں کا ایک جزو قرار پائے خصوصاً قرآن مجید کی دوسری بہت سی آیات میں اس بات کو زیادہ زور دے کر بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس بات پر اصرار رہا ہے کہ ان کی اولاد اور نسلیں خدائی دین پر باقی رہیں۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۳۱ اور ۱۳۲ میں ہے۔

"اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین و وصّٰی بھا ابراھیم بنیہ و یعقوب یا بنیّ ان اللہ اصطفٰی لکم الدین فلا تموتن الّا و انتم مسلمون۔"

"اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ کے رب نے ان سے کہا کہ اسلام لے آؤ اور حق کے آگے جھک جاؤ تو انھوں نے کہا کہ میں عالمین کے پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کر چکا ہوں اور ابراہیمؑ نے اپنی اولاد سے بھی اسی توحیدی دین کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی اور کہا اے میرے بیٹو! خدا نے اس دین کو تمھارے لیے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ہی۔

اگر یہ تصور ہو کہ "جعل" کی تعبیر، تخلیق اور آفرینش کے معنی میں ہے اور خداوند عالم ہی کے ساتھ مخصوص ہے تو یہ تصور غلط ہوگا۔ کیونکہ "جعل" کا اطلاق انسانوں اور غیر انسانوں دونوں پر ہوتا ہے اور قرآن مجید میں اس قسم کے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوسف علیہ السلام کی داستان میں ملتا ہے کہ جب انھیں بھائیوں نے کنویں میں ڈالنے کی ٹھان لی تو قرآن مجید نے وہاں بھی لفظ "جعل" (قرار دینا) استعمال کیا ہے، جیسے:

"فلما ذھبوا بہ واجمعوا ان یجعلوہ فی غیابت الجب۔ (یوسف-۱۵)

ہماری اس گفتگو سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ "جعلھا" میں مفعول کی ضمیر کلمۂ توحید اور "لا الٰہ الّا اللہ" کی گواہی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کیونکہ "اننی براء مما تعبدون" (میں اس چیز سے بیزار ہوں جس کی تم پرستش کرتے ہو) سے یہ بات سمجھی جاتی ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی آیندہ نسلوں میں توحیدی نظریئے کے قائم و دائم رہنے کی مخلصانہ کوششوں کی خبر بھی ملتی ہے۔

متعدد روایات جو ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں بھی ضمیر کا مرجع مسئلہ امامت کو بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تعبیر میں فاعل کی ضمیر خدا کی طرف لوٹے گی۔ یعنی خداوند عالم نے مسئلہ امامت کو ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں دائم و برقرار کر دیا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: میں نے تمھیں امام بنا دیا ہے۔

تو انھوں نے عرض کی کہ ان کی اولاد میں بھی امام ہونے چاہئیں، چنانچہ خداوند تعالٰی نے ان کی دعا کو قبول فرما لیا۔ البتہ ظالم اور ستمگر لوگوں کو اس سے مستثنٰی قرار دے دیا۔ ملاحظہ ہو:

" قال انی جاعلک للناس اماماً قال ومن ذریتی قال لا ینال عہدی الظالمین "
لیکن بادی النظر میں جو مشکل معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ زیرِ تفسیر آیت میں امامت کی بات نہیں ہو رہی، مگر یہ کہ یہ کہا جائے کہ "سیھدین" (خدا مجھے ہدایت کرے گا) کے جملہ کو اس معنی کی طرف ایک اشارہ سمجھیں کیونکہ انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی ہدایت بھی خدا کی ہدایت مطلقہ کی ایک شعاع ہے اور امامت اور ہدایت کی حقیقت ایک ہے۔

اس سے بھی بہتر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ امامت کا مسئلہ کلمۂ توحید ہی میں مندرج ہے کیونکہ توحید کی کئی فروعات ہیں جن میں سے ایک فرع حاکمیت، ولایت اور راہبری میں توحید و وحدت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حضرات ائمہ علیہم السلام اپنی ولایت اور رہبری خدا کی طرف سے حاصل کرتے ہیں، نہ کہ از خود امام اور رہبر بن جاتے ہیں۔ اسی لیے یہ روایات " جعلھا کلمۃ باقیۃ " کا ایک مصداق اور اس کے کلی مفہوم کی ایک فرع سمجھی جائیں گی۔ بنابریں یہ تفسیر پہلی تفسیر سے متضاد نہیں ہوگی جو ہم اوائل میں بیان کر چکے ہیں (غور کیجیے گا) [1]

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ مفسرین نے " فی عقبہ " کی تفسیر میں کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے رہتی دنیا تک ابراہیم علیہ السلام کی تمام ذریت اور نسل سے اس کی تفسیر کی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ صرف ابراہیم کی قوم اور ان کی اُمت سے مخصوص ہے۔ بعض نے آل محمد علیہم السلام سے تفسیر کی ہے۔ لیکن جو بات بظاہر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا مفہوم وسیع اور عمومی ہے جو تا قیام قیامت ابراہیم کی اولاد پر محیط ہے اور آل محمد کی تفسیر اس کا ایک واضح اور روشن مصداق ہے۔

بعد کی آیت درحقیقت کئی سوالوں کا ایک جواب ہے اور وہ یہ کہ ان حالات کے باوجود آخر کیا وجہ ہے کہ خداوند عالم مشرکین مکہ کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا؟ کیا ہم ابھی گزشتہ آیات میں نہیں پڑھ چکے کہ خداوند عالم مشرکین مکہ کو عذاب کیوں نہیں دیتا؟ کیا ہم اس سے پہلے کی آیات میں یہ نہیں پڑھ چکے " فانتقمنا منھم " (گزشتہ اقوام میں سے جنہوں نے انبیاء کی تکذیب کی اور اپنے اس کام پر مصر رہے ہم نے ان سے انتقام لے لیا)۔

اس سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے: بلکہ ہم نے (مشرکین مکہ کے) اس گروہ اور ان کے باپ دادا کو دنیاوی نعمتوں سے بہرہ مند کیا حتیٰ کہ حق اور خدا کا واضح رسول ان کے پاس آ گیا۔ (بل متعت ھؤلاء وآباءھم حتّٰی جاءھم الحق ورسول مبین)۔

ہم نے شرک و بت پرستی کے باطل ہونے میں صرف عقلی حکم پر اکتفا نہیں کیا اور نہ ہی توحید کے بارے میں صرف ضمیر کے حکم کو کافی سمجھا بلکہ اتمام حجت کے لیے انہیں مہلت دی حتیٰ کہ یہ آسمانی کتاب جو سرتا پا حق ہے اور یہ عظیم الشان پیغمبر یعنی حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی ہدایت کے لیے آ گئے۔

دوسرے لفظوں میں گزشتہ آیت میں " لعلھم یرجعون " اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ حضرت ابراہیم کی تمام کوششوں کا مقصد یہی تھا کہ انکی تمام نسلیں راہ توحید کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ عرب اس بات کے مدعی تھے کہ وہ

---

[1] صاحب تفسیر نور الثقلین نے ان احادیث کو جلد چہارم ص۵۹۶ و ص۵۹۵ میں ذکر کیا ہے۔ اور یہ تفسیر برہان جلد ۴ ص۱۴۱ و ص۱۴۰ میں بھی مذکور ہیں۔

ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس طرف رجوع نہیں کیا۔ مگر پھر بھی خدا نے انھیں مہلت دی، یہاں تک عظیم رسولؐ اور نئی کتاب ان کے پاس پہنچ گئی تاکہ وہ اس گراں خوابی سے بیدار ہوں، چنانچہ بہت سے لوگ بیدار ہو بھی گئے۔

لیکن تعجب کی بات ہے کہ "جب حق (قرآن مجید) ان کے پاس پہنچ گیا، تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی اصلاح کرتے اور گزشتہ غلطیوں اور گناہوں کا ازالہ کرتے، اُلٹا بہت سے لوگوں نے مخالفت پر کمر باندھ لی اور کہا یہ تو جادُو ہے اور ہم اس کا انکار کرتے ہیں" (ولما جاءهم الحق قالوا هذا سحر وانا به كافرون)۔

جی ہاں! انھوں نے قرآن کو جادُو کہا اور خدا کے عظیم الشان پیغمبر کو جادُوگر۔ اگر وہ اپنی اس روش سے باز نہ آتے تو عذاب الٰہی ان کے دامن گیر ہو جاتا۔

۳۱۔ وَقَالُوا لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ ○

۳۲۔ اَهُمۡ يَقۡسِمُوۡنَ رَحۡمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُمۡ مَّعِيۡشَتَهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا ؕ وَرَحۡمَتُ رَبِّكَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ○

ترجمہ

۳۱۔ اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دو شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے (مالدار) آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟

۳۲۔ کیا یہ لوگ تمھارے پروردگار کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیاوی زندگی میں تقسیم کر دیا ہے، اور بعض لوگوں کو بعض دوسرے لوگوں پر فوقیت دی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کی خدمت کریں اور آپس میں تعاون کریں اور جو کچھ یہ لوگ جمع کرتے ہیں، تمھارے پروردگار کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے۔

تفسیر

قرآن کسی دولت مند پر نازل کیوں نہیں ہوا؟

گزشتہ آیات میں انبیاء کی دعوت کے ردِ عمل میں مشرکین کی حیلہ سازیوں اور بہانہ جوئیوں کا تذکرہ تھا۔ کبھی تو وہ اس دعوت کو جادو کہتے اور کبھی اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کا بہانہ پیش کرتے ہوئے فرامین الٰہی سے پیٹھ پھیر لیتے۔ لیکن زیرِ تفسیر

آیات میں خداوندِ عالم ان کے ایک اور بے بنیاد اور کھوکھلے بہانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ، انہوں نے کہا یہ قرآن ان دو شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے (مالدار اور مشہور) آدمی پر نازل کیوں نہیں ہوا (وقالوا لولا نزل ھٰذا القرآن علیٰ رجل من القریتین عظیم)۔

ایک لحاظ سے انھیں حق پہنچتا تھا کہ اس قسم کے حیلوں بہانوں سے کام لیں کیونکہ ان کے نکتہ نظر سے انسانی اقدار کا معیار مال و دولت ، ظاہری آن بان شہرت اور شان و شوکت تھی - یہ سر پھرے یہ سمجھتے تھے کہ ان کے دولت مند اور ظالم قبائلی سردار ہی کو خدا کی بارگاہ میں سب لوگوں سے زیادہ تقرب حاصل ہے - لہٰذا وہ تعجب کرتے تھے کہ نبوت اور رحمت جیسی یہ عظیم نعمت اس قسم کے لوگوں پر نازل کیوں نہیں ہوئی ؟ بلکہ اس کے برعکس ایک یتیم ،غریب اور نادار انسان یعنی محمدؐ بن عبد اللہ پر نازل ہو گئی ! یہ تو باور کرنے کی بات ہی نہیں ہے ۔

جی ہاں ایسے غلط اقدار پر مبنی نظام سے ایسا ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے ۔عظیم انسانی معاشروں کی سب سے بڑی مصیبت اور ان کے انکار کی کجی کا اصل سبب یہی غلط اقدار پر مبنی نظام ہیں جو بسا اوقات حقائق کو مکمل طور پر الٹ کر رکھ دیتے ہیں۔

جب کہ اس دعوتِ الٰہی کا حامل ایسا شخص ہونا چاہیئے جس کے تمام وجود کو تقویٰ کی روح نے معمور کر رکھا ہو، باخبر اور بابصیرت ہو، عزم صمیم کا حامل ہو، شجاع اور عادل ہو اور محروم و مظلوم لوگوں کے درد سے آشنا ہو - یہ ہیں وہ شرائط اور اقدار جو اس آسمانی رسالت کے حامل شخص میں پائی جانا ضروری ہیں نہ کہ خوبصورت لباس ، گراں قیمت اور اونچے محلات اور ظاہری آن بان - خدا کے انبیاء تو خاص طور پر ایسی چیزوں سے محروم تھے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اصلی اقدار جھوٹی قدروں کے ساتھ گڈ مڈ ہو جائیں ۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مکہ اور طائف کے وہ کون لوگ تھے جو ان بہانہ سازوں کے پیشِ نظر تھے ؟ اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں - البتہ اکثر مفسرین طائف سے عروہ بن مسعود ثقفی اور مکہ سے ولید بن مغیرہ مراد لیتے ہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے مکہ سے عتبہ بن ربیعہ کا اور طائف سے حبیب بن عمر ثقفی کا نام لیا ہے۔

لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی گفتگو کسی خاص شخص کے بارے میں نہیں تھی ، بلکہ ان کا مقصود کوئی بھی مالدار ، مشہور اور قوم و قبیلہ کا سردار شخص تھا ۔

قرآن مجید ایسی غلط اور خرافاتی طرز فکر کو سرکوب کرنے کے لیے دندان شکن جواب دیتا ہے اور اسلامی و خدائی نکتۂ نظر کو مکمل طور پر مجسم کرتے ہوئے پہلے تو فرماتا ہے : آیا یہ لوگ تمہارے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں۔ (اھم یقسمون رحمت ربک)۔

تاکہ جسے چاہیں نبوت عطا کر دیں ، جس پر چاہیں آسمانی کتاب نازل کر دیں اور جس کے متعلق نہ چاہیں اس کے ساتھ ایسا نہ کریں وہ غلط سمجھتے ہیں۔ تمہارے رب کی رحمت کو خود وہی تقسیم کرتا ہے اور سب سے بہتر جانتا ہے کہ کون شخص اس عظیم مرتبے کے لائق ہے ؟ جیسا کہ سورۂ انعام کی ۱۲۴ ویں آیت میں بھی ذکر ہوا ہے ۔

" اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ "

" خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں قرار دے "

اس سے بھی قطع نظر اگر لوگوں کی زندگی میں کوئی فرق اور اختلاف پایا جاتا ہے تو یہ ان کے معنوی اور روحانی مقامات ومراتب میں فرق کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتی ۔ بلکہ ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیاوی زندگی میں تقسیم کردیا ہے اور بعض لوگوں کو دوسرے بعض لوگوں پر فوقیت دی ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے کی خدمت کریں اور آپس میں تعاون کریں (نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیٰوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضا سخریا)۔

انھوں نے اس بات کو فراموش کردیا ہے کہ انسانی زندگی ایک اجتماعی زندگی ہے اور اس کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور آپس کی خدمت کے بغیر نہیں چلایا جاسکتا اگر تمام لوگ زندگی اور استعداد کے لحاظ سے ایک ہی سطح پر ہوں اور معاشرے میں ان سب کا ایک جیسا مقام ہو تو تعاون اور ایک دوسرے کی خدمت اور ایک دوسرے سے بہرہ مندی کا اصول متزلزل ہو جائے گا۔

اسی لیے انھیں اس قسم کی تفریق دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ ہی وہ اسے انسانی اقدار کا معیار سمجھ بیٹھیں۔

بلکہ تمہارے پروردگار کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے جو کچھ یہ لوگ اکٹھا کرتے ہیں خواہ وہ جاہ ومقام ہو یا مال ودولت ۔ (ورحمت ربک خیر مما یجمعون)۔

بلکہ یہ تمام دنیاوی عہدے ،منصب، مال اور دولت پروردگار کی رحمت اور اس کے قرب کے مقابلے میں مکھی کے پَر کے برابر بھی قدر وقیمت نہیں رکھتے۔

اس آیت میں "ربک" دو مرتبہ آیا ہے، جو پروردگار عالم کے خاص لطف وکرم کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔ جو اس نے اپنے پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرمایا ہے کہ ان کی قامت رسا کو نبوت وخاتمیت کی خلعت زیبا سے مزین فرمایا ہے۔

دو اہم سوالوں کا جواب

اس موقع پر کئی سوال مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ کرتے وقت پیش آتے ہیں اور دشمنان اسلام کی طرف سے بھی انھیں دستاویزی ثبوت کے طور پر اسلام کے آفاقی نظریئے پر حملہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ قرآن مجید نے کیونکر انسان کے ذریعے انسان کی خدمت اور تسخیر کو جائز قرار دیا ہے ؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے اقتصادی اعتبار سے ایسے طبقاتی نظام کی تائید کی ہے جس میں ایک طبقہ خدمت لینے والا ہو اور دوسرا خدمت کرنے والا ؟

پھر یہ کہ اگر روزی اور معیشت خدا کی طرف سے تقسیم ہوچکی ہے اور یہ اقتصادی اونچ نیچ اسی کی جانب سے ہے تو پھر رزق کی تلاش ہمارے لیے کس حد تک مفید اور ثمر آور ثابت ہوسکتی ہے ؟ آیا اس طرح سے زندگی کے لیے کوشش اور جد وجہد کی نفی نہیں کی گئی ؟

اگر آیت مجیدہ کے متن میں غور کیا جائے تو ان سوالوں کا جواب بخوبی واضح ہو جاتا ہے جو لوگ اس طرح کے

اعتراضات کرتے ہیں ان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ انسانوں کا ایک خاص طبقہ دوسرے لوگوں کو مسخر اور تابع فرمان بنا لے اور تسخیر بھی انسان سے ظالمانہ استحصال کے معنی میں۔

حالانکہ ایسی بات نہیں ہے بلکہ اس سے مراد لوگوں کی عمومی طور پر ایک دوسرے سے خدمت طلبی ہے۔ یعنی ہر طبقہ کے اپنے مخصوص وسائل اور استعداد ہوتے ہیں جس کے پیش نظر وہ زندگی کے کچھ مسائل میں سرگرمی دکھاتا ہے اور طبعی طور پر ان مسائل کے بارے میں اسی کی خدمات دوسروں کے کام آتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے طبقوں کی دوسرے مسائل ہیں۔ تو گویا ان کی خدمت طلبی برابر کی سطح پر ہوتی ہے اور طرفین کے درمیان پائی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اصل مقصد اور زندگی میں ایک دوسرے سے تعاون ہوتا ہے نہ کہ کوئی دوسری بات۔

از خود واضح ہے کہ اگر تمام لوگ ہوش و حواس اور روحانی و جسمانی لیاقتوں کے لحاظ سے برابر ہوتے تو اجتماعی لحاظ سے کبھی نظم وجود میں نہ آسکتا۔ جس طرح کہ اگر انسانی بدن کے تمام خلیے ساخت، دفاعی قوت کے لحاظ سے ایک جیسے ہوتے تو انسانی جسم کا نظام بگڑ جاتا پاؤں کی ایڑی کی ہڈی کے مضبوط اور طاقت ور خلیے کہا اور آنکھ کی جھلی کے لطیف و نازک خلیے کہا؛ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی طرز ساخت کے مطابق اپنا اپنا کام انجام دینے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

اس کے لیے زندہ مثال انسانی جسم کے مختلف اعضا کی ایک دوسرے کی خدمت کے حوالے سے دی جا سکتی ہے جو سانس لینے، خون کی گردش کرنے، غذا کھانے اور دوسری جسمانی فعالیت کی صورت میں موجود ہے اور یہ "لیتخذ بعضھم بعضا سخریا" کا روشن مصداق ہے (البتہ جسم کی اندرونی فعالیت کی حد تک) تو کیا اس قسم کی تسخیر پر کسی قسم کا اعتراض وارد ہو سکتا ہے؟۔

اگر یہ کہا جائے کہ "رفعنا بعضھم فوق بعض درجات" کا جملہ عدالت اجتماعی کے خلاف نظریہ پیش کرتا ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے جب "عدالت" کا معنی "مساوات" کیا جائے، جبکہ حقیقی عدالت یہ ہے کہ جو چیز جس کام کے لیے ہے وہیں پر قرار پائے۔ تو کیا کسی فوجی ادارے یا ملکی امور کو چلانے کے لئے مراتب یا مناصب کا وجود اس کے ظالم ہونے پر دلالت کرتا ہے؟

ممکن ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں، جو نعرہ کی صورت میں "مساوات" کے کلمہ کو اس کے حقیقی مفہوم سے بے توجہ ہو کر اسے ہر جگہ استعمال کریں، لیکن یہ صرف نعرے کی صورت میں ہوگا۔ عملی زندگی میں باہمی فرق کے بغیر نظم وجود میں آسکتا ہی نہیں لیکن یہ باہمی فرق ایک انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کے استحصال کا ذریعہ بھی نہیں بننا چاہیئے۔ سب لوگوں کو آزاد ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں، اپنی استعداد کو جلا بخشیں اور اپنی سرگرمیوں کے نتائج سے کما حقہ، فائدہ اٹھائیں اور جہاں ان کی دسترس نہیں ہے، ان لوگوں کو جو طاقت رکھتے ہیں، اُن کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔

اب رہا دوسرا سوال کہ یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ جب ہر شخص کا رزق مقرر ہو چکا ہے پھر کوشش اور جدوجہد کو جاری رکھا جاتے؟ لیکن انھیں یہ غلط فہمی اس لیے ہوئی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ خداوند عالم نے انسان کی سعی و کوشش کو اہمیت نہیں دی اور نہ ہی اسے سعی و کوشش کا حکم دیا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ خداوندِ عالم نے مختلف سرگرمیوں کے لیے انسان کے اندر صلاحیتیں بھی مختلف ودیعت فرمائی ہیں اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ انسانی زندگی میں اس کے اپنے ارادے سے ہٹ کر کچھ بیرونی عوامل بھی بڑی حد تک اثر انداز ہیں لیکن اس کے باوجود ان عوامل میں سے ایک اہم اور بنیادی عامل سعی و کوشش کو بھی قرار دیا گیا ہے اور " ان لیس للانسان الا ما سعیٰ (نجم-۳۹) کے اصول کے پیشِ نظر اس نکتے کی بھی وضاحت کردی ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں اس کا بڑا حصہ اس کی جدوجہد اور سعی و کوشش کا مرہونِ منت بھی ہے۔

بہرحال ایک نہایت ہی باریک اور دقیق نکتہ یہ بھی ہے کہ بنی نوعِ انسان ایک طرح کا برتن نہیں ہیں جو ایک کارخانے میں ایک ہی شکل و صورت، ایک ہی قالب اور پیمانے سے اور ایک ہی طرح کا فائدہ پہنچانے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ اگر یہی کیفیت ہوتی تو وہ ایک دن بھی باہر مل جُل کر زندگی بسر نہ کر سکتے۔

اور نہ ہی انسان کسی مشنری کے نٹ بولٹ کی طرح تخلیق کیے گئے ہیں کہ جس کے بنانے والے اور انجینئر نے اسے کس دیا ہے اور وہ مجبورًا اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس تمام بنی نوعِ انسان ارادی طور پر آزاد بھی ہیں اور ساتھ ہی ذمہ داری اور فرائض کی ادائیگی کے لیے پابند بھی ہیں۔ اس کے باوجود ان کی صلاحیتیں اور لیاقتیں بھی مختلف ہیں اور ایسے خاص مرکب اور مجموعے کا نام انسان ہے۔ چنانچہ اگر اس بارے میں کوئی اعتراض کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اعتراض کرنے والے انسان کی معرفت سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔

قصہ مختصر، خداوندِ عالم نے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر فوقیت اور برتری عطا نہیں کی۔ بلکہ جملہ " رفع بعضهم فوق بعض درجات " کے پیشِ نظر تمام لوگوں میں مختلف امتیازات پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے انہیں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل ہے اور ہر طبقے کی دوسرے طبقے سے حصولِ خدمت اور تسخیر بھی انہیں امتیازات کے پیشِ نظر ہوتی ہے اور اسی چیز کا نام عدالت، تدبیر اور حکمت ہے۔[1]

---

[1] اس سلسلے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۲، سورۂ نساء کی ۳۲ ویں آیت اور جلد ۳ میں سورۂ انعام کی ۱۶۵ ویں آیت کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔

۳۳۔ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝

۳۴۔ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِئُوْنَ ۝

۳۵۔ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۳۔ اگر کفار کا مادی وسائل سے استفادہ اس بات کا سبب نہ ہوتا کہ گمراہی میں سب لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم ان کے لیے جو خدا کا انکار کرتے ہیں گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور وہ سیڑھیاں بھی جن پر وہ چڑھتے ہیں۔

۳۴۔ اور ان کے گھروں کے دروازے اور وہ (خوبصورت نقرئی) تخت جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں۔

۳۵۔ اور زیب و زینت کے دوسرے وسائل بھی، لیکن یہ سب کچھ تو صرف دنیاوی زندگی کے ساز و سامان ہیں اور آخرت تو تیرے پروردگار کے نزدیک صرف پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

تفسیر

چاندی کے محل ۔ جھوٹی قدریں

یہ آیات بھی اسلامی نظام کی اقدار کا ذکر کر رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ مال و دولت اور مادی جاہ و منصب کوئی معیار نہیں ہے ۔ چنانچہ اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے : اگر کفار کا مادی وسائل سے استفادہ اس بات کا سبب نہ ہوتا کہ تمام لوگ کفر کی طرف مائل ہو کر گمراہی میں ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے ، تو ہم ان لوگوں کے جو خداوند رحمان کا انکار کرتے ہیں ، گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے (ولولا ان یکون الناس امة واحدة لجعلنا لمن یکفر بالرحمٰن لبیوتھم سقفًا من فضة)۔[1]

اور جن گھروں کی کئی منزلیں ہوتی ہیں ان کی " سیڑھیاں بھی کہ جن پر وہ چڑھتے ہیں ۔ (ومعارج علیھا یظھرون)۔[2]

بہت سے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں پر مراد چاندی کی سیڑھیاں ہیں اور لفظ " فضة " (چاندی) کو دوبارہ اس لیے نہیں لایا گیا کیونکہ وہ واضح طور پر موجود ہے اس طرح سے گویا انھوں نے صرف سیڑھیوں کے وجود کو گھروں کی اہمیت کی دلیل نہیں سمجھا ، حالانکہ ایسی بات نہیں ہے ، کیونکہ بہت سی سیڑھیوں کا وجود ہی مکانات کی عظمت اور کئی منزلہ ہونے کی دلیل ہے ۔

" سُقُف " (بروزن شُتُر) " سَقف " کی جمع ہے ۔ البتہ کچھ مفسرین اسے " سقیفہ " (چھپی ہوئی جگہ) کی جمع سمجھتے ہیں ۔ لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے ۔

پھر فرمایا گیا ہے کہ اس کے علاوہ ہم ان کے گھروں کے دروازے اور وہ تخت قرار دیتے جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں : (ولبیوتھم ابوابًا وسررًا علیھا یتکئون)۔

ممکن ہے کہ یہ جملہ نقرئی دروازوں اور تختوں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ سابقہ آیت میں چھتوں کے نقرئی بننے کا ذکر ہے اور یہاں پر نقرئی ہونے کو دوبارہ ذکر نہ کیا گیا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ کئی دروازوں اور کئی تختوں کی طرف اشارہ ہو (" ابوابًا " اور " سررًا " چونکہ نکرہ ہیں اور یہاں پر اہمیت بیان کرنے کے لیے آئے ہیں) جو بذات خود ان محلات کی عظمت کی ایک دلیل ہے ۔ کیونکہ کسی معمولی اور حقیر سے گھر میں متعدد دروازے نہیں ہوا کرتے ۔ بلکہ یہ بات بڑے بڑے محلات اور اونچی اونچی عمارتوں ہی سے مخصوص ہوا کرتی ہے ۔ اسی طرح تخت بھی ایسی ہی عمارتوں میں پائے جاتے ہیں ۔

---

[1] " لبیوتھم " " لمن یکفر بالرحمٰن " کا بدل الاشتمال ہے اور لام کو بھی دوبارہ اسی لیے لایا گیا ہے یا پھر " لبیوتھم " کی لام " علیٰ " کے معنی میں ہے جس کا مفہوم یہ ہوگا " علیٰ بیوتھم " لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح ہے ۔

[2] " معارج " معراج کی جمع ہے جس کا معنی ہے ۔ ایسا ذریعہ جس کی وجہ سے انسان بالائی منزلوں پر جاتا ہے ۔

پھر بھی اسی بات پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ آگے چل کر فرمایا گیا ہے کہ اس کے علاوہ زیب و زینت کے دوسرے وسائل بھی" (وزخرفا) ۱؎

تاکہ ان کی پر تعیش زندگی ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے۔ یعنی نقرئی چھتوں کی با شکوہ اور کئی منزلہ محلات اور عمارتیں، متعدد دروازے اور تخت، زیب و زینت کے مختلف وسائل اور ہر قسم کے نقش و نگار جو عام طور پر دُنیا پرستوں کے مطلوب، مقصود اور معبود ہوا کرتے ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: لیکن یہ سب کچھ دنیاوی مادی زندگی کے وسائل ہیں اور تیرے پروردگار کے نزدیک آخرت تو صرف پرہیزگاروں کے لیے ہے۔ (وان کل ذالک لما متاع الحیٰوة الدنیا والاٰخرة عند ربک للمتقین)۔

"زخرف" دراصل ہر اس زینت اور آرائش کو کہتے ہیں جس میں طرح طرح کے نقش و نگار ہوں اور چونکہ زینت کا ایک اہم ترین ذریعہ "سونا" ہے لہٰذا اسے بھی "زخرف" کہتے ہیں اور فضول باتوں کو اس لیے "زخرف" کہا جاتا ہے کیونکہ ان پر ملمع سازی کرکے پیش کیا جاتا ہے۔

المختصر مادی سرمایہ اور دنیاوی زینت کے یہ وسائل اللہ کی بارگاہ میں اس قدر بے قدر و قیمت ہیں کہ صرف کفار و منکرین حق جیسے بے قدر و قیمت افراد ہی کے شایان شایان ہو سکتے ہیں۔ اگر کم ظرف اور دُنیا کے دل دادہ بے ایمانی اور کفر کی جانب جھکاؤ پیدا نہ کر لیتے تو خداوند عالم اس سہارے کو صرف اپنی درگاہ سے دھتکارے ہوئے لوگوں کے ہی نصیب کرتا تاکہ سب لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ ایسے امور انسانی قدر و قیمت اور شخصیت کا معیار نہیں ہوا کرتے۔

چند اہم نکات

۱۔ **اسلام غلط اقدار کی نفی کرتا ہے:** حقیقت یہ ہے کہ جھوٹی اور غلط اقدار کی نفی اور ان پر خط تنسیخ کھینچنے کے لیے مندرجہ بالا آیات میں موجود تعبیر سے بڑھ کر کوئی اور تعبیر نہیں ہو سکتی۔ اسے آنحضرتؐ کو ایسے معاشرے کو منقلب کرنے اور اس میں تبدیلی لانے کے لیے بھیجا گیا جس میں افراد کی شخصیت کا معیار اونٹوں کی تعداد، درہم و دینار کی مقدار، غلاموں اور کنیزوں کی تعداد اور زینت و آرائش کے وسائل اور گھر تھے۔ حتیٰ کہ وہ اس بات پر بھی تعجب کرتے تھے کہ محمدؐ بن عبداللہ جو یتیم اور مادی لحاظ سے غریب انسان ہے، اسے نبوت کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔ سب سے پہلا اور بنیادی کام ایسے معاشرے میں تبدیلی کے لیے یہ ہوتا ہے کہ اس کے ایسے غلط معیاروں کو مسمار کر کے اس پر صحیح انسانی اقدار کی بنیاد رکھی جائے جس میں تقوٰے اور پرہیزگاری

۱؎ بعض مفسرین "زخرفا" کو "سقفا" پر عطف اور زینت کے مستقل وسائل کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو اس قسم کے لوگوں کے پاس ہوتے ہیں اور بعض "من فضة" پر عطف جانتے ہیں جو اصل میں "من زخرف" ہے۔ پھر اسے "نزع خافض" کی وجہ سے منصوب کیا گیا ہے تو ایسی صورت میں جملے کا مفہوم یوں ہوگا "ان کے گھروں کی چھتوں، دروازوں اور تختوں میں سے کچھ کو تو ہم نے سونے کے اور کچھ کو چاندی کے بنایا ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

علم اور دانش، ایثار و فداکاری اور شجاعت و بہادری جیسی صفات پائی جائیں ورنہ ہر اصلاح ظاہری، سطحی اور ناپائیدار ہوگی۔

یہ وہی کام ہے جسے اسلام، قرآن اور خود رسول اللہ نے اعلیٰ ترین صورت میں انجام دیا ہے جس کی وجہ سے خرافات پر مبنی ایک پسماندہ ترین انسانی معاشرہ مختصر سے عرصے میں اس قدر ترقی کر گیا کہ اس کا شمار دنیا کے صف اول کے معاشروں میں ہونے لگا۔ یہ بات لائق توجہ ہے کہ اسی پروگرام کی تکمیل کے لیے، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

"لو وزنت الدنيا عند الله جناح بعوضة ما سقى الكافر منها شربة ماء"

"اگر خدا کے نزدیک دنیا کا وزن مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتا تو اس سے کافر کو پانی کے ایک گھونٹ تک نہ پلاتا"[1]

حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اس بارے میں بات کو نہایت کمال سے بیان فرمایا ہے:

"موسیٰ (علیہ السلام) اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو ساتھ لے کر اس حالت میں فرعون کے پاس آئے کہ ان کے جسم پر اونی کرتے اور ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں اور اس سے قول و قرار کیا کہ اگر وہ اسلام قبول کرے تو اس کا ملک بھی باقی رہے گا اور اس کی عزت بھی برقرار رہے گی۔ تو اس نے (اپنے حاشیہ نشینوں سے) کہا کہ تمہیں اس پر تعجب نہیں ہوتا کہ یہ دونوں مجھ سے یہ معاملہ ٹھہرا رہے ہیں کہ میری عزت بھی برقرار رہے گی اور میرا ملک بھی باقی رہے گا اور جس طرح کے خستہ حال اور ذلیل صورت میں یہ ہیں تم دیکھ ہی رہے ہو (اگر ان میں اتنا دم خم تھا تو پھر) ان کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن کیوں نہیں پڑے ہوئے؟ یہ اس لیے کہ وہ سونے کو اور اس کی جمع آوری کو بڑی چیز سمجھتا تھا اور اونی کپڑوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔"

"اگر خدا یہ چاہتا کہ جس وقت اس نے نبیوں کو مبعوث کیا ان کے لیے سونے کے خزانوں اور خالص طلائی کانوں کے منہ کھول دیتا اور ان کے لیے مہیا کر دیتا اور فضا کے پرندوں اور زمین کے صحرائی جانوروں کو ان کے ہمراہ کر دیتا تو کر سکتا تھا اور اگر ایسا کرتا تو پھر آزمائش ختم اور جزا و سزا بے کار ہو جاتی۔

اسی خطبے کے دوسرے حصے میں فرماتے ہیں۔

"تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے آدم سے لے کر اس جہاں کے آخر تک کے اگلوں پچھلوں کو ایسے پتھروں سے آزمایا ہے کہ جو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ فائدہ، نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے ان پتھروں ہی کو اپنا محترم گھر قرار دیا کہ جسے لوگوں کے لیے (امن کے) قیام کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ پھر یہ کہ اس نے اسے زمین کے رقبوں میں ایک سنگلاخ رقبہ اور دنیا میں بلندی پر واقع ہونے والی آبادیوں میں سے ایک کم مٹی والے مقام اور گھاٹیوں میں سے تنگ اطراف کی گھاٹی میں قرار دیا کہ کھردرے

---

[1] تفسیر کشاف جلد ۴ صفحہ ۲۵

اور کھردرے پہاڑوں، نرم ریتلے میدانوں، کم آب چشموں اور بکھرے ہوئے دیہاتوں کے درمیان کہ جہاں اونٹ، گھوڑا، گائے بکری نہیں پل سکتے، پھر بھی اُس نے آدم اور ان کی اولاد کو حکم دیا کہ اپنا رُخ اس کی طرف موڑیں۔ چنانچہ وہ ان کے سفر سے فائدہ اُٹھانے کا مرکز اور پالانوں کے اترنے کی منزل بن گیا۔ ...."

اسی خطبے کے ایک اور حصے میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اگر خداوند عالم یہ چاہتا کہ وہ اپنا محترم گھر اور بلند پایہ عبادت گاہیں ایسی جگہ پر بنائے کہ جس کے گرد باغ وچمن کی قطاریں اور بہتی ہوئی نہریں ہوں، زمین نرم و ہموار ہو کہ (جس میں) درختوں اور (ان میں) جھکے ہوئے پھلوں کے خوشے ہوں جہاں عمارتوں کا جال بچھا ہوا اور آبادیوں کا سلسلہ ملا ہو، جہاں سُرخی مائل گیہوں کے پودے، سرسبز مرغزار، چمن درکنار سبزہ زار، پانی میں شرابور میدان، لہلہاتے اُگتے کھیت اور آباد گزرگاہیں ہوں، تو البتہ وہ جزاء و ثواب کو اسی اعتبار سے کم کر دیتا کہ جس قدر ابتلاء و آزمائش میں کمی واقع ہوئی ہے، اور لوگ دلفریب ظاہری اقدار کے ساتھ مانوس ہو جاتے ہیں اور حقیقی اور خدائی اقدار سے غافل ہو جاتے۔[1]

بہرحال اسلامی انقلاب، اقدار کا انقلاب ہے اور اگر مسلمان آج سخت اور ناخوشگوار حالات سے دوچار ہیں اور بے رحم اور خونخوار دشمن کے پنجوں میں پھنسے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انھوں نے اصل اقدار کو چھوڑ کر ایک بار پھر زمانہ جاہلیت کی قدروں کو اپنا لیا ہے اور یہ قدریں ان میں خوب پروان چڑھ رہی ہیں۔ انسانی شخصیت کا معیار دنیاوی مال و مقام قرار پا چکا ہے۔ علم، تقوٰے اور فضیلت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لوگ مادی چکا چوند میں کھو چکے ہیں۔ اسلام سے یکسر بے گانہ ہو چکے ہیں اور جب تک ان کی یہی حالت رہے گی اس عظیم غلطی کا انھیں خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا۔ جب تک اپنے وجود پر خدائی اقدار کی حکمرانی کا آغاز نہیں کریں گے اس وقت تک خدا کا لطف و کرم ان کے شامل حال نہیں ہوگا۔ کیونکہ

"ان الله لا یغیر ما بقوم حتّٰی یغیروا ما بانفسهم"

اللہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو اپنے آپ میں تبدیلی نہ لائے۔" (رعد-۱۱)

۲- **ایک سوال کا جواب:** مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے ظاہری ٹھاٹھ باٹھ اور دنیاوی زینت اور شان و شوکت کی نفی کی ہے، جبکہ سورۂ اعراف کی آیت ۳۲ میں فرمایا گیا ہے۔

"قل من حرم زینة الله التی اخرج لعباده والطیبات من الرزق قل هی للذین اٰمنوا فی الحیٰوة الدنیا خالصة یوم القیامة کذٰلك نفصل الاٰیات لقوم یعلمون"

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۹۰ (خطبہ قاصعہ) (اردو ترجمہ از مرحوم علامہ مفتی جعفر حسین)

"کہہ دیجئے کہ اللہ نے جو زینت اپنے بندوں کے لیے خلق فرمائی ہے نیز طیبات کو کس نے حرام کیا ہے؟ کہہ دیجئے کہ یہ دُنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لے آئے ہیں (اگرچہ دوسرے لوگ بھی اس میں شریک ہیں لیکن) قیامت میں خاص طور پر ان ہی کے لیے ہوگی۔ ہم اپنی آیات کو سمجھدار لوگوں کے لیے اسی طرح تفصیل سے بیان کرتے ہیں"

ایک اور جگہ پر فرمایا گیا ہے:

"یا بنی ادم خذوا زینتکم عند کل مسجد"

"اے اولاد آدم! مسجد جاتے وقت اپنے تئیں مزین کر لیا کرو" (اعراف - ۳۱)

تو یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دو قسم کی آیات آپس میں کس طرح ہم آہنگ ہو سکتی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ زیر تفسیر آیات کا اصل مقصد جھوٹی اقدار کی نفی اور ان کا خاتمہ کرنا ہے اور یہ مقصد ملحوظ خاطر ہے کہ مال و دولت اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کو انسانی شخصیت کا معیار نہ سمجھ لیا جائے، نہ یہ کہ مادی وسائل کوئی بُری چیز ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مادی وسائل کو صرف وسائل کی حد تک ہی محدود رکھیں انھیں منتہائے مقصود نہ سمجھ لیں۔

ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ ان وسائل کی اس وقت کوئی قدر و قیمت ہے جب وہ کسی معقول اور شائستہ حد تک ہوں اور اسراف و فضول خرچی سے پاک ہوں، نہ کہ سونے چاندی کے محل بنانے اور سیم و زر کو اکٹھا کرنے کے لیے۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان مادی نعمتوں سے کفار و ظالمین کی بہرہ مندی نہ تو ان کی شخصیت کی دلیل بن سکتی ہے اور نہ ہی مومنین کا ان سے محروم ہونا ان کی شخصیت کے منافی ہے۔ اور نہ ہی معقول حد تک ان امور سے استفادہ انسان کے ایمان اور تقویٰ کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے اور یہی صحیح اسلامی اور قرآنی نظریہ ہے۔

۳۶۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝

۳۷۔ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

۳۸۔ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ۝

۳۹۔ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۝

۴۰۔ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

ترجمہ

۳۶۔ اور جو شخص یاد رحمٰن سے روگردانی کرتا ہے تو ہم اس کے لیے ایک شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں جو ہر دم اس کے ساتھ رہتا ہے۔

۳۷۔ اور وہ (شیاطین) ان لوگوں کو خدا کی راہ سے روکتے رہتے ہیں حالانکہ وہ اسی خیال میں ہیں کہ وہی صحیح معنوں میں ہدایت یافتہ ہیں۔

۳۸۔ یہاں تک کہ جب ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا، کاش مجھ میں اور تجھ میں مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا اور تو کیا ہی برا ساتھی ہے۔

۳۹۔ آج ہرگز اس قسم کی گفتگو تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی کیونکہ تم ظلم کر چکے ہو اور

تم سب عذاب میں شریک ہو۔

۴۰۔ آیا تو بہروں کو سُنا سکتا ہے یا اندھوں کو اور ان لوگوں کو جو صریحی گمراہی میں ہیں ہدایت کر سکتا ہے؟

تفسیر

شیاطین کا ساتھی

گزشتہ آیات میں ان دُنیا پرستوں کی بات ہو رہی تھی جو تمام چیزوں کو مادی پیمانے سے ناپتے ہیں اور زیرِ نظر آیات میں ان کے مہلک آثار میں سے ایک اثر کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو دُنیا کے ساتھ قلبی لگاؤ اور خدا سے یکسر اجنبیت ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اور جو شخص یاد رحمٰن سے روگردانی کرتا ہے ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ہر دم اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ (ومن یعش[1] عن ذکر الرحمٰن نقیض[2] لہ شیطانًا فھو لہ قرین)۔

جی ہاں! ذکرِ خدا سے غفلت اور دنیاوی لذات میں کھو جانے اور دُنیاوی چکا چوند سے دل بستگی اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ ایک شیطان انسان پر مسلط ہو جاتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اس کے گلے میں ایک ایسا پٹہ ڈال دیتا ہے جس کے ذریعے اسے ہر جگہ کھینچے پھرتا ہے۔

ظاہری بات ہے کہ اس آیت سے جبر کا تصور نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ انسان کے اپنے اعمال خاص کر دُنیاوی لذتوں میں کھو جانے اور مختلف گناہوں سے آلودہ ہونے کی سب سے پہلی تاثیر یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل، آنکھ اور کان پر پردے پڑ جاتے ہیں، جس سے وہ خدا سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور اس پر شیاطین مسلط ہو جاتے ہیں اور شیطانی افکار اسے ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں اور یہ انسان کے اپنے ہی

---

[1] "یعش" "عشو" (بروزن نشر) کے مادہ سے مشتق ہے، جب "الیٰ" کے ساتھ متعدی ہو جیسے "عشوت الیہ" تو اس کا معنی ہے کمزور آنکھ کے ساتھ کسی چیز کے ذریعے ہدایت پانا اور جب "عن" کے ساتھ متعدی ہو جیسے "عشوعنہ" تو اس کا معنی ہوگا کسی چیز سے روگردانی کرنا۔ زیرِ تفسیر آیت بھی اسی معنی میں ہے (دیکھیے کتاب لسان العرب مادہ "عشو")

[2] "نقیض" "قیض" (بروزن "فیض") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے انڈے کا چھلکا۔ بعد ازاں اس کا استعمال کسی دوسری چیز پر چھائے رہنے کے لیے ہونے لگا ہے۔

اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے ۔اگر چہ اس کی خدا کی طرف نسبت "مسبب الاسباب" کے اعتبار سے صحیح ہے ۔ یہی وہ چیز ہے جسے قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر "تزیین شیطان" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے ۔ جیسے سورۂ نحل کی ۶۳ ویں آیت میں ہے۔

"فزین لھم الشیطان اعمالھم"

یا شیطان کی سرپرستی کا نام دیا گیا ہے جیسے سورۂ نحل ہی کی اسی آیت میں ہے "فھو ولیھم الیوم"

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "نقیض" اپنے لغوی مفہوم کے لحاظ سے ایک تو انسان پر شیطان کے تسلط پر دلالت کرتا ہے اور دوسرے اس کے ساتھی ہونے پر اس کے باوجود "فھو لہ قرین" کا جملہ جو اس کے بعد آیا ہے اس بات کی تاکید کے لیے ہے کہ اس قسم کے لوگوں سے شیطان کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔

اور لفظ "رحمان" اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ اس خدا سے کیوں روگردانی کرتے ہیں اور اس خدا کی یاد سے کیوں غافل رہتے ہیں ،جس کی رحمت سب پر چھائی ہوئی ہے۔

آیا ایسے لوگوں کا انجام اس کے سوا کچھ اور ہونا چاہیئے کہ وہ شیطان کے ساتھی اور اس کے حکم کے غلام ہوں۔

بعض مفسرین نے اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ یہاں پر "شیاطین" کے وسیع معانی مراد ہیں یہاں تک کہ اس کا مفہوم انسانی شیطان پر بھی محیط ہے اور اس سے وہ "گمراہی کے سرداروں اور سرغنوں" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو یادِ خدا سے غافل افراد پر غالب ، مسلط اور ان کے ہمراہی ہوتے ہیں۔ اور وسیع مفہوم پر مبنی یہ احتمال بھی بعید نہیں ہے۔

پھر ایسے دو اہم امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ان غافلوں کے بارے میں یہ شیطان انجام دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :

وہ (شیاطین) ان لوگوں کو خدا کی راہ سے روکتے ہیں (وانھم لیصدونھم عن السبیل)[1]

جب وہ خدا کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو شیاطین ان کی راہوں میں روڑے اٹکاتے اور رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں تاکہ وہ کسی بھی صورت میں صراطِ مستقیم کی طرف نہ لوٹ آئیں۔

وہ گمراہی کے راستوں کو ان کی آنکھوں میں اس قدر عمدہ کرکے پیش کرتے ہیں کہ "وہ گمان کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ راہِ ہدایت پر ہیں (ویحسبون انھم مھتدون)۔

جبکہ سورۂ عنکبوت آیت ۳۸ میں قوم عاد و ثمود کے بارے میں ہے :

"وزین لھم الشیطان اعمالھم فصدھم عن السبیل وکانوا مستبصرین"

"شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کر دیا ہے اور انھیں سیدھی راہ سے روک دیا ہے حالانکہ وہ راہ تلاش کر چکے تھے"

خلاصہ کلام یہ کیفیت اسی صورت میں برقرار رہے گی ، غافل اور بے خبر انسان اپنی گمراہی میں اور شیاطین اسے گمراہ

---

[1] "انھم" اور بعد کے جملے میں جمع کی ضمیر "شیاطین" کی طرف لوٹ رہی ہے ۔ اگر چہ اس سے پہلے یہ ضمیر مفرد کی صورت میں آچکی ہے ،کیونکہ درحقیقت اس میں جمع کا معنی پایا جاتا ہے ۔

کرنے میں لگے رہیں گے، یہاں تک کہ تمام پردے ہٹ جائیں گے اور انسان کی حقیقت بین نگاہیں کھلیں گی اور جب وہ ہمارے پاس آئے گا اور اس کا ساتھی بھی اسی طرح اس کے ہمراہ ہوگا، وہی ساتھی جو اس کی تمام تر تباہیوں کا باعث تھا، تو وہ پکار پکار کر کہے گا کہ اے کاش! مجھ میں اور تجھ میں مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا اور تو کیا ہی بُرا ساتھی ہے" (حتیٰ اذا جاءنا قال یالیت بینی وبینك بعد المشرقین فبئس القرین)۔

تمام عذاب ایک طرف اور اس بُرے ساتھی کی صحبت ایک طرف، ایسے شیطان کی صحبت جو اسے ہر وقت نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا رہتا ہے، گمراہی اور بدبختی کی تمام یادیں اس کی نگاہ کے سامنے مجسم ہو کر آجائیں گی۔ وہی شیطان جو تمام برائیوں کو اس کے سامنے اچھائیاں بنا کر اور غلط راہ کو صحیح راستے کی صورت میں اور گمراہی کو ہدایت کی صورت میں پیش کرتا تھا ہائے افسوس! وہی اس کا ہمیشگا ساتھی اور ہم رکاب ہے۔

جی ہاں اس دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کو قیامت کے میدان میں وسیع تر صورت میں مجسم کر کے پیش کیا جائے گا اور جو ساتھی، دوست اور راہنما یہاں پر ہوگا وہی وہاں پر ہوگا۔ حتیٰ کہ بعض مفسرین کے بقول وہاں پر دونوں دوست ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوں گے۔

ظاہری بات کہ "مشرقین" (دو مشرق) سے مراد مشرق اور مغرب ہیں کیونکہ عربوں کی عادت ہے کہ جب وہ دو مختلف ہم جنس چیزوں کو تثنیہ بنانا چاہتے ہیں تو ان میں سے ایک لفظ کو لے کر تثنیہ بنا دیتے ہیں۔ جیسے "شمسین" (سورج اور چاند کی طرف اشارہ ہے) "ظہرین" (نماز ظہر و عصر کی طرف اشارہ ہے) اور "عشائین" (نماز مغرب و عشاء کی طرف اشارہ ہے)

مفسرین نے اس بارے میں اور بھی تفاسیر ذکر کی ہیں لیکن زیر تفسیر آیت میں کوئی بھی تفسیر مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ مثلاً سردیوں کے آغاز کی مشرق یا گرمیوں کی ابتدا کی مشرق، اگرچہ دوسرے مقامات پر مناسب ہے۔

صورت حال خواہ کچھ ہو یہ تعبیر دور ترین قابل تصور فاصلے کو بیان کر رہی ہے۔ کیونکہ "مشرق و مغرب کی دوری" اس بارے میں ایک مشہور محاورہ ہے۔

لیکن یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوگی اور ان لوگوں کے اور شیطانوں کے درمیان کبھی جدائی واقع نہیں ہوگی۔ اسی لیے بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: آج اس قسم کی گفتگو اور پشیمانی ہرگز تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی کیونکہ تم ظلم کر چکے ہو اور نتیجے کے طور پر تم عذاب میں شریک ہو۔ (ولن ینفعکم الیوم اذ ظلمتم انکم فی العذاب مشترکون)۔

تمہیں چاہیئے کہ تم اس بُرے ساتھی کے عذاب کے ساتھ اور عذاب کا مزہ بھی ہمیشہ کے لیے چکھتے رہو۔[1]

اس طرح سے ان کی شیاطین سے جدائی کی آرزو ہمیشہ کے لیے ناامیدی میں بدل جائے گی اور اس ساتھی کی صحبت

---

[1] اس طرح "ینفع" کا فاعل وہی سابقہ گفتگو ہے جس میں انہوں نے اپنے اور شیطان کے درمیان مشرق و مغرب کے فاصلے کی آرزو کی ہے اور "اذ ظلمتم" کا نفع نہ پہنچانے کا سبب بیان کر رہا ہے اور "انکم فی العذاب مشترکون" کا جملہ اسی ظلم کا نتیجہ ہے۔

کس قدر رُوح فرسا ہوگی۔

اس آیت کی تفسیر میں اور بھی کئی احتمال ذکر کیے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے ہمدردوں کو دیکھتا ہے تو اس کا دُکھ درد بھی کسی حد تک کم ہو جاتا ہے کیونکہ مثل مشہور ہے کہ۔

"البلیۃ اذا عمت طابت"

"جب مصیبت عمومی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو قابل قبول بن جاتی ہے"

لیکن اس موقع پر بھی ان سے کہا جائے گا "یہاں پر اس قسم کی تسلی بھی تمہارے لیے نہیں ہے بلکہ تم عذاب میں اس حد تک غرق ہو چکے ہو کہ تمہارے ہم رکاب شیطان کا عذاب بھی تمہیں قلبی سکون فراہم نہیں کر سکتا۔ [1]

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو انسان اس کے نتائج کو اپنے دوستوں میں بانٹ دیتا ہے، جس سے کسی حد تک مصیبت کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، لیکن یہ بات بھی وہاں نہیں ہوگی کیونکہ ہر ایک کے لیے عذاب الٰہی کا اپنا حصہ اس حد تک زیادہ ہوگا کہ دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکے گا۔

لیکن چونکہ یہ آیت اپنے سے ماقبل آیت کے لیے تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا وہی پہلی تفسیر کہ جسے ہم نے منتخب کیا ہے زیادہ مناسب ہے۔

یہاں پر قرآن مجید نے ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑتے ہوئے روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر لیا ہے اور ان دل کے اندھے غافل افراد کے بارے میں گفتگو شروع کر دی ہے جو ہمیشہ آپ کو جھٹلاتے تھے اور گزشتہ آیات میں مذکورہ لوگوں کی قسم سے تھے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

"آیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں؟ یا اندھوں کو ہدایت کر سکتے ہیں؟ یا ان لوگوں کو راہ راست کی دعوت دے سکتے ہیں جو کھلم کھلا گمراہی میں ہیں اور اس گمراہی کا احساس بھی نہیں کرتے؟" (افانت تسمع الصم او تھدی العمی ومن کان فی ضلال مبین)۔

اس طرح کا ایک اور تذکرہ بھی قرآن مجید کی دوسری آیات میں آچکا ہے جن میں ہٹ دھرم، ناقابل ہدایت، بے بصیرت اور گناہوں میں مستغرق ہوس پرستوں کو اندھوں، گونگوں، بلکہ مُردوں سے تشبیہ دی گئی ہے، چنانچہ سورۂ یونس کی آیت ۴۲ میں ہم پڑھتے ہیں:

"افانت تسمع الصم ولو کانوا لا یعقلون"

"تو کیا آپ اپنی آواز کو بہروں تک بھی پہنچا سکتے ہیں، اگرچہ وہ عقل سے کام نہ بھی لیں؟"

سورۂ نمل کی آیت ۸۰ میں ہے کہ:

"انک لا تسمع الموتٰی ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین"

---

[1] اس تفسیر کی بنا پر "انکم فی العذاب مشترکون" کا جملہ "ینفع" کا فاعل بنے گا نہ کہ اس کا نتیجہ۔

"آپ نہ تو مُردوں کے کانوں تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی بہروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں کہ جب وہ مُنہ پھیر کر بیٹھ کر لیتے ہیں۔"

اسی طرح کی اور بھی کئی آیات ہیں۔

اس قسم کی تصریحات اس لیے ہیں کیونکہ قرآن مجید کے نزدیک انسان کے لیے "دو قسم کے کان، دو قسم کی آنکھیں اور دو قسم کی زندگیاں ہوتی ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ ان میں سے دوسری قسم زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ اگر انسان کے باطنی ادراک اور حیات بے کار ہو جائیں تو نہ تو اس میں کوئی وعظ و نصیحت مؤثر ہو سکتی ہے اور نہ ہی تنبیہ اور دھمکی!!

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ آیات میں ایسے لوگوں کو ان افراد سے تشبیہ دی گئی تھی جن کی آنکھیں کمزور اور نگاہ محدود ہوتی ہے۔ لیکن اس آخری آیت میں انہیں بہروں اور اندھوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان دُنیا کے ساتھ مشغول ہو جاتا ہے تو اس وقت اس شخص کی مانند ہوتا ہے جس کی آنکھیں تھوڑی بہت حد تک دیکھتی ہیں۔ لیکن جُوں جُوں دنیا کے ساتھ اس کی مشغولیت بڑھتی جاتی ہے، مادیات کی طرف اس کے رجحان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور روحانیت سے بے اعتنائی زیادہ ہو جاتی ہے تو نگاہ میں کمی کے مراحل بھی بڑھتے جاتے ہیں، مختصر درد سے پہلے تو نگاہ میں کمی کا مرحلہ آتا ہے اور پھر نوبت نابینائی تک جا پہنچتی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس نے ان قطعی دلائل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے کہ انسان کا کسی عمل پر اصرار اور تکرار اس کے وجود میں مثبت یا منفی اثرات کی شدت اور ملکہ کے راسخ ہونے کا سبب بنتا ہے۔ اور قرآن پاک نے بھی اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔[1]

---

[1] تفسیر کبیر از فخر رازی جلد ۲۷ صفحہ ۲۱۳ و صفحہ ۲۱۴۔

۴۱۔ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۝

۴۲۔ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ۝

۴۳۔ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

۴۴۔ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ ۝

۴۵۔ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۱۔ تو اگر ہم تجھے ان کے درمیان سے لے جائیں تو ہم ان کو سزا ضرور دیں گے۔

۴۲۔ یا اگر تیری ہی زندگی میں جس عذاب کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے تجھے دکھا دیں، پھر بھی ہم ان پر ہر طرح سے قابو رکھتے ہیں۔

۴۳۔ جو کچھ تجھ پر وحی کی گئی ہے تو اسے مضبوطی سے تھامے رہ کہ یقیناً تو سیدھی راہ پر ہے۔

۴۴۔ اور یہ تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے یاد آوری کا ایک ذریعہ ہے اور عنقریب تم لوگوں سے باز پرس کی جائے گی۔

۴۵۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے اپنے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں ان سب سے دریافت کر دیکھ۔ آیا ہم نے رحمان خدا کے علاوہ ہم نے اور معبود ان کی پرستش کے لیے مقرر کیے تھے؟

تفسیر

دامن وحی مضبوطی سے پکڑے رہیں

گذشتہ آیات میں ہٹ دھرم اور ناقابلِ ہدایت کفار اور ظالمین کے ذکر کے بعد زیرِ تفسیر آیات میں رُوئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر کے ایسے لوگوں کو شدید تنبیہ اور اور پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی اور دلجوئی کی خاطر ارشاد فرمایا گیا ہے: اگر ہم تجھے ان کے درمیان سے لے جائیں تو ہم ان سے ضرور انتقام لیں گے اور انہیں ضرور سزا دیں گے۔"

(فاما نذهبن بك فانا منهم منتقمون)۔

اس قوم کے درمیان سے پیغمبرؐ کے لے جانے سے مراد خواہ رسُولِ پاک کی وفات ہو یا مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت دونوں صورتوں میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر آپؐ شاہد اور ناظر نہ بھی ہوں اور وہ لوگ اپنی اسی روش پر باقی رہیں پھر بھی ہم ان کو سخت سزا دیں گے۔ کیونکہ دراصل "انتقام" کا معنی سزا دینا ہے۔ ہر چند کہ متعدد دوسری قرآنی آیات سے جو اس بارے میں نازل ہوئی ہیں یہ بات سمجھ آتی ہے کہ پیغمبرؐ کو لے جانے" سے مراد آپ کی وفات ہے جیسا کہ سورۂ یونس کی ۴۶ ویں آیت میں ہے:

"واما نرينك بعض الذى نعدهم او نتوفينك فالينا مرجعهم ثم الله شهيد على ما يفعلون"

"اگر ہم آپ کی زندگی میں ان کو کچھ وہ سزائیں دیں جن کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے، یا آپ کو یہاں سے اُٹھالیں اور آپ انھیں نہ دیکھ پائیں، ہر حالت میں اس کی بازگشت ہماری طرف ہے اور خدا ان اعمال کا گواہ ہے جو وہ انجام دیتے رہتے ہیں۔"

یہی چیز سُورہ رعد کی چالیسویں اور سُورۂ مؤمن کی ۷۷ ویں آیت میں بھی آچکی ہے۔ لہٰذا زیرِ نظر آیت سے ہجرت مراد لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اگر تو زندہ بھی رہے اور ہم نے ان سے جس عذاب کا وعدہ کیا ہے، وہ دکھا بھی دیں پھر بھی ہم ان پر ہر طرح سے قابو رکھتے ہیں (او نرينك الذى وعدناهم فانا عليهم مقتدرون)۔

وہ ہر حالت میں ہمارے قابُو میں ہیں، خواہ آپ ان لوگوں کے درمیان موجود ہوں یا نہ ہوں اور ان کی اسی روش پر قائم رہنے کی صُورت میں یہ لوگ ہمارے انتقام اور ہماری سزا سے نہیں بچ سکتے، خواہ ان کا یہ انجام آپؐ کی زندگی میں ہو خواہ آپ کی وفات کے بعد جلدی یا دیر تو ہو سکتی ہے لیکن بچ ہرگز نہیں سکتے۔

قرآن کی یہ تاکید ممکن ہے ایک طرف تو کفار کی اس بے تابی کی طرف اشارہ ہو جو وہ کہتے تھے،

اگر تو سچ کہتا ہے تو پھر ہم پر وہ مصیبت نازل کیوں نہیں ہوتی۔

دوسری جانب ممکن ہے ان کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت کے انتظار کی طرف اشارہ ہو کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جونہی آپ اس دُنیا سے تشریف لے جائیں گے ساری بات ختم ہو جائے گی۔

اس تنبیہ کے بعد رسُولِ پاکؐ کو خدا کی طرف سے حکم ملتا ہے: تیری طرف جو وحی کی گئی ہے تو اسے مضبوطی سے تھامے رہ کیونکہ تو یقیناً سیدھی راہ پر ہے۔ (فاستمسك بالذی اوحی الیك انك علی صراط مستقیم)۔

تیری کتاب اور طرزِ عمل میں ذرہ بھر بھی اور ٹیڑھا پن نہیں ہے اور کفار و مشرکین کے ایک ٹولے کا انھیں قبول نہ کرنا تیری حقانیت کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ تو اپنے اس سلسلے کو پوری طرح سے جاری رکھ باقی سب ہمارے ذمہ ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ قرآن کہ جس کی تجھ پر وحی کی گئی ہے تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے یاد آوری کا ایک ذریعہ ہے (وانه لذکرلك ولقومك)۔

اسکے نزول کا مقصد ہی لوگوں کو بیدار کرنا اور ان کے فرائض سے انھیں آگاہ کرنا ہے۔

"اور تم لوگوں سے عنقریب ہی باز پرس کی جائے گی" کہ تم نے اس خدائی پروگرام اور اس آسمانی وحی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ (وسوف تسئلون)۔

اس تفسیر کے مطابق مندرجہ بالا آیت میں "ذکر" سے مراد "ذکر اللہ" اور دینی فرائض سے آشنائی اور آگاہی ہے۔ جیسا کہ اسی سُورت کی پانچویں اور چھتیسویں آیات میں بھی یہ بات آئی ہے، قرآن کی بہت سی دوسری آیات کے مانند۔

اصولی طور پر قرآن مجید کا ایک نام "ذِکر" بھی ہے، ذِکر بھی وہ کہ جو یاد آوری اور ذکر اللہ ہے اور سُورۂ قمر میں تو یہ جُملہ متعدد بار آیا ہے:

"ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مذکر"
"یعنی ہم نے قرآن مجید کو یاد آوری کے لیے آسان اور سہل بنا دیا ہے آیا کوئی ہے جو یاد سے کام لے"

ملاحظہ ہوں اسی سُورت کی آیات نمبر ۱۷، ۲۲، ۳۲ اور ۴۰۔

اس کے علاوہ "ولسوف تسئلون" کا جُملہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یہاں پر سوال سے مراد اس خدائی پروگرام پر عمل کے بارے میں پُوچھ گچھ ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اس آیت کے لیے بہت سے مفسرین نے ایک اور تفسیر کا انتخاب کیا ہے جو مذکورہ تفسیر سے مناسبت نہیں رکھتی منجملہ انھوں نے یہ کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے:

"یہ قرآن تیرے اور تیری قوم کے لیے سرمایہ شرف و آبرو یا ذکر خیر ہے اور عرب و قریش یا تیری اُمت کو شرف عطا کرتا ہے کیونکہ انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے اور اس نعمت الٰہی کے بارے میں عنقریب ان سے باز پُرس ہوگی۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان، تفسیر کبیر فخر رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر مراغی اور تفسیر ابوالفتوح، انہی آیات کے ذیل میں۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن مجید نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کو ساری کائنات میں شہرت دی ہے اور چودہ سو سال سے زیادہ عرصے سے پیغمبر اکرمؐ کا نام ہر صبح و شام گلدستہ اذان پر عظمت و احترام کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے بے نام و نشان عربوں کو نام ملا ہے اور اسی کے پرتو میں اُمتِ اسلامیہ کو شرف اور سربلندی نصیب ہوئی ہے۔

اور یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ قرآن میں کہیں کہیں پر "ذکر" کا لفظ اس معنی میں بھی آیا ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ پہلا معنی قرآنی آیات میں زیادہ وسعت رکھتا ہے اور نزولِ قرآن اور زیرِ بحث آیات کے مقاصد سے زیادہ ہم آہنگ ہے بعض مفسرین نے سورۂ انبیاء کی دسویں آیت کو دوسری تفسیر پر شاہد قرار دیا ہے۔ آیت یہ ہے:

"لقد انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم افلا تعقلون"

"ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جس میں تمہاری یاد کا ذریعہ ہے آیا تم عقل سے کام نہیں لیتے"؟ [1]

حالانکہ یہ آیت بھی پہلی تفسیر کے لیے زیادہ موزون ہے، جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ کی ساتویں جلد میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ [2]

اس آیت کے ذیل میں حدیث کی کتابوں میں کچھ روایات ذکر ہوئی ہیں، جو بعد میں بیان کی جائیں گی۔

پھر بت پرستی کی نفی اور مشرکین کے عقاید باطل کرنے کے لیے ایک اور دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور ہم نے تجھ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں ان سب سے دریافت کر دیکھ آیا ہم نے رحمان خدا کے علاوہ اور معبود قرار دیئے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے۔ (وسئل من ارسلنا من قبلك من رسلنا اجعلنا من دون الرحمٰن اٰلهة يعبدون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام انبیاءؑ نے توحید کی طرف بلایا ہے اور سب نے دو ٹوک الفاظ میں بُت پرستی کی مذمت کی ہے بنا بریں پیغمبر اسلامؐ نے بتوں سے اپنی مخالفت کے سلسلے میں کوئی نیا کام انجام نہیں دیا۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام کی دائمی سُنّت کا احیاء فرمایا ہے اور یہ بُت پرست اور مشرکین ہی ہیں جنہوں نے تمام انبیاء کے مکتب کے خلاف قدم اٹھایا ہے۔

اس تفسیر میں اگرچہ مخاطب حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں لیکن مراد تمام اُمت ہے حتیٰ کہ آپؐ کے مخالفین بھی۔

اور جن سے سوال کیا جاتا ہے وہ انبیائے ماسلف کے پیروکار ہیں۔ البتہ سچے اور قابلِ اعتماد پیروکار بھی اور عام پیروکار

---

[1] تفسیر قرطبی انہی آیات کے ذیل میں۔

[2] ایک اور بات جو مشہور تفسیر کے لیے دلیل بن سکتی ہیں وہ لفظ "قوم" کے بارے میں ہے جو مندرجہ بالا آیات میں مذکور ہے وہ یہ کہ قرآن مجید ساری دُنیا کے لوگوں کے لیے یادآوری کا ایک ذریعہ ہے، نہ صرف پیغمبرؐ اکرم کی قوم یا ملت اسلامیہ کے لیے۔ لیکن یہ بات بھی جواب طلب ہے، کیونکہ مذکورہ گروہ دوسروں سے پہلے قرآن سے بہرہ مند ہوئے ہیں۔ اسی لیے ان کے ذکر پر زور دیا گیا ہے۔

بھی کیونکہ ان کے مجموعی اقوال سے "خبر متواتر" دستیاب ہو گی جو انبیاء علیہم السلام کے توحیدی مکتب کی مظہر ہے۔
یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اصول توحید سے روگردانی کرنے والے (موجودہ دور کے عیسائی جو تثلیث کے پیروکار ہیں) تک توحید کا دم بھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری تثلیث، توحید کے منافی نہیں ہے جو تمام انبیاء کا دین ہے اسی لیے ان امتوں کی طرف رجوع بھی مشرکین کے دعویٰ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیئے کافی ہے۔
لیکن کچھ مفسرین نے بعض روایات کی روشنی میں ایک اور تفسیر کا احتمال ذکر کیا ہے۔[1]
وہ یہ کہ سوال کرنے والے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور سوال کیے جانے والے خود انبیائے ماسلف ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ واقعہ شب معراج پیش آیا کیونکہ آنحضرتؐ نے وہاں پر انبیائے ماسلف کی ارواح سے رابطہ قائم کیا اور امر توحید کی تاکید کے لیے ان سے سوال کیا اور جواب پایا۔
بعض مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ شب معراج کے علاوہ بھی یہ رابطہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے امکان پذیر تھا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے انبیائے ماسلف کی ارواح سے رابطے کے لیے زمانی اور مکانی فاصلے رکاوٹ نہیں بن سکتے تھے اور پیغمبر گرامی قدر ہر لمحہ اور ہر جگہ ان سے رابطہ قائم کر سکتے تھے۔
البتہ ان تفسیروں میں کوئی عقلی مشکل موجود نہیں ہے۔ لیکن آیت کا مقصد مشرکین کے مذہب کی نفی کرنا ہے نہ کہ رسول پاک کو تسلی دینا، کیونکہ رسول پاک مسئلہ توحید میں اس قدر مستغرق اور شرک سے اس قدر بیزار تھے کہ سوال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں فرماتے تھے اور مشرکین کے مقابلے کے لیے دلیل قائم کرنے کے لیے رسول اللہؐ کا انبیائے ماسبق کی ارواح سے روحانی رابطہ قائم کرنا انہیں مانع نہیں کر سکتا تھا لہٰذا پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ دوسری تفسیر آیت کے باطنی معنی کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ قرآنی آیات کا ظاہر بھی ہوتا ہے اور باطن بھی۔
یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں خدا کے ناموں سے ایک نام "رحمان" کو ذکر کیا گیا ہے جو اس سوال کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایسے خدا کو چھوڑ دیں جس کی رحمت عام اور سب پر محیط ہے اور ان بتوں کے پیچھے لگ جائیں جن سے کسی قسم کی اچھائی یا برائی کی کوئی توقع نہیں ہے۔

پیغمبر کی قوم کون لوگ ہیں؟

"وانہ لذکر لک ولقومک" والی آیت کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں مذکور "قومک" سے کون لوگ مراد ہیں؟ چنانچہ اس بارے میں تین احتمال ہیں۔
ایک تو تمام اُمت مسلمہ، دوسرے عرب قوم اور تیسرے قبیلہ قریش۔

---

[1] یہ روایات تفسیر قرطبی، تفسیر فخر رازی اور تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول ہیں۔ اور تفسیر نور الثقلین میں اس بارے میں دو مفصل روایتیں "احتجاج طبرسی" اور تفسیر علی بن ابراہیم سے منقول ہیں۔ (دیکھیے تفسیر نمونہ جلد نمبر ۱)

چونکہ قرآنی نظر سے بہت سی آیات میں "قوم" کا لفظ انبیاء کی اُمتوں یا ان کی معاصر اقوام کے لیے استعمال ہوا ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر بھی یہی معنی پیشِ نظر ہیں۔

اس صورت میں قرآن مجید تمام اسلامی اُمتوں کے لیے ذکر و آگاہی کا سبب ہوگا (پہلی تفسیر کے مطابق) اور ان سب کے لیے سرمایہ شرف و افتخار ہوگا (دوسری تفسیر کے مطابق)

لیکن اہلبیت علیہم السلام کے ذرائع سے ہم تک پہنچنے والی متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام فرماتے ہیں کہ اس آیت میں "قوم" سے مراد ہم لوگ یعنی اہل بیت پیغمبر ہیں۔ [1]

لیکن کوئی بعید نہیں ہے کہ وہ آیت کا ایک روشن مصداق ہوں۔ قوم کا مفہوم خواہ تمام اسلامی امتیں ہوں یا عرب اقوام یا پھر پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبیلہ، ہر صورت میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام اس کا واضح ترین مصداق ہیں۔

---

[1] ان احادیث کو تفسیر نور الثقلین کے مؤلف نے جلد چہارم صـ۲۴ تا صـ۲۵ میں جمع کر دیا۔

۴۶۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

۴۷۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ○

۴۸۔ وَمَا نُرِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ○

۴۹۔ وَقَالُوْا یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ○

۵۰۔ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ یَنْكُثُوْنَ ○

ترجمہ

۴۶۔ اور ہم ہی نے موسٰی کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس بھیجا تو (اس نے ان سے) کہا، میں سارے جہانوں کے پالنے والے خدا کا رسول ہوں۔

۴۷۔ لیکن جب وہ ان کے پاس ہماری آیات لے کر آیا تو وہ لوگ اس کی ہنسی اڑانے لگے۔

۴۸۔ اور ہم جو آیت (اور معجزہ) ان کو دکھاتے تھے وہ دوسرے سے بڑھ کر (اور اہم تر) ہوتا تھا اور انہیں سزا کے ذریعے متنبہ کیا تاکہ وہ باز آجائیں۔

۴۹۔ (اور جب وہ عذاب میں مبتلا ہوئے تو کہنے لگے اے جادوگر! اس وعدے کے

مطابق جو تمھارے پروردگار نے تم سے کیا ہے ہمارے واسطے دُعا کر (تاکہ وہ ہمیں اس درد و رنج سے نجات دے) ہم ضرور ہدایت پر آجائیں گے۔

۵۰۔ لیکن جب ہم ان سے عذاب ہٹا دیتے تو وہ اپنا عہد توڑ ڈالتے۔

تفسیر

مغرور اور عہد شکن فرعونی

ان آیات میں خدا کے رسول حضرت "موسیٰ بن عمران" کے کچھ حالات اور ان کی فرعون کے ساتھ ملاقات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ مشرکین کی ان بے بنیاد باتوں کا جواب دیا جائے کہ جو وہ کہتے تھے" اگرچہ، خدا نے کوئی پیغمبر ہی بھیجنا تھا تو مکہ یا طائف کے کسی دولت مند شخص کو اس عظیم منصب پر فائز کیوں نہیں کیا؟"

فرعون نے بھی مُوسیٰ علیہ السلام پر یہی اعتراض کیا تھا اور اس کی بھی بالکل یہی منطق تھی۔ فرعون نے مُوسیٰ علیہ السلام کو بھی ادنیٰ لباس اور سونے چاندی کے زیورات نہ رکھنے کی بنا پر طعن و تشنیع کی تھی۔

چنانچہ زیر نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اور ہم ہی نے مُوسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا: (ولقد ارسلنا موسیٰ بآیاتنا الی فرعون وملائه)۔

"(تو مُوسیٰ نے ان سے) کہا میں سارے جہانوں کے پالنے والے خدا کا رسُول ہوں" (فقال انی رسول رب العالمین)۔

"آیات" سے مراد وہ معجزے ہیں جو مُوسیٰؑ کے پاس تھے اور وہ اپنی حقانیت کو انہی معجزات کے ذریعے ثابت کیا کرتے تھے۔ ان میں سے دو اہم معجزات تھے ایک "عصا" اور دوسرا "ید بیضاء"

اور جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں "ملاء" (بروزن خلاء) "ملا" (بروزن خلع) کے مادہ سے ہے، جس کا معنیٰ ہے ایسا گروہ جس کے تمام افراد کا ایک ہی مشترکہ ہدف ہو اور دیکھنے میں بہت بڑی تعداد نظر آئے، قرآن مجید میں عموماً اشراف، دولت مند ل یا درباریوں کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے۔

"رب العالمین" کا تذکرہ درحقیقت دعویٰ کے ساتھ دلیل کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ صرف وہی عبودیت کے لائق ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور ان کا مالک اور مربی ہے، نہ کہ فرعون اور بتوں جیسی محتاج اور نیازمند مخلوق۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ مُوسیٰ علیہ السلام کے منطقی دلائل اور واضح معجزات کے مقابلے میں فرعون اور فرعونیوں کا کیا ردعمل کیا تھا۔ اس بارے میں قرآن بعد کی آیتوں میں فرماتا ہے: لیکن جب مُوسیٰؑ ان کے پاس ہمارے معجزے لے کر آئے تو وہ سب اس

پر ہنستے تھے۔(فلما جاءھم بآیاتنا اذاھم منھا یضحکون)۔

سچے راہنماؤں کے خلاف تمام طاغوتوں اور ستمگروں کا یہی پہلا رد عمل ہوتا ہے۔ ان کی دعوت اور دلائل کو سنجیدہ نہ سمجھنا اور سب کا ہنسی مذاق اُڑا کر ان کی دعوت کا جواب دینا ان کا شیوہ ہوتا ہے تاکہ اس طرح سے وہ دوسرے لوگوں کو سمجھا سکیں کہ سرے سے ان رہبروں کی دعوت نہ تو کسی قسم کے غور کے قابل ہے اور نہ ہی اس کے لیے کسی جواب کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کا سنجیدگی سے نوٹس لینے کی ضرورت ہے۔

لیکن ہم اتمام حجت کے طور پر اپنی آیات اور نشانیاں یکے بعد دیگرے بھیجتے رہے "اور ہم جو آیت (اور معجزہ) ان کو دکھاتے تھے وہ دوسرے سے بڑھ کر (اور اہم تر) ہوتا تھا"۔(وما نریھم من آیۃ الا ھی اکبر من اختھا)۔[1]

غرض ہم نے اپنی نشانیاں انہیں دکھائیں جن میں سے ہر ایک دوسری سے زیادہ اہم، زیادہ واضح اور زیادہ دندان شکن تھی، تاکہ ان کی طرف سے کوئی بہانہ باقی نہ رہ جائے اور وہ غرور، نخوت اور خود خواہی کو ترک کر دیں۔

اس طرح سے ہم نے "عصا" اور "ید بیضا" جیسے معجزوں کے بعد طوفان، ٹڈی دل، جوؤں اور مینڈکوں وغیرہ جیسے معجزے انہیں دکھائے۔[2]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ہم نے انہیں متنبہ کرنے والے عذابوں اور سزاؤں میں مبتلا کر دیا شاید کہ وہ بیدار ہو جائیں اور راہ حق کی طرف لوٹ آئیں (واخذناھم بالعذاب لعلھم یرجعون)۔

خشک سالی، قحط اور پھلوں کی کمی نے انہیں آلیا۔ جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۰ میں ہے:

"ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات"

کبھی دریائے نیل کا پانی خون کا رنگ اختیار کر لیتا جو نہ تو پینے کے قابل ہوتا اور نہ ہی آب پاشی کے اور کبھی زرعی آفات ان کے اناج کو نیست و نابود کر دیتیں۔

یہ تلخ اور دردناک حوادث اگرچہ وقتی طور پر ان کو بیدار کر دیتے تھے اور وہ حضرت موسیٰ کا دامن پکڑتے تھے لیکن جب مصیبت ٹل جاتی تو وہ سب کچھ بھلا دیتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام پر تہمتوں کے تیر چلاتے تھے۔

جیسا کہ بعد کی آیت میں ہے: انہوں نے کہا اے جادوگر! اس عہد کے مطابق جو تیرے پروردگار نے تجھ سے کیا ہے ہمارے واسطے دعا کر تاکہ وہ ہمیں اس درد و رنج اور بلا و مصیبت سے نجات دے اور مطمئن رہ کہ ہم ہدایت کی راہ کو ضرور اختیار کریں گے۔ (وقالوا یا ایھا الساحر ادع لنا ربک بما عھد عندک اننا لمھتدون)۔

---

[1] "اخت" (بہن) لغت عرب میں ہم قدم اور ہم جنس چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، جس طرح دو بہنوں کی آپس میں نسبت ہوتی ہے۔

[2] حضرت موسیٰ بن عمران کے نو معجزات کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۱۲ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۱۰۱ کے ذیل میں بیان ہو چکی۔

یہ عجیب بات ہے، ایک طرف تو حضرت موسیٰ کو ساحر کہتے ہیں اور دوسری طرف بلاؤں اور مصیبتوں کے دُور کرنے کے لیے ان کے دست بداماں ہوتے ہیں اور تیسری طرف ان سے ہدایت اپنانے کا وعدہ کرتے ہیں۔

ان تینوں امور کا ظاہری باہمی عدم تناسب مختلف تفسیروں کا سبب بن گیا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں پر "ساحر" بمعنی "عالم" کے ہے کیونکہ اس زمانے میں خاص کر مصر کے علاقے میں ساحروں کو محترم سمجھا جاتا تھا اور انھیں دانشور کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ یہاں پر "سحر" کا معنی ایک اہم کام بجالانا ہے۔ جیسے ہم اپنی روزمرّہ کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ "فلاں شخص اپنے کام میں اس حد تک ماہر ہے گویا جادُو کرتا ہے":

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے عام لوگوں کے ذہن میں جادوگر مراد ہے۔ اس طرح کی کئی دوسری تفسیریں بھی ہیں۔

لیکن خود پسند جاہلوں، مغروروں اور ظالم طاغوتوں کے اندازِ گفتگو سے واقف لوگ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ان کے ہاں متناقض باتیں ملتی ہیں اور کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ پہلے انھوں نے حضرت مُوسیٰ کو جادوگر کہا ہو، پھر ان کے دامن سے متمسک ہُوئے ہوں اور آخر میں ہدایت قبول کرنے کا وعدہ کیا ہو۔

اس طرح آیت کی تعبیرات باقی رہتی ہیں اور دوسری توجیہوں اور تفسیروں کی ضرورت نہیں پڑتی۔

بہر حال ان کے اندازِ گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرت مُوسیٰ علیہ السلام کی ضرورت کے احساس کے باوجود ان سے جھوٹے وعدے کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ بے چارگی اور سخت ضرورت کو بیان کرتے وقت بھی وہ غرور کو نہیں چھوڑتے تھے۔ اس لیے انہوں نے "ربّک" (تیرا رب) اور "بما عهد عندك" (اس نے جو وعدہ تجھ سے کیا ہے) کے الفاظ استعمال کیے اور کبھی نہیں کہا "ہمارا پروردگار" یا "جو وعدہ اس نے ہم سے فرمایا ہے"۔ حالانکہ مُوسیٰ علیہ السلام نے انھیں واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ "میں سارے جہانوں کے پروردگار کا رسُول ہوں" نہ کہ "اپنے پروردگار" کا۔

جی ہاں! جب سر پھرے مغرور، تختِ اقتدار پر متمکن ہو جاتے ہیں تو ان کی منطق ایسی ہی ہوتی ہے۔

لیکن مُوسیٰ علیہ السلام نے اس قسم کی چبھتی اور توہین آمیز گفتگو کی وجہ سے کبھی ان کی ہدایت سے دست کشی نہیں کی اور ان کی خیرہ سری پر مایوس نہیں ہُوئے اور نہ ہی تھکنے کا نام لیا بلکہ اپنا کام برابر جاری رکھا۔ بارہا دُعا کی کہ طوفانِ بلا تھم جائے اور وہ تھم جاتا، لیکن جیسا کہ بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: جب بھی ہم ان سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنا عہد توڑ ڈالتے۔ اور اپنی ہٹ دھرمی اور للکار پر قائم رہتے۔ (فلما كشفنا عنهم العذاب اذا هم ينكثون)۔

یہ سب مسلمانوں کے لیے زندہ اور گویا درس ہیں اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دل جوئی اور تسلی کا باعث ہیں کہ وہ مخالفوں کی ہٹ دھرمی اور مخالفت سے ہرگز نہ گھبرائیں بلکہ اپنی انتھک کوششوں کو جاری رکھیں۔ خدا چاہتا ہے اُن کے قلب و رُوح پر مایُوسی اور نا اُمیدی کی گرد نہ پڑے اور انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ

مصرع — رگ رگ است ایں آب شیریں و آب شور

لہٰذا انھیں استقامت اور پامردی کے ساتھ پہلے سے زیادہ پیش قدمی کرنی چاہیے جیسا کہ حضرت مُوسیٰ علیہ السلام اور

بنی اسرائیل نے کہا اور انجام کار وہ فرعون اور فرعونیوں پر غالب آئے۔

نیز یہ سخت اور ہٹ دھرم اور دشمنوں کے لیے ایک سخت تنبیہ ہے کہ وہ فرعون اور اس کے ساتھیوں سے نہ تو زیادہ طاقت ور ہیں اور نہ ہی ان جیسے صاحب اقتدار، لہٰذا ان کے کاموں کا انجام بھی دیکھ لیں اور اپنے کاموں کی عاقبت کے بارے میں بھی سوچ لیں۔

۵۱۔ وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○

۵۲۔ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ○

۵۳۔ فَلَوْلَآ اُلْقِىَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ○

۵۴۔ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ○

۵۵۔ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○

۵۶۔ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ○

ترجمہ

۵۱۔ اور فرعون نے اپنے لوگوں سے پکار کر کہا اے میری قوم! کیا مصر کی حکومت میری نہیں اور کیا یہ دریا میرے حکم سے نہیں بہ رہے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟

۵۲۔ میں اس شخص سے برتر ہوں جو ایک پست خاندان اور طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا۔

۵۳۔ (اگر وہ سچ کہتا ہے تو پھر) اسے سونے کے کنگن کیوں نہیں دیئے گئے؟ یا یہ کہ اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے (تاکہ اس کی باتوں کی تصدیق کرتے)؟

۵۴۔ غرض فرعون نے (ان باتوں کے ذریعے) اپنی قوم کو احمق بنایا اور لوگوں نے اس

کی اطاعت کی، بیشک وہ لوگ بدعمل تھے۔

۵۵۔ تو جب ان لوگوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے بھی ان سے بدلہ لیا اور ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

۵۶ اور انھیں (عذاب میں) پیش قدم اور دوسروں کے لیے عبرت بنا دیا۔

تفسیر

موسیٰؑ کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منطق ایک طرف، ان کے مختلف معجزات دوسری طرف اور مصر کے لوگوں پر نازل ہونیوالی بلائیں جو موسیٰؑ کی دعا کی برکت سے ٹل جاتی تھیں تیسری طرف، ان سب اسباب نے مجموعی طور پر اس ماحول پر گہرے اثرات ڈالے اور فرعون کے بارے میں لوگوں کے افکار کو ڈانواں ڈول کر دیا اور انہیں پورے مذہبی اور معاشرتی نظام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

اس موقع پر فرعون نے اپنی دھوکہ دہی کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام کا اثر مصری لوگوں کے ذہن سے ختم کرنے کی کوشش کی اور پست اقدار کا سہارا لیا جو اس ماحول پر حکم فرما تھیں۔ انھیں اقدار کے ذریعے اپنا اور موسیٰ علیہ السلام کا موازنہ شروع کر دیا تاکہ اس طرح لوگوں پر اپنی برتری کو پایۂ ثبوت تک پہنچائے۔ جیسا کہ قرآن پاک انہی آیات میں فرماتا ہے۔

اور فرعون نے اپنے لوگوں کو پکار کر کہا: اے میری قوم! آیا مصر کی وسیع و عریض سرزمین پر میری حکومت نہیں ہے اور کیا یہ عظیم دریا میرے حکم سے نہیں بہ رہے اور میرے محلوں، کھیتوں اور باغوں سے نہیں گزرتے ہیں؛ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ (و نادیٰ فرعون فی قومہ قال یا قوم الیس لی ملک مصر وھذہ الانھار تجری من تحتی افلا تبصرون) [1]

لیکن موسیٰؑ کے پاس کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ ایک لاٹھی اور ایک اونی لباس اور بس تو کیا اس کی شخصیت بڑی ہوگی یا میری؟ آیا وہ سچ بات کہتا ہے یا میں؟ اپنی آنکھیں کھولو اور بات اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔"

---

[1] "وھذہ الانھار تجری من تحتی" میں موجود "واؤ" ممکن ہے کہ "عاطفہ" اور اس کا عطف "ملک مصر" پر اور ممکن ہے کہ "حالیہ" ہو۔ (تفسیر کشاف) لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس طرح فرعون نے مصنوعی اقدار کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، بالکل ویسے ہی جیسے عصر جاہلیت کے بت پرستوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں مال و مقام کو صحیح انسانی اقدار سمجھ رکھا تھا۔

لفظ "نادیٰ" (پکار کر کہا) سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے اپنی مملکت کے مشاہیر کی ایک عظیم محفل جمائی اور بلند آواز کے ساتھ ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ جملے ادا کیے، یا حکم دیا کہ اس کی اس آواز کو ایک سرکاری حکم نامے کے ذریعے پورے ملک میں بیان کیا جائے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دریائے نیل کو "انہار" (نہر کی جمع) سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عظیم دریا ایک وسیع سمندر کے مانند ہے جو نہروں میں تقسیم ہو کر مصر کے تمام آباد علاقوں کو سیراب کرتا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دریائے نیل سے تین سو ساٹھ (۳۶۰) نہریں نکلتی تھیں جن میں سے زیادہ اہم "نہر الملک" "نہر طولون" "نہر دمیاط" اور "نہر تنیس" تھیں۔

آخر فرعون نے نیل کی نہروں پر زیادہ زور کیوں دیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصر کی تمام آبادی، دولت، طاقت اور تمدن اسی دریا کے مرہون منت تھے۔ لہٰذا فرعون نے اس پر ناز کیا اور موسیٰ پر اپنی برتری جتائی۔

"تجری من تحتی" کا مقصد یہ نہیں کہ دریائے نیل اس کے محل کے نیچے سے گزر رہا تھا، جیسا کہ کئی مفسرین نے مراد لیا ہے کیونکہ دریائے نیل اس سے بہت بڑا تھا کہ وہ اس کے محل کے نیچے سے گزرے اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے محل کے پاس سے گزرتا تھا تو مصر کے بہت سے محلات ایسے تھے، جن کے پاس سے یہ دریا گزرتا تھا اور ملک کی بہت بڑی آبادی اس کے دونوں کناروں پر آباد تھی، بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ دریا میرے زیر فرمان چل رہا ہے اور اس کی تقسیم کا نظام بھی میرے حسب منشأ مقرر کردہ قوانین کے تحت چل رہا ہے۔

قرآن آگے چل کر فرماتا ہے کہ فرعون نے کہا: میں اس شخص سے برتر ہوں جو ایک پست خاندان اور طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور صاف طور پر بات بھی نہیں کر سکتا۔ (ام انا خیر من ھٰذا الذی ھو مھین ولا یکاد یبین) [1]

اس طرح سے اس نے اپنے لیے دو بڑے اعزازات (حکومت مصر اور نیل کی ملکیت) اور موسیٰ کے دو کمزور پہلو (فقر اور لکنت زبان) بیان کر دیئے۔

حالانکہ اس وقت حضرت موسیٰ کی زبان میں لکنت نہ تھی۔ کیونکہ خدا نے ان کی دعا کو قبول فرما لیا تھا۔ اور زبان کی لکنت کو دور کر دیا تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے مبعوث ہوتے ہی خدا سے یہ دعا مانگی تھی کہ "واحلل عقدۃ من لسانی" (خداوندا میری زبان کی گرہیں کھول دے) (ملاحظہ ہو سورۂ طٰہٰ آیت ۲۷) اور یقیناً ان کی دعا قبول ہوئی اور قرآن بھی اس بات پر گواہ ہے۔

---

[1] مندرجہ بالا جملے میں کچھ مفسرین نے "ام" کو "منقطعہ اور بل" کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے اسے "متصلہ" اور "افلا تبصرون" سے متعلق سمجھا ہے، جو تقدیری طور پر یوں ہوگا،

"افلا تبصرون ام تبصرون انا خیر من ھٰذا ...... ؟"

بے پناہ دولت، فاخرہ لباس اور چکا چوند کرتے محلات مظلوم طبقے پر ظلم و ستم کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا مالک نہ ہونا صرف عیب کی بات ہی نہیں بلکہ باعث صد افتخار شرافت اور عزت کا سبب بھی ہے۔

"مھین" (پست) کی تعبیر سے ممکن ہے اس دور کے اجتماعی طبقات کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ اس دور میں بڑے بڑے سرمایہ داروں کا معاشرے کے بلند طبقوں میں شمار ہوتا تھا اور محنت کشوں اور کم آمدنی والے لوگوں کا پست طبقے میں۔ یا پھر ممکن ہے موسیٰ کی قوم کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا اور فرعون کی قبطی قوم اپنے آپ کو سردار اور آقا سمجھتی تھی۔

پھر فرعون دو اور بہانوں کا سہارا لیتے ہوئے کہتا ہے: اسے سونے کے کنگن کیوں نہیں دیئے گئے یا اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے کہ جو اس کی باتوں کی تصدیق کرتے: (فلولا القی علیہ اسورۃ من ذھب او جاء معہ الملائکۃ مقترنین)۔ [1]

اگر خدا نے اسے رسول بنایا ہے تو دوسرے رسولوں کے مانند اسے طلائی کنگن کیوں نہیں دیئے اور اس کے لیے مددگار کیوں نہیں مقرر کیے؟

کہتے ہیں کہ فرعونی قوم کا عقیدہ تھا کہ رؤسا اور سربراہوں کو ہمیشہ طلائی کنگنوں اور سونے کے ہاروں سے مزین ہونا چاہیئے اور چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس قسم کے زیورات نہیں تھے بلکہ ان زیورات کے بجائے وہ چرواہوں والا موٹا سا اونی کرتہ زیب تن کیے ہوئے تھے، لہٰذا ان لوگوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا اور یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو انسانی شخصیت کے پرکھنے کا معیار سونا، چاندی اور دوسرے زیورات کو سمجھتے ہیں۔

لیکن انبیاء کرام علیہم السلام ایسی چیزوں سے ہٹ کر رہتے ہیں۔ خاص کر وہ اپنے کردار سے ایسی جھوٹی اقدار کا خاتمہ کرکے ان کی جگہ صحیح انسانی اقدار یعنی علم، تقوےٰ اور طہارت کی حکمرانی دیکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ جب تک کسی معاشرے کی قدروں کا نظام درست نہیں ہوگا وہ معاشرہ کبھی بھی سعادت اور سربلندیوں پر فائز نہیں ہو سکتا۔

بہر حال فرعون کا یہ بہانہ بھی مشرکین مکہ کے اس بہانے کے مانند تھا جس کے متعلق ہم چند آیات پہلے پڑھ چکے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی دولت مند شخص پر کیوں نازل نہیں ہوا؟

دوسرا بہانہ وہی مشہور بہانہ ہے جو بہت سی گمراہ اور سرکش امتیں انبیاء کرام علیہم السلام کے سامنے پیش کیا کرتی تھیں، کبھی تو کہتی تھیں کہ "وہ انسان کیوں ہے اور فرشتہ کیوں نہیں؟ اور کبھی کہتی تھیں کہ "اگر وہ انسان ہے تو پھر کم از کم اس کے ہمراہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟"

حالانکہ انسانوں کی طرف بھیجے ہوئے رسولوں کو نوع انسانی کا حامل ہونا چاہیئے تاکہ وہ ان کی ضرورتوں، مشکلوں اور مسائل کو محسوس کر سکیں اور انہیں ان کا جواب دے سکیں اور عملی لحاظ سے ان کے لیے نمونہ اور اسوہ قرار پا سکیں۔ [2]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ "اسورۃ" "سوار" (بروزن "ہزار") کی جمع ہے، جس کا معنیٰ "کنگن" ہے، خواہ وہ طلائی ہوں

---

[1] "مقترنین" کا معنیٰ "متتابعین" یا "متعاضدین" بیان کیا گیا ہے اور بعض مفسرین کہتے ہیں یہاں پر "اقتران" بمعنیٰ "تقارن" ہے

[2] اس بارے میں تفسیر نمونہ کی تیسری جلد میں سورۂ انعام کی آیت ۹ کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔

یا نقرئی اور اس کی بنیاد ایک فارسی لفظ "دستوارہ" ہے۔ وہ اور "اساور" جمع الجموع ہے۔

بعد کی آیت میں قرآن مجید ایک لطیف نکتے کی جانب اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ فرعون حقیقت الامر سے قطعاً غافل نہیں تھا اور ان اقدار کے بے وقعت ہونے کی طرف بھی کم وبیش متوجہ تھا۔ لیکن "اس نے ان باتوں کے ذریعے اپنی قوم کو احمق بنایا اور ان کی عقلوں کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی (فاستخف قومه فاطاعوه)۔

اصولی طور پر تمام جابر اور فاسد حکومتوں کا طریق کار یہی ہوتا ہے کہ اپنی خودسری اور ظالمانہ روش کو جاری رکھنے کے لیے لوگوں کی سطح فکر کو پست کر دیتی ہیں مختلف حیلوں اور بہانوں سے انھیں احمق اور بے وقوف بنائے رکھتی ہیں۔ انھیں حقائق کے ادراک سے دور رکھتی ہیں اور یہی اقدار کی جگہ جھوٹی اقدار کو رواج دیتی ہیں۔ اور ہمیشہ حقائق سے دور رکھنے کے لیے ان کی برین واشنگ (BRAIN WASH ING) کرتی رہتی ہیں کیونکہ ملتوں اور اقوام کی بیداری اور ان کی فکری آگاہی خود غرض اور شیطانی حکومتوں کی بہت بڑی دشمن ہوتی ہے جسے یہ حکومتیں اپنی پوری طاقت سے ختم کرنے کے درپے ہوتی ہیں۔

فرعون کا یہ طریقہ کار یعنی لوگوں کو احمق بنانا اور ان کی عقلوں کو ہلکا سمجھنا ہمارے دور کے بھی تمام فاسد معاشروں میں بڑی شدومد کے ساتھ حکم فرما ہے۔ اس مقصد تک پہنچنے کے لیے فرعون کے پاس تو محدود وسائل تھے مگر آج کے طاغوتوں کے پاس اس سے زیادہ وسائل موجود ہیں۔ ذرائع ابلاغ عامہ، اخبارات ورسائل، ریڈیو، ٹیلیویژن اور طرح طرح کی فلمیں حتیٰ کہ گمراہ کن کھیلیں اور نت نئے فیشن کہ جن کے ذریعے وہ اقوام وملل کو بے وقوف بنا رہے ہیں تاکہ اس طرح سے پوری طرح سے حقائق سے بے خبر رہیں اور ان طاغوتوں کی اطاعت کرتے رہیں۔ اسی لیے دین دوست دانشوروں اور رہنماؤں پر ایک عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے پروگرام کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور یہی ان کا اہم ترین فریضہ ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات کو اس جملے کے ساتھ مکمل کیا گیا ہے: "بے شک وہ لوگ بدکار تھے" (انهم كانوا قوما فاسقين)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ لوگ فاسق نہ ہوتے اور خدا کی اطاعت اور عقل کے فیصلوں سے خارج نہ ہوتے تو اس قسم کے پروپیگنڈا اور ڈینگوں کو قطعاً صحیح نہ سمجھتے اور اپنی ہی گمراہی کے اسباب خود فراہم نہ کرتے۔ اسی لیے وہ ہرگز معذور اور مجبور نہ تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فرعون نے ان کی عقلوں پر ڈاکہ ڈال کر اپنی اطاعت پر مائل کر لیا تھا، لیکن اندھادھند طریقے سے اس کے آگے سر تسلیم خم کرکے انھوں نے اس ڈاکے کے اسباب از خود فراہم کیے تھے۔ یقیناً وہ خود بھی فاسق تھے اور ایک فاسق کے تابع فرمان بن گئے تھے۔

یہ تھی خدا کے رسول حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں فرعون اور اہل فرعون کی فریب کاری۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان تمام وعظ ونصیحت اور مختلف طریقوں سے اتمام حجت کے بعد اور ان کے حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی وجہ سے ان کا انجام کیا ہوا؟

اس بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: جب ان لوگوں نے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے بھی ان سے بدلہ لیا اور ان سب کو غرق کر دیا۔ (فلما اسفونا انتقمنا منهم فاغرقناهم اجمعين)۔

خداوندِ عالم نے ان کے لیے اپنے تمام عذابوں میں سے غرقابی کے عذاب کو خاص طور پر منتخب کیا، کیونکہ ان کی تمام عزت وعظمت اور شان وشوکت دریائے نیل اور اس کی عظیم و وسیع نہروں کی وجہ سے تھی کہ اپنے تمام قدرتی وسائل میں سے فرعون نے صرف اسی کا ذکر کیا اور کہا:

" الیس لی ملک مصر و ھٰذہ الانھار تجری من تحتی "

" کیا مصر پر میری حکومت نہیں ہے اور کیا یہ نہریں میرے حکم کے مطابق نہیں چل رہیں ؟"

تو جو چیزیں ان کی زندگی اور طاقت کا سبب تھیں انھیں کو ان کی فنا و بربادی کا موجب اور گورستان بننا چاہیئے تھا تاکہ سب لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ [۱]

" اٰسفونا " " اسف " کے مادہ سے ہے جس کا معنی " غم " بھی ہے اور " غصہ " بھی۔ بلکہ " مفردات " میں " راغب " کے بقول کبھی " غم وغصہ " یعنی دونوں معانی کے لیے بھی آتا ہے اور کبھی علیحدہ علیحدہ معانی کے لیے بھی آتا ہے، کیونکہ درحقیقت ایک اندرونی ہیجان ہوتا ہے، جو انسان کو انتقام پر آمادہ کرتا ہے اور جب اس کی نسبت اپنے ماتحتوں کی طرف ہو تو غصے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور جب افرادِ بالا کی طرف ہو تو " غم " کی صورت میں آشکارا ہوتا ہے۔ لہٰذا جب ابن عباس سے پوچھا گیا کہ " حزن " اور غضب میں کیا فرق ہے تو انھوں نے جواب دیا: ان کی بنیاد اور اصل تو ایک ہے، لیکن الفاظ مختلف ہیں۔ [۲]

بعض مفسرین نے " اٰسفونا " کا مفہوم " اسفو رسلنا " لیا ہے (یعنی ہمارے رسولوں کو محزون اور مغموم کر دیا) لیکن یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے اور اس قسم کے ظاہری اختلاف کو اپنانے کی ضرورت بھی معلوم نہیں ہوتی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ خدا کے بارے میں نہ تو " رنج وغم " کا کوئی مفہوم ہوتا ہے، اور نہ ہی " غصے " کا جیسا کہ ہمارے درمیان مشہور ہے۔ بلکہ خدا کا غیظ وغضب " سزا کا ارادہ " ہوتا ہے، اور اس کی رضامندی " ثواب کا ارادہ " ہوتا ہے۔

زیرِ تفسیر آیات میں سے آخری آیت کو اس مجموعی گفتگو کے نتیجے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: اور ہم نے انھیں عذاب میں پیش قدم اور دوسروں کے لیے عبرت بنا دیا (فجعلناھم سلفا ومثلاً للاٰخرین)۔

لغت میں " سلف " آگے جانے والی چیز کو کہتے ہیں۔ لہٰذا آگے چلی جانے والی نسلوں کو " سلف " اور ان کے

---

[۱] جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

در سرداری کہ باشدت سرداری

ہم در سر آں روی کہ سرداری

ترجمہ:- جس سرداری میں تم زور و شور سے سرکھپا رہے ہو۔ اسی چیز کے سر میں تمہیں جانا چاہیئے، کہ جس کا خیال تم اپنے سر میں رکھے ہوئے ہو۔

[۲] مفردات راغب مادہ " اسف "۔

بعد آنے والوں کو "خلف" کہا جاتا ہے اور جو سودے پیشگی طے پا جاتے ہیں انھیں بھی "سلف" کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کی قیمت پیشگی ادا کردی جاتی ہے۔

نیز "مثل" کا معنی وہ گفتگو ہے جو لوگوں کے درمیان عبرت کی صورت میں رائج ہوتی ہے چونکہ فرعون اور فرعونیوں کا ماجرا اور ان کا دردناک انجام ایک عظیم عبرت کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے اسے دوسری قوموں کے لیے "مثل" کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

۵۷۔ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝

۵۸۔ وَقَالُوا أَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ۝

۵۹۔ إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ ۝

۶۰۔ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ۝

۶۱۔ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝

۶۲۔ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝

ترجمہ

۵۷۔ اور جب مریم کے بیٹے کی مثال بیان کی گئی تو اس سے تیری قوم کے لوگ ہنسنے (اور مذاق کرنے) لگے۔

۵۸۔ اور بول اُٹھے کہ بھلا ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ (عیسٰی اور اگر ہمارے معبود جہنم میں ہیں تو وہ بھی جہنم میں ہے، کیونکہ وہ بھی تو ایک معبود تھا) ان لوگوں نے جو مثال تجھ سے بیان کی ہے وہ تو صرف جھگڑنے کو ہے، جبکہ وہ لوگ تو ہیں ہی کینہ پرور اور جھگڑالو۔

۵۹۔ اور وہ تو بس ایک بندہ تھا جسے ہم نے اپنی نعمتوں سے نوازا اور اسے ہم نے

بنی اسرائیل کے لیے ایک نمونہ بنایا۔

۶۰۔ اور اگر ہم چاہتے تو زمین پر تمہاری جگہ پر فرشتوں کو قرار دے دیتے جو (تمہارے) جانشین ہوتے۔

۶۱۔ اور وہ تو یقیناً قیامت کی آگاہی کا سبب ہے (عیسیٰ کا نزول قیامت کے قریب ہونے کی علامت ہے) تم لوگ ہرگز اس میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

۶۲۔ اور کہیں شیطان تمہیں (راہِ خدا سے) روک نہ دے، کیونکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔

شانِ نزول

سیرت ابنِ ہشام میں ہے۔

ایک دن رسولِ خدا ولید بن مغیرہ کے ساتھ مسجد میں تشریف فرماتھے کہ نضر بن حارث بھی ان کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ قریشی سرداروں کے کئی اور لوگ بھی اس محفل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے بات کی تو نضر بن حارث آپؐ کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا۔ رسولؐ اللہ نے بت پرستی کے غلط ہونے کو ثابت کرتے ہوئے منطقی دلائل کے ذریعے اسے خاموش کردیا، پھر ان کے سامنے اس آیت کی تلاوت کی۔

"انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم انتم لها واردون لو کان هٰؤلاء اٰلهة ما وردوها وکلّ فیها خالدون ....."

تم لوگ اور خدا کے علاوہ وہ معبود کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو جہنم کا ایندھن بنو گے، اور تم سب اس میں داخل ہو گے۔ اگر یہ خدا ہوتے تو کبھی جہنم میں نہ جاتے اور تم سب اس میں ہمیشہ رہو گے۔"

اس واقعے کے بعد آنحضرتؐ اپنی جگہ اُٹھ کر چلے گئے۔ اسی اثناء میں عبداللہ بن زبعری

آگیا اور ان لوگوں سے مل گیا۔ ولید نے عبداللہ سے کہا، نضر بن حارث تو محمد(ص)، کے مقابلے میں عاجز آگیا ہے اور کوئی جواب نہیں دے سکا۔ محمدؐ کا گمان ہے کہ ہم اور ہمارے سارے معبود جہنم کا ایندھن ہیں، عبداللہ نے کہا: خدا کی قسم! اگر میں اسے دیکھتا تو ضرور اس کو جواب دیتا تم اس سے پوچھو کہ اگر ایسی ہی صورتِ حال ہے تو کیا سب عابد اور معبود جہنم میں جائیں گے پھر ہم تو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں، یہودی عزیر کی اور نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کی (پھر کیا حرج ہے کہ ہم فرشتوں اور عزیر و عیسیٰ جیسے انبیاء کے ساتھ ایک ہی جگہ پر ہوں)۔

یہ جواب ولید اور دوسرے حاضرین کو بہت پسند آیا۔ ان کے نزدیک یہ ایک دندان شکن جواب تھا۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا کر یہی کچھ کہا تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: جی ہاں! جسے بھی معبود بننا پسند ہے وہ اپنے عابدوں کے ساتھ جہنم میں جائے گا اور یہ بُت پرست تو درحقیقت شیطانوں کی عبادت کرتے تھے اور جن چیزوں کی عبادت کا شیطان انھیں حکم دیتا تھا۔

اس موقع پر سورہ انبیاء کی آیت ۱۰۱ نازل ہوئی کہ:

"ان الذین سبقت لهم منا الحسنٰی اولٰئك عنها مبعدون"

جن لوگوں سے ہم نے اس سے قبل نیکی کا وعدہ کیا تھا (وہ باایمان لوگ جو معبود بننے پر ہرگز راضی نہیں تھے) وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔

اسی سلسلے میں زیر تفسیر آیت "ولما ضرب ابن مریم ....." بھی نازل ہوئی[1]

تفسیر

کون سے معبود جہنمی ہیں؟

ان آیات میں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے کے بارے میں اور ان کی اور بتوں کی خدائی کے بارے میں مشرکین کے عقیدے کی نفی کی بات کی گئی ہے اور گزشتہ آیات میں حضرت موسیٰؑ کی دعوت اور ان کی فرعونی بُت پرستوں کے ساتھ محاذ آرائی کا جو تذکرہ کیا گیا ہے، اس کے تتمہ کی صورت میں بیان ہو رہی ہیں اور زمانہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشرکوں بلکہ تمام کائنات کے مشرکوں کے لیے زبردست تنبیہ بھی ہے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول ص۳۸۵ تھوڑے سے اختصار کے ساتھ۔

اگرچہ یہ آیات مجمل صورت میں گفتگو کر رہی ہیں، لیکن خود ان آیات میں اور قرآن کی دوسری آیات میں جو قرینہ پایا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مفسرین کی طرح طرح کی تفسیروں کے برعکس ان کا مضمون کسی طرح بھی پیچیدہ نہیں ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اور جب مریم کے بیٹے کی مثال بیان کی گئی تو اس سے تیری قوم کے افراد ہنسنے لگے اور روگردان ہو گئے (ولما ضرب ابن مریم مثلاً اذا قومک منہ یصدون)۔[1]

یہ مثال کیا تھی اور کس نے عیسیٰ بن مریمؑ کے بارے میں پیش کی تھی؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس کے جواب میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ آیت کی تفسیر کے سمجھنے کا راز بھی خود اسی میں مضمر ہے، لیکن بعد کی آیات میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ "مثل" مشرکین کی طرف سے تھی اور ان کے بتوں ہی سے متعلق تھی، کیونکہ بعد کی آیات میں ہے۔

"ما ضربوہ لک الا جدلاً۔"

انھوں نے یہ مثال صرف بیان ہی جھگڑے کے لیے کی تھی۔

اس حقیقت کو اور شانِ نزول میں بیان ہونے والے حقائق کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مثال سے مراد وہی چیز ہے، جب مشرکین نے یہ آیت:

"انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم"

"تم اور خدا کے علاوہ تمام وہ معبود جن کی تم عبادت کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں۔"

(سورۂ انبیاء، ۹۸)

سننے کے بعد استہزاء اور مذاق کے طور پر کہی تھی اور وہ یہ تھی کہ عیسیٰ بن مریم بھی تو معبود تھے اور اس آیت کی رُو سے انھیں بھی جہنم میں جانا چاہیئے، اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اور ہمارے بُت حضرت عیسیٰؑ کے ہمسائے ہوں۔ انہوں نے یہ کہا اور کھل کھلا کر ہنسنے لگے اور خوب مذاق اڑانے لگے۔

پھر انہوں نے کہا: آیا ہمارے خدا بہتر ہیں یا عیسیٰ مسیحؑ (وقالوا ءالھتنا خیر ام ھو)۔

اگر وہ جہنم میں جائیں گے تو ہمارے معبود تو ان سے بڑھ کر نہیں ہیں۔

لیکن تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ تمام حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔" اور ان لوگوں نے جو مثال تجھ سے بیان کی ہے تو وہ صرف جھگڑنے کے لیے ہے (ما ضربوہ لک الا جدلاً)۔

"بلکہ یہ لوگ تو ہیں ہی کینہ پرور اور جھگڑالو، اور حق کے خلاف باطل کا سہارا لیتے ہیں (بل ھم قوم خصمون)۔[2]

وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ صرف وہی معبود جہنم میں جائیں گے جو اپنے لیے عبادت کرنے والوں کی عبادت پر راضی تھے جیسے

---

[1] "یصدون" "صد" کے مادہ سے ہے، اگر اس کا فعل مضارع صاد کے کسرہ کے ساتھ ہو، تو اس کا معنی کھلکھلا کر ہنسنا، ٹھٹھے مارنا اور شور مچانا ہے، جیسا کہ عام طور پر کسی کا استہزاء کرنے کے وقت کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو لسان العرب مادہ "صدد")

[2] "خصمون" "خصم" (بروزن "فطن") کی جمع ہے جس کا معنی ہے بہت ہی لڑنے جھگڑنے والا۔

فرعون کہ جس نے لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دی تھی نہ کہ مسیح جیسے، جو لوگوں کے اس قسم کے عمل سے بیزار تھے، اور بیزار ہیں۔

«بلکہ وہ تو صرف ایک بندہ تھا جسے ہم نے اپنی نعمتوں سے نوازا» ہم نے اسے منصب عطا کر کے لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا تھا (ان ھو الا عبد انعمنا علیہ)۔

اور اسے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ایک نمونہ بنایا (وجعلناہ مثلاً لبنی اسرائیل)۔

اس کا بغیر باپ کے شکم مادر سے پیدا ہونا خدا کی آیات میں سے ایک آیت تھا۔ گہوارے میں باتیں کرنا ایک اور آیت اور پھر اس کا ہر ایک معجزہ عظمتِ الٰہی اور اس کی اپنی نبوت کی واضح نشانی تھی۔ عیسیٰ ساری زندگی خدا کی بندگی میں رہا اور تمام لوگوں کو اسی کی بندگی کی دعوت دیتا رہا۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ خود کہتا ہے، جب تک وہ اس دنیا میں تھا، اس نے توحید کی راہ سے کسی کو بھٹکنے کی اجازت نہ دی جبکہ عیسیٰؑ کی الوہیت یا تثلیث کے خرافاتی عقیدے کی بنیاد ان کے بعد لوگوں نے ڈالی۔ [1]

---

[1] مفسرین نے مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں اور بھی کئی احتمال ذکر کیے ہیں اور ان میں سے مجموعی طور پر کوئی بھی آیات کے مضامین میں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

۱۔ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ مشرکین نے جو "مثال" بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآنی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی سرگزشت کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ "محمد" اس بات کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے، کہ وہ ہمیں اپنی خدائی کی دعوت دے۔

لیکن قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کرتے ہوئے کہتا ہے: "نہ تو عیسیٰ الوہیت کے مدعی تھے اور نہ ہی وہ ہوں گے۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں "مثل" سے مراد وہ تشبیہ ہے جو خدا تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۵۹ میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کے بارے میں ذکر فرمائی کہ:

"ان مثل عیسٰی عند اللہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون"

"اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ آدمؑ کے مانند ہے کہ جسے خدا نے مٹی سے بنایا، پھر فرمایا کہ ہو جا، پس وہ ہو گیا"

(اگر عیسیٰ باپ کے بغیر پیدا ہوا ہے، تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ آدم تو ماں اور باپ (دونوں) کے بغیر مٹی سے پیدا کیا گیا ہے)

۳۔ بعض نے کہا ہے کہ "مثل" سے مراد مشرکین کی وہ باتیں ہیں جو وہ کہتے تھے کہ "اگر عیسائی عیسیٰ کی عبادت کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہ اپنے معبودوں کی عبادت کریں، جو اُن سے افضل ہیں"

لیکن مندرجہ بالا آیات میں جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں اگر ان کی طرف دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ تینوں تفسیروں میں سے کوئی بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے:

۱۔ یہ مثل خود مشرکین کی طرف سے تھی۔

۲۔ ایسی بات تھی جو ان کی نگاہوں میں عجیب و غریب اور مضحکہ خیز تھی۔ (بقیہ صفحہ آئندہ)

یہ بات بھی لائق توجہ اور قابل ذکر ہے کہ شیعہ اور سنی طریقوں سے منقول ہونے والی متعدد روایات میں موجود ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

"ان فیک مثلا من عیسیٰ احبہ قوم فھلکوا فیہ وابغضہ قوم فھلکوا فیہ فقال المنافقون اما رضی لہ مثلا الا عیسیٰ، فنزلت قولہ تعالیٰ "ولما ضرب ابن مریم مثلا اذا قومک منہ یصدون"

"تمہارے اندر عیسیٰ کی علامتیں موجود ہیں، کچھ لوگوں نے تو ان سے محبت کی اور اس قدر غلو کیا کہ انہیں خدا کہنے لگے، اور اسی وجہ سے وہ ہلاک ہو گئے اور کچھ لوگوں نے ان سے دشمنی کا اظہار کیا (جیسا کہ یہودیوں نے کیا کہ وہ ان کے قتل پر کمر بستہ ہو گئے) وہ بھی ہلاک ہو گئے۔ (اسی طرح کچھ لوگ تمہیں خدا سمجھیں گے اور کچھ لوگ دشمنی پر کمر باندھیں گے) تو منافقین نے جب یہ بات سنی تو اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ عیسیٰ کے علاوہ انہیں کوئی مثال نہیں ملی؛ تو اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ ولما ضرب ابن مریم ....

مندرجہ بالا گفتگو اس روایت کا متن ہے جسے اہل سنت کے مشہور عالم حافظ "ابو بکر بن مردویہ" نے اپنی کتاب "مناقب" میں ذکر کیا ہے۔ (منقول از کشف الغمہ ص ۹۵)

بعینہ اسی چیز کو میر محمد صالح کشفی ترمذی نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اپنی کتاب مناقب مرتضوی میں قلمبند کیا ہے۔

اس بات کو بہت سے اہل سنت علماء اور عظیم شیعہ علماء نے اپنی متعدد کتابوں میں نقل کیا ہے۔ کہیں پر تو انھوں نے اس کے ساتھ مندرجہ بالا آیت کو ذکر کیا ہے اور کہیں پر ذکر نہیں کیا۔[1]

آیات میں موجود قرینوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشہور حدیث ایک قسم کی مطابقت کی حیثیت رکھتی ہے، اس کی شان نزول نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر آیت کی شان نزول تو ذہی عیسیٰ علیہ السلام کی داستان، مشرکین عرب کی گفتگو اور ان کے بت تھے، لیکن چونکہ اس سے ملتا جلتا ایک اور تاریخی واقعہ پیغمبر اکرمؐ کی مذکورہ تاریخی گفتگو کے بعد رونما ہوا لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مقام پر بھی یہ آیت تلاوت فرمائی، کیونکہ یہ ماجرا بھی مختلف جہات سے اس کے ایک مصداق کی حیثیت رکھتا ہے۔

بعد کی آیت میں اس لیے کہ انھیں یہ وہم نہ ہو کہ خدا کو ان کی بندگی کی ضرورت ہے، وضاحت کرتے ہوئے بیان فرمایا گیا ہے:

اگر ہم چاہیں تو زمین پر تمہاری جگہ فرشتے لے آئیں کہ جو تمہارے جانشین ہوں۔ (ولو نشاء لجعلنا منکم ملائکۃ فی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) ۳۔ ایسی چیز تھی جو عیسیٰ کی الوہیت کے خلاف تھی۔

۴۔ ان کے اس مقصد کو پورا کر رہی تھی جس کی وجہ سے ایک جھوٹی بات پر جھگڑا کھڑا ہو گیا تھا۔

اور یہ تمام خصوصیات صرف اس تفسیر سے مطابقت رکھتی ہیں جو ہم نے سطور بالا میں متن میں بیان کی ہیں۔

[1] مزید معلومات کے لیے کتاب "احقاق الحق" جلد ۳ ص ۳۹۱، تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۰۹ اور تفسیر مجمع البیان کی طرف انہی آیات کے ذیل میں رجوع فرمائیں۔

الارض یخلفون

وہ فرشتے کہ جو فرمان حق کے تابع ہیں اور اس کی اطاعت و بندگی کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔

کچھ مفسرین نے یہاں پر ایک اور تفسیر ذکر کی ہے، جس کی وجہ سے آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ "اگر ہم چاہیں تو تمہاری اولاد کو فرشتے بنا دیں جو زمین میں تمہارے جانشین ہوں"۔

لہٰذا تم اس بات پر تعجب نہ کرو کہ عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں، خدا تو اس بات پر بھی قادر ہے کہ فرشتے جو ایک علیحدہ نوع ہیں انسانوں سے پیدا کرے۔[1]

اور چونکہ انسان سے فرشتوں کا پیدا ہونا کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا لہٰذا بعض عظیم مفسرین نے اس سے فرشتہ صفت لوگ مراد لیے ہیں۔ ان مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم تعجب نہ کرو کہ مسیح جیسا خدا کا ایک بندہ حکم خدا سے مردوں کو زندہ کرنے اور بیماروں کو شفا بخشنے کی طاقت رکھتا ہے، جبکہ وہ مخلص اور فرمانِ الٰہی کا تابع بھی ہو۔ اگر خدا چاہے تو تمہاری اولاد میں سے ایسے لوگوں کو پیدا کردے جن کی تمام صفات اور عادات فرشتوں کی سی ہوں۔[2]

لیکن ان سب تفسیروں میں سے پہلی تفسیر آیت کے ظاہری معنی کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہے باقی سب بعید معلوم ہوتی ہیں۔[3]

بعد کی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ تو یقیناً قیامت کی آگاہی کا ایک سبب ہے (وانہ لعلم للساعۃ)۔

یا اس وجہ سے کہ اس کی بغیر باپ کے ولادت خدا کی بے انتہا قدرت کی دلیل ہے، جس کے پرتو میں مرنے کے بعد کی زندگی (حیاتِ بعد الموت) کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔

یا اس لحاظ سے کہ متعدد اسلامی روایات کے مطابق عیسیٰ کا آسمان سے نزول آخری زمانے میں ہوگا اور یہ قیامت کے قیام کی دلیل ہے۔

جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر اکرم کو یہ فرماتے سنا ہے:

"ینزل عیسی بن مریم فیقول امیرھم تعال صل بنا، فیقول لا ان بعضکم علی بعض امراء، تکرمۃ من اللہ لھذہ الامۃ"

عیسیٰ اتریں گے اور مسلمانوں کا امیر (یہاں پر امیر سے مراد حضرت مہدیؑ ہیں جیسا کہ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے) ان سے کہے گا، آیئے اور ہمیں نماز پڑھایئے! اور وہ کہیں گے نہ امیر

---

[1] پہلی تفسیر کو طبریؒ نے مجمع البیان میں، شیخ طوسیؒ نے تبیان میں اور بعض دوسرے مفسرین نے انتخاب کیا ہے، جبکہ دوسری تفسیر کو قرطبیؒ، فخر رازی اور آلوسی نے اپنی کتاب روح المعانی میں، زمخشری نے کشاف میں اور مراغی نے دوسرا معنی دو معانی میں سے ایک کے طور پر نقل کیا ہے۔

[2] تفسیر المیزان اسی آیت کے ذیل میں۔

[3] پہلی تفسیر کے مطابق "من" بدل کے لیے ہے، جبکہ دوسری اور تیسری تفسیر کے مطابق "من" "نشویہ" ہے۔

تمہیں میں سے ہوگا اور یہ عزت اللہ نے اس امت کو عطا فرمائی ہے۔ (پھر حضرت عیسیٰ جناب امام مہدیؑ کی اقتدار کریں گے۔) ؎۱

ایک اور حدیث میں جناب رسالت مآبؐ فرماتے ہیں۔

"کیف انتم اذا نزل فیکم ابن مریم وامامکم منکم"

تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب مریم کے فرزند تمہارے درمیان نازل ہوں گے جب کہ تمہارا امام تمہیں میں سے ہوگا۔ ؎۲

بہر حال حضرت مسیحؑ پر لفظ "علم" کا اطلاق ایک قسم کی تاکید اور مبالغہ کی صورت میں ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا نزول یقیناً قیامت کی ایک نشانی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "انہ" میں موجود ضمیر "قرآن" کی طرف لوٹ رہی ہو، جس کے مطابق آیت کا معنی یوں ہوگا: قرآن جو کہ آخری کتاب ہے، اس کا نزول قیامت کے قریب ہونے کی دلیل ہے اور قیامت کے قائم ہونے کی خبر دیتا ہے۔

لیکن آیات کا سیاق و سباق جو حضرت عیسیٰ سے متعلق ہے، پہلی تفسیر کی تقویت کرتا ہے۔

بہر حال اس کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے قیامت کا قیام یقینی ہے اور اس کا واقع ہونا نزدیک ہے۔ "اور تم لوگ ہرگز اس میں شک نہ کرو" (فلا تمترن بها)۔

نہ تو عقیدے کے لحاظ سے اور نہ ہی عمل کے لحاظ سے، جیسا کہ غافل لوگ کر رہے ہیں، اور میری پیروی کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے" (واتبعون هٰذا صراط مستقیم)۔

اس سے بڑھ کر اور کونسا راستہ سیدھا ہو سکتا ہے، جو تمہیں آئندہ درپیش آنے والے خوفناک حالات سے آگاہ کرتا ہے اور روزِ قیامت ان خطرات سے نجات کا راستہ تمہیں بتاتا ہے۔

لیکن شیطان تو چاہتا ہے کہ ہمیشہ تمہیں غافل اور بے علم رکھے، لیکن تمہیں خود ہوش سے کام لینا چاہیئے کہ کہیں شیطان تمہیں راہ خدا اور بروزِ قیامت اپنی تقدیر سنوارنے سے تمہیں روک نہ دے، کیونکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے" (و لا یصدنکم الشیطان انہ لکم عدو مبین)۔

اس نے اپنی عداوت اور دشمنی کا اظہار تو روز اول ہی سے کر دیا تھا، جب اس نے تمہارے ماں باپ (آدم و حوا) کے دل میں وسوسہ ڈال کر بہشت سے نکلوا دیا تھا اور دوسری مرتبہ اس نے قسم کھائی کہ "مخلصین" کے سوا باقی تمام بنی آدم کو گمراہ کر کے چھوڑے گا۔ لہٰذا تم ایسے قسم کھانے والے دشمن کے مقابلے میں کیونکر خاموش بیٹھ سکتے ہو اور اسے اس بات کی اجازت کیسے دے سکتے ہو کہ وہ تمہاری روح اور جسم پر غلبہ پالے اور اپنے مسلسل وسوسوں سے تمہیں سیدھی راہ سے روک دے۔

؎۱ اس حدیث کو صاحب تفسیر مجمع البیان نے "صحیح مسلم" سے اسی آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

؎۲ تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں اور تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ ص۔

۶۳۔ وَلَمَّا جَآءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ○

۶۴۔ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ○

۶۵۔ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ ○

ترجمہ

۶۳۔ اور جب عیسیٰ واضح دلائل لے کر آئے تو کہا میں تمہارے پاس دانائی لے کر آیا ہوں، تاکہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو، تمہیں صاف صاف بتادوں، تو تم لوگ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

۶۴۔ بے شک خدا ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

۶۵۔ لیکن ان میں کئی فرقے بن گئے جنہوں نے (عیسیٰ کے بارے میں) اختلاف کیا (اور کچھ لوگوں نے انھیں خدا سمجھا) تو جن لوگوں نے ظلم کیا ان کے لیے اس دن کے عذاب کا افسوس ہے کہ جو بہت دردناک ہے۔

تفسیر

جن لوگوں نے عیسٰی کے بارے میں غلو کیا

گزشتہ آیات میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زندگی کے کچھ خصوصی پہلو ذکر کیے گئے تھے۔ زیرِ تفسیر آیات اس سلسلے کو آگے بڑھاتی ہیں، اور خالص دین کی طرف ان کی دعوت اور ہر طرح کے شرک کی نفی کا ذکر کرتی ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے، جب عیسٰی واضح دلائل (معجزات اور خدائی آیات) لے کر آئے تو کہا: میں تمہارے پاس دانائی لے کر آیا ہوں تاکہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو صاف صاف بتا دوں۔ (ولما جاء عیسٰی بالبینات قال قد جئتکم بالحکمة ولا بین لکم بعض الذی تختلفون فیه)۔

اس طرح سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کا سرمایہ "بینات" یعنی خدا کی آیتیں اور معجزات تھے، جو ایک طرف تو ان کی حقانیت کو بیان کر رہے تھے اور دوسری طرف ان حقائق کو جو مبدا اور معاد اور انسانی زندگی کی ضروریات سے متعلق ہیں۔

اس عبارت میں حضرت عیسٰی علیہ السلام حکمت کو اپنی دعوت کا محور بتاتے ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ "حکمت" کا اصلی معنی "اصلاح کی غرض سے کسی چیز سے روکنا" ہے۔ اس کے بعد تمام عقاید حقہ اور اس صحیح نظام زندگی کا اعلان فرما رہے ہیں جو انسانوں کو ہر قسم کی بے راہ روی ایمان اور عمل میں ہر قسم کی بے راہ روی سے روکتا ہے اور جس میں تہذیب نفس اور اخلاق بھی شامل ہیں، تو اس طرح یہاں پر حکمت کا وسیع معنی مراد ہے جو "حکمت عملی" اور "حکمت علمی" دونوں پر محیط ہے۔ یہ حکمت علاوہ ازیں ایک اور ہدف کو بھی پیش نظر رکھے ہوئے ہے اور وہ ہے ان اختلافات کا دور کرنا کہ جن کی وجہ تمام معاشرتی نظام درہم برہم ہو جاتے ہیں، اور لوگ سرگردان ہو جاتے ہیں اسی لیے جناب عیسٰی علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں اس چیز پر زیادہ زور دیا ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور اکثر مفسرین نے بھی اس طرف توجہ کی ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب عیسٰی علیہ السلام نے یہ کیوں کہا ہے کہ میں تمہارے درمیان موجود بعض اختلافات کو دور کرنے کے لیے آیا ہوں۔ انھوں نے تمام اختلافات کو دور کرنے کا کیوں نہیں کہا؟

اس سوال کے ویسے تو کئی جواب دیئے گئے ہیں، لیکن سب سے مناسب جواب یہ ہے کہ:

لوگوں کے درمیان دو قسم کے اختلافات ہوتے ہیں، ایک قسم تو ان اختلافات کی ہے جو اعتقادی اور عملی نکتہ نظر سے انسان سازی میں اور انفرادی و اجتماعی لحاظ سے مؤثر ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے وہ اختلافات ہوتے ہیں، جو انسان کے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوتے، جیسے منظومہ شمسی کی پیدائشی کیفیت، افلاک اور ستاروں کی حقیقت، انسانی روح کی ماہیت اور زندگی کی حقیقت وغیرہ کے بارے میں اختلافات۔

پس صاف ظاہر ہے کہ انبیاءؑ کا فریضہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے اختلافات کو حقائق کے ذریعے ختم کریں اور ان کی یہ ذمہ داری

نہیں ہوتی کہ ہر قسم کے اختلافات کا خاتمہ کریں، اگرچہ انسان کی تقدیر کے ساتھ ان کا کسی قسم کا تعلق بھی ہو۔
یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ بعض اختلافات کے بیان کرنے کا مقصد خود انبیاءؑ کی دعوت کا نتیجہ اور اس کی غرض وغایت ہے، یعنی انجام کار وہ موفق ہو جائیں گے اور ان کے بعض اختلافات کو حل کریں گے، لیکن تمام اختلافات کا دُنیا میں حل کرنا ممکن نہیں ہے، اسی لیے قرآن مجید کی متعدد آیات میں قیامت کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس دن تمام اختلافات ختم ہو جائیں گے، جیسا کہ سورۂ نحل کی ۹۲ ویں آیت میں ہے کہ:

"ولیبینن لکم یوم القیامة ما کنتم فیه تختلفون"

"جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے ہو انہیں یقیناً قیامت کے دن تمہارے لیے بیان کرے گا۔"

(اور یہی بات سُورۂ آلِ عمران کی آیت ۵۵ سورۂ مائدہ کی آیت ۴۸، سُورۂ انعام کی آیت ۱۶۴ اور سُورۂ حج کی آیت ۶۹ وغیرہ میں بیان ہوئی ہے) [۱]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اب جب کہ صورت حال یہ ہے اور میری دعوت کا لب لباب یہی ہے: "تو تم لوگ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو" (فاتقوا الله واطیعون)۔

پھر اپنی الوہیت کے بارے میں ہر قسم کے شک وشبہ کو دُور کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "بے شک میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے" (ان الله هو ربی وربکم)۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے اس آیت میں کلمہ "رب" دو مرتبہ بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ اپنے لیے اور دوسری مرتبہ عام لوگوں کے لیے تاکہ واضح کر دیں کہ میں اور تم، سب برابر ہیں اور تمہارا اور میرا پروردگار ایک ہی ہے۔

...اپنے وجود اور ہستی کے لیے تمہاری طرح ایک مدبر اور خالق کا محتاج ہوں، وہی میرا مالک اور رہنما ہے۔

مزید تاکید کے طور پر فرماتے ہیں: جب یہ عالم ہے تو پھر تم اسی کی عبادت کرو (فاعبدوہ)۔

کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی بھی لائق عبادت نہیں، تمام چیزیں مربوب ہیں اور وہ رب ہے، تمام اس کے مملوک ہیں اور وہ سب کا مالک ہے۔

ایک بار پھر اپنی اس گفتگو پر تاکید کرتے ہیں تاکہ کسی قسم کے بہانے کی گنجائش باقی نہ رہ جائے، فرماتے ہیں: یہی سیدھا راستہ ہے (هٰذا صراط مستقیم) [۲]

---

[۱] کچھ اور مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر لفظ "بعض" "کل" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یا "بعض الذی تختلفون فیه" کی تعبیر موصوف کی صفت کی طرف اضافت ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میں صرف تمہارے لیے دینی امور بیان کرتا ہوں نہ کہ تمہارے دنیاوی امور لیکن ان میں سے کوئی تفسیر بھی قابلِ توجہ نہیں ہے۔

[۲] اسی طرح کی باتیں مختصر سے فرق کے ساتھ سورۂ مریم کی آیت ۳۶ اور سورۂ انعام کی آیت ۵۱ میں بھی بیان ہوئی ہیں اور اس معنی کا تکرار اس حقیقت کی تاکید ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی بندگی کے بارے میں ان سب پر اتمام حجت کر دیا۔

جی ہاں! راہ راست وہی خدا کی عبودیت اور بندگی کا راستہ ہے جس میں کسی قسم کی کجی اور ٹیڑھاپن نہیں ہے، جیسا کہ سورۂ یٰسین کی ۶۱ ویں آیت میں آیا ہے" وان اعبدونی ھٰذا صراط مستقیم " کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ میری عبادت کرو کیونکہ سیدھا راستہ یہی ہے۔

لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ اس قدر تاکید کے باوجود عیسیٰ کی وفات کے بعد ان میں کئی فرقے بن گئے جنہوں نے (عیسیٰ کے بارے میں) اختلاف کیا " (فاختلف الاحزاب من بینھم)۔[1]

کچھ لوگوں نے تو انھیں خدا سمجھا کہ جو زمین پر اُتر آیا تھا جبکہ کچھ لوگوں نے انہیں خدا کا بیٹا جانا اور کچھ لوگوں نے انھیں "اقانیم ثلثہ" (باپ، بیٹا اور رُوح القدس) میں سے ایک سمجھا۔

صرف چند لوگوں نے انہیں خدا کا بندہ اور رسُول سمجھا، لیکن ایسے افراد اقلیت میں ہیں۔ آخر کار اکثریت کا عقیدہ غالب آگیا اور تثلیث اور تین خداؤں کے عقیدے نے تمام مسیحی دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس بارے میں ہم نے سُورۂ مریم کی آیت ۳۶ کے ذیل میں تفسیر نمونہ کی ساتویں جلد میں ایک دلچسپ اور تاریخی حدیث بیان کی ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ صرف عیسائیوں کے درمیان ہی اختلاف موجود نہیں تھا بلکہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان بھی اختلاف کھڑے ہو گئے تھے۔ حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں نے ان کے بارے میں غلو سے کام لیا اور انھیں خدا سمجھنے لگے، جبکہ عیسیٰ کے دشمنوں نے انہیں اور ان کی پاک دامن ماں، جنابِ مریم پر مختلف تہمتیں لگائیں اور جاہلوں کا طریقہ کار ایسے ہی ہوُا کرتا ہے۔ کچھ لوگ افراط کا شکار ہوتے ہیں اور کچھ تفریط کا۔ یا بقول امیرالمؤمنین علی علیہ السلام کچھ لوگ "محب غال" ہوتے ہیں اور کچھ "مبغض قال" ہوتے ہیں۔

جیسا کہ آپ فرماتے ہیں :

" ھلك فی رجلان محب غال ومبغض قال "

"میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہُوئے ایک تو وہ دوست جنہوں نے مجھے خدا جانا اور دوسرے وہ تہمت لگانے والے دشمن جنہوں نے مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگائے"۔[2]

ان دونوں بزرگواروں کے حالات کس قدر ملتے جُلتے ہیں۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کو روز قیامت کے دردناک عذاب کی دھمکی دیتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے ظلم کیا اور صراطِ مستقیم سے منحرف ہو گئے، ان کے لیے دردناک دن کے عذاب کا افسوس ہے (فویل للذین

---

[1] "بینھم" میں "ھم" کی ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہے جنھیں اس سے پہلی آیت میں حضرت عیسیٰ نے مخاطب کیا، اور خدا کی عبادت کی دعوت دی۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۱۱۷۔

ظلموا من عذاب یوم الیم)۔[1]

جی ہاں! قیامت کا دن دردناک دن ہوگا، اس کے حساب کا طول دردناک، اس کا عذاب اور سزا دردناک، اس کی حسرت واندوہ دردناک اور اس کی رسوائی اور ذلت دردناک۔

---

[1] توجہ رہے کہ "الیم" "یوم" کی صفت ہے نہ کہ "عذاب" کی۔

۶۶۔ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○

۶۷۔ اَلْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ ○

۶۸۔ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ○

۶۹۔ اَلَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ ○

ترجمہ

۶۶۔ وہ لوگ کس انتظار میں ہیں؟ کیا اس میں کہ اچانک ان پر قیامت آجائے اور ان کو خبر تک نہ ہو۔

۶۷۔ اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے ہاں البتہ پرہیز گار (کہ وہ دوست ہی رہیں گے)۔

۶۸۔ اے میرے بندو! آج نہ تمھیں کوئی خوف ہے اور نہ ہی تم غمگین ہو گے۔

۶۹۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور ہمارے فرماں بردار تھے۔

تفسیر

کِس انتظار میں ہو؟

گذشتہ آیات میں رسُولِ اسلام کے زمانے کے ہٹ دھرم بُت پرستوں نیز اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی اُمت میں سے گمراہ اور مشرک لوگوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ نظر آیات میں ان کے انجام کو مجسم کرکے پیش کیا جارہا ہے

فرمایا گیا ہے : وہ لوگ کس انتظار میں ہیں سوائے اس کے کہ اچانک ہی ان پر قیامت آجائے اوران کو خبر تک نہ ہو (ھل ینظرون الا الساعة ان تأتیھم بغتة وھم لا یشعرون)۔

یہ سوال جو استفہام انکاری کی صُورت میں پیش کیا گیا ہے درحقیقت اس قسم کے افراد کی حقیقت حال واضح کرنے کے لیے ہے، جیسے کسی ایسے شخص کی مذمت میں جو کسی بھی خیر خواہ کی نصیحت کو نہیں سُنتا اور اپنی تباہی کے اسباب خُود فراہم کرتا ہے، یہ کہا جاتا ہے کہ وہ تو صرف اپنی موت کا منتظر ہے۔

اس آیت میں بھی بہت سی دوسری قرآنی آیات کے مانند "ساعة" سے مراد قیامت کا دن ہے، کیونکہ اس کے حوادث بہت جلد عملی جامہ پہن لیں گے گویا ایک ہی گھڑی میں سب کچھ ہوجائے گا۔

البتہ یہ کلمہ کہیں پر دُنیا کے خاتمے کے آخری لمحے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور چونکہ ان دونوں کا آپس میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے لہٰذا ممکن ہے اس قسم کی تعبیر ان دونوں مراحل کے بارے میں ہو۔

بہر حال قیامت کا قیام جو دُنیا کے ناگہانی طور پر خاتمے کے ساتھ شروع ہوجائے گا کے بارے میں مندرجہ بالا آیت میں دو صفات بیان کی گئی ہیں ایک یہی "بغتة" (اچانک طور پر) اور دوسرے اس کے وقوع پذیر ہونے سے لوگوں کی لاعلمی۔

ممکن ہے کوئی ایسی چیز اچانک اور ناگہانی صُورت میں واقع ہو کہ جس کا ہمیں پہلے سے انتظار تھا اور اس کا سامنا کرنے کے لیے ہم پہلے سے تیار ہوں، لیکن مصیبت یہ ہے کہ قیامت کا عظیم ترین، تباہ کن اور طاقت فرسا حادثہ اچانک اور ناگہانی صُورت میں واقع ہوگا اور ہم بالکل اس سے غافل ہوں گے۔

ان مجرموں کا حال بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ وہ اس حد تک غفلت میں پڑے ہوں گے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث کے مطابق :

"تقوم الساعة والرجلان یحلبان النعجة، والرجلان یطویان الثوب ثم قرأ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "ھل ینظرون الا الساعة ان تأتیھم بغتة وھم لا یشعرون"

"قیامت اچانک واقع ہوگی، جب کہ ہر شخص اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوگا کچھ لوگ

گوسفند کا دودھ دوہ رہے ہوں گے اور کچھ (خرید وفروخت کے لیے) کپڑا پھیلا رہے ہوں گے۔
پھر آنحضرتؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ "ھل ینظرون الا ......" [1]

کس قدر دردناک بات ہوگی کہ ایسے حالات میں انسان واپسی کی راہیں کھو بیٹھے گا۔ اس قدر غفلت کا شکار ہو جائے گا کہ کسی قسم کی تیاری کے بغیر اس کی موجوں میں غرق ہو جائے گا۔

بعد کی آیت میں ان دوستوں کی صورت حال بیان کی جا رہی ہے جو جرم وگناہ اور دُنیا کی چکا چوند زندگی کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھائے ہوئے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، مگر پرہیز گار (کہ وہ دوست ہی رہیں گے) (الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض عدو الا المتقین)۔[2]

یہ آیت چونکہ عرصہ محشر کی تصویر کشی کر رہی ہے لہٰذا اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ آیت میں بھی "ساعۃ" سے مُراد قیامت کا دن ہے کہ جس دن دوستی کے سب رشتے ٹوٹ جائیں گے، لیکن جو رشتے خدا کے لیے اور خدا کے نام پر استوار کئے گئے ہوں وہ برقرار رہیں گے۔

اس دن اس قسم کی دوستیوں کا دشمنی میں تبدیل ہو جانا فطری بات ہے، کیونکہ اس دن ہر دوست اپنے دوست کو اپنی تباہی اور بربادی کا سبب سمجھے گا گویا اس سے کہے گا کہ تو نے ہی مجھے یہ راستہ دکھایا تھا اور مجھے اس کی دعوت دی تھی، تو نے ہی دُنیا کو میری آنکھوں میں بنا سجا کر پیش کیا تھا اور مجھے اس کی ترغیب دلائی تھی تو ہی تو تھا جس نے مجھے غفلت اور غرور کے سمندروں میں غرق کر دیا تھا اور مجھے میرے انجام سے بے خبر رکھا تھا، ہر ایک اپنے دوست سے یہی کہے گا۔

صرف پرہیز گاروں کی دوستی پائیدار اور جاودانی ہوگی، کیونکہ ان کی دوستی کے معیار اور اقدار پائیدار ہوتے ہیں جس کے نتائج بروز قیامت آشکار ہوں گے اور دوستی کو مزید استحکام ملے گا۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ دوست امُور زندگانی میں ایک دوسرے کے معاون ومددگار ہوتے ہیں۔ اگر دوستی شر وفساد کی بنیاد پر استوار ہو تو ایک دوسرے کے جرم میں شریک ہوتے ہیں اور اگر خیر وصلاح کی بنیادوں پر قائم ہو تو ثواب میں شریک ہوتے ہیں بنا بریں اگر پہلی قسم کی دوستی بروز قیامت دشمنی میں بدل جائے تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے اور اگر دوسری قسم کی دوستی مستحکم تر ہو تو بھی باعث تعجب نہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

---

[1] تفسیر "روح البیان" جلد ۱۵ ص۴۰۹۔

[2] "اخلاء" "خلیل" کی جمع ہے اور "خلۃ" کے مادہ سے ہے۔ جس کا معنیٰ "مودت" اور "دوستی" ہے اور اس کی بنیاد "خلل" اور وزن "شرف" ہے جس کا معنیٰ "دو جسموں کا درمیانی فاصلہ ہے" اور چونکہ محبت اور دوستی گویا انسانی دل میں راسخ ہو جاتی ہے، لہٰذا یہ لفظ اس کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

• الا کل خلة کانت فی الدنیا فی غیر اللہ عز وجل فانها تصیر عداوة یوم القیامة:

"تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ دُنیا میں جو بھی دوستی خدا کے لیے نہ ہو گی وہ قیامت میں عداوت اور دشمنی میں بدل جائے گی [1]

اس دن خداوند عالم انھیں فرمائے گا: اے میرے بندو! آج نہ تو تمھارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ ہی تم غمگین ہو گے (یا عباد لا خوف علیکم الیوم ولا انتم تحزنون)۔

کس قدر دلکش پیغام ہے، خدا کی جانب سے براہِ راست پیغام، ایسا پیغام جو بہترین اوصاف کے ساتھ شروع ہوتا ہے یعنی اے میرے بندو! ایسا پیغام جو پریشان کن دن میں ہر قسم کی پریشانی دُور کر دے گا۔ ایسا پیغام جس سے تمام گزشتہ رنج و غم کافور ہو جائیں گے جی ہاں اس پیغام میں مذکورہ چاروں خوبیاں موجود ہیں۔

زیرِ تفسیر آیات کے سلسلہ کی آخری آیت میں ان پرہیزگاروں اور خدا کے مکرم و محترم بندوں کو دو اور صفات کے ساتھ نمایاں فرمارہا ہے کہ "یہ وہ لوگ ہوں گے جو ہماری آیات پر ایمان لے آئے اور ہمارے فرمانبردار تھے" (الذین امنوا بایاتنا وکانوا مسلمین)۔

جی ہاں! ایسے مومن لوگ ہی خدا کے قابل افتخار خطاب کے مخاطب اور اس قسم کی نعمتوں کے حقدار ہوں گے۔

درحقیقت مندرجہ بالا دونوں جملے ان کے اعتقاد و عمل کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ "ایمان" ان کی اعتقادی بنیادوں پر استوار عمارت کو واضح کر رہا ہے اور "اسلام" ان کے فرمانِ الٰہی کو عملی جامہ پہنانے کی نشاندہی کر رہا ہے۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم، جیسا کہ تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۶۱۲ پر درج کیا گیا ہے۔

۷۰۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ○

۷۱۔ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ۚ

۷۲۔ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

۷۳۔ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○

ترجمہ

۷۰۔ (ان سے کہا جائے گا) تم اپنی بیویوں سمیت نہایت ہی خوشی اور شادمانی کے ساتھ بہشت میں داخل ہو جاؤ۔

۷۱۔ ان کے گرد کھانے کے طلائی برتنوں اور سنہری جاموں کا دور چلے گا اور وہاں (بہشت میں) جس چیز کو ان کا جی چاہے گا اور جس سے آنکھیں لذت اٹھائیں، سب موجود ہوگا اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔

۷۲۔ یہ وہی بہشت ہے جس کے تم اپنے انجام دیئے ہوئے اعمال کے باعث وارث بنو گے۔

۷۳۔ وہاں تمہارے لیے فراواں پھل ہیں جنہیں تم کھاؤ گے۔

تفسیر

جو جی چاہے اور جس سے آنکھ لذّت اُٹھائے

یہ آیات خدا کے ان خالص بندوں اور صالح مؤمنین کی جزار بیان کر رہی ہیں، جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور بہشت بریں کی سات قیمتی نعمتوں کی خوشخبری دے رہی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: خداوندِ عظیم و منّان کی طرف سے انہیں خطاب ہوگا: بہشت میں داخل ہو جاؤ (ادخلوا الجنّة)۔
اس طرح ان کا حقیقی میزبان خود خدا ہی ہو گا جو اپنے مہمانوں کو دعوت دے کر فرمائے گا کہ تشریف لایئے اور جنت میں داخل ہو جایئے۔

پھر پہلی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: تم بھی اور تمھاری بیویاں بھی (انتم وازواجکم)۔
ظاہری بات ہے کہ مؤمن اور مہربان بیویوں کا اپنے شوہروں کے ساتھ ساتھ ہونا مردوں کے لیے بھی خوشی کی بات ہو گی اور عورتوں کے لیے بھی، کیونکہ اگر وہ دُنیا میں ایک دوسرے کے دُکھ درد کے شریک تھے تو آخرت کی خوشیوں میں بھی ایک دوسرے کے ہمرکاب ہوں گے۔

بعض مفسرین نے یہاں پر "ازواج" کا معنی ہم رکاب، دوست اور نزدیکی لوگ کیا ہے اور اگر ایسا بھی ہو تو یہ بات بجائے خود ایک عظیم نعمت ہے۔ لیکن آیت کا ظاہری معنی وہی پہلا ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: تم سب خوشی اور شادمانی میں مستغرق رہو، اس طرح کہ اس خوشی کے آثار تمھارے چہروں سے ظاہر ہوں۔ (تحبرون)۔

"تحبرون" "حبر (بروزن ابر)" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے "حسبِ دل خواہ اثر" اور کبھی اس کا اطلاق سنگھار اور خوشی کے ان آثار پر بھی ہوتا ہے جو چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں اور اگر "عطا" کو "احبار" (جزُ بروزن اَبُر کی جمع) کہا جاتا ہے، تو ان آثار کی وجہ سے جو انسانی معاشروں میں باقی رہ جاتے ہیں، جیسا کہ امیرالمؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"العلماء باقون ما بقی الدهر اعیانهم مفقودة وامثالهم فی القلوب موجودة"

"جب تک دُنیا باقی ہے، علماء زندہ ہیں۔ وہ بذاتِ خود تو ہمارے درمیان موجود نہیں ہوتے لیکن ان کے آثار دلوں میں موجود ہوتے ہیں۔" [1]

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ نمبر ۱۴۷۔

تیسری نعمت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: خاص خدمت گاروں کے ذریعے بہترین غذا اور بہشتی مشروبات سے بھرے کھانوں کے طلائی برتن اور شراب طہور کے زرین جام ان کے گرداگرد گھمائے جائیں گے (یطاف علیھم بصحاف من ذھب واکواب)۔

بہترین ظروف اور بہترین کھانوں سے نہایت ہی آرام، اطمینان اور صدق وصفا کے ساتھ اور کسی قسم کی پریشانی کے بغیر ان کی تواضع کی جائے گی۔

"صحاف" " صحفة" (بروزن "صفحہ") کی جمع ہے جو دراصل "صحف" کے مادہ سے لیا گیا ہے، جس کا معنی "وسعت دینا" ہے اور یہاں پر بڑے بڑے اور وسیع ظروف کے معنی میں ہے۔

"اکواب" "کوب" کی جمع ہے، جس کا معنی ہے "پانی کے ایسے برتن جن کا دستہ نہیں ہوتا" اور آج کی اصطلاح میں انہیں "جام" یا "پیالہ" کہا جاتا ہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا آیت میں صرف طلائی برتنوں کی بات کی گئی ہے اور خوراک ومشروبات کی بحث نہیں کی گئی لیکن ظاہر ہے کہ مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے خالی برتنوں کا دور کبھی نہیں چلتا۔

چوتھے اور پانچویں مرحلے پر وہ اور نعمتوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جن میں تمام مادی اور معنوی نعمتیں جمع ہیں، ارشاد ہوتا ہے: اور بہشت میں جس چیز کو جی چاہے اور جس سے آنکھیں لذت اٹھائیں، سب کچھ موجود ہوگا (وفیھا ماتشتھیہ الانفس وتلذ الاعین)۔

تفسیر مجمع البیان میں مرحوم طبرسی کے بقول اگر کائنات کی تمام مخلوق جمع ہو کر ہر طرح کی بہشتی نعمتوں کی تعریف وتوصیف کرنے لگے پھر بھی اس حد کو نہیں پہنچ سکے گی جو اس جملے میں موجود ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا زیبا اور جامع تعبیر ہو سکتی ہے؟ ایسی تعبیر جو کائنات کی وسعتوں۔ اور ان تمام تصورات کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو ہمارے ذہن میں آسکتے ہیں اور جو نہیں آسکتے۔ ایسی تعبیر جس سے بڑھ کر اور کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ دل پسند چیزوں کو آنکھ کی لذتوں سے علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ علیحدگی بھی بڑی معنی خیز ہے۔ یہاں پر پہلے ایک عمومی اور ہمہ گیر چیز بیان کرنے کے بعد اس میں سے کچھ خاص چیزوں کو جدا کر کے بیان کیا گیا ہے باین معنی کہ "آنکھ کی لذت" کی اہمیت سب سے زیادہ اور دوسری تمام لذتوں سے برتر اور بالاتر ہوتی ہے، یا اس لحاظ سے کہ "ما تشتھیہ الانفس" کا جملہ ذائقہ (چکھنے کی)، شامہ (سونگھنے کی)، سامعہ (سننے کی) اور لامسہ (مس کرنے اور چھونے کی) لذتوں کو بیان کر رہا ہے، لیکن "تلذ الاعین" کا جملہ آنکھ کی لذت کو بیان کر رہا ہے۔

بعض مفسرین یہ سمجھتے ہیں کہ "ماتشتھیہ الانفس" تمام جسمانی لذتوں کی طرف اشارہ ہے، جبکہ "تلذ الاعین" روحانی لذات کا بیان کر رہا ہے اور بہشت میں اس سے بڑھ کر اور کیا لذت ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے دل کی آنکھوں سے پروردگار کے جمال بے مثال کا مشاہدہ کرے کہ جس کا ایک لمحہ بہشت کی تمام مادی نعمتوں سے افضل اور برتر ہے۔

ظاہر ہے کہ شوق وصال جس قدر زیادہ ہوگا دیدار کی لذت بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر مفسرین کو ایک سوال درپیش ہے اور وہ یہ کہ آیا اس آیت کا عمومی مفہوم اس بات کی دلیل ہے کہ جن چیزوں کو اس دُنیا میں خدا نے حرام کیا ہے اگر ان چیزوں کا وہ بہشت میں تقاضا کریں گے تو وہ بھی انھیں ملیں گی؟

اس طرح کا سوال درحقیقت ایک نکتے کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے ذہن میں اٹھتا ہے اور وہ یہ کہ حرام کردہ اور بُری چیزیں درحقیقت اس خوراک کے مانند ہیں جو انسانی رُوح کے لیے قطعاً مناسب نہیں ہوتیں اور یقیناً صحیح وسالم رُوح اس قسم کی غذا کی خواہش نہیں کرتی، بیمار رُوحیں ہوتی ہیں جو زہریلی اور نامناسب غذاؤں کی خواہش کا اظہار کرتی ہیں۔

ہم ایسے بیماروں کو بھی دیکھتے ہیں جو بیماری کی حالت میں مٹی یا اس قسم کی دوسری چیزوں تک کو کھانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جونہی یہ بیماری برطرف ہو جاتی ہے، اس قسم کی غلط خواہشیں از خود ختم ہو جاتی ہیں۔ یقیناً جنتی لوگ ہرگز اس قسم کے اعمال کی خواہش نہیں کریں گے، کیونکہ ایسے اعمال کی خواہش بیمار جہنمی ارواح کی خصوصیات میں شامل ہے۔

یہ سوال بالکل اس طرح ہے جیسے روایت میں آیا ہے۔

"ایک اعرابی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا، آیا بہشت میں اونٹ بھی ہوں گے، کیوں کہ میں اونٹوں سے بہت محبت کرتا ہوں۔

پیغمبر اسلام تو جانتے تھے کہ وہاں پر ایسی ایسی نعمتیں ہوں گے کہ جنہیں دیکھ کر یہ اعرابی اپنے اونٹوں کو بُھول جائے گا، لہٰذا آپؐ نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے یوں جواب دیا:

"یا اعرابی ان ادخلك الله الجنّة اصبت فیها ما اشتهت نفسك ولذة عینك"

"اسے اعرابی! اگر خدا نے تجھے بہشت میں بھیج دیا تو تجھے وہاں پر وہ کچھ ملے گا جو تمھارا جی چاہے گا اور تمھاری آنکھیں جس سے لذت اُٹھائیں گی۔"[1]

دوسرے لفظوں میں وہاں پر ایسا عالم ہوگا کہ انسان اپنے آپ کو حقائق سے پوری طرح ہم آہنگ کرے گا اور بقول شاعر:

آنچہ بینی دلت ہمان خواہد / وآنچہ خواہد دلت ہمان بینی

"جو کچھ تمھاری آنکھیں دیکھیں گی تمھارا جی بھی وہی چاہے گا اور جو کچھ تمھارا جی چاہے گا، تمھاری آنکھیں بھی وہی کچھ دیکھیں گی۔"

بہر حال نعمت کی صحیح قیمت تب ہوتی ہے جب وہ پائیدار اور دائمی ہو۔ اس لیے چھٹی صفت میں اہل بہشت کو اس لحاظ سے بھی اطمینان خاطر دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم وہاں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہو گے۔ (وانتم فیها خالدون)۔

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۳۹۱۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ نعمتوں کے زوال کی فکر انھیں آخرو کے لیے پریشان کردے۔

یہاں پر اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہ بہشت کی یہ سب نعمتیں "قیمت" کے بدلے میں دی جاتی ہیں نہ کہ کسی بہانے کے ذریعے ارشاد فرمایا گیا ہے: یہ وہی بہشت ہے کہ جس کے تم اپنے انجام دیئے گئے اعمال کی وجہ سے وارث کردیئے گئے ہو۔(وتلک الجنة التی اورثتموها بما کنتم تعملون)۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو اعمال کے بدلے کی بات کی گئی ہے اور دوسری طرف "وراثت" کا ذکر کیا گیا ہے، جو عام طور پر ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں پر محنت اور بھاگ دوڑ اور تکلیف اٹھائے بغیر کوئی نعمت انسان کو حاصل ہوتی ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہاری نجات کا اصل سبب تو تمہارے اعمال ہی ہیں، لیکن جو کچھ تمھیں مل رہا ہے وہ تمہارے اعمال کے مقابلے میں اس قدر زیادہ ہے گویا وہ تمھیں بالکل مفت مل رہا ہے۔

بعض مفسرین اس تعبیر کو اس بات کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جیسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہر انسان کا ایک مقام بہشت میں ہوتا ہے اور دوسرا جہنم میں۔ چنانچہ بہشتی لوگ جہنمیوں کے وارث ہوں گے اور جہنمی اہل بہشت کے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

ساتویں اور آخری نعمت بہشتی پھلوں کی ہے جو اللہ کی سب سے اہم اور بہترین نعمت ہے ارشاد ہوتا ہے: بہشت میں تمہارے لیے بہت سے پھل ہیں جنہیں تم کھاؤ گے (لکم فیها فاکهة کثیرة منها تاکلون)۔

درحقیقت ظروف اور جام مختلف کھانوں اور مشروبات کے وجود کو بیان کر رہے تھے۔ لیکن پھلوں کی بات اپنی جگہ ہے۔ لہذا زیر تفسیر آیات کی آخری آیت میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ "منها" کے لفظ سے یہ حقیقت بیان کی جارہی ہے کہ بہشت کے پھل اس قدر زیادہ ہوں گے کہ تم ان میں سے صرف کچھ ہی کھاؤ گے اور اس طرح وہاں پر فنا و خاتمہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے درخت ہمیشہ پھل دار اور لدے ہوں گے۔

ایک حدیث میں ہے۔

"لا ینزع رجل فی الجنة ثمرة من ثمرها الا نبت مثلاها"۔

"کوئی بھی شخص بہشتی درختوں سے کوئی بھی پھل نہیں توڑے گا مگر یہ کہ اس کی جگہ دو پھل اور پیدا ہو جائیں گے"۔

یہ تھی جنت کی روح پرور نعمتوں کی ایک جھلک جو ان لوگوں کے انتظار میں ہے جن کا ایمان روشن اور اعمال صالح ہیں۔

۷۴۔ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝

۷۵۔ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝

۷۶۔ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ۝

۷۷۔ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ۝

۷۸۔ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝

۷۹۔ اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ۝

۸۰۔ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۴۔ مجرم جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔

۷۵۔ ان کے عذاب میں ہرگز کمی نہیں کی جائے گی اور وہ وہاں ہر چیز سے مایوس ہوں گے۔

۷۶۔ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ ظالم تھے۔

۷۷۔ اور وہ پکاریں گے: اے مالک! ہماری آرزو ہے کہ تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے (تاکہ ہم آسودہ خاطر ہو جائیں) وہ جواب دے گا تمھیں اسی حال میں رہنا ہے۔

۷۸۔ ہم تو تمھارے پاس حق لے کر آئے ہیں، لیکن تم میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہو۔

٧٩. بلکہ انھوں نے سازشوں پر کمر باندھلی ہے ہم نے بھی (انکے بارے میں) کچھ ٹھان لیا ہے۔

٨٠. وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے۔ جی ہاں ہمارے رسُول (اور فرشتے) ان کے پاس ہیں اور لکھتے جاتے ہیں۔

تفسیر

مرنے اور عذاب سے جان چھڑانے کی آرزو

ان آیات میں بروز قیامت مجرمین اور کفار کا انجام بتایا گیا ہے تاکہ پروردگار کے فرمانبردار مومنین کی تشویق اور انجام سے ان کا تقابل کیا جائے اور دونوں پہلو واضح ہو جائیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: مجرم جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔ (انّ المجرمین فی عذاب جهنم خالدون)۔

"مجرم" "جرم" کے مادہ سے ہے اور دراصل "کاٹنے" کے معنی میں آتا ہے جو بنیادی طور پر درخت سے پھل توڑنے اور خود درخت کاٹنے کے لیے استعمال ہوا لیکن بعد میں ہر قسم کے بُرے اعمال کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ بُرے اعمال انسان کو خدا اور انسانی اقدار سے جُدا کر دیتے ہیں۔

لیکن ایک بات مسلّم ہے کہ یہاں پر تمام مجرمین نہیں بلکہ ایسے مجرمین مراد ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے اس کی وجہ ایک تو خلود یعنی عذاب میں ہمیشہ رہنے کا قرینہ ہے اور دوسرا ان مومنین کے ساتھ مقابلے کا قرینہ ہے جن کا ذکر گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔ یہ جو مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد تمام مجرم ہیں، بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔

ہو سکتا ہے کوئی سوچے کہ شاید زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ "دائمی عذاب" کی شدت میں کمی واقع ہو جائے اور یہ عذاب آہستہ آہستہ گھٹتا جائے، لہٰذا بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ان کے عذاب میں ہرگز کمی نہیں کی جائے گی اور ان کے لیے کسی قسم کی نجات کا راستہ نہیں ہوگا اور وہ وہاں پر ہر چیز سے مایوس ہوں گے (لا یفتر عنهم وهم فیه مبلسون)۔

اس طرح سے ان کا عذاب ایک تو زمانے کے لحاظ سے دائمی ہوگا اور دوسرے شدت کے اعتبار سے، کیونکہ "مفردات" میں "راغب" کے بقول "فتور" کا معنی تیزی کے بعد سکون، سختی کے بعد نرمی اور طاقت کے بعد کمزوری ہے۔

"مبلس" "ابلاس" کے مادہ سے ہے جو دراصل اس غم کے معنی میں ہے جو سخت پریشانی کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتا ہے اور چونکہ اس قسم کا غم انسان کو خاموشی اور سکوت کی دعوت دیتا ہے لہٰذا "ابلاس" کا مادہ سکوت و خاموشی اور جواب نہ دے سکنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور چونکہ سخت مصائب میں انسان اپنی نجات سے مایوس ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ مادہ مایوس ہونے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور "ابلیس" کو بھی اس وجہ سے ابلیس کہتے ہیں کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہے۔

بہر حال ان دو آیات میں تین نکات پر زیادہ زور دیا گیا ہے، ایک تو عذاب کا دوام دوسرے عذاب میں کمی کا نہ ہونا اور تیسرے غم اور مطلقاً مایوسی۔ کس قدر دردناک ہے ایسا عذاب جس میں یہ تینوں چیزیں جمع ہوں۔

بعد کی آیت میں یہ نکتہ ذہن نشین کرایا جارہا ہے کہ خدا کا یہ دردناک عذاب ایک ایسی چیز ہے جسے ان لوگوں نے اپنے لیے خود ہی فراہم کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ لوگ خود ظالم تھے۔ (وما ظلمناهم ولكن كانوا هم الظالمين)۔

درحقیقت جس طرح سابقہ آیات میں ان بے انتہا نعمتوں کا سرچشمہ پرہیزگار مومنین کے اعمال کو بتایا گیا ہے یہاں پر بھی جا ودانی عذاب کا سرچشمہ خود ان ظالموں کے اعمال کو بتایا گیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ انسان خدا کی آیات کا انکار کر کے اپنی سعادت کی جڑوں پر کلہاڑا چلا دے سورہ صف آیت نمبر ۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

"ومن اظلم ممن افترى على الله الكذب"

"اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتے ہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھیں۔"

جی ہاں! قرآن مجید نے انسان کی سعادت اور شقاوت کا اصلی منبع خود انسان اور اس کے اعمال کو ہی بتایا ہے نہ کہ وہ خیالی مسائل جو بعض لوگوں نے اپنی طرف سے گھڑ لیے ہیں۔

پھر ان مجرمین کی ایک اور ناتوانی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ پکاریں گے اے مالکِ جہنم! ہماری آرزو ہے کہ تمہارا پروردگار ہمیں موت ہی دے دے (تاکہ ہم آسودہ خاطر ہو جائیں)۔ (ونادوا يا مالك ليقض علينا ربك)۔

حالانکہ ہر شخص موت سے بھاگتا اور زندگی کے دوام کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن بعض اوقات انسان پر مصائب کے اس قدر پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں کہ وہ خدا سے موت کی آرزو کرنے لگتا ہے ایسا اتفاق دنیا میں خال خال لوگوں کے لیے پیش آتا ہے، لیکن وہاں پر مجرمین کے لیے یہ آرزو عمومی حیثیت کی حامل ہوگی اور تمام مجرم موت کی تمنا کریں گے۔

لیکن یہ آرزو بے فائدہ ہوگی، کیونکہ داروغہ جہنم انھیں جواب دے گا: "تمہیں اسی حال میں رہنا ہوگا اور موت کے ذریعے تمہیں نجات نہیں مل سکتی"۔ (قال انكم ماكثون)۔[1]

پھر عجیب بات یہ ہے کہ بعض مورخین کے بقول داروغہ جہنم انھیں بڑی بے پرواہی کے ساتھ ایک ہزار سال بعد یہ جواب دیگا اور یہ بے اعتنائی کس قدر دردناک ہوگی۔[2]

---

[1] "ماکثون" "مکث" کے مادہ سے ہے جس کا معنی کسی چیز کے انتظار میں ٹھہرنا ہوتا ہے۔ شاید مالک دوزخ کی طرف سے یہ تعبیر ان کا ایک قسم کا مذاق اڑانا ہو۔ جیسے اگر کوئی غیر مستحق شخص کسی چیز کا تقاضا کرتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے، انتظار کرو۔

[2] تفسیر "مجمع البیان" اپنی آیات کے ذیل میں، البتہ بعض مفسرین نے سالوں کے اس فاصلے کا عدد ۸۰ سال بتایا ہے اور بعض نے ۴۰، لیکن سالوں کی تعداد خواہ کچھ ہو، بے اعتنائی کی دلیل مزید ہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے اور انھیں پورا یقین ہوگا کہ وہاں پر موت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر ان کی یہ کیسی درخواست ہوگی؟ لیکن اس بات کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیئے کہ جب ایک ناتواں شخص ہر جگہ سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس کی طرف سے اس قسم کی درخواستیں فطری بات ہوتی ہیں۔

جی ہاں! جب وہ نجات کی تمام راہیں اپنے لیے مسدود دیکھیں گے تو دل سے اس قسم کی چیخ دپکار کریں گے۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ خود براہِ راست خدا سے یہ درخواست کیوں نہیں کریں گے، بلکہ داروغہ جہنم سے التماس کریں گے کہ وہ اپنے خدا سے ان کی موت مانگے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اس دن خدا سے محجوب (چھپے ہوئے) ہوں گے۔ جیسا کہ سورۂ مطففین کی پندرھویں آیت میں ہے:

"کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون"

لہٰذا وہ فرشتۂ عذاب کے ذریعے درخواست کریں گے، یا پھر اس لیے کہ داروغہ جہنم فرشتہ ہوگا اور فرشتے خدا کے مقرب ہوتے ہیں۔

بعد کی آیت میں جو درحقیقت ان کے آتشِ جہنم میں دائمی عذاب کی وجہ بیان کر رہی ہے، فرمایا گیا ہے: ہم تو تمھارے پاس حق لے کر آئے ہیں لیکن تم میں سے بہت سے لوگ حق کو ناپسند کرتے ہیں اور اسے نہیں مانتے۔ (لقد جئناکم بالحق ولٰکن اکثرکم للحق کارھون)۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ بات داروغہ جہنم کی ہے اور "نا" سے مراد فرشتوں کی جماعت ہے اور مالکِ دوزخ بھی اس جماعت میں ہے یا خدا کی طرف سے ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے دو نظریئے ہیں۔

البتہ کلام کا سیاق اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ مالکِ دوزخ کی بات ہو۔ لیکن آیت کا مضمون یہ بتاتا ہے کہ کلامِ خدا ہے کیونکہ اسی سے مناسبت رکھتا ہے، جیسا کہ سورۂ زمر کی آیت ۷۱ اسی بات کی شاہد ہے:

"وقال لھم خزنتھا الم یأتکم رسل منکم یتلون علیکم اٰیات ربکم"

"جہنم کے خازنین انھیں کہیں گے، کیا تمھارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے جو تمھارے سامنے تمھارے رب کی آیات کی تلاوت کرتے تھے؟"

یہاں پر خازنین جہنم نے رسولوں کو حق لانے والا بتایا ہے نہ کہ خود کو۔

"حق" کا وسیع معنی ہے جو تمام تقدیر ساز حقائق پر محیط ہے اگرچہ توحید، معاد اور قرآن کا مسئلہ ان میں سرفہرست ہے۔

یہ تعبیر درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم صرف انبیاء کرامؑ ہی کے مخالف نہیں تھے، بلکہ سرے سے حق کے مخالف تھے اور یہی مخالفت تمھارے لیے دائمی عذاب کا تحفہ لے کر آئی ہے۔

بعد کی آیت میں ان کی حق سے بیزاری اور باطل کی طرفداری کے ایک گوشے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: بلکہ انھوں نے سازشوں پر کمر باندھ لی ہے، ہم نے بھی ان کے بارے میں کچھ ٹھان لیا ہے (ام ابرموا امرًا فانا مبرمون)۔[1]

---

[1] مذکورہ بالا آیت میں "ام" منقطعہ ہے اور "بل" کے معنی میں ہے اور "ابرام" کا معنی بل دینا اور پختہ کرنا ہے۔

انھوں نے نورِ اسلام کو بجھانے، پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے قتل اور ہر ممکنہ کوشش سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی سازش تیار کی ہے۔

اور ہم نے بھی یہ ٹھان لیا ہے کہ انھیں اس جہاں اور اُس جہاں، دونوں میں سخت سزا دیں گے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی شانِ نزول، ہجرت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی سازش سے متعلق بتائی ہے کہ جس کی طرف سُورہ انفال کی آیت ۳۰ میں ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے:

"واذ یمکر بک الذین کفروا ....." [1]

لیکن ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ امر ایک طرح کی مطابقت ہے نہ کہ اس کی شان نزول۔

بعد کی آیت درحقیقت ان کی سازشوں کے اسباب میں سے ایک سبب بیان کر رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے، بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور سرگوشیوں کو نہیں سنتے۔ (ام یحسبون انا لا نسمع سرھم ونجواھم)۔

لیکن ایسی بات نہیں ہے، ہم خود بھی ان کی باتوں کو سنتے ہیں اور" ہمارے رسُول اور فرشتے ان کے پاس موجُود ہیں اور ہمیشہ ان کی ظاہر اور پوشیدہ باتوں کو لکھتے جاتے ہیں" (بلیٰ ورسلنا لدیھم یکتبون)۔

"سر" وہ بات ہوتی ہے جسے انسان اپنے دل میں چھپائے رہتا ہے یا پھر اپنے رازدار دوستوں سے کہتا ہے اور" نجویٰ" سرگوشی کو کہتے ہیں۔

جی ہاں! خدا صرف ان کی پوشیدہ باتوں ہی کو نہیں جانتا جو چھپ چھپا کر اور سرگوشی کی صُورت میں کرتے ہیں بلکہ حدیث نفس اور ان کے دل کے ساتھ ہونے والی باتوں سے بھی آگاہ ہے کیونکہ اس کے نزدیک مخفی اور آشکار میں کوئی فرق نہیں۔ جو فرشتے انسان کے اعمال اور گفتار لکھنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں وہ بھی ہمیشہ ان باتوں کو ان کے نامۂ اعمال میں لکھتے رہتے ہیں۔ اگرچہ اس کے بغیر بھی حقائق روشن ہیں، لیکن یہ اس لیے ہے تاکہ وہ دُنیا و آخرت میں اپنے اعمال گفتار اور سازشوں کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

---

[1] تفسیر فخر رازی اسی آیت کے ذیل میں۔

۸۱۔ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ○

۸۲۔ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○

۸۳۔ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ○

۸۴۔ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ○

۸۵۔ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

ترجمہ

۸۱۔ کہہ دے کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتا تو سب سے پہلے میں اس کا اطاعت گزار ہوتا۔

۸۲۔ منزہ ہے آسمانوں اور زمین کا پروردگار، عرش کا پروردگار اس سے کہ جو یہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔

۸۳۔ تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے تاکہ وہ باطل میں غوطے کھاتے رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں۔ یہاں تک کہ جس دن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے ان کے سامنے آموجود ہو (اور وہ اپنے کیے کو پالیں)۔

۸۴۔ وہ تو وہی ہے جو آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہ حکیم و

علیم ہے۔

۸۵۔ بہت بابرکت اور ناقابلِ زوال ہے وہ جو آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک اور حاکم ہے اور قیامِ قیامت کی خبر بھی اسی کو ہے اور تم لوگ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تفسیر

انہیں باطل میں غوطے کھانے دو

گذشتہ آیات، خصوصاً سورت کی ابتداء میں خدا کے لیے اولاد کے بارے میں مشرکین کی گفتگو اور ان کے عقاید کا تذکرہ تھا کہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ نیز چند آیات قبل حضرت عیسیٰؑ اور ان کی خالص توحید اور پروردگار کی عبادت کی طرف دعوت کا تذکرہ بھی تھا، لہٰذا ان آیات میں باطل عقائد کی نفی کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ خدا فرماتا ہے:

جو لوگ خدا کے لیے اولاد ہونے کا دم بھرتے ہیں، ان سے کہہ دے کہ اگر رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں اس کا سب سے پہلا احترام کرنے والا اور اطاعت گزار ہوتا۔ (قل ان کان للرحمٰن ولد فانا اول العابدین)۔

کیونکہ خدا پر ایمان اور اعتقاد بھی مجھے تم سے زیادہ ہے اور اس کی آگاہی اور معرفت بھی زیادہ ہے اور اس کی اولاد کا احترام بھی میں تم سے پہلے کرتا اور اس کی اطاعت بھی۔

اگرچہ اس آیت کا مضمون کچھ مفسرین کی نظر میں پیچیدہ ہے اور انہوں نے اس کی مختلف توجیہیں کی ہے کہ جن میں سے بعض توجیہات تو عجیب معلوم ہوتی ہیں۔[1]

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس مضمون میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسا دل کش اندازِ گفتگو ہے جو ہٹ دھرم

---

[1] مثلاً بعض مفسرین نے "اِنْ" کو نفی کے معنی میں اور "انا اول العابدین" کو خدا کا سب سے پہلا عبادت کرنے والا، کے معنی میں لیا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کا معنی یوں ہوگا: "خدا کی کوئی اولاد نہیں اور میں سب سے پہلا عبادت کرنے والا ہوں"، جب کہ کئی اور مفسرین نے "عابدین" کو "عبادت سے انکار کرنے والا" کے معنی میں لیا ہے، تو اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا: اگر خدا کی کوئی اولاد ہوتی تو میں ایسے خدا کی ہرگز عبادت نہ کرتا، کیونکہ صاحب اولاد کبھی خدا نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تفسیریں کسی بھی صورت میں آیت کے ظاہر سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

اور جھگڑالو لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص غلط فہمی کی بنا پر ایسے شخص کے بارے میں یہ کہے کہ وہ "اعلم" ہے جو "اعلم" نہ ہو تو ہم اسے کہیں گے : اگر وہ اعلم ہوتا تو سب سے پہلے ہم اس کی اقتدا کرتے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے دعویٰ کے استدلال کے بارے میں غور و فکر سے کام لے اور جب اسے سمجھ آجائے تو خواب غفلت سے بیدار ہو جائے۔

غرض : یہاں پر دو نکتوں کی طرف توجہ ضروری ہے۔

پہلا یہ کہ لفظ عبادت ہر جگہ پرستش کے معنی میں نہیں ہوتا، بلکہ کبھی اطاعت، تعظیم اور احترام کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں پر بھی اسی معنی میں ہے۔ کیونکہ بفرض محال اگر خدا کی اولاد ہوتی تو بھی اس کی عبادت کے لیے کوئی دلیل موجود نہ تھی اور چونکہ اسی فرض محال کی بنا پر خدا کی اولاد ہے، لہٰذا اس کی اطاعت اور احترام کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرا یہ کہ عربی ادب کی رُو سے عام طور پر "لو" "ان" کے معنی میں آتا ہے جو محال ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اگر اس آیت میں ایسا نہیں کہا گیا تو اس کی وجہ صرف فریق مخالف سے اندازِ گفتگو میں ہم آہنگی اور رواداری کا مظاہرہ کرنا ہے۔

اس طرح سے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں مطمئن کرنے کے لیے کہا کہ خدا کے لیے اولاد کا تصور نہیں کیا جاسکتا اگر اس کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کا احترام کرتا۔

اس گفتگو کے بعد ان بے بنیاد دعووں کی نفی کے لیے ایک اور روشن دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : یہ لوگ جو کچھ بیان کرتے ہیں تمام آسمانوں اور زمین کا مالک ، عرش کا مالک اس سے پاک و پاکیزہ ہے (سبحان رب السماوات والارض رب العرش عما یصفون)۔

جو ذات آسمانوں اور زمین کی مالک مدبر ہے اور عرش عظیم کی پروردگار ہے، اسے اولاد کی کیا ضرورت ہے، وہ غیر متناہی اور تمام کائنات پر حاوی ہے اور تمام مخلوقات کی مربی ہے۔ اولاد کی تو اسے ضرورت ہوتی ہے، جسے مرجانا ہو لہٰذا اولاد کے ذریعے وہ اپنی نسل کو باقی رکھنا چاہے۔

اولاد کی تو اسے ضرورت ہوتی ہے، جسے کمزوری اور تنہائی کے موقع پر تعاون اور محبت کی ضرورت ہو۔

غرض اولاد کا وجود جسم ہونے اور زمان و مکان میں محدود ہو جانے کی دلیل ہوتا ہے۔

عرش، آسمان اور زمین کے پروردگار کو جو ان سب سے بے نیاز ہے ، اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔

"رب السماوات والارض" کے بعد "رب العرش" کا ذکر درحقیقت "عام کے بعد خاص کا ذکر ہے، کیونکہ جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں "عرش" کا اطلاق تمام کائنات پر ہوتا ہے جو کہ خالق اکبر کا تخت حکومت ہے۔

ایک یہ احتمال بھی ہے کہ "عرش" کے لفظ سے مالعبد الطبیعۃ کائنات کی طرف اشارہ ہو جو کہ "سماوات وارض" کے مقابل میں ہے جس سے مادی کائنات کی طرف اشارہ ہے۔

(عرش کے معنی کی مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد اوّل سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵ نیز تفسیر نمونہ جلد اوّل سورۂ بقرہ آیت نمبر کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں)۔

پھر ان ہٹ دھرم لوگوں سے بے نیازی ، بے اعتنائی اور تہدید کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور یہ بذاتِ خود اس قماش کے لوگوں کے

ساتھ بحث کا ایک طریقہ ہے۔ ان کے بارے میں رسُولِ اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے: اب جب صورتِ حال یہی ہے۔ تو انھیں تو اُن کے حال پر چھوڑ دے تاکہ وہ باطل میں غوطے کھاتے رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں یہاں تک کہ جس دن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے ان کے سامنے آموجود ہو اور وہ اپنے تلخ اعمال اور بُرے اور شرمناک افکار کا ثمرہ چکھ لیں۔ (فذرھم یخوضوا ویلعبوا حتی یلاقوا یومھم الذی یوعدون)۔

ظاہر ہے کہ اس روز سے مُراد وہی قیامت کا موعود دن ہے۔ بعض مفسرین نے جو یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مُراد موت کا لمحہ ہے، بہت بعید معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اعمال کی سزا و جزا قیامت کے دن ملے گی نہ کہ موت کے وقت۔

یہ وہی یوم موعود ہے جس کے متعلق سُورہ بُروج کی آیت ۲ میں قسم کھائی گئی ہے کہ "والیوم الموعود" روز موعود (قیامت کے دن) کی قسم۔

بعد کی آیت میں مسئلہ توحید کے بارے میں سلسلہ گفتگو کو جاری رکھا گیا ہے جو ایک لحاظ سے تو ما قبل کی آیات کا نتیجہ ہے اور دوسرے لحاظ سے ان کی تکمیل اور استحکام کی دلیل ہے اور اس میں خداوند کریم کی سات صفات کو بیان کیا گیا ہے جو سب کی سب نظریہ توحید کی بنیادوں کے استحکام کے لیے مؤثر ہیں۔

پہلے تو ان مشرکین کے عقائد کی نفی کی جاتی ہے جو بزعم خود آسمان اور زمین کے لیے علیحدہ علیحدہ خداؤں کے قائل تھے، بلکہ دریا صحرا، جنگ، صلح حتیٰ کہ مختلف انواع کے لیے علیحدہ اور جداگانہ خداؤں کے قائل تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ تو وہی ہے جو آسمانوں میں بھی معبُود ہے اور زمین میں بھی۔ (وھو الذی فی السماء الٰہ وفی الارض الٰہ)۔

کیونکہ گزشتہ آیات میں مذکور اس کی آسمانوں اور زمین میں ربوبیت کو قبول کر لینے سے الوہیت کا مسئلہ بھی ثابت ہو جائے گا کیونکہ صحیح معنوں میں معبُود وہی ہے جو کائنات کا رب، مدبر اور مربی ہے۔

نہ تو اربابِ انواع اور فرشتے عبادت کے لائق ہیں اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بُت! کیونکہ ان میں سے کوئی بھی مقام ربوبیت کا حامل نہیں ہے، بلکہ اپنے اپنے مقام پر مخلوق، مربوب اور اس کے خوان نعمت کے نمک خوار ہیں اور اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

پھر دوسری اور تیسری صفت کو بیان کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: اور وہی حکیم و علیم ہے (وھو الحکیم العلیم)۔
اس کے تمام کام حساب و کتاب اور حکمت پر مبنی ہیں اور وہ ہر چیز سے آگاہ اور باخبر ہے۔

اس طرح سے بندوں کے اعمال سے بخوبی واقف ہے اور اپنی حکمت کے مطابق انھیں جزا یا سزا دیتا ہے۔

چوتھی اور پانچویں صفت میں اس کے وجُود کی بے پناہ اور دائمی برکات اور آسمان و زمین میں اس کی مالکیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہُوئے قرآن کہتا ہے: بہت ہی بابرکت اور ناقابلِ زوال ہے وہ جو آسمانوں، زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے: (وتبارک الذی لہ ملک السماوات والارض وما بینھما)۔

"تبارک" "برکت" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے "عظیم اور بہت بڑی اچھائی کا مالک ہونا" یا "ثبات و بقا کا مالک ہونا" یا "اچھائی اور ثبات و بقا ہر دو کا مالک ہونا" اور خداوندِ عالم کے بارے میں دونوں باتیں صادق آتی ہیں کیونکہ ایک تو اس کا وجود جاودانی اور برقرار ہے اور دوسرے عظیم اور بہت بڑی اچھائی کا منبع ہے۔

بلکہ اصولی طور پر عظیم خیر وخوبی کا تصور بغیر ثبات و برقراری کے ناممکن ہوتا ہے، کیونکہ اچھائیاں اور خوبیاں خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں لیکن عارضی ہیں، لہٰذا ناپائیدار کے لیے فراوانی اور عظمت بے معنی ہے۔

آخر میں چھٹی اور ساتویں صفت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: "اور قیام قیامت کی خبر بھی صرف اسی کو ہے اور تم سب لوگ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے" (وعندہٗ علم الساعۃ والیہ ترجعون)۔

اسی لیے اگر تمہیں خیر و برکت کی ضرورت ہے تو اسی سے طلب کرو نہ کہ بتوں سے اور قیامت کے دن تمہارا مقدر اسی سے وابستہ ہے اور اس دن تمہاری بازگشت اسی کی طرف ہے۔ اور بُت ہوں یا دوسرے معبود ان کا اس بارے میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **سماوات وارض کا تین مرتبہ ذکر:** یہ الفاظ ایک بار تو پروردگار کی ربوبیت اور اس کے تمام امور میں تصرف اور تدبر کے عنوان سے ایک مرتبہ پروردگار کی الوہیت کے بیان کے طور پر اور ایک مرتبہ اس کی حاکمیت اور مالکیت کو بیان کرنے کے لیے زیر بحث آیات میں آئے ہیں اور یہ تینوں آپس میں مربوط ہیں اور درحقیقت ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔ وہ "مالک" ہے اور اسی وجہ سے رب ہے اور نتیجہ کے طور پر "اللہ" ہے، اور "حکیم" "علیم" کے ساتھ اس کی توصیف بھی ان معانی کا تتمہ ہے۔

۲۔ **زندیقین کا غلط استنباط:** بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض زندیق اور مشرکین نے مندرجہ بالا آیت "وھو الذی فی السماء الٰہ وفی الارض الٰہ" کو اپنے عقیدہ کے ثبوت کے لیے ایک دستاویز بنا لیا اور اپنے غلط وہم کی وجہ سے اس کی یہ تفسیر کی کہ آسمان میں ایک معبود ہے اور زمین میں کوئی دوسرا معبود ہے، حالانکہ خود آیت اس کے برعکس کہتی ہے اور وہ یہ کہ وہ آسمانوں میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی یعنی ہر جگہ معبود صرف وہ ہے۔

چنانچہ جب اس بات کو سوال کے طور پر ائمہ معصومین علیہم السلام کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کا "نقضی جواب" بھی دیا اور "حلی جواب" بھی۔

جب کہ کتاب کافی میں "ہشام بن حکم" سے منقول ہے کہ "ابو شاکر دیصانی"[1] نے مجھے کہا کہ قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو ہماری بات کہتی ہے۔ میں نے کہا: وہ کیا؟

تو اس نے یہ آیت پڑھی: "وھو الذی فی السماء الٰہ وفی الارض الٰہ" مجھ سے اس کا جواب نہ بن پڑا۔

میں اس سال خانۂ خدا کی زیارت سے مشرف ہوا اور امام جعفر صادقؑ کے پاس جا کر حاضری دی اور تمام ماجرا ان کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے فرمایا: "یہ کسی خبیث ملحد کی بات ہے، جب تم واپس جاؤ تو اس سے پوچھو کہ کوفہ میں تمہارا کیا نام ہے تو وہ کہے گا کہ فلاں، پھر پوچھو کہ بصرہ میں تمہیں کس نام سے پکارتے ہیں تو وہ کہے گا کہ فلاں سے، تو تم کہنا کہ ہمارا پروردگار بھی اسی طرح ہے، آسمانوں میں "اللہ"

---

[1] ابو شاکر دیصانی "فرقہ" دیصانیہ" کے علماء میں سے ایک تھا جو "ثنویت" (دوگانہ پرستی) کا عقیدہ رکھتے تھے اور نور اور ظلمت کے خداؤں کے قائل تھے۔

(ملاحظہ ہو لغت نامہ "دھخدا" مادہ "دیصان")

اور معبود وہی ہے اور زمین میں بھی اِلٰہ اور معبود وہی ہے، اسی طرح دریاؤں اور صحراؤں غرض ہر جگہ وہی اِلٰہ اور معبود ہے۔

ہشام کہتے ہیں کہ جب میں واپس آیا تو "ابوشاکر" کے پاس جاکر اس کا جواب دیا، ابوشاکر نے کہا: یہ تمھارا جواب نہیں ہو سکتا بلکہ اسے تم حجاز سے لائے ہو۔[1]

عظیم مفسر "طبرسی" نے زیرِ تفسیر آیت میں لفظ "اِلٰہ" کے تکرار کی دو علتیں بیان کی ہیں ایک تو ہر جگہ پروردگار کی الوہیت کی تاکید اور دوسری یہ کہ آسمان کے فرشتے بھی اس کی عبادت کرتے ہیں اور زمین کے انسان بھی اس کی پرستش کرتے ہیں۔ بنابریں وہ فرشتوں، انسانوں اور زمین و آسمان میں موجود تمام موجودات کا معبود ہے۔

---

[1] اصول کافی جلد اول کتاب "التوحید" باب "الحرکۃ والانتقال" حدیث ۱۔

۸۶۔ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○

۸۷۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ○

۸۸۔ وَقِيلِهِ يَا رَبِّ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ ○

۸۹۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ○

ترجمہ

۸۶۔ اس کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، ہاں مگر وہ لوگ کہ جو حق کی شہادت دیتے ہیں اور خوب آگاہ ہیں۔

۸۷۔ اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً وہ کہیں گے خدا نے تو پھر وہ خدا کی عبادت سے کیوں کر روگردانی کرتے ہیں۔

۸۸۔ وہ لوگ پیغمبر کی اس شکایت سے کیسے غافل ہیں کہ وہ کہے گا پروردگارا! یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔

۸۹۔ (اب جبکہ یہ عالم ہے)، تو تُو ان سے مُنہ پھیر لے اور کہہ دے کہ تم کو سلام، لیکن وہ بہت جلد جان لیں گے۔

تفسیر

شفاعت کون کرسکتا ہے؟

ان آیات میں جو سُورۂ زخرف کی آخری آیتیں ہیں، حسبِ سابق مشرکین کے تلخ انجام اور کئی دلائل کے ذریعے ان کے عقیدے کے باطل ہونے کو واضح کیا گیا ہے، سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اگر وہ شفاعت کے گمان میں ایسے معبودوں کی عبادت کرتے ہیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیئے: "خدا کے سوا جن لوگوں کی یہ عبادت کرتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے" (ولا یملك الذین یدعون من دونه الشفاعة)۔

خدا کی بارگاہ میں "شفاعت" کا حق اسی کے اذن و فرمان کے مطابق ہوگا اور حکمت والے خدا نے ان بے قدر و قیمت اور عقل و شعور سے عاری پتھروں اور لکڑیوں کو ہرگز یہ اذن و فرمان نہیں دیا۔

لیکن چونکہ ان کے معبودوں میں فرشتے اور ان جیسی دوسری مخلوق بھی ہے، لہٰذا اسی آیت کے ضمن ہی میں ان کو مستثنیٰ کرتے ہُوئے فرمایا: "مگر وہ کہ جنہوں نے حق کی شہادت دی" (الّا من شهد بالحق)۔

وہی جنہوں نے تمام مراحل میں خدا کی توحید اور یگانگت کو دل و جان سے قبول کیا اور حق کے آگے پوری طرح جھک گئے، یقیناً ایسے لوگ بحکم پروردگار شفاعت کے مالک ہوں گے۔

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ہر شخص کے لیے شفاعت کریں گے خواہ وہ بُت پرست، مُشرک اور آئینِ توحید سے منحرف ہی کیوں نہ ہوں! بلکہ "وہ اچھی طرح جانتے ہیں، کہ کن لوگوں کے حق میں شفاعت کرسکتے ہیں۔ (وھم یعلمون)۔

تو اس طرح سے ان (مشرکین) کی فرشتوں سے شفاعت کی امید کو دو دلیلوں کے ساتھ قطع کرتا ہے: ایک تو یہ کہ خود فرشتے توحید کی شہادت دیتے ہیں اسی لیے انھیں شفاعت کی اجازت ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کن لوگوں کے حق میں شفاعت کرنی ہے۔[1]

بعض مفسرین نے "وھم یعلمون" کے جُملہ کو "الّا من شهد بالحق" کا تتمہ سمجھا ہے، جس کے مطابق جملے کا مفہوم یُوں ہوگا کہ: صرف وہی لوگ شفاعت کا حق رکھتے ہیں جو توحید کی شہادت دیتے ہیں اور اس کی حقیقت سے آگاہ ہیں۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "الّا من شهد بالحق" میں "استثنائے متصل" ہے، لیکن اگر "الذین یدعون من دونه الشفاعة" سے مراد خاص کر بُت ہوں تو پھر "استثنائے منقطع" ہوگا، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے خاص کر "الذین" کو پیش نظر رکھتے ہُوئے، کیونکہ وہ عقلندوں کے لیے یا عاقل اور غیر عاقل دونوں کے لیے غلبہ کی صُورت میں استعمال ہوتا ہے۔

بہر حال یہ آیت اللہ کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والوں کی اہم شرط کو بیان کر رہی ہے، کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو حق کی گواہی دیتے ہیں، تمام مرحلوں پر حق کو پہچانتے ہیں، توحید کی رُوح سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان شرائط سے بھی باخبر ہیں جو شفاعت کیے جانے والے لوگوں میں پائی جانی چاہئیں۔

پھر خود مشرکین کے اپنے عقائد کو سامنے رکھتے ہُوئے انہیں دندان شکن جواب دیتا ہے، ارشاد فرماتا ہے: "اگر تم ان سے پوچھو گے کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے، تو یقیناً وہ کہیں گے کہ خدا نے" (ولئن سألتهم من خلقهم ليقولن الله)۔

ہم کئی مرتبہ بتا چکے ہیں کہ عرب اور غیر عرب مشرکین میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جو بتوں کو خالق اور پیدا کرنے والا مانتے ہوں بلکہ وہ یا تو انھیں خدا کی بارگاہ میں شفاعت کا ایک ذریعہ جانتے تھے اور یا اولیاء اللہ کے مقدس وجود کی علامت اور نمونہ سمجھتے تھے لیکن ساتھ ہی ان کا یہ بہانہ بھی تھا کہ ہمارے معبود کو ایک محسوس چیز ہونا چاہیئے تاکہ ہم اس سے مانوس ہو سکیں۔ اسی لیے وہ ان کی عبادت کیا کرتے تھے۔ لہٰذا جب ان سے خالق کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو فوراً کہہ دیتے تھے کہ "اللہ"۔

قرآن نے بارہا اس حقیقت کی یاد دہانی کرائی ہے کہ عبادت صرف اور صرف کائنات کے خالق اور مدبر کے شایان شان ہے۔ لہٰذا اگر تم اسی کو خالق اور مدبر سمجھتے ہو تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہ جاتا کہ اسے "معبودیت" اور الوہیت سے مخصوص بھی سمجھو۔

اسی لیے آیت کے اختتام پر انھیں سرزنش کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر صورتِ حال یہی ہے تو "پھر وہ خدا کی عبادت سے مُنہ مُوڑ کر اس کے غیر کی طرف کیوں رُخ کرتے ہیں" (فأنّٰی یؤفکون)۔

بعد کی آیت میں رسُولِ پاک کی بارگاہ ایزدی میں اس ہٹ دھرم اور بے منطق قوم کی شکایت کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وہ لوگ پیغمبر کی اس شکایت سے کیونکر غافل ہیں کہ وہ کہیں گے: پروردگارا! یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ (وقیلہ یا رب انّ ھٰؤلاء قوم لا یؤمنون)۔

پیغمبرؐ کہیں گے کہ مَیں نے انہیں شب و روز تبلیغ کی، انھیں بہشت کی خوش خبری دی اور جہنم کے عذاب سے ڈرایا، گزشتہ اقوام کے انجام سے انہیں مطلع کیا، تیرے عذاب سے انھیں ڈرایا اور گمراہی سے بچنے کی صُورت میں انھیں تیری رحمت کی ترغیب دلائی، غرض اپنی بساط کے مطابق انہیں سب کچھ بتایا اور جو کہنے کی باتیں تھیں، ان سے کہیں، لیکن پھر بھی میری ان گرم باتوں نے ان کے سرد دلوں پر کوئی اثر نہ کیا اور وہ ایمان نہیں لائے، اس حقیقت سے تو بھی واقف ہے اور وہ بھی۔[1]

---

[1] "وقیلہ" کا عطف کس پر ہے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ کچھ اسے تین آیات قبل موجود لفظ "الساعۃ" پر عطف سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں اس جملے کا مفہوم یُوں ہوگا: خدا قیامت سے بھی باخبر ہے اور کفار کے بارے میں پیغمبر کی شکایت سے بھی۔ کچھ اسے "علم الساعۃ" پر معطوف سمجھتے ہیں۔ (البتہ اس شرط کے ساتھ کہ "قیلہ" سے پہلے "علم" محذوف ہے)، تو ایسی صُورت میں معنی کے لحاظ سے اس کا پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ فرق نہیں ہے جبکہ بعض مفسرین نے واؤ کو قسم کے معنی سمجھا ہے۔ اس قسم کے اور بھی کئی احتمالات ہیں جن کو بیان کرنے سے بات لمبی ہو جائے گی۔ البتہ ایک اور قابل ذکر احتمال بھی ملتا ہے جو شاید سب سے بہتر ہے اور وہ یہ کہ اس کا عطف "انّٰی یؤفکون" پر ہے اور تقدیری طور پر یوں ہوگا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اسی سلسلے کی آخری آیت میں خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ کو حکم دے رہا ہے: اب جبکہ صورتِ حال یہ ہے تو تو ان سے مُنہ پھیر لے۔ (فاصفح عنهم)۔

لیکن یہ رُوبھٹنے اور جُدا ہونے کی صُورت یوں نہ ہو کہ جس میں سختی اور ترشی پائی جاتی ہو، بلکہ اُن سے کہہ دے: "تم پر سلام"۔ (وقل سلام)۔

دوستی اور تحیہ کے عنوان سے نہیں بلکہ جدائی اور علیحدگی کے طور پر سلام ہو۔ اور یہ سلام درحقیقت اس سلام کے مشابہ ہے جو سُورۂ فرقان کی آیت ۶۳ میں بیان ہوا ہے۔

" واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما "

جب جاہل لوگ ان کو بُرے لفظوں کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں تو وہ جواب میں "سلام" کہہ دیتے ہیں۔

ایسا سلام جو بے اعتنائی اور بزرگواری کی علامت ہوتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود انھیں ایک معنی خیز جملے کے ساتھ دھمکی بھی دی جاتی ہے تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ جدائی اور علیحدگی اس بات کی دلیل ہے کہ اب خدا کا ان سے کوئی سروکار ہی نہیں رہا، ارشاد ہوتا ہے: لیکن وہ بہت جلد جان لیں گے۔ (فسوف یعلمون)۔

جی ہاں انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے اپنی ہٹ دھرمیوں اور ضد کی وجہ سے کیسی آگ اور کس قدر دردناک عذاب فراہم کر لیا ہے؟

بعض مفسرین نے " ولا یملك الذین یدعون ...... کی شانِ نزُول ذکر کی ہے اور وہ یہ کہ "نضر بن حارث" اور قریش کے چند دیگر لوگوں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کچھ کہتا ہے اگر وہ حق ہے تو ہمیں اس کی شفاعت کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہماری فرشتوں سے دوستی ہے اور ہم انھیں اپنا ولی سمجھتے ہیں اور وہی شفاعت کرنے کے بھی زیادہ سزاوار ہیں۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی (جس میں انھیں خبردار کیا گیا ہے کہ بروز قیامت ملائکہ کسی کی شفاعت نہیں کریں گے۔ اگر کریں گے بھی تو ان لوگوں کی جو حق کی گواہی دیتے ہیں۔ یعنی مؤمنین کی)[1][2]

یہاں پر سُورۂ زخرف ختم ہو جاتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص کا)

" انی یؤفکون من عبادة وعن قیله یارب ان هؤلاء قوم لا یؤمنون "

" خدا کی عبادت سے کیوں انحراف کرتے ہیں اور اس بے ایمان قوم سے پیغمبرؐ کی شکایت کو کیونکر نظر انداز کر سکتے ہیں"؟

[1] اس تفسیر کے مطابق " الا من شهد بالحق " کا جملہ شفاعت کئے جانے والوں کی صفت ہے نہ کہ شفاعت کرنے والوں کی۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۵۹۴۲

پروردگارا! ہمارا رابطہ اپنے ساتھ اور اپنے اولیاء کے ساتھ روز بروز زیادہ سے زیادہ مستحکم فرما تاکہ ان کی شفاعت ہمارے شامل حال ہوسکے۔

خداوندا! ہمیں ہر قسم کے جلی اور خفی شرک سے محفوظ فرما اور اس سے دُور رکھ۔

بارِ الٰہا! قیامت کے دن کے جو اوصاف تونے اپنی آسمانی کتابوں میں بیان فرمائے ہیں، اُن کے مطابق وہ دن بہت سخت اور طاقت فرسا ہوگا۔ اُس دن تو ہمارے ساتھ اپنے فضل وکرم کا مظاہرہ فرمانہ کہ اپنے عدل کا۔ آمین!

آمین یارب العالمین!

تفسیر سورۂ زخرف کا اختتام

۲۰ رجب ۱۴۰۵ھ

۱۳۶۴/۱/۵

ادارہ امامیہ قرآت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۱)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان الفاضل)
مہتمم/منیجر
امامیہ قرآت کالج
اندرون موچی دروازہ ۔ لاہور

اشاریہ

تفسیر نمونہ ــــــــــ جلد ۱۱

ترتیب و تزئین ـ ـ ـ ـ ـ ـ سیّد شکیل حسین موسوی

ـ ـ ـ ـ ـ ـ سیّد محمّد حسین زیدی الباھروی

مضامین :

اُصول و عقائد

اسمائے باری تعالیٰ

توحید

عدل

نبوّت

امامت

قیامت

برزخ

جنّت

جہنّم

معجزہ

احکام

نماز

روزہ

زکوٰۃ

انفاق

حج

عبادت

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

اخلاقِ رذیلہ

اقوامِ سابقہ

قومِ ثمود

قومِ سباء

قومِ عاد

قومِ فرعون و قارون

قومِ نوحؑ

شخصیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ابنِ ابی العوجاء

ابوجہل

ابوذرؓ

ابوسعید خدریؓ

ابوشاکر دیصانی

ابوہریرہؓ

اسماءؓ

حضرت اسماعیلؑ

جابر ابن عبداللہ

حضرت امام جعفر صادقؑ (امام ششم)

جویبرؓ

❖

عبداللہؓ ابنِ عباسؓ

عبداللہؓ ابن مسعود

عتبہ ابنِ ربیعہ

حضرت علیؑ ابنِ ابیطالبؑ (امیرالمومنینؑ امام اول)

حضرت امام علیؑ ابن الحسینؑ (امام چہارم)

حضرت امام علیؑ ابن موسیٰؑ رضا (امام ہشتم)

عمار یاسرؓ

عمرؓ ابن شعیب

حضرت عیسیٰؑ

فرشتے

فرعون

قارون

کافرین و مشرکین

حضرت امام محمدؑ بن حسنؑ العسکری (امام زمانہ)

حضرت محمد مصطفٰےؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت امام محمد باقرؑ (امامِ پنجم)

مفضل

حضرت موسیٰ علیہ السلام

مومن آلِ فرعون

مؤمنین

حضرت نوح علیہ السلام

وحشی

دحیہ بن خلیفہ کلبی

ولید بن مغیرہ

ہامان

ہشام بن حکم

حضرت یعقوبؑ

حضرت یوسفؑ

عُلماء و دانشور

کتبِ آسمانی

تورات

قرآن پاک

کُتبِ تفسیر و تاریخ و سیر

لغاتِ قرآن

(ا)

(ب)

(ت)

(ج)

(ص)

(ض)

(ط)

(ظ)

(ع)

(غ)

(ف)

(ق)

(ک)

(ل)

(م)

متفرق موضوعات

آخری فیصلہ

آسمانوں اور زمین کی خلقت کے ادوار

آفاقی اور انفسی آیات

اختیار و عدالت

ارادہ قتل موسیٰؑ

اسلام غلط اقدار کی نفی کرتا ہے